
حیدرآباد

شاداب

جلد (۶) شمارہ (۱) جنوری ۱۹۸۹ء حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	نعیم جاوید	حکیم الدین اشرف

قیمت 5-00

مجلس مشاورت

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	۵۰ روپے	150 ریال	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سال	۹۰ روپے	270 "	65 ڈالر	36 "	225 "
تاحیات	۱۰۰۰ روپے	2500 ریال	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 "

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاداب

فہرست

حرف اول	ایڈیٹر	۳
المرتضیٰ	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۵
مہر اور اسکی ادائی	محمد عبدالستار	۱۱
شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	۱۷
ایجنسی انٹرنیشنل	(ماخوذ)	۲۱
شیطانی کلمات	سکندر توفیق	۲۷
سیٹانک ورسیز	چو راما سوامی	۴۳
رشدی، ارون شوری اور قرآن	سید یوسف	۴۵
پونہ اردو تعلیمی سمینار	—	۵۳
دیہی قرضوں میں نرمی	پی، ایس بھٹناگر	۵۵
زرعی پیداوار	ٹی وی ستیہ نرائنن	۵۹

حرف اول

مدرسہ صُفّہ : اسلام سے پہلے دنیا میں جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ علم کی کمی کی وجہ سے پورے سماج کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور اخلاق و کردار کی پستیوں کی کوئی انتہا نہ تھی ایسے وقت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیائے انسانیت کو اسلام کی نعمت سے نوازا اور ہر قوم کے لئے ہر علاقہ کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرچشمۂ ہدایت، اللہ تعالیٰ کا کلام پاک، قرآن شریف نازل ہونا شروع ہوا۔ کلام پاک کی سب سے پہلی وحی، سورہ علق کی پہلی پانچ آیات، میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

" پڑھئے اپنے رب کے نام سے جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، بنایا آدمی کو جمے ہوئے خون سے، پڑھ یہ تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا آدمی کو وہ سب کچھ جو نہ جانتا تھا "

اس میں پڑھنے کا حکم ہے اور قلم سے علم سکھائے جانے کا بیان ہے، حضورؐ کی بعثت کا مقصد بھی کلام پاک میں کئی جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم اللہ تعالیٰ کی آیتیں سناتے ہیں۔ ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ حضورؐ نے علم کی اشاعت دو ذریعوں سے فرمائی ایک زبان دوسرے قلم۔ بعثت سے ہجرت تک زبان سے کتاب و حکمت کی تعلیم ہوتی رہی۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضورؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی اور اس کے ساتھ ہی صُفّہ (سائبان) کا مدرسہ قائم فرمایا۔ صفہ مسجد نبوی کے شمالی سرے پر ایک ہموار چبوترہ تھا جس پر کھجور کے درخت کے پتوں کی چھت تھی۔ معلم کتاب و حکمت نے اس مقام کو درس و تدریس کے لئے قائم فرمایا، یہاں تعلیم ہوتی، ساتھ ہی دور دراز سے دین کی تعلیم کی غرض سے مدینہ آنے والے مسافر بھی یہاں قیام کرتے، وہ لوگ جن کا نہ کوئی کاروبار تھا نہ زراعت اور نہ ہی جن کے پاس رہنے کو گھر

تھا وہ بھی یہیں رہتے۔

صفہ کے طالب علم نادار اور بے آسرا لوگ تھے۔ کھانے کا وقت آتا تو صاحب حیثیت لوگ ان میں سے دو دو تین تین کو اپنے گھر لے جاتے اور کھانا کھلاتے تھے۔ جو بچ جاتے انہیں حضور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ صفہ کی تعلیم کی بنیادی کتاب قرآن شریف تھی، اس کی قرأت، حفظ اور حکمت کی تعلیم دی جاتی۔ لکھنے اور خوش خطی کی مشق کرائی جاتی۔ اور دین و فقہ کے ساتھ ساتھ حساب، علم انساب و تاریخ، فن تعمیر، نشانہ بازی تیراندازی جیسے دیگر علوم کی تعلیم بھی دی جاتی۔ گویا صفہ ایک اقامتی درسگاہ تھی۔ اس اقامتی درسگاہ کے فیض یافتہ ہر طرف پھیلے اور علم کی روشنی سے اپنے ساتھ لے گئے اور بہت جلد مسلمان دین کے ساتھ دنیاوی علوم میں بھی پوری دنیا کے رہبر و رہنما بن گئے آج پوری دنیا میں مسلمان تعلیمی پستی میں مبتلا ہیں، اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہیکہ ہم صفہ کے اقامتی مدرسہ کی سنت پر قائم نہ رہے آج ہم اس سنت کو زندہ کرتے ہوئے ہر مسجد میں مدرسہ صفہ قائم کرسکتے ہیں، اس کے لئے کسی سرمایہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسجد میں مدرسہ صفہ کا احیاء کیا جائے جہاں مسجد کے اطراف کے بالغ اور بچے جمع ہوں۔ قرآن و سیرت و فقہ کی تعلیم حاصل کریں نیز دنیاوی مدرسوں کی تعلیم کا آموختہ بھی کرلیا جائے۔ تو بلا کسی خرچ کے تھوڑی سی محنت کے بعد ہم اپنی تعلیمی پستی کو دور کرسکتے ہیں۔

شاداب

: شاداب نے اپنی زندگی کے پانچ سال مکمل کرلئے ہیں، اور کو اس بات کی خوشی ہے کہ اس پوری مدت میں نہایت پابندی کے ساتھ وقت پر اشاعت عمل میں آئی جو اردو ماہنامہ کے لئے ایک قابل لحاظ کامیابی ہے نیز اردو کی اشاعت و ترقی کے ساتھ دین و مذہب، قومیت و سیکولرزم اور سائنس وغیرہ سے متعلق مضامین کی اشاعت کی کوشش کی گئی ہے۔ قارئین سے خواہش ہے کہ وہ "شاداب" کے مندرجات کے بارے میں مشورے اور تجاویز بھجوائیں۔ تاکہ اس رسالہ کو نافع بنانے کے دلچسپ اور پسندیدہ بھی بنایا جائے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

المرتضیٰ

(یہ مقالہ ۲۶ نومبر کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ کی تازہ شاہکار تصنیف "المرتضیٰ" کے رسم اجراء کے موقعہ پر پڑھا گیا، جو کتاب مذکور پر پہلے تأثر کے الفاظ میں تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔)

رائے بریلی کے دائرہ علم اللہ میں دعوت و عزیمت، ارشاد و تلقین، علم و فضل، مخبوری اور حق شناسی، سلوک و عرفان کا جو حیرت انگیز اجتماع نظر آتا ہے وہ ہندوستان کے بہت کم علمی خانوادوں کو نصیب ہوا ہے۔ یہاں تقریباً تین سو سال تک علم و فضل کی روایت رہی ہے۔ مولانا علی میاں آج اس عظیم الشان خاندانی روایت کے [illegible] بصیرت افروز علمی کارناموں کے پاسبان، اور اس کے روح پرور مسلک دعوت و عزیمت کے ترجمان ہیں۔

مولانا کی علمی و ادبی کاوشوں کا میدان بہت وسیع ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کاوشوں کا رشتہ ملت کی ضروریات، حالات کے تقاضوں، دعوت و اصلاح کے مطالبوں اور احیاء دین کے جذبات سے کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اگر ان کی تصانیف کا تاریخی پس منظر ذہن میں ہو تو ملت اسلامیہ کی ذہنی اور فکری تاریخ کا جیتا جاگتا نقشہ سامنے آجائے۔ عصر حاضر [illegible] پر جس کتاب نے غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور عربوں کو ان کے منصب و مقام سے آشنا کیا ہے

فقید المثال کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ان کی انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ہے" اس کتاب میں ایک حساس ملی شعور کی پُرنم آنکھیں شاہراہ مقصود کا پتہ دیتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے جہاں عربوں کو ان کے مقام اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے وہاں مغرب کو اس تہذیب کے مہلک اثرات سے باخبر کرنے میں گریز نہیں کیا۔ جو خودکشی کے لیے اپنے دامن میں خنجر چھپائے ہوئے ہے۔ انھوں نے ممالک اسلامیہ میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا جائزہ بڑی دیدہ وری سے لے کر بتایا ہے کہ مسلمانوں کو خود اپنے علمی اور ثقافتی سرمایہ کو دیکھنا چاہیئے کہ اس میں کیسے کیسے درد کا درماں موجود ہے۔ مغربی علمی مرکزوں میں اسلامی تہذیب و تاریخ کو صحیح معروضی انداز میں پیش کرنے کی تدابیر سوچی ہیں مولانا کی دردمند لیکن پُرامید آواز دور دور تک پہونچی ہے۔ اس پس منظر میں جب "المرتضیٰ" کو دیکھا جائے تو اس کی بالکل نئی اہمیت ابھر کر آتی ہے۔ یہ نہ صرف وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرتی ہے۔ بلکہ تاریخ کے بعض ایسے گوشے اس سے منور ہوجاتے ہیں جو مدتوں تعصب اور تنگ نظری کے پردے پڑے رہے ہیں۔ اور جن کے گرد بقول فاضل مصنف جذبات و تصورات کا ایک تنگ و سنگین حصار قائم کردیا گیا ہے۔ اس اجارہ داری" کو اس کتاب نے غیر معمولی بصیرت کے ساتھ ختم کیا ہے۔ اور سیرت المرتضیٰؓ کی عظمت و شان کو عقیدت و ارادت کے محدود دائروں سے نکال کر تاریخ کے دریچے سے دیکھنے کو اس طرح سجایا ہے کہ بصیرت کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔

میرے نزدیک "المرتضیٰ" کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ایسے دور کو جو مختلف فرقوں و عقائد کے تصادم کا اس طرح بازیچہ بن گیا تھا کہ اس میں کوئی گفتگو مناظرہ اور مجادلہ (Polemics) کی شکل اختیار کئے بغیر نہ رہتی تھی فاضل مصنف اس کو ایک ایسی سطح پر لے جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں جہاں حالات کے افہام و تفہیم کے لئے ایک نیا پس منظر پیدا ہوگیا ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اگر خلوص اور بصیرت کا ساتھ ہو تو صدیوں کی کُہر دم بھر میں چھٹ سکتی ہے۔ یہ صرف تاریخ نویسی نہیں ہے بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں فاضل مصنف کا خامہ معجز رقم ایک تاریخ ساز انجام دیتا نظر آتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اس اہم دور کے واقعات اب مختلف زاویہ ہائے

پڑھنے والے حضرات، کھلے دل سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں اور نئی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بہت بڑا شرف اور بہت بڑی سعادت ہے۔ جو مولانا کے لئے مقدر تھی اور ان کے لئے دعا بھی مبارکباد بھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب انھوں نے "المرتضیٰ" پر قلم اٹھایا تو ان کے حساس دل کو اس شعر نے متنبہ کیا ؎

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

انھوں نے "المرتضیٰ" سے دلوں کو جوڑنے کا کام لیا ہے، اور یہ بہت بڑا کام ہے جو تاریخ میں ان کا مقام متعین کرتا ہے ؎

دردی کہ خیزد از دل فیضی
سوزشی در کتاب می بینم

تاریخ اور سیرت نگاری مولانا کے وہ محبوب موضوعات ہیں جن میں ان کی ذہنی کاوشوں کا جوہر نکھرتا ہے۔ انھوں نے سیرت سید احمد شہیدؒ سے جس علمی کاوش کا آغاز کیا تھا۔ وہ سیرت علی مرتضیٰ تک پہنچ کر اس طرح پہونچی ہے کہ انداز بیاں کی شگفتگی، نقطۂ نظر کی وسعت، حکمت دینی کی رہبری نے ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے۔

مولانا علی میاں کا طرز نگارش ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے وسعت سے پاک دل میں جگہ تلاش کرنے والا۔ "از دل خیزد و بر دل ریزد" کا مصداق۔ ان کی تاریخی بصیرت نے حضرت علیؓ کا وہ مرقع تیار کر دیا ہے جو اسلامی تاریخ میں یادگار رہے گا اور جس سے تحقیق و تجزیہ کی نئی راہیں کھلیں گی۔ جب مولانا شبلی کی "الفاروق" کا اعلان ہوا تھا تو علمی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ آج تقریباً ۸۰ سال بعد "المرتضیٰ" کے ذریعہ انھوں نے تشنگانِ علم کے ساتھ وہی عمل کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود ان کے خانوادہ اور شبلی اسکول پر ایک قرض تھا، جو مولانا نے اس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نوا ہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ اند

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ الخفا میں خلافتِ راشدہ پر گفتگو کرتے ہوئے ایک

جملہ لکھا ہے :

بعلم الیقین دانستہ شد کہ اثبات
خلافت ایں چہار بزرگواران اصل است از
اصول دین، تا وقتے کہ ایں اصل را محکم
نگیرند، ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم
نشود ۔

مولانا اصلی میاں نے جس طرح عمرانیاتی منظر میں قبائلی جذبات کو سمجھایا ہے اور معاصرانہ رجحانات کا تجزیہ کرکے یہ ثابت کیا کہ خلفاء کی ترتیب زمانی میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ تھیں، وہ غیر معمولی بصیرت، محققانہ تیزنگاہی اور بیدار ملی شعور کی نشاندہی کرتا ہے، وہ منطقیانہ استدلال کے بجائے حق و صداقت کو رہبر بنا کر چلتے ہیں ۔ اور ذہن و دل کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں اس طرح دوسرے کے دل کو آواز دے کر کوئی اپنے جلو میں لے کر نہیں چل سکتا جب تک حق و صداقت سے خود اس کا پیکر ایک آئینہ نہ بن چکا ہو ۔

قریش کی خصوصیات اور ان کے استحقاق خلافت پر بعض ذہنوں میں خلش پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی معقول توجیہہ اس کی نہیں ملتی ۔ مولانا کی یہ تحریر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جس سے ذہنوں کا غبار چھٹ جاتا ہے اور ایک تاریخی حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے لکھتے ہیں ۔

- اہل قریش کی امتیازی خصوصیات میں یہ بات بھی تھی کہ وہ اپنی اولاد سے محبت رکھتے تھے (بدویانہ معاشرت میں یہ بات نہ تھی) خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، مناسک حج ادا کرتے تھے، میت کو کفن پہناتے، غسل جنابت کرتے ... شادی بیاہ زرا دور کی قرابت میں کرتے اور نکاح میں گواہوں اور مہر کا التزام رکھتے طلاق دیتے تو تین بار ـــــ قرآن نے اس طرز معاشرت کو بنظر استحسان دیکھا اور اس کو شریعت قرار دیا ۔"

جس قبیلہ کا طرز معاشرت، شریعت کی اساس قرار پائے، اس کی برتری اور استحقاق ۔

[illegible] کو شبہ ہو سکتا ہے۔ اس عبارت کے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] کو سنبھالنے کے لئے ابوالقریش بہترین صحابی منتظر تھے جن کو دوسرے [illegible] [illegible] قیادت کی خدمت سپرد کی جا سکتی تھی۔

مولانا کے قلم، نظر کا اعتدال اور منصفانہ انداز کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ نسب کے متعلق سب کچھ کہہ دینے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کرتے ہیں کہ: فرمایا:

"جس کو عمل نے پیچھے ڈال دیا ہو، اس کا نسب اس کو
آگے نہیں بڑھا سکتا۔"

فاضل مصنف نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی ذاتی خوبیوں، ذہنی کمالات، اخلاق و شمائل، دینی بصیرت، زہد و تقویٰ، خلوص و قربانی کی تفصیلات بڑی دقتِ نظر سے مرتب کی ہیں۔ اور ان حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ جن میں حضرت علی کو کام کرنا پڑا تھا یہ تجزیہ منصفانہ بھی ہے۔ بصیرت افروز بھی۔ اگر اس کو منزل بہ منزل سمجھ لیا جائے تو پھر اس عہد کی تاریخ بالکل نئے آب و رنگ میں نظر آئے گی۔ مصنف نے باقی تینوں خلفاء سے ان کے تعلقات کا ہر ہر پہلو واضح کیا ہے۔ اور جن عوامل و محرکات نے ان کی جدوجہد و سعی کا رخ متعین کیا تھا، ان کو بھی روشن کر دیا ہے۔ اکثر مورخین کا قلم اس دوسری منزل پر پہونچ کر سر بہ گریباں ہو جاتا ہے اور تلاش و تحقیق کے مطالبات سخت تر نظر آنے لگتے ہیں۔ فاضل مصنف جب اس منزل پر پہونچے تو آزمائش کے کتنے ہی میدان نظر کے سامنے آ گئے لیکن ان کے عزم و ارادہ سفرِ تحقیق کا ہم زبان ہو کر [illegible]

رہ گیا تحقیق و تنقید روایت ہائے تاریخی
سوا اس کے واسطے [illegible] میر اور ہمراہی

درحقیقت یہ ہے کہ اس میدان کو جس انداز میں انھوں نے سر کیا ہے، وہ ان کی تاریخی بصیرت، معروضیت، تحقیق کا ذوقِ شوق اور احساس کی شعور کا شاہکار ہے۔ انھوں نے تاریخی ماخذ کو بڑی محنت سے کھنگالا ہے بہت سے مروجہ نظریات کو تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ محض بدگمانی اور تنگ نظری نے ہمارے تاریخی

کس طرح غبار آلود کر دیا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے پس منظر میں اس عہد کی اہم شخصیتوں کو دیکھا ہے۔ ان تمام حالات و عوامل پر نظر رکھی ہے جو انسان کی فکر کو عمل کا جامہ پہناتے ہیں اور جن کے صحیح تجزیہ پر تاریخی سطح نظر کی صلابت و سچائی کا انحصار ہے کچھ عرصہ کی بات ہے۔ کشاف کے مشہور مصنف علامہ جار اللہ زمخشریؒ کی "الموافقۃ بین اھل البیت والصحابہ" کا مطالعہ کر رہا تھا اس کے بعض حصوں، بالخصوص بالکل ابتدائی عبارت نے کچھ الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ جو ذہن کے کسی گوشہ میں چلی آئی تھیں "المرتضیٰ" نے ان تمام شبہات کو اس انداز سے دور کر دیا کہ ذہن میں علامہ زمخشری کے بیانات کی حقیقت روشن ہو گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ سے حضرت علیؓ کے تعلقات کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی تیاری میں حضرت ابوبکرؓ نے مدد کی تھی۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ پر کس قدر اعتماد رکھتے تھے کہ فرماتے تھے "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا" حضرت عمرؓ بیت المقدس کے سفر پر گئے تو حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنایا۔ یہ اور ایسے بہت سے واقعات ذہن کو اس طرح متاثر کرتے جاتے ہیں کہ آخر میں ان تمام روایتوں کا بے حقیقت ہونا ثابت ہو جاتا ہے جن میں اکثر حضرت علیؓ کے خلفاء ثلاثہ سے تعلقات کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے تاریخی ماخذ کی تلاش و جستجو میں بڑی محنت کی ہے اور اس مرقع کا رنگ و بو مختلف گلشنوں سے حاصل کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض ایسے واقعات جن کو یا تو مصنفین نظر انداز کر دیتے ہیں یا ۔ اگر بیان کرتے ہیں تو کوئی خاص نتائج اخذ نہیں کر پاتے مولانا نے اس کی تفسیر و تعبیر کا وہ کام لیا ہے جس سے تاریخی سطح نظر میں جان پڑ گئی ہے حقیقتاً تاریخ کچا مواد ہے۔ اس سے کوئی مرقع تیار کرنے کے لئے بصیرت اور ژرف نگاہی کے ساتھ دل کی رہبری بھی ضروری ہے۔ ایک مرتبہ "المرتضیٰ" ہاتھ میں آ جائے تو جب تک ختم نہ ہو جائے ہاتھ سے نہیں چھٹتی۔ اس میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی پوری تصویر پیدائش سے شہادت تک آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض واقعات کا سبق آموز انداز بیان دامن دل کو پکڑ لیتا ہے۔

حضرت علیؓ کو حضورؐ کا اپنے بستر پر لٹانا، حضرت بی بی فاطمہؓ کے فاقے اور رسولؐ کا۔

(باقی ص ۴۲ پر)

محمد عبدالستار بی اے ایل ایل ایم

مہر اور اسکی ادائی

مہر کے متعلق اخبارات میں اکثر مضامین اور استفسارات شائع ہوتے جارہے ہیں کہ مہر کیا ہے. اس کی کتنی قسمیں ہیں۔ اس کی مقدار کیا ہونی چاہیئے کیا اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اگر مہر کا ین سکہ رائج الوقت میں نہیں ہو تو اس کی ادائی کس طرح ہونی چاہیئے۔ ان استفسارات پر مختصر ‌ں کے معنوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مہر کی تعریف

مہر وہ زر نقد یا مال ہے جو زوجہ عقد نکاح کے معاوضہ میں شوہر سے پانے کی مستحق ہے اس کی حیثیت ایک لازمی ہدیہ یا عطیہ کی ہے جس کو ساقط رنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ اسلام میں مہر عورت کی قیمت نہیں ہے بلکہ وہ ایک قانونی فریضہ ر پر خلوص ہدیہ ہے جس کا مقصود زوجین کے درمیان الفت و محبت کے تعلقات پیدا کرنا اور نکاح اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہے مہر کی ادائی شوہر پر واجب ہے خواہ اس کا تعین بوقت نکاح ہوا دیا نہ ہوا ہو۔

مہر کی قسمیں

مہر کی دو قسمیں ہیں (۱) مہر مُسمّٰی - وہ مہر ہے جس کا تعین بوقت عقد کیا جائے (۲) مہر مثل - وہ مہر جس کا تعین بوقت نکاح نہ ہوا ہو یہ مہر جو عورت کے ‌پ کی جانب کی عورتیں یعنی دادی پھوپھی وغیرہ کے مہر کے مماثل ہوگا - مہر مسمی کی بھی دو قسمیں ہیں

الف) مہر معجل PROMPT DOWER - یہ وہ مہر ہے جو بوقت نکاح ہی ادا طلب ہو

ب) مہر موجل DEFFERED DOWER - یہ وہ مہر ہے جو نکاح کے بعد یا کسی واقعہ ‌ ر وقوع سے طلاق یا انفساخ نکاح یا شوہر کی موت پر واجب الادا قرار پائے۔

جہاں تک مہر معجل کا تعلق ہے وہ عموماً بوقت نکاح ہی ادا کر دیا جاتا ہے لیکن مہر موجل

ریٹائرڈ سشن جج، آندھرا پردیش، آغاپورہ، حیدرآباد

طلاق یا موت کے بعد قابل ادائی ہوتا ہے اس کے قبل زوجہ شوہر سے ادائی کا مطالبہ بطور حق کے نہیں
کر سکتی۔ ہندوستان کے تمام ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ نے بھی اس اصول کو تسلیم اور طے کیا ہے اور
یہ اصول امر منفصلہ بن چکا ہے چنانچہ آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ میں جو زوجہ کے
شوہر کے خلاف حصول طلاق کا دعویٰ دائر کیا تھا۔ جس میں زوجہ نے دلا پانے مہر کی بھی استدعا بطور
"دادرسی مستلزمہ" کی تھی لیکن ہائی کورٹ نے مہر کی ادائی کی ڈگری دینے سے اس لئے انکار کیا کہ مہر قابل
کو پانے کا حق فسخ نکاح یا طلاق کے بعد ہی ہوگا۔ یہ دادرسی قبل از وقت ہے اس لئے عطا کرنے سے
انکار کر دیا۔ شوہر مہر موجل کی صورت میں رضاکارانہ طور پر بنا دعویٰ پیدا ہونے سے قبل ادا کر دے تو
قانوناً اس کی ممانعت نہیں ہے چنانچہ ایک مقدمہ بابو خاں بنام کمشنر انکم ٹیکس میں آندھرا پردیش ہائیکورٹ
نے یہ اصول طے کیا ہے کہ اگر شوہر طلاق یا انفساخ نکاح سے قبل اپنی خوشی اور رضامندی سے زوجہ کا
مہر موجل ادا کر دے تو ایسی ادائی قانون کے خلاف نہیں ہوگی۔ اسلامی ممالک میں عموماً مہر معجل باندھا
اور فوری ادا کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں مہر موجل ہی کا قرار داد کا عام رواج ہے، شیعہ، اسمعیلیہ فرقہ
میں مہر معجل کا طریقہ رائج ہے اور مہر بوقت نکاح ہی ادا کر دیا جاتا ہے۔

مہر کی مقدار کا تعین

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اسلامی قانون میں اس کے لئے
حد مقرر نہیں ہے۔ مہر کی اقل ترین یا اعظم ترین مقدار کے تعین کی
کوئی پابندی یا شرط نہیں ہے۔ مقدار کا تعین شوہر کی مالی حیثیت اور اس کی ادا کرنے کی صلاحیت کو
پیش نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ بعض نے "درمختار" باب طلاق "کے حوالہ سے کم سے کم مہر جو کہ دس درہم
جو ½۳۱ ماسہ چاندی ہوتی ہے باندھنے کو لازمی قرار دیا ہے۔ اسلام میں عورتوں کے مہر کی کوئی حد
بندی نہیں ہے جتنا مہر کوئی شخص دینا چاہتا ہے دے سکتا ہے۔ مہر وہی ہے جو ادا کر دیا جائے مگر
مہر دینے کی چیز ہے ایسا مہر باندھنا جس کی ادائی ممکن نہ ہو صریحاً خلاف احکام قرآن کریم ہے
اگر ایک امیر آدمی اپنی زوجہ کا مہر لاکھوں میں باندھنا چاہتا ہے اور اس میں ادا کرنے کی صلاحیت ہے
تو وہ باندھ سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی کے عہد خلافت میں مہر بڑھا چڑھا کر باندھنے کا عام رواج
ہو گیا تھا اس رجحان کو روکنے کے لئے حضرت عمر فاروق رضی نے چار سو درہم کی انتہائی حد مقرر فرمانا
چاہا تھا مگر ایک عورت نے ٹوک کر یہ آیت پڑھی۔
"اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے تم کچھ واپس نہ لو" اس کی مد

آپ کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے ۔ اس دلیل کو سنکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا " ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا " اور اعلان فرمایا کہ " میں نے چار سو درہم مہر سے زیادہ دینے سے روکا تھا جو کوئی اپنے مال سے جسقدر چاہے دے سکتا ہے ۔

اگر کوئی شخص مہر ادا نہ کرنے کی نیت سے مہر باندھے تو اس کا نکاح جائز نہ ہوگا ۔ بھاری مہر کا حقیقی مقصد یہ ہوتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور وہ ملکر نہ رہ سکے تو زیادتی مہر عورت کے حق میں بلائے جان ہو جاتی ہے شوہر اس خوف سے طلاق نہیں دیتا اور سالہاسال بلکہ ساری عمر کیلئے زوجہ معلق پڑی رہتی ہے ۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے ان میں سے ایک عام چیز مہر کی زیادتی ہے اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو بہت سی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں ۔

" اگر مہر کا سکہ رائج الوقت میں تعین کیا گیا تو اس کی ادائی کس طرح ہوگی "

یہ ایسا اہم مسئلہ ہے جو آجکل مہر کے تعلق سے اٹھایا جا رہا ہے ۔ مہر کا تعین سکہ رائج الوقت میں کیا گیا ہے تو آیا اس کی ادائی مقررہ مقدار میں عمل میں آئے گی یا بوقت ادائی سکہ کی قدر و قیمت کے حساب سے ادائی جائے گی اگر مہر پانچ ہزار سکہ رائج الوقت باندھا گیا تو تاریخ ادائی پر روپیہ کی قدر و قیمت کی کمی کے باعث اس وقت کے پانچ ہزار اب کے پچاس ہزار کے مساوی ہوں گے تو ایسی صورت میں کیا مہر صرف پانچ ہزار ہی ادا کیا جائے گا یا پچاس ہزار ۔ اس سوال کا جواب دینے سے قبل نکاح کی ماہیت اور نوعیت پر غور کرنا ضروری ہے ۔ اسلام میں شادی یا نکاح دراصل عورت عورت اور مرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے اس معاہدہ کا انعقاد فریقین کے باہمی ایجاب و قبول سے عمل میں آتا ہے اور معاہدہ تکمیل پاتے ہی مہر واجب الادا قرار پاتا ہے ۔ مہر معجل کی صورت میں مہر عقد کے وقت ہی ادا کر دیا جاتا ہے ۔ اس لئے سکہ کا تفاوتِ قدر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ مہر موجل کی صورت میں جو طلاق یا موت پر واجب الادا قرار پاتا ہے تو ادائی کی تاریخ پر سکہ کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادائی عمل میں آنی چاہیئے ۔ درست نہیں ہے ۔ جبکہ نکاح ایک معاہدہ ہے تو معاہدہ کرنے والے دونوں فریق کی حیثیت قانوناً یکساں اور مساوی ہوگی ۔ بیوی جو معاہدہ کی ایک فریق ہے اور شوہر جو معاہدہ کا دوسرا فریق ہے مجبور نہیں کر سکتی کہ سکہ کی

بھی قدر و قیمت جو تاریخ ادائی پر ہے ادا کرے اگر ایسی شرط معاہدہ نکاح کے وقت عائد کی جائے اور اس کا اندراج سیاہہ میں درج کر دیا جائے کہ سکہ رائج الوقت کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مہر ادا کیا جائے تو ایسی شرط کا عائد کرنا نہ خلاف شریعت ہے اور نہ قانون کے مغائر ہے قانوناً فریقین شرائط معاہدہ کے پابند رہیں گے۔

"آیا مہر کا تعین سکہ رائج الوقت میں ہونا چاہیے یا سونا چاندی کے وزن سے مقرر کیا جانا چاہیے۔"

مہر کے تعلق سے ایک اور مسئلہ غور طلب ہے وہ یہ کہ آیا مہر سکہ رائج الوقت میں باندھنا چاہیئے یا سونا چاندی کے مقررہ وزن کے لحاظ سے مہر مقرر کرنا چاہیے۔ بعض اصحاب اس خیال کے حامی ہیں کہ مہر کا تعین سکہ رائج الوقت میں شرعاً غلط ہے محض ایک رواج اور غیر اسلامی طریقہ ہے اس کے بجائے سونے یا چاندی کے مقررہ وزن کی صراحت کے ساتھ مہر کا تعین شرعاً درست ہے لیکن مہر کی تعریف کے اعتبار سے سکہ زر نقد کی تعریف میں آتا ہے اور سکہ رائج الوقت میں مہر کا تعین کرنا شرعاً یا قانوناً ممانعت نہیں ہے۔ مہر کا سکہ رائج الوقت میں باندھنا قانون ملک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اسلامی ممالک میں درہم۔ دینار و ریال سکہ رائج الوقت ہے اور پھر ان ممالک میں مہر ان سکوں کے چلن کے اعتبار سے باندھا جاتا ہے۔ شرعاً اور قانوناً اس کی کوئی پابندی نہیں ہے کہ مہر سونا چاندی کے وزن کے اعتبار سے باندھا جائے اور سکہ رائج الوقت میں باندھا نہ جائے۔

"آیا مہر کے مقدار میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے"

میاں بیوی آپسی رضامندی سے مقررہ مہر میں کمی و بیشی کر سکتے ہیں اور بیوی چاہے تو مہر معاف بھی کر دے سکتی ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی زوجہ کا مہر پانچ ہزار روپے باندھا ہو اور عقد کے بعد اس کی مالی حالت بہت ہی اچھی ہو جائے تو وہ مہر ایک لاکھ روپے رضاکارانہ طور پر بڑھا سکتا ہے۔ قانون ایسے اضافہ کی اجازت دیتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ ایسا اضافہ بیوی سے الفت و محبت کے جذبے کے تحت کیا جائے نہ کہ کسی قرض وغیرہ کو ترکہ میں رکھنے کے لئے کیا گیا ہو۔ بہرحال ایسا اضافہ رضاکارانہ اور نیک نیتی پر مبنی ہونا چاہیئے۔

بعض برادریوں میں بڑے مہر کا باندھنا ایک رسم کے طور پر چلا آ رہا ہے اس کا منشاء محض مہر باندھنا ہوتا ہے تاکہ برادری میں خاندان کی ناک اونچی رہے ورنہ شوہر کی مالی حیثیت بالعموم اس کی

اجازت نہیں دیتی کہ مہر لاکھوں روپیہ یا سونا چاندی کی بھاری مقدار میں باندھا جس کی ادائی کی نوبت نہ آئے مناسب اور درست نہیں ہے۔ اصل منشاء ادائیگی ہے نہ کہ صرف باندھنا۔ بعض وقت ایسے غلو آمیز مہر باندھے جاتے ہیں جس کی ادائی شوہر کے بس کی بات نہیں ہو تو وہ اپنی بیوی کو اس پر نظر ثانی کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں اور باہمی رضامندی سے ترمیم ہو سکتی ہے اور مہر کی مناسب کمی شوہر کی مالی حیثیت کے بموجب ادائی کی پیشکش کی جا سکتی ہے اور بیوی اس پیشکش کو قبول کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں حیدرآباد کے ایک مشہور جاگیردار خاندان میں جو بھاری مہر باندھا گیا تھا اس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ مہر اپنی نوعیت میں نہ صرف انوکھا اور حیرت انگیز تھا بلکہ ایک اتفاقی حیثیت کا حامل بھی۔ اس خاندان کے ایک فرد نے اپنی بیوی کا مہر سوا لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت یا سوا اشرفی، سوا من مچھر کی چربی اور چیونٹی چول (بنڈی کی آواز) باندھا تھا۔ اس کے لحاظ سے ظاہر ہوگا کہ مہر کس قدر غلو آمیز تھا۔ جس کی ادائی نہ صرف محال بلکہ ناممکن تھی۔ زوجہ نے دلاپانے مہر کا دعویٰ عدالت میں دائر کیا اور یہ مقدمہ اپنی مختلف مدارج سے گذرا بالآخر جوڈیشیل کمیٹی جس میں عدالت العالیہ کے فیصلے کے مرافعے ہوا کرتے تھے، تک پہنچا۔ یہ عدالت دورِ عثمانی کی اعلیٰ ترین عدالت تھی۔ اراکین جوڈیشیل کمیٹی کو روپیہ اور اشرفیوں کی ادائی کے تعلق سے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ البتہ سوا من مچھر کی چربی اور چیونٹی چول کی دادرسی عطا کرنے میں پریشانی لاحق رہی اور فریقین کی باہمی رضامندی سے اس جزو مہر کی حد تک انفصام و تفہیم کی۔ اس مقدمہ کے واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھاری مہر کا باندھنا محض اس غرض سے ہوتا ہے کہ شوہر زوجہ کو ادائی مہر کے خوف سے طلاق دینے کی جرأت یا جسارت نہ کر سکے۔

جس طرح فریقین کی آپسی رضامندی سے مہر میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے بیوی مہر معاف کر سکتی ہے، مہر سے دستبرداری کا اعلان کر سکتی ہے جس کو "ہبۃ المہر" کہا جاتا ہے۔ بیوی شوہر کو خلع کی ترغیب دینے کے لئے معافی مہر کی پیشکش کرتی ہے تاکہ شوہر خلع کو قبول کرتے ہوئے طلاق دینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ بعض وقت شوہر بیوی کے کسی خاص احسان کے بدلے یا جذبۂ الفت اور محبت کے تحت مہر معاف کر سکتی ہے مگر اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ شوہر کی میت غسل کے بعد دیدار کے لئے رکھی گئی ہے۔ شوہر کی جانب کی عورتیں مثلاً دادی، پھوپھی وغیرہ جبکہ بیوی پر شوہر کی موت کی وجہ سے رنج والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اور وہ آہ و گریہ میں مبتلا۔

نہ صرف خواہش کرتے ہیں بلکہ اس کو مجبور کرتے ہیں کہ مہر معاف کردے تاکہ شوہر کی روح کو نجات وسکون ملے۔ ایسے نازک لمحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زوجہ سے مہر معاف کروالینا نامناسب اور دانشمندی سے بعید ہے۔ بیوی حالات کی نزاکت سے مجبور ہوکر اگر مہر معاف بھی کردے تو ایسی معافی کی قانوناً کوئی اہمیت اور جواز نہیں ہے۔ مہر ایک دین ہے۔ متوفی کی چھوڑی ہوئی جائیداد یعنی متروکہ پر یہ دین ایک بار ہے اور اس قرضہ کی ادائی کو اولیت حاصل ہے جب ایک کثیر جائیداد متوفی نے چھوڑی ہو تو معافی مہر کا سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر اس نے فی الواقعی کوئی جائیداد نہ چھوڑی ہو تو بیوی بعد غور وفکر کسی وقت بھی اپنے طور پر اگر وہ مناسب سمجھے تو مہر معاف کرسکتی ہے۔

(سلسلہ صفحہ ۲)

● اس طرح کی زندگی گذارنے کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟ اب تو بس کسک باقی رہ گئی ہے

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

ابن انشا نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ فہرست میرے حوالے کی اور وصیت کی کہ "ہندو دانش کی خفیہ نویسی کو بے نقاب کرو اور دلجمعی سے ایک کتاب لکھو۔ میں تو اسے پڑھنے کے لئے زندہ نہ رہوں گا۔ لیکن میری رُوح خوش ہوگی۔"

حامی تو میں نے بھرلی، لیکن جب قلم اٹھایا تو ایک شدید الجھن میں گرفتار ہوگیا میں۔ احساس تھا کہ میں نے زندگی بھر کوئی ایسا تیر نہیں مارا جس پر شیخیاں بگھار کر اور اپنے منہ میاں مٹھو بن کر ادب کے میدان میں ایک بر خود غلط تیس مار خاں بننے کی کوشش کروں۔ کیسے لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ اور کیوں لکھوں۔ اس شش و پنج میں کئی برس گذر گئے۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ کی تاریک سرنگ میں روشنی کے کچھ آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ جن واقعات، مشاہدات اور تجربات نے مجھے متاثر کیا ہے ان کی روئیداد بے کم وکاست بیان کردوں۔

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ

"شہاب نامہ" قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت سوانح حیات ہے (۱۱۸۱) صفحات کی یہ ضخیم کتاب قارئین کو نہایت محبوب ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن ختم ہو گئے ہیں۔ کتاب کے آخری ٹائیٹل پر لکھا ہے۔

"یہ کتاب قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت ہے۔ ایک بھرپور زندگی کے ہنسنے ہنسانے، رونے رلانے والے واقعات کا حیرت ناک اور عبرت ناک مرقع۔

ماضی اور حال کے آئینے میں پاکستان کے مستقبل کی عکاسی۔

یہ کتاب سربراہوں کی کج رویوں، سیاسیتوں کی ہیرا پھیریوں، نوکر شاہی کی حضوریوں، بیوروکریٹس کی من مانیوں، انتظامیہ کی دھاندلیوں، اور معاشرے کی بے حسی کی بے لاگ داستان ہے۔

انگریز کا راج، ہندو کا مزاج، سکھوں کا مزاج، مسلمانوں کا ٹمٹماتا چراغ، داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کے لیل و نہار، با اعتماد اور ناقابلِ اعتماد "دوست" ممالک کے نقش و نگار، کشکولِ گدائی پر انحصار، محلاتی سازشوں اور آمریت کا جال، اقتدار کا زوال، مارشل لاؤں کا جنجال، جہادِ کشمیر اور جزوی آزادی، یو۔ این۔ او، کی قراردادوں کی بے حرمتی اور بے ثباتی۔

مسجد اقصیٰ کی ایک رات، دینِ مبین کی تجلیات، قلب و نظر کے مشاہدات، تزکیہ نفس کے معاملات۔

کتاب کے آخر میں "پاکستان کے بارے میں چند اندازے" اور اسلام کے فیوض و برکات اور ذاتی مشاہدات شامل کر کے مصنف نے اس خودنوشت کو نئی جہت عطا کر دی ہے۔

ادارہ "شاداب" نے طے کیا ہے کہ اس کے اقتباسات "شاداب" میں شائع کیے جائیں۔

کتاب کے پہلے باب "اقبال جرم" میں قدرت اللہ شہاب نے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنی سوانح کیوں اور کس طرح لکھیں۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:

• ۹ جون ۱۹۳۸ء سے میں نے باقاعدہ ایک ڈائری رکھنے کی طرح ڈالی یہ روایتی روزنامچہ کی صورت میں نہ تھی۔ بلکہ میں نے اپنے ایک خودساختہ شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) میں ہر ایسے واقعہ یا احوال کو نوٹ کرنا شروع کر دیا جو میرے نزدیک کسی خاص اثر یا اہمیت کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ یہ میری عادت ثانیہ بن گئی۔

کچھ عرصہ بعد ابن انشاؔ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر علاج کی غرض سے لندن چلا گیا۔ اس کی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل میں اسے ملنے لندن گیا۔ اس دوران ابن انشاؔ نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی نصیب ہو تو اسے کس طرح بسر کرنا چاہو گے؟

میں نے مختصراً جواب دیا کہ بہت سی کج فہمیوں، کمزوریوں، خطاکاریوں اور غلطیوں کی اصلاح کر کے میں دوسری زندگی بھی مجموعی طور پر ویسے ہی گزارنا چاہوں گا جیسے کہ موجودہ زندگی گزار رہا ہوں۔

یہ سن کر ابن انشاؔ چونکتا ہو گیا اور کاغذ پنسل ہاتھ میں لے کر سکول ماسٹر کی طرح حکم دیا "وجوہات بیان کرو۔ تفصیل سے"

میں خود احتسابی کی کدال سے اپنا اندر اور باہر کرید کرید کر بولتا رہا اور ابن انشاؔ ایس ایچ۔ او۔ کی طرح F.I.R. کے طور پر میرا بیان لکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست یہ تھی:

● دین کے بارے میں۔ میں کبھی کسی شک و شبہ یا تذبذب میں گرفتار نہیں ہوا۔ دین کے متعلق میرا علم محدود اور عمل محدود تر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی سے مجھے اسلام کی بعض جھلکیوں کی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔

● ایک دور افتادہ، پس ماندہ اور سادہ ماحول سے نکل کر میں نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لیا اور اللہ نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔ سروس

روس کے دوران میں نے کبھی اپنی پوسٹنگ یا ٹرانسفر کے لئے کسی قسم کی کوشش، سفارش یا خوشامد سے کام نہیں لیا۔ اس کے باوجود مجھے اچھے سے اچھا عہدہ نصیب ہوتا رہا۔

ملازمت کے دوران میں نے دانستہ طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی جائز اہ کے علاوہ میں نے کبھی کسی حکومت سے مالی یا زرعی اراضی یا پلاٹ وغیرہ کی شکل میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک بار سربراہ مملکت نے مجھے آٹھ مربع زمین کا انعام دینے کی پیشکش کی جب میں اسے قبول نہ کیا تو انھوں نے کسی قدر ناراضگی سے اس کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں یقین یا کہ انسان کو انجام کار دو ڈھائی گز زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ ہر کس و ناکس کو یں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے۔

ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار استعفٰی دینے کی نوبت آئی چوتھی بار بعد از خرابیٔ بسیار منظور تو ہوگیا لیکن میری پنشن اور ویڈنٹ فنڈ غالباً سزا کے طور پر تین برس تک رکے رہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ مرزا اسداللہ خاں ب جیسی عظیم ہستی کے ساتھ میری بس یہی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی پنشن کے ول میں یکساں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا!

وہ تین برس خاصی تنگدستی کا زمانہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی انسان کے سامنے ت سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

میں خود کسی کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یقینی ہے دوسری تخمینی۔ دوسروں کے دل کا احوال تو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔

انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات میں وقتاً فوقتاً رنجشیں، کدورتیں، نفرتیں اور تنازعے ہونا ایک فطری امر ہے۔ میں ان کمزوریوں سے ہرگز مبرا نہیں، لیکن میں نے رنجشوں، کدورتوں، تنازعوں کو ہمیشہ عارضی اور دوستیوں اور محبتوں کو ہمیشہ دائمی سمجھا ہے۔

میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے وہی بات کہی جائے جو اس کے منہ پر دہرائی سکے۔ اس اصول کو پوری طرح نبھا تو نہیں سکا لیکن کسی حد تک اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی رہی ہے۔

میں نے اپنے خلاف تنقید یا الزام تراشی کو برداشت کرنا سیکھا ہے اور اس کے جواب میں

تضحیک یا تردید کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ بجا یا بے جا تعریف سن کر دل خوش ہو جایا کرتا تھا رفتہ رفتہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بندہ کے لئے مدح و ذم دونوں یکساں ہیں۔

- میں کبھی Frustrate (مایوس) یا Bore نہیں ہوا۔
- تنہائی کے احساس نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ میں اکیلے میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔
- خوش قسمتی سے مجھے ایسے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی، جن کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی شخصیت ہے۔ مثلاً ابن انشاؔ، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، واصف علی واصف، جمیل الدین عالی، ریاض انور، ایثار راعی، مسعود کھدر پوش، ابن الحسن برنی، اعجاز بٹالوی، ایوب بخش اعوان وغیرہ۔ یہ سب اپنے اپنے میدان کے منفرد شہسوار ہیں۔ باہمی محبت، خلوص احترام اور اعتماد کے علاوہ ہمارے درمیان اور کوئی خاص قدرِ مشترک یا مقصدیت نہیں اس کے باوجود ہر زمانے میں ہمارے تعلقات میں نہ کوئی کمی آئی ہے اور نہ کوئی کمی پیدا ہوئی ہے۔

خاص طور پر ممتاز مفتی انتہائی ذکی الحس، قلندر، بے باک اور شدت اور جدت پسند تخلیق کار ہیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انہیں پسند آگئی اور انھوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کافور سے مہکتی ہوئی صافی داڑھی چسپاں کر کے، میرے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پُر اسرار جامہ پہنا کر اپنی سدا بہار تحریروں کے دوش پر مجھے ایسی مسند پر لا بٹھایا، جس کا میں اہل تھا نہ خواہشمند۔ اس عمل سے ان کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لئے وہ ایک طرح کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے پر اور بھی زیادہ مستعد ہو گیا تاکہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے بظاہر میرا نفس تو بہت پھولا، لیکن اندر ہی اندر عرقِ ندامت میں غوطے کھاتا رہا کیونکہ من آنم کہ من دانم

- میں نے دنیا بھر کے درجنوں سربراہانِ مملکت، وزرائے اعظم اور بادشاہوں کو کئی کئی مرتبہ کافی قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کسی میں مجھے اس عظمت کا نشان نظر آیا جو جھنگ شہر میں شہید روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے پرانے جوتے گانٹھنے والے موچی میں دکھائی دیا تھا

باقی صفحہ ۲۱ پر

اس شخص کا احوال اس کتاب میں "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے باب میں درج ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل ۔ ایک تعارف

دنیا بھر میں ہزاروں لوگ اپنے اعتقادات کی وجہ سے جیلوں میں بند ہیں۔ بہت سے لوگوں کو الزام بتائے بغیر یا مقدمہ چلائے بغیر قید میں رکھا گیا ہے۔ تشدد اور موت کی سزاوں کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ متعدد ممالک میں مرد عورتیں اور بچے سرکاری حراست میں لئے جانے کے بعد غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو دکھاوے کی قانونی کارروائی کے بغیر بھی موت کی نیند سلا دیا گیا ہے، حکومتوں اور ان کے ایجنٹوں نے ان لوگوں کو چنا اور قتل کردیا۔ ایک دوسرے سے بہت مختلف نظریات رکھنے والے ممالک میں انسانی حقوق کو پامال کیا جاتا ہے۔ یہ صورتحال بین الاقوامی ردعمل کی متقاضی ہے۔ انسانی حقوق کا تحفظ ایک عالمی ذمہداری ہے جو قومی نسلی اور نظریاتی سرحدوں سے بلند ہے یہ ایک بنیادی نظریہ ہے۔ جس پر ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل ایک آزاد عالمی تحریک ہے۔ یہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی تحفظ میں ایک مخصوص کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی سرگرمیاں قطعی طور پر قیدیوں پر مرکوز ہیں۔

یہ ضمیر کے قیدیوں کی رہائی کیلئے کوشش کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نظریات، رنگ جنس، نسلی منظر، زبان یا مذہب کی وجہ سے کہیں بھی قید ہوں اور انہوں نے نہ تو تشدد استعمال کیا ہو اور نہ ہی اس کی وکالت کی ہو۔

یہ تمام سیاسی قیدیوں پر منصفانہ اور فوری مقدمات چلانے اور الزامات کے بغیر مقدمہ چلائے بغیر قید رکھے جانے والے لوگوں کے لئے کام کرتی ہے۔

یہ تمام قیدیوں کیلئے بلا امتیاز سزائے موت، یا تشدد، یا دیگر ظالمانہ غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزاؤں کی مخالفت کرتی ہے۔

پوری دنیا میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سرگرم ارکان موجود ہیں ۔ ۱۶۰ سے زائد ممالک اور علاقوں میں اس کے پانچ لاکھ سے زیادہ ارکان چندہ دینے والے اور حامی ہیں۔ اس تحریک کے دروازے ہر اس شخص کیلئے کھلے ہیں جو اس کے مقاصد کی حمایت کرتا ہے۔ اسکے ارکان زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر کی عکاسی کرتے ہیں ۔ ان کی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ابتداء سنہ ۱۹۶۱ء میں ایک برطانوی وکیل پیٹر بینین کے اخباری مضمون سے ہوئی جس میں اس نے دنیا بھر کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ضمیر کے قیدیوں کی رہائی کےلئے غیر جانبداری کے ساتھ اور پر امن طور پر کام کریں ۔ ایک ماہ کے اندر اندر مختلف ممالک سے ایک ہزار سے زائد لوگوں نے عملی امداد کی پیشکش کی جو سیاسی مقدمات کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ان کی تشہیر کرتے اور حکومتوں سے اپیل کرنے کے لئے تیار تھے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تشہیر کی ایک مختصر کوشش سے شروع ہونے والی یہ تحریک ایک بڑھتی ہوئی بین الاقوامی تحریک بن گئی ۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل غیر جانبدار ہے ۔ کسی حکومت یا سیاسی نظام کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتی اور نہ ہی یہ لازماً ان قیدیوں کے خیالات کی حمایت یا مخالفت کرتی ہے جن کے حقوق کی تحفظ کے لئے یہ کوشش کرتی ہے ۔ یہ حکومت کے نظریے یا اس کا نشانہ بننے والے قیدیوں کے اعتقادات کا لحاظ رکھے بغیر ہر معاملے میں محض انسانی حقوق کے تحفظ سے غرض رکھتی ہے ۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل حقائق کی غیر جانبدار ، دیانتدارانہ اور درست اطلاع کو بہت اہمیت دیتی ہے اس کی سرگرمیوں کا انحصار انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزامات کی باریک بینی سے کی جانے والی تحقیقات پر ہے ۔ لندن میں قائم انٹرنیشنل سکریٹریٹ (جس میں عملے کی تعداد دو سو سے زائد ہے اور ان کا تعلق تقریباً تیس مختلف قوموں سے ہے) میں ایک شعبہ تحقیقات ہے جو مختلف طرح کے ذرائع سے معلومات واطلاعات جمع کرتا اور ان کا تجزیہ کرتا ہے ۔ ان ذرائع میں سینکڑوں اخبارات ورسائل حکومتوں کے بلیٹن ، نشریات ، وکلاء اور انسانی بنیادوں پر کام کرنے والوں کی تنظیموں کی رپورٹیں اور قیدیوں اور ان کے عزیزوں سے ملنے والے خطوط شامل ہیں ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل حقائق دریافت کرنے والے وفود بھی بھیجتی ہے جو موقعہ پر جاکر تحقیقات کرتے ہیں اور مقدمات کی کارروائی دیکھتے قیدیوں اور حکومت کے حکام سے ملاقات کرتے ہیں اور انٹرویو بھی لیتے ہیں ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل

اپنی شائع کردہ رپورٹوں کی پوری ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اگر کسی بھی جگہ کوئی بات غلط ثابت ہو جائے تو وہ اس کی تصحیح کرنے پر تیار رہتی ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل اپنے ارکان اور حامیوں کے عطیات پر انحصار کرتی ہے۔ اس کی معاشی آزادی کا اسکے کام کے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ سیاسی آزادی۔ عطیات لینے کے متعلق اس کے ضوابط بہت سخت ہیں اور اس امر کو یقینی بناتے ہیں کہ تنظیم کی کسی بھی شاخ کی طرف سے وصول کئے جانے والا چندہ اس کی دیانت داری کو متاثر نہ کرے، اسے کسی عطیہ دینے والے کا محتاج نہ بنائے اور اس کی سرگرمیوں کی آزادی کو محدود نہ کرے۔ تحریک کی آمدنی کا بڑا حصہ چھوٹے چھوٹے انفرادی عطیات رکنیت کی فیسوں اور چندہ جمع کرنے کی مقامی مہموں سے حاصل ہوتا ہے ایمنسٹی انٹرنیشنل اپنے بجٹ کیلئے کبھی حکومت سے نہ تو رقم وصول کرتی ہے اور نہ ہی اس کی طالب ہے

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بیشتر ارکان اور حامی چھوٹے مقامی گروپوں میں ہیں۔ افریقہ، ایشیا امریکہ اور یورپ کے براعظموں اور مشرق وسطیٰ بھر میں اب ۳۶۰۰ سے زائد گروپ موجود ہیں۔ انسانی حقوق کے لئے بین الاقوامی جدوجہد کے اصول پر زور دیتے ہیں۔ ان گروپوں کے کام کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ان میں سے ہر گروپ اپنے ملک کے قیدیوں کے لئے نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کے قیدیوں کے لئے کام کرتا ہے۔ بیشتر گروپ کم از کم دو قیدیوں کے معاملات پر کام کرتے ہیں اور غیر جانبداری کو یقینی بنانے کے لئے ان کے کام میں جغرافیائی اور سیاسی طور پر توازن قائم کیا جاتا ہے۔ کسی گروپ یا رکن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے ملک کے بارے میں معلومات فراہم کرے اور نہ ہی ان پر بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے ان کے ملک کے متعلق کئے جانے والے اقدامات اور دیئے جانے والے بیانات کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل جمہوری انداز میں چلایا جاتا ہے۔ ۵۴ سے زائد ممالک میں ارکان اور گروپ شاخوں میں ہیں شاخوں کے ذریعہ ارکان اس تحریک کی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں جس کو وہ مالی مدد دیتے ہیں۔ پالیسی کے بڑے فیصلے تنظیم کی انٹرنیشنل کونسل کرتی ہے جو تمام شاخوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے وہ اپنے فیصلوں پر کارآمد کرانے اور انٹرنیشنل سکریٹریٹ کے روزمرہ کے کاموں کی نگرانی کے لئے ایک انٹرنیشنل ایگزیکیٹیو کمیٹی منتخب کرتے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کو جب بھی سیاسی گرفتاریوں یا تشدد یا سزائے موت سے دوچار قیدیوں

کے متعلق پتہ چلتا ہے تو وہ سب سے پہلے حقائق معلوم کرنے پر توجہ دیتا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بین الاقوامی سکریٹریٹ میں تحقیق کرنے والے "ریسرچر" قیدیوں اور ان کے حالات کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ہر دستیاب تفصیل جمع کرتے ہیں اور اس کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اس کے بعد قیدیوں کی مدد کرنے کی کوششیں شروع کردی جاتی ہیں۔ اگر واضح ہو جائے کہ اپنی آزادی سے محروم ہونے والے افراد ضمیر کے قیدی ہیں تو ان کے کیس خودبخود فوراً دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تحریک کے گروپوں میں سے ایک یا زائد کے سپرد کردیئے جاتے ہیں۔ یہ گروپ جو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مقامی ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں قیدیوں کے معاملات کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں اور متعلقہ حکام کو قیدیوں کے فوری اور غیر مشروط رہائی کی اپیل کرتے ہوئے (خطوط وغیرہ) لکھنا شروع کرتے ہیں۔ یہ مہم مہینوں بلکہ اکثر اوقات سالوں جاری رہتی ہے۔ کابینہ کے وزراء اور جیل کے حکام کو خط پر خط بھیجے جاتے ہیں۔ ارکان مقامی ذرائع ابلاغ میں اپنے اختیار کردہ قیدیوں کے متعلق تشہیر حاصل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں متعلقہ سفارتخانہ یا تجارتی وفود کے دفاتر میں جاتے ہیں۔ وہ ممتاز شخصیات سے اپیلوں پر دستخط کراتے ہیں۔ اگر وہ قیدی کے خاندان سے رابطہ قائم کرسکیں تو وہ امدادی پارسل بھیج سکتے ہیں اور قیدی سے خط وکتابت شروع کردیتے ہیں۔

جب بڑے پیمانے پر سیاسی گرفتاریاں ہوتی ہیں تو بعض اوقات یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ نشانہ بننے والے ہر شخص کی نشاندہی کی جاسکے۔ لیکن جہاں کہیں بھی سیاسی بنیادوں پر لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے ایمنسٹی انٹرنیشنل متعلقہ حکومت پر زور دیتی ہے کہ وہ قیدیوں کے اس حق کا احترام کرے کہ انکے خلاف مقدمہ کی کارروائی منصفانہ طور پر اور بغیر کسی تاخیر کے مکمل کی جائے۔ دنیا بھر میں ارکان ایسے قیدیوں کے لئے مہم چلاتے ہیں جن میں سے بہت سے سالہا سال سے قید میں ہوتے ہیں۔۔۔۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل تشدد اور سزائے موت کے خاتمہ کے لئے بھی مہم چلاتی ہے۔ اس مہم کا اطلاق تمام قیدیوں پر ہوتا ہے جب لوگوں کو تشدد کے معلوم مراکز میں لے جایا جاتا تھا یا انہیں سزائے موت سنائی جاتی ہے تو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ارکان تشدد کے خاتمہ اور سزائے موت پر عملدرآمد کرانے کیلئے کوششیں شروع کردیتے ہیں۔ ایسے موقع پر درجنوں ممالک میں رضاکاروں کو چوکس کیا جاسکتا ہے اور گھنٹوں کے اندر ہی سینکڑوں تاریں اور دیگر اپیلیں متعلقہ حکومت، جیل یا نظربندی کے مرکز کو روانہ کی جاسکتی ہیں۔

پوسٹ کارڈ، تاریں اور پارسل متعلقہ لوگوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ قیدیوں کے جوابی خطوط آتے ہیں جن میں سے بہت سے خطوط جیل سے باہر نکل کر سمگل ہو کر یا ایرپورٹ کے سنسرشپ سے بچ کر ان تک پہنچ جاتے ہیں

مشرقی یورپ کے ایک ملک میں جب قانون کے ایک طالب علم کو جسے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مطالبہ کی دستخطی مہم چلانے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔ تین سال قید کی سزا سنائی گئی تو اس کے والد نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کو لکھا

میرے بیٹے کے لئے آپ نے دفاع میں جو آواز بلند کی ہے اس کے لئے میں آپ کا شکرگذار ہوں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل ہمارے عہد میں روشنی کا مینارہ ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کیلئے جو جیل کی اندھیری کوٹھڑیوں میں بند ہوتے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آپ کے بے لوث کام سے یہ روشنی ان لوگوں کیلئے جنھیں اس کی اشد ضرورت ہے ایک پھیلتے ہوئے دائرے میں جگمگا رہی ہے۔ ...... ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والے بہت سے لوگوں میں لاطینی امریکہ کا ایک استاد بھی تھا۔ جب پولیس اس پر تشدد ڈھا رہی تھی تو انہوں نے عقوبت خانہ اور قیدی کے گھر کے درمیان فون کا سلسلہ قائم کیا اور اس کی بیوی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خاوند کے چیخنے کراہنے کی آوازیں فون پر سنے، یہ جانکاہ عذاب سہتے ہوئے بیوی پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکی، قیدی خود بچ گیا اور بالآخر اس کو اپنے بچوں کے ساتھ جلا وطن ہونے کی اجازت دیدی گئی اس نے ہمیں بتایا، انہوں نے میری بیوی کو قتل کر دیا ہے وہ مجھے بھی قتل کر دیتے، لیکن آپ نے مداخلت کی اور میری زندگی بچالی۔

کچھ قیدیوں کو ایسی مہم کے شروع ہونے کے بعد جلد ہی رہا کر دیا جاتا ہے۔ کچھ عام معافی کے تحت آزاد ہو جاتے ہیں جب کہ دوسروں کو اپنی پوری سزا جھیلنی پڑتی ہے۔ تاہم ایمنسٹی انٹرنیشنل یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ کسی بھی قیدی کی رہائی اس کی کوشش ہی کے نتیجے میں ہوتی ہے خواہ اس نے اس قیدی کے بارے میں تحقیق کی ہو یا مہم چلائی ہو مگر ایک بات ہے کہ جب ایک دفعہ کسی قیدی کے معاملے کا ذمہ لے لیا جاتا ہے تو ایمنسٹی انٹرنیشنل اس کی رہائی تک اپنی کوششیں ترک نہیں کرتی۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی تحریک قیدیوں کیلئے زندگی کی ایک لہر بن چکی ہے، ایک شمع امید ہے جس کی روشنی سے ہر وہ شخص فیض یاب ہو سکتا ہے جو انسانی وقار کے دفاع کے لئے کام کرنا چاہتا ہے

اس تحریک کی مقبولیت نے یہ ثابت کردیا ہے کہ عام لوگ سیاست کا لحاظ رکھے بغیر ظلم واستبداد کو روکنے کی کوشش میں اکٹھے مل کر کوشش کرسکتے ہیں ۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل میں جو قیدی کے معاملات اپنے ذمہ لیتی ہے ان کی حقیقی طور پر مدد کرنے کی کوشش کرتی ہے ان کے مصائب کے متعلق بین الاقوامی تشہیر نہایت اہم ہے ۔ اس طرح سے خطوط اور اپیلوں کا تانتا بندھا بھی اہمیت رکھتا ہے ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے وفود قیدیوں سے اکثر باقاعدہ ملاقاتیں کرتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ تشدد کا نشانہ بننے والوں کا معائنہ کرنے کیلئے ان وفود میں ڈاکٹر بھی شامل ہوتے ہیں ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے میڈیکل گروپ، قیدیوں کے لئے بہتر علاج معالجے اور رہائی کے لئے خاص طور پر مختلف ہوتے ہیں ۔ کچھ ممالک میں عدالتیں ضمیر کے قیدیوں کو طویل المیعاد سزائیں دیتی ہیں جب کہ بعض دوسرے ملکوں میں انہیں سالوں تک مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں رکھا جاتا ہے ۔ کچھ ممالک میں تھانوں میں کئے جانے والے تشدد کے لئے بجلی کے جنریٹر استعمال کئے جاتے ہیں جب کہ کچھ دوسرے ملکوں میں نفسیاتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ موازنہ کی کوشش کرنے کی بجائے ایمنسٹی انٹرنیشنل ہر معاملے میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خاتمہ کی کوششیں کرنے پر توجہ مرکوز کرتی ہے ۔

عالمی رائے عامہ کو بیدار کرنے کی کوششوں میں ایمنسٹی انٹرنیشنل معاشی اور ثقافتی بائیکاٹ کی نہ تو حمایت اور نہ ہی ان کی مخالفت کرتی ہے لیکن وہ ایسے فوجی پولیس اور سیکورٹی کے سازوسامان اور مہارت کی بین الاقوامی منتقلی کے خلاف ہے جیسے وصول کرنے والی حکومتیں ضمیر کے قیدیوں کو گرفتار کرنے، ان پر تشدد کرنے اور سزائے موت پر عمل درآمد کے لئے استعمال کرتی ہیں ۔

انسانی حقوق کا تحفظ ایک بین الاقوامی ذمہ داری ہے ۔ یہ انفرادی اقدام مقدرہ جیسے ان کی آزادانہ دیکھ بھال اور بحالی میں مدد دیتے ہیں، قیدیوں اور ان کے اہل خاندان دونوں کیلئے خوراک لباس اور دیگر امداد فراہم کرتے کیلئے چندہ جمع کیا جاتا ہے ۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل حکومتوں کی انسانی حقوق کے ریکارڈ کے مطابق درجہ بندی نہیں کرتی اور نہ ہی کوئی بلیک لسٹ تیار کرتی ہے ۔ مختلف ممالک میں جبر و تشدد نہ صرف انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق معلومات کے آزادانہ پھیلاؤ کو روکتا ہے ۔ بلکہ جبر و تشدد کے طریقے اور ان کے اثرات بھی مختلف جگہ وسیع عالمی ادارے تسلیم کرچکے ہیں ۔ حکومتیں اب اپنے شہریوں کے حقوق کا تحفظ

باقی صفحہ (۴۲) پر

سکندر توفیق

شیطانی کلمات اور ڈھونگی شہید

سلمان رشدی

بتدریج سلمان رشدی جو کل تک ایک سلگتا موضوع تھا آج محض ایک سلگتا وجود ہے۔ اس آگ میں جلتا آدمی جس کے شعلوں کو خود اس نے اپنی پھونکوں سے بھڑکایا ہے لیکن فی الحال اہمیت اُن نوواردوں کی ہے جو اس پس منظر میں آدھمکے ہیں (انڈین ایکسپریس ۲۰ نومبر ۱۹۸۸ء) یہ ایسے نوارد ہیں جو رشدی کے جلتے شعلوں کی غیر مستقل روشنی میں راہ پالینے کی توقع رکھتے ہیں لہٰذا خبرداری کے یہ چند کلمات!

آغاز ہی میں ہمیں اس بات سے چارہ نہیں کہ رشدی کی چالاکی کا اعتراف کریں۔ رشدی نے اپنی کتاب پر "ایک افسانوی کردار کا افسانوی خواب" کا ٹھپہ لگا کر عملاً سنجیدہ مسلم اہل قلم کی گویا ناکہ بندی کردی ہے تاکہ وہ اس زیریں معرکہ میں شرکت کو اپنی شان کے منافی خیال کرتے ہوئے اسے نظرانداز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن اپنے اسی عمل سے رشدی نے اسلام دشمن قوتوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کردیا ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ آخر یہ معاندانہ عناصر کیوں رشدی کے بنیادی دعوی "ایک افسانوی کردار کا افسانوی خواب" پر قانع نہیں؟ ان کا موقف تو یہ ہے کہ رشدی ایک خوفزدہ لرزاں و ترساں مصنف ہے جو اپنے دل کی بات پردے ہی پردے میں کہہ سکتا ہے، کھلے عام نہیں۔ اس تانے بانے نے ایک عجیب اور انتہائی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی ہے۔ بہرحال رشدی کی کتاب آستین کا دشنۂ پنہاں بن گئی ہے جسے روز روشن میں لانے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسے مذہب کی محض تشنہ بُد رکھنے والوں کو خامہ فرسائی پر مجبور ہونا پڑا کہیں ایسا نہ ہو کہ وضاحت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہزاروں ذہن آلودگی میں ملوث ہو جائیں۔

بمبئی، ...

پہلی بات تو یہ کہ کوئی بھی حمیت، عزتِ نفس اور احساس وقار رکھنے والا شخص رشدی کے قلم سے پھیلتی بھیانک تصویر کشی کو برداشت نہیں کرسکتا نفاست پسند طبائع یہ بات گوارا ہی نہیں کرسکتے کہ کوئی حتیٰ کہ پاگل آدمی بھی ۔ ان کے دیوان خانے کی دیوار کو زینت دینے والے کسی معمولی سے مرقع پر کیچڑ اچھالے پھر بھلا وہ کس طرح اس بات کو انگیز کرلیں کہ ان کی روح کے پاکیزہ حجرے کو تقدس عطا کرنے والے مرقع جمال پر غلاظت کی بوچھار کرے چاہے یہ عمل مزاح کے عنوان سے ہو کہ افسانے کے نام سے

دوسری بات یہ کہ خدا کے آخری پیغام کے امین ہونے کی حیثیت سے اب ہر مسلمان کا یہ فرض ہوگیا ہے کہ الوہی صداقت کو نہ جاننے والوں کے کانوں تک پہنچادے ۔ ترسیل اور ابلاغ کا یہ عمل غلط فہمی کے ازالے کو بھی محیط ہے ۔ ان کا قبول کرنا، نہ کرنا، ایک دوسری بات ہے جس سے ہمیں زیادہ سروکار بھی نہیں ع ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں اور بس !

برسبیل تذکرہ ایک سرسری سوال یہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ " شیطانی کلمات " کو سپرد قلم کرنے کے بعد آخر سلمان رشدی کا ایک اسلامی نام سے وابستہ رہنا کیا جواز رکھتا ہے ؟ کیا رشدی کا اس بات کی تشریح کے لئے دیا گیا جواب تنویری نہ سہی کم ازکم تفریحی نہ ہوگا ؟ جس سے ہمیں ان کے اسلامی نام سے چپٹے رہنے کی علت کا علم ہوجائے ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ سلمان رشدی کا نام ہی اصل سرمایہ تجارت ہے ۔ وہ کیوں ؟

اس کیوں کا جواب تاریخ اسلام کے مبتدی کے لئے بھی کوئی بڑا معمہ نہیں ۔ رشدی کا نام ہی رشدی کی کل متاع ہے ۔ اسے واضح طور پر سمجھنے کیلئے قرآن حکیم کے صحیفہ نورانی کے اوراق پر نظر ڈال لیجئے قرآن حکیم نے یہودیوں کی ایک گہری چال کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے اس ہوائی غبارے کو جسے ان کے عیار دماغ نے اختراع کیا تھا اور ان کی مکاری نے کارآمد بنانے کی کوشش کی تھی، بے اثر بناکر رکھدیا انہوں نے ایک انتہائی سریع الاثر چال اختیار کی تھی کہ طلوع صبح کی اولین ساعتوں میں علی الاعلان اسلام قبول کرلیتے اور شام ہوتے ہوتے شور شرابا اٹھاتے اسلام سے مرتد ہوجاتے اور منصوبہ بند انداز کے اس عمل پر ایک سچے صدمے اور اصلی مایوسی کا خول سا چڑھا لیتے ۔ زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے کہ "بدقسمتی سے وہ اسلام کے نئے مذہب میں کوئی سچائی، نیکی یا تسکین نہ پاسکے ۔ افسوس، صد ہزار افسوس کہ انہیں اس نئے لبادے کو چھوڑ کر پھر سے یہودیت کے دامن ہی میں پناہ لینی پڑ رہی ہے ۔" سورۂ عمران کی آیت ۷۲ میں قرآن حکیم نے ان کے اس ڈھکوسلے کا بھانڈا پھوڑا ہے :

"بعض لوگوں نے، اہل کتاب میں سے کہا کہ ایمان لے آؤ اس پر جو نازل کیا گیا ہے مسلمانوں پر شروع دن میں اور پھر انکار کر بیٹھو آخر دن میں۔ عجب کیا کہ وہ (خود) پھر جائیں"

یہ انتہائی مکارانہ چال سگمنڈ فرائیڈ کے آبا و اجداد نے مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو جو بالعموم ناخواندہ تھے ورغلانے کے لئے ہی اختیار کی تھی کیونکہ یہودی عام طور پر علم و حکمت کے نگہبان سمجھے جاتے تھے۔

ان کی یہ چال انسانی نفسیات کے اس ابتدائی اصول پر مبنی ہے جو فرد درونِ خانہ INSIDER کو بہت اہم قرار دیتا ہے۔ ہندی کہاوت ہے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ لیکن اگر یہ بھیدی یہ فردِ درونِ خانہ INSIDER خود ہی صحیح علم اور درست فہم سے محروم ہو یا سچائی کی پرکھ نہ رکھتا ہو تو اس کا نام نہاد انکشاف بجز اس کے اور اس کے مقلدین کے کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ لوگ خود ہی فتح و کامرانی کے خزینے کی بجائے مصیبت اور ناکامی کے تحت الثریٰ میں جا گرتے ہیں۔ ناقص بینائی رکھنے والے، رنگ و چمک سے بے خبر، آب و تاب ناشناس احول کے ہاتھ میں اگر موتی اور کنکر بھری ہتھیلی تھما دی جائے تو ہم اس بات پر اعتماد نہیں کر سکتے کہ اس کے ہاتھ ہتھیلی میں سے جو چیز نکال کر دے رہے ہیں وہ کنکر ہے یا موتی ۔۔۔ نابینا یا احول (بھینگا) نگران یقیناً موتی اور کنکر میں نہ تو کوئی امتیاز کر سکتا ہے اور نہ موتی کے رنگ و چمک اور آب و تاب سے اس کی قیمت پہچان سکتا ہے۔ بعض اوقات گھر کے بھیدی INSIDER کا یہی حال ہوتا ہے کم از کم رشدی نے اپنے آپ کو اسی طرح کا ثابت کیا ہے۔ اگر وہ کوہِ نور کو کوئلہ کا ٹکڑا کہنے ہی پر مصر ہو تو بھلا کوئی کیا کر سکتا ہے؟ بریں عقل و دانش بہ باید گریست (اس عقل و دانش پر رونا ہی پڑتا ہے)

مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد نے رشدی کے اسلام سے اخراج کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مطالبہ نے رشدی کو بیٹھے بٹھائے ایک شہید کا سا روپ دے دیا ہے۔ شیطانی کلمات کی قربان گاہ پر نام نہاد شہید کا ۔۔۔۔ اور اب یہ ڈھونگی شہید شریر النفس اور حقیقت ناآشنا افراد سے ڈھیروں مدد پا رہا ہے۔ میری ناچیز رائے میں رشدی کا اسلام سے اخراج ۔۔۔ گو جائز سزا سہی ۔۔۔ اسے ایک ہارا سا عطا کر دے گا۔ جس کی رشدی کو بے انتہا ضرورت ہے۔ لیکن جس کا وہ ہرگز مستحق نہیں ہے دم گزیدہ ہونے کا ایک غلافی احساس رشدی پر طاری ہو جائے گا اور یہ احساس حفاظت کا ایک خول بن جائے گا جو اسے دولت کے ریلے میں سر اٹھائے تیرتے رہنے اور ہمدردیاں بٹورنے میں مدد دیتا رہے گا۔ خواہ تھوڑی مدت کے لئے ہی سہی۔

سرشتی کے ساتھ جو موزوں طرز عمل ہوسکتا ہے وہ، وہ برتاؤ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور منافق عبداللہ بن ابی اور اس کے پیرؤں کے لئے روا رکھا تھا۔ ان لوگوں کی غلیظ فطرت سے عام آگہی اور ایک آہنی بیگانہ وشی اور بے نیازی ـــــ انہیں اس بات کی کھلی چھوٹ تھی کہ اپنی چھوٹی شان میں جیسے بے عزتی سے اینڈتے پھریں۔ عبداللہ بن ابی اقرار باللسان کے باوجود، اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے کے باوجود، مجالس بلئے رسالت میں شرکت کرنے کے باوجود مختصراً یہ کہ خود کو مسلمان ظاہر کرنے کی حالت میں سرکار دوعالم کے دیدار سے مشرف ہونے کے باوجود، صحابی کے ممتاز لقب سے محروم رہا۔ کوئی اسے صحابی شمار نہیں کرتا۔ نتیجۃً اس کی موت نہ تو ایک یہودی کی حیثیت سے ہوئی اور نہ ایک صحابی کی حیثیت سے۔ گویا وہ گوشت و پوست کی ایک گٹھری تھا، حیوان محض۔ انسان ایمان کے بغیر اس سے بڑھکر کچھ اور ہوتا بھی نہیں۔ بھلا بچارے شری رام سروپ (انڈین ایکسپریس) اس عقدہ کو کس طرح حل کر سکتے ہیں۔ غالباً انہوں نے صحابی کی یہ تعریف پڑھ رکھی ہے "صحابی اس مسلمان کو کہتے ہیں جنہیں سرکار دوعالم کی خدمت میں ان کی حین حیات حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو" ہم سروپ جی کو الزام دینے کے لائق بھی نہیں سمجھتے۔

جب وہ اس نمایاں معمہ کو حل کرنے سے بھی قاصر ہیں تو ہم کس طرح یہ توقع کرسکتے ہیں کہ سروپ جی اور ان ہی کی طرح کے دوسرے "قلمکار" اس واقعے کی حکمت، باریکی اور ضرورت کو سمجھ سکیں گے جو شیطانی کلمات کی بنیاد بنا؟

ان لوگوں نے اس وقوعہ کو علم و تحقیق کے دائرے سے سرحد باہر کردیا ہے اور علمی بحث کی بجائے اب اس سے اسلام دشمن جذبات کو اکسانے اور ابھارنے کی نوک کا کام لے رہے ہیں۔ اس بات کا احساس کئے بغیر کہ اصل خراش اسلام پر نہیں ان ہی کے جسم پر لگ رہی ہے۔ سروپ جی نے اس وقوع کو طبری اور واقدی کی سند سے بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ اول الذکر محض ایک مورخ ہیں اور آخرالذکر ایک پرچہ نویس (جسے "کذاب" (جھوٹا) کہا جاتا رہا ہے) ان میں سے کوئی بھی محدث کا وقیع شان اور مقام نہیں رکھتا۔ اس پر مستزاد، وقوعے کا نہ تو پس منظر ہی بیان کیا گیا ہے اور نہ جاندار جزئیات۔ اسی لئے انہیں درج ذیل کیا جارہا ہے۔

ایک صبح جب سرکار دوعالم فجر کی نماز کی امامت فرما رہے تھے آپ نے پہلے ہی سے نازل شدہ اور حفظ کردہ سورتیں یعنے النجم (۵۳) اور اللیل (۹۲) کی تلاوت فرمائیں۔ پہلی رکعت میں

جب آپ النجم کی تلاوت فرمارہے تھے ۔ واضح رہے کہ یہ تلاوت سورے کی پہلی بار کی تلاوت نہ تھی تو آپؐ پر طلسمی اونگھ سی طاری ہونے لگی۔ جب آپ نے آیت ع۱۸ ختم فرمائی اور ع۱۹ اور ع۲۰ پر پہنچے تو شیطانی سحر وفسوں کے زیر اثر آپؐ کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ ادا ہوتے سنائی دئیے جن کے معنی ہیں " یہ بلند پرواز کلنگ ہیں جن کی شفاعت یقیناً پسندیدہ ہے " اور چونکہ سورہ النجم کی آخری آیت (۶۲) میں سجدۂ تلاوت آتا ہے آپ نے حسب معمول سجدہ کیا۔ کفارِ مکہ جو ہمیشہ سرکارِ دوعالمؐ کی جاسوسی کرتے اور سرگوشیاں کیا کرتے تھے وہ بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ سربسجدہ ہوگئے۔ یہ سجدہ ایمان لائے بغیر تھا۔ دوسری رکعت میں سرکارؐ نے اللیل کی مختصر سورت جس میں کل ۲۱ آیات ہیں تلاوت کرکے صلوٰۃ فجر کو مکمل فرمادیا۔

لیکن سب ہی اس بات پر متعجب تھے کہ آخر کافروں اور مشرکوں نے سجدہ کیوں کیا ؟ اس وقت شیطانی کلمات کا راز کھلا۔ بعد میں جبرئیل علیہ السلام نے بھی یہ تصدیق فرمائی کہ متذکرہ کلمات ان کے لائے ہوئے نہیں تھے۔ یہ سن کر سرکارِ دوعالمؐ سراپا الم بن گئے۔ خیال رہے کہ آپؐ کو اس بات کی ذرا بھی خوشی نہ ہوئی کہ اتنے بہت سے کافروں نے آپؐ کے اتباع میں سجدہ ادا کیا۔ اگر کوئی دنیادار جاہ وحشمت کا طلبگار آپؐ کی جگہ ہوتا تو یقیناً خوش ہوتا۔ لیکن آپؐ ایسے نہ تھے۔ آپ پر رنج والم طاری تھا۔ اتنا گہرا رنج کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے سورۃ النحل نازل فرمائی جو ۱۲۸ آیات (ایک ہزار آٹھ سو اکتالیس کلمات) پر مشتمل ہے اور جو یہ خوشخبری بھی سناتی ہے۔

" اور جس دن ہم ہر امت میں ایک ایک گواہ جوان کا ہوگا ان کے مقابلے میں قائم کردیں گے اور ان کے مقابلے میں آپؐ کو گواہ بناکر لائیں گے اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور خاص مسلمانوں کے واسطے، بڑی ہدایت بڑی رحمت اور بڑی خوشخبری سنانے والا ہے " (سورۃ ۱۶ آیت ۸۹)

مگر ہمارے ' بے چارے سلمان رشدی نہایت معصومیت سے " کس پر اعتماد کریں ؟ " کا ڈھونگ رچاتے دکھائی دیتے ہیں تو ان کے حلیف یہ نعرہ لگاتے ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں " یہی تو ہم بھی کہتے ہیں " لیکن دکھاوے کے عظیم الشان متذکرہ مظاہرے کے دوران وہ اس ایک سادہ مگر اساسی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کیا وہ کسی حتمی شہادت کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرسکتے ہیں کہ سورۃ النجم اسی صبح پہلی بار نازل ہوئی تھی ؟ اس کے برخلاف اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے کہ سورۃ النجم ایک پہلے نازل شدہ اور

اورحفظ کردہ صورت تھی ۔ آیت ۶۲ کے ختم پر سجدۂ تلاوت اس بات کا ایسا ٹھوس ثبوت ہے جو آج تک موجود ہے ۔ اس صورتحال کے پیش نظر نئے الفاظ کے اضافے کا پتہ چلانا اور انہیں بے اثر کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور چنانچہ ہوا بھی یہی ۔

اس طرح یہ الزام کہ سرکارِ دو عالم ایک بار مصالحت کا اندازہ لئے الندوہ تشریف لے گئے ، شیطانی کلمات کا اعادہ فرمایا لیکن بعد میں اس سے انحراف فرمایا محض ایک افترا ہے ۔ پیغمبر عالم کفار و مشرکین مکہ کے پاس ہرگز تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ وہ خود حسبِ عادت قدیم آپ کی سرگوشیاں لے رہے تھے اور ایسے میں شیطانی مداخلت کو سن کر خوشی سے اتنے بے حال ہوئے کہ سجدے میں گر پڑے ۔ اسلام کے اقرار کے بغیر ـــ اور مغیرہ نامی مشرک نے سجدہ کرنے کی بجائے اپنی پیشانی پر مٹی کا تِلک لگایا ۔

یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے ۔ جب ہم اس وقت کی تاریخ پر نظرِ بازگشت ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصالحت کی تجویز بارہا پیش ہوئی مگر ہمیشہ کفار و مشرکینِ مکہ کی جانب سے ، لیکن ہمارے پاک پیغمبر ص اپنے موقف سے ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے اور ہمیشہ اللہ جلّ شانہٗ کی وحدانیت کا اقرار و اصرار فرمایا ۔ لہٰذا یہ بات ناممکن اور ناقابلِ قیاس ہے کہ حضور از خود جاتے بوجھتے کفارانِ مکہ کے پاس گئے ہوں اور اپنی زندگی بھر کے نصب العین کے خلاف مصالحت کا پیشکش کیا ہو ۔ لہٰذا یہ تمام واقعہ ایک افترا یا زیادہ سے زیادہ ایک وقتی شیطانی مداخلت ٹھہرتا ہے جس کی تہہ میں سحر اور جادو کارفرما تھا اس کا وحی سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ اس مداخلت کو مداخلت سمجھ لینا ہی خود اس کی تصحیح تھی جس کے باعث آیت میں بیرونی عنصر کوئی نقصان نہ پہنچا سکا ۔

انڈین ایکسپریس میں اٹھائے ہوئے سوال پھر بھلا ہم کس طرح شیطانی نغوذ اور ملکوتی وحی میں امتیاز کرسکتے ہیں ؟ اس کا صرف ایک جواب ہے ۔ کیا چودہ سو سال گزرنے کے بعد آئے ہوئے ہم لوگ اس خصوص میں کوئی قولِ فیصل رکھ بھی سکتے ہیں ؟ یا خود شاہدانِ پیغمبر علیہ السلام جو آپ کے چشم دید گواہ اور ہمعصر تھے ؟ کیا انہوں نے کسی لمحہ بھی سرکار پر یہ الزام لگایا کہ آپ (نعوذ باللہ) وحی اور غیر وحی میں امتیاز نہیں کرسکتے تھے ؟ کیا کبھی انہوں نے سرکار پر تلون کی تہمت رکھی ؟ اگر نہیں ـــ اور یقیناً نہیں تو پھر کس برتے پر کوئی س ر (سلمان رشدی) یا ر س (رام سروپ) مسندِ عدل پر متمکن ہو سکتا ہے اور اگر وہ کوئی فیصلہ سنا بھی دے تو اس فیصلے کی کیا وقعت ہوگی اور کیا وزن ہوگا ؟

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرورِ دو عالم کے ہمعصر ـــ مومن و کافر ہر دو ـــ سرکار کو

"امین" اور "صادق" ہی مانتے تو رہے اور آپ کی ذاتِ بابرکات کے تعلق سے کسی تردد اور شک کا بھی مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے شیطانی مداخلت کو اس کی اپنی روشنی میں محض مداخلتِ بے جا ہی سمجھا انہوں نے معاملات (وحی اور غیر وحی) کو خلط ملط بھی نہیں کیا اور نہ کسی سوءِ ادب کے مرتکب ہوئے۔ اور نہ خود کو فیصلہ دینے کا اہل گردانا سمجھا۔ ان کے سامنے مخاطب قرآن ﷺ اور قرآن پاک دونوں موجود تھے۔ و قرآنِ مجید جو سارے عالمِ انسانیت کو وحی اور غیر وحی کے تصفیہ کی بھاری ذمہ داری سے بری قرار دیتا ہے۔ سورہ ۶۹ میں آیات ۴۱ تا ۴۷ واضح طور پر اعلان کرتی ہیں۔

"۴۱ - اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں - مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو

۴۲ - اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے - تم بہت کم سمجھتے ہو

۴۳ - رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے

۴۴ - اور اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے

۴۵ - تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے

۴۶ - اور پھر ہم ان کے دل کی رگ کاٹ ڈالتے

۴۷ - پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا" (سورۃ ۶۹ آیات ۴۱ تا ۴۷)

جہاں اتنی سخت وعید کے ذریعہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی ضمانت دی گئی وہیں وحی کے وصول کرنے کے آداب کی وضاحت کے ذریعہ خود پیغمبر ﷺ کو یہ طمانیت دی گئی اور ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وصولِ وحی میں بے قراری اور عجلت کا مظاہرہ نہ فرمائیں اور نہ الفاظِ وحی کو یک لخت اپنی گرفت میں لینے کی سعی کریں بلکہ بوقتِ نزولِ وحی اسے دہرانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ سورت ۷۵ کی آیات ۱۶ تا ۱۹ اس صراحت کے باعث وحی کے مصدقہ ہونے کی دہری ضمانت بن جاتی ہیں۔

" اور اے پیغمبر آپ قبلِ اختتام وحی قرآن اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ جلدی اس کو لیں ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور (پھر) پڑھوا دینا - جب ہم اسے پڑھیں (مکمل) تو آپ اس کی پیروی کریں - پھر اس کا بیان کرا دینا (بھی) ہمارے ذمہ ہے"

(سورہ ۷۵ آیات ۱۶ تا ۱۹)

شہنشاہوں کا شہنشاہ یقیناً عاجز اور اپنے پیامبر کے رحم و کرم پر نہیں رہ سکتا۔ دنیوی بادشاہ کے سفیر اس بادشاہ کے ...

لیکن اللہ (عالم و بینا) کے ساتھ ایسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ علیم و خبیر، حاظر و ناظر اور حکیم و قدیر ہے۔ واقعہ زیر بحث کے سلسلے میں اللہ جل شانہ نے پیغمبر کی تسلی و تشفی ہی کی۔ سرزنش نہیں۔ یہ بات حکمت سے خالی نہیں۔

اب کچھ تشریح اس واقعہ کی حکمت، باریکی اور ضرورت کے تعلق سے۔ یہ واقعہ، بشرطیکہ پیش آیا ہو، بجائے خود ایک ٹھوس مکمل اور زندہ ثبوت کی صورت اختیار کر کے حسب ذیل حقائق کی نشاندہی کرنے لگتا ہے۔

۱۔ یہ کہ قرآن پاک کلام اللہ ہے جو الفاظ کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ یہ محض مفہوم کا نزول نہیں
۲۔ یہ کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن مجید پر اپنی سخت نگرانی رکھی تھی۔ رکھ رہا ہے اور رکھے گا اور اس صحیفے کو ہر ممکنہ تحریف، تو صیف اور بیرونی عنصر کے ادخال سے محفوظ رکھے گا۔
۳۔ یہ کہ قرآن عظیم کی موجودہ عبارت "مکمل" خالص اور از اغلاط سے پاک صد فیصد وحی ہی تو ہے

نمبر ۱ کے تعلق سے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب کوئی شخص قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اس الوہی چیلنج سے بھی آگاہ رہتا ہے جسے بارہا دہرایا گیا ہے۔ یہ چیلنج اللہ نے تمام کائنات جن و انس ہر دو کے لئے جاری فرمایا ہے چیلنج یہ ہے کہ وہ قرآنی آیات کے مماثل محض چند آیات ہی تخلیق کر دکھائیں۔ اور اللہ جل جلالہٗ کا دعویٰ ہے کہ وہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔

چنانچہ سورہ ۲ کی آیات ۲۳ و ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے۔

"اگر تم کچھ خلجان میں اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندہ (خاص) پر تو (اچھا) پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو۔ اور بلا لو اپنے حمائتیوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں۔ اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم (یہ کام) نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ تیار ہوئی رکھی ہے کافروں کے واسطے۔" (سورہ ۲ آیات ۲۳، ۲۴)

یہ ایک ناممکن کام تھا۔ اس لئے کسی کافر نے بھی کھلے عام اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہ کی۔ عہد ضلالت کے بہترین شاعر، مقرر اور انشا پرداز سب ہی نے بزبان حال اپنا عجز تسلیم کر لیا لیکن شیطان نے (جو ایک جن تھا) ایک آخری کوشش کر لینے کی ٹھانی۔ وہ خود بھی اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ وہ نہ تو کوئی مکمل سورت اس کے مثل تشکیل دے سکتا تھا اور نہ کوئی خود تخلیق

لیکن شیطان نے سوچا کہ وہ کم از کم چند الفاظ کا اضافہ ہی کر دے گا تا کہ نازل شدہ عبارت کا مفہوم بدل جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے منصوبے کو تکمیل کا جامہ پہنا دیا۔ پہلے تو اس نے قرآن کے ایسے سیاق و سباق کا انتخاب کیا جس میں مشرکین کے بتوں کے نام مذکور ہوئے تھے اور ان ناموں کے بعد صرف چند توصیفی کلمات بڑھا دیے۔ لیکن یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند صاف نمایاں رہا۔ جو سورہ کی متاخر آیات سے کسی طرح میل نہ کھا سکتا تھا۔ اس طرح کلام اللہ اور غیر کلام اللہ کی ایک مثال دستیاب ہو گئی۔

اس واقعہ کو مخالف مستشرقین ADVESE ORIENTALISTS اور دشمنانِ اسلام قرآن کے من گھڑت ہونے کے ثبوت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن یہ ان کی خواہش کے برخلاف قرآن کے شک و شبہ سے بالا اصلی وحی ہونے کا ثبوت بن بیٹھا۔ ایسی مصدقہ، خالصتاً اور واقعتاً الوہی وحی جس میں چند الفاظ کا اضافہ بھی ممکن نہیں۔ اور ایسی ہر کوشش خود اپنی شکست کی آپ آواز بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ واقعہ ضربِ معکوس بن کر آج اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ قرآنِ حکیم کسی بھی قسم کا کوئی بھی بیرونی عنصر چاہے وہ کسی جائز واسطے دلیجئے خود لبِ مصطفےٰ ہی سے کیوں نہ گزارا گیا ہو۔ ہرگز ہرگز بار نہیں پا سکتا اور ہرگز ہرگز استحکام نہیں حاصل کر سکتا۔

یہ منفرد وجود، تنہا و یگانہ واقعہ — چاہے وضع کردہ FABRICATED ہو یا حقیقی FACT آج ایک مقصد پورا کر رہا ہے اور کون جانے اس مقصد کی بجا آوری ہی عین مشیت ہو۔ اس کا واحد و تنہا پن اور یکتائی، بعض کفار کا اس کے واقع ہونے پر اصرار اور بعض مومنین کی اس سے بے خبری، اس کا فضیحت اور رسوائی کی جڑ ہونا اور کسی بھی فضیحت یا رسوائی SCANDAL کا نمودار نہ ہونا، اس کا اشاعتِ اسلام کے حق میں مقاومت اور تحدید کا حکم رکھنا اور اس تحدید کی عدم تشکیل، غرض یہ تمام عناصر اسے ایک سِرّ مکنون ایک پراسرار راز بنا دیتے ہیں۔ نفسیاتی عوارض کے بارے میں ہماری جدید تحقیق اور مختلف علم PSYCHIATARY ایک نئی توجیہ پیش کرتا ہے۔ کیا یہ ایک ایسا سماعی تخیل HALLUCINATION تھا جو صرف کفار ہی تک محدود رہا۔ وہ سب کے سب ایک سمعی فریب AUDITARY DELUSION کا شکار بن کر اپنی دلخواہ گو یا DESIRED ECHO سن رہے تھے جبکہ مومنین اپنے ایمانِ راسخ کے باعث اس عارضہ سے محفوظ رہے تھے۔ بہرحال روایت اس راز سربستہ کو گہرے سے گہرا ہی کرتی جاتی ہے اور کہنا ہی پڑتا ہے واللہ اعلم بالصواب

لیکن بہر حال یہ واقعہ آج ایک مجسم اور منہ بولتا ثبوت ہے مندرجہ ذیل دو باتوں کا -

۱۔ زیر سما کوئی ایسی ہستی نہیں جو قرآن کا مثل ایک سورت بھی تخلیق کر سکے ۔

۲۔ کوئی بیرونی عنصر قرآن میں شامل ہو کر باقی و برقرار نہیں رہ سکتا ۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم - دیگر تمام پیغمبروں کی طرح - بے شک معصوم تھے ۔ لیکن بیماری اور جادو سے مامون نہیں - اسی لئے علیمٌ بذات الصدور خداوند قدوس نے حضورؐ سے نہ تو کفارے اور معافی کا مطالبہ کیا اور نہ کوئی سرزنش کی اور نہ خفگی کا ادنیٰ سا اظہار - اس کے بالکل برخلاف جب سرکار دو عالمؐ نے ایک مرتبہ نابینا صحابی عبداللہ ابن مکتوم کی مداخلت پر بے صبری کا اظہار کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے واضح اظہار ناخوشنودی فرمایا ۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ ایک ایسے وقت جب سرکار دو عالمؐ با وقار قبیلۂ قریش کے خاص طور پر ملاقات کے لئے آئے ہوئے چند سربر آوردہ اصحاب کو اسلام کے اصول سمجھا رہے تھے ، بینائی سے محروم ابن مکتوم نے سرکار کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بے موقع کوشش کی جو سرکارؐ کو ناگوار گزری اور آپؐ نے ناگواری کا اظہار بھی فرمایا ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ طرز عمل - یعنی ابن مکتوم کی بظاہر سادہ سی اتفاقی مداخلت کو اعلیٰ درجہ کی اہمیت دینا اور بظاہر انتہائی دور رس اثرات کی حامل ، شیطان کی منصوبہ بند مداخلت کو کوئی اہمیت نہ دینا ۔ س ر اور رس کے لئے حیران کن ہو تو ہو ، ہمارے لئے عجیب نہیں ۔ آخر شیطانی مداخلت کی حیثیت ہی کیا ؟ اور قدرت الٰہی کے سامنے اس کی کیا وقعت ؟ اللہ تبارک وتعالیٰ جیسا کہ کہا جا چکا ہے محض تشفی اور دلدہی کو ملحوظ رکھا ۔

" اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈالا ۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی بات کو زیادہ مستحکم کر دیتا ہے اور اللہ خوب علم والا خوب حکمت والا ہے " سورہ ۲۲ ایت ۵۲

ابن مکتوم سے سلوک جس پر اللہ جل شانہٗ نے اظہار ناخوشی فرمایا تھا (ملاحظہ ہو سورہ ۸۰) سرکار دو عالمؐ کا اپنا با لارادہ اور خود مختارانہ فعل تھا ۔ لیکن شیطان کے سحر و افسوں کے تحت الفا کا اعادہ بظاہر رسالت پناہؐ ہی کا فعل سہی ، آپؐ کا اپنا با لارادہ اور خود مختارانہ فعل نہیں تھا ۔

مصنفِ حقیقی نے اسی لئے سرزنش کرنے کے بجائے تسلی دی اور علاج و تدارک تجویز فرمایا اس آیت کے ذریعے کہ ہر قراءت قرآن سے پہلے تعوذ کا التزام کیا کریں۔

"تو جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطانِ مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں"
(سورہ النحل ۱۶، آیت ۹۸)

اب رہی رشدی کی یہ مصنوعی تشویش کہ کیا مستند ہے اور کیا نہیں؟ تو اس کا مسکت جواب مندرجہ بالا خط کشیدہ آیت قرآنی ہے۔ یعنی "پھر اللہ تعالیٰ اپنی بات کو زیادہ مستحکم کر دیتا ہے" جو آیت بھی قرآن حکیم میں قائم شدہ اور مستحکم ہے اس کو بلا چوں و چرا قبول کر لو۔ اور کسی لایعنی پریشانی میں نہ پڑو۔ تم ہر قسم کی ذمہ داری سے بری ہو — مستند اور غیر مستند کی شناخت کی ذمہ داری سے بھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے واضح طور پر قرآن کے نزول کی ذمہ داری — اسے پیغمبرؐ کو یاد کرانے کی ذمہ داری ان کی زبانِ مبارک سے ہو بہو ادا کرانے کی ذمہ داری۔ اور قرآن کو قیامت تک محفوظ، تضعیف، تحریف سے ماوراء رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اس کھلی ضمانت کے ہوتے آخر رشدی (یا کوئی اور) کیا چاہتا ہے اور اس کی حاجت بھی کب ہے!

بلاشبہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان اس کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ بھی خدا کے اس تکوینی قانون سے ماوراء نہ تھے۔ لیکن۔ غالباً اس وقوعہ کے بعد — وہ شیطان جو آپ کی بات اور کھوج میں لگا رہتا تھا۔ آپ کا مطیع بنا دیا گیا جیسا کہ ایک حدیث پاک میں صراحت ملتی ہے۔ اور اس حدیث کی شہادت میں یہ نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ شیطانی کلمات کی طرح کا کوئی اور واقعہ بعد میں کبھی ظہور میں نہ آیا۔ ضمناً: اس حقیقت کو عیاں اور مستحکم بنانے کے لئے کہ قرآن حکیم میں بیرونی عنصر کبھی بار نہیں ایک ہی مثال بہت کافی تھی۔

لگے ہاتھوں اب ذرا اندرونی شواہد پر بھی نگاہ ڈال لیجئے جو ایک نیا ہی قصہ سنا رہے ہیں اور بانگِ دہل، معجزانہ طور پر اس بات کو نمایاں اور آشکارا کر رہے ہیں کہ رشدی کا ذہن شیطان کا محل (یہ گھر) ہے۔ شیطانی کلمات میں ایک مخصوص لفظ غرانیق استعمال ہوا ہے۔ سروپ جی اپنی ہمدانی سے کام لیتے ہوئے اس کے معنی بتاتے ہیں "پرندے" ہم ان کی اطلاع کے لئے عرض کر دیں کہ غرانیق اسم جمع ہے غرنوق یا غرنیق کی۔ اور غرنیق کے ایک معنی ہیں کلنگ — لیکن دنیا کا کوئی مذہب بھی ایسا نہیں جس میں کلنگ کو کوئی روحانی یا مذہبی اہمیت دی گئی ہو۔ پھر؟ تو عرض ہے کہ

بلو غزنتی بلکہ ایک معنی اور بھی ہیں ۔ "نازک اندام نوجوان" اب ندا رشدی کو ان تصاویر پر نظر ڈال لیجیے جو انڈین ایکسپریس اور ویکلی وغیرہ میں وقت ، بے وقت گویا ایک جبرِ مشیت کے تحت چھاپی گئی ہیں ۔ مثلاً تبصرے کے دوران تبصرہ نگار کی تصویر کی بجائے موضوعِ تبصرہ یعنے رشدی ہی کی تصویر ۔ کیا غزنتی کے بیان کردہ معنی رشدی کا قلمی مرقع نہیں ۔ "نازک اندام نوجوان" اشرافت زدہ مسلم چلائے جانے پر مامور و مجبور و محکوم محض

موجودہ نسل کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ سرکارِ دو عالمؐ اور محسنِ اعظم کی مبارک شخصیت کی عظمت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی محسنِ انسانیتؐ کے ہمعصر کفار و مشرکین حضورؐ میں ایک فوق الانسان کے متوقع اور متلاشی تھے ۔ وہ جب آنحضورؐ کو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ، سوتے جاگتے اور چلتے پھرتے دیکھتے تو سراسیمہ اور مبہوت رہ جاتے ۔ جبکہ موجودہ عالمی نسل ایک دوسری انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے ۔ سرکارؐ کو محض ایک معمولی فرد سمجھ بیٹھنا ۔ کیا یہ جاہلیت کا دورِ مکرر نہیں ؟ کیا یہ سنگین ناانصافی نہیں ؟

آخر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں ؟ وہ واحد و تنہا ہستی جس نے اپنی آنکھوں سے اللہ کا دیدار کیا ۔ وہ واحد و تنہا ہستی جس نے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کیا ۔ وہ واحد و تنہا ہستی جس نے بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر بالائے دوزخ آویزاں طویل ترین پلِ صراط کا معائنہ کیا جس پر سے گزرے بغیر کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا ۔ اور جس کی مسافت کو طے کرنے ہزارہا سال درکار ہیں وہ واحد و تنہا ہستی جو اس مسافت کو بہ آسانی اور بہ عجلت کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے راز کی امین ہے ۔ وہ واحد و تنہا ہستی جو فوزِ عظیم اور فلاحِ دارین کا مکمل علم رکھتی ہے ۔ وہ واحد و تنہا ہستی جس کی انگلی کے تحکمانہ اشارے پر بدرِ کامل دو اجزاء میں شق ہو گیا (جسے دیکھ کر دور دراز ہندستان میں کیرالا کے ایک راجہ کو اسلام لانے کی توفیق ملی) اور آج رشدی اور اس کے ہم قماش اس ذاتِ ستودہ صفاتؐ کے تعلق سے توہین آمیز غیر سنجیدہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں ۔

بالکلیہ غیر جانبدارانہ اور سو فیصد کاروباری نقطۂ نظر سے ہی سہی منصفانہ جائزہ لیجیے ۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار رسولوں اور نبیوں کی اس جگمگاتی کہکشاں میں کون دوسرا ایسا رسول ہے جس نے خلائے بسیط OUTER SPACE کا عملاً یا کم از کم تصوراتی سفر ۔ اور وہ بھی آج نمودار ہونے والے سائنس و ٹکنیکی امکانات سے چودہ سو سال پہلے ۔ طے کیا ہو ؟ لوگ معراج

نبیؐ کو ایک حقیقی جسمانی (جو واقعتاً تھا بھی یہی) خیال کریں یا محض ایک روحانی خواب ہی کے طور قرار دیں کیا یہ پیغمبر حاضر کے خلائی دور کا نمائندہ بلکہ پرچم و نشانِ امتیاز نہیں؟ یہی ایک بات سرکارِ دو عالمؐ کو خلائی عہد کا پیغمبر باور کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ آپؐ کے اس دعویٰ کو کہ آپؐ ایک عالمی رسول ہیں بادجہ احسن سچ کر دکھاتی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جو قیامت تک جاری رہیگا دوسرے رسول یا تو کسی جغرافی اکائی کے لئے یا پھر ایک تمدنی اکائی کے لئے مبعوث ہوئے تھے لیکن ہمارے رسولؐ ساری کائنات کے لئے تا ابد رسول ہیں۔ جو صراطِ مستقیم سرکارؐ نے بتا دی ہے اس پر ایمان لانا اور گامزن رہنا ہی آخری، بنیادی اور باقی رہنے والی فتح و کامرانی ہے اور اسی پر انعامِ الٰہی کا حتمی وعدہ!

انعام — ابدی جنت کی صورت میں — مضمر ہے۔ ایمان بالغیب (نامعلوم، نادیدہ اور پس پردہ پر ایقان) اور اعمالِ صالح پر یہی ایک یقینی آزمائش اور اصلی امتحان ہے

بہ صورت دیگر، کسی نمائش کے جبری مشاہدہ کے لئے انعام عطا کرنے کا نہ تو کوئی عقلی، اخلاقی اور مادی جواز ہے اور نہ کوئی دستور — نمائش کے مشاہدہ کیلئے الٹے ٹکٹ خریدنا گرہ سے مال خرچ کرکے معاوضہ دینا پڑتا ہے اور کافر و مشرک یہ معاوضہ، اپنی جان دوزخ کے حوالے کرکے چکتا کرنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ عالم بالا کی مملکت میں اور کوئی سکہ نہیں چلتا۔

اس توضیح میں کونسی بات غیر عقلی ہے۔ سرکار دو عالمؐ مخبرِ صادقؐ نے اس کے سوا اور کہا بھی کیا ہے ع۔ بدلہ احسان کا توہین و غضب کیا کہئے! کسی ماہر فن، یا لیڈر یا محض دستار کے سامنے تو زانوئے ادب تہہ کیا جاتا ہے، موقع و محل کے مناسب گن کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن رسول اللہؐ کے ساتھ کیا رویّہ ہے؟ قبل از قبل مخالفت، من مخالفہ دشمنی، شکوک و شبہات" ظالمانہ سوالات" سوء ادب، تنفر، تکبر، تردد، تصنع اور کیا اور کیا۔ ایک فارسی کہاوت ہے "بے ادب بے نصیب" رشدی چھاپ ذہنی فضلہ بھلا حضرت اسماعیلؑ کی اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کے سامنے اطاعت شعاری — یا پھر ایک دیسی مثال شری رامچندرجی کا اپنے پتا کی آگیا کا پالن — چودہ برس کا بن باس، ایک حماقت کے سوا اور کیا نظر آئے گا؟ اپنی بیاہتا بیوی کو سکھ چین کے حق سے محروم کر دینا — واہ رے پتی! واہ رے پُتر!! بولو مغرب زدہ رشدی کی جے!!!

رشدی کا اپنی کتاب میں اعتقادات کے بخیے ادھیڑنا — ناشائستہ اطوار — نفرت انگیز اظہارات

غیر مہذب زبان، شرارت پسند محاکات۔ بالارادہ توہین، بیمار ذہنیت، استہزا اور استکبار ان عناصر نے ایک عام حقارت کو ہوا دی ہے یہی وہ چیز ہے جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ اور کتاب پر تحدید کو جائز قرار دیتی ہے۔ رشدی یا کسی اور کا اسلام پر اعتقاد رکھنا یا نہ رکھنا اصل مسئلہ نہیں۔ رشدی کے پیپ ٹپکاتے زہرناک قلم نے انگریزی ادب کو بھی آلودگی میں لتھڑ دیا ہے۔ لارنس سے لیکر گراہم گرین تک، موضوع سے قطع نظر تمام انگریزی کے ناول نویس کردار نگاری، زبان، اسلوب اور دقتِ نظر کا ایک شان رکھتے ہیں۔ لیکن رشدی — محض بہتان! اور اس کے باوصف اس سکنڈ ریٹ گنجلک ادیب کو اعلیٰ ترین ادبی انعام سے نوازا گیا ہے! بہتیرے نقوی (ملاحظہ ہو دیکھی) اور نقوی کے حاشیہ بردار بے شک مبہوت ہو کر اس کے طرفدار بن رہے ہیں۔ طنز و مزاح، بذلہ سنجی اور ظرافت کا نام لے کر — عمر رسیدہ کاسۂ سر پہ طبلہ نوازی کی مشق ظرافت نہیں دنائیت کہلاتی ہے اصل بات یہ ہے کہ رشدی کے طرار الفاظ سے زیادہ رشدی کو ادا کئے گئے چیک کے چمکتے ہندسے نے ان کی آنکھوں کو خیرہ ذہن کو چیرہ اور ذہن کو تیرہ کر دیا ہے۔ ورنہ غالب اور جوش کے اشعار سے رشدی کے ناہنجار شعار کی توجیہہ کی کوشش نہ کرتے۔ اس کی بجائے اگر وہ یہ غور کرتے کہ رشدی کی زنبیل میں کیا تھا، تو بہتر ہوتا۔ رشدی کے سیاہ اعمالنامہ اس کے سوا اور کوئی اہم چیز نہیں کہ اس نے آج کے آوارہ ذہن کو — استہزا کے راستے سہی — روح کی جانب موڑنے کی کوشش کی ہے۔ رشدی نے اپنے مخلصین کو شیطان کا خوگر بنا دیا ہے۔ ایک قدم اور آگے اور اللہ اور اس کے رسول کا اقرار دور نہیں ہے شیطانی سے کبھی دو قدم ہے۔

رشدی نے اس از خود رفتہ اور فراموشی گزیدہ دور میں، جس نے مغرب کو بالکلیہ اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، روحانی اقدار کے حوالے سے ایک معنوی تعلقِ خاطر کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ تعلق خاطر منفی ہی منفی ہے، شیطانی، مکارانہ، منکرانہ اور سراسر کاذبانہ — اور اس کا حاصل، دو کروڑ یہ ایک منفی انعام ہے۔ اگر وہ مثبت تعلقِ خاطر کا نمائندہ ہوتا تو انعام بھی اثباتی ہوتا — دائمی جنت الفردوس!

لیکن اسے کیا کہیے کہ خود رشدی ہی نے دوزخ کا سودا کیا ہے۔ پھر بھی درِ توبہ ابھی بند نہیں ہوا۔ رشدی کے لئے بھی نہیں۔

اگر رشدی کے انعام کی سند ان الفاظ میں ہو کہ "یہ انعام رشدی کو اس کی اسلام دشمن مساعی،

دیا گیا ہے" تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔ کم از کم یہ اعتراف حقیقت کا جھلک تو بن سکا ۔ لیکن مسند میں کوئی اور جواز دکھایا جائے تو یہ دوں ہمتی اور منافقت کے سوا اور کسی شئے کو ثابت نہ کر سکے گا ۔ اور سینکڑوں اور ہزاروں رشدی اپنا سر توڑ کوشش کرلیں تو بھی اپنے پیارے رسول کی اس مسند پر ہمارا ایمان متزلزل نہیں ہوسکتا کہ منافق کا مقام دوزخ کا اسفل ترین درجہ ہے جو کفار کے لئے مختص کردہ طبق سے بھی کہیں بدتر ۔

رشدی، عبداللہ بن ابی ہی کا رائج الوقت بیمانہ پر ایک عصری چربہ ہے اسی عبداللہ بن ابی کا بغض اور نفرت رکھنے کے باوجود اسلام کا جوا اپنے گلے میں لٹکائے رکھتا تھا ۔ بالائے زمین اس کی یہی سزا تھی ۔ رشدی بھی یہی سزا بھگت رہا ہے ۔ اور اب یہ رشدی کے بہی خواہوں کا کام ہے کہ وہ رشدی کے اس جوتے کو جوا نہ رہنے دیں ۔ عام مسلمان یا اکابرین اسلام کو کیا غرض کہ اس کے پکارے بغیر لبیک کہیں ؟

قرآن حکیم خدا کی آخری کتاب ہے اور آخر تک رہے گی ۔ اسکی تعلیمات "نیک صفات، اعلیٰ اخلاق، خوشگوار رویہ اور منصفانہ معاملات پر مشتمل ہیں جو روحانی فوز عظیم اور تسکین کی ضامن بھی ہیں اور مادی خوشحالی اور امن کی بھی ۔۔ یہ نسخہ آزمودہ ہے اور کارآمد بھی ۔ اس کے [illegible] اثرات کی خود تاریخ عالم گواہ ہے ۔ اصل بات یہ ھیکہ آج کی دنیا کے بیشتر علاقے مجاہدین کی تیغ آبدار کے زیر نگیں رہ چکے ہیں ۔ اور اب یہ علاقے اپنے کل تک کے فاتحین کی پگڑی اچھالنے کو آزادیٔ کردار سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ نہیں ۔ سارے قصہ کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے ۔

ایک بے جان بت کی طاقت بے شک اس کے پجاریوں کی فتح ظفر موج پر منحصر ہوتی ہے لیکن اللہ لم یزل کی طاقت کا یہ راز نہیں ۔ اسی لئے رسول اللہ کو خاص طور پر اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دوٹوک الفاظ میں اس بات کو واضح فرمادیں اگر کوئی اسلام قبول کرتا ہے تو خود اپنے فائدے کے لئے قبول کرتا ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے ۔

یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں ۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو ۔ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی ۔ بشرطیکہ تم اخلاص رکھتے ہو ۔ سورہ ۴۹ : ۱۷

[illegible] اور سچا شوق نہیں رکھتے انہیں توفیق بھی نہیں ملتی ۔

الانہ سوالات ، بسر و چشم بشرطیکہ وہ سچے خلوص سے موزوں انداز و الفاظ میں پوچھے جائیں ۔
نافرانہ تکبر، پوشیدہ تنفر، کلام کے الفاظ بیان کے سیاق و سباق سے جدا کر کے عمل جراحی ۔ یہ سارے
فعال سچے خلوص کی جگہ ایک معاندانہ جوش، قبل از وقت مخالفت بے سبب کے آئینہ دار ہو سکتے ہیں
دونوں قلمکار س ر (سلمان رشدی) اور رس (رام سروپ) ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ۔ ایک ایسی
کشتی کے جو بے پایاں بدخواہی اور اندھی نفرت کے بوجھ سے بوجھل ہے ۔ اسکا لکھا اس کی غرقابی!

سلسلہ صفحہ ۴

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر لیا ہے کہ میں نے اس کتاب کو نہیں پڑھا ۔ لیکن ... اس
...ب کو پڑھ کر اس کے اقتباسات پیش کر کے مسلمانوں نے جو اعتراضات کئے ہیں کہ
مسلم جذبات کو مجروح کرنے والی کتاب ہے " ایسے مضامین کو بغور پڑھا ہے اور سلمان رشدی
اس پر کوئی جواب نہیں آیا ہے اس کو بھی میں نے نوٹ کیا ہے ۔
ایسی حالت میں حکومت کا یہ اقدام قابل مذمت نہیں ہے ۔ بولنے اور لکھنے کی
...ادی تو ضرور ہونی چاہیئے مگر اس آزادی کے نام پر مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لئے
...کا استعمال نہ ہونا چاہیے ۔ اول الذکر تو بنیادی حق ہے ۔ ثانی الذکر اس بنیادی حق
...انتہائی غلط استعمال ہے ۔ اس لئے اس کتاب پر عائد کی جانے والی پابندی میری
...میں غلط نہیں ہے ۔

سلسلہ صفحہ ۲۶

کرنے کا عالمی برادری کے سامنے کھلے طور پر جوابدہی بین بین الاقوامی تنظیموں کا یہ حق شامل
ہے کہ وہ سوالات پوچھیں اور جب لوگوں کے حقوق سلب ہوں تو اس پر اپنی تشویش کا اظہار کریں ۔
ایمنسٹی انٹرنیشنل انسانی حقوق کے ان بین الاقوامی معیاروں کی بنیاد پر کام کرتی ہے جن کا
بین الاقوامی برادری نے اعلان کر رکھا ہے اگر کوئی ملک ان معیاروں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو
ایمنسٹی انٹرنیشنل نشانہ بننے والوں کا دفاع کرتی ہے ۔ ★★

چوراما سوامی

ایڈیٹر "تغلق" مدراس

"سیٹانک ورسیز" پر تبصرہ

جنوب کے مشہور ٹمل ہندو روزنامہ رسالہ "تغلق" مدراس کے حالیہ شمارہ میں اس کے ایڈیٹر مسٹر چوراما سوامی نے سلمان رشدی کی کتاب "سیٹانک ورسیز" پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے۔ قارئین کی افادیت کے لئے ہم اس کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

"تغلق" کے قاری مسٹر پرکاش ارکوتم نے سوال کیا تھا۔

سوال :- سلمان رشدی کی کتاب "سیٹانک ورسیز" پر حکومت ہند نے جو پابندی عائد کی ہے اس کے خلاف عالمانہ تنقیدی مضامین کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس مسئلہ پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :- تمام ناقدین کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ "اس کتاب کو وزیر اعظم نے پڑھا ہے اور نہ ہی دوسرے حکام نے۔ کتاب کو پڑھے بغیر اندھا دھند پابندی عائد کی گئی ہے۔ بعض مسلم بنیاد پرستوں کی دھمکیوں سے دب کر اور ان کے اعتراضات کو قبول کر کے مرکزی حکومت نے یہ اقدام اُٹھایا ہے۔ اس پابندی کو مذکورہ بالا بنیاد پر غلط قرار دیا جا رہا ہے۔

مگر انہوں نے اس کتاب کو پڑھے بغیر پابندی عائد کی ہے یہ بالکل درست ہے بلکہ اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ ناقدین بھی کتاب کو پڑھے بغیر ہنگامہ مچا رہے ہیں۔

کتاب کے مصنف سلمان رشدی نے اپنے دفاع میں یہ بات کہی ہے کہ "مذہب اسلام کی تضحیک اور محمدؐ کی توہین میرا مقصد نہیں ہے" لیکن اسلام کے ماننے والوں میں سے بعض نے اس کتاب کو دیکھ کر اس کے اقتباسات پر جو سوالات اٹھائے ہیں اس کا کوئی جواب سلمان رشدی نے اب تک نہیں دیا ہے۔

میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے۔ تاہم میں نے مسلمانوں کے ایسے مضامین پڑھے ہیں جس میں کتاب کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ "یہ مذہب اسلام کی تضحیک اور نبی کریمؐ کی توہین ہے۔ ایسے تمام مضامین کے تعلق سے سلمان رشدی کا کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

یہ تو ہوا مسئلہ کا ایک بنیادی رُخ مگر میرے ذہن میں ایک دوسری بات آرہی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے جذبات کو کونسی باتیں مجروح کرتی ہیں اور کونسی نہیں۔ اس کا فیصلہ کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔ اس مذہب کو ماننے والے یا غیر مذاہب کو ماننے والے؟

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس پابندی کے خلاف ہنگامہ مچانے والوں میں کثیر تعداد ہندو مذہب کے ماننے والوں کی ہے اور اسی طرح مغرب میں ابھی تک جن لوگوں نے آواز اٹھائی ہے وہ سب کے سب عیسائی مذہب کے ماننے والے ہیں۔

ایک "تخیلاتی ناول" کے نام پر ایک کتاب آتی ہے جس میں اسلامی عقائد و روایات کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ کہانی کے جو کردار پیش کئے جاتے ہیں ان سب کے نام مسلمانوں کی مذہبی شخصیات سے مماثل ہیں تو ایسی صورت میں دیگر مذاہب کو ماننے والوں کا یہ فیصلہ دینا کہ "یہ ایک تخیلاتی ناول ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ میرے لیے ناقابلِ فہم ہے میں اس موقف کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں

آیئے ہم ایک دوسری صورت حال کو فرض کرلیں۔ کل " ایک تخیلاتی ناول" کے نام سے ایک کتاب آتی ہے یا آئے۔ اور اس کا لکھنے والا ایک ہندو ہو۔ اس ناول میں کردار و واقعات سب "راماین" کے کردار اور شخصیات سے مماثل ہوں ان کرداروں کا مذاق اُڑایا جائے طنز و تعریض کی جائے۔ ایسی صورت میں بعض ہندو بھائی اٹھیں اور اعتراض کریں کہ یہ ہمارے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والی کتاب ہے۔ اس کے مقابلہ میں بعض مسلمان بھائی یہ فیصلہ دیں کہ "صاحب یہ تو ایک تخیلاتی ناول ہے اس سے ہندو بھائیوں کے جذبات کو مجروح ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" تو کیا آپ کی نظر میں یہ صحیح فیصلہ ہوگا؟ آپ کہیں گے کہ نہیں! تو اسی طرح میں کہوں گا کہ آپ کا یہ رویہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

ہندوستان مذہبی اختلافات اور کشمکش کی آماجگاہ ہے یہاں کی سب سے بڑی اقلیت کے اعتراضات کو نظر انداز کرکے اس کتاب کی فروغ اور تقسیم کی مکمل آزادی حکومت دے تو کیا اس اقدام سے بھلائی متوقع ہو سکتی ہے؟

باقی صفحہ (۴۲) پر

سید یوسف ایڈیٹر ریڈینس / ڈاکٹر سید معین الدین قادری

رشدی ، ارون شوری اور قرآن

سلمان رشدی کے ناول "شیطانی کلمات" میں جس شیطانیت کا ثبوت دیا گیا ہے اس کے خلاف شدید عالمی رد عمل ظاہر ہو چکا ہے ۔ چنانچہ کتنے ہی ممالک میں اس کی فروخت پر امتناع ہو چکا ہے اور ہماری حکومت نے بھی اس پر امتناع عائد کیا ہے جو لائق تحسین قدم ہے ۔

مسٹر ارون شورے (انڈین ایکسپریس) جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں انھوں نے سلمان رشدی کے ناول پر حکومتی امتناع کے تناظر میں انڈین ایکسپریس میں ایک مضمون " تو پھر قرآن کی آیات سے متعلق کیا خیال ہے ؟ " کے زیر عنوان سپرد قلم کیا ہے جس میں ہندوستان اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں ۔ مسٹر ارون شورے نے مفسدانہ حرکات اور بدنیتی کے ساتھ اہانت آمیز الفاظ قرآن شریف اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف استعمال کئے ہیں ۔ اور اپنے اس مضمون کے ذریعہ نفرت پھیلانے کی مذموم حرکت کی ہے جو ایک ناروا جسارت ہے ۔ مذہبی جذبات کو بھڑکانے ، نفرت ، عناد ، دشمنی اور لاقانونیت کی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ملک کے امن و امان یکجہتی اور مذہبی رواداری کو درہم برہم کرنے والی کوشش ہے ۔ جو تعزیرات ہند اور قومی سلامتی کے قوانین کی بھی مغائر ہے جس پر ان کے خلاف تعزیراتی کارروائی ہونا چاہیئے ۔ ارون شورے کے اس فتنہ انگیز اور نفرت آمیز مضمون کا جواب جناب سید یوسف صاحب ایڈیٹر ریڈینس ویکلی نے سپرد قلم کیا ہے جو انڈین ایکسپریس کی ۲۲/ اکتوبر ۸۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے ۔ اس کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے ۔ اس سے بہت کچھ ارون شورے کے نفرت انگیز طرز عمل کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ (ادارہ)

انڈین ایکسپریس کی ۱۹/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں ایک مشہور صحافی کا مضمون بہ عنوان ۔

تو پھر قرآن کی آیات سے متعلق کیا خیال ہے؟ استفہامیہ انداز میں شائع ہوا ہے، مقالہ نگار نے آیات قرآنی کو متن سے علیحدہ کرکے بے ربط انداز میں پیش کیا ہے تاکہ اپنی من مانی تاویلات سے ایسا مفہوم پیدا ہو جائے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو دین اسلام سے نفرت پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کے خلاف ان کے غم و غصہ کے جذبات ابھر آئیں۔ آزادیٔ صحافت کے نام پر لوگوں کو حقائق سے گمراہ کرکے اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کی اس منصوبہ بند مہم کے احساس سے طبیعت میں بڑا انقباض پیدا ہوا اور جس نے بھی یہ مضمون پڑھا اس کے جذبات کو شدید ٹھیس لگی جہاں تک کہ بائبل مقدس کی غلط ترجمانی کا تعلق ہے اس سلسلہ میں جوابدہی کی ذمہ داری عیسائی علماء پر عائد ہوتی ہے البتہ قرآنی آیات و تعلیمات کو جس طرح توڑ مروڑ کے بے ربط پیش کیا گیا ہے اس کا منہ توڑ جواب دینا بحیثیت مسلمان کے میرے فرائض میں ہے اس مضمون کا بین السطور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بالعموم اسلام کی روحانی و اخلاقی تعلیمات پر ایسے دل آزار و رکیک حملے کسی سوچی سمجھی معاندانہ تحریک کی کڑی ہیں۔ جن کا مقصد ہندوستان میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین منافرت پیدا کرنا اور مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنا ہے، ان بدنہاد راشٹروادیوں کی ان مذموم کوششوں میں فرقہ وارانہ کشیدگیوں میں اور اضافہ ہی ہوگا۔ اور اس سے بالآخر قومی اتحاد کو بڑا دھکا لگے گا۔

مقالہ نگار نے جنگ و جدال کے قرآنی تصور کو کچھ اس شکل میں پیش کیا ہے گویا قرآن کا مقصود بالآخر یہی ہے: تمام غیر مسلموں کو تہ تیغ کر دیا جائے تاکہ وہ خوف و پریشانی میں مبتلا ہو کر اسلام قبول کر لیں۔ اس سے وہ قارئین میں تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے اعلیٰ دینی مقام حاصل کرنے کے لیے جنگ و جدال اور قتل و غارت گری بھی ایک فریضہ ہے بلکہ وہ تو یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ اللہ نے مسلمانوں سے پہلے ہی معاہدہ طے کر لیا ہے کہ وہ اس کی راہ میں ہمیشہ جہاد کے لیے تیار رہیں گے۔ قتل کریں گے اور کیے جائیں گے۔ اور کافروں کو خود اسی نے اس لیے گمراہ رکھا کہ وہ راہ راست پر نہ آئیں تو قتل کر دیے جائیں۔

لیکن قرآن نے کبھی بھی قتل عام کی تلقین نہیں کی! قرآن نے کہیں بھی غیر مسلموں کے خون ناحق کو روا نہیں رکھا ہے مسلمانوں کو صرف اپنی مدافعت میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ مختلف آیات میں اس کی صراحت کر دی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے اس وقت قتال کریں جب کہ وہ ان پر حملہ آور ہوں اور ان سے برسرپیکار ہوں۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے سازشوں میں ملوث پائے جائیں،

یا کھلے عام علم بغاوت بلند کریں۔ قرآن نے جہاں بھی قتال کا حکم دیا ہے وہاں اپنے فلسفہ جہاد کو واضح طور پر پیش کر دیا ہے کہ جنگ صرف اللہ کے لئے ہو اسلام کی مدافعت اور مسلمانوں کی عافیت کے لئے ہو اور اس میں اس نے ذاتی اغراض، مادی منفعتیں یا غلبہ تسلط کے محرکات کو روا ہی نہیں رکھا۔ قرآن نے جنگ کا ایک مکمل ضابطہ اخلاق بھی دیا ہے۔ جس کی رو سے معصوم بچوں کمزور عورتوں اور اللہ والے راہبوں، رشیوں، منیوں پر دست درازی سے سختی سے روکا گیا ہے اور اسی طرح کے قتل عام کو بہیمیت و گناہ سے تعبیر کیا ہے بلکہ اس نے تو جنگ میں جانوروں ہرے بھرے درختوں اور کھیتوں کو اجاڑنے سے بھی روکا ہے اس کے تصور جہاد میں رحم و انصاف کی تلقین کی گئی ہے اور دشمن صلح جوئی کرے تو فوراً تلوار نیام میں کر لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مقالہ نگار کہتے ہیں کہ قرآن قتل عام کو کار خیر قرار دیتا ہے، یہ بین تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا، قرآن کا پیام تو یہی ہے، اللہ کا دین ساری انسانیت کے لئے ہے وہ اس کو تسلیم کریں اور اپنی مرضی اس کی تعلیمات کے مطابق ڈھالیں اور شکر گذار بندوں کی طرح امن و آشتی سے آپس میں زندگی گذاریں۔ اس پیام کا مقصود اصلی تو یہ ہے کہ تمام انسان ایک کنبہ کی طرح باہمی تعاون، اور بھائی چارگی کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اس خوشگوار سماجی زندگی میں ظلم و زیادتی اور زور و زبردستی کو قطعاً روا نہ رکھیں۔ قرآن نے دین حق کو انسانیت تک پہونچا دیا۔ اب لوگوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس کو قبول کریں یا رد کر دیں اور اپنی آبائی روایات کو تھامے رہیں۔ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ بہر صورت جائز نہیں کہ جبر و تشدد دین کی اسپرٹ کے منافی ہے۔ یہ آزادی سب ہی کو حاصل ہے کہ وہ انتہائی نرمی، خوش اسلوبی اور پورے خلوص و نیک نیتی سے دین کا پیام اپنے سب بھائیوں تک پہنچا دیں اور بس۔

قرآن کی ان تعلیمات کی روشنی میں مقالہ نگار کی نگارشات کا مطالعہ کیجئے، تو یہ بڑی علمی بددیانتی نظر آتی ہے کہ موصوف فکری آزادی کا سہارا لیکر جدال و قتال کی ان آیتوں کو جو بہ زمانہ جنگ نازل ہوئی تھیں ان کے اساسی پس منظر سے ہٹا کر اور اس کو غلط معنی پہنا کر شرارتاً اس طرح پیش کیا ہے کہ قارئین کو اسلام کا فلسفہ جہاد ایسا محسوس ہو کہ گویا قرآن فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کا داعی ہے یہ اسلام کے خلاف شر انگیزی نہیں تو اور کیا ہے؟

جنہوں نے بہ نظر غائر مسلمانوں کی ملی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ، ہجرت سے

پہلے مسلمانوں پر کفارِ مکہ کے ظلم و زیادتی کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور ان کو شعب ابی طالب میں محصور رکھ کر غذا پانی تک روک دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن نے ان کے خلاف مدافعانہ جنگ کے لیے ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی اور ان تمام زیادتیوں کا صبر و تحمل کے ساتھ جواب دینے کی تلقین کی گئی لیکن مسلمان اپنے دین پر جمے رہے اور کفار کی ان ساری زیادتیوں کا ہنسا اور ظلم و تشدد کے ذریعہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور حق پر ڈٹے رہے۔ جب ان ظالموں کی آتشِ غضب اس سے بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تو انھوں نے پیغمبر اسلامؐ ہی کو قتل کر ڈالنے کا منصوبہ تیار کیا اور سارے قبیلے اس سازش میں ملوث ہو گئے ان حالات میں اللہ نے ہجرت کا حکم دیا۔ جب مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے وہاں سے کلمۂ حق کی تبلیغ کرنے لگے۔ تو ان کو اور آگ لگی انھوں نے مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے مدینہ پر چڑھائی کر کے ان کا قتلِ عام کر کے باقی ماندہ کو پھر شدھی کرنے کی ٹھانی جب مکہ کے بت پرستوں کا ظلم کم ہونے کے بجائے حد سے زیادتی کی طرف بڑھنے لگا تو اس سے مسلمانوں کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا۔ اور اللہ نے ان کو اپنی مدافعت اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے بزورِ شمشیر ان کا مقابلہ کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ سورۃ البقرہ کی (۱۹۰) ویں آیت میں جب جنگ کی اجازت مرحمت فرمائی گئی تو جنگ میں بھی ظلم و زیادتی کے حد سے تجاوز کر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اس لیے کہ قتل و خونریزی اور ظلم و زیادتی اسلام کی روح کے منافی اور اس کی تعلیمات کے مغائر ہیں۔ آیت یہ ہے وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۱۹۰-۲) ..... فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۹۲-۲)

ترجمہ:- اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی کو روا نہ رکھو کیوں کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا مقابلہ پیش آئے اور انہیں بھی وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اس لیے کہ قتل اگرچہ کہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے ..... پھر اگر وہ باز آجائیں تو (تم بھی) اپنے ہاتھ روک لو) اور جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور بڑا رحم فرمانے والا ہے،، مضمون نگار نے تو اس آیت کا توحوالہ دیا مگر اللہ کے رحم و کرم اور مسلمانوں کو صلح جوئی کی تاکیدات کو چھپا کر۔ اس تناظر پر پردہ ڈال کر صرف قتال اور جہاد کو پیش کیا جائے تو بربریت اور خونریزی کے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

موقعوں پر فنکاری سے ایسے ہی وحشیانہ قتل و خون کا نقشہ پیش کر ڈالا ہے تھا۔ قرآن کے متشدد
وہ ایسے لیے چنے تھے جہاں آپ حق سے ہٹا کر کسی طرح آیات قرآن کا غلط مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے انہوں
نے سورۂ محمد ۴۷ کی آیات ۴، ۵ کو پیش کیا ہے۔ ان کو مجرداً دیکھئے تو بظاہر بڑے سخت احکام
ہوتے ہیں لیکن ایک قومی دشمن کی مسلسل جارحانہ کارروائیوں کو روکنے کے لیے مسلمانوں کی مٹھی بھر
جماعت کو گھمسان کی لڑائی میں ایسے جان فروشی اور شجاعت و شہادت کے مظاہرے کے احکام نہ
دیئے جائیں تو پھر مدافعت کیسے ہوگی، اور ظلم کی کلائی کیسے موڑی جائے گی۔ سورۂ محمد کی آیت کو سورۂ
بقرہ کی آیات ۱۹۰، ۱۹۱ سے ملا کر پڑھئے تو اس سے اسلام کا فلسفہ جہاد واضح طور پر نظروں کے سامنے
آجائے گا۔

سورۂ انفال کی آیت ۳۹ میں جنگ کے لیے مسلمانوں کو یہی ہدایت دی گئی ہے۔ شورش و سازش
اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے خلاف سختی سے قتال کرو یہاں تک کہ پھر فتنہ و فساد
کا خاتمہ ہو جائے اور اللہ کا دین اور اس کا حکم مضبوطی سے زمین پر قائم ہو جائے اگر وہ ظلم و زیادتی
فتنہ و فساد سے باز آجائیں تو پھر معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دو وہ ان کے کرتوتوں سے باخبر ہے۔ اگر وہ
صلح و صفائی کی باتوں کو ٹال جائیں تو یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نصرت و حفاظت کے لیے بہت کافی ہے
ان آیات کا متن یہ ہے۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ (انفال ۸: ۳۹-۴۰) اپنے مفہوم کی پوری وضاحت کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے
سورۂ حج کی ۳۸، ۴۰ ویں آیت کی صراحت کی جائے۔ ان آیات کا متن یہ ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج ۳۸-۴۰)

ترجمہ: اللہ بالیقین دفع کر دے گا دشمنوں کو ایمان والوں کے ذریعہ اللہ دغا باز ناشکرے لوگوں کو
نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں چونکہ وہ مظلوم ہیں اس لیے ان کو بھی (اپنی مدافعت کے لیے)

جنگ کا اذن دیا گیا اور بے شک اللہ ان (مظلوموں) کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے جنھیں ناحق بغیر کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہوئے اللہ کو اپنا رب پکارتے تھے۔ ناحق ان کو اپنے وطن سے خارج کر دیا گیا۔ اگر اللہ ایک (گروہ) کو دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹایا کرتا تو گرجے، مدرسے، عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے تسبیح و تہلیل کا ورد ہوتا رہتا ہے وہ سب ڈھا دیے اور مسمار کر دیے جاتے جو اللہ کے دین میں ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں۔ بالیقین اللہ بھی ہمیشہ ان کی پشت پر ہوتا اس میں کوئی شک ہی نہیں اللہ زبردست اور زور والا ہے۔

یہ وہ آیت ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کو بت پرست کفار اور منافقین سے اپنی جان اور دین کی مدافعت کے لیے پہلی مرتبہ قتال اور جنگ کرنے کی اجازت عطا کی گئی۔ مقالہ نگار نے جہاد اور قتال کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس اہم اور بنیادی آیت کا حوالہ تک نہیں دیا۔ یہ تجاہل عارفانہ موصوف کی نیت اور غایت کا غماز ہے اور انھوں نے ان حقائق و واقعات سے بھی صرف نظر کر لیا کہ مکی زندگی میں پیغمبر اسلام اور ان کی جماعت نے کفار مکہ کی حد سے بڑھی ہوئی زیادتیوں کا جسمانی اور روحانی قسم کے عدم تشدد کے ذریعہ کس طرح پامردی اور صبر و تحمل سے مقابلہ کیا اور اپنے مشن کو مسلسل آگے بڑھایا۔ اس طرح مقالہ نگار نے قرآن کی آیات ۴: ۳/۲، ۹/۱۱۱، ۹/۱۲۳ اور ۵/۳۳، ۲/۱۹۲ استعمال کر کے ان کی غلط تاویلات کے ذریعہ انھیں غلط مفہوم کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ہم سورۃ المائدہ کی صرف آیت کا ذیل میں متن پیش کرتے ہیں جس کے مطالعہ سے موصوف کی غلط تاویلات کے ذریعہ معلومات آفرینی کا اندازہ ہو جائے گا۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ:- وہ لوگ جو اللہ اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا مخالف سمتوں سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں۔ یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی کی سزائیں تو ان کے لیے دنیا میں ہیں اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ دردناک ہے۔

یہ آیت نازل ہوئی ان منافقین کے سلسلے میں جو مدینہ کے شہری معاملات سے بدعہدی کر رہے تھے، مثلاً

منصوبہ بنا رہے تھے اور بغاوت و سرکشی پر اتر آئے تھے لیکن آج بھی ایسے جرائم کے لیے ہر متمدن ملک میں ایسی ہی سخت سزائیں ہیں۔

سورہ نساء کی ۸۹ ویں آیت مشرکین و کفار سے متعلق نہیں ہے بلکہ منافقین سے متعلق ہے۔ اللہ نے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں سے جو مار آستین ہوتے ہیں ہمیشہ چوکنا رہیں اور جب ان کا نفاق ظاہر ہو جائے تو ان کے معاملے میں اغماض نہ کرتے رہ جائیں بلکہ ان کا سختی سے مواخذہ کریں اور سخت سزاؤں کے ذریعہ ان کا تدارک کریں۔ نساء کی ۱۳۷ ویں آیت سے جو منافقین سے ہی متعلق ہے۔ اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑے گی اس آیت کا متن یہ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لِیَہْدِیَہُمْ سَبِیْلًا۔

ترجمہ:- ایسے لوگ جنہوں نے ایمان کا اعلان کیا، پھر کفر کی راہ اختیار کی پھر ایمان لائے پھر کفر کیا اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اللہ ایسوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا اور چونکہ وہ کفر کی راہ پر لوٹ گئے ہیں اس لیے کبھی ان کو راہ راست نہیں دکھائے گا۔

المائدہ کی ۴۱ ویں آیت بھی منافقین سے متعلق خواہ وہ اسلام کے منافق ہوں یا یہود ہوں، سچے
یٰاَیُّہَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاہِہِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُہُمْ ۔۔۔ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

ان تمام آیات کا تعلق منافقین سے ہے جن کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے دین کی اجراء اس کی تحریک کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ دین کے قیام و استحکام کے لیے ضروری تھا کہ ان کا تدارک کرنا اور [illegible] ضروری تھا۔ سخت سزائیں اسی مقصد کے حصول کے لیے [illegible] گئی تھیں۔

سورہ انفال کی ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں آیات شیطان اور رحمان کے مابین مقابلہ کو پیش کرتی ہیں۔ جہاد اور قتال سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ مقالہ نگار نے سورہ احزاب کی ۳۶ ویں آیت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے باہمی تنازعات سے متعلق ہے۔ اس آیت نے مسائل کو حل کر دیا اور اس کے بعد سکون ہو گیا۔ بات بس اتنی سی تھی لیکن شوری صاحب ان آیات میں بھی غلط مفہوم [illegible] شیطانیت سے باز نہیں آتے مسٹر شوری! آپ تو آیات قرآنی کی تحریف کرکے [illegible] انتہا کر دی! ایک محقق اور دیانت دار ریسرچ اسکالر کا یہ کام نہیں ہوتا کہ۔

وہ ایک ماہر عیار ہونے کے باوجود ادھر ادھر سے مختلف ٹکڑے جمع کر ایک مسودہ ایسا تیار کرتے جس میں اپنی عیارت کا مظاہرہ کرے۔

رشدی کی کتاب پر امتناع سے متعلق شوری صاحب کے مضمون کا اختتام بھی خوب ہے! اس شیطانی ناول کے خلاف احتجاج کرکے اس پر امتناع عائد کرنے والوں کو سمجھاتے ہوئے دوسرے فرقوں خصوصاً ہندوؤں کو اکسایا ہے۔ اگر مسلمانوں کا احتجاج مذہبی دل آزاری کے مسئلہ پر ہے تو وہ بھی آگے بڑھیں اور قرآن کی ان آیات کے خلاف احتجاج کرکے ان کو "الکتاب" سے حذف کرانے کی کوشش کریں کیونکہ ان سے دوسرے مذہب والوں کی توہین بھی ہوتی ہے۔ اور بعض فرقوں مثلاً عیسائیوں اور یہودیوں کے جذبات کو شدید ٹھیس بھی لگتی ہے۔ موصوف کے اختتامیہ مضمون "پھر گرہات قرآنی" سے متعلق یہی کہا گیا کا بالا فر مطالبہ یہی ہے کہ پورے قرآن کو "ممنوع" قرار نہیں دیا جا سکتا تو کم از کم شوری صاحب کی نشان زدہ آیتوں کو قرآن کے متن سے نکال کر ان کو منسوخ قرار دیا جائے۔ کیا فراست کا مظاہرہ کیا ہے! گویا شوری صاحب کے مضمون کی تان اسی پر ٹوٹی ہے کہ قرآن پر امتناع عائد کیا جانا چاہئے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

مسٹر شوری حکومت کے حکم امتناع پر بڑی حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ محض کسی فرقہ کے جذبات کو ٹھیس لگنے کے بہانے کسی کتاب پر امتناع عائد کرنے کے کیا معنیٰ ہیں! ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگوں کو سمجھایا جائے اور کتاب کے مختلف مباحث و مضامین پر غور و فکر اور بحث و مباحث کے بعد لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ بجائے ایسا شائستہ طریقہ اختیار کرنے کے امتناع کا غیر جمہوری طریقہ کیوں اپنایا گیا؟ اس سلسلہ میں اگر میں مسٹر شوری کی توجہ ڈاکٹر امبیڈکر آنجہانی کی کتاب "ہندو مت کی پہیلیاں" (RIDDLES OF HINDUISM) کی طرف مبذول کراؤں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کا رد عمل رہا وہ آپ بنگلور کے دکن "ہیرالڈ" کے ایڈیٹر اور مالک مسٹر گونکا سے ضرور دریافت فرمائیں۔

پونہ ضلع
اردو پرائمری تعلیمی سیمینار

شہر پونہ میں تعلیمی میدان میں مختلف سطحوں پر کام کرنے والی فعال تنظیم والدین (پلک) اردو مدارس پونہ نے پونہ ضلع پریشد، پونہ میونسپل کارپوریشن اور مہاراشٹرا اسٹیٹ ٹ بک بیورو کے تعاون سے کل پونہ ضلع سطح پر اردو پرائمری اساتذہ کے لئے بتاریخ ۲۸ دسمبر ظیم الشان تعلیمی سیمینار کا انعقاد کیا۔ جس میں تقریباً پانچ سو معلمین و معلمات نے اور بانی ل و کالج اساتذہ اور تعلیمی میدان سے دلچسپی رکھنے والے لاتعداد اردو دوست حضرات رکت کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر ایم۔ ایچ پمپل کھرے (سابق جوائنٹ ڈائرکٹر) نکش راؤ کا کڑے (میئر پونہ)، شری وی۔ جی مہاڈک (ایم پی)، شیوا جی راؤ ڈھیرا (کلکٹر پونہ)، شری بھائی ویدیہ، جناب ایس این کوتوال (وائس پرنسپل پونہ کالج)۔ بے ڈی پانڈھری پانڈے (اے او، پونہ میونسپل کارپوریشن) کے علاوہ ضلع پریشد اور اداروں کے سربراہاں شریک تھے۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عصمت جاوید، مسز نورالعین علی، بشیر انصاری، پرنسپل فاروقی، امیر رحمان اور اسحٰق کی خیز قابل ذکر ہیں۔ ان مقالوں میں نئی تعلیمی پالیسی، بلیک بورڈ، ریاستی نصاب کا جائزہ اور موثر تدریس کے اقدامات وغیرہ پر سیر حاصل ۔ تقریباً ۹ گھنٹے کے اس طویل اجلاس کے بعد مندرجہ ذیل نہایت اہم تجاویز اتفاق رائے منظور کی گئیں

تجاویز

نئی تعلیمی پالیسی کے Action plan میں صفحہ ۱۱۶ اور ۱۱۷ پر اقلیتی گروہوں کے لئے سفارشیں کی گئی ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے کیا گیا ہے کہ ان پر عمل آوری ریاستی حکومت کا فرض ہے

سیمینار کے شرکا یہ پر زور سفارش کرتے ہیں کہ ان پر جلد از جلد عمل ہو۔

۲۔ سیمینار اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ SCERT سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آپریشن بلیک بورڈ جو کہ [illegible] اردو میڈیم تک عمل میں نہیں لایا گیا (مرکزی حکومت کی ہدایت کے باوجود) عمل میں لائے اس کے تحت اردو اسکولوں میں پائی جانے والی کمی کو فوراً دور کیا جائے۔

۳۔ ٹیکسٹ بک بیورو سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کم از کم جماعت ششم کے Title cover کو فوراً تبدیل کر دے کیونکہ اس میں دو فرقوں کی جنگ دکھائی گئی ہے۔ یہ دس بنیادی اجزاء - core curriculum کے خلاف ہے۔

۴۔ ریاستی سطح پر ایک اقلیتی تعلیمی بورڈ یا [illegible] قائم کیا جائے جو یہ نگراں کرے کہ کیا حکومت سے اردو مدارس فیضیاب ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اور ان تک اس کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں یا نہیں۔

۵۔ یہ سیمینار مطالبہ کرتا ہے کہ دس بنیادی اجزاء کے متعلق اردو میں بھی لٹریچر فراہم کرے۔

۶۔ وزیر اعظم کے ۱۵ نکاتی پروگرام سے اردو مدارس کو مستفیض کرنا ضروری ہے اقلیتی کمیشن اس کی جانچ کرے۔

۷۔ پونہ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ Open University میں اردو کو بحیثیت مضمون کے شامل کیا جائے۔

۸۔ ضلع پریشد ڈویژن میں اردو اسکولوں کے لئے اردو انسپکٹر کا تقرر کیا جائے۔

۹۔ گورنمنٹ بورڈ اور دیگر مدارس میں اردو اساتذہ کا تبادلہ مراٹھی اسکول میں نہ کیا جائے اور نہ ہی مراٹھی اساتذہ کا اردو اسکولوں میں تبادلہ ہو۔

مہمانوں کا تعارف تنظیم والدین کے صدر جناب عبدالکریم عطار نے کروایا۔ پروگرام کی وضاحت، اور تنظیم کی روداد تنظیم کے سکریٹری شیخ اسحٰق شرف الدین صاحب نے پیش کی۔ مہمانوں مندوبین کا استقبال استقبالیہ کمیٹی کے چیرمن ابرار خان صاحب نے کیا۔ نظامت کے فرائض افسر امین صاحب نے انجام دیئے اور شکریہ انیس چشتی صاحب نے ادا کیا۔

دیہی قرضوں میں نرمی کی ضرورت

۱۹۸۱ میں سے ۱۹۸۲ تک اتفاقی دیہی بینکوں میں ۶۰ کروڑ روپے کے خسارے کی رپورٹ سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ دیہی شعبہ ایک ایسا گڑھا ہے جس میں جتنی رقم ڈالیں گے اتنا ہی نقصان ہے۔ یہ تاثر غلط ہے کیونکہ دیہی کاروبار میں خسارے کو دیگر مالی کاموں کی طرح نہیں آنکا جا سکتا۔ حالیہ بجٹ میں وزیر خزانہ کے ذریعے اعلان کردہ دیہی قرضوں سے متعلق رعایتوں کو اسی جذبے سے دیکھا جانا چاہیے۔

درحقیقت زراعت اور دیہی ترقی کا قومی بینک (این۔ اے۔ بی۔ اے۔ آر۔ ڈی) اور دیگر مخصوص ادارے کسانوں کے قرض کی ضروریات کو پوری طرح تکمیل نہیں کرتے۔ ہرچند کہ قومی آمدنی کا ایک تہائی حصہ زراعت سے حاصل ہوتا ہے لیکن بینکوں کے کل قرضوں میں اس شعبے کا حصہ صرف ۱۷ فیصد ہے۔ وہ تجارت اور بڑی صنعتیں قرض دی جانے والی رقم کا ۳۶ فیصد حاصل کرتی ہیں جبکہ قومی آمدنی میں ان کا حصہ ۲۰ فیصد سے کم ہے۔

مذکورہ بینک نچلی سطح کے اداروں کو دوبارہ رقم دینے کی سہولیات فراہم کر رہا ہے تاکہ زراعت اور دیہی شعبے کو قرضوں کی فراہمی کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔

طویل مدتی ڈھانچہ دیگر بینکوں کی طرح عوام سے رقم جمع نہیں کر پاتا اس لئے یہ مذکورہ بینک کے ذریعے دوبارہ فراہم کی گئی رقم، قرضوں اور اپنے خود کے وسائل پر منحصر رہتا ہے۔ کم مدتی ڈھانچہ ریاستی سطح پر امداد باہمی کے ریاستی بینکوں، ضلع کی سطح پر ضلع کے مرکزی امداد باہمی بینکوں اور دیہاتوں کی سطح پر ابتدائی قرضے سے متعلق امداد باہمی سوسائٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن ان سوسائٹیوں [illegible] اور ان کے ذریعے دی گئی رقم قرض لی گئی رقم پر مشتمل [illegible]

ریزرو بینک آف انڈیا نے سود کی شرحوں کا ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت قرض حاصل کرنے والے کو مقرر کردہ شرح سود پر ہی قرض کی رقم قرض دینے والے ادارے سے ملے گی ۔ قرضوں کی شرحوں میں یکسانیت کی غرض سے سود کی یہ شرحیں قرض دینے والی ایجنسیوں کے درمیان تفریق نہیں برتتیں

طویل مدتی قرضے کے ڈھانچے کے لئے زراعت اور دیہی ترقی کا بینک [illegible] سرگرمیوں کے لئے ۵ء۶ فیصد سود کی شرح پر دوبارہ رقم فراہم کرتا ہے ۔ قرضدار سے سود کی شرح دس فیصد لی جاتی ہے اور بقیہ ۳ء۵ فیصد رقم زمینی ترقیاتی بینکوں کے لئے بچ جاتی ہے ۔ ان بینکوں کو مہیا کے لئے تجارتی بینکوں اور علاقائی دیہی بینکوں کے لئے دوبارہ رقم فراہم کرنے کا ہے ۔ یہ فیصد ہے لیکن زیادہ تر زمینی ترقیاتی بینک ۳ء۵ فیصد شرح کے باوجود زیادہ قرضوں اور کم تجارت کا شکار ہیں ۔ قرضوں کی واپسی کے لئے مناسب ترغیبات سے وصولیابی کی کارکردگی میں بہتری لائی جا سکتی ہے ۔ اور ان قرضوں کی تعداد کو بھی کم کیا جا سکتا ہے جن کی واپسی کسی وجہ سے رکی ہوئی ہے ۔ اگر قرض کی واپسی کے لئے قرضدار کے گھر جایا جائے تو قرض کی واپسی میں یقیناً بہتری آسکتی ہے اس وقت قرض واپس لینے والی ٹیمیں گاؤوں میں ایک خصوصی مہم کے طور پر جاتی ہیں نہ کہ مستقل بنیادوں پر ۔ قرضے کی بروقت واپسی کے لئے بعض ترغیبات دینے اور قرضدار کے گھروں میں جاکر قسطیں لینے سے قرض کی واپسی کے ماحول میں بہتری آسکتی ہے ۔

لیکن ان دونوں ہی تجاویز کی کچھ مالی پیچیدگیاں بھی ہیں ۔ لہٰذا چھوٹے پیمانے کی آبپاشی جیسی بعض منتخب سرگرمیوں کے لئے مذکورہ بینک کے ذریعہ دوبارہ رقم زمینی ترقی کے بینکوں کو پانچ فیصد کی شرح سود پر فراہم کی جا سکتی ہے ۔ ۵ء۱ فیصد کی فاضل شرح سے یہ بینک بروقت ادائیگی کے لئے ایک فیصد کی شرح ترغیب کے طور پر دے سکیں گے ۔ اس سے ان کی وصولیابی میں بہتری آئے گی اور یہ بینک رقم کی واپسی میں بہتری کے لئے گھروں پر جانے کے لئے عملہ تعینات کر سکیں گے ۔

کم مدتی ڈھانچے میں اس بینک کے ذریعہ دوبارہ رقم کی فراہمی ریاستی کمرشیل بینکوں [illegible] بینکوں اور پی اے سی ایس کے ذریعہ ہوتی ہے ۔ اس وقت ریزرو بینک آف انڈیا چھ فیصد کی شرح سود پر قرضوں کی فراہمی کرتا ہے اور یہ ریاستی کمرشیل بینکوں کو سات فیصد شرح سود پر دیا جاتا ہے ۔ زراعت اور دیہی ترقی کی قومی بینک کو جو شرح ملتی ہے وہ اس کے کام کا [illegible] ہوتا ہے ۔ یہ ضروری ہے کہ علاقائی دیہی بینکوں کو کوآپریٹو بینکوں کے برابر سستی رقوم فراہم

کی جائیں۔ علاقائی دیہی بینک زیادہ تر چھوٹے کسانوں کو قرضے دیتے ہیں جن پر سود کی شرح کم ہوتی ہے اور بینک پر بوجھ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی جگہوں پر ان بینکوں کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور ان پر آنے والا صرف نسبتاً کم ہوتا ہے۔ علاقائی دیہی بینکوں کو زراعت اور دیہی ترقی کے قومی بینک کے ذریعہ دوبارہ رقم سستی شرح پر ملنی چاہئے اور ایک فیصد تک فوری ادائیگی کے لئے ترغیب ملنی چاہئے۔

عملی طور پر یہ دشوار ہو سکتا ہے کہ چوتھی ایجنسی یعنی تجارتی بینکوں کے لئے سود کا مختلف ڈھانچہ رکھا جائے۔ جب دیگر مذکورہ بینک قرضوں کی بروقت ادائیگی کے لئے ترغیبات دیں گے تو تجارتی بینکوں کو بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا ورنہ ان کے قرض کی واپسی متاثر ہوگی لیکن دیہی قرضے فراہم کرنے سے ان بینکوں کا کم تعلق ہونے کے سبب یہ بینک اپنے سرمائے سے ایک فیصد خرچ برداشت کرسکیں گے۔ اس وقت تجارتی بینکوں کے ذریعہ موجودہ قرضے کی واپسی تقریباً ۲۱۵۰ کروڑ روپیے ہے اور ایک فیصد ترغیب کے معنی ہوں گے کہ ۲۱.۵ کروڑ روپیہ کا فاضل خرچ کیا جائے۔

زراعت اور دیہی ترقی کے قومی بینک کے ذریعہ اسکیموں کے تحت ۸۷-۱۹۸۶ میں ۱۳۳۳ کروڑ روپیہ کا قرضہ دیا گیا۔ اس میں سے ۳۵ فیصد چھوٹے پیمانے کی آبپاشی کے لئے اور ۱۴ فیصد مشینوں کے لئے تھا۔ اس وقت بینک صرف نئے ٹریکٹر خریدنے کے لئے ہی قرضہ دیتے ہیں اور زراعت اور دیہی ترقی کا بینک استعمال شدہ ٹریکٹروں کی خرید کے لئے دوبارہ رقم فراہم نہیں کرتا۔ حال ہی میں بعض حلقوں میں اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ کسانوں کو استعمال کے لائق ایسے پرانے ٹریکٹروں کی خرید کے لئے قرضے دیئے جائیں جو تین سال سے زائد پرانے نہ ہوں۔ دیکھا گیا کہ کسانوں کی بڑی تعداد پرانے ٹریکٹر حاصل کرنا چاہتی ہے کیونکہ یہ سستے پڑتے ہیں۔ دوسری جانب خوشحال کسان اپنے پرانے ٹریکٹروں کی جگہ نئے ٹریکٹر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا زراعت اور دیہی ترقی کے بینک کو نہ صرف نئے بلکہ پرانے ٹریکٹروں کے لئے دوبارہ رقم فراہم کرنے کی سہولت دینی چاہئے۔ زراعت اور دیہی ترقی کا بینک اپنے ذریعہ دیئے گئے اوسط قرضوں کی بنیاد پر بروقت قرض کی ادائیگی کے لئے ایک فیصد چھوٹ کی لاگت لگا سکتا ہے۔ موجودہ کام کی بنیاد پر یہ رقم تخمیناً [illegible] روپیہ سالانہ ہوگی۔ تجارت میں فروغ کے ساتھ یہ رقم بڑھ کر [illegible]

قابو میں رکھا جا سکے گا کیونکہ کل آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا ۔

یہ تجاویز دیہات میں رقم کی دوبارہ فراہمی کو امداد باہمی کے کم مدتی قرضوں کے لئے ایک فیصد پوائنٹ اور زمینی ترقی و دیہی بینکوں کی زمینی تجارت کے لئے ۱.۵ فیصد پوائنٹ سستا بنا دیں گی ۔ کیونکہ زمینی ترقیاتی بینکوں میں دوبارہ رقم کی فراہمی زیادہ ہوتی ہے اس لئے ان کو نسبتاً زیادہ فائدہ ہوگا۔ جب کسی قرضدار کو قرض کی بروقت واپسی کے لئے چھوٹ دی جائیگی تو نچلی سطح کے اداروں کی آمدنی کم ہو جائیگی ۔ اس کمی کو رقم کے بہتر انتظام کے ذریعہ پورا کیا جانا چاہیئے ۔ جہاں تک سرکاری سیکٹر کے بینکوں کا تعلق ہے وہ زراعت اور دیہی ترقی کے بینک سے کوئی رعایت حاصل کئے بغیر یہ رعایت فراہم کریں گے ۔ جولائی ۱۹۸۶ سے جون ۱۹۸۷ تک زراعتی شعبے میں سرکاری سیکٹر کے بینکوں کی وصولیابی ۳۶۷۵ کروڑ روپیہ تھی ۔ یہ مانتے ہوئے کہ ۲۱۵۰ کروڑ روپے بروقت ادائیگی کے طور پر وصول ہوئے ، قرض لینے والے کسان کو ۲۱.۵ کروڑ روپے کا فائدہ ہوا ۔ قرض کی واپسی میں بہتری اور زراعتی شعبہ میں سرکاری سیکٹر کے بینکوں کا زیادہ شرکت کے ذریعہ ساتویں منصوبے کے آخر تک یہ رقم ۳۰ کروڑ روپے تک ہو سکتی ہے ۔

قرض کی بروقت ادائیگی کے لئے دی جانے والی ترغیبات سے قرض کی واپسی کے لئے بہتر ماحول بنے گا لیکن زراعت اور دیہی ترقی کے بینک کو جو فاضل خرچہ کرنا پڑے گا اس سے اس کے مالی وسائل میں کمی آئے گی ۔ اس بینک کے ذریعہ حاصل شدہ فاضل نفع کو کسانوں کو ترغیب کے طور پر دینے سے اسکیموں کے تحت دئیے جانے والے قرضے میں کمی آئیگی ۔ یہی چیز قرضے دینے والے دیگر اداروں پر بھی لاگو ہوگا ۔ اس بینک کے بقایہ جات جون ۱۹۸۴ سے جون ۱۹۸۷ تک ۵۲۹۳ کروڑ روپیہ سے بڑھکر ۳۸۴۷ کروڑ روپیہ ہو گئے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ان تین برسوں میں ۶۱۵ کروڑ روپے دیہی قرضے کے قومی فنڈز اور سٹیبلائزیشن فنڈ کو دئیے گئے ۔ اس سے مذکورہ بینک کے کاروبار میں بغیر لاگت والے فنڈ کے حصے میں کافی اضافہ ہوا ہے ۔

جون ۱۹۸۳ کے آخر تک کے اعداد و شمار اس سے بھی بہتر ہونے چاہئیں ۔ لہٰذا یہ بینک ۸۹-۱۹۸۸ اور ۹۰-۱۹۸۹ کے دوران امداد باہمی کے بینکوں اور علاقائی دیہی بینکوں کو ۷۰ کروڑ روپے سے لیکر ۱۰۰ کروڑ روپے تک کی رعایتیں دے سکتا ہے ۔

ڈ - یکی - ستیہ نرائن

زرعی پیداوار

جب ملک ۱۹۸۷ء میں بدترین خشک سالی، جیساکہ ماہرینِ موسمیات نے کہا ہے، کا شکار ہوا، تو وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے اسے "تباہی نہیں بلکہ قدرتی آفت" قرار دیا۔ وزیراعظم زرعی پیداوار پر خشک سالی کے اثرات کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

شری گاندھی کا قول ۸۸-۱۹۸۷ کے لئے زرعی پیداوار کے ان حالیہ تخمینوں سے سچ ثابت ہوا ہے جو ریاستوں سے موصول ہوئے ہیں۔ بارش کی کمی کے باوجود جس نے ملک کے صرف ۶۳ فیصد علاقے کو ہی فیض یاب کیا، اس سال کے لئے اناج کی پیداوار کا تخمینہ ۱۳۷۰ لاکھ ٹن سے ۱۳۹۰ لاکھ ٹن لگایا گیا ہے جو ۸۴-۱۹۸۳ء میں حاصل کی گئی ۱۵۲۴ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کی اعلیٰ سطح کے مقابلے میں صرف ۱۳۰ لاکھ ٹن سے ۱۵۰ لاکھ ٹن تک کم ہے۔ ایک زبردست خشک سالی کے سال میں یہ کارکردگی درحقیقت قابلِ تعریف سمجھی جانی چاہیئے۔

ایک تباہی ہونے سے قطع نظر، ۱۹۸۷ء کی خشک سالی زحمت کے بھیس میں ایک رحمت ثابت ہوسکتی ہے اگر زرعی پیداوار میں مزید اضافے اور موسم پر انحصار کو کم سے کم کرنے کیلئے کئے گئے اقدامات کے مثبت نتائج برآمد ہونے لگیں

خشک سالی کے نتیجے میں ہماری زرعی ترقی و فروغ میں کچھ کمزوریوں کے سامنے آجانے کے بعد نقصان کی تلافی کے لئے کوششیں بھی فوری اور تیزی سے کی گئیں۔ وزیراعظم نے وزرائے اعلیٰ کی ایک کانفرنس بلائی تاکہ زرعی ترقی و فروغ کو سب سے زیادہ ترجیح دینے اور اناج کی پیداوار کا ایک خصوصی پروگرام شروع کرنے کے لئے ریاستوں سے ایک ٹھوس وعدہ لیا جائے۔ ساتویں منصوبے کی تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے، منصوبے کی ترجیحات کو از سرِ نو تشکیل دینے اور انھیں حقیقت پر مبنی نشانے مقرر کرنے کے لئے ایک خصوصی ٹاسک فورس قائم کی گئی۔ چنانچہ ۸۹-۱۹۸۸

کے لئے ۱۹۶۰ لاکھ ٹن اناج اور ۹۰-۱۹۸۹ کے لئے جو ساتویں منصوبہ کا آخری سال ہے ۔
۱۷۵۰ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کے نشانے مقرر کئے گئے ۔

مذکورہ نشانے بہت زیادہ نہیں ہیں بشرطیکہ مِن موجی مانسون سازگار ثابت ہو ۔ زراعت کی
مرکزی وزارت، منصوبہ سازوں اور زرعی ترقی و فروغ کے کام سے وابستہ تمام افراد کے لئے بڑھتی ہوئی
آبادی کی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے اس علاقے کے اختتام کے لئے زراعت کے قومی کمیشن کے
مقرر کردہ پیداواری نشانوں کے پیش نظر مذکورہ نشانوں کی حصولی ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے ۔

۲۰۰۰ء تک پہنچنے کے لئے صرف ایک دہے سے کچھ زائد مدت باقی رہ جانے پر، زرعی
محاذ پر کارکردگی میں یہ اعتماد پیدا کرنا نہایت اہم ہوجاتا ہے کہ پیشرفت بخوبی چل رہی ہے ۔

بلاشبہ زرعی کارکردگی گزشتہ دو دہائیوں میں ہماری اقتصادی ترقی کا ایک اہم جزو رہی ہے
ہماری زراعت کے بڑھتے ہوئے استحکام کی وجہ سے مطلوبہ نشانوں تک پہنچنے کے لئے ملک کی
صلاحیت کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیئے ۔ یہ استحکام
متعدد عناصر کی وجہ سے حاصل ہوا ہے ۔ پہلا عنصر یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک وسیع علاقہ ایسا ہے
جہاں یقینی طور سے آبپاشی ہوتی ہے ۔ ملک میں کل زیر آبپاشی علاقہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲۲٦ لاکھ
ہیکٹر سے بڑھکر ۸۵-۱۹۸۴ء کے اختتام تک ٦۷۵ لاکھ ہیکٹر ہوگیا ۔ آئندہ دو برسوں میں مزید
۴۴ لاکھ ہیکٹر علاقہ میں آبپاشی کی صلاحیت مہیا ہوجائے گی ۔

دوسرا عنصر یہ ہے کہ کسان اب زیادہ سے زیادہ کیمیاوی کھادوں، کیڑے مار دواؤں، اور
معیاری بیجوں کا استعمال کر رہے ہیں ۔ اس وقت چھوٹے بڑے سب ملا کر کیمیاوی کھادوں کے
۱۱۳ یونٹ ہیں جو مختلف اقسام کی کیمیاوی کھادیں تیار کر رہے ہیں، جن میں نائٹروجن، فاسفیٹ
وغیرہ ملی ہوتی ہے ۔ کیمیاوی کھادوں کی کھپت ۵۱-۱۹۵۰ء میں محض ٦۹ ہزار ٹن سے بڑھکر
۸۷-۱۹۸٦ء میں ۸۷۳ء لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ہے ۔ تیسرا عنصر یہ ہے کہ سائنسدانوں نے کاشتکار
طبقہ کے فائدے کے لئے مختلف فصلوں کی زیادہ پیداوار والی اقسام تیار کی ہیں جو مختلف زرعی
موسمی حالات سے مناسبت رکھتی ہیں ۔ اب بیجوں کے تحفظ، غذائیت کی سپلائی، کیڑے مکوڑوں
اور بیماریوں کی روک تھام اور فصل اگانے کے بہتر طریقے موجود ہیں ۔

اتنا ہی اہم ایک اور عنصر یہ ہے کہ خشک سالی اور کم بارشوں کے زمانے میں بھی زیادہ سے

زیادہ پیداوار کے لئے متعدد اقسام کی ٹکنالوجی تیار کی گئی ہے۔ مذکورہ تمام عناصر کے علاوہ قیمتوں میں امداد کی پالیسی کی وجہ سے ہم اناج کے معاملے میں خود کفالت کی جانب تیزی سے بڑھ سکے ہیں اور بڑے پیمانے پر اناج کی درآمدات کو خیرباد کہہ سکے ہیں۔

جب ٥١-١٩٥٠ میں پہلا پنجسالہ منصوبہ شروع ہوا۔ اس وقت اناج کی پیداوار تقریباً ٥٠٠ لاکھ ٹن تھی۔ بھارت کی منصوبہ بندی کے معمار جواہر لال نہرو نے اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے درکار کوششوں پر توجہ دی۔ انہوں نے کہا "ہر چیز انتظار کر سکتی ہے لیکن زراعت نہیں"

پہلے پنجسالہ منصوبے میں اس وقت دستیاب بہترین ٹکنالوجی کی مدد سے فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر ایک قومی توسیعی سروس کا آغاز کیا گیا۔ ترقی کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ توسیعی کارکنوں کے پاس ایسی کوئی قابل ذکر ٹکنالوجی نہیں تھی جسے وہ کسانوں تک پہنچاتے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیز اناج کی پیداوار میں سست شرح اور اکثر و بیشتر ہونے والی خشک سالی اور سیلابوں کی وجہ سے حکومت کو عوام کی ضروریات کی تکمیل کے لئے درآمد شدہ اناج پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑا۔

٦٧-١٩٦٦ء میں بھارتی زراعت کی تاریخ میں ایک اہم لمحہ اس وقت آیا جب زرعی ٹکنالوجی میں سائنسی پیشرفت پر مبنی ترقیات کے لئے ایک نئی حکمت عملی شروع کی گئی۔ جس کے نتیجے میں "سبز انقلاب" رونما ہوا۔ اس وقت سے پیداوار کے شعبے میں کی گئی کوششیں اس حقیقت سے ظاہر ہوں گی کہ اناج کی پیداوار ٥١-١٩٥٠ میں ٥٠٨ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ٦١-١٩٦٠ء میں ٨٢٠ لاکھ ٹن اور ٧١-١٩٧٠ء میں ١٠٨٤ لاکھ ٹن ہو گئی

اناج کی پیداوار ٧٩-١٩٧٨ میں ١٣٢٠ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی اور اناج کے ذخیرے ٢١ لاکھ ٹن تک پہنچ گئے۔ اس ذخیرے کی وجہ سے اس وقت ملک کی بھرپور مدد ہوئی جب اس کے ٢ برس ملک کو ایک زبردست خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔

چھٹا پنجسالہ منصوبہ (٨٥-١٩٨٠) بھارت کی زرعی ترقی و فروغ میں ایک اور سنگ میل ثابت ہوا اور ٨٤-١٩٨٣ء میں ١٥٢٤ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار ہوئی جو اب تک کی سب سے زیادہ پیداوار ہے اور جسے اکثر دوسرے سبز انقلاب کا نقیب بھی کہا جاتا ہے۔ مذکورہ سال میں صرف پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا بلکہ پیداوار کے طریقے میں بھی تبدیلی آئی۔ پہلی مرتبہ

زرعی طور سے پسماندہ ریاستوں اور علاقوں نے بھی پیداوار میں بہتر شرح اضافہ حاصل کرنا شروع کیا۔ پیداوار میں اضافہ صرف گیہوں اور دالوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ موٹے اناجوں کی پیداوار میں بھی، جنہیں خاص طور پر غریب کسانوں نے اگایا تھا اضافہ ہوا۔ چاول کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہوا جو اس وقت تک پسماندہ ریاستوں کے بڑے پیمانے پر تعاون کے نتیجے میں حاصل ہوا۔

ساتویں منصوبے میں حکمت عملی یہ تھی کہ گزشتہ برسوں میں تیار کی گئی ٹھوس بنیاد سے فائدہ اٹھا کر پیداوار کو زیادہ سے زیادہ اونچائیوں تک لے جایا جائے۔ اگرچہ منصوبہ کا شروعات ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۵۰۰ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار سے ہوئی لیکن بعد کے برسوں میں ناموافق موسمی حالات کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوششوں میں رکاوٹ آگئی ہے۔

آٹھویں دہے کے لئے اناج کی پیداوار کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اضافہ کے جائزے سے ایک حوصلہ افزا تصویر سامنے آتی ہے۔ ان برسوں میں پیداوار میں اضافہ مجموعی طور پر اناج کی پیداوار اور زرعی پیداوار کے لئے ۴ء۰۷ فیصد سالانہ کی شرح اضافہ کے مقابلے میں ۳ فیصد سے زائد کی شرح کے حساب سے ہو رہا ہے۔

آٹھویں دہے میں اضافہ پیداواریت میں اضافے کی وجہ سے ہوا ہے کیونکہ پیداواری علاقے میں اضافہ برائے نام رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں پیداواری علاقے میں اضافہ صفر کے برابر رہا ہے فصلوں کے حساب سے چاول کی پیداوار میں سالانہ شرح اضافہ ۱۲ء۴ فیصد اور گیہوں کی پیداوار میں سالانہ شرح اضافہ ۵ء۴ فیصد رہی تاہم موٹے اناجوں کے معاملے میں پیداوار میں خاص طور سے علاقے میں کمی کی وجہ سے کمی آئی۔ دیگر فصلوں کی پیداوار کی شرح اضافہ اس طرح ہے۔ دالیں ۲ء۸۳ فیصد، تلہن ۴ء۱۳ فیصد، گنا ۲ء۲۰ فیصد، پٹ سن اور میسٹا ۳ء۵۰ فیصد اور کپاس ۱ء۴۷ فیصد

ساتویں منصوبے کے وسط مدتی جائزے میں منصوبہ سازی کمیشن نے پہلے تین برسوں میں اناج پیداوار کی کمیوں کا ذکر کیا ہے اور اس نتیجے میں کسی بھی قسم کی خوش فہمی کے لئے متنبہ کیا ہے۔ وسط مدتی جائزہ کی دستاویزات کے مطابق اناج کی پیداوار کے معاملے میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں حاصل کی گئی سطح میں کمی آنا تشویش کا باعث ہے۔ بلاشبہ ناموافق موسم جزوی طور پر اس کے لئے ذمہ دار ہے۔ اسکی دیگر وجوہات بھی ہیں۔ دستاویز کے مطابق زرعی پیداوار میں اضافہ کی رفتار کو دوبارہ

حاصل کرنے اور موسمی عناصر پر انحصار کو کم کرنے کی غرض سے جن شعبوں پر توجہ دی جانی ہے ان میں پیداوار بڑھانے والے ساز و سامان میں اضافہ، آبپاشی کے نظام کی جدید کاری اور بہتر آبی انتظام نیز بارانی زراعت اور دھان، تلہن اور دالوں جیسی فصلوں کی پیداوار میں تیزی لانا اور خود کفالت حاصل کرنا۔ جائزے میں یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ زرعی منصوبہ بندی کی بنیادی حکمت عملی کو دو سمتیں عطا کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلی — زرعی حکمت عملی مقامی زرعی و موسمی حالات کو مدنظر رکھ کر وضع کی جانی چاہیئے۔ دوسری — زرعی منصوبہ بندی فصلوں کی پیداوار سے آگے بھی ہونی چاہیئے جس میں متعلقہ سرگرمیاں مثلاً مویشی پالن، ماہی پروری، جنگل بانی اور زرعی صنعت شامل ہوں۔

منصوبہ کے وسط مدتی جائزے کے بعد اناج کی پیداوار کے نشانے نظر ثانی کے بعد ۱۹۸۸-۸۹ کے لئے ۱٦٦۰ لاکھ ٹن اور ۹۰-۱۹۸۹ کے لئے ۱۷۵۰ لاکھ ٹن مقرر کئے گئے ہیں۔ اس برس کے لئے نشانہ ۱۹۸٦-۸۷ میں ختم ہونے والے تین برسوں کے دوران ۱٤٦۷.۹ لاکھ ٹن کی اوسط پیداوار کے مقابلے میں ۱۹۳ لاکھ ٹن زیادہ ہے۔ اس نشانے کا حصول بہت کچھ مرکز اور ریاستوں کے تیار کردہ اناج کی پیداوار کے خصوصی پروگرام کے عمل آوری پر منحصر ہے جس میں کم مدت میں پیداوار بڑھانے کی صلاحیت والے علاقوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ مذکورہ پروگرام پر عمل آوری کیلئے کل ملا کر ۱٤ ریاستوں کے ۱٦۹ اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں خاص طور سے چاول، گیہوں، مکئی، ارہر اور چنے کی پیداوار میں اضافے پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ان اضلاع میں پیداوار میں اضافے کی وسیع حکمت عملی میں کیمیاوی کھادوں کے استعمال میں اضافہ، بہتر بیجوں کا استعمال گھاس پھوس کی صفائی، کیڑے مکوڑوں پر کنٹرول، زیر زمین پانی کے وسائل کو بروئے کار لانے اناج کی وصولی کے لئے بونس، ترغیبات اور قرض کے نظام کی بہتری شامل ہیں۔ اناج کی پیداوار کے خصوصی پروگرام کی شروعات متعدد دیگر پروگراموں کے علاوہ ہے۔ ان پروگراموں میں، جن پر عمل آوری ہو رہی ہے، مشرقی ریاستوں کے لئے چاول کی پیداوار کا خصوصی پروگرام، دالوں کے فروغ کے لئے قومی پراجکٹ، تلہنوں کے فروغ کا قومی پراجکٹ نیز چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کی امداد کا پروگرام شامل ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن نے زرعی و موسمی علاقوں کی بنیاد پر منصوبہ بندی کے طریقے پر عمل آوری کے لئے کام شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ۱۵ زرعی و موسمی علاقوں کی نشاندہی

کی جا چکی ہے اور ہر علاقے کے لئے قائم کی گئی منصوبہ ٹیم کے ساتھ تبادلہ خیالات کے بعد خطوط وضع کر لئے گئے ہیں۔ زرعی موسمی علاقائی پراجکٹ کا مقصد مزید گوناگوں زراعت پر توجہ دینا ہوگا۔ یہ پراجکٹ فصلوں کے علاوہ مویشی پالن، مرغی پالن اور دودھ کی ڈیریوں وغیرہ پر بھی توجہ دے گا۔

ہماری زراعت کے سامنے بہت سے چیلنج ہیں۔ پیداوار اور پیداواریت میں اعلیٰ سے اعلیٰ سطحیں حاصل کرنے کی کوششیں کرنے کے علاوہ علاقوں اور فصلوں کے لحاظ سے پیداوار میں زبردست عدم مساوات کو دور کر کے ایک متوازن ترقی حاصل کرنا بھی اہم ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیداوار کی لاگت کم کی جائے اور کسانوں کو کیسے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ خوراک کے محاذ پر ابتدائی کامیابی حاصل کرنے کے بعد آرام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے خوراک کی سلامتی کے ایک ٹھوس نظام کے قیام سے قبل، جس میں ہر ایک شہری کے لئے کافی خوراک مہیا ہو، ہمیں ابھی ایک بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔

(سلسلہ صفحہ)

ارشاد کہ اہل حلقہ کو چھوڑ کر تمہاری مدد نہیں کی جا سکتی، جنگ احد میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا چہرہ اقدس سے خون صاف کرنا اور یہ ایسے نہ معلوم کتنے واقعات ہیں جن کو مصنف کے قلم نے بڑا دلکش دلآویز اور مؤثر بنا دیا ہے یقین ہے کہ اس کتاب کو ہمارے تاریخی لٹریچر میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ اور صحیح تاریخی نقطۂ نگاہ پیدا ہوگا۔

مولانا فضل میاں نے جس عالمانہ اور مؤثر انداز میں "سب بہت علی مرتضیٰ" پر روشنی ڈالی ہے اس پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ اس وقت عرفی کے اس شعر پر اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

زبان ز نکتہ فرو ماند و راز سخن باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

(تعمیر حیات لکھنؤ سے ماخوذ)

ماہ نامہ

شاداب

جلد ۶ شمارہ ۲ فروری ۱۹۸۹ء حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
قمر الدین صابری	نعیم جاوید	کلیم الدین احسن

قیمت 5.00

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد • نیر احمد صدیقی • محمد منظور احمد صدیقی • اے جی فاروقی • ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا • پروفیسر میر تراب علی •

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	۵۰ روپے	۱۶۰ روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
سال	۹۰ روپے	270	65	36	225
تاحیات	۱۰۰۰	2600	450	300	2000

ترسیل زر کا پتہ

ماہ نامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر قمر الدین صابری نے بزنس فاران پرنٹنگ پریس چار مینار سے چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول	ایڈیٹر	۳
مدینہ کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ	صفدر حسین	۵
ملیشیا میں اسلامی کیلنڈر سیمنار	مولانا محمد برہان الدین	۱۳
اردن شوریٰ اور قرآن مجید	پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالباری	۲۰
جامعہ ملیہ اسلامیہ بل	اختر الواسع	۲۳
مجلس عمل برائے اردو کے مطالبات		۳۰
سائنس کی منتقلی برائے ترقی	پروفیسر عبدالسلام	۳۲
شہاب نامہ (مسودہ دوم)	قدرت اللہ شہاب	۴۱
اداریہ نویسی	عابدہ رخسانہ	۴۶
چوتھی سارک چوٹی کانفرنس	پی آئی بی	۵۱
ہفتہ کو کنگ ساتوں کے لئے ایک رخصت	سی ین ین محمد تقی	۶۱

حرفِ اوّل

اردو ہندوستانی زبان ہے، اردو عوامی رابطے کی زبان ہے۔ ہندوستانیوں نے جنگِ آزادی اسی زبان میں لڑی۔ مگر آزادی کے بعد جب قومی زبان قرار دیے جانے کا تصفیہ ہونے لگا تو اردو اور ہندی کے لیے مساوی رائیں حاصل ہوئیں۔ اور اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے محترم راجندر پرشاد آنجہانی نے صدارتی کاسٹنگ ووٹ کے ذریعے ہندی کو قومی زبان بنا دیا۔ ہندی والوں نے اردو کو اپنا حریف جان کر اردو کے خلاف مخالفانہ سلوک جاری رکھا اور اسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے دیس نکالا دینا چاہا۔ چونکہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سب ہی ہندوستانیوں کی زبان ہے اور اس کی جڑیں ہندوستانی عوام کے دلوں میں پیوست ہیں۔ اردو برابر عوامی رابطے کی زبان بنی رہی۔

خوشی کی بات ہے کہ اب ہندی والوں کا معاندانہ رویہ تقریباً ختم ہو گیا ہے اور اردو کو اس کا مستحقہ مقام دینے میں ان کی مخالفت باقی نہیں ہے۔ اردو کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ اردو والوں کی جدوجہد کے نتیجے میں اردو کو حکومتی اور تعلیمی دونوں سطحوں پر استعمال کرنے کے احکامات جاری ہو رہے ہیں مگر بڑی حد تک ان پر عمل آوری نہیں ہو رہی ہے۔ آندھرا پردیش میں بھی سابقہ حکومت کے اجرا کردہ احکامات پر عمل کرنے کے لیے تلگو دیشم حکومت نے متعدد احکامات جاری کئے۔ جب اردو والوں نے یہ مطالبہ کیا کہ واضح اور جامع احکامات جاری کئے جائیں اور ان پر عمل آوری کی سختی سے تاکید کی جائے تو حکومت نے دستور میں اقلیتوں کو دیے گئے تیقنات اور آج تک جاری کئے گئے تمام احکامات کو یکجا کر کے ایک "بروشر" جاری کر دیا ہے۔ اس طرح سے نہ جامع اور واضح احکامات کی اجرائی کا وعدہ پورا ہوا نہ تعمیل کنندہ عہدیداروں

کو تاکید کی گئی کہ وہ اس پر پورا پورا عمل کریں۔

اردو والوں کے احتجاج پر چیف منسٹر کی مقرر کردہ کابینی سب کمیٹی نے متحدہ مجلس برائے اردو کے نمائندے سے تفصیل بات کی۔ اس موقع پر جو نمائندگی کی گئی اور مطالبات پیش کئے گئے انہیں اس شمارے میں درج کیا گیا ہے۔ اردو بچاؤ تحریک کا یہ مسلسل مطالبہ رہا ہے کہ جب تک چیف منسٹر سے راست بات چیت نہ ہوگی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ چیف منسٹر اردو والوں سے فروری کے پہلے ہفتہ میں راست بات کریں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق دیا جائے گا اور اس کے پنپنے اور آگے بڑھنے کے راستے میں کوئی رکاوٹیں باقی نہیں رہیں گی۔ تاکہ اردو آزادی سے قبل کے زمانے کی مانند ہمارے ملک کی قومی زندگی میں اپنا مستحقہ حصہ ادا کرتی رہے۔

منظور حسین

مدینہ کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ

بچے گا کیا پھر زمیں پہ جغرافیہ شناسو
جہاں کے نقشہ سے گر مدینہ نکال دیجئے

کئی دنوں سے اس شہر کی حاضری کا ارادہ تھا جس کے بارے میں آقائے نامدار حضرت محمدؐ نے فرمایا ہے کہ جس کو مدینہ پہنچنے کی وسعت ہو اور وہ میری زیارت کو نہ آئے، اس نے میرے ساتھ بے مروتی کی اور یہ بھی فرمایا کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت لازم ہوگئی پھر کون ہوگا جو روزِ قیامت حضورؐ کی شفاعت سے محروم ہونا پسند کرے گا! فرصت اور سہولت پاکر میں نے عمرہ کی ادائیگی کے بعد اس پرعظمت شہر کی زیارت سے فیض یاب ہونے کا قصد کرلیا جس میں رسول اکرمؐ نے اپنی عمر عزیز کے دس سال گزارے ہیں۔ جہاں مسجد نبوی ہے جس پر آپ کے سجدوں کے نشانات ثبت ہیں۔

مکہ سے مدینہ کا فاصلہ ۴۶۰ کلومیٹر ہے۔ کئی سال پیشتر مدینہ کے زائرین کو جدہ کے رستے جانا پڑتا تھا۔ تاہم اب جدہ کو چھوئے بغیر مدینہ منورہ پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ راستہ قریب قریب وہی ہے جس سے محسنِ انسانیت ہجرت کے موقع پر تشریف لے گئے تھے۔ عجوم اور عثمان سے ہوتا ہوا میں وادیٔ جلیس پہنچا۔ بڑی سرسبز و شاداب وادی ہے۔ یہ بھی رسول اکرمؐ کے سفرِ ہجرت کے رستے کا مقام ہے۔ ان سرسبز و شاداب باغات کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ شاید حضورؐ نے بھی کچھ دیر ان ہی باغات کے سائے میں آرام کیا ہوگا۔ ہاں، شاید گھڑی دو گھڑی کے لیے [illegible] ٹھنڈی ہوا نے آپؐ کے لئے استراحت کا سامان فراہم کیا ہو اور آپ کی آنکھ لگ گئی ہو، شاید .... اور تاریخ ۱۳ نبوی کے یکم ربیع الاول کی یاد دلانے لگی جب غارِ ثور سے آپؐ یارِ غار کی معیت میں اپنے اس تاریخ ساز سفر پر روانہ ہوئے۔ سر راہ مل جانے والے مسافروں کو خبر نہیں تھی کہ یہ مختصر سا قافلہ

دراصل یہی انسانیت کا قافلہ ہے جو دنیا کے عظیم ترین انقلاب کی منزلوں کی طرف گامزن ہے
(میری لغت میں تاریخ انسانی میں صرف دو سفر ہیں - معراج اور ہجرت!) میں سفر ہجرت کے نقوش
پر آقا کی محبت میں کھوئے کھوئے بڑھتا رہا ہوں - تاریخ کی کتابیں پڑھ کر کبھی اس طویل سفر کی شدت کا اندازہ
نہیں ہوتا - آج جبکہ میں چودہ سو سال کی مسافت پر کھڑے ہو کر لق ودق صحراؤں کو دیکھ رہا ہوں -
اُف میرے خدا! ان راستوں پر جہاں میل ہا میل تک پانی کی بوند بھی نہیں ملتی تھی، ہاں اس دور
میں بھی نہیں ملتی، اتنا لمبا، کٹھن، جانگسل، پرتھکن سفر - خدا کے محبوب پیغمبرؐ پر اتنا کڑا وقت بھی
آیا تھا -

پہاڑی سلسلوں کی اوٹ سے نکلے تو سامنے کھجوروں کے وسیع باغات کے درمیان بدر کا قصبہ تھا
جدید عمارات، وسیع وعریض سڑکوں، اسپتال، مارکٹ وغیرہ کی بدولت اب یہ قصبے کی تعریف سے
نکل چکا ہے - بدر کے تیرہ شہیدوں کے پاکیزہ نقوش تہ خاک مدفون ہیں - مدفن کے احاطے کے باہر
کھڑے ہو کر میں نے ان جلیل القدر صحابہ کیلئے دعائیں مانگیں جن کا مقدس خون اسلام کی تاریخ کو نکھار
عطا کر گیا - ہم پر ان کا احسان عظیم ہے - میرے سامنے پہاڑی نشیب وفراز پر وہ میدان پھیلا ہوا
ہے جہاں حق کا وہ عظیم الشان معرکہ پیش آیا ہے جس نے انسانیت کی تاریخ بدل کر رکھ دی - ایک
طرف بے سروسامان تین سو تیرہ جاں نثار، حق کے سپاہی، ٹوٹی پھوٹی تلواریں - جن کے سینے زرہ بکتر
سے بے نیاز لیکن نور ایمان سے منور - دوسری طرف وہ لشکر جرار جو کبر وغرور میں ڈوبا ہوا - گھمسان
کی لڑائی میں تھوڑی سی دیر میں غرور کا سر پاش پاش ہو جاتا ہے - بے شک رب العزت کا کلمہ دنیا میں
غالب ہونے کے لئے آیا ہے -

بدر میں کچھ وقت گذار کر میں کوئے حبیب کی طرف پھر روانہ ہو گیا - اب میں مدینہ کے مضافات
میں داخل ہو رہا ہوں - مدینۃ النبی کی قربت کے احساس سے میرے وجود میں سر سے پاؤں تک ایک
قسم کی جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی ہے - یہ تصور بڑا ہی کیف انگیز اور یہ خیال بڑا ہی روح پرور محسوس
ہو رہا ہے کہ میں اس بستی میں قدم رکھ رہا ہوں جس کی مٹی نے محبوب خدا کے قدموں کے بوسے لئے
تھے - میں ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں جہاں ہمارے پیارے نبیؐ کی معطر سانسوں کی مہک رچی
ہوئی ہے - فی الوقت میری حالت اس عاشق کی سی ہے جو محبوب کے کوچہ میں قدم رکھتے ہوئے مسرت
انبساط سے مخمور ہونے کے ساتھ ساتھ بوکھلایا ہوا بھی ہو -

شہرِ محبت قریب آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے موٹر کار کی رفتار اور تیز ہو جائے۔ وقت کو پر لگ جائیں۔ اڑ کے پہنچ جاؤں۔ عجیب کیفیت ہے۔ سنگِ میل بلکہ سنگِ کلومیٹر پڑھ رہا ہوں۔ مجھے وہ سامنے مدینہ پاک کی جھلک نظر آنے لگی۔ کھجور کے باغات سے بھرپور شہر، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے محسوس ہونے لگے۔ ابھی سبز گنبد کی محض ایک جھلک نظر آئی ہے۔ اب نظر کے سامنے وہ مرکز عقیدت و محبت ہے جسے آقائے دوجہاں نے اپنی مسجد کہا۔ اس کی تعمیر میں آپ کے مقدس ہاتھوں کی محنت شامل ہوئی۔ سرورِ دوعالم کو اس شہر سے اتنی محبت تھی کہ آپؐ جب بھی سفر سے واپس تشریف لاتے مدینہ منورہ کی عمارتیں دیکھ کر آپؐ فرطِ شوق سے اپنی سواری کو تیز کر دیتے یہاں کی خوشگوار ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کے لئے آپؐ چادر نیچے گرا دیتے اور صحابہ سے بھی فرماتے " چہرے سے چادریں ہٹا دو، ان ہواؤں کو جذب کرلو کہ مدینہ کی خاک میں بھی شفا ہے " یہ شہر آپؐ کی دعاؤں سے آباد ہوا، یہاں کی آب و ہوا کی خوشگواری آقائے دوجہاں کی رحمتوں اور دعاؤں کا صدقہ ہے۔ امام مالکؒ کا یہ عالم تھا کہ مدینہ میں وہ برہنہ پاؤں چلتے مبادا کہ ایسی جگہ پر جوتیوں سمیت چلنے کی بے ادبی نہ ہو جائے جہاں حضورؐ کے قدم مبارک گزرے ہوں۔

اب میں روضۂ اطہر کے قریب آ پہنچا ہوں، جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا ہے قلب و نظر کی حالت دگرگوں ہوئی جاتی ہے۔ جذبات و محسوسات میں ایک تلاطم برپا ہے۔ بدن کا رواں رواں لرزاں اور ترساں ہے۔ میں اپنے گرد و پیش نگاہ کرتا ہوں تو کم و بیش ہر ایک کو اسی کیفیت سے دوچار پاتا ہوں۔ کاندھے جھکے ہوئے۔ جسم سمٹا سمٹایا، قدم نپے تلے، آنکھیں جھکی جھکی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی تحلیل ہوا جا رہا ہے!

یہ فرطِ عقیدت یا احساسِ ندامت کہ حضور اکرمؐ کے سرہانے پہنچتے پہنچتے جسم و جاں ہزار کیفیات سے دوچار ہو گئے ہیں۔ بہرحال اب باادب ہو جائیے اور درود و سلام کا ورد کیجئے اور کرتے ہی چلے جائیے۔

مسجد نبوی پہنچ کر اب لمحوں کا وقفہ صدیوں کا وقفہ محسوس ہوتا ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی قلب و نگاہ کی حالت بدل گئی۔ روضۂ اطہر پر نظر پڑی تو مدتوں کی مشتاق آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ میں روضۂ مبارک کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جالیوں کے سوراخوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو غلافِ مزار کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ میرے پیارے نبیؐ کا روضۂ اطہر ہے

دل نے چاہا کہ اس سے لپٹ جاؤں، جی بھر کر روؤں اور فریاد کروں ۔ لیکن یہ پیغمبر اعظم کا روضۂ مبارک ہے یہاں ادب و احترام شرط اولین ہے ۔ دربار رسالت کے کچھ آداب بھی تو ہیں ۔ فرط عقیدت و محبت میں شرک کے ارتکاب کا بھی خطرہ تھا ۔ شرک نہ خدا اور نہ محبوب خدا کو منظور ہے ۔ یہ زندگی کا بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما امتحان تھا ۔ مجھے ایک نامعلوم خوف نے لرزہ براندام کردیا اور دل ڈوبنے لگا ۔ وہاں کھڑے ہو رہنے کی مجھ میں سکت نہ رہی ۔ میں ہجوم عشاق سے نکل کر روضۂ اطہر کے پہلو میں ریاض الجنۃ کے ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا اور دیوانہ وار اسے دیکھتا رہا ۔ قلب و چشم روتے رہے اور زبان پر درود شریف جاری رہا لیکن دل یہ کہتا رہا کہ عشق رسول میں ہر حال میں چاہے عالم جذب و مستی کیوں نہ ہو ، مؤدب و خاکسار اور ہوش مند و نفس گم کردہ رہنا لازمی ہے ۔ اس اعتبار سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی فضاؤں میں بڑا فرق ہے ۔ حرم کعبہ میں عالم جذب و مستی میں رہنے کی اجازت ہے لیکن حرم نبوی میں، ہر حال میں، باادب باملاحظہ ہوشیار رہنا لازمی ہے ۔ اس لحاظ سے اہل جذب و شوق کے لئے حرم نبوی میں جلال زیادہ اور حرم کعبہ میں جمال کی فراوانی ہے ۔ چنانچہ یہ شعر جتنا معروف ہے اس سے زیادہ سچا ہے : ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر ۔۔۔ نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

تھوڑی دیر بعد ہی اذان کی آواز بلند ہوگئی ۔ مسجد نبوی کی اذان میں بھی ایک گہرے سکون کی کیفیت موجود ہے ۔ کیوں نہ ہو کہ یہیں سب سے پہلے اذان دی گئی ۔ لوگوں کو خدا کے گھر کی طرف بلانے کا یہ انتہائی دلکش اور موثر انداز یہیں سے شروع ہوا ۔ یہیں ایک بلند مقام سے حضرت بلالؓ کی اذانیں گونجتی رہیں ۔ اتنی پرسوز اذاں کہ جب وصال نبیؐ کے ایک عرصہ بعد حضرت بلالؓ ایک مرتبہ مدینہ پاک دوبارہ تشریف لائے اور حسینؓ کے پرمحبت اصرار پر آپ نے اذان کہی تو آقائے موذن خاص کی اذان سن کر مدینہ پاک میں کہرام مچ گیا ۔ لوگ چیختے چلاتے گھروں سے باہر نکل آئے ۔ فرط عقیدت سے صحابہ کرام کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ہر دل میں جذبات کا طوفان امڈ رہا تھا ۔ اس مسجد نبوی کی اذان سنتے ہوئے میری آنکھیں بھی نم ناک ہوجاتی ہیں ۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی جسمانی آنکھیں بند کرکے تصور کی آنکھیں کھول لیتا ہوں اور ۱۵ سو سال پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالتا ہوں یہ کیسی دنیا تھی ؟ اس تاریک دور میں یہ زمین کا ایک ایسا گوشہ تھا جہاں تاریکی کا تسلط تھا ۔ ایسے زمانے میں ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے جو بت پرستی ، جہالت ، بداخلاقی ، بدکرداری ، ناانصافی

کہ اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں کوئی چیز بھی اس کو اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے۔ سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے۔ کوئی ایسی روشنی ڈھونڈتا ہے جس سے وہ چاروں طرف چھائی ہوئی اس تاریکی کو دور کر دے۔ یکایک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر کوئی ذی روح، کوئی سیارہ اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ، اس کی بندگی و عبادت کرو۔ اس کی فرماں برداری اور اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا اور ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی کی بندگی کرو، اسی کا حکم مانو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ سچ بولو، انصاف کرو، نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو، جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو، تم سب انسان ہو۔

انسان ایک عجیب سرور محسوس ہونے لگتا ہے۔ خوشگوار کیف طاری ہو جاتا ہے۔ سکون کی عجیب لذت نصیب ہوتی ہے۔ واقعی یہ ادب گہہ محبت ہے، ہماری گستاخیوں، بداعمالیوں، ظاہری محبت اور کھوکھلے دعووں کے باوجود رسالت مآب کا دستِ شفقت ہم پر ہے ورنہ ہم تو اپنے اعمال سے غضبِ خداوندی کو دعوت دینے والے ہیں۔ ہم تو محبتِ خداوندی کے آخری حدوں کو چھو چکے ہیں۔

پہلے مغرب پھر عشاء کی نماز با جماعت پڑھنے سے وہ کیف و سرور حاصل ہوا جو حرم کعبہ میں نماز پڑھنے کے سوا کہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ حرم کعبہ میں صرف الہٰ ورب تھا لیکن مسجد نبوی میں الہٰ کے ساتھ اس کے حبیب بھی تھے۔ یہاں شرابِ محبت دو آتشہ تھی اور اس کا کیف و سرور بھی دگنا تھا۔ یہاں حسن الہٰی کے ساتھ حسن رسالت مآب کے جلوے بھی تھے۔

رات کے وقت خانہ کعبہ کی طرح مسجد نبوی بھی خوشنما فانوس اور برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنی ہوتی ہے اور یہ نظارہ جنت نگاہ تو ہوتا ہے۔ دل ان مناظر سے متاثر تو ہوتا ہے مگر خدا جانے اسے کیوں آب و گل کی وہ سادہ و پُر برکت افروز مسجد نبوی دیکھنے کی آرزو و جستجو تھی جو رسول اکرم کے عہد مبارک میں تھی۔ عالی شان عمارتوں، ہوٹلوں اور دکانوں نے مدینہ منورہ کو جدید و نظر افروز بنا دیا ہے لیکن میری نظریں پندرہ سو سال پہلے کے مدینہ منورہ کو ڈھونڈ رہی ہیں جس کا اب

آثار بھی باقی نہیں رہے ۔ سب کچھ بدل چکا ہے ۔ تغیر و تبدل ہر چیز کا تقدیر ہے پھر بھی میری آرزو تھی کہ میں مدینۃ النبی کو دیکھوں ۔ یہ آرزو و خیال خام تھی نہ پوری ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ دل میں اس آرزو کے پیدا ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ لکھتے وقت میں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا ایک ایک گوشہ ، تصور کی آنکھ سے بار بار دیکھا تھا بلکہ ایک طویل عرصہ تک ہر روز دیکھتا رہا تھا ۔ مدینہ منورہ اب رسول پاکؐ کے عہد کا شہر نہیں رہا لیکن وہ آپؐ کا شہر ہے اور قیامت تک آپؐ کا شہر رہے گا اس لئے کہ آپ وہاں تشریف فرما ہیں۔

مسجد نبوی سے لوٹنے کے بعد رات میں نے عالم خواب میں دیکھا کہ اصحاب صفہؓ کے چبوترے پر مستغرق بیٹھا ہوں۔ اسی حالت میں دفعتاً میں نے دیکھا کہ میں کچی مٹی کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ہوں وہ بظاہر خوبصورت تو اتنی نہ تھی مگر دل کو بے حد پیاری لگی ۔ اس میں آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور روح اس پر فدا ہوئے جاتی تھی ۔ میں فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی مسجد نبوی ہے جسے حضورؐ کے مبارک ہاتھوں اور صحابہ نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی بنیاد حق اور تقویٰ پر رکھی گئی تھی ۔ اس کے تقدس پر فرشتوں کو بھی ناز تھا ۔ یہ مسجد اصحاب صفہ کی یونیورسٹی بھی تھی اور عدلیہ ، انتظامیہ ، تربیت گاہ کے علاوہ فوجی ہیڈ کوارٹر بھی تھی ۔ یہ وہ مسجد تھی جس سے محبت و رحمت ، حریت و اخوت ، علم و حکمت ، ایمان و تقویٰ ، عدل و احسان اور توحید کے آفتاب طلوع ہوئے ۔ جن سے بنی نوع انسان آج بھی مستفید ہو رہے ہیں ۔

رات ہوٹل میں اضطراب میں گزری ۔ صبح دو بجے فون کی گھنٹی بجی اور ساتھ آواز آئی کہ جناب عالی تہجد کی اذان ہو رہی ہے ۔ ابھی آسمان پر سپیدہ سحر [illegible] نہیں ہوا ہے مگر شہر کی گلیاں اور کوچے انسانی قدموں کی چاپ سے گونج رہے ہیں ۔ اہل شہر [illegible] اپنے نرم و گرم بستروں کو خیرباد کہہ کر گھروں سے نکل آئے ہیں اور نماز تہجد کی ادائیگی کے لئے مسجد نبوی کی سمت رواں دواں ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مسجد اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود کھچا کھچ بھر گئی ۔ جو اندر نہیں جا سکے انہوں نے مسجد کے باہر ہی صفیں بنالیں اور تمام ملحقہ بازاروں میں نمازیوں کی قطاریں بن گئیں حتیٰ کہ حد نظر تک سر ہی سر نظر آنے لگے ۔ یہ شوکت اسلام کا وہ روح پرور منظر ہے جو یا تو مکہ میں بیت اللہ شریف میں نظر آتا ہے یا پھر مدینہ میں حرم نبوی کے اندر

کل کی طرح آج بھی میں جب کاشانۂ نبوت میں حاضر ہوا تو میری نگاہ تیر چیر گئی دل وجد

آج بھی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی اور لذتِ گریہ بھی ' لذتِ جذب و مستی بھی ۔ درد و سوز بھی ملا اور کیف و سرور بھی ۔ ہم نفس گم کردہ بھی رہے اور گریہ کناں بھی ۔ میں نے حال کے منظر بھی دیکھے اور ماضی کے نظارے بھی ۔

زیارت روضۂ اقدس کے بعد تلاوت سے فارغ ہوکر میں باہر نکل آیا ۔ شہر رسالت دیکھنے کا شوق مدینہ پاک کی گلیوں میں کشاں کشاں لئے پھر رہا ہے ۔ میں در و دیوار کو اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں ۔ عمارتیں بدل چکی ہیں ۔ گلیوں کی ہیئت تبدیل ہوگئی ہے ۔ بام و در کی صورت یکسر مختلف ہوگئی ہے ۔ مگر مدینہ پاک کی خاک تو تبدیل نہیں ہوئی ۔ مٹی کے وہ ذرے تو تبدیل نہیں ہوئے جن کے دلوں میں رسولِ خدا کے نقشِ پا کی ہمراہی کی مسرت ہوتی تھی ۔ میں بھی شہرِ محبت کے در و دیوار کو نگاہِ شوق سے چوم رہا ہوں ۔ مسجدِ نبوی اور روضۂ رسول سے نظریں ہٹاتا ہوں تو کوچہ و بازار میں دورِ رسالت کا مدینہ منورہ چشمِ تصور کے سامنے گھوم جاتا ہے ۔

دیارِ مقدس کی سیر کرتے کرتے مجھے ایسا لگا جیسے میں عہدِ رسالت مآب میں پہنچ گیا ہوں وہی گلی کوچے ' وہی مناظر اور وہی لوگ ـــ رسول اکرمؐ کا گھر محل نہیں ' بنگلہ یا حویلی نہیں ' پتھر گارے کا ایک چھوٹا سا مکان ہے ۔ اب نہ وہ فرش تھا اور نہ وہ در و دیوار ہی تھے جو آپ کے عہد میں تھے لیکن فضا تو وہی ہے ' زمین آسماں تو وہی ہیں ۔ یہ گھر تحریکِ اسلام کا مرکز تھا اور یہاں ہی سے توحید و رحمت کا وہ سرچشمہ پھوٹا تھا ۔

جسے سارے عالم کو سیراب کرنا تھا ۔ آپؐ کا یہ مسکن مبارک دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ آپؐ کتنی سادہ زندگی گزارتے تھے ۔ سادگی آپؐ کی سنت حسنہ ہے لیکن یہ بات مسلمان بھول گیا ہے ۔ آپؐ کے ضبطِ نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ جیسے فقیر پہلے تھے ویسے ہی فقیر رہے ۔ پھونس چھپر میں رہتے تھے ۔ بوریے پر سوتے تھے ۔ موٹا جھوٹا پہنتے تھے ۔ غریبوں کی سی غذا کھاتے تھے ۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑے رہتے تھے ۔ غریبوں اور مجبوروں کی خدمت کرتے تھے ۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی آپؐ کو تامل نہ تھا ۔ آپؐ ایک عام کی طرح لوگوں سے ملتے تھے ۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے ۔ تمام عمر کی جد و جہد نے ... کے لئے بھی کچھ نہ چھوڑا حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا ۔

مدینہ منورہ میں میرا قیام صرف تین روز رہا ۔ یہ تین دن میری زندگی کے یادگار ترین اور

قدسِ آفریں ایام تھے۔ مدینہ کی پلیع صبحیں، مدینہ کی خوشگ شامیں، مدینہ کی روشن دوپہریں اور مدینہ کی خواب ناک راتیں بھلائے نہ بھول سکیں گی۔ مدینہ کی کھجوروں کی شیرینی، مدینہ کے پھلوں کی تازگی، مدینہ کے باشندوں کی خوش اخلاقی و مہمان نوازی آج تک دل پر نقش ہے۔

آخری سلام پیش کرنے کی غرض سے روضۂ رسولؐ پر حاضر ہوا تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا اور بدن کا رواں رواں درود شریف پڑھ رہا تھا۔ سے

یہ مشغلہ بھی عبادت سے کم نہیں خالد درود دل سے پڑھو نعت اگر زباں سے پڑھو

مدینہ سے رخصت ہوتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ دولت دارین چھینی جا رہی ہے۔ کون جانے دوبارہ اس شہر مہر و محبت کی زیارت نصیب ہو یا نہ ہو۔ حرم سے باہر آتے ہوئے حسرت و بے چارگی سے میں روضۂ رسول کو دیکھ رہا ہوں کہ ناگاہ میری نظر مسجدِ خضرا پر اٹھ جاتی ہے۔ وہاں ایک مزدور سیڑھی لگائے ہاتھ میں رنگ کی بالٹی تھامے سبز رنگ میں بھیگا ہوا برش گنبدِ خضرا پر پھیرنے میں معروف ہے۔ دل میں ایک ہوک سے اٹھی کہ اے کاش! یہ میں ہوتا۔

سلسلہ صفحہ ۵۹

چاہئیے۔ دیرپا ترقی کے لئے تعاون کو جنوب ایشائی علاقائی تعاون کی وہ نمک سرگرمیوں کے مرکزی نقطہ کا حصہ بنایا جانا چاہئیے۔

آئیے ہم ۱۹۸۹ء کے سال کو جنوبی ایشیا کے عوام کا سال بنائیں ہمیں شک و شبہات اور خدشات میں نہیں پڑے رہنا چاہئیے۔ اپنی امیدوں کو بلند کریں اور اپنے عزائم کو توانا بنائیں کریں تاکہ علامہ اقبال کا ہم پر یہ الزام نہ عائد ہو۔ :-

کیا رفعت کی لذت سے دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر پستی میں مثل نقش پا تو نے
رہا دل بستہ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

مولانا محمد برہان الدین

ملیشیا میں عالمی اسلامی کیلنڈر سیمنار

آج کل ہر قسم کے وسائل و اسباب کی فراوانی کی وجہ سے پوری دنیا گویا ایک مکان کا صحن بن گئی ہے کہ ایک حصہ کی خبر آن کی آن میں تمام گوشوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ اسی صورت کی افادیت و خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بعض اوقات وہی خوبی انتشار و اختلاف کی برائی پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہے

اس پہلو کا سب سے زیادہ تکلیف دہ منظر نئے چاند کی خبر ریڈیو وغیرہ پر نشر کرنے سے اس وقت سامنے آتا ہے جب کہ ایک ہی شہر میں کئی کئی عیدیں منائی جاتی ہیں۔ اس بری اور مضحکہ خیز حالت سے بچنے کے لئے مختلف حلقوں کی طرف سے تجاویز و تدابیر سامنے لائی جاتی ہیں۔ پھر جو حلقہ جس تدبیر کو صحیح و موثر سمجھتا ہے اسے روبہ عمل لانے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اور فطری طور پر دوسروں سے بھی اس کی تائید کا خواہاں ہوتا ہے۔ جس پر نہ ملامت کی جا سکتی ہے نہ الزام دیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی تدبیر شرعی اصول یا روح شریعت سے متصادم ہو تو علماء کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس کا نوٹس لیں اور دلائل شرعیہ کی روشنی میں اس کی غلطی واضح کریں کیونکہ رمضان کے روزوں اور ذی الحجہ کی قربانی کی طرح عید بھی عبادت ہے۔ صرف تہوار نہیں ہے ۔

سیمنار کی اصل غرض

اس سلسلہ میں جن باشعور ذی علم اور دین دار لوگوں نے اپنے اپنے دائرہ علم و عمل کے مطابق تدابیر سوچیں بلکہ دریافت کریں پھر انھیں بروئے کار لانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر الیاس صاحب کا ہے جو ملیشیا سائنس یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں جو فلکیاتی علوم کے ممتاز ماہر

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہونے کے ساتھ دینی مزاج کے حامل اور طبع سلیم کے بھی وارث ہیں موصوف نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرکے نئے چاند کی رویت کے امکان کا ایک طویل المیعاد چارٹ تیار کیا ہے۔ اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بھی انگریزی زبان میں

"A modern guide to Astronomical calculation of islamic calendar" لکھی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کر لینے کے لئے شاید تنہا یہ بات کافی ہو کہ اس پر دیگر ماہرین فن کے ساتھ "نگر پنج" رسالہ کے نائب ایڈیٹر نے بھی بہترین رائے ظاہر کی ہے کتاب میں ایک ایسا چارٹ بھی ہے کہ جس سے ساری دنیا میں ۱۳۱ سال تک کے ہر نئے چاند کا امکانی وقت اور تاریخ دریافت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ موصوف نے صرف علمی انکشاف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے عملی شکل دینے اور چارٹ کی افادیت سے روشناس کرانے کے لئے ایک وسیع تعارفی پروگرام بھی بنایا ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں میں پہلے علاقائی سطح کے سیمنار منعقد کرانا پھر عالمی پیمانہ پر ایک بہت بڑے سیمنار کا انعقاد شامل ہے۔ اسی سلسلہ کا پہلا علاقائی سیمنار "انٹرنیشنل اسلامک کلینڈر" پر ملیشیا کے مشہور شہر پینانگ کی سائنس یونیورسٹی ملیشیا میں ۸/تا ۱۰/جون ۱۹۸۸ء مطابق ۲۲/تا ۲۴/شوال ۱۴۰۸ھ جج ڈاکٹر الیاس صاحب کی کوشش اور دعوت پر منعقد ہوا۔ جس میں جنوبی دنیا پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، مالدیپ، سری لنکا، سنگاپور، جاپان، ملیشیا، انڈونیشیا، ہانگ کانگ، برونی، فلپائن، تائیوان، تھائی لینڈ، نیوزی لینڈ، فجی، آسٹریلیا، نیز امریکا وغیرہ ۲۵ ملکوں کے تقریباً ۷۰ نمائندے شریک ہوئے۔

سائنس دانوں کی اکثریت

سیمنار کے شرکاء میں زیادہ تر عصری تعلیم یافتہ اور سائنس داں یعنی علوم فلکی کے ماہر تھے علماء شریعت اور عربی داں کم تھے، ہندوستان سے راقم الحروف اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق پرو وائس چانسلر اور شعبہ جغرافیہ کے سابق صدر پروفیسر شفیع مدعو تھے لیکن پروفیسر صاحب نہیں پہنچ سکے۔ اس لئے راقم نے ہی ہندوستان کی نمائندگی کی۔

سیمنار کی نشستیں یونیورسٹی کے ایک ہال میں (جو دیوان کہلاتا ہے) ہوئیں یہ ہال ایسے ہی کاموں کے لئے مخصوص طور پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہاں مدرج کرسیاں لگی ہوئی تھیں یونیورسٹی کی تمام عمارتیں سادہ اور صاف ستھری ہیں یہ ہال بھی سادہ اور اوسط درجے کا ہے۔ — یونیورسٹی کی سڑکیں بھی اچھی اور صاف ستھری نظر آئیں فٹ پاتھ پر سرخ رنگ کی اینٹیں نہایت سلیقہ سے اور خوبصورت انداز میں بچھی ہوئی ہیں۔

یونیورسٹی اور ہماری قیام گاہ کے درمیان تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ [illegible] ایرکنڈیشنڈ کوچ سے طے کرایا جاتا تھا جو مہمانوں کے لئے مخصوص تھیں۔

رصدگاہ کا قیام اور علمی نمائش

ایک روز شہر سے تقریباً بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر تمام شرکاء ایسی جگہ لے جائے گئے۔ جہاں ایک طرف سمندر (بحر ہند) موجیں مار رہا تھا اور دوسری طرف متوسط درجے کی سرسبز پہاڑی کا خوشنما منظر تھا اسی پہاڑی کے کنارے ایک رصدگاہ کا سنگ بنیاد صوبہ پینانگ کے گورنر الحاج آونگ حسن نے رکھا۔ اس تقریب میں گورنر کے علاوہ اس صوبہ کے چیف منسٹر (جو چینی نسل کے بودھ ہیں) نیز دیگر معززین شریک تھے۔ اس جگہ ایک بہت بڑے میدان میں عارضی ٹینٹ لگا کر مہمانوں کی نشست اور ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور ایک علمی نمائش بھی لگائی گئی تھی جس میں فلکیات سے متعلق بہت سی مفید معلومات۔ تصاویر اور مختلف آلات کے ذریعہ فراہم کی گئی تھیں اور فلکیاتی مشاہدے کے قدیم آلات (اصطرلاب وغیرہ) بھی دکھائے گئے تھے۔ اور بعض ماہرین فلکیات، مثلاً ابن سینا رازی، کی قلمی تصاویر بھی دکھائی گئی تھیں۔ اور بجلی کے ذریعہ سیاروں کی [illegible] رفتار وغیرہ کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اس تقریب کی خبریں دوسرے روز وہاں کے انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ اس میں یہ بھی ذکر تھا کہ صوبائی حکومت نے رصدگاہ کے لئے ۸۵ ہزار ڈالر (غالباً ملیشیائی ڈالر۔ کیونکہ وہاں کے سکے کا نام بھی ڈالر ہے) کی امداد منظور کی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رصدگاہ کا منصوبہ ڈاکٹر الیاس صاحب کا پیش کردہ ہے ظاہر ہے کہ اس کی نگرانی ہی میں تحقیق اور مطالعاتی کام بھی ہوگا اور اُمید ہے کہ وہ اپنی دینی فکر اور اسلامی خدمت کے جذبہ کی بنا پر اس مفید وجدید ادارے میں اسلامی خدمت کے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ڈاکٹر الیاس صاحب کا اس سمینار سے اصل مقصد اپنے تیار کردہ چارٹ کا تعارف اور اس کی قدر و قیمت و افادیت سے روشناس کرانا تھا تاکہ اس مفید کام سے ساری دنیا فائدہ اٹھا سکے اور اس میں شک نہیں کہ اس چارٹ سے کم از کم یہ نفع تو یقیناً اٹھایا جاسکتا ہی ہے کہ اس میں دیئے ہوئے وقت و تاریخ پر چاند دیکھنے کا نتیجہ [illegible] جس دن رویت [illegible] امکان نہ ہو اس دن چاند دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے کی بات ماننے میں بہت [illegible] زیادہ احتیاط کی جائے بلکہ عام حالات میں نہ مانی جائے۔

ڈاکٹر الیاس صاحب نے سمینار کی متعدد نشستوں میں اس موضوع پر بہت مفید

معلومات افزا اور تحقیقی لکچر دئیے اور مختلف قسم کے نقشوں کے ذریعہ آسان بنا کر پیش کیا نیز فلکیاتی علوم سے متعلق بہت سی قیمتی معلومات فراہم کیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ لکچر س سیمینار کا اصل تھے سیمینار میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دیگر شرکاء نے بھی حصہ لیا اکثر نے زبانی بعض نے تحریری پروگرام کی تفصیل جو کہ خوبصورت کتابچہ کی شکل میں پہلے ہی تقسیم کر دیا گیا تھا۔

سیمینار کا عمومی رخ

راقم السطور اپنا مقالہ (عربی میں) پیش کرنے کی غرض سے گیا تھا چنانچہ سیمینار کی ایک مخصوص نشست جو علماء پر مشتمل تھی، میں پڑھا گیا۔ اس نشست کی صدارت کا بار بھی میرے ناتواں دوش پر رکھ دیا گیا تھا، چونکہ شرکاء کی زیادہ تعداد عصری تعلیم گاہوں کی فیض یافتہ تھی۔ مزید برآں یہ کہ ملیشیا میں انگریزی جاننے والے بکثرت ہیں بلکہ ملیشیائی زبان انگریزی (رومن) رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے زیادہ تر مذاکرات انگریزی میں ہی ہوتے تھے۔ شرکاء کی اکثریت جس ذہن و فکر اور ماحول کی تھی اس کے پیش نظر یہ بات قابل تعجب نہیں سمجھی جائے گی کہ عمومی رجحان یہ تھا کہ چاند کی پہلی تاریخ کا فیصلہ حسابی طریقہ پر۔ یا بالفاظ دیگر ڈاکٹر الیاس صاحب کے تیار کردہ چارٹ کے مطابق کرنا چاہیئے۔ رویت (آنکھ سے نئے چاند دیکھنے) پر دار و مدار نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسی سے اختلاف رونما ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ جزائے خیر دے ڈاکٹر الیاس صاحب کو کہ انھوں نے اپنے صحیح دینی ذہن و فکر کی بنا پر صاف کہہ دیا کہ چاند کی تاریخ کا فیصلہ کرنا علمائے شریعت کا ہی منصب ہے، ہمارا نہیں، ہم نے اپنی محنت کا حاصل علماء کے سامنے رکھ دیا ہے اب وہ اس سے جس طرح یا جس درجہ میں فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھائیں۔

سیمینار کی مذکورہ بالا تفصیلات سے قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن کی اکثریت صرف حسابی طریقہ پر نئے چاند کا فیصلہ کرنے کی خواہش مند۔ دوسری طرف وہ حضرات ہیں جو بہر صورت رویت (آنکھ سے نیا چاند دیکھنے) کے مدعیوں کے بیان پر فیصلہ کرنے پر مصر ہے خواہ اس روز حسابی و عقلی طور پر رویت کا امکان ہو یا نہ ہو گویا دونوں گروہ دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں راقم کا نقطۂ نظر درمیانی ہے۔ وہی سیمینار کے اندر اپنے مقالے میں مدلل طور پر پیش کیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ فیصلہ کا مدار تو شرعاً رویت پر ہی ہونا ضروری ہے۔ البتہ یہ تحقیق لازمی ہے کہ رویت حقیقتاً ہوئی ہو مگر واہمہ یا قوت متخیلہ کی کارفرمائی نہ ہو اس کے لیے حساب اور صحیح عقلی بنیادوں سے مدد لینا چاہیئے۔ کہ جس روز حسابی و عقلی طور پر رویت کا امکان نہ ہو اس دن کی رویت کا دعویٰ

کرنے والے کی بات ماننے میں بہت زیادہ احتیاط برتی جائے بلکہ عام حالات میں مانی ہی نہ جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ راقم کا نقطۂ نظر نہ صرف یہ کہ قابل توجہ سمجھا گیا بلکہ اس کی رعایت میں تجویز کے اندر یہ عبارت شامل کی گئی۔ حساب، رویت کا بدل نہیں ہے البتہ اس سے رویت کے فیصلہ میں مدد لی جا سکتی ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ :۔

یہاں اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا وہ یہ کہ جب سمینار میں اکثر شرکاء نے حسابی بنیاد پر (چارٹ کے مطابق) فیصلہ کرنے پر زور دینا شروع کیا تو راقم نے مناسب سمجھا کہ اپنے مقالہ کا کم از کم وہ حصہ ان کے سامنے آجائے جس میں نہایت قوی دلائل سے نئے چاند کے فیصلہ کے لئے رویت کی ضرورت ثابت کی گئی ہے لیکن دشواری یہ تھی کہ مقالہ عربی میں تھا اور (اردو قالب بھی موجود تھا) اکثر لوگ دونوں زبانوں سے ناواقف تو یہ تدبیر سوچی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر سنا دیا جائے چنانچہ پاکستان کے ایک بہت ممتاز اور خلیق سائنس داں سے رابطہ قائم کیا اور وہ ترجمہ کرنے پر آمادہ ہو گئے، انھیں مقالہ (کا اردو پیکر) دے دیا گیا۔ خداوند تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے معتدبہ حصہ کا ترجمہ کر دیا، اور یہ بھی کہا (راقم کو مخاطب کرتے ہوئے) مولانا میں تو آپ کا مقالہ پڑھ کر کنونسنس (CONVINCE) ہو گیا" مطلب یہ تھا کہ رائے بدل گئی اور اب رویت ہی پر فیصلہ کرنے کی بات صحیح معلوم ہونے لگی۔ اس پر راقم نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور ان کی سلامتی فکر اور مخلص ہونے کا اندازہ ہوا۔

سمینار کی بعض تجاویز :۔

سمینار میں پاس ہونے والی تجاویز کے اندر مذکورہ بالا تجویز کے علاوہ ایک یہ بھی تھی کہ ہر مسلمان حکومت اور ہر جگہ کی رویت کا فیصلہ کرنے والی اتھارٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس چارٹ سے جسے سمینار کے اکثر شرکاء نے "الیاس تھیوری" یا "الیاس پلان" کا نام دیا فائدہ اٹھائیں اور نئے چاند کا فیصلہ کرتے وقت اس سے مدد لیں (بلکہ فیا ناپر چلیں) کہ ملیشیا کی حکومت سے تو یہ اپیل کی گئی کہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کیا کرے۔ اور سننے میں تو یہ بھی آیا کہ ملیشیا حکومت نے یہ بات مان بھی لی ہے۔ اس جگہ یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ حسابی طریقہ سے فیصلہ کرنے کا رجحان علماء میں بھی پیدا ہونے لگا۔

چنانچہ سیمینار میں شریک ایک عالم نے ایک مشہور حدیث کا جس سے یہ حساب پر مدار رکھنے کی نفی ہوتی ہے (یعنی نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب الخ) عجیب وغریب مفہوم بیان کیا کہ وہ یہ رویت (دیکھنے) کے بعد چاند کی پہلی تاریخ کا فیصلہ کرنے کا حکم اس وقت تک ہے جب تک کہ حساب کا علم صحیح نہ ہو سکے۔ حساب کا علم ہوجانے کے بعد اسی کے مطابق فیصلہ کیا جاوے جس طرح تیمم کا حکم اس وقت تک ہے جب تک پانی نہ ملے۔ پانی مل جانے کے بعد تیمم درست نہ ہوگا۔" اس پر راقم نے عرض کیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ امت نے چودہ صدیوں تک تیمم کیا اور اب وضو کرنے کا وقت آیا۔

پینانگ شہر

ملیشیا جزیروں کا ملک ہے اس کے بہت سے بڑے شہر جزیروں پر آباد ہیں۔

پینانگ جہاں ملیشیا سائنس یونیورسٹی ہے (جس میں یہ سیمینار ہوا) وہ بھی ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام (PIHLAU, PENANG) یہی نام ایرپورٹ پر لکھا ہے PIHLAU ملیشیائی زبان میں جزیرہ کو کہتے ہیں یہ شہر سنگاپور سے شمال مغرب کی طرف ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوائی پرواز پر واقع ہے اسے ایک دوسرے جزیرہ سے ملانے کے لئے سمندر پر ایک بہت بڑا پل بنا ہے جس کی لمبائی سات کیلو میٹر بتائی گئی ہے۔ وہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے اسی سبب سے تمام عمارتوں حتیٰ کہ ایرپورٹ کی چھتیں اوپر سے ڈھلوان مخروطی شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ شہر کا جتنا حصہ ہم نے دیکھا وہ خوبصورت منظم طریقہ پر بنا ہوا نظر آیا۔ ملیشیا بھر کی سب سے اونچی عمارت ۴۴ منزلہ کمی تھیا ہے۔

سب سے زیادہ قابلِ ذکر عمارت ایک تاریخی مسجد کی ہے جو نہایت پر شکوہ اور خوبصورت ہے جو چھت گنبد نما یعنی گول ہے اس پر نہایت حسین سنہرا خربوزہ نما گنبد ہے جس پر سنہرا کلس حسن کو دوبالا کر رہا ہے۔ اس چھت کے نیچے ہزار سے زیادہ نمازی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجد میں ملحق شاندار عمارتیں ہیں وضو خانہ، غسل خانہ وغیرہ ہے۔ اس طرف کی ایک بہت بڑی مسجد سائنس یونیورسٹی ملیشیا کے احاطہ کے اندر بھی ہے، جو سعودی حکومت کی امداد سے تیار ہونے کی بناء پر شاہ خالد مسجد کہلاتی ہے۔ اس طرح کی مسجدوں میں سب سے اگلی صف سب سے چھوٹی ہوتی ہے اور ایسی ہی سب سے پچھلی، درمیانی صف سب

سے طویل ہوتی ہے پوری مسجد میں عمدہ قالین بچھا ہے اس کے باوجود سجدہ کرنے کے لئے علحدہ جانماز بیا ہو کہ ہر جگہ عام طور پر قالین سے بچا کر رکھتے ہیں اس طرح بچھی ہوتی ہیں کہ ان پر سجدہ کرتے وقت صرف سر اور ہاتھ رکھے جا سکیں پیر نہ رکھے جا سکیں۔

آبادی :-

یوں تو ملیشیا، معمولی مسلم اکثریت کا ملک ہے (۵۲ فی صد مسلمان ہیں) لیکن پنیانگ میں غیر مسلموں کو (چینیوں کو جو زیادہ تر بودھ ہیں) اکثریت ہے شاید اسی بنیاد پر پنیانگ (ملیشیا کے صوبہ پینیانگ) کا وزیر اعلیٰ بھی چینی ہے۔ وہاں ہندو بھی ہیں اور ایک مندر بھی، جو ہوٹل سے یونیورسٹی آتے جاتے نظر آتا تھا لیکن اس کی ساخت ہندوستان کے مندروں سے مختلف ہے۔ اس کے کچھ باہری حصے پر گہرے سبز رنگ کا روغن ہے۔

ملیشیا بالخصوص، پنیانگ میں سندھی بھی آباد ہیں جو زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں جن مقامی لوگوں سے ربط رہا ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں کے باشندوں میں تواضع، دینداری اور سادہ مزاجی ہے تکبر اور تصنع نہیں ہے۔ غالباً دینداری کا یہ اثر ہے کہ پتلون پر ایک خوبصورت تہبند گھٹنے تک استعمال کرنے کا رواج ہے۔ ملیشیا میں تبلیغی جماعت کے اثرات بھی نمایاں محسوس ہوئے ہر جگہ کی طرح وہاں بھی ایک مسجد میں مرکز ہے۔ عوام کی اقتصادی حالت بھی اچھی معلوم ہوئی؟ اس میں حکومت کی مساعی کا خاصا حصہ بتایا گیا۔

ایک خاص پھل :-

وہاں سر سبزی و شادابی عام ہونے کی وجہ سے بہت قسم کے پھل، ترکاری اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے لیکن وہاں کا ایک خاص پھل دریان ہے جو کٹھل جیسی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ پھل برما وغیرہ میں بھی سنا ہے کہ پایا جاتا ہے۔ البتہ ہندوستان میں نہیں ہوتا۔ اسے وہاں کے لوگ بہت شوق سے کھاتے اور بہت مقوی، مفید اور لذیذ بتاتے ہیں مگر اس میں ایک خاص قسم کی بدبو (لہسن کی بو سے ملتی جلتی ہوتی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ کریہہ) اتنی شدید ہوتی ہے کہ جس جگہ یہ پھل کاٹا جاتا ہے پورا علاقہ اس کے بو سے بس جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کیلئے ناقابل برداشت ہوتی ہے اس لئے اکثر بڑے ہوٹلوں میں یہ ہدایت لکھی ہوئی ہے "یہاں دریان لانا منع ہے" ہمارے ہوٹل میں بھی یہ ہدایت لکھی تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالباری

ارون شوری اور قرآن مجید

ارون شوری ہندوستان کے شہرت یافتہ پختہ کار اور منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ سلمان رشدی کشمیری مسلمان ہیں، جنہوں نے برطانیہ میں شہریت اختیار کرلی ہے۔ ثانی الذکر کا متنازعہ ناول۔۔۔ "شیطانی کلمات" عالم اسلام کے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے جس میں بظاہر طور پر قرآن اور حضور اکرمؐ کی سیرت کو مسخ کردیا گیا ہے۔ چنانچہ، اس متنازعہ اہانت آمیز ناول اور عام حضرت عیسٰی کی آخری خواہش پر دنیا میں سب سے پہلے وزیراعظم راجیو گاندھی نے امتناع عائد کرکے ہندوستان کو سبقت عطا کی۔ پھر متواتر پاکستان، اور جنوب ممالک کے ساتھ ساتھ نسلی حکومت، جنوبی آفریقہ نے بھی امتناع عائد کردیا۔ سلمان رشدی کو جو ۱۰/نومبر کو اپنے متذکرہ ناول کی رسم اجرائی کے لئے جنوبی آفریقہ جانا تھا۔ مجبوراً اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ رشدی نے جو کھلا خط وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے نام ارسال کیا تھا۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا نے اس کا معقول جواب السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں دے دیا ہے۔ صحافی ارون شوری کلدیپ نائر اور کرانجیا کی طرح ضیاء مرحوم سابق صدر پاکستان سے بعض انٹرویو لے چکے ہیں۔ ۱۹/اکتوبر انڈین اکسپرس، ایڈیشن حیدرآباد میں موصوف نے اپنے مضمون بعنوان "مگر وہ آیات کیا ہیں"؟ میں نہ صرف رشدی کی "شیطانی کلمات" کی تائید کی ہے بلکہ ام الکتاب قرآن مجید کو نشانِ ملامت بنایا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ کہ اس مقدس کتاب میں دیگر مذاہب کے خلاف عدم رواداری موجود ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں ازل سے ایک ہی دین، دین اللہ رہا لیکن شریعتیں حالات کے اعتبار سے بدلتی رہیں۔ ہر زمانہ میں ایسے لوگ بھی دنیا میں رہے۔ جنہوں نے شرک منافقت اور فسق و فجور کو اپنائے رکھا۔ قرآن کے بعض، بنیادی تعلیمات یہ بھی ہیں۔ مومنین جو اعمال صالح سے لیس رہیں گے۔ الہامی کتب و پیغمبروں کی تعلیمات پر عمل

کریں گے ۔ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں گے ۔ وہ سب جنت میں جائیں گے ۔
(بحوالہ سورۃ البقر) بجز اللہ کے کوئی اور قابل پرستش نہیں ۔ قرآنی تعلیمات کا مخاطب صرف مسلمانوں ہی سے نہیں، دیگر اور سب انسانوں (ماضی، حال، مستقبل) سے بھی ہے دنیا کی ہر قوم و ملت اور ہر ملک کو پیغمبروں سے سرفراز کیا گیا ۔ اسلام ایک مکمل اور مکمل دین حیات ہے ۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ دوسرے اور مذہبوں اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت ملحوظ رکھیں ۔ اگر ماں باپ غیر مسلم بھی ہوں تو مسلمان ان کی بھی عزت اور بزرگی سے گریز نہ کریں ۔ انسان کی ہم نے بڑی مشقت سے تخلیق کی ۔ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر عناصر ترکیبی سے پیدا کیا ۔ انسان فطرتاً عجلت پسند ہے ۔ فتنہ پردازی قتل سے بڑھ کر شدید تر گناہ ہے ۔ اگر تم کو کوئی سلام کرے تو اس سے زیادہ خوبصورت طریقے سے جواب دو ۔ وغیرہ، وغیرہ —

صحافی ارون شوری نے قرآن مجید پر سخت تنقید کی ہے ۔ اس کی ایک بڑی وجہ قرآن فہمی یکسر فقدان ہے ۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ بیشتر مغربی ممالک اور بالخصوص متحدہ امریکہ میں اسلام دشمن عناصر نے قرآن کے جعلی، نقلی، خود ساختہ اور ملاوٹی ترجمے پھیلا دیئے ہیں ۔ جو اصل قرآنی مفہوم سے مطابقت ہی نہیں رکھتے ۔ اور پھر ایسے نقلی جعلی اور ملاوٹی نسخوں کا مغربی مصنفین نے حوالہ دے کر قرآن اور سید البشر کی سیرت پاک کو مسخ کرنے کی بھرپور سعی، ناکام کی ہے ۔ ایسا لگتا ہے، بلکہ یقین ہے کہ ایسے ہی نسخوں سے سلمان رشدی اور ارون شوری نے استحصالی استفادہ کیا ہے ۔ ہم ان دونوں کی ذات پر حملہ نہیں کریں گے ہمارا ایمان اور قرآن اس بات کی اجازت نہیں دیتے ۔ ارون شوری نے مسخ کردہ ترجموں کا حوالہ دے کر قرآن و اسلام کی بے حرمتی کی ہے ۔ مثلاً سورۃ محمد ۴۷ کی آیات ۴ اور ۵ کا انگریزی ترجمہ سرے سے غلط ہے ۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ انہوں نے قرآن کے کس انگریزی ترجمہ سے استفادہ کیا ہے ؟ ۔ وہ کس حد تک مصدقہ اور خود ساختہ اور جعلی ہے ؟ انگریزی زبان میں کئی اسکالرس نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں ۔ جن میں بہت کچھ تضاد ہے ۔ شاہ بانو نان نفقہ مقدمہ کا عدالتی فیصلہ متعلقہ آیت کے غلط انگریزی ترجمے سے عبارت ہے

سورۃ البقر ۲ کی آیات ۱۸۶ تا ۱۸۹ ارون شوری نے جو حوالہ انگریزی ترجمے سے دیا ہے ۔ اصل قرآن میں وہ مفہوم ہی نہیں ہے ۔ نیز انہوں نے سورۃ انفال آیات ۵ اور ۷۰ کا مفہوم مسخ کیا ہے ۔ موصوف نے سورۃ الاحزاب ۳۳ آیت

سے ۳۶ وجس کا یہ مطلب ہے کہ ــ" اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ
صریح گمراہی میں پڑا" ۔ بھلا اس میں کون سی بات قابل اعتراض ہے؟

بعض قرآنی آیات خاص خاص مواقع یا دوران غزوات نازل ہوئی ہیں ۔ اُن کا اوون
شوری نے حوالہ دے کر قصداً غلط فہمیاں کی ہیں ۔ اور قرآن کو مسخ کیا ہے ۔ بعض آیات قرآنی کو ان
کے متن سے علحدہ کر کے پیش کیا گیا ہے ۔ یہ سب کوشش اس امر کی غماز ہیں اور یہ کھلی کھا
رہی ہیں کہ قرآن کو غلط طور پر پیش کر کے مسلمانوں کو بدنام کرنے کا ایک منظم بین الاقوامی سازش
کارفرما ہے ۔ علمائے دین کے لئے یہ ایک کٹھن امتحان اور چیلنج ہے ۔ فاضل مضمون نگار نے
جن آیات کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے وہ خود ساختہ، تراشیدہ، مسخ شدہ ہیں ۔ اگر قرآن میں
حضرت عیسیٰ مسیح کے عرش پر اٹھا لیے جانے کا تذکرہ اور صلیب کئے جانے کی اور تثلیث کی
تکذیب ہے تو اس سے کون سا فتنہ بھڑک اٹھتا ہے ۔ یہاں یہ بھی صحیح ہے کہ سورۃ التوبہ کی
آیت نمبر ۳۰ کے ذریعہ یہودیوں کے اس عقیدے کی بھی تکذیب کی گئی ہے ۔ کہ عزیر خدا کے
بیٹے تھے ۔ نہ ہی حضرت عیسیٰ مسیح خدا کے بیٹے ہیں ۔ یہ قرآن میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے ۔
اگر کوئی عیسیٰ ابن مریم اور عزیر کو خدا کا بیٹا تصور کرے تو یہ اس کا اختیار ہے ۔ مومن تو اس
کی تکذیب ہی کرے گا ۔ دوسروں کو ان کا اپنا آزادانہ حق ہے ۔ قرآنی تعلیمات میں دین کے
معاملہ میں غیر مسلموں پر کوئی جبر نہیں ہے ۔ اور نہ اسلام کو کسی اور مذہب سے ہے ۔ ویسے
یہ بھی سوال ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں برس قدیم مقدس و مذہبی کتب پر عصری قوانین و تدوین
شدہ جمہوری یا غیر جمہوری آئین کی مدد سے امتناع عائد کرنے کی کوشش کیا جواز رکھتی ہیں؟
کیا اس کا اختیار ــ ڈکٹیٹروں اور شوریوں کو سونپا جا سکتا ہے ۔

سلسلہ صفحہ ۶۳

لاگت آتی ہے ۔

یہ ڈھانچہ چوہے کی زد اور نمی سے محفوظ رہتا ہے ۔ اور اس میں دھونی بھی
دی جا سکتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ ڈھانچہ ہر قسم کے موسم میں گیہوں، دھان، مکی
وغیرہ محفوظ رکھنے کے لئے مناسب ہوتا ہے ۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد فروری ۱۹۸۹ء

اختر الواسع

جامعہ ملیہ اسلامیہ بل

[illegible] ۱۹۸۸ء [illegible]

حکومت ہند نے تاخیر سے سہی، بالآخر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ عطا کرنے والے بل کو ۲۹ اگست کو راجیہ سبھا اور ۲ ستمبر کو لوک سبھا سے پاس کرا لیا۔ یہ کام آزادی ملنے کے فوراً بعد ہو جانا چاہیے تھا، اس لیے کہ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین "جامعہ ہی صرف وہ واحد جگہ ہے جو ہمیں اس وقت کی یاد دلاتی ہے جب ہندوستانی مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شانے سے شانہ ملا کر وہ گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کی آزادی اور حریت کے لیے لڑتے رہیں گے۔ جب خدمت اور قربانی کی سیاست جیسے قطعی غریب راستے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس وقت گاندھی جی کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے اور حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کی سرپرستی میں مسلمانوں میں چند بہترین اور منتخب نوجوانوں نے اپنی زندگیاں تعلیم کے اس کام کے لئے وقف کر دیں، جو بہت وقت لیتا ہے اور صبر طلب ہے۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۰ء میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات کے دوران ان لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوئی، جو کہ غیر ملکی سامراج سے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ سرکار کی مدد سے چلنے والے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ وہ تعلیمی اداروں کی آزادی کو ملک کی آزادی کی جدوجہد میں پہلی منزل سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ جداگانہ قومیت کے بجائے متحدہ قومیت کے نقیب تھے۔ اسی لئے سن [illegible] میں گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالمجید خواجہ صاحب کی قیادت میں سر سید کے قائم کردہ ایم اے او کالج سے اساتذہ اور طلباء کے ایک گروہ نے [illegible] کی اختیار کی جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین

کا نام اور ادارہ کا عمل بڑا تاریخی اور تابناک ہے۔

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے علی گڑھ میں جو سفر خیموں سے شروع کیا تھا وہ تقریباً پانچ سال بعد اپنے ارتقاء کی پہلی منزل طے کر کے دہلی پہنچا اور یہاں قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں رہ کر جنوبی دہلی میں جمنا کے کنارے واقع اوکھلا میں ایک نئی بستی جامعہ نگر کی آبادکاری کا موجب بنا۔ اُنیس (۱۹) سال کے لمبے سفر کے بعد ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ سوسائٹی وجود میں آئی اور ۱۹۳۹ء میں اس کا باضابطہ رجسٹریشن بھی کرا لیا گیا۔ اس کے دستور میں اس کے مقصدِ قیام اور نصب العین کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا۔

ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں ایسی دینی اور دنیوی تعلیم کو جو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق اور صحیح اصولِ تعلیم پر مبنی ہو رواج دینا اور اس مقصد کے لئے مناسب تعلیمی ادارے قائم کرنا ان کا انتظام کرانا اور ان کی نگرانی کرنا۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سفر جاری رہا اور پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی کے لفظوں میں جامعہ والے باغبانیِ صحرا کا قاعدہ رقم کرتے رہے، یا یوں کہیئے کہ جنوں کی حکایات خونچکاں لکھتے رہے۔" ملک آزاد ہوا تو جامعہ والوں کو یقین تھا کہ ان کے ایثار و خدمات کا خصوصاً تعلیم کے میدان میں اعتراف کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ مل جائے گا۔ لیکن بھرپور اجتماعی اور انفرادی کوششوں سے اتنا ہوا کہ جون ۱۹۶۲ میں جامعہ کو صرف "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تحت یونیورسٹی" یعنی ڈیمڈ ٹو بی یونیورسٹی کا درجہ مل پایا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے ایماء، ڈاکٹر کے۔ ایل شریمالی جو اس وقت وزیر تعلیم تھے کی تائید سے حکومتِ ہند اور یو۔ جی۔ سی دونوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دستور میں درج اغراض و مقاصد کو پوری طرح باقی رکھا جس میں "ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں دینی اور دنیوی تعلیم" کے مذکورہ بالا مقصد کی توثیق کی گئی۔ خود جامعہ والے بھی یہی چاہتے تھے اور اس کا ثبوت وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل شریمالی کے نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۱۷ مئی ۱۹۶۰ء کو راج بھون، پٹنہ سے انہیں لکھا۔ ذاکر صاحب کے لفظوں میں۔

" حکومت کو چاہیئے کہ وہ ایسا موثر قدم اٹھائے، جس سے جامعہ کے بقا اور ترقی کی اس طرح ضمانت ہو جائے کہ اس کی خصوصیات اور اس کا امتیازی رنگ و روپ فنا نہ ہونے پائے جامعہ کی امتیازی خصوصیات ہیں اساتذہ اور طلبہ کی آزاد اجتماعی زندگی، جامعہ کا نظم و نسق پوری طرح اس کے کارکنوں کے ہاتھوں میں ہونا، جامعہ کا اقامتی کردار، اُردو یا

ہندوستانی کا ذریعۂ تعلیم ہونا، ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کا کام، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا میلا ملا اور ہمہ گیر تعلیمی پروگرام جس میں ہر طرح کی اور ہر منزل کی تعلیم شامل ہے۔ اس ادارہ کو ایک طرف تو اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ اس کے کام اور اس کی امتیازی خصوصیات کا ملک کے وسیع تر نظام تعلیم کے ساتھ ایک رشتہ اور تعلق قائم ہو جائے۔"

"یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ماتحت یونیورسٹی" کی حیثیت سے جامعہ ترقی کی منازل طے کرتی رہی لیکن جامعہ والوں کی یہ خواہش برابر بنی رہی کہ جامعہ اسلامیہ کو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ "مرکزی یونیورسٹی" کا درجہ ملے۔ کوششیں برابر جاری رہیں اور اب جب "جامعہ ملیہ اسلامیہ بل ۱۹۸۰ء" پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو پتہ چلا کہ حکومت جامعہ ---- --- ---- ----

کو صرف مرکزی یونیورسٹی نہیں بنا رہی بلکہ اس کے اغراض و مقاصد، خود مختاری اور جمہوری ا اور اپنے پر سیاہی پھیر کر اسے وزارتِ تعلیم کے ماتحت ایک ادنیٰ شعبے کا روپ دے رہی ہے۔

یہ ادارہ جو متحدہ قومیت، سامراج مخالف جذبہ، سیکولر اقدار، مخلوط تہذیب، مشترکہ ثقافت، روشن خیالی کے علمبردار نامور بزرگوں نے ایک ایسے زمانے میں قائم کیا تھا جب بقول ڈاکٹر صاحب "اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت آئی تھی اور جب ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں نے آزادیٔ وطن کے لئے متحدہ کوشش شروع کی تھی" اور مسیح الملک حکیم اجمل خان کے لفظوں میں "اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا" نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ اور بابائے قوم مہاتما گاندھی نے اس کی تائید کی اور پروفیسر محمد مجیب بقول:۔

"مہاتما گاندھی نے سب سے پہلے ہندوستان کی تعلیم میں آزادی کو معیار قرار دیا۔ اور انھیں اس پر بہت اصرار تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک اسلامی ادارہ ہو، ہمارے لئے یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا، وہ اسے خالص عقلی نقطۂ نظر سے صحیح مانتے تھے"

"جامعہ ملیہ اسلامیہ بل ۱۹۸۶ء کے شروع ہی میں اس ادارہ کی جو تعریف متعین کی گئی ہے اس میں مہاتما گاندھی کے علاوہ تمام بانیانِ جامعہ کے نام حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "اس سے مراد وہ ادارہ ہے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور ۱۹۱۹ء میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات کے دوران گاندھی جی کی سرکاری امداد سے چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کی اپیل پر قائم ہوا" لیکن اس میں اس ادارہ کے بانیوں "شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین" کے نام شامل نہیں کئے گئے اس پر بھی پارلیمنٹ کے

دونوں ایوانوں میں آزادی وسائل کی ترقی کے مرکزی وزیر پی۔ شیو شنکر سینہ ٹھوک کر یہ اعلان
ہیں کہ اس ادارے کا تاریخی کردار محفوظ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حکومت ان ہستیوں
کے ناموں کو اس "ادارہ کی تعریف" میں شامل کرنے سے ہچکچا رہی ہے، جن کے ایثار و قربانی کے
کے طفیل اس ملک کو آزادی اور کانگریس پارٹی کو حکمراں جماعت بننے کا موقع ملا۔ قومیت
کے علمبردار ان جلیل القدر قوم پرور مسلمانوں کے ناموں تک کے ساتھ حکومت کا یہ سوتیلا
کا سلوک ہی فرقہ پرستوں کو آگے آنے اور شک و شبہ کی فضا بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔ کیا
آزادی کی چالیسویں سالگرہ منانے کے بعد اتنی جلدی ان بزرگوں کے ناموں اور کاموں کو بھلا
دینا ہی ہماری تاریخ ہے؟ اور کیا اسی کو ہماری حکومت جامعہ کا "تاریخی کردار" قرار دے
رہی ہے؟

پی۔ شیو شنکر صاحب نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں یہ یقین دہانی بھی
کرائی کہ اس بل کے ذریعہ "جامعہ کا بنیادی کردار" برقرار رہے گا۔ اب وزیر موصوف کا
"بنیادی کردار" سے کیا مطلب ہے؟ یہ تو وہ ہی جانیں لیکن جہاں تک جامعہ کا دستور، اس
ادارہ کی روایات اور اس کے نصب العین کا تعلق ہے پارلیمنٹ سے پاس شدہ بل میں نہ صرف
ان سے انحراف کیا گیا ہے بلکہ ان کو یکسر بدل دیا گیا ہے۔ جامعہ کے دستور میں اس کے جو "اغراض
و مقاصد" بیان کئے گئے ہیں اور جنہیں ۱۹۶۰ء وشوا بھارتی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر
جسٹس ایس۔ آر۔ داس کی سرکردگی میں قائم اس کمیٹی نے بھی منظوری دی تھی جس کے دیگر
ارکان میں مشہور مورخ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر تارا چند، دیو آنند گھار، مولانا حفظ الرحمٰن (ایم۔ پی)،
احمد محی الدین مرحوم (مرکزی نائب وزیر شہری ہوا بازی) پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس
چانسلر جسٹس تیجا سنگھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی،
اتر پردیش اور اڑیسہ کے سابق گورنر اور اس وقت راجیہ سبھا کے رکن نواب اکبر علی خان،
مشہور ماہر تعلیم سید نوراللہ (سابق پرو۔ وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب شامل تھے۔ یہی وہ اغراض و مقاصد تھے
جنہیں ۱۹۶۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو "یو۔ جی۔ سی کے ماتحت یونیورسٹی" کا درجہ دیتے
وقت اس وقت کی حکومت نے بھی بغیر کسی ترمیم کے قبول کیا تھا۔ وہ "اغراض و مقاصد" کیا
تھے؟ ان کی فہرست بہت طویل ہو جائے گی لیکن ان میں سے دو اہم ترین "اغراض و مقاصد"
درج ذیل ہیں:۔

۲ (الف) "عام طور سے ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی ترقی کے لئے کوشش کرنا اور تعلیم کے صحیح اصولوں اور قومی زندگی کی ضروریات کے مطابق اس کا انتظام کرنا ۔۔۔"

۳ (ب) "جامعہ کی نگرانی اور انتظام میں چلنے والے تمام اداروں میں تعلیم کی ہر منزل میں عام طور سے اردو ذریعہ تعلیم ہوگی ۔ مگر خاص صورتوں میں کسی دوسری زبان میں بھی تعلیم دی جا سکے گی ۔"

موجودہ "بل" میں یہ دونوں باتیں شامل نہیں ہیں ۔ پہلے اور بنیادی مقصد کے بارے میں پی شیو شنکر نے یہ کہا کہ انہوں نے بہت سے مسلمانوں سے بات کی اور وہ "خاص طور پر مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی ترقی ۔۔۔۔" جملے کے ذکر کی شمولیت کے خلاف تھے ۔ ہمیں بہر حال یہ جاننے کا تو حق ہے کہ وہ کونسے مسلمان تھے جن سے وزیر موصوف نے بات کی؟ دوسرے ان کو مسلمانوں کی جانب سے یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ بل" میں اس بنیادی مقصد کی مخالفت کریں؟ پھر حکومت نے کن بنیادوں پر ان مسلمانوں کا گفتگو کے لئے انتخاب کیا؟ کیا اس مسئلے پر صرف مسلمانوں سے ہی گفتگو کرنے کا وزیر موصوف کا یہ دعویٰ خود اس بات کا ثبوت نہیں کہ شعوری طور پر وہ بھی اسے مسلمانوں کا ہی ادارہ سمجھتے رہے ہیں ۔؟ ایک سوال جو یہاں اور اٹھتا ہے وہ یہ کہ ۱۹۶۲ء میں جن اغراض و مقاصد کو اس ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر کے. ایل. شریمالی کو تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا اور نہ ہی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس پر جامعہ کو اپنے ماتحت یونیورسٹی کا درجہ دیتے ہوئے اعتراض کیا تو پھر آج ہماری حکومت کو ان کے تسلیم کرنے میں کیوں جھجک ہے؟ ۔۔۔۔

اگر ۲۶ سال تک اس سے سیکولرزم کو نقصان نہیں پہنچا اور ہمارے نظام تعلیم کے لئے یہ مضرت رساں ثابت نہیں ہوئے تو موجودہ بل میں اس کے شامل کئے جانے میں کیوں دشواری ہو رہی ہے؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، کارکنوں اور اسکولوں کے ۔۔ اساتذہ کی تمام انجمنوں نے بھی شروع ہی سے ان "اغراض و مقاصد" کو جامعہ سے متعلق قانونی مسودہ میں شامل کئے جانے کی مانگ کی تھی ۔ اور انہیں موقعہ بموقعہ اس کی مثبت الفاظ میں یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی ۔

یہ عجیب بات ہے کہ حکومت جامعہ ملیہ اسلامیہ سوسائٹی (رجسٹرڈ ۱۹۳۹ء) کو ختم کر کے جامعہ کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیتے وقت اس کی تمام املاک منقولہ و غیر منقولہ کو تو اپنے قبضہ میں لینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتی لیکن وہی حکومت اسی سوسائٹی کے

میسور نظام آف ایسوسی ایشن میں شامل اس کے " اغراض و مقاصد " کا حصہ ہے :
بل ۔ شوشنکر صاحب نے لوک سبھا میں ایک یقین دہانی یہ بھی کرائی ہے کہ " حکومت
جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خود مختاری میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی " ۔ تو اس پر ہمیں بھی کوئی شک و شبہ
اس لئے نہیں ہے کہ وہ اس ادارہ کی خود مختاری اور جمہوری ساخت کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ کیا
سکتا ہے وہ مذکورہ " بل " کے ذریعہ حکومت نے کر ہی دیا ہے ۔ اور اب جامعہ ملیہ اسلامیہ
حیثیت " محکمہ تعلیم کے ایک محض معمولی شعبہ " سے زیادہ نہ رہ نہ رہ گئی ہے ۔ اس لئے کہ
کی دفعہ ۴۴ کی ضمنی دفعات کے تحت ، حکومت نے یہ اختیار تک حاصل کر لیا ہے کہ ا
یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نہ چاہے تب بھی وزیٹر (یعنی دراصل محکمہ تعلیم کے افسر) جا
کے ضوابط میں کوئی بھی ترمیم و اضافہ خود ہی کر سکتے ہیں ۔ اور یونیورسٹی ان کی پابند ہوگی
جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں نے ایک طویل جد وجہد کے بعد تعلیمی اور انتظامی ا
میں اپنے لئے انتخابات کے ذریعہ نمائندگی کا حق حاصل کیا تھا ۔ لیکن تمام کارخانوں ، صنعتی ادا
اور پنچایتی کی راج کے لئے دیہاتوں تک میں انتخابات کے ذریعہ نمائندگی کے جس جمہوری طریقہ
حکومت تسلیم کرتی ہے ۔ اسی حق سے تعلیم کے اس مرکز میں دانشوروں کو اور پڑھے لکھے لوگوں
اس بل کے ذریعہ اسی حکومت کردیا ہے ۔ اور وائس چانسلر کے ذریعہ نامزدگی کے نا روا ا
کچھ روا رکھا گیا ہے ۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی اور علیگڑھ یونیورسٹی کے اسا
اور کارکنان کو یہ حق ہوگا کہ وہ انتخابی بنیادوں پر اپنی جمہوری نمائندگی سے فائدہ اٹھائیں لیکن
میں نہیں ۔ اسکولوں کے اساتذہ کو تو ان کے انتظامی بورڈ میں ہر طریقے سے نمائندگی سے محروم
گیا ہے ۔ کیا یہی جمہوری فکر و عمل ہے ؟ اور کیا یہ بات اس حکومت کو زیب دیتی ہے
خود انتخابی طریقے سے تشکیل پا کر وہ ایک منتخب پارلیمنٹ کے ذریعہ ایسے غیر جمہوری آئین
ہیں اس سے آمریت اور کلیت پسندانہ اندازِ فکر و نظر کی بو نہیں آرہی ہے ؟
اس بل میں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کی انفرادی آزادی اور عدالتی چارہ
کے حق کو غصب کرنے والی دفعات بھی رکھی گئی ہیں ۔۔۔ مثلاً دفعہ ۲۹ کی ضمنی دفعات
میں کہ اب جامعہ اور اس کے ملازمین کے تنازعات کا فیصلہ ایک مصالحتی ٹریبونل کر
اور اس کے فیصلے کو کسی سول عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا ۔ کیا یہی عدل و انصاف کے
جذبۂ احترام ہے ؟ اور کیا یہ ہمارے دستور میں درج بنیادی حقوق کی پامالی نہیں ہے
اس بل کی دفعہ ۷ میں یونیورسٹی کی داخلہ پالیسی کو تک طے کر دیا گیا ہے ۔ اور علاوہ

کے لئے اصول وضع کر دیے گئے ہیں جن کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ اب اقتصادی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کی بنا پر اپنے طالب علموں اور اپنے ملازمین کے بچوں تک کے لئے شاید کوئی رعایت نہیں کر پائے گی؟ اس لئے کہ مذکورہ بالا دفعہ میں لکھ دیا گیا ہے کہ "شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب، سماجی طور معذور اور خواتین" کے علاوہ کسی کے لئے داخلے اور ملازمتوں میں ریزرویشن قانون کے خلاف" ہوگا۔ اب ایک طرف تو حکومت اقلیتوں اور کمزور طبقات کو ابھارنے کے لئے بیس نکاتی اور پندرہ نکاتی پروگراموں کا اعلان کرتی ہے۔ اور دوسری جانب ان اداروں کو بھی جو کہ برسوں سے اقلیتوں اور کمزور طبقات کی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ان کے اختیارات کو بھی سلب کر رہی ہے؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اس سلسلے میں وزیر موصوف کا یہ کہہ دینا کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" والے جیسا چاہیں اپنے ادارہ کو چلائیں، کیا زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ اور ہے اس لئے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مستقبل کے منصوبے اور پالیسیاں اس "بل کے مندرجات و مشمولات" کے ذریعے تشکیل پائیں گے جناب پی، شیو شنکر کے زورِ بیان" کی بنیاد پر نہیں۔ اس لئے کہ ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

یہی وہ تاریخی و بنیادی اور جمہوری حقائق ہیں جن کی وجہ سے جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں نیز طالب علموں تک کی تمام انجمنیں اس بل میں ترمیمات کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ سیاسی داؤ آزماؤں سے جامعہ جیسے تعلیمی اداروں کو محفوظ رکھنے کے لیے حکومت خود بھی معقولیت کا رویہ اپنائے گی اور جامعہ برادری کے جائز مطالبات کو مان لے گی کیونکہ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین:-

جامعہ جہاں اسلامیہ ہے، دوسری طرف قلیمہ بھی ہے۔ وہ اپنے اندر ایک طرف اسلامی روایات اور تعلیم کو زندہ کرے گی اور اسی کے ساتھ دوسری طرف متحدہ قومیت کی تعمیر ۔۔۔ کی سعی کرتی رہے گی۔

کیا اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے گا؟ کیا جامعہ کو اپنے مقدس مشن کے لئے سعی و فکر و عمل کی حکومت اجازت دے گی؟ یہی وہ سوال ہیں جن کا ہم حکومت سے موجودہ بل میں ترمیمات کا مطالبہ کر کے جواب چاہتے ہیں۔

کابینی سب کمیٹی کے سامنے پیش کردہ

"متحدہ مجلس عمل برائے اردو کے مطالبات"

نظم و نسق میں استعمال

(۱):۔ آرٹیکل ۳۴۵ کے معنوں میں بحیثیت مسلمہ سرکاری زبان اردو کے موقف کو دستور کی دفعہ ۳۴۷ اور قانون سرکاری زبان بابت ۱۹۶۶ء کی دفعہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ دفعہ ۷ اردو والوں کے مطالبہ پر شامل کی گئی لیکن اس کے نتیجے میں تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ قانون کو سرکاری طور پر مسلمہ زبان کا تعین کرنا چاہئیے اور عاملہ کے لئے ایسے خطوط رہنمائی وضع کرنا چاہئیے کہ دوران مقاصد کا تعین کرتے ہوئے جن کے لئے زبان استعمال کی جا رہی ہے گزٹ اعلامیہ جاری کر سکیں۔ اردو کے نمائندہ کی شمولیت کے ذریعہ سرکاری زبان کمیشن کے دائرہ کار کو وسعت دینی چاہئیے۔

(۲) جی او ۲۷۲ اور جی او ۳۷۱ میں کہا گیا ہے کہ اہم قوانین، کو اعداد و اردو میں شائع کرنا چاہئیے۔ لیکن جی او ۳۷۱ کے ساتھ منسلک شیڈول میں صرف ... اور ایکشن نوٹسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) جن مقامات پر اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۰ فیصد ہو۔ اقل ترین سرکاری مقاصد کے لئے اردو استعمال کی جانی چاہئیے جیسا کہ کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ اس میں نہ صرف قوانین و ضوابط بلکہ رائے دہندوں کی فہرستیں بلدیہ اور الکٹریسٹی کے بل راشن کارڈ اردو میں دستاویزات کے رجسٹریشن کی اجازت عدالتوں میں اردو میں ریکارڈ اور گواہیاں درج کرنے اور اگر اردو میں بیان دیا گیا ہو تو مطالبہ پر فیصلہ کا اردو [illegible]

ترجمہ فراہم کرنے کی سہولت بحال ہے۔

(۴) اس بات پر غور دیا گیا کہ اگر کسی ریاست میں کوئی مخصوص لسانی اقلیت آبادی کا ۳۰ فیصد ہو تو ریاست دو لسانی ہونی چاہیے اسی اصول کے مطابق ضلع اور نچلی سطح کے انتظامیہ مثلاً منڈلوں، پنچایتوں یا بلدیات میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ۳۰٪ ہو انتظامی طور پر دو لسانی ہونی چاہیے۔

(۵) ایسے علاقوں میں جہاں اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کی گئی ہے اردو میں پیش کردہ درخواستوں کا اردو ہی میں جواب دیا جانا چاہیے اور ایسے انتظامی یونٹوں سے "جب بھی ممکن ہو" کی شرط ختم کر دینی چاہیے۔

(۶) اب جب کہ سکریٹریٹ خدمات میں بھرتی کے لئے اردو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کی جا چکی ہے سکریٹریٹ کو اردو درخواستوں کا اردو میں جواب دینا چاہیے اور تمام جی او زو غیرہ گزٹ میں تلگی اور انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی شائع کرنا چاہیے۔

تعلیمی مطالبات

(۱) مدارس میں جو ایسے علاقوں کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں جہاں اردو بولنے والی آبادی ۱۰ فیصد سے زائد ہے اردو کی متوازی جماعتیں قائم کرنا چاہیے اور ایسے سکشن کھولنے کے لئے طلبا کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اردو اور تلگو طلباء کے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے سے بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے مصارف کم ہوں گے۔ اتحاد اور یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا اور اردو طلبا کو تلگو سیکھنے میں آسانی ہوگی کیونکہ تلگو طلباء سے ان کا میل جول بڑھے گا اور وہ ان سے بات چیت کریں گے۔

(۲) غیر اردو میڈیم مدارس میں اردو مادری زبان کے طلبا کو تیسری جماعت سے اردو پڑھائی جانی چاہیے۔

(۳) اردو میڈیم مدارس میں تیسری جماعت سے تلگو پڑھانا چاہیے۔ چنانچہ پرائمری تعلیم مکمل کرنے تک کافی تلگو سیکھ جائیں گے تو وہ کسی وجہ سے ترک تعلیم یا تلگو میڈیم ہی کیوں نہ اختیار کریں۔

(۴) انگریزی چھٹی جماعت سے پڑھائی جانی چاہیے چنانچہ طلبا، ایس، ایس، سی، تک

بقیہ صفحہ ۹ پر

پروفیسر عبدالسلام

سائنس کی منتقلی برائے ترقی

قسط دوم

اس کے متعلق خاص طور سے ہی اہم مثالوں میں سے ایک مثال طبعیات اور توانائی کے شعبے کی ہے توانائی کی فراہمی موجودہ دور میں ہماری ایک بہت بڑی تشویش ہے ک ملک یا تو توانائی کے نئے شعبے کھولے گئے ہیں یا اٹامک انرجی کمیشن کو ایک جامع توانائی شعبے میں تبدیل کر دیا گیا ہے تمام بین الاقوامی کانفرنسوں کے انعقاد کے باوجود میرے علم کے مطابق اب بھی توانائی میں سائنسی لحاظ سے تحقیق اور تربیت کا ادارہ وجود میں نہیں آیا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان کو ... تحقیق کر سکیں۔ ایک مناظری ... (optical concentrator) کو کتنا کم سے کم ممکن حد تک استعمال کرنا چاہیے۔ یہ شمسی شعاع کی گہرائی (Penetration) اور انسانی ... ت (Excited State) کی عمر یا ڈفیوژن لمبائی (Diffusion length) سے معلوم ہوتی ہے۔ اس تبدیلی کا انحصار ہے غیر قلمی مادے (Amorphous materials) کے لیے یہ تبدیلی نقائص (defects) کی کثافت پیداوار ان کو ... پر منحصر ہے۔ تاثیر بخش اور قیمت کے بہتر بدل کے لیے فوٹو وولٹائک خانے اس طرح ٹھوس حالت مواد کی فزکس پر انحصار کر سکتے ہیں اور نہ کرنا تو جیسے کی کم فہمی پر۔ اس ضرورت کے پیش حقے کو پورا کرنے کے لیے ٹریسٹ کے مرکز نے محسوس کیا کہ اس کو توانائی سے مناسبت والے مواد کی اعلیٰ معیار کی فزکس کے فروغ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور خاص توجہ ... (Emittings) اور اخراجی ([illegible]) سطحوں کی فزکس کی طرف۔ اب تک اس شعبے میں ہمارے کالجوں میں تقریباً ایک ہزار ماہرین طبعیات شریک ہو چکے ہیں۔

لندن اکنامسٹ جو ایک موقر جریدہ ہے اپنے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں اس شعبے کے متعلق رقم طراز ہے۔

"اگر شمسی توانائی کو دنیا کی توانائی کے بحران کا حل مہیا کرنا ہے تو وہ حل نہ ...

فیہ ماری بالائے چھت شعاع ریزیوں سے نہیں ہوگا۔ یہ انقلاب کوانٹم فزکس، پاشیو کیمسٹری یا بیسویں صدی کے سائنسی علوم کے اطلاق سے آئے گا۔ آج کی ٹکنالوجی پر مبنی تمام صنعتیں نئی سائنس پر انحصار کرتی ہیں۔

۱۹۸۳ء میں ٹریسٹ مرکز میں ۴۰۰۰ ماہرین طبیعیات آئے ان میں سے ۱۴۰۰ سائنس داں ۹۰ ترقی پذیر ممالک سے آنے والے اوسطاً دو ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ مرکز میں گزارتے ہیں اور اس کی تحقیقی ورکشاپ اور طویل ریسرچ کالجوں میں حصہ لیتے ہیں۔ ۱۹۸۱ سے ہم نے ان میں سے چار کالجوں کا انعقاد ترقی پذیر ممالک میں کیا ہے۔ گھانا، بنگلہ دیش، کولمبیا اور سری لنکا میں یہ چار سے آٹھ ہفتے کے ریسرچ کالج ٹھوس حالت فزکس، موسمی حرکیات، شمسی فزکس اور (Microprocessors) کے موضوعات پر تھے ہم نے ایک ایسوسی ایٹ شپ اسکیم کا آغاز کیا ہے۔ جو کہ اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک سے چوٹی کے طبیعیات داں اپنے سہولت کے اوقات میں جن کا دورانیہ چھ ہفتے سے تین ماہ تک ہے، چھ سال میں تین مرتبہ اس مرکز میں آسکیں۔ تاکہ وہ اپنے ہم عصروں سے ایک محرک ماحول میں کام کرکے اپنی بیٹریاں چارج کریں اور پھر واپس اپنی تدریسی اور تحقیقی پوزیشن میں چلے جائیں۔ ہم کوئی تنخواہ نہیں ادا کرتے۔ صرف سفر اور قیام کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ اس وقت ایسے ۳۰۰ ایسوسی ایٹ اس مرکز سے وابستہ ہیں۔ ہمارے ساتھ ۱۰۰ ترقی پذیر ممالک میں واقع ۱۰۲ فزکس کے درس گاہوں کی وابستگی اور الحاق میں حصہ داری بھی دیرپا ہے ایک کتب بینک اسکیم کے ذریعے ہم انفرادی عطیات سے کل ۵۵۶۰ کتابیں اور ۳۴۰۰ جدید جرائد ۷۶ ممالک میں موجود ۳۲۰ اداروں میں تقسیم کرچکے ہیں ہم ایک اور اسکیم شروع کررہے ہیں جس میں ترقی یافتہ ممالک کی تجربہ گاہوں کا عطا کردہ غیر استعمال شدہ فاضل ساز و سامان کو جمع کرکے تقسیم کرتا ہے۔ ۱۹۸۳ء سے اطالوی گورنمنٹ کی ایک تہائی ملین ڈالر سالانہ کی امداد سے ہم نے ۲۵ تجرباتی ماہرین طبیعیات کو ۶ سے ۹ ماہ کے عرصہ کے لیے اطالوی جامعات اور صنعتی تجربہ گاہوں میں بھیجا ہے اس مرکز نے طبیعیات کے مضمون کو عموماً ترقی پذیر ممالک کی فزکس برادری کو خصوصاً فروغ دیا ہے۔

تیسری دنیا میں سائنسی علوم کی نشوونما اور ممتاز

فزکس میں حاصل کردہ تجربے کی بنا پر ہم ترقی پذیر ممالک

، اور جاپان، برازیل، چین اور بھارت کے سوا) کو تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا زمرہ ۹ ممالک پر مشتمل ہے۔ بنگلہ دیش، کوریا، ملائشیا، پاکستان، سعودی عرب اور ترکی ایشیا میں، مصر افریقہ میں اور میکسیکو اور وینزویلا لاطینی امریکہ میں۔ ان ممالک میں ماہرین طبیعیات کی تعداد معقول حد تک پوری ہو رہی ہے بلکہ ان ممالک میں طبیعیات میں اعلیٰ معیار کے بہت سے مراکز بھی معرض وجود میں آ رہے ہیں۔ جہاں سائنس داں اپنے طور پر تحقیق کر سکیں گے۔ یہ مراکز اپنے ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کے اہل بھی ہوں گے۔

دوسرے زمرے میں کوئی ۱۷ ممالک ہوں گے جو کہ ان ممالک پر مشتمل ہیں۔ ایران، عراق، اردن اور لبنان مشرق وسطیٰ میں، انڈونیشیا، فلپائن، سری لنکا، تھائی لینڈ اور ویت نام جنوب مشرقی ایشیا میں، الجزائر، گھانا، کینیا، مراکش، نائیجیریا، سوڈان، تنزانیہ افریقہ میں، چلی، کولمبیا اور پیرو لاطینی امریکہ میں۔ ان ممالک میں ماہرین طبیعیات کی مناسب تعداد ہے اگرچہ جامعات میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ یہاں کوئی تحقیقی گروپ تشکیل نہیں پا سکے، لیکن کچھ حالات میں انفرادی طور پر بعض لوگ کافی سرگرم ہیں۔ قاعدے کے مطابق ان متعلقہ ممالک میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ایوارڈ نہیں کی جاتی۔ میں ان دو قسموں کا ذکر کر رہا ہوں۔ کیونکہ اگر دنیا کی سائنس برادری مستقل امداد دے تو یہ ممالک قلیل مدت میں ترقی کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔ باقی ۲۰ ممالک "غربت لائن" سے نیچے آتے ہیں ان کے بعض غیر معمولی ذہین افراد کو ہم ٹریسٹ مرکز کے ایسوسی ایٹ منتخب کرتے ہیں اس وقت تک کے لئے جب تک ان کے اپنے ممالک میں تحقیق مرکز شروع ہو۔ میرے یہ تاثرات ٹریسٹ برادری کے ساتھ تجربات پر مبنی ہیں، ان میں کسی اور قسم کی اہمیت کا دخل نہیں ہے۔

سائنسی علوم کے فروغ کا طریقہ کار

آخر میں ہمارے ممالک میں سائنس کا فروغ ہمارا مسئلہ ہے لیکن اس مضمون میں محض اس امر کے ذکر تک اپنی بات محدود رکھوں گا جس کی ہمیں ترقی یافتہ ممالک، بین الاقوامی سائنس برادری اور متعلقہ افراد سے بہتری دیتا ہیں۔ اعلیٰ سائنسی علوم کے فروغ کے سلسلہ میں ملنے کی امید ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی امداد اگر منظم طریقے پر دی جائے تو یہ خاطر خواہ نتائج دے گی۔ انفرادی طور پر

ماہرین طبیعیات کے کام میں مدد کے لیے مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ترقی یافتہ ممالک کی فزیکل سوسائٹیاں اپنے جرائد کی ۱۰۰ سے ۲۰۰ جلدیں مستحق اداروں اور افراد کو بطور عطیہ دیں وہ اشاعت اور کانفرنسوں میں شمولیت کے اخراجات معاف کر سکتی ہیں۔ اسی سلسلے میں بین الاقوامی یونین برائے خالص اور اطلاقی طبیعیات (IUPAP) نے پرانی جلدوں کی تقسیم کے اخراجات برداشت کر کے مرکز کی امداد کی ہے جبکہ [illegible] کی فزیکل سوسائٹی نے ۲۰ ترقی پذیر ممالک سے متعلق ۱۳۰ ماہرین طبیعیات کی [illegible] چندے کی صورت میں ہماری مدد کی۔ ترقی یافتہ ممالک کی تحقیقی تجربہ گاہیں اور جامعات ترقی پذیر ممالک کی اس طرح مدد کر سکتی ہیں کہ وہاں کی اپنی مقابل جگہوں سے فیڈریشن تعلقات استوار کریں اور ان اداروں کے اسٹاف کے دوروں کی مالی اعانت کریں۔ وہ ایسوسی ایٹ طرز کی اسکیم کا اجرا کر سکتے ہیں، جس کا ذکر میں پہلے ٹریسٹ مرکز کے حوالے سے کر چکا ہوں (جس کے تحت [illegible] ماہر طبیعیات جو کہ ترقی پذیر ممالک میں کام کر رہا ہوتا ہے ہمارے اسٹاف سے منسلک ہو جاتا ہے اس طرح کہ وہ چھ سال میں تین مرتبہ ہمارے یہاں آنے کا حق حاصل کر جاتا ہے)۔

مجھے اس طرح اظہار خیال کرنے پر معاف فرمائیے کہ ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ مرکز کے ادارے اپنے طور پر (جنیوا کی شکل میں) اقوام متحدہ کے مشہور قاعدے کے تحت مدد کرنے پر غور کر سکتے ہیں جس میں اکثر ترقی یافتہ ممالک نے اپنے GNP کا ۰.۷ فیصد آمدنی دنیا کی ترقی کے لیے صرف کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ آخر میں ایک اخلاقی مسئلہ ہے کہ آیا سائنس برادری کا خوش حال طبقہ اپنے مستحق لیکن محروم ساتھیوں کا خیال رکھنے کے لیے تیار ہے۔ نہ صرف اس طرح کہ ان کی مادی [illegible] کرے اچھے سائنس داں بن کر رہ سکیں بلکہ اس جنگ میں ان کے ساتھ برابر کے شریک رہ کر بھی مدد کر سکیں تاکہ وہ اپنے ممالک میں مستقل بنیادوں پر مانے جائیں جو اپنے ممالک کی ترقی اور بالآخر دنیا کی ترقی کے لیے اہم ہیں۔

اب میں اس موضوع کی طرف آرہا ہوں کہ بین الاقوامی ادارے اپنے استعداد کے میدان میں لمبی مدت کے لیے سائنسی ڈھانچہ بنانے میں مدد مہیا کر سکتے ہیں میں خاص کر اس طریقہ کار پر زور دیتا ہوں جس سے بین الاقوامی طور پر [illegible] ہمارا یقین ہے بین الاقوامی تحقیقی ادارے [illegible] سوال کی [illegible]

ترقی پذیر ممالک تو آج بین الاقوامی تحقیقی اداروں سے مدد لے رہے ہیں جیسے اطلاقی میدان گندم چاول تخلیق ادارہ اور سائنسی میدان میں نیروبی کیڑوں کا فزیالوجی کا بین الاقوامی مرکز (ICIPE) بین الاقوامی بنا ہے بغیر سائنس فروغ نہیں پا سکتی کوئی پیمانہ کی یقین دہانی نہیں کر سکتا اور نہ نئے خیالات سے آگاہی کی یقین دہانی اور نہ ہی خالقین سائنس اور ان مراکز کے مدعوئین کی طرف سے براہ منتقلی کی جو کہ حسن تخلیق کے جذبے سے سرشار ہو کر یہاں آتے ہیں۔

حال ہی میں (NICE) کے مقام پر ریاض میں ایک بین الاقوامی مرکز امریکا میں ترکی میں اور ایک وینزویلا میں [illegible] بین الاقوامی مرکز [illegible] طبیعیات برائے لاطینی امریکہ کا افتتاح پچھلے ماہ قبل کولمبیا کے صدر نے کیا اور یونیسکو بھی بائیوٹکنالوجی میں دو بین الاقوامی مراکز بنانے جا رہے ہیں ایک ٹریسٹ میں دوسرا بھارت میں بائیوٹکنالوجی میں دیکھنے میں آیا ہے کہ جینیات (Genetic) میں واٹسن اور کرک نے جینیاتی ضابطہ (Genetic code) سمجھنے میں جدید پیش رفت کی ہے۔ تمام معلوم شدہ زندگی کی بنیاد جیسے ظاہر ہے وہ [illegible] کو ایک [illegible] والی نہایت ہی اعلیٰ دریافت ہے نہ صرف بیسویں صدی کی بلکہ تمام وقتوں کی۔ مجھے اس امر واقعہ پر فخر ہے کہ والٹر گلبرٹ جنہوں نے ۱۹۵۶ء میں میرے ساتھ نظریاتی طبیعیات میں کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ اور پھر جینیات کے میدان میں داخل ہوگئے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہوں نے وہ شاندار تکنیک دریافت کی جس سے جینیاتی ضابطے کا مطلب نکالا گیا اس کام پر انہیں کیمیا میں ۱۹۸۰ء کا نوبل انعام ملا۔ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے ایک کمپنی ۲۹ جون کو بنیاد ڈالی جو کہ دوسروں کے مقابلہ میں جینیاتی کاریگری سے انسولین کی تیاری کو کام میں لاتی ہے۔ اس میں پھر ہم اعلیٰ سائنس اور ٹکنالوجی کے امتزاج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

یونیسکو کی ابتداء آج کا دوبارہ ذکر کر رہا ہوں۔ یونیسکو کے انتظامی ڈاکٹر عبدالرحمان خان ہیں جن کا تعلق الجزائر سے ہے۔ ٹریسٹ آنے پر ہمارے بنیادی اور اطلاقی طبیعیات کے مشترک پروگراموں سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تیسری دنیا کے لیے ایسے ہی ایک یا ایک سے زیادہ بائیو ٹکنالوجی کے مراکز قائم کرنے کا وقت آگیا ہے یونیسکو کے کہنے پر ایک مقابلہ

اہتمام ہوا جس کے نتیجے میں اٹلی، اسپین، بھارت، پاکستان، مصر، تھائی لینڈ، اور دیگر ایسے مراکز قائم کرنے کی پیش کش کی۔ جگہ کو منتخب کرنے کے لیے تین میں الوزارتی اجلاس منعقد ہوئے۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں دہلی اور ٹریسٹ آخر کار ایک مشترکہ مرکز کے لیے چن لیے گئے۔

میرے خیال میں حیاتی علوم کے حالات کا سب سے اہم ایک پہلو یہ ہے کہ تیسری دنیا کے اتنے سارے ممالک اس بات کے خواہاں تھے کہ یہ مرکز ان کے یہاں ہو اور اس کے لیے بڑے وسائل کی پیش کش کر رہے تھے ذاتی طور پر مجھے ان وزراء کے فیصلے پر افسوس ہو جو مقابلے میں ان ہارنے والے ممالک مصر، تھائی لینڈ، پاکستان اور اسپین کو آخری وقت سے الحاقی مرکز کا درجہ دینے پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ ان ممالک کی دلیل خواہ جیسی تھی کہ ایک کو ایک ثانوی درجہ ہی مل جائے تاکہ وہ اپنی مقامی کوشش کو بین الاقوامی بنانے کے فوائد میں حصہ لے سکیں مجھے امید ہے کہ مسئلہ کا جلد ہی حل تلاش کر لیا جائے گا اور یہ دوسری پیش کش بھی مان لی جائے گی جو نقطہ نظر میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ممالک بھی جن میں سائنسی تحقیق کی معمولی سی بھی سرگرمی ہے انہوں نے بین الاقوامی سائنسی مراکز کو قائم کرنے میں دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے اس نسبت سے اس بات کو اجاگر کرنے کے لیے کہ عالمی بنک یا بین الاقوامی فنڈ برائے مالیات (IMF) جیسے ادارے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں اس اقتباس پر غور کیجئے جو ای۔ ایس۔ میسن (E. S. Mason) اور آر۔ ای۔ آشر (R. E. Asher) کی حال ہی میں لکھی ہوئی عالمی بنک کی سوانح سے لیا گیا ہے۔

> عالمی بنک کے اس میدان میں آنے سے پہلے یونیسکو کئی
> سال سے تعلیمی منصوبہ بندی پر معقول رائے دیتا رہا
> ہے۔ بعض اوقات اس رائے کے بعض حصے مان
> لیے جاتے لیکن تعلیمی منصوبہ بندی کی طرف توجہ تاقی
> ہو گئی۔ جب یہ عیاں ہو گیا کہ بعض پراجیکٹ کو
> عالمی بنک کی طرف سے مالی امداد ملنے کا موقع نہیں۔

تعلیمی منصوبہ بندی اور سائنسی زراعت کی ترقی میں امداد کے علاوہ میں یہ چاہتا ہوں کہ عالمی بنک اپنے طور پر ترقی پذیر ممالک کو باور کرائے کہ کچھ کام ملک

اسی کا حاصل کرنے کا تیز ترین ذریعہ سائنس بنیادی طور پر اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حصول پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر مائکرو الیکٹرانکس کمپیوٹر سے مستفید ہونے کے علوم اور اس طرح کے دوسرے شعبے اور ان شعبوں میں جیسے اہم اور بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے وہ ہے سائنسی علوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افرادی قوت کی افزائش جس وقت ہمارے سرمایہ کاری پر قدرت رکھنے والے (خواہ ترقی پذیر ممالک کی گورنمنٹ سے منسلک ہوں یا پرائیویٹ سیکٹر سے) اس بات کو سمجھ جائیں اسی وقت معاشی نجات کا آغاز ہوگا۔

مختصر یہ کہ ہر ترقی پذیر ملک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل در پیش ہیں جن کے لیے سائنسی ماہرانہ رائے کی ضرورت ہے، میں اسے شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ اقوام متحدہ کو ترقی پذیر ممالک میں سائنس کی بین الاقوامی حیثیت کا جائز تحریک کی قیادت کرنی چاہیے یہ ضروری نہیں کہ تحقیقی ادارے ترقی پذیر ممالک ہی میں واقع ہوں۔ کچھ سال پہلے سابق امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے امریکی گورنمنٹ کی جانب سے تیسری دنیا سے نئے اداروں کے قیام کا وعدہ کیا تھا جن میں ایسے ادارے بھی شامل تھے جن کو اعلیٰ ٹیکنالوجی کی رہنمائی ہو گی انہوں نے خاص کر بین الاقوامی ادارے جیسا کہ ایک مرکز برائے تبادلہ تکنیکی اطلاعات اور ایک بین الاقوامی ادارہ برائے صنعت و حرفت کا ذکر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ امریکی انتظامیہ جلد ان وعدوں کو وفا کرے گی اور یہ ادارے میں مذکورہ سائنس کے حقوق ادا کرے گی۔

آخر میں قومی امداد مہیا کرنے والے اداروں کی طرف آتے ہوئے ہر جگہ کے تعمیری اداروں سے میری گزارش ہے کہ ان کو سائنس کے فروغ کے لیے ملی نقطۂ نظر سے مہیا پروگرام ترویج کرنا چاہیے ان کا بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے جو انہیں ضرور استعمال کرنا چاہیے خصوصاً یہ دیکھنے کے لیے ان ممالک کا جو کہ امداد کرتے ہیں متاثر ڈھانچہ بن چکا ہے اور وہاں کی سائنسی برادری اس قابل ہے کہ وہ تعمیری عمل میں صحیح کردار ادا کر سکیں۔

اس بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کی منتقلی کا اچھی طرح آج موجودہ طریقہ کار ایک ہیں۔ قومی فاؤنڈیشن برائے سائنس کا بنیادی ڈھانچہ

جو کہ ترقی پذیر ممالک میں سائنس دانوں کو انفرادی گرانٹ دے۔ ان مقاصد کے تحت
ایک بین الاقوامی سائنس فاؤنڈیشن میری تجویز پر سویڈن میں ۱۹۷۲ء میں
قائم کی گئی اس فاؤنڈیشن کی آج کل یہ ممالک امداد کر رہے ہیں۔ سویڈن، کینیڈا،
امریکہ، مغربی جرمنی، فرانس، آسٹریلیا، ہالینڈ، بلجیم، نائجیریا، ناروے اور سوئٹزرلینڈ
اس فاؤنڈیشن سے ترقی پذیر ممالک کے محققین کو تحقیق کے لیے انفرادی امداد دی
جاتی ہے جو کہ دس ہزار ڈالر فی گرانٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بد قسمتی سے فاؤنڈیشن
کے پاس کل فنڈ کی رقم دو ملین ڈالر سے زیادہ نہیں۔ اسی قسم کا کام امریکہ میں
[illegible] نامی تنظیم کرتی ہے جس کو امدادی ادارے رقم مہیا کرتے ہیں۔ ان
سرگرمیوں میں نیچرل سائنس داخل نہیں ہے۔ اور نہ ہی فنڈ میں اتنی گنجائش
ہے، وہ سائنسی ڈھانچے کی تعمیر میں مدد کر سکے۔

برانٹ کمیشن کی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے متعلق سفارشات کو ذہن میں
رکھتے ہوئے میں نے ان سربراہان مملکت کو جنھوں نے [illegible]
میں شرکت کی، مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"میں جانتا ہوں ٹیکنالوجی منتقلی پہ زیادہ زور
توانائی کے مسائل پر ہوگا میکسیکو میں شمال، جنوب سربراہان
مملکت کی آئندہ میٹنگ میں زیر بحث موضوعات میں سے ایک
موضوع ہوگا۔ بد قسمتی سے زیادہ تر ترقی پذیر ممالک ہر سطح پر
سائنسی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے امداد چاہتے ہیں اور سائنس کی منتقلی
ٹکنالوجی کی منتقلی کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر موجودہ ٹکنالوجی کو واقعی ہمارے
ممالک میں منتقل ہونا ہے تو شمال کی سائنسی برادری اپنی
جنوبی برادری کی پھلنے پھولنے میں مدد کر سکتی ہے اور مجھے یقین
ہے کہ وہ ایسا کرے گی، بشرطیکہ وہ اس کے لیے تیار ہو۔"

میں نے سائنس کی منتقلی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے کم از کم اتنا فنڈ کی
ساتھ جتنا کہ فورڈ فاؤنڈیشن مہیا کرتی ہے (ایک سو سے دو سو ملین
ڈالر سالانہ) ایک شمال جنوب سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کی تجویز دی۔ اس
فاؤنڈیشن کا نظم و نسق دنیا کی سائنسی برادری کے ہاتھ میں ہو اور بنیادی

سائنسی علوم میں تحقیق اور تحقیق میں ترجیحات کا بند و بست کریں۔

میری درخواست کہ حال ہی میں سب ترقی یافتہ ممالک کے سربراہوں سے بھی شائستہ جواب موصول ہوئے جب کہ ترقی پذیر ممالک کے سربراہوں میں سے صرف مسز گاندھی نے جواب دیا (یہ عدم توجہی شاید تیسری دنیا میں سائنس کی بابت سرد مہری کی طرف ایک بار پھر توجہ دلاتی ہے) تاہم یہ کہنے کی مجھے اجازت دیں کہ ہمیں کوئی نہ کوئی طریقۂ کار تلاش کرنا ہوگا۔ خصوصاً فورڈ فاؤنڈیشن کے اس خط کے بعد جو اس نے حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی سائنسی علوم میں تیسری دنیا کی اکیڈمی Third World Academy of Sciences کو لکھا کہ فورڈ فاؤنڈیشن کی نگاہ میں اب تیسری دنیا میں سائنسی تحقیق کی کوئی اولین اہمیت نہیں ہے۔

دوسرے شعبوں کی طرح سائنسی علوم میں بھی یہ دنیا امیر و غریب میں منقسم ہے آدھا امیر تر حصہ جو کہ صنعتی شمالی اور مرکزی انتظامیہ کے تحت خطوں پر مشتمل ہے (جس کی آمدنی ۵ کھرب ڈالر ہے اس کا ۲ فیصد حصہ ۱۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ غیر فوجی سائنسی اور ترقیاتی تحقیق پر صرف کرتے ہیں۔ باقی آدھی دنیا غریب جنوب پر مشتمل ہے۔ جن کی اس آمدنی کا ۱/۵ حصہ یعنی کوئی ایک کھرب ڈالر ہوتا ہے جس) سے دو ملین ڈالر سے زیادہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ نہیں کرتی۔ امیر ممالک کے فیصد کے لحاظ سے ان کو ۲۰ گنا زیادہ خرچ کرنا چاہیے یعنی تقریباً ۲۰ ارب اقوام متحدہ کے زیر انتظام سائنس اور ٹیکنالوجی پر ویانا کانفرنس جو ۱۹۷۹ء میں منعقد ہوئی اس میں غریب ممالک نے بین الاقوامی فنڈ کے لیے درخواست کی۔ تاکہ وہ اپنے سالانہ خرچ ۲۔ارب سے ۴ ارب ڈالر تک بڑھا سکیں ان سے نہ ہی دو ارب کے [illegible] ہی ایک ارب کے وعدے ہوئے بلکہ اس کا بھی ساتواں حصہ ملے جیسے ہم [illegible] یہ بھی محسوس نہیں کیا گیا کہ بین الاقوامی سائنس اور ٹیکنالوجی امدادیاتی نظام برائے ترقی بھی مناسب وسائل کے بغیر ہے۔ اس صورت حال کا فوجی میدان سے موازنہ کریں ایک نیوکلیائی آبدوز کی قیمت ۲۔ارب ڈالر ہے جب کہ دنیا کے سمندروں میں اس طرح کی ۱۰۰ آبدوز موجود ہیں ایک نیوکلیر آبدوز کی قیمت سے [illegible] جیسے پانچ سو مراکز کی ایک سال کے لیے مالی امداد فراہم کی جا سکتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ قسط دوم

اقبالِ جرم

(قدرت اللہ شہاب نے اپنی خود نوشت سوانح کیوں اور کس طرح لکھی۔ کتاب کے پہلے باب "اقبالِ جرم" میں اس کا بیان ہے ان کا کہنا ہے کہ جس دانستہ، مشاہدہ اور تجربہ نے ہمیں جس طرح متاثر کیا، بے کم و کاست انہوں نے اس کا بیان کر دیا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں کہ)

اس کے علاوہ یہ امر بھی مدِ نظر رہا کہ بعض غلط فہمیوں اور مفروضوں کی بنا پر ... ے ماتھے پر کچھ ایسے کلنک کے ٹیکے لگ چکے ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً میرے محترم اور مہربان بزرگ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے شاعرانہ موڈ میں یہ کہہ دیا

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کا بہت چرچا ہوا اور یہ تاثر پھیل گیا کہ وطنِ عزیز میں "انقلاب" کی آڑ میں جتنی غیر ... وری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں ان سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے سب سے پہلے اسمبلیاں توڑ کر آمریت کا ڈول ڈالا۔ اس وقت ... پنجاب کی صوبائی حکومت کے تحت لاہور میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر متعین تھا ... واقعہ کے بہات آٹھ روز بعد مجھے اچانک گورنر جنرل کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ مجھے ... تک معلوم نہیں۔ اس وقت تک ملک غلام محمد سے میری نہ کوئی ذاتی شناسائی تھی نہ کوئی ... ملہ تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خاں کا مارشل لاء نافذ ... اس وقت ۲۰ ستمبر سے میں جناح ہسپتال کراچی میں عارضۂ قلب کے علاج کے لئے داخل ... یا۔ اکتوبر کے شروع میں ہسپتال سے گھر آ گیا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ مزید دو ہفتے دفتر نہ جاؤں ... گھر پر ہی مکمل آرام کروں مارشل لاء لگنے کی خبر مجھے پہلی بار کرنل مجید ملک نے رات کے بارہ بجے

گھر پر ٹیلی فون کرکے سنائی۔ وہ ان دنوں مرکز میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے۔ دوسرے مارشل لا کی سازش جنرل محمد یحییٰ اور ان کے ایک مخصوص ٹولے تک محدود تھی۔ پورے دس ماہ میں اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ میں بے کار بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ پھر ندو نوں بعد اس دھاندلی پر ہلکا سا احتجاج کرکے میں بیوی بچے سمیت بیرون ملک چلا گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ تیسرے مارشل لا کے وقت میں اسلام آباد میں گوشہ نشینی کی زندگی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اقتدار میں آنے کے پینتیس روز بعد مجھے اچانک ضیاء الحق کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ تراویح کے بعد رات کے تقریباً گیارہ بجے میں آرمی ہاؤس پہنچا۔ اس وقت جنرل صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں مولانا ظفر الحق انصاری کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جنرل صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا "ملک کے اس نازک مرحلے میں ہمیں تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت ہے میری خواہش ہے کہ کل سے تم وزارتِ تعلیم کا کام سنبھال لو۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا "اب مجھ میں کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ کچھ تو ضعیف العمری کا تقاضا ہے۔ کچھ ریٹائرڈ زندگی نے آرام پسندی کی عادت بڑھا دی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ عرصہ کے لئے لندن جا کر اپنے دوست ابنِ انشا کی عیادت کرنا چاہتا ہوں۔"

جنرل صاحب مسکراتے رہے اور فرمایا "کوئی بات نہیں۔ ضرور جاؤ وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری ڈاکٹر محمد اجمل چند روز میں یونیسکو کی تعلیمی کانفرنس کے لئے جینوا جا رہے ہیں۔ میں تمہیں ان کے ساتھ ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے لندن بھی ہو آنا واپسی پر پھر بات ہوگی۔"

میں اس وقفہ کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر اجمل کے ساتھ پہلے جینوا اور پھر لندن چلا گیا ہم کچھ روز ابنِ انشا کے ہاں ٹھہر کر واپس اسلام آباد آ گئے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میری ٹال مٹول پہچان کر اب وزارتِ تعلیم میں کام کرنے کی بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن میرے کئی عزیزوں اور دوستوں نے جو فوج میں ملازم تھے، مطلع کیا کہ جی۔ ایچ کیو کے افسروں کی ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے میرا نام لے کر بتایا کہ انھوں نے

شعبہ تعلیم کے لئے مجھے منتخب کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کویت سے میرے ایک دیرینہ دوست کا پیار بھرا خط آیا کہ مشرق وسطیٰ کے دورے پر کسی مقام پر پاکستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے جنرل صاحب نے پھر یہی بات دہرائی۔ مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی، لیکن میں خاموشی سے کان لپیٹ کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اس دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے دورے نور تن مل گئے تھے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا اگر خدانخواستہ میں لالچ میں آکر یہ پیشکش قبول کر لیتا تو مجھے یقین ہے کہ نوّے روز کے مارشل لاء کو ساڑھے آٹھ سال تک طول دینے کا سہرا بھی اسی خاکسار کے سر باندھا جاتا۔

صدر ایوب کے زمانے میں جب انہوں نے جگہ جگہ عام جلسوں میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا تو میرے دوست سید محمد جعفری نے اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں یہ پھبتی اڑائی۔

یہ سوال و جواب کیا کہنا
صدرِ عالی جناب کیا کہنا
کیا سکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا

سید محمد جعفری بڑے بلند پایہ اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کے نام کی وجہ سے یہ اشعار بہت سے حلقوں میں زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ اسی شہرت نے یہ طلسم ڈھایا کہ ہر کوئی یہ سمجھنے لگا کہ صدر ایوب میرے اشارے پر ناچتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ میرے مشوروں کا مرہونِ منت ہے۔

مجھے توقع تھی کہ صحافی برادری، جو بڑے بڑے "سکوپ" لے اڑنے میں مہارت رکھتی ہے ان میں کوئی صاحب دل میرے سر تھوپے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تفتیش کرنے کی زحمت بھی اٹھائے گا۔ یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ الٹا بھیڑ چال کی صورت میں بہت سے حضرات بلا چوں و چراں یہی الزامات دہراتے رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کتاب لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کا مقصد اپنی بریت اور معصومیت کا ڈھول پیٹ کر مجھ پر جلنا

نہیں۔ فقط حقائق کے ریکارڈ کو صاف کرنا مقصود ہے۔

اس کتاب میں واقعات سب صحیح ہیں۔ لیکن اسلوب بیان میرا ہے۔ جہاں کہیں میں نے کوئی نتائج اخذ کیے ہیں یا کوئی رائے دی ہے ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔ ان سے لوگوں کو اتفاق ہو سکتا ہے، بعض کو اختلاف، دونوں صورتیں میرے لئے برابر ہیں۔ اپنی غلطیوں یا خام خیالیوں کی اصلاح کرنے میں میری انا کوئی رکاوٹ نہ بننے گی بلکہ خوشدلی سے اظہار تشکر میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔

کچھ صاحبان کو گلہ ہے کہ جو واقعات بے شمار سے لے کر میں اب سنا رہا ہوں، اس وقت کیوں خاموش رہا جب یہ سب کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ میں ایک مثالی بیورو کریٹ نہیں لیکن قدرے اچھا بیورو کریٹ ضرور رہا ہوں۔ اچھا بیورو کریٹ بننے کے لیے چند شرائط لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی معاملے میں اس کا مشورہ طلب کیا جائے تو اسے بے لاگ رائے کا بے خوفی سے اظہار کرے۔ اگر اس کی رائے کے عین مطابق فیصلہ ہو تو فبہا۔ بصورت دیگر اگر اس کی رائے یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہو تو ایک اچھے بیوروکریٹ کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا مخالف، اس کا فرض ہے کہ وہ سر تسلیم خم کر کے اس پر دیانت داری سے عملدرآمد کرے۔ بصورت دیگر استعفیٰ دینے پر ہمت چست کرے اور ملازمت چھوڑ کر چلا جائے۔ اپنی سروس کے دوران میں ان دونوں راستوں پر چلا ہوں۔ پہلے پر زیادہ۔ دوسرے پر کم۔ میرے کمزور ضمیر نے مجھے فقط چار بار استعفیٰ پیش کرنے پر اکسایا۔ چوتھی بار جب میرا استعفیٰ منظور ہوا، اس وقت میری ملازمت کے سات آٹھ سال باقی تھے۔ میں اسے اپنا کمال تو نہیں سمجھتا جس پر اتراتا پھروں، لیکن مطلق عرصہ ہوا ریٹائرمنٹ کے بعد ہر سرکاری ملازم کو حق حاصل ہے کہ وطن کے دفاع اور State Secrets (امور ریاست کے راز) فاش کئے بغیر وہ اپنے تاثرات اور تجربات کو آزادی کے ساتھ بیان کرے۔ میں نے اسی موقف کو اپنا کر یہ کتاب لکھی ہے۔ دنیا بھر میں بھی یہی چلن رائج ہے۔

محترمہ ادا جعفری نے اسلام آباد میں ایک گھریلو قسم کی ادبی تنظیم "سلسلہ"

قائم کررکھی تھی۔ انہوں نے مجھ پر اصرار ڈالا کہ مجھے اس تنظیم کے ماہانہ اجلاس میں "شہاب نامہ" کا ایک باب سنانا پڑتا تھا۔ جب وہ کراچی چلی گئیں تو محترمہ نثار عزیز بٹ نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا۔ اس کتاب کے ابتدائی چند باب ان ہی محفلوں کے لئے لکھے گئے۔ اس سے میرا سست رفتار قلم کسی قدر تیزی سے رواں ہوگیا سلسلہ" بند ہونے کے بعد جواں سال ادیبوں کی ایک ایسی ہی تنظیم "رابطہ" نے بھی میری اسی طرح مدد کی۔

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد نے مجھے اپنی چند نشستوں میں اس کتاب کے کچھ باب سنانے کی دعوت دی۔ نیپا N.I.P.A کراچی اور پشاور میں بھی مجھے کچھ باب سنانے کا موقع ملا۔ سیارہ ڈائجسٹ، معاصرہ، دستاویز، نیادور، اور تخلیق ادب جیسے رسالوں میں میرے کچھ باب شائع ہوئے۔

اس کتاب کا پورا مسودہ ممتاز مفتی، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے حرف بہ حرف پڑھ کر اپنی قیمتی تجاویز سے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ہے

ان سب اداروں، رسائل اور احباب کا لفظی شکریہ ادا کر کے میں ایک فرسودہ رسم دہرانا نہیں چاہتا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں ان سب کا کس قدر ممنون احسان ہوں اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش اور خوشحال رکھے۔

سلسلہ صفحہ ۵۰

اور لالچ سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتا رہے۔ اسے مشتعل ہو کر اپنا غیر جانبداری۔ برتنے یا پارٹی بازی میں ملوث ہونے کی بجائے اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے نظریوں کا احترام کرنا چاہیئے تب ہی وہ ایک اچھے کامیاب اور غیرجانبدار اداریہ نویس کی حیثیت سے فکر و فہم عمل کرنے والے ہمہ موضوعاتی اداریے تحریر کرسکتا ہے جو اخبار کی مقبولیت اور کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔

صابرہ خان

اداریہ نویسی

دُنیا کے ہر خطہ میں اخبارات کا آغاز کم و بیش ایک ہی مقصد کے تحت ہوا تھا۔ یعنی تبلیغ و اصلاح۔ ابتداء میں ہر اخبار کی اجراء کسی نہ کسی ایسی قد آور شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آئی جن کا مقصد ملک و قوم کی اصلاح عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل تھا۔ برصغیر ہند و پاک میں سرسید احمد خاں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں مولانا محمد اکرم خاں اور ایسے ہی دوسرے علماء نے اپنے اخبار ملک و قوم کی اصلاح اور آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے علاوہ قوم میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے جاری کیئے تھے۔ ان اخبارات میں ادارتی صفحات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ان شخصیتوں کے افکار و خیالات مضمون کی صورت میں ادارتی صفحات پر ہی شائع ہوتے تھے۔

امریکہ میں آئی۔ ایل۔ کارل اور ہنری واٹرسن کے علاوہ دوسری کئی ایک اہم شخصیتوں نے اپنے افکار کے ذریعہ ادارتی صفحہ کی اہمیت کو بڑھایا ہے۔ برطانیہ میں ڈینل ڈیفو۔ جان والٹر اور جان تھرکلف جیسی شخصیتوں نے اس صفحہ کو عظمت بخشی نپولین نے ان الفاظ میں اداریہ کی قوت کا اعتراف کیا تھا کہ:

"میں تو سنگینوں کی بہ نسبت ایک اخبار سے زیادہ ڈرتا ہوں"

اسی طرح جارج ہشتم نے یہ کہکر کہ:

"اخبار ٹائمز (جو لندن سے شائع ہوتا ہے) دریائے ٹیمز سے بھی زیادہ طاقتور ہے"

خبار کی اسی قوت کی طرف اشارہ کیا تھا جو اداریہ کی صورت میں رائے عامہ تشکیل رتی ہے۔ جس سے حکومتیں بنتی یا بگڑتی ہیں۔ علامہ جمال الدین نے اخبار کے فرائض کے سلسلے میں لکھا تھا کہ۔

" اخبار شفیق لبیب۔ سچا ناصح۔ صابر مودب۔ بیدار پاسبان، ہوشیار ہبان۔ تاجروں کے لئے رہبر۔ حاکموں کے لئے مشیر۔ ارباب بصیرت کے لئے ریاض۔ ارباب سیاست کے لئے دستور پسندیدہ۔ تمدن کا مضبوط ظیفہ اور انسان کی سلامتی کی مستحکم رسّی ہوتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ لکھتے وقت ان کے سامنے اخبار کی خبروں سے صفحات کم اور ارتی صفحات زیادہ تھے۔ کیونکہ ان مقاصد کی تکمیل ادارتی صفحات ہی کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر ادارتی صفحات کی مندرجات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ۔ مضامین میں ایک ایسا ایڈیٹوریل ہونا چاہیئے جو زمانے کے مسائل و حالات کے نوعات کو زیر بحث لائے اور یہ مضمون اخبار کو بھرنے کی غرض سے نہ لکھا ہو بلکہ ایسا ہو جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا۔"

مضمون خواہ پولیٹکل ہو یا سوشیل، تعلیمی ہو یا تجارتی بہرحال ایڈیٹوریل نوٹ کے واقعات اور خبروں پر رائے زنی کے لئے ہونا چاہیئے۔

نرائن کا کہنا ہے کہ " دو اخباروں کو ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا نے والا ادارتی صفحہ ہوتا ہے"۔

ایک اور مصنف کے خیال میں ادارتی کالم رائے عامہ کی رہنمائی اور تشکیل ے قیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ان کالموں میں روزمرہ کے واقعات اور ن کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

ادارتی صفحات اور اداریوں کی ضرورت و اہمیت کے سلسلہ میں یہاں جن راکو جمع کیا گیا ہے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ادارتی صفحہ کو روایتی طور خبار کی روح سے متعارف کیا۔ یہ صفحہ اخبار کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے اور بارات کو حلویات و اطلاعات کے دوسرے عام ذرائعوں سے ممتاز کرتے

کے ساتھ ساتھ اخبار کو معاشرے میں وقار اور اثر بھی عطا کرتا ہے۔ اگرچہ ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع جیسے ریڈیو اور ٹی۔ وی بھی خبروں پر تبصرے نشر یا ٹیلی کاسٹ کر کے اپنے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان ذرائع ابلاغ کی ترقی اور وسعت کے باوجود اخبارات کے ادارتی صفحات کی ضرورت و اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ خواندگی میں اضافے کے ساتھ اخباروں کا دائرہ اثر بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ادارتی صفحات جن مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں وہ نشر یا ٹیلی کاسٹ ہونے والے تبصروں سے پورے نہیں ہوتے اخبار کے اہم ترین مقاصد دو ہوتے ہیں۔

(۱) معلومات و اطلاعات اور خبریں فراہم کرنا۔

(۲) خبروں پر تبصرہ کرنا یعنی حالات حاضرہ پر عوام کی رہنمائی کے لئے اپنی رائے دینا

ان دو بنیادی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اخبارات کے صفحات کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) خبروں کے صفحات جن میں وہ ساری اطلاعات و معلومات شامل ہوتی ہیں جو خبروں کے زمرے میں آتی ہیں۔

(۲) ادارتی صفحات میں اہم ترین خبروں یعنی مسائل اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا جاتا

آج کل اخبارات میں عموماً خبریں کم و بیش یکساں ہوتی ہیں۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ہر اخبار اپنی پالیسی کے مطابق خبریں شائع کرتا ہے جس کی وجہ سے ایک اخبار دوسرے اخبار سے مختلف نظر آتا ہے۔ اور یہ فرق ادارتی صفحات میں نمایاں ہوتا ہے کیونکہ ہر اخبار خبروں کی طرح اداریئے کے موضوع کا انتخاب بھی اپنی پالیسی کے مطابق کرتا ہے۔ مقالات، اطلاعات اور شذرات کے علاوہ معلوماتی مضامین اور کالم بھی ہوتا ہے۔ خبریں قارئین کو مقامی، ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رکھتی ہیں جن کی فراہمی کا ذریعہ خصوصی نامہ نگار ہوتا ہے جو مختلف واقعات سے متعلق معلومات فراہم کر کے قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح اداریئے کے لئے زمین تیار ہو جاتی ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر سنجیدہ اور مدلل

کرنے کے رائے عامہ کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اداریہ نویسی کا مقصد حالات اور مسائل کی تشریح و توضیح کے علاوہ قارئین کی رہنمائی اور ان کی فکری صلاحیتوں کی نشو ونما کرنا ہوتا ہے اس اعتبار سے اداریہ اخبار کا اہم تحریری جزو ہوتا ہے۔ اور اس کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔

(۱) خبروں پر مبنی اداریے (۲) خبروں پر مبنی معاشرتی اداریے (۳) خالص معاشرتی اداریے (۴) خصوصی اداریے (۵) جنگ اور ہنگامی حالات پر مبنی اداریے۔ قارئین کی دلچسپی کا لحاظ رکھنے والے اداریے (۱) مقامی دلچسپی کے مسائل اداریے (۲) قومی یا وسیع تر دلچسپی کے مسائل اداریے (۳) بین الاقوامی دلچسپی کے مسائل اداریے (۲) اسلوب کے لحاظ سے اداریے کی قسمیں (۱) جذباتی اسلوب (۲) منطقی و استدلالی اسلوب (۳) جذباتی اور منطقی امتزاج کا حامل اسلوب۔

اداریے کی ہیئت یا فارم کا انحصار ان اجزاء پر ہوتا ہے۔ (۱) عنوان (۲) حقائق اور واقعات کا ساتھ ہی ساتھ بیان (۳) وضاحت یا تجزیہ و تبصرہ یا بحث اور دلائل (۴) فیصلہ نتیجہ یا رائے۔

ابتدائی دور کے اخبارات میں خبروں کی افکار و نظریات مقدم سمجھے جاتے تھے اس لیے اکثر اوقات اداریے صفحہ اول پر یا کسی دوسرے صفحہ کی نمایاں جگہ پر شائع کیے جاتے تھے۔ چونکہ اس وقت صحافت تکنیکی اعتبار سے ترقی نہیں کر پائی تھی لیکن اب جب کہ صحافت تکنیکی اعتبار سے ترقی کر چکی ہے خبروں، اداریوں اور میگزینوں کے لئے صفحات علیحدہ اور مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ آج کل کے اخبارات میں خبروں کو مقدم حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے صفحہ اول خبروں کے لیئے مختص ہوتا ہے اگرچہ اب بھی بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اداریہ مقالہ خصوصی کی صورت میں صفحہ اول پر شائع کیا جاتا ہے۔ اب ادارتی صفحہ صرف مقالات خصوصی یا مقالہ افتتاحیہ سے عبارت نہیں ہوتا بلکہ اس صفحہ پر خصوصی مضامین مذہبی فیچرس۔ مزاحیہ کالم اور بعض اخباروں میں مدیر کے نام خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان سب کو یکجا کرنے کے لئے ایک صفحہ کی تخصیص ضروری تھی چنانچہ اس مقصد کے لئے ادارتی صفحہ مخصوص

دیا گیا ہے تاکہ رہنمائی کے طالب قارئین کو ہر روز یہ صفحہ تلاش کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے بلکہ انہیں پہلے ہی سے معلوم ہو کہ کس اخبار میں کس صفحہ پر اداریہ شائع ہوتا ہے۔

جس طرح اخبار کے لئے اداریہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے بالکل اسی طرح اخباری ادارے میں اداریہ نویس یا ایڈیٹر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے چونکہ ادارتی کالموں میں وہ جس رائے کا اظہار کرتا ہے اسے اخبار ہی کی رائے سمجھا جاتا ہے اور اسی کی تحریر کی بنا پر ادارتی صفحہ کو اخبار کی روح قرار دیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر کے خیالات تجاویز اور منتخب کردہ اشعار کا ملک کی سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ وہ عوامی خواہشات اور رجحانات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص تحریروں کے ذریعہ اپنے اخبار کے لئے قارئین کا ایک وسیع تر حلقہ بنا کر انہیں فکر و فہم کی روشنی عطا کرتا ہے لہٰذا ایک اچھے اداریہ نویس کو اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لئے جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے وہ مندرجہ ذیل درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱) زبان و بیان پر عبور (۲) منطقی ذہن (۳) انسانی نفسیات سے آگہی (۴) غور و فکر کی صلاحیت (۵) رہنمائی کا جذبہ (۶) متوازن شخصیت (۷) قوت فیصلہ (۸) مطالعہ کی وسعت (۹) رپوٹر ہونا (۱۰) اقوام اور شخصیات سے واقفیت (۱۱) انسانی ہمدردی (۱۲) عوامی حقوق کے لئے جہاد (۱۳) تخلیقی صلاحیت (۱۴) معاصر خیالات سے واقفیت (۱۵) قومی تقاضوں کا احساس (۱۶) اخبار کی پالیسی سے آگہی (۱۹) فنی چابکدستی: اس ساری بحث کا حاصل آئی فرینک کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ایڈیٹر کی سب سے بڑی خوبی اس کی متوازن اور غیر جذباتی قوت فیصلہ ہوتی ہے جو دنیا کے وسیع ترین تجربے پر مبنی ہو۔ اس کے علاوہ ایڈیٹر کو راست باز۔ خوش اطوار، صاف ذہن اور ملکی و غیر ملکی واقعات سے اچھی طرح باخبر ہونا چاہیئے اس کا مقصد کے بارے میں ثابت قدم اور باحوصلہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے چونکہ وہ رائے عامہ کی تشریح کرتا ہے۔ اس لئے اس پر کئی طرف سے دباؤ پڑتا ہے۔ اسی لئے اسے اس قابل ہونا چاہیئے کہ دباؤ ز

باقی صفحہ ۶۲ پر

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا

چوتھی سارک چوٹی کانفرنس

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی تقریر

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے آج اسلام آباد میں منعقدہ چوتھی سارک چوٹی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

مجھے آپ کی خوبصورت راجدھانی اسلام آباد میں پہلی مرتبہ آنے پر بہت خوشی ہے۔ مجھے خاص طور سے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ پاکستان کے لوگوں نے آپ کو اپنا وزیر اعظم چنا کہ آپ اپنے ملک کو جس کی جڑیں جمہوریت میں پیوست ہیں۔ ترقی اور خوشحالی کی راہ پر آگے لے جائیں۔ میں پاکستان کے لوگوں کے لئے بھارت میں ان کی بہنوں اور بھائیوں کی طرف سے تہنیت کا پیغام لایا ہوں۔ ہم بھارت اور پاکستان کے درمیان دوستی اور تعاون کے رشتوں کی قدر کرتے ہیں۔

ہم عالمی امور میں ایک تاریخی موڑ پر کھڑے ہیں۔ تیرہ ماہ ہوئے جب ہم ملے تھے اس دوران بہت سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے تھے جنہوں نے بنیادی طور پر دنیا کے عالمی نظام میں تغیر و تبدیلی پیدا کی۔

اپنی بنیادی وقوع پذیری اور سمت کے لحاظ سے یہ واقعات مثبت اثرات کے حامل رہے۔ صدر گورباچوف اور صدر ریگن کے درمیان ایک معاہدے کی تکمیل ہوئی جس کے بعد اصولی طور پر ترک اسلحہ کے ضمن میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ جب سے نیوکلیائی اسلحہ ایجاد ہوتے ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ دنیا نیوکلیائی اسلحہ کے کنٹرول کی حد سے آگے بڑھی اور نیوکلیائی اسلحہ میں کمی لانے کی بات پر عمل کیا گیا۔

بڑی فوجی طاقتوں کے درمیان بہتر مفاہمت دنیا کے مختلف حصوں میں کشیدگیوں

میں کمی آنے کا باعث ہوتی ہے۔ افغانستان کے تعلق میں ہوئے جنیوا سمجھوتے پر عمل درآمد
سے افغانستان میں قومی موافقت و ہم آہنگی پر مبنی حکومت وجود میں آنے کی جو خود مختار
آزاد، اور غیر جانبدار ہوگی بشرطیکہ تمام متعلقہ پارٹیاں اس سمجھوتے کو قدر
کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کے عمل درآمد میں ایمانداری و سنجیدگی سے تعاون کریں۔

شکر ہے کہ ٹھیک ہمارے مغرب میں ایران و عراق کے درمیان جنگ
بند ہو گئی ہے۔ فلسطین میں انقلابی تبدیلی آنے کو ہے۔ ہمارے بھائی یاسر عرفات
نے فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا ہے اور ہم سب نے اس کا خیر مقدم کیا ہے
ہم نے سب سے پہلے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ امریکہ اور تنظیم آزادی فلسطین کے درمیان
یقینی طور پر بات چیت شروع ہو گئی ہے

جنوب مشرقی ایشیاء میں کمبوڈیا کے تنازعہ کے حل کے لئے امکانات نظر آرہے ہیں

افریقہ میں نامیبیا کے لوگوں سے اب وعدہ کیا جا رہا ہے کہ دس سال پہلے سلامتی
کونسل نے جس آزادی کے منصوبے کو منظور کیا تھا اب آخر کار اس پر عمل درآمد کیا
جائے گا۔

میں نے حال ہی میں بھارت اور چین کے درمیان تعلقات کا نیا عہد شروع
کرنے، دو طرفہ تعلقات میں ایک نیا موڑ لانے، اور دونوں کے درمیان اشتراک و
تعاون کا احیاء کرنے کے لئے چین کا دورہ کیا ہے تاکہ بقائے باہمی کے پانچ اصول
پنچ شیل پر مبنی ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل کی جائے۔

سوویت یونین اور چین کے درمیان جو کشیدگیاں قائم تھیں ان میں
بڑی کمی آ رہی ہے۔

ہمارے پڑوسی دوست اور جمہوری ملک مالدیپ میں کرائے کے فوجیوں نے جمہوری
نظام کو توڑنے کی کوشش کی تو ہم نے فوراً ان کی امداد کی درخواست کو قبول کیا۔

سری لنکا میں صدر جے وردھنے اور میں درمیان دستخط کئے گئے سمجھوتے کے نتیجے
میں اس ملک کا اتحاد اور اس کی سالمیت مستحکم ہوئی ہے۔ ووٹ دہندگان کی بڑی
تعداد نے دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کی دھمکیوں کے باوجود نئی صوبائی کونسلوں

اور نئے صدر کے انتخاب میں ووٹ ڈالے۔ ہم یہاں سارک میں صدر بش کی دانشمندی اور رہنمائی کی کمی کو محسوس کریں گے۔ میں ان کی دکاوت اور تدبیر کے تئیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی کا پیروکار تصور کیا ہے وہ ایک محب الوطن ہیں جن کے دل میں اپنے عوام کے لئے بہت محبت ہے ہماری دعا ہے کہ وہ بہت سے برسوں تک اپنے ملک اور اس خطہ کی خدمت کریں۔

یہاں پاکستان میں جمہوری انتخابات کے نتیجہ میں آپ کی قیادت میں نئی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس سے برصغیر میں ہر جگہ یہ امید پیدا ہوئی کہ ہمارے درمیان دوستی اور تعاون کی نئی صبح پیدا ہوگی۔

اجتماعی طور پر یہ تمام واقعات ہمارے خطے میں اور دنیا میں بین الاقوامی نظام کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تبدیلیوں کے پیش رو ہیں اور امن و ترقی کو قائم رکھنے میں ان کی ضرورت ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوب ایشائی علاقائی تعاون اس رفتار سے بڑھا ہے جس رفتار سے عالمی برادری اور ابھرتے ہوئے عالمی نظام کے لئے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔

نئے چیلنجوں کے تئیں ہمارے موجودہ ردِ عمل کی روشنی میں اور دوسری علاقائی گٹھ بندیوں کے مقابلے میں ہم آج سست رفتار محسوس ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنے ذہن کو ماضی میں لے جاتے ہیں جب بنگلہ دیش نے علاقائی تعاون کی شروعات کی تھی تو ہمارے ردِ عمل فکر اور اختراع کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا میں بہت کشیدگی تھی۔ ہمارا علاقہ بھی کشیدگی سے پاک نہیں تھا۔ جنوب ایشیائی تعاون کی تنظیم تشکیل دینے کی پیش قدمی مستقبل میں یقین کا اظہار تھا۔ جھگڑے پر تعاون کو ترجیح دینے کا اظہار تھا۔ جغرافیائی اور ذہنی فاصلوں کو کم کرنے کا عہد تھا اور ہمارے عوام کو قریب لانے کا ایک وعدہ تھا۔

ہم نے اچھی شروعات کی ہے۔ لیکن کیا اچھی شروعات کافی ہے؟ کیا نہیں۔ ہم ترقی کی رفتار تیز نہیں کرتی چلے جائیں۔ دنیا میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان سے بے شمار مواقع دستیاب ہو رہے ہیں۔ اپنے عوام کے تئیں یہ ہمارا فرض ہے کہ ......

علیحدہ خود مختار قوموں کی حیثیت سے اور مشترکہ طور پر دنیا میں سب سے زیادہ تعداد والے گروپ کی حیثیت سے جنوب جنوب اشتراکی تعاون کو مضبوط بنائیں۔ اس تغیر پذیر زمانے میں اپنے عوام کے تئیں یہ ہمارا فرض ہے کہ اس بات کو یقینی بنائیں تاکہ دنیا ایسی سمت میں بڑھے جہاں سے ہمارے قومی مفادات محفوظ ہوں۔ علاقائی مفادات کو فروغ ملے اور ایسا عالمی نظام پیدا ہو جو ہماری ضروریات کی تکمیل کرے، ہماری توقعات کے مطابق ہو اور پرامن بقائے باہم کے ذریعے امن کی ہماری خواہش کا مظہر ہو۔

ہم سب کے لئے فائدہ مند چیز یہ ہے کہ ہم ناوابستگی کی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناوابستہ دنیا کا نظریہ بلاک سیاست، فوجی معاہدہ کے جھگڑوں، دھمکیوں سے پیدا ہونے والے خطرات اور موجودہ عالمی نظام سے پیدا ہونے والے خوف نفرت اور تشدد کا متبادل فراہم کرتا ہے۔

ناوابستگی کا عالمی نظریہ ایک ایسی دنیا کا تصور کرتا ہے جو نیوکلیائی اسلحوں سے پرے ہو۔ ناوابستگی کا عالمی نظریہ نیوکلیائی اسلحوں سے پرے ایک دنیا قائم کرنے کے لئے درکار عالمی نظام کے پرامن بقائے باہمی کا تصور کرتا ہے۔ ناوابستگی کا عالمی نظریہ خوف کی جگہ اعتماد نفرت کی جگہ خیرسگالی، تشدد کی جگہ امن اور پرامن بقائے باہم کو عدم تشدد طرز زندگی کی شکل میں پیش آتا ہے۔

نئے عالمی نظام کا خاکہ پیش کرنے کے لئے ناوابستگی کی تحریک نے اقوام متحدہ کے جائزے سے تحریک حاصل کی ہے۔ نئے عالمی نظام میں عالمگیر اعتماد پیدا کرنے کے لئے درکار نگرانی اور توثیق کا کام انجام دینے کی غرض سے اقوام متحدہ کے نظام کو مزید جمہوری بنانے اور اسے مستحکم کرنے کی ضرورت ہوگی۔

نئے بین الاقوامی اقتصادی نظام کو فروغ دینے کے لئے اقوام متحدہ کے اداروں کو استعمال میں لانے کی ضرورت ہوگی کیونکہ یہ ادارے بین الاقوامی سیاسی نظام کو جاری رکھنے کے لئے لازمی ہیں۔ ان اداروں کے ذریعے ہی ہمیں دیرپا ترقی صرف پرامن استعمال کے لئے بیرونی خلاء کے تحفظ اور انسانی تہذیب کے ثقافتی ورثے کی حفاظت کو یقینی بنانے کی غرض سے ماحولیاتی تحفظ کے لئے درکار عالمی تعاون کو بڑھاوا دینے کی بھی ضرورت

ان عظیم اور نیک کاموں کی تکمیل کے لئے ہی ہمیں اپنے ذہنوں کو ہم آہنگ کرنا ہوگا جنوبی ایشیا جو خود اپنی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہو، جو چھوٹے موٹے تنازعوں میں گھرا ہو یہ وہ جنوبی ایشیا نہیں ہے جو اپنی عوام کے وعدوں کو پورا کر سکے۔ اور نہ یہ وہ جنوبی ایشیا ہے جو نئے عالمی نظام میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ اگر ہم انسانی تقدیر کے کاروں کے صف اول میں جنوبی ایشیا کو مقام دلانے میں ناکام رہے تو ہم اپنی تقدیر کو دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیں گے اور ہمارے حصے میں ایک ایسا عالمی نظام آئے گا جو ہمارے مقاصد کے مطابق نہ ہوگا اور ہم اپنے مفاد کو دوسروں کے مفاد کے لئے گروی رکھ دیں گے۔ ہماری ساری امیدیں دوسروں کی خواہشات پر منحصر ہوں گی۔ ہم اپنی آزادی کو دوسروں کے حوالے کر دیں گے اور آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسری طرف خود اعتمادی اور آگے کی طرف گامزن جنوبی ایشیا کے ایک ارب افراد کی جو دنیا کی آبادی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہے۔ اس کی کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ ہم پر اس بات کا انحصار ہے کہ ہم نئے عالمی نظام کے چیلنجوں کے جواب میں جنوبی ایشیا کی آواز ٹکڑوں میں بٹے ہوئے خطے کی آواز ہوگی یا ایک ایسے خطے کی آواز ہوگی جن کے درمیان میل جول ہو اور جو اپنے صبر و سکون کے درمیان امن و تعاون سے قوت حاصل کرتے ہیں۔

جنوبی ایشیا میں ہمارے تعاون کو اس عظیم نظریے سے باخبر ہونا چاہئے ایسا کرنے میں ہمیں ہمت سے کام لینا پڑا ہے۔ کیا اب ہمارے پاس وہ ہمت موجود ہے کہ ہم تصور کو حقیقت کا جامہ پہنا کر اپنے درمیان تعاون کو نئی سمت دیں جو نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس تصور کے بغیر ہمارے درمیان تعاون کو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ تنگ نظریوں کا شکار نہ ہو جائے۔

ہمیں جنوبی ایشیائی تعاون کو اپنے کروڑوں لوگوں کے لئے ایک زندہ جاوید حقیقت بنانا ہے۔ ایک جنوبی ایشیا کی بیداری کی ضرورت ہے ایک ایسا شعور جس کے تحت بحیثیت ایک خطے کے ہمیں وہ سب کچھ کرنا ہے جن کے لئے ہم خواہشمند رہے ہیں اور جس کے لئے ہم مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں اور جسے ہمیں دنیا

سامنے لاتا ہے۔ جب تک ہم جنوب ایشیا کی علاقائی تعاون کی انجمن کو ایک تحریک نہ بنا لیں۔ اس وقت تک کامیابیاں صرف وصول میں پڑی فائل بند یا ہماری دفتری حکومت کے سانچوں میں پڑی نظر آئیں گی ایسا اسا کی تعاون رے عوام کی زندگیوں اور ہماری حکومتوں کے کام کے لئے سطحی ہوگا۔ ایسا تعاون سے علاقے کی ضرورتوں کے لئے کسی کام کا نہیں ہوگا اور نہ ہی عالمی امور میں۔ سے علاقے کے لئے کوئی کردار ادا کر سکے گا جو ہم بطور ایک علاقے کے حاصل چاہیں گے۔

ہمیں تمام رکاوٹوں کو دور کرنا چاہئے۔

شروعات کے طور پر ہمیں ان رکاوٹوں کو دور کرنا چاہئے جو اطلاعات کی دانہ ترسیل کی راہ میں حائل ہیں، معلومات کا حصول، باہمی اعتراف اور مفاہمت ترویحات، نیز نظریات و خیالات اور جذبات کا باہمی تبادلہ ہونا چاہئے۔ امید کروں گا کہ اطلاعات کی آزادانہ ترسیل سے ان تمام بندشوں کو توڑنے مدد ملے گی جو ایک دوسرے کو جاننے، ایک دوسرے سے ملاقات کرنے اور دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں ہمارے عوام کی راہ میں حائل ہیں ورک اس وقت ایک روشن حقیقت بن جائے گی جب جنوبی ایشیا کے عوام کو یہ معلوم کہ وہ اس علاقہ میں بغیر کسی پابندی یا رکاوٹ کے سفر کر سکتے ہیں۔ ہمارے عوام اس کام میں شامل اور سرگرم کیا جانا چاہئے تاکہ عوام کی خواہشات کی تکمیل پھر ہمارا ناون آگے کی سمت مزید رواں دواں ہو۔

میں تجویز کروں گا کہ ہم ان تین قسم کے اقدامات پر غور کریں جن سے ہم اس سمت ما آگے کی جانب بڑھ سکیں۔

پہلا قدم اس علاقہ کے اور مجموعی طور پر ہمارے علاقہ کے ہر ایک سے کو درپیش بنیادی مسئلہ غریبی کا خاتمہ ہے۔ ہمارے ہر ایک ملک میں ہماری سب سے بڑی ترجیح غریبی کے خلاف لڑائی ہے۔ جنوب ایشیائی علاقائی تعاون رے عوام کے لئے مفید ثابت ہو۔ اس سلسلے میں اس کو جہاں تک ممکن ہو سکے

پر ترقی کے ساتھ قومی طور سے مربوط ہونا چاہیئے ۔ تب ہی ہمارے عوام کے لئے اس کی اہمیت بہت زیادہ نمایاں ہو سکے گی۔ ہم سب ہی ترقی پذیر ممالک کم و بیش ترقی کے یکساں مراحل میں ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ مشترکہ تجربات کا خزانہ موجود ہے جس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔

جیسا انفرادی طور پر ایک علاقہ کے طور پر اپنے آپ کو مستحکم کرنے کے لئے اپنے ممالک کے درمیان رابطوں کو مستحکم کرنے کی بھی ضرورت ہے ۔ اس کام کے لئے ہمارے علاقے میں زیادہ اقتصادی تبادلوں کی ضرورت ہے۔ جس میں زراعت سے لے کر صنعت ، بنیادی ڈھانچہ ، ٹیکنالوجی اور انسانی وسائل کی ترقی و فروغ تک تمام اقتصادی سرگرمیاں شامل ہوں ۔ اقتصادی تعاون علاقائی تعاون کی بنیاد پر کیا جانا چاہیئے ۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے ہم آہنگی کی ایک فضا ہونی چاہیئے کہ ہماری حیثیتوں میں اضافہ ہماری متعلقہ حیثیتوں کو مستحکم بنانے نیز عالمی فورموں میں ہماری آواز اور اثر کو زور دار بنانے کے لئے موزوں ہو۔ اس سے ہمیں اس موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کو از سر نو مرتب کرنے کے سلسلے میں اپنا بھرپور تعاون دینے میں مدد ملے گی جو بنیادی طور سے غیر مساوی اور غیر منصفانہ ہے۔

ہم تجارتی اور اقتصادی تعاون کرنے سے کتراتے ہیں ۔ ہماری گذشتہ چوٹی کانفرنس میں ہم نے تجارتی اور اقتصادی تعاون سے متعلق شعبوں میں اپنے منصوبہ سازوں کے کام کو سراہا تھا اور اس قسم کے تعاون کے لئے شرائط و ضوابط طے کرنے کے لئے ماہرین کا ایک گروپ قائم کیا تھا۔ ایک سال میں منصوبہ سازوں کا دوسرا جلسہ اور ماہرین کا پہلا جلسہ منعقد ہوا ہے ۔ ہم نے ایک ایسی نوعیت کے علاقائی تعاون کے سلسلے میں ایک بھی بھرپور قدم نہیں اٹھایا ہے ۔ جو نچلی سطح پر ترقیاتی ادارے کے سلسلے میں ہمارے عوام کے لئے ضروری ہے اس طرح علاقائی تعاون ہمارے عوام کے لئے ایک حقیقت بن سکتا ہے ۔ اگر ہم سایوں کے پیچھے بھاگتے رہیں گے اور اپنے پر گزرد و خوف کو حاوی رکھیں گے تو ترقیات میں تعاون ایک سراب رہے گا

ترجیحات میں تعاون کے بغیر، جنوب ایشیائی علاقائی تعاون ہمارے عوام کی زندگیوں کے لئے مسلسل بیمار رہے گا۔

ہماری انجمن کے رکن ممالک کے رقبہ، ترقی کی سطح اور معیشتوں میں تنوع کے اعتبار سے فرق کے باوجود، ہم سب کے مفادات کے تحفظ اور اجتماعی مفاد کے فروغ کے لئے علاقائی تعاون کی کسی اسکیم میں خصوصی اقدامات اور تحفظات کئے جاتے ہیں۔ بھارت کو ابتدا میں یہ اعلان کرتے ہیں کوئی جھجک نہیں ہوئی ہے کہ بھارت کو اپنی خصوصی ذمہ داریوں اور فرائض کا مکمل احساس ہے۔ ہم اپنے کسی ساتھی کی قیمت پر کسی قسم کا غلط فائدہ اٹھانا نہیں چاہیں گے۔ درحقیقت کسی کے بھی مفادات کو نقصان پہنچا کر ہم میں سے کسی کے بھی مفادات حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

دوسرا اقدام وہ سرگرمیاں ہیں جن میں عوام کی زیادہ شرکت کی ضرورت ہے۔ کھیل کود اور ثقافت دو شعبے ہیں جن میں عوام کی شرکت اور ان کا رابطہ گہرا اور وسیع ہے۔ دونوں شعبوں کی نشاندہی تعاون کے لئے کی جا چکی ہے۔ ہم نے اب تک کھیل کود کے جو پروگرام منعقد کئے ہیں ان سے عوام کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں روایتی اور جدید کھیلوں میں مقابلہ جاتی ٹورنمنٹوں اور نمائشوں کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے تاکہ سارک کھیل مقابلے اتنے ہی دلچسپ ہو سکیں جیسے ایک روزہ کرکٹ یا فٹ بال میچ ہوتا ہے۔

ثقافت کے شعبے میں سارک نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ہماری صلاحیتوں کے مطابق نہیں ہے۔ ہماری ثقافتیں ہزاروں سال پرانی ہیں اور اپنے تسلسل کے لحاظ سے دنیا میں امتیاز رکھتی ہیں۔ آثار قدیمہ سے متعلق منعقدہ تین کانگریسوں نے ہمارے علاقے کے ورثے کے یکساں پہلوؤں کو ظاہر کیا ہے۔ ایسی لین دین سے ہماری ثقافت کی تشکیل ہوئی ہے۔

ریڈیو، سینما اور حال میں ٹیلی ویژن نے دکھایا دیا ہے کہ کس طرح جنوبی ایشیا کے عوام ایک دوسرے سے ہمکلام ہو سکتے ہیں ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکتے ایک دوسرے سے سیکھ سکتے ہیں، آپس میں ہنس سکتے ہیں اور اپنی تکمیل کر سکتے ہیں تا

ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے توسط سے ہم اپنی گوناگونی کے باوجود اپنے تعلق کا اظہار کر سکتے ہیں۔ بھارت جنوب ایشائی میلہ منعقد کرنے کی پیش کش کرتا ہے۔ ہم دوسرے ممالک میں ایسے ہی میلوں میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

تیسرا میدان جس میں جنوب ایشائی تعاون ہمارے عوام پر اثرانداز ہو سکتا ہے وہ ہے ماحولیاتی تحفظ کا میدان۔ ماحولیات کی سمجھ بوجھ اور حفاظت ایک عالمی مسئلہ ہے اور اس کے لیے عالمی تعاون کی ضرورت ہے۔ کاٹھمنڈو میں ہم نے قدرتی آفات و حادثات کے اسباب اور اس کے نتائج نیز ماحولیات کی حفاظت و تحفظ سے متعلق ایک مطالعہ شروع کروایا تھا ... میں ایک چھوٹی سی شروعات کی جا چکی اس کا چھوٹا سا دائرہ جو ہمارے ذہنوں ... شک و شبہات کی عکاسی کرتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے ترقی کا نتیجہ بدحالی اور غریبی کو بڑھاتی ہے۔ ماحولیاتی بدحالی ایک بنیادی سبب ہے جو بعض اوقات غریبی کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ ہم نے تلخ تجربوں سے یہ سیکھا ہے کہ تحفظ پر آنے والا خرچ ترقی کا ایک ناگزیر خرچ ہے۔ یہ ایک ایسی قیمت ہے جسے ماحولیات کی طرف غفلت برتنے کے لیے ادا کیا جانا چاہیئے اور جو ہمیشہ تحفظ کی لاگت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے کا ایک خاص تجربہ یہ بھی رہا ہے کہ بہت سے معاملوں میں بہت سے اہم معاملوں میں موثر تحفظ کے لیے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ جنوب ایشائی علاقائی تعاون کی انجمن کے ذریعے اب تک کئے گئے کام میں اس میدان میں نہ تو اس کی اہمیت اور نہ ہی اس میں تعاون کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ مطالعے جو ہم نے شروع کروا ... اسے جلد از جلد مکمل کئے جانے چاہئیں اپنے علاقے کے عام مسائل سے متعلق مطالعوں کے لیے ہیں بلکہ سے باہر دیکھنا چاہیئے ان مسئلوں میں سمندری سطح میں چڑھاؤ موسم کے بدلتے ہوئے رجحانات اور مانسون سمیت ماحولیاتی مسائل سے متعلق "گرین ہاؤس ایفکٹ" کا اثر خاص طور سے قابل ذکر ہیں یہ ایسے معاملے ہیں جو ہمارے عوام اور ہماری معیشت کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ ہمیں ان چیزوں کا مشترکہ طور سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور ایک ساتھ تعاون کے عملی طریقوں کی تلاش کرنی چاہیئے ہمیں ایک رفتار ہو کر کام کرنا

بقیہ صفحہ ۱۴ پر

سی این این مورتی

پختہ کوٹھا کسانوں کے لئے ایک رحمت

ترقی یافتہ زرعی تیکنالوجی اور انتظامی طریقوں کے طفیل ہمارے ملک میں خوراک کی پیداوار میں عظیم ترقیاں ہوئی ہیں حالیہ برسوں میں اناج کی پیداوار تقریباً ۱۸۵ ملین ٹن رہی جس نے اناج کو محفوظ رکھنے میں نئی جہت سے آشنا کیا۔

تقریباً ۷۰ فی صد اناج کسان لوگ اپنی غذائی ضرورت، چارہ، بیج، مبادلے یا فروخت کے لئے اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے اناج کا ذخیرہ کرنے کا روایتی سہولیات اور طریقے اناج کو نہ تو مقدار کے اعتبار سے اور نہ ہی کوالٹی کے اعتبار سے خراب ہونے سے روک پاتے ہیں۔ تقریباً اناج کا دس فی صد نقصان تو کسانوں کے پاس ہی ہو جاتا ہے۔ یہ نقصان کیڑوں، گھن، نمی، پھپھوندی لگنے اور چڑیوں کے کھانے سے ہوتا ہے۔ ذخیرہ کرنے کے اچھے بندوبست سے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ ذخیرہ کی سہولیات کو بہتر بنایا جائے اور دھات سے بنے اور غیر دھات والے پیپوں، ومٹکوں کے ڈیزائن کو بہتر بنایا جائے تاکہ وہ دیہی گھروں کے علاوہ شہری گھروں میں بھی استعمال ہو سکیں۔

محفوظ رکھنے کی مناسب تکنیکیں انڈین گرین اسٹوریج انسٹی ٹیوٹ (آئی جی ایس آئی) ہاپوڑ اور ان کے پانچ میدانی مراکز پر فصل کٹنے کے بعد اناج کے ذخیرہ کرنے اور محفوظ رکھنے کی بہتر تکنیکوں و طریقوں کے فروغ پر کام ہو رہا ہے۔ اناج کا ذخیرہ کرنے و محفوظ رکھنے سے متعلق بھارتیہ انسٹی ٹیوٹ (آئی جی ایس آئی) نے دیسی طریقے سے ذخیرہ کرنے کے بندوبست و ڈھانچوں میں سدھار لانے کے علاوہ دیہی علاقوں استعمال کے لئے دھات اور غیر دھات سے بنے مختلف مقدار اور گنجائش والے ظروف معہ ڈھانچہ

کے مختلف ڈیزائن تیار کئے ہیں۔ کسان اپنی خریداری کی ضرورت اور گنجائش کے مطابق کسی بھی دستیاب ڈیزائنوں میں سے ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔

اناج بچاؤ مہم (ایس جی ایس) جو محکمۂ خوراک کے تحت آئی جی ایس کا ایک معاون ادارہ ہے۔ اناج کو محفوظ رکھنے کے چھوٹے سائز کے (کم گنجائش والے) بیبیوں یا ٹنکوں کو مقبول عام بنا رہا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ریاستی حکومتوں کو مالی امداد فراہم کی گئی ہے۔ اور نو لاکھ سے زائد اناج محفوظ رکھنے کے پیپے یا ظروف حالیہ برسوں میں دیہی علاقوں میں فروخت ہوئے ہیں۔ کسانوں کے ہاں اناج کے ذخیرہ کرنے کی سہولیات کو بہتر بنانے پر دو وجوہات کے باعث زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اول یہ کہ ملک میں پیدا ہونے والے اناج کی بڑی مقدار کسان اپنے پاس رکھتے ہیں اور دوم یہ ہے کہ ذخیرہ کرنے اور محفوظ رکھنے کے دوران زیادہ نقصان کسانوں کے یہاں ہی ہوتا ہے۔

موجودہ زرعی فارموں اور دیہی گھروں میں اناج کا ذخیرہ رکھنے کے ڈھانچوں اور بندوبست کے ایک جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ اناج کا زیادہ تر نقصان ذخیرہ رکھنے کے سائنسی طریقوں کے استعمال نہ کرنے اور ذخیرہ رکھنے کے ترقی یافتہ ڈھانچوں اور ظروف کے عدم استعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ سہولیات اناج کو برباد ہونے سے روکنے میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اناج محفوظ رکھنے کا ایک اچھا ڈھانچہ اناج کو برباد ہونے سے بچاتا، بیج والے اناج کی عمدگی برقرار رکھتا ہے۔ ذخیرہ رکھنے کی موجودہ لاگت میں کمی آتی ہے۔ کیڑے لگنے کا کنٹرول تمام موثر طریقے سے ہوتا ہے اور اناج کے لدان اور اتارنے کے کاموں میں سہولت اور کفایت ہوتی ہے۔

نقصان پر قابو پانے کی ضرورت

کسان عام طور پر اناج کی بڑی مقدار مختلف قسم کے ذخیرہ کے ڈھانچوں میں رکھتے ہیں جو مقامی طور پر دستیاب خام مال سے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے ڈھانچے زیر زمین یا زمینی سطح سے بلند ہوتے ہیں۔ زرعی ذخیرے کے ڈھانچوں یا کوٹھوں کی دیواریں پانی نہیں روک سکتیں اور اناج چاروں اطراف اور زیریں فرش کی مٹی میں نمی کی وجہ سے اطراف

میں اور فرش سے لگے اناج میں پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ عام طور پر ذخیرہ رکھنے کے جو ڈھانچے گھروں میں اور گھروں سے باہر بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بنیادی طور پر گیلی مٹی، دھان کے پیرال نرکل (سرپت) اور بانس کی کھپچیوں سے بنائے جاتے ہیں یہ مٹی کے بنے ڈھانچوں مکمل طور پر نمی یا ہوا سے محفوظ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ذخیرہ کرنے کا ڈھانچہ یا کوٹھی جس چبوترے پر تعمیر کی جاتی ہے وہ زمین سے زیادہ بلند نہیں ہوتا ہے۔ اور کترنے والے جانور جیسے چوہے با آسانی ان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ڈھانچوں میں اناج عام طور پر کیڑوں، پھپھوندی اور کترنے والے جانوروں سے برباد ہوتا ہے یہ ڈھانچے دھونی دینے کے لئے بھی مناسب نہیں ہوتے کیونکہ گیس یا دھواں باہر نکل جاتا ہے۔

ایسے مسائل پر قابو پانے اور اناج کو محفوظ رکھنے کے لئے (آئی جی ایس آئی) نے ایک ڈھانچے کی سفارش کی ہے جسے پختہ کوٹھا یا کوٹھی کہتے ہیں۔ یہ ڈھانچہ چبوترے پر یا ٹھوس فرش پر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

ایک بہتر ڈھانچہ

پختہ کوٹھا یا کوٹھی بنیادی طور پر ایک اندرون خانہ بنایا جانے والا ڈھانچہ ہے جس میں کم نمی اور سوکھنے والے اناج کا ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ یہ ڈھانچہ موجودہ مٹی اور خام بینٹ کی اس کوٹھیا یا کوٹھی سے بہتر ہے جو عام طور پر پنجاب اور اتر پردیش میں استعمال میں آتی ہے۔ یہ ڈھانچہ پختہ اینٹوں اور سیمنٹ کے پلاسٹر سے بنایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دیہی گھروں میں دستیاب جگہ کے مطابق مختلف گنجائش اور سائزوں میں تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں دو میٹرک ٹن اناج رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں دو خانے ہوتے ہیں تاکہ دو قسم کے اناج یا دو قسم کی کوالٹی والا اناج علیحدہ علیحدہ کیا جا سکے۔ ہر خانے میں فرشی سطح پر اناج نکالنے کا گول یا چوکور سوراخ ہوتا ہے اور اوپر ڈھکن کی طرف اناج ڈالنے کا 425 x 350 ملی میٹر سائز کا مستطیل نما سوراخ ہوتا ہے۔ یہ سوراخ دھات کے بنے ہوتے ہیں۔ پختہ کوٹھا یا کوٹھی یا تو اینٹوں سے بلند چبوترے پر تعمیر کی جا سکتی ہے۔ جو 500 تا 700 ملی میٹر تک بلند ہو یا پھر 240 ملی میٹر بلند ٹھوس بنیاد پر تعمیر کے وقت 900 سے 1000 گیج کی پولی تھین کی شیٹ لگائی جاتی ہے۔ جو نمی کو اندر آنے سے روکتی ہے۔ اس کے علاوہ گو...

اندر محلل و قو... متحاب بھی ۔ کوٹھی کی تعمیر کے لئے بہت اہم ہے ۔ سب سے مناسب جگہ کسی کمرے کی دیو... ساتھ یا کونے کی ہوگی ۔ اگر کمرے کی پہلے ہی موجود دیوار بارش کے پانی سے محفوظ ہو... نے کے پورے ایک کنارے کو گھیر لینا کفایت کا باعث ہو سکتا ہے کمرے کی میر... ار کے ساتھ پولی تھین کی چادر بچھا کر ۱۱۵ ملی لیٹر موٹی فاضل دیوار تعمیر کرنے سے نمو... ندر پھوٹ آنے کا امکان نہیں رہتا ہے ۔ یہ تکنیک نمی کی روک تھام کا کام کرتی... س کوٹھی کا فرش اور چھت دو بار پکی ہوئی اینٹوں سے تعمیر ہوتی ہیں اور ڈھانچے کی دیو...ریں ۱۱۵ ملی میٹر موٹی اور سیمنٹ کے مسالے سے تیار کی جاتی ہیں دیواریں مضبوط کرنے کے لئے ہر چوتھی تہہ کے بعد ۶ ملی میٹر قطر کی لوہے کی سلاخوں کا استعمال کیا جانا چاہیئے ۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے سیمنٹ کے مسالے سے پلاسٹر کر دیتے ہیں

. کھرو سے مضبوط اور سستی | فرش سے اونچی پختہ کوٹھی یا کوٹھا تعمیر کرنے کے لئے سیمنٹ کی آٹھ بوریوں، ۰.۴۲ کیوبک میٹر پتھر کی بجری ۲۹ کلوگرام ایم ایس سلاخوں (۶ ملی میٹر موٹی دیوار اور دس ملی میٹر موٹے فرش اور دوبارہ پختہ کی گئی اینٹوں کی چھت کے لئے) اناج اندر ڈالنے اور باہر نکالنے کے سوراخوں کے لئے دو ڈھکنوں کی ضرورت ہوگی ۔ یہ پختہ کوٹھی یا کوٹھا ایک راج مستری ایک مزدور کے ساتھ مل کر روزانہ آٹھ دن کام کر کے تعمیر ہو سکتا ہے ایک قسم کی پختہ کوٹھی یا کوٹھا تعمیر کرنے کے لئے تقریباً ۱۱۲۰ روپئے درکار ہوں گے ۔

ٹھوس اور پختہ فرش اور پختہ کوٹھا تعمیر کرنے کے لئے ۸ بوری سیمنٹ ۰.۶۰ کیوبک میٹر موٹا ریت ۰.۷۱ کیوبک میٹر باریک ریت ۹۵۰ اینٹوں، ۰.۴۲ کیوبک میٹر پتھر کی بجری (جو ۸/۳ سائز کی ہو) ۲۱ کلوگرام ایم ایس سلاخوں (۶ ملی میٹر موٹی دیوار اور دس ملی میٹر موٹائی والے فرش اور چھت کی تعمیر کے لئے) اناج اندر ڈالنے اور نکالنے کے لئے دو عدد ڈھکنوں، ۳ مربع میٹر پولی تھین کی چادر (۸۰۰ تا ۱۰۰۰ گیج کی) ضرورت ہوگی ۔ اس قسم کا پختہ کوٹھا ایک راج مستری اور ایک مزدور کی مدد سے روزانہ آٹھ گھنٹے کام کر کے سات دن میں تعمیر کر سکتا ہے ۔ اس قسم کے پختہ کوٹھے کی تعمیر پر تقریباً ۱۰۶۰ روپئے کے قریب

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

بقیہ صفحہ ۳۱

اتنی انگریزی سیکھ لیں گے کہ ٹکنیکل ڈپلوما کورس میں داخلہ لے سکیں ۔

۵:۔ حکومت نے آٹھویں جماعت سے ہندی کا لزوم عائد کیا ہے اور طلبا کو اس سے استثنیٰ دیا جا سکتا ہے اور جب وہ اردو ہندی (۱۲۰ ۔ ۸۰) کمپوزٹ کورس اختیار کریں تو درجہ کے تعین کے لئے ان نشانات کو شمار نہیں کرنا چاہیئے ۔

۶:۔ اردو اساتذہ کے لئے تربیتی سہولت میں اضافہ کرنا چاہئے ۔ اردو بولنے والی آبادی کے علاقوں میں موجودہ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں متوازی جماعتیں قائم کرنا چاہئے ۔

۷:۔ اساتذہ کے تقررات کے لئے جب احکامات جاری کئے جائیں تو یہ واضح کرنا چاہئے کہ اردو تدریس اور اردو میں دیگر مضامین پڑھانے کے لئے اساتذہ کی ضرورت ہے

۸:۔ فی الوقت حکومت راسٹر سسٹم میں صرف اس حد تک ترمیم کا حکم دیا ہے کہ ایس سی اور ایس ٹی امیدوار صرف ۳ سال کے لئے عارضی طور پر بھرتی کئے جا سکتے ہیں اور اس عرصہ میں کوئی اضافہ تدریسی نہیں دیا جائے گا ۔ جب ایس سی اور ایس ٹی امیدوار دستیاب ہوں تو انہیں خدمت سے برطرف کر دیا جائے گا ۔ اس شرط کو ختم کر دیا جانا چاہئے ۔ اور ایس سی اور ایس ٹی امیدوار جب بھی دستیاب ہوں ان کا ان جائیدادوں پر تقرر کیا جا سکتا ہے ۔ جن کے لئے اشتہار دیا گیا ہے ۔

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (٦) شمارہ (٣) مارچ ۸۹ء حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	نعیم جاوید	کلیم الدین احسن

قیمت : پانچ روپیہ ۵/-

مجلس مشاورت

• محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد
منیر احمد صدیقی • محمد منظور احمد صدیقی • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاءالرحمٰن خاں منشار
• پروفیسر میر تراب علی

زر تعاون

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	۵۰ روپے	150 روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال	۹۰ "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	۱۰۰۰ "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب 147-5-11 ، ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد (اے۔ پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چادرگھاٹ سے چھپوا کر
دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ اے پی سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل	ایڈیٹر	۳
انبیاء علیہم السلام کی معراج کی قرآنی اصطلاحات	امۃ العزیز ساجدہ	۵
اسلام اور تعلیم	محترمہ عائشہ بیگم رباب	۸
خلافت	ڈاکٹر حسن الدین احمد	۱۳
ملک کی نازک صورت حال اور محبانِ وطن کی ذمہ داری	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۔
شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	۲۱
نواب بہادر یار جنگ چند یادیں اور چند باتیں	حضرت مولانا باری نقشبندی	۲۴
جگن ناتھ آزاد کو افتخارِ غالب ایوارڈ		۲۷
ذکرِ کرشن چندر	ڈاکٹر بھگتہ وتسل راؤ	۲۹
ذرائع ابلاغ کی اہمیت	تسنیم فاطمہ برلاس	۳۱
صفدر ہاشمی	قمر سنبل	۴۰

حرفِ اول

نہایت خوشی کی بات ہے کہ ریاستی چیف منسٹر جناب این ٹی راما راؤ نے حسبِ وعدہ اردو بچاؤ تحریک کے قائدین سے ۲ فروری ۱۹۸۵ء کو تفصیلی بات چیت کی جو نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ چیف منسٹر نے نہایت واضح الفاظ میں بتایا کہ لسانی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا جائے گا ۔ اردو بچاؤ تحریک کے قائدین کے ساتھ چیف منسٹر کی گفتگو نہایت خوشگوار فضاء میں ہوئی۔ چیف منسٹر نے نہ صرف یہ کہ نہایت توجہ کے ساتھ بات چیت میں حصہ لیا بلکہ تمام مسائل کی یکسوئی بھی کردی' موقع پر اہم فیصلے کئے (۱۴) مطالبات میں سے (۷) کو اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی سے رجوع کیا گیا اور (۷) مطالبات قبول کرتے ہوئے (۷) نکاتی اعلان جاری کیا اور ان کی موثر اور بلا تاخیر عمل آوری کا تیقن بھی دیا ۔

اعلان کے (۷) نکات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ سرکاری زبان کمیشن میں لسانی اقلیتوں کے مفادات کی نگہداشت کے لئے اردو کے نمائندہ کو شامل کیا جائے گا۔

۲۔ ڈپٹی سکریٹری یا جوائنٹ سکریٹری کی سطح کے ایک عہدہ دار کو سکریٹریٹ کے محکمہ جاتی ڈی میں اردو سے متعلق حکم ناموں کو روبہ عمل لانے کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جائے گا ۔

۳۔ سکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی مقرر کی جائے گی جو دیگر تمام مسائل و مطالبات اردو کا گہرائی سے جائزہ لے گی اور تمام امور سے نمٹے گی ۔

۴۔ اردو میں جو درخواستیں وغیرہ وصول ہونگی ان سب کے جوابات ممکنہ حد تک اردو ہی میں دیئے جائیں گے ۔

۵۔ سرکاری حکم ناموں کے اردو میں ترجمہ کرنے کے طریقہ کار کو برقرار رکھا جائے گا ۔

۶۔ سرکاری اور خانگی تعلیمی اداروں میں اردو کی متوازی جماعتیں اور سکشن قائم کرنے کے لئے عوام سے عطیہ نہیں لیا جائے گا۔

۷۔ اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء کو تیسری جماعت سے نہیں بلکہ پانچویں جماعت سے تلگو پڑھائی جائیگی

نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ سابقہ تمام حکم ناموں کو یکجا کر کے حکومت نے جو "بلیٹن" جاری کیا ہے وہ کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع جی او جاری کیا جائے گا جس میں قانون سرکاری زبان کی دفعہ ۲ کے مطابق اردو کے سرکاری استعمال اور موقف کی وضاحت کی جائے گی۔ اردو بچاؤ تحریک کے قائدین نے خوشگوار فضا میں فیصلہ کن گفتگو کے بعد اپریل ۱۹۸۳ء سے جاری اپنی (۱۰) ماہ طویل جدوجہد کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا، اردو والے حکومت اور اردو بچاؤ تحریک کے اس تصفیہ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان تصفیوں پر بلا تاخیر مخلصانہ اور منصفانہ طریقے سے عمل کیا جائے گا۔ تاکہ ہندوستانی عوامی زبان اردو سازگار ماحول میں پھلے پھولے، آگے بڑھے، اپنا مستحقہ مقام حاصل کرے۔ اور ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصّہ ادا کرتے ہوئے یک جہتی کو مستحکم بنائے۔

فارم ۴ تحت ضابطہ ۸

تختہ بابتہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد (انڈیا)

مقام اشاعت : دفتر شاداب، 147-5-11، ریڈہلز۔ حیدرآباد اے پی

اوقات اشاعت : ماہانہ

پرنٹر کا نام و پتہ : محمد قمر الدین صابری۔ ریڈہلز حیدرآباد اے پی

قومیت : ہندوستانی

پبلشر کا نام و پتہ ، محمد قمر الدین صابری ریڈہلز، حیدرآباد اے پی

قومیت : ہندوستانی

ایڈیٹر کا نام و پتہ ، محمد قمر الدین صابری ۔ ریڈہلز ۔ حیدرآباد اے پی

قومیت ، ہندوستانی

نام و پتہ مالک جریدہ = محمد قمر الدین صابری ریڈہلز حیدرآباد اے پی

قومیت : ہندوستانی

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و

[illegible]

امتہ العزیز ساجدہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

انبیاء علیہم السلام کی معراجوں کے قرآنی امتیازات

اللہ تعالیٰ نے اپنے باریابی اور تکلم سے بعض انبیائے کرام کو جو سرفراز فرمایا اور اس کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا اور پھر انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت آدمؑ کو حوا کے ساتھ جنت میں رہنے کا مقام عطا کیا لیکن ابلیس کے ورغلانے پر ان کی اس دنیا میں منتقلی عمل میں آئی مگر توبہ و استغفار کے ذریعہ انہیں حزن وملال سے نجات ملی اور علم و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ ورسالت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن چند ہی اشخاص ایمان لائے اور باقی کو غرق آب کرنے کیلئے حضرت نوح علیہ والسلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا (صنع الفلک باعیننا و وحینا (ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے ذریعہ ایک کشتی بناؤ) جس کے ذریعہ ایمانداروں کو بچا لیا گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ سلام "علی نوح فی العلمین۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے واقف کرانے کی غرض سے ارض وسموات کی سیر کرائی - وکذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض۔۔

حضرت ابراہیم ان نشانیوں کے بے حقیقی کو پہچان کر خالق الآیات

انی وجہت وجہی للذی فطر السموت والارض حنیفاً وما انا من المشرکین (سورہ الانعام)

حضرت ابراہیم کا یہی کلمہ ہماری نمازوں کی نیت بن گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی باریابی اور تکلم کا شرف حاصل ہوا لیکن تجلی باری تعالیٰ سے غش کھا کر گر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے اپنی بیوی کو لے کر مصر واپس ہورہے تھے تو انہیں ندا دی گئی انا اخترتک فستمع لما یوحیٰ

اسکے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزے بھی عطا کئے گئے اور حکم ہوا کہ فرعون کی سرکشی ختم کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرانے فرعون کے پاس جائیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (طٰہٰ)

فرعون کے غرق کئے جانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ہمراہ کوہ طور کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستے میں ان کی قوم شرک میں مبتلا ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ جب اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا۔ وما اعجلك عن قومك يا موسى ۔

اپنی قوم کو چھوڑ کر اتنی عجلت کیوں کی۔

اور واپسی پر اپنی قوم کی ان مشرکانہ حرکتوں کی وجہ سے انہیں اپنے الواح کو علٰحدہ رکھدینا پڑا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی معجزوں سے سرفراز کیا۔ مگر ان کا زمانہ نبوت بہت مختصر رہا ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو نور رسالت اپنے کمال کو پہونچ گئی۔

آپ کی سیرت کو اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ اور آپ پر ایسا قرآن نازل فرمایا گیا کہ جس کے ذریعہ بنی نوع انسانیت کو ظلمات سے نکال کر نورانی ہدایات عطا کی گئیں۔

فرائض نبوت کی تکمیل کے سلسلے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی مشکلات کا سامنا ہوا تو ۲۷ رجب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو معراج سے مشرف فرمایا اور جیسا کے پندرہویں پارہ کی ابتداء میں ذکر ہے کہ اللہ پاک اپنے بندے کو اپنے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا۔

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بٰرکنا حولہ لنریہ من اٰیٰتنا انہ ھو السمیع البصیر (بنی اسرائیل)

اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ سے مشرف باریابی عطا ہوئی اس کا کچھ ذکر سورہ والنجم میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت آپ کی نظر بھٹکی نہیں اور وہ قربت حاصل ہوئی کہ

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی o (النجم) اور اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ آپ کو بتایا جو بتانا مقصود تھا۔ معراج سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا مکالمہ اپنے صحابہ کے سامنے سنایا وہ مختصراً احادیث شریف میں اس طرح بیان کیا گیا کہ

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبٰتُ تمام قولی بدنی اور مالی عبادتیں اللہ کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا جواب آیا اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ سلام ہو آپ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ آنحضرتؐ نے دوبارہ عرض کیا اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ ط۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر۔ اس پر حضرت جبرئیل اور ملائکہ میں سے ہر ایک کی آواز سنائی دی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

الحاصل ہماری نمازوں کی نیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ کلمات ہیں جو انہوں نے آیات الٰہی کو دیکھ کر معرفت الٰہی پا لینے پر ادا کئے تھے جبکہ خود نمازیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی یعنی حضور صلعم کی معراج کا ماحصل ہوگئیں یعنی

الصلوٰت معراج المومنین ہوگئیں

بلغ العلیٰ بکمالہٖ	کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ	صلوا علیہ وآلہٖ

بقیہ صفحہ ۱۴

سے احساس ہو جائے۔ ہمارے اسلاف کے کارنامے ہماری نظروں کے سامنے آجائیں اور ہم بے تابی سے وہی کام کرنے دوڑیں جو ہمارے اسلاف نے کئے تھے یعنی سرِبلند و سرفراز ہو گئے تھے۔ جاہ و جلال پایا تھا۔ اس جمود کو دور کرنے کے لئے تازیانے لگانے کا کام جلسہ ہائے میلاد النبی ہی ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا ہے کہ ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق اور صراطِ مستقیم نصیب ہو۔ آمین

محترمہ عائشہ بیگم رباب

اسلام اور تعلیم

ہر سال ہم ربیع الاوّل کے مبارک مہینے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
ہ مبارک یاد تازہ کرتے ہیں۔ آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ کی سیرت پاک
ے کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے آقائے نامدار
ے کے نام پر گلہائے عقیدت نچھاور کریں اور اس محسنِ انسانیت سے دلی محبت کریں
پ پر درود و سلام بھیجیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ عملی طور پر آپ صلعم کی اطاعت
ور پیروی کا حق ادا کریں۔ ہر سال جلسہ میلاد النبیؐ کے موقع پر سب ایک دل ہو کر۔
تفاق و اتحاد کے ساتھ آپ کی تعلیمات کے مطابق اچھی باتیں اختیار کرنے اور ان پر
تی سے عمل کرنے۔ نیز بری باتوں کو یکلخت ترک کرنے کا عہد راسخ کریں اور فوری اس
پر عمل شروع کر دیں۔ ہم یہ عہد کریں کہ ہم غیر ضروری اور غیر شرعی اسراف جو رسومات
یشا بینی، فیشن پرستی اور پہننے کے کپڑوں پر حد سے زیادہ پیسہ خرچنے پر ہوتا ہے
یک دم روک دیں گے۔ جس قدر بھی ہو سکے پیسہ پس انداز کریں گے اور اس کو اپنے بچوں
تعلیم پر خرچ کریں گے۔ کیونکہ آج انسان کی زندگی میں سب سے پہلا اور اہم ترین
ریضہ اس کے بچوں کی تعلیم ہے۔ مسلمانوں کے بچوں میں مناسب تعلیم کے فقدان کی وجہ
سے ان میں تیزی سے پستی، پس افتادگی اور افلاس اور شرمناک برائیاں آ رہی ہیں
ن سب برائیوں کو کاٹنے کے لئے اگر کوئی تریاق ہے تو وہ تعلیم ہے۔ علم کے تعلق
سے آپ وہ دعا سنیئے جو حضور صلعم نے ہمیں سکھائی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا
نَافِعًا وَّ رِزْقًا طَیِّبًا وَّ عَمَلًا مُّتَقَبَّلًا ہ [اے اللہ میری درخواست ہے کہ مجھے فائدہ
بخشنے والا علم، اچھا رزق اور تیری بارگاہ میں قبول ہونے والا عمل دے] اس دعا

میں جن تین چیزوں کو مانگا گیا ہے ان میں سب سے پہلے نفع دینے والا علم اور اس کے بعد اچھے رزق کے ساتھ اللہ کے پاس قبول ہونے والا عمل ہے جب تک علم نہ ہوگا اچھے رزق اور مقبول عمل کی صورت پیدا نہ ہوگی۔ اللہ کا کلام جب حضور صلعم پر نازل ہوا تو سب سے پہلی وحی علم ہی سے متعلق ہے۔ اِقْرَأ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (پڑھو اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرہ خون سے پیدا کیا۔ پڑھو یہ تیرا بزرگ پروردگار ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو اس چیز کا علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ جل شانہٗ کے پاس قلم اور تحریر کی اتنی اہمیت ہے کہ سورۂ قلم کی ابتداء ہی اس سے کی گئی ہے کہ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ (قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کچھ لکھتے ہیں) نیز کلام پاک ہی میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ "کہہ میرے رب! میرے علم میں زیادتی فرما۔ فضیلت علم کے بارے میں قرآن پاک میں بہت سی آیتیں ہیں۔ جیسے يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کو درجات عطا فرماتا ہے)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے عام مسلمانوں پر علماء کو سات سو درجہ فوقیت ہے ہر درجہ کے درمیان پانچسو سال کی مسافت کے برابر فاصلہ ہے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ (فرما دیجئے کیا عالم و جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟) نیز فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں)۔

فرماتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُونَ ۝ (یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جنہیں عالم ہی سمجھتے ہیں) رسول اللہ نے فرمایا العلماء ورثة الانبیاء۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

نیز فرمایا۔ اچھا آدمی وہ ذی علم مومن ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں۔ علم حاصل کرو۔ اللہ کے لئے علم حاصل کرنا نیکی ہے۔ علم کی طلب عبادت ہے۔ علم سے مشغولیت تسبیح ہے۔ بحث و مباحثہ جہاد ہے۔ علم سکھانا صدقہ ہے۔ کسی اہلیت رکھنے والے کو تعلیم دینا قرب خداوندی ذریعہ ہے۔ علم تنہائی کا رفیق، غم خوار دوست، بہترین ہم نشین اور جنت کی راہ کے [illegible] ستارہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ علم ہی کے ذریعے قوموں کو سربلند فرماتے ہیں۔ بھلائیوں میں رہبری فرماتے ہیں۔ لوگ اہل علم کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ فرشتے اپنے پیروں سے ان کے دامن کی گرد جھاڑتے ہیں دنیا کی ہر چیز ان کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔ علم دلوں کی زندگی ہے۔ اور [illegible] پن اور تاریکی کے مقابلے میں بینائی ہے وہ جسم کی توانائی ہے: علم میں غور [illegible] روزے کے برابر ہے۔ اور اس کا شغل نمازوں کے مساوی ہے۔ اسی سے [illegible] قرابت کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ علم خوش قسمت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ بدقسمت [illegible] سے محروم رہتا ہے۔

سورۂ جمعہ کی دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ وہی ہے جس نے امیوں میں ان ہی کا ایک رسول بھیجا تاکہ انھیں اس کی آیتیں سنائے۔ ان کا تزکیہ کرے سنوارے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ آنحضرت صلعم نے کتاب و حکمت کی تعلیم دینے اور ایمان والوں کو سنوارنے اور ان کا تزکیہ کرنے کا پورا پورا اہتمام فرمایا۔ خصوصاً ہجرت کے بعد اپنی بے شمار مصروفیتوں کے باوجود۔ مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی ذاتی نگرانی فرمائی۔ جنگ بدر میں گرفتار ہونے والے پڑھے لکھے غریب مکیوں کی رہائی کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ مسجد نبوی میں صفہ پر مدرسہ قائم فرمایا۔ وہ دارالاقامہ بھی تھا اور مدرسہ بھی۔ جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی ضروری طور پر دی جاتی تھی۔ ہر تعلیم کے لئے [illegible] موجود تھے۔ آنحضرت صلعم کو عورتوں کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص خیال تھا اور اس کا بھی انتظام تھا۔ قرآن مجید میں فطرت کے مطالعہ پر بار بار زور دیا گیا ہے

اس اعتبار سے انسان کو کائنات سے متعلق علوم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے
یہ علم کائنات جتنا ہی بے اندازہ ہے۔ انسان چاہے جتنا بھی علم حاصل کرے پھر
بھی تھوڑا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق یہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لئے پیدا
کیا گیا ہے۔ اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے اپنے عمل کے مطابق جانچا
جائے گا۔ اس لئے سارے عالم سے استفادے اور اپنی تخلیق کے مقصد کو جاننے
اور اس کی تکمیل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم علم حاصل کریں نہ صرف دین کا علم
اس دنیا کا علم جو انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

مسلمانوں نے علم حاصل کیا۔ اور بہت محنت سے حاصل کیا نتیجتاً دنیا
کے سالار کارواں بن گئے۔ مگر اس کے بعد جب علم حاصل کرنے اور تحقیق و تجسس سے
غفلت برتنے لگے تو۔ حصول علم کی لگن اور محنت و مشقت کو چھوڑ کر غافل و
کاہل بن گئے تو پست کردہ اقوام میں شامل ہو گئے۔ آج ہماری کیا حالت ہے؟
ہم پست کردہ اقوام سے بھی گئے بیتے ہو گئے جس تیزی کے ساتھ مسلمانوں کی نسلیں بڑھ
رہی ہیں اسی تیزی کے ساتھ وہ مفلس، پس ماندہ تر بدکردار اور ہر قسم کی برائیوں میں
ملوث ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا معیار زندگی بڑی حد تک گر گیا ہے۔ زندگی کیا ہے
ایک بحران ہے۔ ایک پریشانی ہے ۸۰ فی صد سے زیادہ آبادی میں افلاس
پھیلا ہوا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے اپنے افلاس کو دور کرنا ہو گا۔ اور وہ اسی وقت
دور ہو گا جب کہ ہمارے بچوں کو اسلامی تعلیم دیں اور ساتھ ہی ساتھ انھیں دنیاوی
تعلیم کو نہایت ہی محنت و مشقت سے حاصل کرنے کے لئے تیار کریں۔ بچوں کے دلوں
اور دماغوں میں یہ بات ٹھونس ٹھونس کر ڈال دینا کہ وقت بہت تیزی سے
گذر رہا ہے اور انھیں صبح سے شام تک ایک ایک منٹ حصول تعلیم کے لئے
جانفشانی سے گذارنا ہے تب کہیں وہ جوان ہو کر، حلال کی روٹی خود کما سکیں گے
اور اپنے متعلقین اور مستحقین کو کھلا سکیں گے۔ زکوٰۃ لینے کے لئے ہاتھ پھیلانے
کے بجائے زکوٰۃ دینے کے اہل ہو سکیں گے۔ اپنی آج کی خستہ اور [illegible]

تعلق کے دائرے سے اپنی آئندہ نسلوں کو باہر نکالنے کا یہی ایک راستہ ہے
اپنے بچوں کو دیوانہ وار طریقہ سے محنت کرنے اور علم حاصل کرنے کے لئے تیار
کیا جائے ۔ وقت کو بے کار گنوانے سے بچوں کو بچایا جائے ۔ خراب بچوں کی
بری صحبتوں سے انہیں دور رکھا جائے ۔ اسکولوں کی تعلیم بچوں کے لئے کافی نہیں
ہے مزید وقت اسٹڈی کرنے کے لئے گھر میں ملنا چاہیئے ماں باپ چاہے جاہل
ہوں لیکن انہیں اپنے بچوں کی تعلیمی نگرانی کے لیے کافی وقت دینے کی شدید ضرورت
ہے ۔ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں جن علوم سے ہمارے بچوں کی زندگیاں سدھر
سکتی ہیں ، سنور سکتی ہیں ، وہ سرخرو ہو سکتے ہیں ان علوم میں زبردست محنت و
جانفشانی سے طاق بننے کے لیئے ان میں جوش و خروش پیدا کرنے کا کام ماں باپ
کے ذمہ ہے ۔ آپ تاریخ اسلام اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں نے بہت ہی محنت
و مشقت سے وہ وہ علوم حاصل کئے جن کو دنیا کے دوسرے لوگ حاصل نہیں
کر سکے ۔ اور جب مغربی ممالک کو ہوش آیا کہ وہ عربوں سے کتنے پیچھے ہیں تو ان میں
تعلیمی میدان میں سبقت لے جانے کا زبردست جوش پیدا ہوا ۔ وہ ہڑبڑا کر
اٹھے ۔ انھوں نے مسلمانوں کی کتابیں لیں اور ان کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں
کر ڈالا ، تب انھوں نے دیکھا کہ عربی کتب میں علم کا انمول خزانہ ان کے ہاتھ آگیا
ان ترجمہ شدہ کتابوں کو انھوں نے اتنی گہرائی اور ایسی انتھک کوشش سے پڑھا
کہ دن رات پڑھتے رہے ۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جاتے تھے ان کی غفلت کی آنکھیں روشن
ہوتی جاتی تھیں ۔ اور پھر کیا تھا ان ہی کتب کے مطالعے سے ان کی صلاحیتیں بڑھیں
اور وہ طرح طرح کی چیزیں ایجاد کرنے لگے ۔ بے شمار دولت ان ایجادات سے
ان کے ہاتھ لگی ۔ اور جن کا سائنس ، جن کی ریاضی ، جن کی حکمت ، ڈاکٹری ، انجینیری
جن کا لٹریچر اور دیگر علوم وہ لوگ لے گئے ۔ "یعنی ہم" ہمارا کیا حال ہوا ! ہمیں
مختلف اسباب نے گہری نیند میں سلا دیا ۔ آج ہم گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں ۔
ہمیں اس حد تک جھٹکے دینے اور جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے کہ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں ۔
ہمارے دماغ اور ہمارے دل جاگ جائیں ۔ ہمیں ہماری ذلت و خواری کا شدت

بقیہ صفحہ ۷ پر

ڈاکٹر حسن الدین احمد

خلافت

خلیفہ قرآن مجید کا اہم تعارفی لفظ ہے جو خَلَفَ سے مشتق ہے۔ خَلَفَ کے معنی متاخر ہونے پیچھے رہ جانے۔ بعد میں آنے یا کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ سَلَفَ کی ضد ہے جس کے معنی متقدم ہونے یا پہلے گزر جانے کے ہیں۔

خلافت کے لغوی معنی قائم مقامی کے ہیں۔ قرآن میں "انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا (۲: ۳۰)۔ عام طور پر اس کے معنی یوں لئے جاتے ہیں کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب مقرر کیا گیا جو درست نہیں۔ نہ تو انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہو سکتا ہے نہ قائم مقام۔ ان معنوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت انسان کے تفویض نہیں کی۔ زمین پر ہر آن فرمانروائی، حاکمی، شاہی اور خدائی سب اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ قرآن مجید میں استخلاف کے معانی ایک قوم کی جگہ دوسری کو اس کا جانشین بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر کردہ قانون بقائے اصلح کے تحت ایک نوع مخلوق کو دوسری کا جانشین یا قائم مقام بناتا رہا۔ عالم حیوانات کی کشمکش حیات میں جسمانی زور ہی کسی جنس کے قیام کے لئے کافی نہیں بلکہ بقا کا اصلی راز صلاحیت اور استعداد ہے۔ جس نوع حیوانی نے موانعات فطرت کا مقابلہ تدبیر اور استقلال سے کیا وہی قانون طبعی کی اصطلاح میں صالح اور وہی مستخلف فی الارض ہے اگر یہ صورت نہ ہوتی تو آج وہ عظیم الجثہ جانور جو انسان کی خلقت سے لاکھوں سال قبل روئے زمین پر کثرت سے موجود تھے مسلط ہو جاتے۔ غرض جانوروں کی ایک نوع کو اللہ تعالیٰ دوسری نوع کا جانشین بناتا رہا تا آنکہ اس نے انسان کو خلیفہ یعنی دوسری انواع کا جانشین بنایا۔ سورہ انعام کی آخرت آیت اور سورہ ۳۵ کی آیت ۳۹ کا یہی مفہوم ہے" وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ (یعنی دوسری انواع کا جانشین) بنایا" اللہ تعالیٰ انسانوں میں بھی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا آپ میرا رب تمہاری جگہ کسی قوم کو (تمہاری) جانشین کرے گا" (۱۱: ۵۷) اسی طرح فرمایا "اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں

[illegible]

[illegible] صالح امت کا جانشین) بنایا (۴۷ : ۳۸) [illegible] طرح فرمایا [illegible]

کی قوم کے بعد تم کو اس کا خلیفہ بنایا (۷ : ۶۹) انسانی معاشرہ کو مستحکم بنانے کے لئے ایمان اور عمل صالح لازمی ہیں۔ جس جماعت کے افراد میں یہ دونوں باتیں ہوں وہی اصلح ہے۔ اس خلافت کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ شرط رکھی ہے کہ انسان ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دے۔ آیت استخلاف میں ارشاد ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنایا جائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنایا جا چکا ہے (سورہ نور ۲۴ : ۵۵) سورہ (۲۱ : ۱۰۵) میں بھی آیہ استخلاف کا مضمون ہے۔ آیت استخلاف میں وراثت زمین سے متعلق مشروط وعدہ ہے۔

جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھو دیتی ہے تو اس کو ہٹا کر اس کی جگہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لاتا ہے جو با ایمان ہو اور عمل صالح کو اپنا شعار بنا چکی ہو۔ کسی قوم کو ہٹانے کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ اس قوم کو بالکل نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ ایک قوم کو ہٹانے کے بعد بھی اس قوم کے افراد موجود ہوتے ہیں اس کی جگہ جس قوم کو لایا جاتا ہے اس کے افراد بھی پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ پھر ایک قوم کو دوسری قوم کا جانشین بنانے کے کیا معنی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی صلاحیت کے بموجب اس کو اقتدار سے نوازتا ہے پھر ایک قوم کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بنانے کے معنی ایک قوم کو اقتدار سے محروم کر کے دوسری قوم کو اس جگہ اقتدار سے نوازنا اور دنیا کی امامت تفویض کرنا ہے۔ قوموں کو اقتدار سے نوازتے یا ان کو اقتدار سے محروم کرنے کا یہ کام اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانون کے تحت انتہائی انصاف سے ہوتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایمان والے اور عمل صالح کرنے والے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون اور وعدہ کے مطابق رسول اللہؐ کی قیادت میں اس جماعت کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ رسول اللہ کے بعد اس جماعت کو کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں نے فتنہ ارتداد کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اور اسلام کو نئی زندگی بخشی قرآن مجید کا جامع متن Standard Version مرتب کر کے حفاظت قرآن کے الٰہی کام کی تکمیل کی۔ غرض انہوں نے بقائے اصلح کے قانون کے تحت الٰہی امتحان میں کامیابی حاصل

اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جانشین بنایا امانت سونپا گیا۔

مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب متفقہ طور پر اپنا امیر منتخب کیا تو وہ بجا طور پر خلیفہ رسول کہلائے یعنی رسول ؐ کے بعد آنے والے یا ان کے جانشین اس طرح مابعد قرآن لٹریچر میں لفظ خلافت اس عظیم ادارہ کے لئے استعمال ہوا جو رسول کی جانشینی اور دنیا کی امامت کا فرض ادا کرے یا انکا خلافت کی بنیاد پچھلے کسی سیاسی نظام مثلاً قیصر وکسریٰ کے انداز پر نہیں رکھی گئی بلکہ وہ ایک جدید نظام تھا جس کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلم کو جو ملکی اختیارات حاصل ہیں ان کی حیثیت ایک مقدس امانت ہے۔

اس نوبت پر منہاج نبوت کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ منہاج کے معنی ہیں راستہ دستور یا طریقہ۔ رسول اللہ صلعم آخری رسول تھے آپ ؐ کے بعد کوئی رسول یا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ ؐ کے بعد فرائض نبوت مسلمانوں کی جماعت کے تفویض ہوئے۔ یہ ایسا عظیم اعزاز اور ذمہ داری ہے کہ سابق میں کسی امت کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ امت مسلمہ من حیث الکل منہاج نبوت پر فائز ہے۔ یہ حق مشترکہ طور پر باعث عزت اور موجب فخر ہے لیکن اگر امت کا کوئی فرد یہ ادعا کرے کہ وہ منہاج نبوت پر فائز ہے تو اس کا دعویٰ قطعی باطل قرار پائے گا۔ یہ حق اور یہ ذمہ داری امت مسلمہ کی مشترکہ امانت اور ذمہ داری ہے۔

اس اجتماعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک جسد واحد کی حیثیت سے ملی زندگی بسر کریں اور وحدت خیال اور وحدت عمل کا اظہار کریں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا خلیفہ ہو جو مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہو۔

خلافت ایک ایسا عجیب و غریب ملٹی نیشنل ادارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بموجب ایک قوم کی جگہ دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی رہی اور یہ سب اقوام خلافت کے دائرہ میں رہیں عربوں کی سیادت ختم ہوئی تو عجمیوں - تاتاریوں - سلجوقیوں اور ترکوں نے یکے بعد دیگرے قیادت سنبھالی - ایک ایک قوم آگے بڑھی اور اس نے مرکزی کردار ادا کیا۔ خلافت قائم رہی مرکزیت باقی رہی۔

انسانیت کی نشو ونما ایک ایسی انسانی جماعت کی ذمہ داری ہے جو خالق کائنات کے منشاء کے تحت اس اہم اور مقدس کام کو شعوری طور پر انجام دے - خلافت کو ایسی انسانی جماعت کے کر

حیثیت حاصل ہے۔

مسلمانوں کی حیات اجتماعی کا سب سے بڑا سانحہ سلسلۂ خلافت کا انقطاع ہے۔

جب ۱۳۴۲ سال تک نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ عالم انسانیت کی بیش بہا خدمات انجام دینے کے بعد اندرونی کمزوریوں اور بیرونی سازشوں کے باعث ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ ہوا تو یہ خود مسلمانوں کا زوال تو تھا لیکن اسلام کے انحطاط اور مسلمانوں کے قیادت اور خلافت سے محروم ہو جانے سے دنیا ایک نظریۂ حیات اور عملی نظام سے محروم ہو گئی انسانی زندگی کا لائحۂ عمل متاثر ہو گیا اور غلط فلسفیانہ تصورات کا اثر فضاء میں چاروں طرف پھیل گیا۔ اگر خلافت باقی رہتی اور مسلمان اپنے فرض کو انجام دیتے ہوئے علوم اور فلسفوں کو اس نہج سے آگے بڑھاتے جس کی نشاندہی قرآن کرتا ہے تو باطل فلسفے اس طرح ہرگز فروغ نہ پاتے جس طرح ان کا فروغ ہم بھگت رہے ہیں اور آج دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ خلافت کا خاتمہ ہوا اور علوم سے مسلمانوں کو سروکار نہ رہا تو کفر نے مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کے بعض حقائق اور علم کو لے کر اور اس میں باطل کی آویزش کر کے استدلال کی قوت کے سہارے ان کو دنیا میں پھیلا دیا۔ موجودہ تہذیب کی تمام خرابیوں اور کوتاہیوں کی اصل وجہ یہی باطل فلسفے ہیں ان ہی باطل نظریات کی بنیادی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے موجودہ دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور پہونچ رہا ہے۔ دنیا کو ان سے نجات دلانا امت مسلمہ کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

مسلمان ہی دنیا کی مسلمہ علمی صداقتوں کے وارث ہیں کیونکہ یہ صداقتیں قرآن کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ جب مسلمانوں نے ان علمی صداقتوں کی تلاش بند کر دی اور ان کی ترقی میں اپنا حصہ ادا نہ کیا تو یہ علمی صداقتیں نہ صرف باطل کے ساتھ ملوث ہو گئیں بلکہ باطل فلسفوں کی زینت بن گئیں۔ بہ الفاظ دیگر علمی صداقتوں کے بل بوتے پر باطل کی جلوہ فروشی خلافت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں نے خلافت کو ختم کر کے ایک مجرمانہ کوتاہی کی ہے دنیا کو مسلمانوں کی خلافت کے ختم ہو جانے سے بدقسمتی سے دوچار ہونا پڑا۔ حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتے جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخداترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے اور مسلمان ایک غول کی حیثیت میں نہ ہوں بلکہ خلافت کے تحت امت واحدہ کا

شکل میں ہوں۔

خلافت کے اختتام اور مسلمانوں کے انحطاط کے نتیجہ میں جو قوتیں ابھریں وہی تمام خرابیوں کا اصل سبب ہیں۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خلافت دینی ضرورت ہے خلافت کا قیام جو اسلامی مملکت کی مستند شکل ہے محض ایک سیاسی تدبیر ہی نہیں بلکہ ایک شرعی ضرورت ہے جس کے بغیر دین کے اہم ارکان متاثر ہیں اور خلافت اسلام کی بقا اس کی عالمی ترویج اور مدافعت کے لئے ناگزیر ادارہ ہے۔ خلافت سے محرومی شریعت کے بنیادی احکام سے انحراف کے مترادف ہے۔

جہاں تک دینی ضرورت کا تعلق ہے صرف چند امور لائق غور ہیں۔ اسلام میں نہ کلیسائی نظام ہے نہ پروہتی نظام لیکن اسلامی عبادات کی ادائی میں تنظیم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں پر جو فرائض عائد کرتا ہے ان کی بجا آوری باہمی ربط کے بغیر ممکن نہیں۔ بعض فرائض نوعیت کے اعتبار سے صریحاً اجتماعی ہیں۔ پروہتی نظام سے بچنے کے لئے اسلام نے ایسی ملت منظم کی جو اجتماعی فرائض ادا کر سکے۔ اسلامی مملکت کی تشکیل کی بنیادی غرض یہی ہے کہ وہ ملت کی تنظیم کی سربراہ ہو۔

صلوٰۃ دین کا دوسرا اہم رکن ہے۔ امیر المومنین اور ان کے تحت تمام اصحاب اقتدار کا فرض ہے کہ اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کریں۔ صلوٰۃ جمعہ کی تنظیمی سطح پر بڑی اہمیت ہے۔ خطبہ جمعہ کی اہمیت کا سرسری اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمانان عالم کا خواہ وہ حدود خلافت میں رہتے ہوں یا خلافت سے باہر، ایک پلیٹ فارم ہے جہاں مقررہ دن اور مقررہ وقت پر سب مسلمان جمع ہو جاتے ہیں۔ خطیب جمعہ کا خلیفہ کی جانب سے مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ خطبہ جمعہ خلفاء کے تسلسل کے اظہار اور خلیفہ وقت کے نام سے یا اس کی جانب سے ہوتا ہے اس لئے اس میں خلیفہ کا نام لینا ضروری ہے۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں خطبہ جمعہ کی افادیت اور معنویت باقی نہیں رہی۔

جو لوگ جلسے منعقد کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں اس دشواری کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو جمع کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ تاریخ اور وقت کا تعین کرنا۔ سب کو اس کی اطلاع دینا جلسہ کے لئے مقرر کا انتظام کرنا وغیرہ۔ اسلام نے دن۔ وقت۔ مقام اور خطیب کے انتخاب کے

تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے اور ہمیشہ کے لئے پلیٹ فارم کا مستقل اہتمام کیا اور ان خطبات
کے سلسلہ میں اہم [illegible] پڑھے جانے والے ہدایات مشترکہ حکمت عملی کے نشانات طے کرتے [illegible]
ایک ہی مرکزی قوت کے ترجمان ہوتے ہیں یہ ایسا اہتمام ہے جو عقل انسانی کو دنگ کر دیتا ہے ۔
ذرائع ابلاغ کی غیر معمولی ترقیوں کے باوجود ایسے خوبصورت اور مکمل انتظام کا کوئی جواب نہیں ۔ یہ
سارا اہتمام عملاً تو باقی ہے لیکن اس کا ایک اہم بنیادی جزو یعنی خطیب کو مقرر کرنے والی
[illegible] باقی نہیں جس کے نتیجہ میں خطبہ جمعہ کی روح باقی نہیں رہی اور اس کے فائدوں سے
جو اہم منفعت کے حامل تھے مسلمان محروم ہو گئے ۔ اقامت صلوٰۃ کا اہم فرض متاثر ہو گیا ۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے ۔ عام صدقات و خیرات اور زکوٰۃ میں ایک واضح فرق ہے
صدقہ و خیرات اختیاری ہیں جب کہ زکوٰۃ کی ادائی لازمی یعنی [illegible] ہے ۔ صدقہ و خیرات
ایک فرد دوسرے فرد کو دیتا ہے جس کو دیا جائے اس پر دینے والے کا احسان ہوتا ہے ۔ زکوٰۃ
کی رقم مزکی (زکوٰۃ دینے والا) اپنے ہاتھ سے مستحق کو نہیں دے سکتا بلکہ بطور ٹیکس خلافت کے
مرکزی ادارہ بیت المال کو دینا ضروری ہے ۔ زکوٰۃ کی ادائی میں کسی احسان کا تصور نہیں بلکہ
مستحق کا شرعی حق ہے ۔ جو بیت المال سے اس کو پہنچا دیا جاتا ہے ۔ امیر المومنین سے اپنے
عاملین کے ذریعہ زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ کی رقم مرکزی بیت المال میں جمع
ہونے کے بعد امیر المومنین ہی کی جانب سے اس کو متعلقہ ابواب پر صرف کیا جاتا ہے ۔ خلافت
کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ بنیادی رکن متاثر ہے ۔

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے ۔ حج کے موقعہ پر تمام دنیا سے آئے ہوئے مسلمانوں کے
عظیم الشان اجتماع میں خطبہ حج خلیفہ وقت یا ان کی جانب سے نامزد کئے ہوئے آدمی کی ذمہ داری
ہے ۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ اہم رکن متاثر ہے ۔

جہاد اسلام کا اہم رکن ہے ۔ جہاد کی بنیادی جہت اللہ کے حکم کی برتری ہے اس کے
لئے ضروری ہے کہ مسلمان ذاتی اور سماجی زندگی میں اللہ کے حکم کی برتری کا مظاہرہ کریں ۔ یہ سب
منظم طریقہ پر کریں ۔ دین کی تبلیغ بلند اخلاق اور عمدہ طریقہ پر کریں ۔ اور اس طرح کریں کہ حجت قائم
ہو جائے ۔ اس میں جو بھی دشواریاں اور رکاوٹیں ہوں ان کو برداشت کریں ۔ پوری طاقت سے
جد و جہد کریں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں ۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش بھی جہاد ہے اگر

تاکہ نیک مسلمان [illegible]
پر تیار رہتی ہے [illegible]
سے پہلے کا کام [illegible]
ہے ہو اس طرح خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسلام کا ایک اہم رکن بے اثر ہو گیا ہے۔

یہی حال دوسرے احکام کا ہے۔ قرآن مجید میں ناپ تول کا خیال رکھنے کی تاکید بار بار آئی ہے۔ ان احکام کی پابندی امیر المومنین کے حکم سے ہوتی ہے جو محتسب کے ذریعہ ان پر عمل پر نظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح محتسب اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ بازار میں ذخیرہ اندوزی نہ پائے اور یہ کہ صنعت و تجارت میں جھوٹ، خیانت اور فریب بھی نہ ہو۔

یہ تو رہی ارکان اور احکام اسلام کی بات۔ اگر غور سے دیکھیں تو خود قرآن مجید کے بیشتر احکام خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے معطل العمل باقی نہیں رہے۔ قرآن کا واضح حکم ہے: اطاعت کرو اللہ کی، رسول کی اور ان کی جو تم میں اولی الامر ہیں۔ (۴: ۵۹) اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اولی الامر صرف امیر المومنین یا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ بدنہ دنیا کے مسلمان اپنے اپنے علاقہ کے حکمرانوں کو اولی الامر تسلیم کریں اور ان کا حکم مانیں تو ویسی ہی سر پھٹول ہو گی جیسی کہ خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے آج ہو رہی ہے۔ اولی الامر کی عدم موجودگی ایک عجیب و غریب صورتحال ہے جس کی سنگینی کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے ایک حالیہ عبرت آمیز واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

جب کبھی مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے تو وہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف اور ۲۹۵ الف کے تحت چارہ کار اختیار کرتے ہیں۔ ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء چاند مل چوپڑا نے کلکتہ کی عدالت العالیہ میں رٹ پیش کی کہ متذکرہ دفعات ہی کے تحت قرآن کی قابل اعتراض آیات پر پابندی عائد کی جائے یعنی ان کو ban کیا جائے۔ جسٹس Basak نے اس رٹ کو نامنظور کیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں ہندو رکھشا دل کے صدر اندر سین شرما اور سکریٹری راجکمار آریہ نے قرآن مجید کی چوبیس (۲۴) آیات کی نشاندہی کرتے ہوئے ہندی میں ایک پوسٹر شائع کیا جس کا عنوان تھا "ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں" اور مطالبہ کیا کہ جب تک ان آیات پر پابندی عائد نہ کی جائے گی ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا روکنا ناممکن [illegible]

نہیں ہوسکتی۔ اس پوسٹر کے شائع کرنے والوں کے خلاف عدالتی کارروائی کی گئی لیکن عدالت نے ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کو ان اشخاص کو بری قرار دیا۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ متذکرہ آیات باہمی نفرت پیدا کرنے کے باعث ہیں اور فیصلہ کیا کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف اور ۲۹۵ الف کے تحت ان ہر دو کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔

اگر کلکتہ ہائیکورٹ کورٹ منظور ہو جاتی تو ہندوستان کی حد تک چند آیات قرآنی پر پابندی عائد ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ صورتحال ہوتی کیونکہ ملک بھر کے تمام قرآنی نسخوں کو جن میں وہ آیتیں موجود ہوں ضبط کیا جاسکتا تھا۔

مغربی طاقتوں اور یہودیوں نے متعصب ہندوؤں سے زیادہ گہری اور موثر چال چلی انہوں نے ملت اسلامیہ کی محرک اور کارکرد مشنری سے "کنگ پن" کو نکال دیا۔ آیتوں کو تو درکنار انہوں نے قرآن اور دین کو بے اثر اور کم اثر کردیا۔ وہ آیتیں جو خلافت سے راست یا بالواسطہ متعلق تھیں تلاوت کے لئے تو رہ گئیں لیکن معناً وہ معطل ہوگئیں اور یہ سب اس انداز سے ہوا کہ مسلمان اس صورتحال کی سنگینی کا پورا ادراک تک نہ کرسکے۔

خلافت کو ختم ہوئے پینسٹھ سال گزر گئے ان (۶۵) سالوں میں ملت اسلامیہ کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچا جس کا تصور میں لانا مشکل ہے گویا ۶۵ صدیاں گزر گئیں۔ بیسویں صدی کے فوائد سے ہم مستفید نہ ہوسکے۔ دنیا میں آزادی اقوام کی ہوا چلی مسلم ممالک کو جو برطانوی۔ فرانسیسی اور دوسرے سامراجی ممالک کے غلام تھے آزاد کیا گیا لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا۔ اسلام تو عرب وعجم کی تقسیم کا روادار نہ تھا۔ اب خود عربیت کی ریاستیں بیسیوں ذیلی وحدتوں میں بٹ گئیں۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سامراجی طاقتوں یعنی برطانیہ، فرانس امریکہ اور روس نے اپنے ساختہ و پرداختہ مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو انتشار و اختلاف میں الجھائے رکھا۔ مسلمان حکمران جو شخصی مفاد کی بناء پر سامراجیوں کے آلہ کار بن گئے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی افکار سے مرعوب ہے دونوں احیاء خلافت کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ لفظ خلیفہ کو وہ معنی دیئے گئے ہیں جو اس کی عظمت کے منافی ہیں۔ خلیفہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہوتا ہے اور بیک وقت دنیا میں ایک ہی خلیفہ ہوتا ہے عام زبان میں خلیفہ حجام، نائی، درزی وغیرہ پیشہ کرنے والے آدمیوں کو کہتے ہیں یا پھر صوفیوں کی اصطلاح میں

مرشد اپنے جن مریدوں کو بیعت لینے کی اجازت دیتے ہیں ان کو خلیفہ کہا جاتا ہے نہ خلیفہ کے معنی خواہ سیاسی ہوں یا صوفیانہ اصل لفظ کی جو عظمت تھی ذہنوں میں باقی نہ رہی اور کئی خلیفہ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک دینی اصطلاح کو مختلف معنی دیدیئے جاتے ہیں تو اس کی عظمت ذہنوں سے محو ہونے لگتی ہے اس کے باوجود یہ بات خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس دینی ضرورت کو تسلیم کرنے تیار ہے اور ملت کا سواد اعظم اس انتشار و اختلاف سے بری ہے جس میں دشمنان اسلام کے خود غرض ایجنٹ الجھے ہوئے ہیں۔

ہر قوم کو اپنے ورثہ کے تحفظ کی خواہش ہوتی ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ ورثہ خلافت اسلامیہ کا تسلسل ہے۔ خلافت کے احیاء ہی سے مسلمانوں کے بلکہ عالم انسانیت کے تمام مسائل انشاء اللہ حل ہوں گے۔ اس لئے خلافت کے احیاء کی کوششوں میں تیزی پیدا کرنا چاہیئے۔ بعض گوشوں سے اس قسم کے شیطانی وسوسے پیدا کئے جاتے ہیں کہ خلافت کا احیاء مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مسلمانوں کا ذہن اس تعلق سے بالکل صاف ہونا چاہیئے کہ اگر خلافت ایک دینی ضرورت اور انسانیت کی موجودہ خرابیوں کا واحد حل ہے تو اس کا احیاء ہونا چاہیئے اور ضرور ہوگا۔ اگر اسلام حق ہے۔ خلافت اسلام کی بنیادی ضرورت ہے اور اگر مسلمانان عالم کا روئے زمین پر بالآخر ایک غالب عنصر رہنا منشاء الٰہی ہے تو خلافت کا قیام ضرور عمل میں آئے گا۔ ضرورت وسیع پیمانہ پر احساس پیدا کرنے کی ہے۔ عزم کی ہے۔ استقامت کی ہے۔ یقین کی ہے اور سعی و کوشش کی ہے۔ اس بات کو مسلمانوں میں عام کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی ادارہ خلافت کا بدل نہیں ہوسکتا۔ بین الاقوامی سطح پر اسلامی ادارے مثلاً رابطۃ العالم الاسلامی۔ اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اور ایسے ہی دوسرے ادارے خواہ کتنے ہی مفید کام کیوں نہ انجام دیں خلافت کے متبادل نہیں ہوسکتے۔

ایسا نہیں ہے کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کو ختم کر دیا گیا تو مسلمانان عالم نے اس صورتحال کو تسلیم کرلیا۔ امت اسلامیہ کی اہل نظر شخصیتوں نے جن میں برصغیر کے مولانا محمد علی اور سید سلیمان ندوی۔ روس کے موسیٰ جار اللہ، مصر کے محمد علی علویہ پاشاہ اور سید رشید رضا مدیر المنار، انڈونیشیا کے سعید عمر شکرو منتو اور عرب لیگ کے مفتی امین الحسینی شامل تھے باہم صلاح و مشورہ کرکے ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں ایک جمعیت حج کے اجتماع کے موقع پر قائم کی اور اس کا نام موتمر العالم الاسلامی رکھا

یہ اسلامی ریاست تشکیل دیا گیا ہے۔ دنیا کے ۱۱ ملکوں میں احمدی خلیفہ یا الحاکم سے قائم ہے اور
وہ کوشش کر رہے ہیں کہ خلافت کا نظام پھر سے اختیار ہو۔

خلافت کے قیام کے سلسلے میں کچھ اہم تجاویز بھی سامنے آئی ہیں۔

سید قیصر الحق انصاری پرنسپل گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان نے ایک ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ کا مکمل دستور آئینی تجاویز کا خاکہ مرتب کیا جس کو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رابطہ العالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ میں پیش کیا۔ اس کا اردو ترجمہ "مطلب یا ہم" کے نام سے کاروان ادب ملتان نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ یہ مسلم ملکوں کے کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز ہے۔ کنفیڈریشن کی حکومت صدر، مجلس استصوابیہ، مجلس ملی اور مجلس علماء پر مشتمل ہوگی۔ مجلس ملی کی تشکیل کے لئے ہر رکن ریاست سے تین ارکان منتخب کئے جائیں گے۔ صدر کا انتخاب ۵ سال کیلئے ہوگا۔ مجلس علماء ۳۲ علماء پر مشتمل ہوگی۔ اس دستور کا مقصد اسلامی نظریات و تحریکات پر مبنی مسلم حکومتوں کی سیاسی وحدت قائم کرنا ہے لیکن دستور میں کسی جگہ اور نہ ہی پیش لفظ اور دیباچہ میں احیاء خلافت کی بات کی گئی ہے۔ اور دستور میں کنفیڈریشن کے صدر کے لئے خلیفہ یا امیر المومنین کا لقب استعمال نہیں کیا گیا۔ اس طرح یہ ایک ایسی تجویز ہے جو خلافت کے احیاء کی تحریک سے قریب تر لانے کے باوجود حکومت بری ترقی کی ... ہے۔

حیدرآباد دکن سے جناب سید شاہ معین الدین محمد محمد الحسینی فیض نے ۲۱ اپریل ۱۹۹۹ء میں ایک مسودہ دستور خلافت اسلامیہ مرتب کر کے شائع کیا۔ اس دستور کا خاکہ جمہوری اساس پر مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی طرز حکومت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دستور کے بموجب ملک اسلامیہ میں مجلس اولیٰ کے کئی مرحلے ہونگے۔ ہر مسلم ملک کی خود مختاری ختم نہ ہو ان کے اساس پر برقرار رکھتے ہوئے ارکان کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

ضرورت ہے کہ ان بنیادی خاکوں کو سامنے رکھ کر تجاویز مرتب کی جائیں۔ عالم اسلام کے ہر ملک میں بحث کی جائے گی۔ غیر مسلم ... خطوط پر ... جائے گا ... خلافت تمام عالم انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ احیاء خلافت کے راستے میں جو رکاوٹیں نظر آ رہی ہیں ان کو ... اور حکمت سے دور کرنا چاہئے۔ وہ دن دور نہیں کہ خلافت کا احیاء ہوگا اور ... ہوں گے ...

ابوالحسن علی ندوی

ملک کی نازک صورت حال اور محبانِ وطن کی ذمہ داری

(خطبہ صدارت بر اجلاس پیام انسانیت [illegible])
منعقدہ [illegible]

صاحبو! [illegible] آپ مجھے معاف کریں گے کہ میں بھائیو اور دوستو کے الفاظ کے سوا اس وقت دوسرے الفاظ استعمال نہیں کر رہا ہوں، کبھی اسٹیج پر اگر مختلف عہدیدار اور اعزاز و القاب رکھنے والے معزز صاحبان [illegible] تعداد میں تشریف رکھتے ہوں تو ہمیں میں سے ہر ایک کا نام لے کر خیر مقدم کرنا اور ان کے [illegible] کو یاد کرنا کہ ایسے معزز حضرات ہمارے اسٹیج پر تشریف رکھتے ہیں [illegible] بلکہ ایک ضروری کام [illegible] معلوم نہیں کس مصلحت [illegible] کا نام [illegible] القاب و آداب ذہن میں [illegible] ان کی خصوصیات کے ساتھ خطاب کرنے سے احتیاط کر رہا ہوں [illegible] اور میں بھائیو اور دوستو ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں اور یہی ہماری اس تحریک "پیامِ انسانیت" کی روح اور اسپرٹ ہے، اور میں اس کو سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

حضرات! ملک کی جو [illegible] صورت حال ہو [illegible] کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں [illegible] حالات [illegible] ایک [illegible] وہ آج [illegible]

محبت، امن و سکون، اور بھائی چارہ کی فضا رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کا ایک دوسرا گھر بھی ہے، وہ گھر بڑا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ اس کا ملک ہے، لیکن ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ دونوں ہمارے گھر ہیں، ایک ہمارا چھوٹا گھر (چاہے وہ بڑی وسیع اور شاندار کوٹھی ہو) جس میں ہمارے بچے اور ہمارا کنبہ رہتا ہے۔ دوسرا بڑا گھر جو ہمارے چھوٹے گھر جیسے بے شمار گھروں سے مل کر بنتا ہے، جس میں ہمارے بھائی بند اور اہلِ وطن رہتے ہیں۔ ہم جس طرح اپنے چھوٹے سے خاندان کے فرد ہیں۔ اسی طرح ہم اس بڑے کنبہ سوسائٹی (معاشرہ یا سماج) اور ملک کے آبادی کے بھی ایک فرد ہیں ہماری نظروں سے یہ حقیقت اکثر اوجھل ہو جاتی ہے کہ ایک گھر کی قسمت دوسرے گھر سے وابستہ ہے۔ یعنی آپ کے بڑے گھر (ملک) کی قسمت آپ کے گھر سے اتنی وابستہ نہیں ہے۔ جتنی آپ کے گھر کی قسمت اس بڑے گھر (ملک) سے وابستہ ہے، اگر وہ گھر پرامن اور پرسکون (شانت) ہے اگر وہ گھر محفوظ ہے۔ اگر اس گھر میں محبت کا دور دورہ ہے۔ اگر اس گھر کا ہر فرد دوسرے فرد کا حق پہچانتا ہے، اس کو اس کی جان پیاری ہے، وہ ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ اس کا اپنے اوپر حق مانتا ہے اس کی جان کی اس کے مال کی اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا، تو وہ گھر خوش نصیب ہے وہاں جینے اور رہنے کا مزہ ہے اور وہ گھر خطرہ سے محفوظ ہے، جب تک ہم اس بڑے گھر (اپنے ملک اور دیس کو) اپنا گھر نہ سمجھیں گے، اس گھر کی فکر نہ کریں گے اس گھر میں امن کا دور دورہ اور محبت و باہمی اعتماد کی فضا نہ ہوگی، اس کی ہر چیز ہم کو پیاری نہ معلوم ہوگی، اس وقت تک اس چھوٹے گھر کا کوئی ٹھکانا نہیں اس کی بقا اور حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں۔

لیکن یہ بدیہی اور واضح حقیقت اکثر ہمارے ذہن سے نکل جاتی ہے اپنے ذاتی گھر کی فکر، اس کی محبت جیسے بڑے گھر (دیس اور ملک) کے مقابلہ میں "بچوں کا گھروندا یا گڑیوں گڈوں کا محل کہنا غلط نہ ہوگا" ہم اپنی دنیا سمجھنے لگتے ہیں، اپنی زندگی اور اپنی فکر و دلچسپی کو اس گھر کی چہار دیواری میں محدود دیکھ

لیتے ہیں ، اور اپنی قسمت کو اپنے کنبہ اور خاندان کے افراد سے وابستہ کر لیتے ہیں، اور گھر کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں یہ حقیقت ہمارے ذہنوں سے نکل جاتی ہے ، کہ جب باہر زور کی آندھیاں اور ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں ، یا باہر آگ لگی ہو اور وہ آگ بڑھتی چلی آرہی ہو ، ساری بستی سیلاب کی زد میں ہو یا زلزلہ کے پُرزور جھٹکے آرہے ہوں تو کوئی ایک گھر بھی اس بنیاد پر محفوظ نہیں رہ سکتا کہ وہ بڑی مضبوط اور گہری بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے ، اور انجینیری اور فنِ تعمیر ARCHITECTURE کے اعلیٰ اصولوں پر اس کی تعمیر ہوئی تھی ، اور وہ نہایت مضبوط آہنی پھاٹک رکھتا ہے جس سے اگر شیر اور ہاتھی بھی سر ٹکرائیں تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔

اسی طرح اگر یہ گھر محبت و الفت کی گھنی چھاؤں کے نیچے زندگی گذار رہا ہے زمین کے ذرّہ ذرّہ اور درخت کے پتہ پتہ سے امن و شانتی کا پیغام مل رہا ہے خاندان کا ہر فرد دوسرے فرد پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے ۔ لیکن باہر نفرت کی گرم اور زہریلی ہوائیں چل رہی ہیں ۔ بدگمانیوں اور دشمنیوں کے طوفان اٹھ رہے ہیں ۔ تو یہ گھر بھی سکون کے ساتھ نہیں رہ سکتا ، جب کسی بستی میں یا بستی کے آس پاس پلیگ ہوتا ہے [اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے] اور جب غذاؤں اور پانی میں بیماری کے جراثیم اور سمیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ تو بڑے سے بڑے صاف ستھرا گھر اور بعض اوقات صحت و بیماریوں سے حفاظت کے مرکز [سینیٹوریم] SANATARIUMS اور ہسپتال دواخانے بھی محفوظ نہیں رہتے آپ ہزار اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیں ، دروازوں پر تالے ڈال لیں ، اور اوپر سے شامیانے بھی لگا دیں اور سب کو تاکید کر دیں کہ خبردار کوئی گھر سے باہر قدم نہ نکالے تو یہ سب احتیاطات بھی کام نہ دیں گے ۔ جب تک کہ باہر کی پوری فضا آپ کے گھر سے تعاون نہ کر رہی ہو ۔ آپ کے گھر کی فضا کے لئے سازگار نہ ہو اس وقت تک وہ محفوظ نہیں کیا جا سکتا ۔

میں اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں ، گرمی کا سخت زمانہ ہے ، آگ برس رہی ہے ، آپ ایک پتھر پر کھڑے ہوئے ہیں پتھر جل رہا ہے آپ ایک بالٹی پانی اپنے

پیچھے [illegible] کے پتھر پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا ہو جاتا
ہے مگر آپ کو تھوڑی دیر کے بعد ہی احساس ہو جائے گا کہ پتھر اور زمین پر
[illegible] کی شدت پھر پانی پر غالب ہے، وہ جگہ پھر گرم ہو گئی اگر پورا فرش جل
[illegible] اور موسم میں اچھا ہے، تو یہاں آپ کھڑے ہیں اس لحظہ کو ٹھنڈا کرنے
کا کام نہیں [illegible]۔ یہ موسم اور ماحول کی گرمی کا اثر ہے، آپ اپنی جگہ برف کی سل
[illegible] اور اس سل پر کھڑے ہو جائیں، تھوڑی دیر بعد وہ برف کی سل بھی
پگھل جائے گی اور گرمی آپ کے پیروں کو جھلسا دے گی۔ آج ہمارے
[illegible] اور مغرب زدہ مفکرین اور مصنفین یہاں تک کہ بعض لوگ بھی اس
فہمی میں مبتلا ہیں وہ صرف اپنے رہنے کی جگہ کو ایئر کنڈیشن کر رہے ہیں
[illegible] ماحول اور فضا سے لاتعلق ہو کر بیٹھے ہیں جس میں آپ کو زندگی گزارنی
آپ ایک گھر یا ایک محلہ یا ایک بستی کو بھی AIR-CONDITIONED کر لیں تو اس سے
[illegible] چلے گا مگر آپ یہ بھی طے کر لیں کہ آپ اس گھر سے باہر نہیں نکلیں گے
[illegible] زیادہ دیر تک آپ کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ فضا کی
[illegible] گرمی [illegible] دے گی یا اس کے ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت [illegible]
[illegible] کام کرنے والی چیز قانون قدرت ہے۔ مستقل طور پر ساتھ دینے
[illegible] ہے آسمانی کتابیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں، قرآن شریف
[illegible]

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ — اور اس فتنہ سے بچتے رہو، جو اگر
الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً — اٹھا تو اس کی زد صرف انہیں پر نہیں
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ — پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں
الْعِقَابِ ۝ — بلکہ سب ہی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے
(سورۃ الانفال - ۲۵) — اور جان لو کہ اللہ بڑی سخت سزا دینے والا
ہے!

ﮮ [illegible] راہ روی [illegible] اصول و اخلاق سے [illegible]

اور دولت پھیل کر مقلوب مثال کا نتیجہ کسی فرد یا افراد تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر پورے معاشرہ یا ماحول پر پڑتا ہے اور وہ پورا معاشرہ اور ماحول جس نے اس کو روکنے کی کوشش کی اور اس سے آنکھیں بند کر لیں اس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

تاریخ بھی بتاتی ہے کہ دنیا میں کئی ایسی مستحکم سلطنتیں اور ترقی یافتہ تہذیبیں گذری ہیں، جن کا دنیا میں طوطی بولتا اور ڈنکا بجتا تھا لیکن ان میں مرور زمانہ سے ذہنی انتشار، اخلاقی زوال و انحطاط رونما ہوا، نفس پرستی، دولت پرستی کا لاوہ پھوٹ پڑا، انسانی حقوق پامال اور عزت و آبرو خاک میں ملائی جانے لگی، خواہشات نفس کی تسکین اور ذاتی مفادات کی تکمیل پیرزیا تیں اور عملی [illegible] صرف کی جانے لگیں۔ مذہبی تعلیمات اور اخلاقی قدروں سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئیں بلکہ ان کا مذاق اڑایا جانے لگا، ظلموں اور کوششوں میں داد عیش دی جاری تھی اور انگریزی مثال کے مطابق "روم جل رہا تھا" اس زمانہ میں بھی نیرو سے تھیٹر، فلاسفر، ادیب و شاعر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے، وہ اپنے فن کو رچے تھے اور لوگوں کو اپنی فنی مہارت اور ادبی کمالات سے محو کر رہے تھے، لیکن معاشرہ بگڑا ہوا تھا، بازاروں میں فساد تھا، سڑکوں پر فساد تھا، [illegible] فساد تھا، تعلقات میں فساد تھا، جب فساد کی یہ ناگہانی آندھی چلی تو روم جیسا شہر بھی جو اپنے قانون Roman Law اپنے علم و فن [illegible] Roman Administration اور [illegible] اور ترقی یافتہ تہذیب اور معیار زندگی کی بنا پر دنیا میں ضرب المثل تھا۔ اس سب کے باوجود اخلاقی امکانات سے مفقود ہو کر زوال اور موت و ہلاکت کی [illegible] سے نہ بچ سکا جس کی قرآن مجید نے تصویر کھینچی ہے

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ — اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک

بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ — کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش پر نازاں

مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن — تھیں سو دیکھ لو یہ گھر ہیں کہ ان کے بعد

إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ○ آبادہی نہیں ہوئے لیکن تھوڑی
(سورۃ القصص] ۵۸ [ ) دیر کے لئے اور آخرکار ہم ہی مالک ہے:

اس تاریخی زوال وانحطاط پر آخری سقوط و زوال کی تاریخ اور اس کی۔ تفصیلات آپ انگریزی کے شہرہ آفاق مصنف وادیب GIBBON کی کتاب۔ [زوال وسقوط روما] DECLINE AND FALLOF THE ROMAN EMPI کے صفحات میں پڑھ سکتے ہیں۔

آج ہندوستان میں ہم اسی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں، ہمیں صرف اپنے گھر کی فکر ہے، اس وقت کا سب سے بڑا مرض وہ ہے جس کو ہمارے صوفی [سلف] اور شاعر "نفسی نفسی" (یعنی میں ہی میں) کہتے تھے۔ ہر شخص کی انانیت EGO اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری اخلاقی قدریں، سارے انسانی اعتبارات اور سارے قومی وملی مفادات پس پشت پڑ گئے ہیں۔ خودغرضی، مفاد پرستی کا ایک جنون پیدا ہوگیا ہے۔ ہر شخص اسی فکر میں ہے کہ میں دن بھر میں کتنا کما سکتا ہوں، میں مہینہ بھر میں کتنی آمدنی پیدا کر سکتا ہوں، میری تنخواہ کتنی اور میری بالائی آمدنی کتنی ہے مجھے معاف کیجئے، آج کل بالائی آمدنی اصل ترجیح وفضیلت کا معیار QUALIFICATI ہے شادی بیاہ کے رشتوں اور پیاموں میں بے تکلف پوچھا جاتا ہے۔ اور تعارف وتعریف میں بھی کہا جاتا ہے کہ بالائی آمدنی کتنی ہے۔ معاف کیجئے گا اس بالائی آمدنی سے بہت کم لوگ بالا وبلند ہیں۔

حضرات! اپنے گھر کی فکر کرلینا، اپنے گھر کو گلزار بنالینا اور اس کو ایک مثالی IDEAL ماحول بنا دینا بالکل کافی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سمندر میں تو جزیرے ہوں گے۔ وہ ہزاروں لاکھوں برس سے اپنی جگہ پر ہیں لیکن زمین کسی جزیرے کو قبول نہیں کرسکتی، قانونِ قدرت سمندر میں جزیروں کی اجازت دیتا ہے، اور ان کی سلامتی کا ضامن ہے، قانونِ قدرت کا NATURAL LAW ہے، وہ ابدی اور دائمی ہے۔ وہ زمین میں جزیرہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آج ہم نے گھر گھر کو جزیرہ بنا رکھا ہے، شہر شہر کو جزیرہ بنا رکھا ہے۔ اپنی ذات اپنی برادری

کو جزیرہ بیمار کس ہے: یہ جزیرہ جزیرہ سے ٹھہر نہیں سکتے۔ ہم آج سے دو ہزار سال پہلے کی تاریخ پڑھتے ہیں، تو ان جزیروں کا نام ملتا ہے، وہ جزیرے آج تک موجود ہیں اور رہیں گے، پہاڑ لاکھوں برس سے کھڑے ہیں، لیکن مسلح تومعول کے لئے اللہ کا قانون دوسرا ہے۔ وہاں اپنی الگ دنیا نہیں بسائی جاسکتی وہاں کے ہر خطہ کا متاثر اور مؤثر ہوتا قانون قدرت ہے، اس پوری سطح زمین کے لئے خدا کا حکم، مذہب کی تعلیم اور قانون فطرت یہ ہے کہ مِل جل کر رہا جائے، انسانیت ایک زنجیر مسلسل ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہے، ہر ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ ہے یہاں ہر ایک، ایک ہی وقت میں سائل اور مسئول ہے، ہر ایک محتاج اور محتاج الیہ ہے، قدیم مشرقی فلسفہ کی اصطلاح میں انسان "مدنی الطبع" ہے [یعنی فطرتاً متمدن اور اجتماعی زندگی گذارنے کا خواہشمند اور ضرورت مند ہے] یہاں جنگل کی زندگی نہیں گذاری جاسکتی، کہ ایک جانور کو دوسرے جانور سے سروکار نہیں، اور ہر طاقتور کمزور کو شکار کرنے کے لئے تیار رہے کوئی کام باہمی صلاح ومشورہ اور تعاون سے نہیں کرتا، ہر ملک اور شہر کو ایک ایسے حساس، شریف النفس، پُرمحبت خاندان کی طرح رہنا چاہئے جو دوسرے کی تکلیف سے تکلیف خوشی سے خوشی محسوس کرے۔ جہاں چمن کے پھولوں، مناظر قدرت، اور جمالیاتی مظاہر، اس سے آگے بڑھ کر اپنے سرمایۂ دولت اور سامانِ عزت ولذت سے بڑھ کر اپنے ہم وطنوں اور انسانی بھائیوں کے بچوں کو دیکھ کر خوشی محسوس ہو بلکہ پیار آئے، میں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اس ملک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، جہاں لوگ خود اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہ ہوسکیں؟ وہ بچوں کو دیکھیں تو بجائے خوش ہونے اور اطمینان کا سانس لینے اور شکر کرنے کے ان پر یہ فکر غالب ہو کہ معلوم نہیں کل ان کے ساتھ کیا پیش آئے، کل امن وامان کی حالت کیا ہوگی، کوئی طوفانی جھکڑ ایسا چلے کہ یہ کلیاں پھول بننے سے پہلے مسل دی جائیں اور دیکھنے والا حسرت سے کہے کہ

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے۔

یہ ایک ایسی انوکھی، غیر معمولی اور استثنائی بات ہے جس کو ہر ایک آدمی عقل سے باور نہیں کر سکتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ مختصراً اس لئے کہ انسانی قدر و قیمت کا احساس نہیں، انسانیت کے رشتے سے ایک خاندان ہونے کا اور اس کی طرف منسوب اور جڑا ہوا ہونے کا جذبہ یہ نہیں معصومیت، انسانی جمال و کمال سے لطف لینے، علم کی دولت سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی عادت نہیں، حالانکہ ہمارے اس ملک کو اس بات کا فخر ہے کہ یہاں وہ لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے باہر کی دنیا کو بھی امن و محبت کا پیغام دیا، اس ملک کے خمیر میں محبت ہے، پریم ہے۔ آپ اس ملک کی تاریخ پڑھتے ہیں، اس ملک کی تاریخ خالی مہا بھارت نہیں ہے، رامائن نہیں ہے، اس ملک کی تاریخ میں محبت کی داستانیں ہیں۔ آپس کے بھائی چارہ و ایثار و قربانی کا جذبہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں صرف دو تین باتیں یہاں کے صوفیوں کی سناتا ہوں، میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور اس کے ناطے ان صوفیوں کے کچھ واقعات نقل کرتا ہوں۔

حضرت خواجہ فریدالدین شکر گنج چھٹی صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ ہیں ان کے پاس ایک شخص قینچی لایا، ہر شہر کا ایک تحفہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے شہر کا تحفہ تھا جہاں قینچیاں بہت اچھی بنتی تھیں وہ بہت خوش تھا کہ میں حضرت کے سامنے اپنے شہر کی یہ سوغات پیش کروں گا تو حضرت بہت خوش ہوں گے کہ بڑی کام کی چیز لایا، اور مجھے دعا دیں گے لیکن جب ان کے سامنے قینچی پیش کی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ کیا؟ یہ ہمارے کام کی چیز نہیں ہے! ہمارا کام کاٹنا اور پھاڑنا نہیں، ہمارا کام سینا اور جوڑنا ہے (ان کا مطلب دلوں اور تعلقات کو جوڑنا اور ملانا تھا) ہمیں قینچی کی ضرورت نہیں ہے، تم ہمارے لئے سوئی لائے ہوتے۔

باقی آئندہ شمارہ میں

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ (قسط سوم)

سادگی مسلم کی دیکھ

۱۹۴۷ء کے اگست کے مہینے میں ایک روز میں اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ حسبِ معمول سے کھردرے سے بادامی کاغذ پر ایک سائیکلوسٹائلڈ خط نکلا۔ جسے میں اپنی زندگی کا نہایت عزیز خط سمجھتا ہوں۔ آغا ہلالی نے نئی دہلی سے حکم بھیجا تھا کہ مجھے پاکستان کی وزارتِ تجارت میں انڈر سیکرٹری تعینات کیا گیا ہے۔ اور میں ۱۵ اگست کے بعد جلد از جلد کراچی پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لے لوں۔

حکومتِ پاکستان کے نام سے اپنی زندگی کا پہلا خط پاکر جوشِ مسرت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ایک پوسٹنگ آرڈر نہیں بلکہ ایک سلطنت مل گئی ہے۔

اس خط کا ایک ایک حرف بجلی کی لہر کی طرح میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ میں نے اسے بار بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور بھاگم بھاگ وزیر اعلیٰ کے کمرے میں پہنچ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شری ہری کرشن مہتاب بڑے خوش اخلاق اور نیک نیت ہندو تھے۔ میرے چہرے پر مسرت کا غیر معمولی ہیجان دیکھ کر وہ افسردہ سے ہو گئے۔ اور بولے "میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ جب جی چاہے چلے جانا۔ مجھے تو اس بات کی چنتا ہے کہ اگر سب مسلم افسر اسی طرح چلے گئے تو صوبے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

چیف منسٹر سے فارغ ہو کر میں چیف سکریٹری مسٹر پی۔ سی۔ کر بی کے پاس گیا۔ میں

جیسے شوقیہ مزاج آزاد خیال دہریہ قسم کے آدمی تھے۔ گائے کا گوشت شوق سے کھاتے تھے اور اسی وجہ سے تعصب کے جذبات سے خالی تھے۔ آئی سی ایس کی ٹریننگ کے دوران انھوں نے لندن میں کسی کے پاس سورہ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ دیکھا تھا۔ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسے حفظ کرلیا۔ کبھی کبھی موڈ میں آکر مجھے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے "یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ سات چھوٹے چھوٹے فقروں میں اتنا کچھ آگیا ہے کہ سات کتابوں میں بھی نہیں سما سکتا۔"

جب میں نے مسٹر مکرجی کو چیف منسٹر کی یہ تشویش بتائی کہ اگر مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو یہاں پر مسلم آبادی کی دیکھ بھال کون کرے گا، تو وہ زور سے ہنسے اور بولے "مہتاب جی رسمی باتیں کرتے ہیں۔ تم یہاں رہ بھی جاؤ تو ۱۵ر اگست کے بعد تمہیں ہوم ڈیپارٹمنٹ سے نکال کر غالباً ریکارڈ آفس کا افسر بکار خاص لگا دیا جائے، تاکہ بند کمرے میں بیٹھ کر پرانی فائلوں کی گرد جھاڑتے رہو۔"

مسٹر مکرجی نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالی اور کھول کر مجھے ایک صفحہ دکھایا جس میں صوبے کے نئے گورنر چندو لال تریویدی نے چیف سکریٹری کو انتہائی درشت لفظوں میں بڑی سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ نیا گورنر بھی آئی۔ سی۔ ایس افسر تھا اور حال ہی میں ڈیفنس سیکریٹری کے عہدے سے ترقی پاکر اڑیسہ کا پہلا ہندوستانی گورنر مقرر ہوا تھا۔ چیف منسٹر اور دوسرے کانگریسی وزیروں کے سامنے وہ بڑی فرمانبرداری سے دم ہلاتا رہتا تھا، لیکن چیف سیکریٹری سمیت باقی افسروں پر گرجنا برسنا اور نا جائز رعب جھاڑنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ چیف سیکریٹری کے طور پر میں بھی چند روز کا مہمان ہوں۔" مسٹر مکرجی نے کہا۔" یہ لوگ مجھے درجہ اول کا ہندو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے بہت جلد مجھے بھی کسی بے عزت اور بے اثر محکمے کی پوسٹ میں دھانس دیا جائے گا۔ تم ان کی باتوں میں نہ آنا بڑے شوق سے پاکستان جاؤ۔ وہاں جانا تمہارا فرض ہے۔

اگست کے شروع ہی میں کٹک سے کراچی پہنچنے کے سارے رستے مسدود ہو چکے تھے۔ جوں توں کرکے میں کسی نہ کسی طرح بنگال ناگپور ریلوے کے ذریعے ۱۲ر ستمبر کو بمبئی پہنچ گیا

اور اگلے روز ایئر انڈیا کے ہوائی جہاز سے کراچی آگیا۔

وزارت تجارت، صنعت اور ورکس چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی۔ آئی چندریگر وزیر، مسٹر میکلفارلین سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسن جائنٹ سیکرٹری تھے۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کسے کہتے ہیں اور برآمدات و درآمدات کس چڑیا کا نام ہے۔ بندر روڈ پر ایک کباڑیے کی دوکان سے میں نے ایک انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کام کرنے کے لئے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا ہوا تھا۔ پہلے روز اس میں فقط ایک میز تھا۔ دوسرے روز ایک کرسی بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کرسیاں اور بھی آگئیں۔ فائلوں کے لئے کاغذ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اس روز یہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔

ان دنوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ بھارت سے ان دونوں کی درآمد یکایک بند ہو گئی۔ چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گڑ کا استعمال شروع کر دیا۔ اور کراچی میں جابجا طرح طرح کا گڑ ریڑھیوں پر بکنے لگا۔ لیکن کوئلے کی کمی باعثِ تشویش تھی۔ اس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے پر چلتی تھیں۔ اور اس کی قلت سے رسل و رسائل کے سارے نظام کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے چندریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افسروں کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کی۔ میں سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا۔ اس لئے میری چند تجاویز بڑی سہولت سے منظور ہو گئیں۔ اس سے میرے وزیر، سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کو غالباً یہ خوش فہمی ہو گئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے۔ لیکن مجھے علم تھا کہ میں اندر سے کھوکھلا ہوں تاہم اپنی ہمہ دانی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے میں نے بازار سے تجارتی معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور حکیمانہ میٹنگوں

[illegible]

[illegible] اور مشورے دینے کی شدید عادت ڈال رکھی۔
میرے اس سطحی قسم کے عمل سے چندریگر صاحب خاص طور پر مرعوب تھے اور بہت سی میٹنگوں میں مجھے اکثر اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز وزیر خزانہ غلام محمد صاحب کے کمرے میں میٹنگ تھی۔ کراچی میں دفتری اور رہائشی ضروریات کے لئے جو نئی عمارتیں اور کوارٹر تعمیر ہو رہے تھے۔ ان کے لئے سینٹری سامان درآمد کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میٹنگ میں چار پانچ وزیر اور کچھ افسر شریک تھے۔ وزیروں میں مولوی فضل الرحمن بھی موجود تھے۔ جن کے پاس امور داخلہ، اطلاعات اور تعلیم کا چارج تھا۔
کچھ بحث و تمحیص کے بعد جب سینٹری کے سامان کا کوٹہ طے ہو گیا، تو وزیر تعلیم مولوی فضل الرحمن نے بڑے معقول الفاظ میں تجویز پیش کی کہ اگر اس امپورٹ کا کچھ حصہ ڈھاکہ کے لئے بھی مخصوص کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

اس تجویز پر بڑی ہنسی اڑی۔ کسی نے کہا کہ ڈھاکہ میں کوئی خاص تعمیری کام شروع نہیں ہوا اس لیے وہاں پہ سینٹری سامان بھیجنے کی کوئی تک نہیں۔ کسی نے کہا کہ جو سامان ڈھاکہ جائے گا وہ لازمی طور پر سمگل ہو کر کلکتہ پہنچے گا۔ ایک صاحب نے مذاق ہی مذاق میں یہ پھبتی اڑائی کہ بنگالی لوگ تو کیلے کی گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں۔ وہ ابھی سے کموڈ اور واش بیسن لے کر کیا کریں گے۔

مولوی فضل الرحمن مسکرائے نہ بگڑے۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے انہوں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ زیادہ نہیں تو ایک قلیل علامتی سا حصہ ڈھاکہ کے لئے ضرور مخصوص کیا جائے، کیونکہ نظریاتی طور پر یہ مناسب اقدام ہوگا۔ کچھ مزید بحث و مباحثہ اور طنز و مزاح کے بعد مولوی فضل الرحمن صاحب کی بات مان لی گئی اور ڈھاکہ کے لئے سینٹری سامان کا کچھ حصہ مخصوص ہو گیا۔ لیکن ایسی بدمزگی کے ساتھ جس طرح دودھ میں مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لاشعوری طور پر بنگلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔

کامرس منسٹری میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کا ڈپٹی سیکرٹری بنتے ہی میرے دفتر کا چھوٹا سا کمرہ شہر کے بڑے تاجروں اور سیٹھوں کی محبوب گذرگاہ بن گیا۔ سارا دن بھانت

دیکھے ہی کمپلیکٹ بنانے کی فکر میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان سب میں ایک مضبوط
مشترک یہ تھی کہ وہ یکساں لگن سے پیسہ بنانے کی دھن میں سرشار تھے۔ جہانگیر
سوال پر وہ حیرت و استعجاب سے بھنویں چڑھاتے تھے۔ کیونکہ یہ بے وقت
گی ان کے ذوق سماعت پر بڑی گراں گذرتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان
ی طور پر تجارتی وسعت اور معاشی پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔ اس وقت اخلاق
فیوں کی عیاشی میں وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ یہ سب لوگ پاکستان
تی کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ اور مملکت خداداد کی ترقی کا پیمانہ ہر ایک
ا اپنی ذاتی تجوری میں نصب تھا۔ میرے چھوٹے سے دفتر میں فقط ایک کھڑکی
و حرص و ہوا کے اس غبار کو خارج کرنے کے لئے بالکل ناکافی تھی جو ہر آنے والا
ے کمرے کی فضا میں متعدی سمی بخارات کی طرح چھوڑ جاتا تھا۔
دلمیا نگر کا پریم ناتھ ڈالمیا ہو یا مملکت خداداد کا مسلمان تاجر، رشوت
سلام گاہ میں دونوں ایک ہی طرح سے بولی دیتے ہیں۔
ایک روز کامرس سیکرٹری مسٹر میکفارقر نے امپورٹ ایکسپورٹ سیکشن کی ایک
طلب کی۔ بڑی ڈھونڈیا پڑی لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن سے
منٹ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسٹنٹ
رتھوپ دیا کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپرواہی سے گم ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں
یہ بھی لکھا کہ یہ اسسٹنٹ لاابالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم
ن ہے۔ دفتری دستورالعمل کی چنداں پابندی نہیں کرتا۔ اب اس
ع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادیبی کارروائی کر کے
اقعی سزا ضرور دینی چاہئے۔
میں نے ملزم کو اپنے کمرے میں طلب کیا تو ایک خوش پوش، بانکا ترچھا گورا
چھریرے بدن کا جوان لٹک مٹک بے اعتنائی سے آیا اور دونوں
ں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی

گئے ہوا ہو۔ میں نے اس سے فائل کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بے حد
رکھائی سے بے حد مختصر جواب دیا۔ "مل نہیں رہی۔"
"کیوں نہیں مل رہی ؟" میں نے بھی لہجے میں تیزی پیدا کر کے کہا۔
"گم ہو گئی" اسسٹنٹ نے وضاحت کی
"کیسے گم ہو گئی ؟" میں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔
"بس یوں ہی گم ہو گئی۔ بتا کے تو نہیں گئی" اسسٹنٹ نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت ناک پر رگڑ کر کھوں کھوں کیا۔ اور جس طرح لشکت مشکت کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح لشکت مشکت واپس چلا گیا۔

یہ انوکھا جواب سن کر میں کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر ہنسی آنے لگی اگر ہر لاپتہ چیز یہ اعلان کر کے جانے کہ وہ کیسے گم ہو رہی ہے، تو گمشدگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں ؟

میں نے اپنے افسران بالا کو نوٹ لکھ کر بھیج دیا کہ، فائل نہیں مل اور غالباً گم ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ لغزش میرے سیکشن میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ اس لئے انچارج افسر کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر مجھے سیکرٹری میکفارقر، جائنٹ سیکرٹری ایس۔ اے حسن، ڈپٹی سیکرٹری ایم۔ ایوب اور دوسرے ڈپٹی سکریٹری اشرف سعید سے درجہ بہ درجہ تحریری طور پر خاطر خواہ ڈانٹ پڑی اور ہر ایک نے مجھے آئندہ محتاط رہنے کی شدید وارننگ دی۔

وہ دن اور آج کا دن، جمیل الدین عالی سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں۔ کیوں کہ امپورٹ ایکسپورٹ سیکشن کا الھڑ بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا جمیل الدین عالی ہی تھا میں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا قیمتی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالی کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے خوبصورت پہلوؤں اور
باقی صفحہ پر

سے متاثر کرتے ہیں ان میں بھی بصری پہلوؤں کو زیادہ اور بنیادی اہمیت حاصل ہے چونکہ یہ سماعت اور نگاہ دونوں کے لئے کشش رکھتا ہے اس لئے اس کا اثر ریڈیو سے زیادہ ہے اس میں جو کشش ہے وہ نہ رسائل و اخبارات میں ہوتی ہے اور نہ ریڈیو میں۔
مختصر یہ کہ اس بات میں شبہ نہیں کہ دور جدید میں ٹیلی ویژن ایک اہم مفید اور پُر قوت وسیلہ ہے۔

دنیا میں پہلی عوامی ٹیلی ویژن سروس برطانوی براڈکاسٹنگ کارپوریشن (بی۔بی۔سی) نے ۱۹۳۶ء میں شروع کی تھی ۱۹۵۴ء میں بی۔بی۔سی' کی ٹیلی ویژن سروس کی اجارہ داری ختم ہوتی اور برطانوی پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کر کے ایک اور ٹیلی ویژن ادارہ "INDEPENDENT TELEVISION AUTHORITIES" قائم کیا گیا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ایک تجرباتی سروس ۱۵/ستمبر ۱۹۵۹ء کو دہلی میں شروع کی گئی یہ سروس ایک چھوٹے سے عارضی قسم کے اسٹوڈیو سے چلائی جاتی تھی اور اس کے پروگرام ہفتہ میں دو بار ایک' ایک گھنٹہ کے لئے پیش کئے جاتے تھے حالیہ برسوں میں ملک میں ٹیلی ویژن نے بہت فروغ پایا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں فورڈ فاونڈیشن کی مدد سے ٹیلی ویژن سنٹر نے دہلی کے اسکولوں کے لئے تعلیمی پروگرام بھی ٹیلی کاسٹ کرنے شروع کئے۔

حالیہ برسوں میں ملک میں ٹیلی ویژن نے بہت فروغ پایا ہے اور اس کے انتظام میں ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ اُسے آل انڈیا ریڈیو سے الگ کر دیا گیا اور دوردرشن کے نام سے ایک علحدہ اور خود مختار ادارہ کا قیام عمل میں آگیا۔

وسائل نشریات و اطلاعات کے اُمور پر قائم کردہ

[illegible] ملک میں ٹیلی ویژن کی ترقی پر خاص طور پر زور دیا ہے کیٹی نے کہا تھا کہ اس وسیلے کو تعلیم، زرعی و صنعتی پیداوار، حفظانِ صحت، خاندانی منصوبہ بندی، تعلیم بالغان پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت کے شعبوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیئے۔ اٹلی میں کیئے گئے ایک تجربہ کا حوالہ دیتے ہوئے کیٹی نے کہا کہ اس تجربہ سے حتمی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خواندگی اور تعلیم کے فروغ کے لیئے یہ لازمی نہیں ہے کہ پہلے ملک بھر میں اسکول قائم کیئے جائیں اور ٹیچروں کو تربیت دی جائے بلکہ یہ کام ریڈیو اور ٹی وی سے بہت موثر طریقہ سے لیا جا سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن پر خبروں کے علاوہ ایسے پروگرام ٹیلی کاسٹ کیئے جاتے ہیں جو تعلیم و تربیت، قومی یکجہتی کا تصور، ذات پات کی تفریق کے خلاف، حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی کے علاوہ مفید معلومات، دلچسپ اور صحت مندانہ تفریح بہم پہنچاتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ ٹیلی ویژن کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ آواز کے ساتھ متحرک تصاویر کی پیش کشی ہے۔ حالانکہ تصاویر اخبارات میں بھی شائع ہوتی ہیں لیکن اخبار کے بصری پیکر خاموش ہوتے ہیں اور اگر ان کا کوئی سمعی پیغام ہوتا بھی ہے تو وہ گویا پڑھنے والے تک بالواسطہ یعنی اخبار نویسیوں کے وسیلے سے پہنچتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیغام اپنا ابتدائی تاثر اور قوت کسی نہ کسی حد تک کھو دیتا ہے حالانکہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ مسلم ہے چنانچہ ریڈیو فلم اور ٹیلی ویژن کے فروغ کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے ذرائع ابلاغ (پرنٹ میڈیا) غیر موثر ہو گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کا اپنا اثر اپنی جگہ برقرار ہے ظاہر ہے کہ کوئی ریڈیو اور ٹی وی آنے کے بعد اپنے گھر اخبار لینا بند نہیں کر سکتے کیونکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن

ے مختلف واقعات سننے اور دیکھنے کے بعد بھی ایک تشنگی
ی رہتا ہے اور اس تشنگی کو اخبارات دور کرتے ہیں کیونکہ اخبار
ں واقعات کی تفصیل اور تشریح جس طرح کی جاتی ہے اُسی طرح
یڈیو اور ٹی۔وی پر ممکن نہیں۔

مگر ان تمام حقائق کے باوجود ٹی۔وی کی اہمیت اس
لئے زیادہ ہے کہ وہ جب اسی لکھی ہوئی چیز کو اپنے اسکرین پر
یں کرتا ہے تو دیکھنے والوں کے دلوں اور ذہنوں پر زیادہ گہرے
ر دیرپا نقوش چھوڑتا ہے جس کی تازہ مثال ٹی۔وی سیریل تمس
. بھیشم ساہنی کا یہ ناول ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مگر اس پر
سی نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی یہ کبھی موضوع بحث
. مگر جیسے ہی اسے ٹی۔وی کے اسکرین پر پیش کیا گیا تو سارے
میں ایک دھوم مچ گئی اور ہنگامے کھڑے ہو گئے اور اب بھی
ل دہلی میں منعقد ہونے والے حالیہ "بک فیئر" میں عوام کی توجہ
مرکز بن گیا اور اسے خریدنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا
ہا تھا یعنی لوگوں کو اسے خریدنے کے لئے گھنٹوں قطار میں کھڑے
نا پڑا۔ اور وہاں یہ ناول ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوا۔
نے کا مقصد یہ ہے کہ اس ناول کی اتنی مقبولیت کی اہم وجہ محض اس
ٹی۔وی پر پیش ہونا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ
ب یا اخبار کے مقابلے میں عکس اور آواز ہمارے جذبات واحساسات
. زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ فسادات اور تقسیم ہند کے موضوع
اردو اور دوسری زبان کے تخلیق کاروں نے کئی ناول اور افسانے
لے مگر جب انہی موضوعات کو ٹی۔وی پر پیش کیا گیا تو اس کا اثر
یکھنے والے پر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوا۔ ٹی۔وی کی مقبولیت کو
یکھتے ہوئے حکومت ہند کی جانب سے ۸۹-۱۹۸۸ء کے دوران

مرکزی ٹیلی ویژن کی ترقی کے لئے ۱۴ کروڑ روپیہ کا بجٹ رکھا گیا۔ سماجی تبدیلیوں اور قومی شعور کو اُجاگر کرنے میں حکومت ٹی۔ وی سے بہت اہم کام لے رہی ہے اس طرح کی کوشش میں ایک اہم کام لے رہی ہے اس طرح کی کوشش میں ایک اہم بات ہندی کو ملک بھر کی زبان بنانا بھی ہے چنانچہ قومی پروگرام یا قومی سطح پر ہندی پروگرام پیش کرنے کا اہم مقصد یہ ہے کہ ملک بھر کی زبان ہندی ہو جائے اور رفتہ رفتہ لوگ ہندی کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے جاری و ساری کریں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ٹیلی ویژن کے فروغ سے ریڈیو اور فلم دونوں ذرائع کو ایک بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے فلموں کے سلسلہ میں تو یہ ہوا کہ سینما ہالوں میں جانے والوں کی تعداد تیزی سے گرنے لگی کیونکہ ٹیلی ویژن میں یہ سہولت ہے کہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر آدمی فلم سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ریڈیو کے مقابلہ میں ٹی۔ وی یوں زیادہ بہتر ہوا کہ اس میں حصہ لینے والوں کو دیکھنے اور ان کو سننے کا موقع بھی اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی مل جاتا ہے۔

ابتداء میں یہ خطرہ ان دونوں ذرائع کے لئے زیادہ سنگین تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور ان تینوں وسائل کی کارکردگی کے تجربات سے اب یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ہر ایک وسیلے کے لئے اس کا علحدہ علحدہ میدان اور دائرہ کار مخصوص ہے یہ تینوں وسیلے اپنے اپنے شعبوں میں ایک دوسرے کے کام میں دخل انداز ہوئے بغیر پھل پھول سکتے ہیں۔

آخر میں، میں اپنے مضمون کا اختتام ان جملوں پر کروں گی کہ دنیا بھر میں جو بھی ذرائع ابلاغ استعمال کئے جا رہے ہیں اُن سب کا حقیقی مقصد انسان کی فلاح و بہبود کے ساتھ اُس کی ثقافتی تعلیمی اور سماجی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا ہے۔

حضرت مولانا ہادی نقشبندی*

نواب بہادر یار جنگ

چند یادیں اور چند باتیں

۱۹۴۰ء کے اواخر ماہ نومبر میں معتمد مجلس جاگیرداران سلطنت آصفیہ توسیع مجلس کے سلئے اورنگ آباد تشریف لائے اور نواب سید علی خاں مرحوم کی دیوڑھی بڑ والے نواب" میں جلسہ جاگیردارا صوبہ اورنگ آباد رکھا جس میں حضرت والد ماجد مولانا سید شاہ امام الاسلام حسنی الحسینی قادری نقشبندی المجددی علیہ الرحمۃ بھی مدعو تھے چنانچہ راقم الحروف بھی حضرت ممدوح کی معیت میں بزرگان خلدآباد و دولت آباد کی زیارت سے فارغ ہوکر "بڑ والے نواب کی دیوڑھی" پہونچا۔ جلسے کے دسیع برآمدہ میں ہم سب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بلند قامت سرخ و سپید رنگ گٹھا ہوا توانا جسم کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، وجیہہ و جاذب نظر شخصیت، حیدرآبادی تنگ موہری کا دوہرا پاجامہ، ولایتی پمپ شوز، اکرسٹی ترکی ٹوپی، شیروانی میں ملبوس مسکراتی ہوئی داخل ہوئی: ہم سب تعظیماً کھڑے ہوگئے " یہ تھے قائد ملت، لسان الامت نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور۔

اس وقت میرا کوئی چودہ ۱۴ پندرہ ۱۵ کا سن ہوگا اس پہلی جلوہ نمائی اور نواب مرحوم کی تقریر کے یہ الفاظ آج بھی ساٹھ سال گزرنے کے بعد میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"...... ریاست حیدرآباد کا یہ اہم طبقہ جاگیرداران جو سلطنت کے ایک ثلث حصہ پر قابض اس کے ایک ثلث محاصل آمدنی کا سرمایہ دار، اسمی قدر رعایا پر حکمران جن کے دم سے ہزارہا گھر بقعۂ نور، دوکانیں اور ہوٹلیں آباد لیکن اسکی عیش کوشی، تن آسانی اور ناعاقبت اندیشی سے اپنی حیثیت سے موافق کسی بینک میں سرمایہ جمع رکھنے کی بجائے اس سے زیادہ مقروض ...... اولاد

---

* سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ عنایت اللّٰہی، بالاپور (ودربھ)

اولاد تعلیم و تربیت اور زندگی کے جدید تقاضوں سے محروم، عیش و عشرت میں معروف جبکہ [illegible]
شغل کی تحقیق و تحقیر کے لئے کافی، ضروریات زمانہ سے بے خبر مست و کاہل ثابت کرنے کے لئے
کافی ہو۔۔۔۔۔ میں آپ میں سعی حیات کی وہ تڑپ نہیں دیکھتا جو ایک زندہ طبقہ کے لئے
ضروری ہے، اپنی اولاد کی آئندہ تعلیم و تربیت اور جاگیرات کی تنظیم و ترقی پر کچھ [illegible]۔۔۔

یہ تھے نصف صدی قبل ایک روشن خیال بالیدہ نظر جاگیردار کے مشاہدات و احساسات۔
ابھی میرا یہ تاثر ختم نہ ہوا تھا کہ اوائل جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں مجھے 'جاگیردار کالج' بیگم پیٹھ میں داخل کروا دیا گیا جو ایک مغربی طرز کی کیمبرج سے ملحق اقامتی درسگاہ تھی جس کے پرنسپل مسٹر ڈیونڈ اور نگران ایک یوروپین خاتون ہیں انگریزی طرز معاشرت اور طور طریق سکھلاتیں، نیز بیٹھنے کے آداب بتلاتیں، ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ پرنسپل صاحب حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ کو لئے ہوئے میرے کمرہ پہونچے، جو اس ماحول کو دیکھ کر ناخوش، انتہائی برافروختہ تھے۔ پرنسپل صاحب سے دریافت کیا کہ "بچوں کے نماز پڑھنے کی جگہ کہاں ہے"؟ پرنسپل صاحب نے جواباً کہا "مسجد کے ساتھ مندر بھی بنانا ہوگا" فرمایا کیا جرم ہے، مذہبی تعلیم کے بغیر اخلاق و انسانیت نہیں آتی، ہمارے بچوں کو سادہ زندگی کے ساتھ زرعی تعلیم بھی دی جانی چاہیئے تاکہ وہ اپنی جاگیرات جاکر رعایا کے ساتھ مل جل کر کام کر سکیں، میں اس ماحول میں اپنے بچے کو تعلق رکھنا نہیں چاہتا اور بطور احتجاج آپ سے اسکو واپس لے جانے کی اجازت چاہتا ہوں"۔

اب ہماری گاڑی بیگم پیٹھ کے جاگیردار کالج سے، بیگم بازار کی سمت رواں دواں تھی جو دیوڑھی نواب بہادر یار جنگ مرحوم "مہدوی منزل" جو محدثین "بیت الامت" کہلائی پہونچی۔ قائد ملت مرحوم اطلاع ملتے ہی والد مرحوم کو لینے، گاڑی تک آئے اور اوپر کی منزل کے لئے جاگیردار کالج کے حالات کا علم ہوتے ہی کبیدہ خاطر ہوئے، اسی وقت مہاراجہ بہادر صدر اعظم کو فون کر کے والد مرحوم کے ساتھ ملنے کا وقت لیا اور ایک عرضداشت مرتب کی کہ "ہمارے بچوں کی تعلیم میں اخلاقیات اور زرعی تعلیم کو اولیت دی جائے نیز جاگیردار کالج کا الحاق کیمبرج کی بجائے جامعہ عثمانیہ سے ہو، جہاں بچوں کی تربیت مشرقی سادہ ہندوستانی انداز میں اس طرح کی جائے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی رعایا کے لئے مفید ثابت ہوں، چنانچہ دوسرے روز حسب پروگرام صدر اعظم بہادر سے ملاقات ہوئی اور مسئلہ متعلقہ پر کافی دیر گفتگو رہی اور ممدوح نے حسب منشاء

[illegible]

یل [illegible] کیا ۔

قائد ملت مرحوم کی یادگار واقعات کے ساتھ، حیدرآباد مرحوم کے گزرے ہوئے دور کی یاد نہ ہوگی۔ اب نہ جاگیرات رہیں اور نہ جاگیردار، جاگیردار کالج بھی اب پبلک اسکول ہو گیا ہے۔ اس سے میں بطور احتجاج علی گڑھ بھجوایا گیا تھا، جہاں کے یونیورسٹی اسکول کے جالا ہوسٹل "منٹو سرکل" سے سر سید ہال کے "۱۲ ایس ایم ایسٹ" تک یہ دلنشیں بارہ سال میری زندگی کا خوشگوار سرمایہ ہیں۔ انقلاب حیدرآباد کے بعد لسانی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور دینی خدمات سے مسلم یونیورسٹی کورٹ سینیٹ کی ممبری سنہ ۱۹۸۶ء تک کی داستان بڑی دلسوز و فکر انگیز ہے۔

قائد ملت مرحوم سے علی گڑھ اور دوسرے مقامات پر ملنے جلنے اور ساتھ رہنے کے بار بار موقع ملے، مرحوم کی غیرت دینی و حمیت اسلامی کے ساتھ جوش ایمانی کا اس وقت اندازہ ہوا جب سنہ و تاریخ تو یاد نہیں البتہ موسم سرما کے ماہ صیام میں نواب معین الدولہ مرحوم کی کرکٹ ٹیم، نواب ظہیر یار جنگ مرحوم کی سربراہی میں دورہ بہار میں آکولہ آ رہی تھی اور کلکٹر آکولہ بڑی جوش و خروش سے ان کے اہتمام میں مصروف تھے جس کے ایک لنچ کے لئے والد مرحوم سے ایک خاصی بھاری رقم لے گئے، جب والد مرحوم کو اس کا علم ہوا کہ یہ زمانہ صیام ہوگا تو مرحوم کو شدید روحانی اذیت و ذہنی کوفت ہوئی اور مجھے فوراً طلب فرما کر حکم دیا کہ "[illegible] بہادر یار جنگ کو لکھو کہ وہ کسی نہ کسی طرح ماہ صیام میں ٹیم کا دورہ رکوا دیں" چنانچہ اسی وقت میں نے نواب مرحوم کو عریضہ لکھا جسے بالاپور سے ڈاک نکل جانے کے باعث آکولہ جا کر سپرد آر ایم ایس کیا۔

قائد ملت مرحوم کو میرا یہ عریضہ بروقت مل گیا، جس کے ملتے ہی مجھے لکھا "اللہ تعالیٰ ان والدین کو عقل سلیم اور حمیت دینی عطا فرمائے کہ وہ شعائر اسلامی کا احترام اور اس پر عمل پیرا ہیں۔ میری طرف سے آپکی سعی مشکور اور انہیں ہدایت ہو کہ وہ ماہ صیام میں معین الدولہ کرکٹ ٹیم کا دورہ ملتوی کروادیں۔ میں نواب معین الدولہ سے اسی وقت ملنے جا رہا ہوں" دوسرے روز قائد ملت کا ٹیلیگرام پہونچا۔ "ماہ صیام میں معین الدولہ کرکٹ ٹیم کا دورہ بہار ملتوی ہو گیا ہے"

سنہ ۱۹۳۸ء میں ۲۶ دسمبر کو پٹنہ (بہار) میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں انتہائی تزک و احتشام سے شروع ہے۔ ہندوستان کے چپے چپے سے اکابرین، مندوبین اور شائقین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہیں، صدر استقبالیہ مسٹر سید [illegible]

(جو بعد میں وزیر قانون حکومت حیدرآباد ہو گئے) نے نہ صرف قائد ملت مرحوم (صدر آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ) کو خصوصی طور پر مدعو کیا تھا بلکہ مسائل حیدرآباد سے متعلق اس اجلاس میں ایک خصوصی نشست کا بھی اہتمام کیا تھا جن میں اکابر زعمائے ہند نے ' حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس تام نہاد ہندو لیبریشن یونین اور آریہ سماج ستیہ گرہ کی پول کھولی جو چند سازشی افراد تک محدود تھی ' اپنی تفصیلی تقاریر میں ان تمام حقائق کو طشت از بام کیا ۔

قائد ملت مرحوم کو مبدء فیاض نے نگاہ دور بین ' غیر معمولی فکر و ادراک اور ذہن رسا کے ساتھ بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا ' باوجود شدید اصرار ' اس نشست خصوصی میں بوجہ گفتگو مصالحت (جو نرسنگھ راؤ صاحب ایڈیٹر رعیت ' حیدرآباد کے ساتھ ہو رہی تھی) مرحوم نے بیرونی حیدرآباد سے کسی قسم کی اعانت و جبریہ مداخلت کو پسند نہ کرتے ہوئے ' تقریر نہ کی لیکن بعد میں جب حیدرآباد سے تعلق خاطر کے باعث عمومی اصرار بڑھا تو مرحوم نے صرف آل انڈیا مسلم لیگ کاؤنسل کے اراکین کو ایک عصرانہ پر مدعو کرتے ہوئے مجھے (ہادی نقشبندی غفلہ) سید محمد مسعود مرحوم (پوسٹ ماسٹر جنرل بہار) جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا فون کر کے " بیت العزیز " طلب کر کے فرمایا " یہ عصرانہ محدود و خصوصی ہے ۔ سوائے اراکین مسلم لیگ کاؤنسل جن سے آپ واقف ہیں کوئی غیر شریک نہ ہو ' یا ینوجہ میں نے آپ کو زحمت اہتمام دی ہے " ' بحمد اللہ حسب الحکم نواب مرحوم یہ عصرانہ لسان الامت کی تقریر کے ساتھ انتہائی کامیاب رہا ۔

مارچ ۱۹۴۱ء کی ۲۲ تاریخ کو آکولہ میں صوبائی مسلم لیگ کا عظیم الشان اجلاس قائد ملت لسان الامت نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمۃ کی صدارت میں ہو رہا ہے ۔ صوبائی اجتماع کے باوجود قائد ملت مرحوم کی صدارت کے باعث اقطائے ہند کے تقریباً تمام زعما اکابر شریک ہیں اجلاس کی نوعیت اور اہمیت کے پیش نظر مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا

" تجویز لاہور قیام پاکستان کا ایک برادرانہ تقسیم ہے " عام مسلمانان ہند تعلیمات اسلامی اور اپنے روایتی اتفاق و اتحاد کی روشنی میں ' برادران وطن سے محبت و مودت کے ساتھ اسکی تائید و تعاون کے خواہشمند ہیں "

قائد ملت مرحوم ۲۴ مارچ کی شام میں ' ختم اجلاس سے قبل ' تحریک مجددی کے بانی امیر دکن شیخ الاسلام حضرت سید شاہ عنایت اللہ حسنی الحسینی قادری نقشبندی المجددی قدس سرہ العزیز

(یعنی خانقاہ نقشبندی عنایت اللّٰہی بالاپور، بہار) کے روحانی بزرگ حاضری کے لئے مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم، ایم پی محمد حبیب الحق ایڈوکیٹ مرحوم، ایم ایل اے خان بہادر مولانا رحمٰن بیگ مرحوم اور سیٹھ اکبر عبدالعلی مرحوم کو لئے ہوئے بالاپور پہونچے، بعد نماز عشاء چائے کے بعد خانقاہ کی بین الاقوامی اہمیت کے حامل کتب خانہ کی زیارت اور حضرت مولانا سید شاہ امام الاسلام نقشبندی نوراللہ مرقدہ، سجادہ نشین خانقاہ کے ساتھ شرکت عشائیہ کے بعد مراجعت فرما ہوئے۔

سنہ ۱۹...ء کے معاہدہ بالاپور میں مغفرت مآب آصف جاہ اول کو حاضری خانقاہ و کامرانی پر پرچم آزادی آصفیہ عطا ہوا چنانچہ حیدرآباد میں "شاہ عنایت گنج" انہی کی یادگار حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمتہ کے نام سے موسوم ہے جو محلہ گاوی آصفیہ میں "چراغ نقشبندیہ" روشن رکھکر چالیس حافظ آصف سابع تک ہر دو روضتیں خانقاہ کے بزرگوں کو ایصال ثواب کرتے رہے، حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے تینوں عبقری صاحبزادگان "فتاوی عالمگیری" کے ممتاز مرتبین میں ہیں، غفران مآب آصف جاہ ثانی، سالار جنگ اول اور شہزادی درشہوار طال العمرہا سنہ ۱۹...ء میں اسی خانقاہ نقشبندیہ عنایت اللّٰہی بالاپور میں بغرض حصول خیر و برکت اور پیش خراج عقیدت و نذور حاضر ہوئیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء کا ۱۳ فروری کو مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا باون سالہ ۵۲ اجلاس نواب ظہیر یار جنگ مرحوم کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ نواب بہادر یار جنگ بھی شریک ہیں، ختم اجلاس پر راقم الحروف مرحوم کو چھوڑنے "حبیب منزل" میرس روڈ گیا، وہاں پہنچنے پر بدوران گفتگو فرمایا" میری ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملوں، اسکا تذکرہ قائداعظم محمد علی جناح سے آیا تو فرمایا" ان سے نہ ملو تو اچھا ہے"۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں ایک ہی وقت بمبئی میں مجلس عاملہ کانگریس و لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے اس موقع پر قائد ملت مرحوم حضرت مولانا آزاد سے ملنے ان کی قیام گاہ پہونچے، کافی دیر گفتگو رہی جس سے قائد ملت مرحوم، مولانا آزاد کے تبحر علمی، سیاسی بصیرت اور طلاقت بیانی سے بے انتہا متاثر ہوئے اور محسوس کیا کہ اسی لئے قائداعظم نے ان سے ملنے منع فرمایا تھا۔ قائد ملت

[illegible]

یہ المیہ حقیقت ان کے عظمت کردار کا مظہر ہے۔

۱۴ رجنوری ۱۹۶۴ء کی عجیب غمزدہ صبح تھی، آکولہ سے بالاپور آتے ہوئے خبر یکایک دی گئی کہ اس المناک اطلاع پر دل غم و اندوہ میں ڈوب گیا کہ قائد ملت، لسان الامت نواب بہادر خاں جیسا بے باک، جانباز قوم، دردمند ملت، پیکر حق و صداقت، نگہبان دکن اس دنیائے فانی سے چل کر اپنے مالک حقیقی کے حضور پہونچ گیا ہے۔ اِنا للّٰہ وانا الیہ راجعون

بالاپور میں تمام مدارس و دفاتر بلدیہ بند کروا دیئے گئے، بعد نماز مغرب خانقاہ نقشبندیہ عنایت الٰہی میں بہاؤ صاحب سومنی صدر بلدیہ کی صدارت میں جلسہ تعزیت اور بعد نماز فجر مسجد کلاں خانقاہ میں قرآن خوانی ہوئی۔ قائد ملت کی رحلت پر حیدرآباد کی دانشمندانہ سیاست کا ایک اہم باب ختم ہو گیا۔

••

سلسلہ ۳۶

ملی نغموں نے مجھے شادکام کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے مالا مال کیا ہے اور جس کی نازک مزاجی، زود رنجی، تلملاہٹ، جھنجھلاہٹ اور رکھ رکھاؤ نے میرے دل میں کبھی کوئی آزردگی پیدا نہیں کی۔

سلسلہ ۵۰

غلبہ ہوا۔ مصنوعی پیس میکر سے بھی کام نہ چلا اور وہ ہم سے میلوں دور آسمانوں میں چلے گئے۔ ادبی دنیا میں خصوصاً ترقی پسند ادبی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ ادیب غمزدہ ہو گئے۔ پرستار یتیم ہو گئے افسانوی ادبی دنیا میں۔ تعزیتی پیامات، تار ہزاروں کی تعداد ہندستان بھر، بیرونی ممالک سے وصول ہوئے پسماندگان کو۔ حکومت پنجاب نے پندرہ ہزار روپے رقم کی منظوری دی غرض ایک محب وطن، ایک عظیم انسان، ایک ادیب، ممتاز فن کار، ناولسٹ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ سو

ایک جھونکے میں بس ادھر سے ادھر
چار دن کی بہار ہے دنیا " (امیر مینائی)

جگن ناتھ آزاد کو فخرِ غالب ایوارڈ

غالب میموریل سوسائٹی نئی دہلی کی جانب سے سوسائٹی کے بیسویں سالانہ اجلاس کے موقع پر غالب اکیڈمی میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو شری آریل بھاٹیہ ایم پی نے ۰ افتخار غالب ایوارڈ برائے قومی یکجہتی" عطا کیا۔ ڈاکٹر حیات اللہ انصاری ۰ ایم ۰ پی نے صدارت فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب ذہین نقوی سیکریٹری غالب اکیڈمی نے انجام دیئے۔

غالب اکیڈمی کی جانب سے پروفیسر آزاد کو اکیڈمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم سیکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنی تقریر میں جگن ناتھ آزاد کی علمی و ادبی خدمات کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضامین، تقریروں اور توسیعی لیکچروں کے ذریعے سے اس وقت علامہ اقبال کو ہندوستان میں صحیح مقام دلانے کا کام کا آغاز کیا جب ہندوستان میں اقبال کا نام لینا جرم تھا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آزادی کے فوراً بعد صرف اقبال ہی نہیں بلکہ اردو کا نام لینا بھی جرم تھا اور اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد کے کام اور ان کی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جوگندر پال نے اپنی تقریر آزاد کے تخلیقی کام بالخصوص شاعری تک محدود

رکھی جب کہ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی اور ڈاکٹر قمر رئیس نے اقبال پر آزاد کے تحقیقی اور تنقیدی کام پر روشنی ڈالی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ جہاں تک قومی یکجہتی کا تعلق ہے آزاد نے اپنی نظم و نثر کے ذریعے صرف قومی یکجہتی ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ اس سے ایک قدم آگے گئے ہیں۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک دوستی کی فضا پیدا کرنا ان کا مشن رہا ہے اور مقام مسرت ہے کہ دونوں ملکوں میں ان کے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

صدرِ جلسہ ڈاکٹر حیات اللہ انصاری نے بحیثیت مجموعی آزاد کے فکر و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ غالب سوسائٹی کا انتو غالب ایوارڈ پروفیسر آزاد کو بہت پہلے ملنا چاہیئے تھا۔

اس موقع پر دہلی کی متعدد علمی اور ادبی جماعتوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے اداروں کی جانب سے جگن ناتھ آزاد کی گل پوشی کی جن میں انجمن ترقی اردو (ہند)، ترقی اردو بیورو، دہلی اردو اکیڈمی، غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب میموریل سوسائٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین، سوسائٹی، ذوق ریسرچ سوسائٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، بیسویں صدی "پبلیکیشنز" اور ماہنامہ "فلمی ستارے" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جناب محبوب ظفر نے پاکستانی سفارت خانے (نئی دہلی) میں کام کرنے والے اردو اہلِ قلم حضرات کی جانب سے جگن ناتھ آزاد کو گلدستہ پیش کیا۔

جلسے کے اختتام پر ملک کے مشہور قوال اسلم صابری اور ان کی پارٹی نے جگن ناتھ آزاد کی غزلیں سازوں پر پیش کر کے سماں باندھ دیا۔

ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ

ذکر کرشن چندر

ناموراضانہ نگار، طنز نگار کرشن چندر اردو ادب کے محسن تھے، ان کا لکھنے کا ڈھنگ ہی لگ تھا۔ انسان کے احساسات کو سمجھ پاتے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو وہ دیکھ چکے تھے۔ غیوں کا تجربہ تھا انہیں۔ پریم چند کے کارناموں کا انہوں نے تفصیلی جائزہ لیا۔ آزادی کی جدوجہد وہی انقلاب، مزدور کی بیداری کا اثر ان کے افسانوں میں ہے۔ تاریک ترین لمحات میں بھی مید و یقین کی کرنوں کا سہارا مشہور نقاد و ادیب کرشن چندر نے لیا ہے۔ حقیقت نگاری بھی ان کے سانوں میں ہے۔ انسانیت پر انہیں پورا بھروسہ تھا۔ ماضی کی عظمت ہے تو موجودہ دور کی ہمواریت کا ذکر ہے۔ خوش آئند مستقبل کا تصور بھی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کے موثر بزار میں شہری زندگی، دیہاتی زندگی، غریبوں کے تکالیف، ناامیدوں کے آغوش میں سسکتی نا ٹمن زندگی شامل ہیں۔ اونچا طبقہ، متوسط طبقہ، نچلا طبقہ کرشن چندر کے کرداروں کا خزانہ یں۔ ان کے افسانوں میں نامور حسب ذیل ہیں۔

۱) کالو بھنگی ۲۔ ان داتا ۳۔ امرتسر آزادی سے پہلے، آزادی کے بعد
۴۔ پشاور ایکسپریس ۵۔ گل فروش ۶۔ بت جاگتا ہے۔
۷۔ یوکلپٹس کی ڈالی ۸۔ ہم وحشی ہیں ۹۔ زندگی کے موڑ پر۔

خوبصورت مصوری کی مثالیں "رپورتاژ" و "صبح ہوتی ہے" ہیں۔ ملخیوں کی نمایاں مثال "گلفروش" ہے۔ ذہنی ارتقاء کا پتہ دینے والے کارناموں میں "ٹوٹے ہوئے تارے و نظارے" ان کی ایک مثال ہے۔ "دروازے کھول دو" ان کا انمول ادبی تحفہ ہے۔ "ایک گدھے کی سرگزشت" و "ایک گدھا نیفا میں" طنز و مزاح کے تحفے ہیں اردو ادب کے احاطہ میں کرشن چندر کے

2-2-1144/1/B، پوسٹ آفس لین، نیو نلہ کنٹہ، حیدرآباد - 44 - اے پی

کرشن چندر اعلیٰ حلقہ ارباب ذوق ادب سے وابستہ رہے۔ مارکسی ادب کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ ممتاز ادیبوں مثلاً خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری سے ملاقات اکثر رہا کرتی۔ ان کی گفتگو خود ایک سوانحی ادب ہے۔ سماجی اصلاح، فلاح و بہبود، سماجی تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے لکھی ہوئی ناولوں میں "شکست" "جب کھیت جاگے" و "باون پتے" ہیں۔ حالیہ کہانیوں میں "ایرانی پلاؤ" و "عورتوں کے عطر" ہیں۔ ان کی تصانیف میں مشاہدہ کی گہرائی ہے تو احساس کی شدت ہے۔ اسلوب کا نشیب و فراز ہے تو مصوری کی بے پناہ صلاحیت ہے۔

کرشن چندر افسانہ کی دنیا کا راجہ تھا۔ عہد ساز مصنف بھی تھا۔ "فٹ پاتھ کے فرشتے" بیسوی صدی رسالہ میں بطور افسانہ شائع ہوا تھا۔ ایک لفظ میں ہم کرشن چندر کو بیسوی صدی داستانہ کے احاطہ میں کہہ سکتے ہیں۔ جب ان کی موت کی خبر پھیلی تو ایک جریدہ میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

> "عالم بالا میں عبد الماجد، رشید کے ساتھ جی کھول کر افسانے سنا رہے ہونگے ادھر ہم ستاروں کو غمزدہ کر دیئے۔ شائقین آبدیدہ ہو گئے ہیں۔ کلاسیکی فنکار بھی تھے۔ ہندی ادب میں غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ اردو کے حقوق کے لئے صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ مصلحت کو معقولیت سے دور رکھ ان کی تخلیقات ساٹھ (۶۰) زبانوں میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ غریبوں اور مزدوروں کے وہ سچے دوست اور ہمدرد تھے۔ عام انسانوں کی زندگی کی سچی عکاسی کی ہے کہ وہ لاکھوں انسانوں کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے۔ تحریر میں زندگی کا مطالعہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کا اہم ترین ستون تھے۔ اردو کے سب سے بڑے وکیل، حامی، علمبردار، بے لچک اور بے خوف طرفدار اور پاسبان تھے۔"

کرشن چندر نے فکشن کو معیار عطا کیا۔ ان کے افسانے ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی ادب کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے فکر و فن کا لہجہ ہی الگ ہے۔ عالمی امن، بھائی چارگی، رواداری کے خواہاں تھے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انہیں نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ حکومت ہند نے سنہ ۱۹۶۹ء میں انہیں پدم بھوشن عطا کیا۔

۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ناگہانی موت نے ان کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ قلب پریشاں

بقیہ ۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں

تسنیم فاطمہ عبراس

ذرائع ابلاغ کی اہمیت

ابتدائے آفرینش سے ہی تجسس اور تلاش کا مادہ انسانی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے معروف طور پر بنی نوع انسان کی بنیادی ضروریات تین متصور ہوتی ہیں یعنی پیٹ بھرنے کے لئے روٹی، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا اور سر چھپانے کے لئے مکان۔ لیکن ان تین ضروریات کے علاوہ ایک چوتھی حاجت بھی ہے جس کی تکمیل اتنی ہی اہم اور ضروری ہے جتنی اول الذکر ——— اور وہ ہے آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنا ——— حجری دور سے لے کر آج کے عصری دور تک انسان کا یہ جذبہ کبھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ——— اس فطری داعیے کی تکمیل یعنی اپنے ہم جنسوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور اپنے خیالات احساسات و تجربات سے دوسرے کو واقف کرانے کی غرض سے انسان نے ابتدائی عہد سے ہی مختلف ذرائع استعمال کرنا شروع کئے۔ علوم و فنون میں جیسے اضافہ ہوتا گیا اور تہذیب انسانی جس قدر نشوونما پاتی گئی اُسی کی مناسبت سے اُن ذرائع کی نوعیت بھی بدلتی اور ترقی کرتی رہی۔

ابتدائی دور میں تجارتی قافلوں کے سفر نے جذبۂ تجسس کو مہمیز کیا اور جب زمان و مکاں کی قیود ٹوٹنے لگیں تو جدید اخبار نویسی نے جنم لیا اور اسی کو لے کر تین جدید "میوزیس" "MUSES" ریڈیو فلم اور ٹیلی ویژن

پیدا ہوئے جو چشم زدن میں دنیا کے ایک کونے کی خبریں دوسرے کونے تک پہنچا دیتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا عمل واقعات، پالیسوں اور پروگراموں کے پس منظر میں اور قومی ضروریات اور مقاصد کے مطابق ظہور میں آتا ہے یہ ایک انتہائی زندہ اور فعال موضوع ہے۔ مثلاً اخبارات نہ صرف معلومات کی فراہمی اور تربیت دینے کا کام کرتے ہیں بلکہ یہ عوامی امور کے نگران اور عوام کے حقوق کے امین بھی ہوتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما ایسے برقیاتی وسائل ابلاغ ہیں جو عوام کے ذہنوں پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ لوگ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جیسے وہ خود قومی وملکی معاملات میں عملاً شریک ہوں۔

جدید ذرائع ابلاغ کا انحصار جدید ٹکنالوجی کی ایجادات پر ہے جس سے انسان کی زندگی میں انقلاب آگیا ہے یہ ایجادات نہ ہوتیں تو عوامی ترسیل موجودہ اہمیت کی حامل نہ ہوتی اور یہ خیالات کی زبانی ترسیل اور فاصلوں کو جسمانی محنت سے طے کرنے کی کوششوں تک محدود رہتی ڈھائی سو سال کی سائنسی ترقی کے دور نے انسان کو نہ صرف چاند تک پہنچایا ہے بلکہ اب وہ نظام شمسی کے بعید ترین سیاروں تک پہنچنے کی بات سوچ رہا ہے۔ ٹکنالوجی کی ترقی نے ذرائع ابلاغ کو ایک اعلیٰ سائنسی بنیاد بخشی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے پس منظر اور پیش منظر پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ ترسیل وابلاغ کا مفہوم کیا ہے۔

اصطلاحی معنوں میں خیالات، رجحانات اور اطلاعات واعلانات کو ایک فرد سے دوسرے فرد تک پہنچانے کے عمل کو ترسیل کہتے ہیں یعنی کسی پیغام کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا نام ترسیل ہے اور اس پیغام کو کچھ اس طرح سے پہنچایا جائے کہ ہر سننے والے کی سمجھ میں آسانی سے آجائے

سے ابلاغ کہتے ہیں اور ان وسائل کو جن کے ذریعہ آبادی کے وسیع حصہ تک کسی پیغام کو موثر انداز میں پہنچایا جائے انہیں ذرائع ابلاغ یا Mass media کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ ترسیل کے ذرائع کی اہمیت ابتدا ہی سے محسوس کی گئی تھی یہ اور بات ہے کہ ابتدا میں اس کی حیثیت محدود رہی، وسائل کی کمی اس کا اہم سبب تھی پتھر کے دور میں Stone Age کا انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے اشاروں، مختلف جسمانی حرکات اور آوازوں کا سہارا لیتا تھا

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم دنیا میں خبروں کی فراہمی اور اشاعت کے ساتھ ایک دلچسپ داستان وابستہ ہے" ہزارہا برس پہلے کا ذکر ہے عہد فراعنہ کے مصریوں نے حالت حاضرہ کو عوام تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی برٹش میوزیم لائبریری میں "پے پی رس" مسودہ رسم الخط میں یہ عبارت ملتی ہے" بادشاہ تقرر رے کے رے" حکم دیتا ہے کہ ان دستاویزات کی ایک نقل پتھر پر کندہ کر کے 'کوپ توس' کے معبد کے دروازے کے باہر نصب کر دی جائے تاکہ سب لوگ اسے پڑھ سکیں۔

خبروں کی اشاعت کے لئے معبد کی دیواروں کو اس لئے ذریعہ بنایا گیا تھا کہ وہاں نہ صرف مقامی باشندے باقاعدگی سے حاضر ہوتے تھے بلکہ اہم عبادات پر دور دراز کے لوگ بھی پہنچتے تھے۔

فراعنہ کے علاوہ مصر کے ٹالمی اور رومی حکمرانوں نے بھی خبروں کی اشاعت پر زور دیا تھا اور اب حالیہ کھدائیوں میں ایسے یونانی کتبے دریافت ہوئے جن میں حکومت کے اعلانات و قوانین درج ہیں۔

قدیم ہندوستان میں خبروں کی اشاعت کا آغاز جاسوسی اور مخبری سے ہوا جس کی تفصیل منوسمرتی اور کوتلیہ کے ارتھ شاستر سے ملتی ہے۔ اُس دور میں اطلاعات، اعلانات، مذہبی و ملکی قوانین کی اشاعت کے لئے تانبے کی تختیوں، لوہے کے میناروں کے علاوہ پتھروں پر

حاصل کرنے کا رواج ملتا ہے اشوک اعظم نے بدھ مت کے اصولوں کو پھیلانے کے لئے ملک میں مختلف مقامات پر لاٹھیں بنوائی تھیں اس کے علاوہ اس نے نامہ نگار بھی مقرر کئے ان نامہ نگاروں کو "پلسانی" کہا جاتا ہے یہ پلسانی ایک خفیہ رسم الخط میں خبریں لکھتے اور خاص طور پر تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعہ انہیں منزل مقصود تک پہنچاتے تھے.

جنگلوں میں رہنے والے قبائل جب کوئی اہم پیغام اپنے دوسرے ساتھیوں تک پہنچانا چاہتے تھے تو وہ اس کے لئے ڈھول یا اسی طرح کے کوئی اور چیز کا استعمال کرتے اور آواز کے مختلف اُتار چڑھاؤ یا آہنگ کے ذریعہ وہ اپنا پیغام جنگل کے کونے کونے تک پہنچا دیتے تھے اور سننے والے ان آوازوں کے زیر و بم میں چھپے ہوئے پیغام کو سمجھ لیا کرتے تھے اس طرح کی پیغام رسانی کسی ناگہانی آفت یا مصیبت، خوشی کے موقعہ، جان کی حفاظت یا دوسرے قبیلے کے حملے کے اندیشے کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔

شاہی اور جاگیرداری دور میں اہم خبروں، فیصلوں، اعلانات اور احکامات کو فوری عوام تک پہنچانے کے لئے منادی کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا یعنی عوام کے رہائشی علاقوں میں کسی اہم مقام چوک، بازار یا چوپال میں نقارہ یا اسی طرح کی کوئی چیز بجائی جاتی تھی تاکہ لوگ اس آواز کی طرف متوجہ ہوں اور وہاں جمع ہو جائیں پھر منادی کرنے والا شخص وہ مخصوص اعلان با آوازِ بلند پڑھ کر سناتا تھا اور یہ پیغام وقت واحد میں آبادی کے ایک بڑے حصّہ تک فوری پہنچ جاتا تھا۔ گویا منادی کرنے والا ایک ذریعہ تھا جو بادشاہ اور عوام کے درمیان رابطہ کا کام انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اسی طرح کے اعلانات مساجد اور دوسرے مذہبی مقامات میں بھی کروائے جاتے.

...یہ طریقہ ہندوستان میں انگریزوں کے عہد تک بھی جاری رہا اس
...بنیادی وجہ یہ تھی کہ ملک کا ایک بڑا طبقہ ناخواندہ تھا اور دور
...دور میں اخبار بینی کا ذوق بھی بہت کم تھا اس لئے عوام تک اطلاعات
پہنچانے کے آواز اور زبان کا وسیلہ استعمال کیا جاتا تھا یہ مختلف
...ع اپنے اپنے دور کی ضروریات کے لحاظ سے کافی تھے۔

مغرب میں صنعتی انقلاب کے بعد ذرائع ابلاغ کی اہمیت تسلیم
... اور اس کو وسعت بھی دی گئی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے
... سے اخبارات کا اجراء عمل میں آیا۔ ہندوستان میں کیونکہ جاگیر
...نہ نظام اٹھارویں صدی کے ابتدائی دور میں دودھوں تک مضبوط
...س لئے یہاں صحافت کا وہ تصور نہیں ہوسکتا تھا جو پیرس یا لندن
...ہو سکتا تھا لیکن جب انگریزوں کے قدم یہاں مضبوطی سے جمنے
... ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے
...سے علاقوں میں اقتدار کے استحکام کے لئے جو اقدامات کررہی ہے
زیادہ سے زیادہ پروپگنڈہ کرے اور عوام کا ردِ عمل بھی معلوم
کسی بھی حکومت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں کی عوام حکومت
...نوا ہوں اگر عوام کی رائے حکومت کے خلاف ہو تو پھر ملک
...قی اور استحکام میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اسی لئے مملکت کے
...ہاں کی یہ کوشش رہی کہ عوام کو اپنا ہم نوا بنائیں اور یہ کوشش جمہوری
...یں بے حد ضروری ہے جمہوریت نام ہے عوام کی حکومت کا جو عوام
...تخبہ نمائندوں کے ذریعہ عوام پر کی جاتی ہے کسی ملک کے سربراہان
...ی نمائندے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ فرداً فرداً ہر شخص سے ملیں
...سے حکومت کی پالیسیوں اور فیصلوں سے واقف کروائیں چنانچہ ایسے
... تلاش یا ایجاد کئے گئے جن کے ذریعہ وقتِ واحد میں زیادہ
...یادہ لوگوں تک اپنی یا حکومت کی بات پہنچائی جاسکے۔ اسی کے

ترقی کے ساتھ عوام میں بھی یہ شعور پیدا ہو چکا تھا کہ وہ حاکم یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کی طرزِ حکومت کے تعلق سے زیادہ سے زیادہ جانیں یا باخبر رہیں اور اس کی خامیوں یا کمزوریوں پر اپنا ردِ عمل ظاہر کریں ماضی میں انسان کے لئے زیادہ باخبر رہنا ضروری نہیں تھا کم آبادی اور محدود وسائل کے باعث انسان کا دائرہ فکر اپنی ذات قبیلہ یا علاقہ تک محدود تھا۔ لیکن آج علم کی ترقی نے تجسس کو مہمیز کردیا ہے باخبر رہنے کا ذوق بڑھ چکا ہے دوسروں کے تعلق سے جاننے کا رجحان شدت اختیار کرتا جارہا ہے اطراف واکناف کے حالات سے واقفیت ضروری ہو گئی ہے دنیا کے کسی بھی ملک میں ہونے والے واقعات اور انقلابات کے اثرات دوسرے ملکوں کو بھی اپنے لپیٹ میں لئے بغیر نہیں رہتے۔ سیاست، معیشت اور سماجی زندگی پر یہ اثر انداز ہوتے ہیں تیل پیدا کرنے والے ممالک تیل کی قیمت میں اضافہ کردیں تو اس کا اثر صرف خلیجی ملکوں پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے کئی ممالک پر پڑے گا۔ اسی طرح ایران و عراق کی مسلسل اور طویل جنگ سے کئی ایشیائی ملکوں کی معیشت متاثر ہو رہی ہے آج کے دور میں ان سارے واقعات اور حالات کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا ذریعہ اخبارات، رسائل، کتابیں ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن ہیں۔

ذرائع ابلاغ نہ صرف ہمیں باخبر رکھتے ہیں بلکہ ہمارے اندازِ فکر رویوں، اور طرزِ عمل میں بھی تبدیلی اور تغیر کا باعث بنتے ہیں زندگی اور اس کے وسائل کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں اس کے علاوہ یہ وسائل ثقافتی، دلچسپی اور تفریح کا وسیلہ بھی ہیں۔

آج کے پیچیدہ سماج میں ذرائع ابلاغ ایک مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ نظامِ حکومت خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ، ذرائع ابلاغ کی ضرورت بہرحال رہتی ہے فرق اتنا ہوتا ہے کہ آمرانہ نظام میں ذرائع ابلاغ پر

علامتی مکمل کنٹرول ہوتا ہے جس میں آزادانہ اظہار رائے کی اجازت نہیں ہوتی جبکہ جمہوری نظام میں ترغیب کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

مطبع خانوں کے قیام کے بعد اخبارات اور رسائل ترسیل کا ایک اہم ذریعہ بن گئے یہ اخبار پڑھے لکھے لوگوں کے لئے انتہائی معاون ثابت ہوئے اخبارات کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ جگہ جگہ کی مختلف قسم کی خبریں شائع کر کے عوام کی دلچسپی اور ان کے معلومات میں اضافہ کیا جائے بلکہ اسی کے ساتھ ان میں اصلاح حال کا شعور پیدا کرنا فکری رائے عامہ کی تشکیل دینا بھی تھا ان اخبارات کی بدولت گھر گھر علم و دانش کے چراغ روشن ہوئے اور جب ابتلا و مصائب کے طوفان آئے تو ڈگمگاتے قدموں کے لئے نئی زمینیں ہموار کر گئیں۔

قومی تحریکیں ہوں کہ انفرادی کوششیں سبھی ان اخباروں کے ذریعہ پھیلتی پھولتی ہیں یہ اخبار صحیفہ ہی اعلیٰ قدروں اور اعلیٰ اصولوں کے قائل ہیں آج جمہوری اور عوامی دور میں جو ہمہ جہتی ترقیاں ہو رہی ہیں ان میں بلاشبہ ان اخباروں کا اہم رول ہے کسی بھی ملک کی لسانی، معاشی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور ادبی و سیاسی زندگی کے لیل و نہار کے مطالعہ کے لئے اخباروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

اخبارات نہ صرف معلومات کی فراہمی کا موثر ذریعہ ہیں بلکہ ان کے کالموں کے ذریعہ عوام میں قومی شعور پیدا ہوا۔ اخبار کی سرخیاں وہ اثر دکھاتی ہیں جو شائد میدانِ جنگ میں سپاہی کی تلوار نہ دکھا پائے اخبارات کی اہمیت ایک تعلیم یافتہ سماج میں اور زیادہ ہے اسی لئے اسے چوتھی مملکت FOURTH ESTATE کہا گیا ہے۔

دنیا کے کئی انقلابات اور انقلابات کی روح رواں شخصیتوں نے اخبارات سے اثر قبول کیا۔ پریسیڈنٹ نکسن کے واٹر گیٹ اسکینڈل کا سب سے پہلی بار جیک انڈرسن جیسے مشہور صحافی

نے راز فاش کیا برطانیہ میں ایک کابینی وزیر پر وفیومو کے کالے کارناموں کو بے نقاب کرنے میں لندن ٹائمس اور دیگر اخبارات پیش پیش رہے اور یہ اسکنڈل سیاسی و صحافتی تاریخ میں " پروفیومواسکینڈل " کے نام سے مشہور ہوا۔ ابھی حال میں " بوفورس معاملات اور " فیرفاکس " وغیرہ کے بارے میں انڈین ایکسپرس نے کئی اہم انکشافات کئے۔

ریڈیو اور ٹی۔ وی کی ایجاد کے باوجود اخبارات کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے اخبار ماضی میں بھی اہم تھا حال میں بھی اہم ہے اور مستقبل میں بھی اس کی اہمیت و افادیت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا ان اخبارات کے ساتھ یہ ایک سہولت ہے کہ جب چاہیں پڑھا جا سکتا ہے اس کے فائل محفوظ رکھے جا سکتے ہیں بلکہ کسی حوالہ یا دلیل کے طور پر انھیں استعمال بھی کیا جا سکتا ہے اخبار کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ اس کی قیمت کی کمی بھی ہے جو کسی پر بھی گراں نہیں گزرتی ایک معمولی استطاعت کا فرد بھی اخبار خرید کر پڑھ سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ ایک مخصوص حلقہ میں ہی مقبول ہے کیونکہ ہمارے ملک میں ناخواندگی کا تناسب زیادہ ہے۔

اخبارات پرنٹ میڈیا کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس پرنٹ میڈیا میں اخبارات کے علاوہ رسائل، جاوزجنرل، پمفلٹ، پوسٹرس اور کتابیں شامل ہیں یہ مختلف ذرائع بھی اپنی جگہ افادیت کے حامل ہیں۔

ابلاغ کا ایک اہم ذریعہ ریڈیو بھی ہے ریڈیو آج ملک کی ۹۷ تا ۹۸ فیصد آبادی کا احاطہ کرتا ہے دنیا کا پہلا ریڈیو اسٹیشن ۱۹۲۲ء میں انگلستان میں قائم ہوا تھا اور ہندوستان میں پہلی نشرگاہ ڈیڑھ کلو واٹ کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کے ساتھ جولائی ۱۹۲۷ء میں بمبئی میں قائم ہوئی۔ یہ نشرگاہ انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی نے قائم کی تھی اسی سال اگست کے مہینے میں کلکتے میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا ۱۹۳۰ء میں انڈین براڈ

کاسٹنگ کمپنی ختم ہوگئی اور اسی سال نشریات کا کام حکومت ہند نے سنبھال لیا۔ اور انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس قائم کردی گئی پھر جون ۱۹۳۶ء میں اس ادارے کا نام بدل کر آل انڈیا ریڈیو کردیا گیا اُس وقت سے لے کر اب تک براڈکاسٹنگ کے شعبہ میں ترقی ہوئی خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی سے ریڈیو نے ایک بے حد موثر ذریعہ ابلاغ کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوالی تھی دوسری جنگ کے دوران اسے پروپگنڈہ کے لئے بھی استعمال کیا گیا لیکن بعد میں محسوس کیا گیا کہ نشریاتی وسیلہ کا اصل اور سرمایہ کاری کا م پروپگنڈہ نہیں بلکہ معلومات و اطلاعات کے توسط سے تحریک و ترغیب دینا ہے چنانچہ آزادی کے بعد عوامی معلومات ملک کے اتحاد بیرونی حملوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہنگامی حالات کے تقاضوں وغیرہ کی بنیاد پر ملک میں نشریاتی سہولتوں میں بہت ترقی ہوئی بیشتر ممالک میں تعلیمی سرگرمیوں، مختلف سماجی سرگرمیوں کی تکمیل کے لئے ریڈیو کا استعمال کیا جانے لگا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دیہی علاقوں میں ریڈیو ہی بہت بڑا اور مقبول ذریعہ ابلاغ ہے حالانکہ اکثر دیہاتوں میں ٹی۔وی پہنچ چکا ہے لیکن عوام کے پاس ٹی وی سیٹس نہیں ہیں ناخواندگی کا زیادہ اوسط ہونے کے باعث اخباروں کا مطالعہ کم ہو جاتا ہے اس لئے وہاں معلومات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ریڈیو ہے اس کے علاوہ تفریح کے لئے بھی ریڈیو کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ریڈیو نے ڈرامے، غزلوں، گیتوں، مزاحیہ خاکے، مشاعرے اور دیگر ریڈیائی دھنیں، موسیقی اور دوسرے معلوماتی فیچر کے ذریعہ ہمارے فنون لطیفہ اور سماجی زندگی پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ریڈیو سے کوئی ایسے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جو

جاری معلومات میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں چند ایک پروگراموں میں تو چار ... گرد کے سماج و معاشرہ کی عکاسی ... پیش کی جاتی ہے ... ملک میں آج ... اہم سرگرمیاں ہیں وہ مختصراً ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ ثقافتی پروگرام۔ جیسے گیت، موسیقی، ڈرامے، مزاحیہ خاکے اور مشاعرے وغیرہ

۲۔ توسیعی پروگرام۔ جیسے دیہی نشریات، تعلیمی پروگرام نوجوانوں کے لئے پروگرام خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق پروگرام وغیرہ

۳۔ خبروں کی ترسیل۔

۴۔ بیرونی ملکوں کے لئے نشر کئے جانے والے خصوصی پروگرام وغیرہ۔

اس جدید دور میں ابلاغ کا ایک اہم ذریعہ سینما ہے فلم کے تاثر کا دارو مدار عکس اور آواز دونوں پر ہے فلم محض تعلیم اور تفریح کا وسیلہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک فنی تخلیق بھی ہوتی ہے جس کا مقابلہ بصری فنون کے بہترین نمونوں سے کیا جا سکتا ہے عوام کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے میں اور ان کے ذہنوں، ذہنی رویوں اور رجحانات کی تشکیل کرنے میں سینما کا رول بے حد اہم ہے اخبارات کے بعد اپنے استحکام اور قدامت کے لحاظ سے یہ دوسرا بڑا وسیلۂ ابلاغ ہے ترقی پذیر معاشرے میں اس وسیلۂ ابلاغ سے بہت اہم کام لئے جا رہے ہیں کیونکہ یہ عوام کے ذہنوں کو بہت جلد متاثر کرتا ہے اس کی اہمیت اور افادیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی متحرک تصویروں کے ذریعہ پہنچائے جانے والا پیغام انسانی ذہن پر فوراً اپنا تاثر قائم کر لیتا ہے چنانچہ اس میڈیم کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک کے مختلف ترقیاتی، اصلاحی و

فلاحی کاموں کو روبہ عمل لانے کے لئے اور ایک سازگار ماحول بنانے کے لئے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے۔ چنانچہ مقصدی اور دستاویزی فلموں کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جانے لگا ہے یہ فلمیں زیادہ تر حکومت ہند کا "فلمز ڈویژن" ادارہ تیار کرتا ہے۔ جو ملک کا واحد سب سے بڑا دستاویزی فلمساز ادارہ ہے اس کا قیام ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا تھا جہاں قومی دلچسپی کے تقریباً تمام موضوعات پر فلمیں تیار کی جاتی ہیں جیسے ان میں دستاویزی فلموں، کارٹون فلموں کے علاوہ مختلف موضوعات جیسے قومی ترقیاتی بشمول زراعت، پرورش مویشیاں جنگل بانی، باغبانی، اجتماعی ترقی، گھریلو صنعتیں، دستکاریاں، ماہی پانی پنج سالہ منصوبے کے پراجکٹ، خوراک، قدرتی وسائل، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے علاوہ آثار قدیمہ، فنون لطیفہ، دفاع، تعلیم، تہذیب سفر وسیاحت، تہذیب ومعاشرت، سائنس وٹکنالوجی، فیملی پلاننگ، کھیل کود، تجارت اور بین الاقوامی موضوعات پر بھی خصوصی فلمیں بنائی جاتی ہیں اس طرح کی فلموں کے موضوعات کا انتخاب ہر سال حکومت ہند کی وزارتوں ریاستی سرکاروں اور مختصر دستاویزی فلموں سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے اداروں کے مشوروں سے کیا جاتا ہے۔

فلمیں دیہی ترقی اور قومی ترقی میں مدد دیتی ہیں فلمی صنعت کو ٹی۔وی کی ایجاد کے بعد سے دھکا پہنچا ہے مگر اس کے باوجود اب بھی یہ ایک فعال ذریعہ ابلاغ ہے جس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آج کے جدید دور میں ٹیلی ویژن بالکل نیا اور نسبتاً کم عمر ذریعہ ابلاغ ہے لیکن اس نے بہت جلد ساری دنیا کو اپنے سحر میں محصور کرلیا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بنیادی فرق سماعت اور بصارت کا ہے ریڈیو صرف سمعی ذریعہ اظہار ہے جبکہ ٹیلی ویژن ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس پر ؟ ہونے والے عمل ناظرین کو سمعی اور بصری دونوں حیثیتوں

قمر سنبھلی

صفدر ہاشمی

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

گذشتہ دنوں اسٹیج کے ایک مشہور فن کار مسٹر صفدر ہاشمی کو دہلی سے قریب ضلع غازی آباد میں ایک ڈرامہ پیش کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا بتایا جاتا ہے کہ اس قتل کے پیچھے سیاست کارفرما تھی۔ اس الم ناک حادثہ کی تمام حلقوں کی طرف سے انتہائی مذمت کی گئی اور سخت احتجاج کیا گیا۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ حادثہ تھا بھی لائق مذمت۔ کسی شخص کو محض اس سے سیاسی اختلافات کی بناء پر زندگی سے ہی محروم کر دینا ایک انتہائی سفاکانہ اور مجرمانہ فعل ہے۔ اس لیے اس وحشت ناک جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو عبرت ناک سزا ملنی ہی چاہیئے۔ اس افسوس ناک حادثہ نے دہلی کے مسلم حلقوں میں دوہری تکلیف کا احساس پیدا کیا ایک تو یہ کہ حادثہ ایک اچھے فن کار اور غریبوں، مزدوروں سے ہمدردی رکھنے والا شخص یوں چشم زدن میں ان سے چھین لیا گیا۔ دوسری تکلیف دہ بات یہ ہوئی کہ اس فن کار کی لاش کو ہندو رسم و رواج کے مطابق جلا دیا گیا۔

اخبارات کی اطلاع کے مطابق خود صفدر ہاشمی کی خواہش کے مطابق ہی ان کی آخری رسوم بجلی کے شمشان گھر میں سپرد آتش کر کے ادا کی گئیں۔

اس خبر نے دہلی کے مسلمانوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ انھیں کسی طرح یقین ہی

تا ہے کہ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم دین معروف مفسر قرآن اور جمعیۃ العلماء
سابق صدر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم کا قریبی عزیز
نردم تک "ہاشمی" کی متبرک نسبت کو اپنے نام کا جزو بنائے رہا، کس طرح مرتے
نے اس خواہش کا اظہار کر گیا کہ اس کا جسد خاکی سپرد خاک کرنے کے بجائے سپرد
ا کیا جائے۔ ایسے شبہ کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ صفدر ہاشمی کی
، ایک غیر مسلم اور اسٹیج کی مشہور اور بااثر آرٹسٹ [illegible] دہلی کے مسلمانوں کے یہ
ت بالکل بے بنیاد بھی نہیں ہیں کیونکہ ان کی زندگی میں ان کے قریبی دوستوں کو بھی
، اس خواہش کا علم نہیں تھا، نہ کسی ایسی وصیت کا تحریری ثبوت کسی اخبار میں نظر
گذرا، اسی وجہ سے یہ خیال زیادہ حقیقت سے قریب معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان کی
ی کی خواہش پر ہی ایسا کیا گیا۔ ظاہر ہے جس شخص کا جنازہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر
، انہ کر کے برقی آتش کدہ (بجلی کے شمشان گھر) سپرد آتش کرنے کے لئے لے جایا
اس کی نماز جنازہ کا تو کیا سوال؟

دیکھو اسے "جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ صفدر ہاشمی ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ
مہ تھے اور مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اس کا گمان تک نہ
کہ وہ ایسے مذہب بیزار ہوں گے کہ اپنی آخری رسوم کے لئے ہندو رسم و رواج کے
بق عمل کرانے کو ترجیح دیں گے۔

دراصل یہ اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے جو ہمیں آزاد خیالی کے نام پر قدم
پر نظر آ رہی ہے۔ بہت سے مرعوب ذہن رکھنے والے نام نہاد سیکولرزم میں ملے
ترے ہوئے کچھ مسلم گھرانوں کے نوجوان اسلامی روایات کے برخلاف اپنی ذاتی خواہش
جذبہ سے مغلوب ہو کر یا فیشن پرستی کی رو میں بہہ کر اور خود کو آزاد خیال سیکولر
نے کے شوق میں غیر مسلموں میں شادی بیاہ کر کے فخر محسوس کرتے ہیں مگر اس کے
م سے غافل ہیں یا جان بوجھ کر اس پر نظر نہیں کرنا چاہتے۔

نتیجہ ظاہر ہے یہی ہوتا ہے کہ تمام عمر مسلمان بنے رہے، مگر جنازہ کی نماز سے بھی

محروم رہے۔ اتنا تقہ کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی اور ذاتی معاملہ ہے۔۔۔ مگر ہمنا یہ تعلق ذاتی اور انفرادی معاملہ نہیں ہے بلکہ بالواسطہ یہ پوری ملت کا مسئلہ ہے۔ جس عمل کی پاداش میں پورا فرقہ، بلکہ تمام علاقہ اور شہر کا شہر فساد کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہو اسے کیسے ذاتی معاملہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

کبھی کبھی دو مختلف المذاہب افراد کا آپس میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا تباہیوں اور فسادات کا سبب بن جاتا ہے۔ دہلی والے شاید ابھی بھولے نہ ہوں گے مسٹر سکندر بخت کی شادی ایک غیر مسلم عورت سے ہوئی تو دہلی کے مسلمانوں کو شدید فساد کی قیامت سے گذرنا پڑا تھا۔ اور اس کی وجہ سے کتنے ہی خاندان متاثر ہوئے تھے ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اب بھی ایسے مناظر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اس لیئے اس طرح کے واقعات کو ذاتی یا انفرادی سمجھ کر ان سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیئے اور ہمارے رہنماؤں اور بااثر شخصیتوں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کر کے اس کے سد باب کی کوشش کرنا چاہیئے خود ایسے آزاد خیال افراد کو بھی اپنے طور پر یہ سوچنا چاہیئے کہ ان کے ایسے فعل سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ صرف ان کی اپنی زندگی میں بلکہ خاندان اور ملت کے لیے کیسے کیسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

کیا ایسے مسلمان جو غیر مسلم بیویاں رکھتے ہیں۔ صفدر ہاشمی کے بغیر نماز جنازہ سپرد آتش کیئے جانے سے کچھ سبق حاصل کریں گے۔ کیا سکندر بخت اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے حضرات نے اپنی آخری رسوم کے متعلق وصیت کر کے اس کا عوامی اظہار فرما دیا ہے؟ اگر نہیں تو انھیں اپنی حیات میں اس کا اعلان کر دینا چاہیئے تاکہ ملت بعد کے خلفشار سے محفوظ رہے۔ اور خدا نخواستہ ان کو اپنا یہی حشر منظور ہے تب بھی اس کا اعلان ہو جانا چاہیئے تاکہ ملت کے افراد کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہیں۔

(ندائے ملت سے ماخوذ)

ماھنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۲۰) شمارہ (۴) اپریل ۱۹۸۹ء حیدرآباد

قیمت : پانچ روپے =/۵

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۵ سال	90 ”	270 ”	65 ”	36 ”	225 ” ”
حیات	1000 ”	2500 ”	450 ”	300 ”	2000 ” ”

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز - حیدرآباد (اے۔پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپواکر دفتر "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد اے۔پی سے شائع کیا۔

فہرست

حرفِ اول	ایڈیٹر	۳
ملک کی نازک صورت حال	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۴
خلافت	ڈاکٹر حسن الدین احمد	۹
تصوف	صفدر حسین نقشبندی	۱۳
گستاخ رسول	عبدالحفیظ خان	۲۴
ضیاء شہید	مفتی محمد تقی عثمانی	۳۱
شناسہ نامہ	قدرت اللہ شہاب	۴۶
دریا ایک استعارہ	محمد نسیم الدین	۶۲
مفت قانونی امداد	آشوتوش سنہا	۷۴
عشق صادق	محمد نظام الدین ناہر ناظر	
غزل	ڈاکٹر منشاء	
غزل	فاطمہ ناز	
غزل	سکندر توفیق	

حرفِ اوّل

اردو : اقلیتی کمیشن آندھرا پردیش کی گذشتہ (۵) سالانہ رپورٹیں اسمبلی میں پیش نہیں کی گئیں : اور کمیشن کی تقریباً تمام سفارشیں ریاستی حکومت کی جانب سے مسترد کردی گئی ہیں ۔ سفارشوں کو منظور نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی کہ اقلیتی کمیشن صرف ایک مشاورتی ادارہ ہے ۔ کمیشن نے ایک سفارش یہ بھی کی تھی کہ اگر حکومت سفارشات قبول نہ کرے اور رپورٹ اسمبلی میں پیش کرنے میں تاخیر ہو تو یہ عوام کی اطلاع کے لئے اخبارات کے لئے جاری کردی جائے حکومت نے اس سفارش کو بھی نامنظور کیا ۔ ایسی صورت میں اقلیتی کمیشن کا قائم رہنا اقلیتوں کے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ، اسے تو اقلیتوں ہی کو سوچنا اور اس خصوص میں کچھ کرنا چاہیئے ۔

اقلیتی کمیشن کی ایک اور سفارش جو سال بہ سال کی جاتی رہی اور مسترد ہوتی رہی یہ ہے کہ ریاست میں اردو کو دوسری زبان کا موقف دیا جائے ۔ حکومت نے بیان کیا کہ ریاست میں اردو بولنے والوں کی جملہ آبادی ۷٫۵ فیصد ہے اس لئے یہ ممکن نہیں ہے ۔

اردو کے حقوق کے لئے اردو بچاؤ تحریک چلائی گئی ۔ اور اس سے متاثر ہو کر حکومت نے چند تصفیے کئے کہ اردو کو اس کا حق دیا جائے گا ۔ اردو تعلیم کا انتظام ہوگا ۔ انتظامیہ میں اردو استعمال کی جائے گی اور جن علاقوں میں اردو دوسری زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے اس پر عمل کیا جائے گا ۔ ان تصفیوں کے باوجود عملی اقدام کا انتظار ہے ۔ اردو کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہی ہوتی آرہی ہے کہ اردو کی اہمیت کا اعتراف کیا جاتا ہے ۔ اسے حق دینے کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کیا جاتا ۔ اگر احکام اور ہدایتیں جاری بھی کی جاتی ہیں تو [illegible] کنندہ حکام ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان سے کوئی جواب نہیں لیا جاتا کہ وہ یہ کوتاہی کیوں روا رکھیں ۔ اردو والوں نے اردو بچاؤ تحریک چلا کر کچھ وعدے حاصل کئے انہیں مزید اقدام کے لئے تیار رہنا چاہیئے تاکہ وعدوں کی تکمیل کو بھی یقینی بنایا جاسکے ۔

ماہنامہ [illegible] حیدرآباد

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

ملک کی نازک صورت حال

اور محبان وطن کی ذمہ داری

(قسط دوم)

اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے (اور یہی پیام انسانیت کی تحریک کا خلاصہ ہے) کہ ہم اپنے اس بڑے گھر کی فکر کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم آرام سے ہیں اور اصول و اخلاق کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یا تو پھر باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، پیغمبر انسانیت حضرت محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کی ایسی بلیغ اور واضح مثال دی ہے، جس سے بہتر مثال کم سے کم مجھے نہیں ملی۔ میں لٹریچر کا بھی طالب علم ہوں اور ہسٹری اور فلاسفی کا بھی، مختلف ملکوں میں جو اصلاحی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ان سب کا میں نے امکانی حد تک مطالعہ کیا ہے مجھے ایسی سمجھ میں آنے والی مثال نہیں ملی، آپ نے فرمایا، زندگی ایک کشتی کی طرح ہے اس میں ایک بالا درجہ UPPER CLASS اور ایک زیریں درجہ LOWER CLASS ہے میں اس کو بھی رسول اللہ کا معجزہ سمجھتا ہوں، عرب کے ملک میں نہ دریا ہیں نہ نہریں، اس وقت کوئی ایسا بین الاقوامی بندرگاہ بھی نہیں تھی۔ جہاں غیر ملکی کشتیاں اور جہاز آئیں۔ جیسا کہ اس وقت جدہ ہے، باہر کی دنیا میں بھی عام طور پر ایک ہی درجہ کی معمولی اور سادہ کشتیاں چلتی تھیں، تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سمندر کا [illegible] کیا۔ پھر آپ نے بالائی اور زیریں طبقہ کی مثال کیسے دی،

سب جانتے ہیں کہ جو لوگ اپر کلاس میں رہتے ہیں وہ بالانشینوں کی طرح بلند خیال
بلند معیار زندگی کے لوگ اور ضرورت سے زیادہ حساس اور خود دار SENSITIVE
تے ہیں اور نیچے کے طبقے میں غریب غربا اور متوسط الحال لوگ سفر کرتے
یں ۔ آپ نے فرمایا کہ اس کشتی میں پانی کا انتظام بالائی حصہ میں ہے ۔ اور وہیں
سے سب مسافروں کو ملتا ہے ۔ حصہ زیریں کے رہنے والے بھی بہرحال انسان
یں پانی کے بغیر ان کا بھی گزارہ نہیں ۔ وہ اوپر جاتے ہیں اور پانی بھر کر لاتے
یں، پانی کی فطرت ہے، کہ وہ چھلکے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کون پاس بیٹھا ہے۔ یہ
رے آدمی ہیں، ان پر پانی نہیں گرنا چاہیئے، یہ بے ادبی بے گستاخی ہے
یکن پانی نے منطق نہیں پڑھی، پانی جب گرے گا تو چاہے کسی ملک کا بادشاہ بیٹھا
ا ہو وہ بھی بھیگ جائے گا، پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ کشتی یا جہاز چلنے والی
یز ہے ۔ اور دریا یا سمندر موج بھی ہے اور متلاطم بھی، برتن بھی ہر ایک
ے پاس بڑا نہیں ہوتا، کوئی چھوٹا برتن لے کر آتا ہے، یا جہاز ہلتا ہے پاس
یٹھا ہوا آدمی مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے، کوئی شعر و شاعری میں معروف ہے کسی
ے ابھی کپڑے بدلے ہیں، اور قیمتی فرش پر جلوہ افروز ہے پانی ادھر گرا ادھر گرا، ان
نشینوں کی اونچی پیشانی پر غصہ کی شکن آجاتی ہے، ان کو گراں گذرتا ہے، ایک مرتبہ
تو آدمی برداشت بھی کر لے لیکن یہ تو روز کا جلاپا ہی کئی مرتبہ کا کام ہے انھوں نے کہا
ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ کام ان کا پانی کا اور ۔
یشان ہوں ہم ۔ ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، اب یہاں کوئی پانی لینے نہ آئے۔
نیچے کے درجے والوں نے جب یہ سنا تو کہا کہ پانی کے بغیر گذارہ نہیں اگر
یہ ہمیں اوپر نہیں آنے دیتے تو آپ آرام سے بیٹھے خدا مبارک کرے، ہم نیچے ہی
ا میں سوراخ کر لیتے ہیں وہیں بیٹھے بیٹھے پانی بھر لیا کریں گے، رسول اللہ صلے اللہ
یہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نے ان کو عقل دی ہے، اور ان کی شامت نہیں آئی تو
ا خوشامد کریں گے کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کرو ہم سے غلطی ہوئی، تم کشتی میں
وراخ نہ کرو ۔ اس لیے کہ اگر کشتی میں سوراخ ہوا تو نہ ہم بچیں گے نہ تم بچو گے آپ کا

مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسان ایک ملک کے بسنے والے، ایک معاشرہ کے افراد (خواہ ان میں نسل و نسب، عرفی حیثیت، اقتصادی حالت اور دماغی سطح کے لحاظ سے کتنا ہی فرق ہو) ایک کشتی کے مسافر ہیں، ہمارے ملک میں خود یہ محاورہ ہے کہ "ایک کشتی کے مسافر" یعنی اگر کشتی پر کوئی مصیبت آئے گی تو کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوگا اور بڑے چھوٹے سب ڈوبیں گے۔

صاحبو! میرے لئے ایک بڑی پہیلی ہے جس کا بوجھنا مشکل ہے کہ اتنے لانبے چوڑے ملک میں چند سو آدمی بھی ایسے نہیں ہیں جن کو اس بڑے گھر کی فکر ہو جو اس سے ڈر رہے ہوں کہ (ملک) پر کوئی آفت آئی تو ہماری بھی خیریت نہیں، یہاں کسی طبقہ کی کمی نہیں، اجتماعی خدمت Scocial work کرنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن آپ مجھے معاف کریں، وہ کتنے آدمی ہیں جو اس فکر میں ڈوبے چلے جا رہے ہوں، جن کی راتوں کی نیند اڑی ہو کہ اس ملک کا کیا بنے گا؟ اس ملک میں کرپشن کا یہ حال ہے کہ آخری چیز جو کسی سماج کی خرابی کی دلیل ہو سکتی ہے وہ بھی یہاں شروع ہو گئی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ غذاؤں میں ہی نہیں دواؤں میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے، اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مرکزی حکومت کے ایک وزیر صحت نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ۶۰ فیصدی دواؤں میں ملاوٹ شروع ہو گئی ہے ایک رفاہی اسپتال کے افتتاح کی تقریب میں جس میں اس ریاست کے چیف منسٹر بھی موجود تھے، اور بڑے بڑے اہم ذمہ دار لوگ بھی، میں نے کہا تھا کہ کسی سماج کے اخلاقی ترقی و تنزل کا تھرمامیٹر یہ ہے کہ اسپتالوں میں جا کر تو دیکھئے کہ وہاں کس قدر ہمدردی اور خلوص اور بے غرضی سے مریضوں کی خدمت ہوتی ہے، اور کرپشن وہاں تو نہیں پہنچ گیا ہے؟ ابھی کچھ عرصہ ہوا، واقف دوستوں نے بتایا کہ بعض اسپتالوں میں جائے ضرور TOILET پر تالے لگا دیئے گئے ہیں، جب مریض یا اس کا تیماردار بے قرار ہو کر وہاں دوڑتا ہے تو وہاں سے عملہ کا کوئی آدمی کہتا ہے کہ پہلے دو روپیہ دو پہلے ۵ روپیہ دو پھر ہم تالہ کھولیں گے، میرے ایک دوست نے جو سرکاری ملازم ہیں ابھی بتایا کہ ہم کو ہر سال میڈیکل ٹسٹ کرانا پڑتا ہے

ن ترقی کے لئے کبھی پوسٹ کے لئے ہمیشہ CHECK-UP کے لئے جاتے تھے اور رپورٹ
لے کر واپس آجاتے تھے لیکن اس دفعہ گئے تو چیک کرنے والے اور رپورٹ دینے والے کہا
کہ آپ کے بائیں پھیپھڑے پر دھبہ ہے، اب کیا کیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ
ہزار روپیہ، اس کا علاج انجکشن نہیں ہے۔ اس کا علاج دو ہزار روپئے ایسی
بعد ہزار روپیہ ان کے ہاتھ میں رکھ گئے تب جا کر وہ دھبہ مٹا، ادھر مٹھی گرم
ادھر کلیجہ ٹھنڈا ہوا، اس طرح ملک کیسے چلے گا اور زندگی کا لطف تو بڑی چیز ہے
دگی کیسے گذاری جائے گی ؟

میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے بھی
فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی، ہم کو ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم
تعلیم دی تھی کہ ۔

لرٰاحمون یرحمہم الرحمٰن تبارک
تعالیٰ، ارحموا من فی الارض یرحمکم
من فی السماء ۔

رحم کرنے والوں پر بڑی رحمت کرنے
والا خدا بھی رحم کرتا ہے۔ تم اہل زمین
کے ساتھ رحم و شفقت کا برتاؤ کرو جو
آسمان پر ہے وہ تمہارے ساتھ رحمت
و مہربانی کا معاملہ کرے گا ۔

ہندوستان کے مشہور شاعر حالی نے نظم میں اس طرح ترجمہ کیا ہے ۔

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

کہ ہم سے قیامت میں سوال ہوگا کہ اس ملک میں رہتے ہوئے تم نے کیسے
اس کو برداشت کیا، سب سے پہلے تمہاری ذمہ داری تھی، تمہیں اس
اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دینا تھا یہ اس لئے کہ ابھی ہمارے پاس اللہ
ب موجود ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت اور زندگی،

پ کی تربیت دی ہوئی نسل کے کارنامے اور خدمات کا ذخیرہ موجود ہے، اس
ہیں کثرت سے روحانی پیشوا، معلمین اخلاق، زہد و ایثار کی زندگی گزارنے
الے، اور انسانیت کا سچا درد رکھنے والے مسلسل پیدا ہوتے رہے ہیں، تم نے
ہ غفلت کیوں نہیں کی جو تمہیں کرنی چاہیے تھی، میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا
ہ اسلام ایک متعین عقیدہ اور ایک متعین مذہب ہے، اس کے حدود ہیں، اس کا
یک قانون ہے، اس کی ایک شریعت ہے، اس پر عمل کرنا اس کے مطابق زندگی
گزارنا ہم سب کا فرض ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ بھی ذمہ داری
ہے کہ ہم اس ملک کو بچائیں، ہمارے ہوتے ہوئے یہ ملک ڈوبے نہیں، ہم
اگر کسی کشتی پر سوار ہیں، تو اس کشتی کو نہیں ڈوبنا چاہیے، یہ ہماری اور آپ سب
کی ذمہ داری ہے، اور قیامت میں ہم سے اس کا سوال۔

حضرات!

آخر میں میں صفائی سے کہتا ہوں کہ ملک سو گیا ہے، مرا نہیں ہے
سویا ہوا شخص سو بار جگایا جا سکتا ہے مرا ہوا ایک بار بھی زندہ نہیں کیا جا سکتا
دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ممالک، معاشرے، تہذیبیں اور ماحول ہزاروں
بار سوئے ہزاروں بار جاگے، سونا عیب نہیں، سونا زندگی کی ضرورت اور علامت
ہے، لیکن سونے کی ایک حد ہوتی ہے رات بھر سوئیے دن میں بھی سو لیجئے۔ لیکن
سوتے ہی رہیے اس کی اجازت نہیں، خاص طور پر ایک ایسے زمانہ میں جب
زندگی کی دوڑ بہت بڑھ گئی ہے، ریس بہت تیز ہو گئی ہے، اور اب بہت
بڑا مقابلہ درپیش ہے، اس وقت ساری دنیا میں ایک مقابلہ ہے یہ مقابلہ
خالی اقتصادیات کا سیاسیات کا، فوجی طاقتوں کا نہیں مقابلہ اخلاقی بھی ہے
اور اصولی بھی، اس وقت ہمارے ملک کو اپنی اخلاقیات کی بھی فکر ہونی
چاہیے اور معاشرہ کو بھی نمونہ کا اور معیاری بنانا چاہیے۔ ہماری پیام
انسانیت کی یہ تحریک "نقار خانہ میں طوطی" کی آواز کہی جا سکتی ہے، لیکن

باقی ص ۴۲ پر

۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد ۔

خلافت

ماہنامہ شاداب کے گذشتہ شمارہ (مارچ ۱۹۸۹ء) میں ڈاکٹر حسن الدین احمد کا مقالہ "خلافت" شائع ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں جناب سید غلام غوث محی الدین اسٹرانمر (موظف) رصدگاہ نظامیہ کا ایک استفسار وصول ہوا ہے۔ استفسار اور ڈاکٹر حسن الدین احمد کی وضاحت شائع کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اپنے مقالے "خلافت" میں قانون الٰہی کا حوالہ دیا ہے کہ جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھو دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اقتدار سے محروم کرکے اس کی جگہ ایسی قوم کو اقتدار سے نوازتا ہے جو صالح ہو۔

اس قرآنی اصول کے بموجب مسلمانوں نے اپنی صلاحیت کھو دی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اقتدار سے محروم کر دیا اور خلافت ختم ہوگئی۔ مسلمانوں کی شامت اعمال نے اتاترک کی صورت اختیار کی۔ اس لحاظ سے جب تک مسلمان دوبارہ عمل صالح کو اختیار نہ کریں ان کو دنیا کی امامت حاصل ہوگی اور نہ ہی خلافت کا احیاء ہوگا۔ اصل شئی کو نظر انداز کرکے خلافت کے لئے ادارے قائم کرنا مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنا یا دستوری خاکے مرتب کرنا کہاں تک درست ہوگا؟ سید غلام غوث محی الدین اسٹرانمر (موظف) رصدگاہ نظامیہ

سوال نہایت واجبی اور خیال آفرین ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے مقالہ "خلافت" پر دانشوروں نے توجہ دی۔ قانون الٰہی سے نہ افراد کو مفر ہے نہ اقوام کو ع

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کی خطاؤں کو معاف   اقبالؔ

آیت استخلاف (قرآن ۲۴:۵۵) کے بموجب خلافت ارضی یعنی دنیا کی امامت اس قوم کو عطا ہوتی ہے جو ایمان لائے اور عمل صالح جس کا شعار ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون نہایت واضح

ابوالاعلیٰ

نشاد ثانیہ

اور اسعاب پر مبنی ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ اس قانون پر کروڑوں برس سے عمل ہو رہا ہے لیکن اس قانون میں کبھی سرمو انحراف نہیں ہوا اللہ کے کلمات (اصول و قوانین) کبھی نہیں بدلتے (قرآن ۱۰- ۶۴)۔ تم اللہ کی سنت میں (قانون فطرت میں) کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے (قرآن ۳۳: ۶۲) اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا (قرآن ۳۰: ۶ اور ۹: ۱۱۱) اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ (قرآن ۹: ۱۱۱) بے شک اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا (قرآن ۷۳: ۱۸) اگر خلافت کا احیاء ہوگا اور ضرور ہوگا تو بالکلیہ قانون الٰہی کے تحت ہی ہوگا۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کے امتحان میں کامیاب ہونگے تب ہی ان کو دنیا کی امامت ملیگی اس سے مفر نہیں۔

مسلمانانِ عالم کو چاہیئے کہ اسی الٰہی قانون پر پورا پورا ایمان رکھیں، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں قرآن کا حکم ہے "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو" (قرآن ۳۹: ۵۳) مسلمانوں کو چاہیئے کہ خود کو ایسی امت ثابت کریں کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا "تم نیک جماعت ہو جو انسانوں میں سے پیدا کی گئی ہے۔ معروف کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو (قرآن ۳: ۱۱۰)

جس امت کو خیر امت کہا گیا ہے ہم اس کے وارث اور جانشین تو ہیں لیکن اس خوش نصیب قوم کی میراث کے حق دار نہیں کیونکہ ہم استخلاف فی الارض کے بنیادی شرائط کو پورا نہیں کرتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ الٰہی معیار پر پورا اترنے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جو موثر بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی۔

چونکہ خلافت دین کے قیام کے لئے بنیادی اہمیت کا ادارہ ہے جس کے احیا سے اعلائے کلمۃ الحق ہوگا اور مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی اس لئے جب ہم خلافت کی بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے حصول کے شرائط کو مسلمانوں کے سامنے رکھتے ہیں اور مسلمانوں میں ان الٰہی شرائط کو پورا کرنے کا جذبہ پیدا کرتے

اقوام عالم کے مقابلے میں ملت مسلمہ کو آج بھی یہ فوقیت حاصل ہے کہ ہم کو پیدائشی صحیح ایمان کی دولت میسر ہے یعنی استخلاف کی دو شرائط میں سے ہم ایک شرط کو پوری کرتے ہیں اور اس طرح پچاس فیصد نمبرات کے مستحق بنتے ہیں۔

مہلت حاصل ہے لیکن کامیابی کے نمبرات سے کام نہ چلے گا۔ بات مقابلہ کی ہے
اور معاملہ ایسی ہستی سے ہے جو سریع الحساب ہے [قرآن ۲ : ۲۰۲] اور سات
جگہ اس لئے ہے ایمان کا محاسبہ کرتا ہوگا۔ پیدائشی ایمان کے ساتھ ساتھ ایمان کی
دولت کا اکتساب خود اپنے ذہن سے کرتا ہوگا۔ ایمان کی روشنی حاصل کرتا ہے تو دل کا بھی اجالا ہوگا۔

ایمان سے مسلمانان عالم ناواقف نہیں البتہ ایمان کے وسیع مفہوم سے ان کو پوری طرح
واقف کروانا ضروری ہے۔ جب ہم خلافت کے احیاء کی کوشش کرتے ہیں تو گویا ایک اہم دینی
ادارے کو دوبارہ قائم کرنے کی بات کرتے ہیں جو دین کے اہم بنیادی ارکان مثلاً صلوٰۃ
زکوٰۃ۔ حج۔ جہاد اور دیگر اہم ارکان قرآنی کی تکمیل کا ضامن ہوگا تو ظاہر ہے کہ
ایمان کا وسیع مفہوم ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔

اللہ کے رسول نے ابوجہل سے فرمایا تھا تو ایک کلمہ [لا الہ الا اللہ] کہہ دے
عرب و عجم کی حکومت حاصل ہوگی۔ اس حدیث کی روشنی میں ایمان کے مکمل تصور کو
ذہن نشین کرنے کے لئے خلافت فی الارض کے تصور سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ہم خلافت
کے احیاء کی کوشش کرتے ہیں تو گویا دنیا کی امامت کے حصول کی شرائط اور
ذمہ داریاں ہمارے ذہن میں لازماً آجاتی ہیں یعنی کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حکومت
اس کے اقتدار اعلیٰ اس کے نافذ کئے ہوئے اٹل قوانین اس کے عدل و انصاف
اس کی رحمت اور اقوام کے عروج و زوال اور حصول اقتدار کے شرائط کا تصور
ذہن میں آتا ہے اس طرح نہ صرف ایمان کے حقیقی مفہوم کے ادراک میں مدد ملتی ہے
بلکہ ایمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ اصول بیان ہوا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم
کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت [ما بانفسہم] کو نہ بدلے [قرآن
۱۳ : ۱۱] احیاء خلافت کی کوشش اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ذہن اور ان
کی نفسیات کو بدلنے کی جدوجہد کو اس آیت کی روشنی میں یقیناً اپنی حالت کو بدلنے
کی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے اور اس جدوجہد کی بناء پر ہم بجا طور پر یہ توقع

سر جھکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کو ضرور بدل دے گا۔

اگر مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو جائے کہ خلافت کا احیاء دینی ضرورت ہے اور یہ ہمارے عظیم الشان ورثہ کا ایک اہم حصہ ہے جس سے ہم اس وقت محروم ہیں تو اس کو دوبارہ قائم کرنے کی امنگ ولولہ اور جذبہ پیدا ہوگا اور اس کے دوبارہ قیام کی جو شرائط ہیں ان کو پورا کرنے کا میلان پیدا ہوگا۔ وحدت (یکسانیت) خیال او ہم آواز ہونا مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بد قسمتی سے آج مسلمان گروہوں میں منقسم ہیں۔ ہر گروہ اپنے نظریات اجتماعی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بد قسمتی سے آج مسلمان گروہوں میں منقسم ہیں۔ ہر گروہ اپنے نظریات پیش کرتا ہے اور اپنا تجویز کرتا ہے۔ خلافت کا قیام ایک ایسا خیال ہے جو دینی ضرورت بھی ہے اور مسلمانوں کی مرکزیت اور حیات اجتماعی کا ضامن بھی۔ یہ کوئی جدید نظریہ یا شخصی خیال نہیں بلکہ ایسا نسخہ ہے جو قرآن مجید سے ثابت ہے جو ایک تاریخی حقیقت ہے جو مسلمانوں کا عظیم الشان اور قابل فخر ورثہ ہے۔ اس میں مرکزی خیال بننے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ خلافت کا احیاء نہ صرف مسلمانانِ عالم کی بلکہ ساری انسانیت کی تمام بیماریوں کا ایسا موثر علاج ہے کہ دوسرے تمام مجوزہ علاج اس کے سامنے ذیلی اور ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر احیاء خلافت کی آواز مسلمانوں کی مرکزی آواز بن جائے تو اس کے ذریعے کو ایسی تقویت حاصل ہوگی جس کا کسی اور طرح حاصل ہونا محال ہے۔ عمل صالح کی ایسی ترغیب ہوگی جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ اس مثبت رویہ اور اس وحدت خیال کی وجہ سے برکات الٰہی ضرور نازل ہونگی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ خلافت کے احیاء کے لئے ادارے قائم کرنا رائے عامہ کو ہموار کرنا خلافت اسلامیہ کا دستوری خاکہ مرتب کرنا افادیت سے خالی نہیں۔

کسی تحریک کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھا جائے۔ مسلمانان عالم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے احیاء خلافت سے عظیم تر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ خلافت اسلامیہ کا دراصل مسلمانانِ عالم کی حیات اجتماعی کا احیاء۔ وہ بے شمار اور شاندار نتائج جو مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ حاصل ہونگے صرف ایک اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر حاصل کئے جا سکتے ہیں اور وہ مقصد ہے خلافت اسلامیہ

مولانا صفدر حسین نقشبندی

تصوّف

اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا!

[شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فرمودہ فقرہ "تصوف : اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا!" کو عنوان بناتے ہوئے جناب صفدر حسین نے "تصوف" پر قلم اٹھایا ہے۔ مضمون کے مسودہ میں مضمون نگار کا نام "مولانا" کے سابقہ اور "نقشبندی" لاحقہ کے ساتھ ہے جو موصوف کی دیگر تحریروں پر اب تک نظر سے نہیں گذرا۔ آج کل اردو کے کئی الفاظ اپنے حقیقی معنوں سے ہٹے ہوئے مفہوم کے اظہار میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان ہی میں "مولانا" اور "مولوی" بھی ہیں۔ "مولانا" روم کہتے ہیں : "مولوی" ہرگز نہ شد مولائے روم ۔ تا غلام شمس تبریزی نہ شد
خبر نہیں "مولانا" کا کونسا مفہوم جناب صفدر حسین کے پیش نظر رہا ہے۔ البتہ لاحقہ "نقشبندی" سلسلہ سے موصوف کی نیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس تناظر میں موصوف نے "تصوف" کی جو تشریح کی ہے وہ نہایت خیال آفریں اور فکرانگیز ہے۔ کتاب و سنت کے حوالے سے تصوف کو ایک بدعت قرار دیا ہے اور خانہ تصوف کے بڑے بڑے "بتوں" پر ضرب لگائی ہے۔ جس سے دنیائے تصوف میں ایک ارتعاش پیدا ہونا یقینی ہے۔ صوفیائے کرام یا ان کے معتقدین اس بارے میں اظہار خیال فرمائیں تو شاداب کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں]

برسوں پہلے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔ انہوں نے یہ کیوں اور کس لئے کہا تھا اس کو سمجھنے کے لئے تصوف کی ابجد کو جاننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں کہ تصوّف اصل کے اعتبار سے یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی آنکھیں بند کرلینا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو تصوف یقیناً ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک ترجمۂ معنی

نہ ہوسکا۔ اگر ہم کسی بڑے سے بڑے تصوف کے مدعی سے پوچھیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو ہم دیکھیں گے کہ وہ اس کے متعلق متعین طور پر کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کہے گا تو اتنا کہ "ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی"! یعنی یہ وہ شراب ہے جس کے نشہ کی کیفیت اسی کو معلوم ہوسکتی ہے جو اسے خود پیئے یعنی ظالم تو نے پی ہی نہیں!

تصوف لفظی اعتبار سے ایک ایسا اجنبی لفظ ہے جس کا عربی لغت میں کوئی وجود نہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے معنی میں خود صوفیا کا شدید اختلاف ہے اور اب تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ اس لفظ کا وہ کون سا مفہوم ہے جس کی رعایت سے اس کے حامل کو صوفی کہا جاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ لفظ نہ قرآن مجید میں مذکور ہے، نہ حدیث شریف میں بلکہ جماعت صحابہؓ میں بھی کسی ایک صحابیؓ نے اس کو استعمال نہیں کیا ہے، اسلئے ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافِ اسلام ایک بدعت ہے، جسکی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں۔

تصوف کا نظریہ اور مسلک جس شد و مد سے مسلمانوں کے ہاں در آیا ہے اور جس قدر وسعت گیرائی اور گہرائی اس نے حاصل کی ہے، دوسرے مذاہب کے ہاں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دیگر مذاہب میں تصوف کا نظریہ اور مسلک ماند پڑتا گیا اور مسلمانوں کے ہاں یہ زیادہ برق رفتاری کے ساتھ ابھرتا اور پھیلتا چلا گیا۔ تاریخ کا طالب علم اس مقام پر پہنچ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے کہ اسلام جیسے دین میں جس کی سند اور اساس خدا کی کتاب میں محفوظ ہے، اس قسم کا تغیر بلکہ تحریف کس طرح واقع ہوئی؟

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ ہمارے صدرِ اول کے لٹریچر میں تصوف یا صوفی کا لفظ تک نہیں ملتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی نسبت ان اصحابِ صفہ کی طرف جاتی ہے جو مسجدِ نبوی میں ایک چبوترے پر درویشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن اس روایت کی صحت پر شبہ ہے کیونکہ صحابہ کبارؓ مردانِ مجاہد تھے نہ کہ عزلت گزیں درویش۔ ان ساری باتوں سے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تصوف کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟

ہندستان میں تصوف کا تصور کن راستوں سے آیا اور اس نے یہاں اسلام کے ساتھ کیا کیا اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے ——— پہلا مسلمان دانشور جس نے مسلمانانِ ہند کو ہندو تصوف (ویدانت وغیرہ) سے روشناس کرایا، وہ ابو ریحان بیرونی تھا۔ بیرونی نے

بعد شہنشاہ اکبر نے مہابھارت، رامائن اور اسی نوع کی دیگر سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا لیکن اس باب میں سب سے زیادہ نقصان داراشکوہ نے پہنچایا۔ دیکھئے علامہ اقبالؒ نے اس بارے میں کیا کہا ہے ۔ ؎ تخم الحادے کہ اکبر پرورید باز اندر فطرتِ دارا دمید

یہ ٹھیک ہے کہ اکبر اعظم نے الحاد کا بیج بویا تھا لیکن اس کے تخم الحاد اور داراشکوہ کے شجر الحاد میں بڑا فرق ہے ۔ اکبر کا الحاد برہنہ سامنے آیا تھا اس لئے اس سے ملتِ اسلامیہ نے فریب نہیں کھایا تھا لیکن دارا کے الحاد نے تصوف کے نقاب میں یلغار کی تھی جس کے نتیجہ میں "متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی"

داراشکوہ کے عقائد اور نظریات، جن کی بنیاد ہندو ویدانت پر تھی، بالخصوص پنجاب میں عام ہو گئے ۔ اس نے اپنی کتابوں میں بتدریج سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا تصوف (وحدت الوجود) اور ویدانت ایک ہی ہیں۔ اور رام بھی وہی ہے اور رحیم بھی وہی ! اس طرح وحدتِ الوجود اس دور کے شاعروں کی رگ رگ میں سموگیا اور پھر پنجابی شاعروں اور سندھی صوفیا وغیرہ نے وہ دھمال رچائی کہ اسلام کا نام ونشان تک اس غبار میں گم ہو کر رہ گیا ۔ اسلام کا نام ہی نہیں جب بات ملامتیہ یا قلندریہ تک پہنچی تو ہر قسم کی شرعی پابندیاں اٹھ گئیں اور جس قدر کوئی "بزرگ" فواحش و منکرات کا مرتکب ہو، وہ اتنا ہی "پہنچا ہوا" قرار پاگیا ۔ اور یہ سب "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" سمجھے جانے لگے !

آئیے تصوف کی حقیقت پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں ۔ صوفیا کے مختلف سلسلوں میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ فروعات کے اعتبار سے تو یہ اختلافات بکثرت ہیں لیکن اصولی نظر سے انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی حلول، وحدت الوجود اور وحدت الشہود

حسین بن منصور حلاج حلول کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے ۔ اس کا دعویٰ تھا کہ خدا کی ذات اس میں حلول کر گئی ہے ! اسی وجہ سے وہ انا الحق کا نعرہ بلند کرتا تھا ۔

ایک عامی شعر کے الفاظ میں ؎

خود رازِ انا الحق کو وہی کھول رہا ہے منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

حلاج کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تخلیقِ کائنات سے پہلے خدا خود اپنی ذات میں گم تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو آدم کو پیدا کیا ۔ اس طرح خدا آدم میں حلول کر گیا اور یوں

خدا اور انسان ایک ہوگئے! حلول کے عقیدہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ خدا بشکلِ انسان دنیا میں اُتر آتا ہے۔ ہم میں کس نے یہ شعر قوالوں کی زبان سے نہیں سنا اور اس پر "بزرگان کرام" کو سر دھنتے اور وجد میں آتے نہیں دیکھا۔ سہ

وہی جو مستوئ عرش تھا خدا ہو کر | اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر (معاذاللہ)

یہ ہیں زبان سے اشھدان محمد عبدہ ورسولہ کا اقرار کرنے والوں کے عقائد رسول اللہ کے متعلق! اور یہ وہ مقام ہے جہاں تصوف پہنچا تا ہے۔

وحدت الوجود کا عام فہم الفاظ میں یہ مفہوم ہے کہ کائنات میں کوئی شئے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے، سب خدا ہی ہے۔ یعنی خدا ہر شئے ہے اور ہر شئے خدا ہے۔

تصوف کے بارے میں ایک بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ تقریباً تمام صوفیا کسی نہ کسی طور پر حلول کے قائل ہیں۔ یعنی ان کی رائے میں خالق اپنی ہر مخلوق میں سمایا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم کے سوا کسی دوسری ذات یا چیز کا وجود نہیں۔ ان کی رائے میں خدا ایک امر کلّی ہے جس کا خارج میں کوئی ذاتی وجود نہیں۔ وہ صرف اپنی جزئیات میں پایا جاتا ہے۔ یہی نظریہ ان کو وحدتِ ادیان تک لے گیا ہے جس کے مطابق دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں، خواہ وہ آسمانی ہوں یا انسان کے خود ساختہ، وہ سب ان کے نزدیک ایک ہیں۔ اور حق و ہدایت ان سب میں مشترک ہیں۔ کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یعنی بُت پرستی اور خدا پرستی ایک ہی چیز ہے؛ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ گویا شرک عین توحید اور توحید عین شرک ہے!

ابن عربی (صوفیا ان کو "شیخ اکبر" کے نام سے یاد کرتے ہیں) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کی ذات میں داخل ہو جاتا ہے تو ظاہر میں وہ بندہ، بندہ ہی رہتا ہے لیکن باطن میں خود خدا ہو جاتا ہے اور یہ دخول بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے انسان میں بصارت، سماعت، حرکت اور سکون داخل ہیں۔ اسی دلیل سے ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ قائم کیا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو پیدا کیا اور خود عین اشیا رہا!

حلول کا عقیدہ بدیہی طور پر کفر دکھائی دیتا تھا اس لئے وہ تو عام طور پر مستور رہا لیکن ابن عربی نے بڑی مغالطہ آفریں شکل میں پیش کر دیا۔ اسے وحدت الوجود کا نظریہ کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں اسے منظم مذہب اور مسلک کی حیثیت سے ابن عربی ہی نے پیش کیا۔ اس میں

بے شبہ بہت سے بڑے ذہین اور فطین تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کسی ذہین اور فطین کی گردن ٹیڑھی ہو جائے تو جس قدر نقصان وہ پہنچا سکتا ہے، دوسروں کے ہاں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ابن عربی کی ذہانت نے یہی کچھ اسلام کے ساتھ کیا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ جب انسان کا اپنا وجود ہی نہیں تو وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ بالفاظ دیگر جب اسکے اعمال، اس کے اعمال نہیں، خود خدا کے اعمال ہیں تو انسان سے ان کا مواخذہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ علی حزیں نے کہا ہے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" چنانچہ وحدت الوجود جیسا رنگین عقیدہ جب شاعروں کے ہتھے چڑھا تو انہوں نے وہ گل کھلائے کہ توبہ بھلی۔ مولانا روم کی مثنوی تو ہے ہی وحدت الوجود کا دفتر بے پایاں!

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ تصوف کو بالعموم اور نظریہ وحدت الوجود کو بالخصوص اسلام میں شامل کرنے میں ابن عربی کا نام سر فہرست آتا ہے، لیکن جس شخصیت نے ان نظریات کو عین اسلام قرار دے کر اسے امت کے خون کے ذرات میں تک تحلیل کر دیا انہیں مولانا روم کے لقب سے کیا جاتا ہے۔ مولانا روم نے شعر کی زبان میں ایسے عام فہم، دلکش اور افسانوی انداز سے پیش کیا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ زبان زد خلائق ہو گیا۔ مدرسہ ہو یا خانقاہ محراب و منبر ہو یا اسٹیج، ہر مقام پر مولانا روم کی مثنوی دلوں کو گرمانے اور سامعین کو وجد و کیف کے عالم میں لے جانے کے لئے جادو کا کام دیتی ہے۔ اس مثنوی کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہا جاتا ہے!

جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے رومی بھی ابن عربی کی طرح وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی رو سے کفر اور ایمان میں کوئی فرق نہیں رہتا ابن عربی اس وحدت کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرتے ہیں لیکن رومی اسے اپنے ساحرانہ انداز کے مطابق تشبیہ و استعارات کی رنگینیوں کے پردوں میں وجہ فریب نگاہ بنا دیتے ہیں۔

وحدت الوجود کی ایک تعبیر تو یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہے۔ اس کی دوسری تعبیر ویدانتی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی روح کا ایک جزو انسانی پیکر میں پہنچ کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے اور نہایت کرب و اذیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد [illegible] تحریک طاعت سے روحِ خداوندی کو اس دلدل سے آزادی دلائی جائے

تاکہ یہ خود اپنے کل سے جا ملے۔ علمائے سلف نے اس نظریہ کی سختی سے مخالفت کی ہے، چنانچہ امام ابن تیمیہؒ نے اس نظریہ کے علمبرداروں کو کافر قرار دیا ہے جو مقام نبوت تک پہنچ جانے کو بھی ممکن قرار دیتے ہیں! (استغفراللہ)

حلول اور وحدت الوجود کے بعد اب وحدت الشہود کی طرف آئیے۔ ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے مقابل شیخ علاؤالدین سمنانی نے وحدت الشہود کا عقیدہ وضع کیا۔ ہندوستان میں اس کی شہرت مجدد الف ثانی امام سرہندی کے ذریعہ عام ہوئی۔ اسے "ہمہ اوست" کی بجائے "ہمہ از اوست" کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ وحدت الوجود سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی جو کچھ عالم محسوس میں ہے سب خدا ہے، حتیٰ کہ انسان بھی خدا ہے! اس کے برعکس وحدت الشہود کی رو سے کہا جاتا ہے کہ کائنات خود خدا تو نہیں لیکن اس کا ظل یا سایہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ نظریہ کہ کائنات اپنا الگ وجود نہیں رکھتی، وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں میں مشترک ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات ایک دوسرے کی ضد اور باہمی متخالف قرار دیئے جاتے ہیں اور ان کے ماننے والوں میں اکثر مباحثہ اور مجادلہ جاری رہتا ہے۔ صوفیا کے ہاں یہ دونوں نظریات مروج ہیں لیکن علمی بصیرت کے مطابق دونوں قرآنی تعلیم کے خلاف ہیں قرآن کریم کی رو سے نہ تو کائنات کی ہر شے خدا ہے اور نہ ہی انسان کا کمال ذات خداوندی میں فنا ہو جانا۔ اس قسم کے نظریات ذہن انسانی کے تراشیدہ ہیں اور اسلام میں خارجی اثرات کا نتیجہ۔ تصوف کی بنیاد اس دعویٰ پر ہے کہ مرشد کی وساطت کے بغیر خدا سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس دعویٰ کی شہادت میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کی جاتی، استعارات سے کام لیا جاتا ہے۔ مریدوں سے کہا جاتا ہے کہ کپاس کے ایک ڈھیر کو سارا دن دھوپ میں رکھ چھوڑ دو، وہ یونہی ہلکی سی گرم ہو جائے گی۔ لیکن سورج کی ان ہی شعاعوں کو آتشیں شیشہ (محدب عدسہ) میں سے گزار کر کپاس پر ڈالو تو چند لمحوں میں شعلہ بھڑک اٹھے گا۔ اگر جمال خداوندی کی شعاعوں سے تم براہ راست مستفید ہو تو تمہارے قلب میں یوں ہی خفیف سی حرارت پیدا ہو سکے گی لیکن وہ شعاعیں جب مرشد کے قلب میں سے گزر کر تمہارے سینے پر پڑیں گی تو تمہارے تن بدن میں عشق خداوندی کی آگ بھڑک اٹھے گی جو ما سوا اللہ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ [illegible]

تم سورج کی طرف دیکھو - تمہاری آنکھیں چندھیا جائیں گی - تم سورج کا مشاہدہ نہیں کر سکو گے لیکن اسی سورج کا عکس پانی کے پیالے میں دیکھو تو بہت کچھ سورج تمہارے سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے گا - کوئی آنکھ جمالِ خداوندی کی براہ راست تاب نہیں لا سکتی لیکن جب اسی جمال کو مرشد کے جمال کی وساطت سے دیکھا جائے تو نہایت سکون و سکوت سے اس کا مشاہدہ کیا جا سکے گا حضرت موسیٰ نے براہِ راست جمالِ خداوندی کا مشاہدہ کرنے کی آرزو کی اور اسے لن ترانی میں جواب مل گیا - اگر وہ یہی خواہش کسی مرشد کی وساطت سے پیش کرتے تو جلوہ خداوندی مسکراتا ہوا سامنے آ جاتا!

تصوف، محض تشبیہات اور تمثیلات کے ذریعہ لطائف کو حقائق کی طرح منوا لیتا ہے - آپ نے دیکھا کہ یہ آتشیں شیشے اور یہ پانی کے پیالے کی تشبیہات نے کس طرح ایک سادہ مسلمان کے ذہن کو بھنور میں پھنسا دیا - اور یہی وہ تصوف کا سحر ہے جس سے صدیوں سے امت کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے محض تصوراتی خوابوں کے طلسم ہوش ربا میں غرق کر رکھا ہے - یہ ہے تصوف کا زہر، جسے حسنِ عقیدت کی بنا پر تریاق سمجھا جاتا ہے، لیکن زہر تو زہر ہی ہوتا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے -

یہ واضح رہے کہ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ سے تعلق غیر قرآنی ہے - قرآن کہتا ہے: "ان سے کہو کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو جن کی حالت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کے لئے بھی کسی بھی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے" (۱۳/۱۶) عام اولیا تو ایک طرف اس باب میں اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق جن کا مقام یہ ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" - خدا کا ارشاد ہے کہ "ان سے کہو تو خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا - یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے" (۷/۱۸۸)

تصوف کے عقیدہ کی رو سے صوفیا کی وفات کے بعد ان کی ذات، ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے - اس سے ذہن لازماً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ موت سے ان حضرات کا تشخص ختم ہو جاتا ہے - یوں یہ حضرات، خود ان ہی کی اصطلاح میں فنا فی اللہ ہو جاتے لیکن نہیں! ان کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ یہ مرنے کے بعد بدستور زندہ رہتے ہیں - اس نے

کے ساتھ ان کے تعلقات اسی طرح قائم رہتے ہیں بلکہ ان کے اختیارات کی وسعتیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ انہیں قضا و قدر پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔ کائنات کا نظم و نسق ان ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس طرح خارجی کائنات میں ارباب اقتدار کا الگ گروہ ہوتا ہے اور ان کے فرائض کی نسبت سے ان کے الگ الگ عہدے اور منصب ہوتے ہیں، اسی طرح زیر زمین دنیا میں "رجال الغیب" کی ایک خاص جماعت موجود رہتی ہے۔ اس طرح غوث، قطب، ابدال وغیرہ کا نظام ہمارے تصوف کا مستقل جزو بن گیا ہے۔

تصوف میں یہ عقائد ہمہ گیر ہیں کہ مدفون حضرات اپنے عقیدت مندوں کی دعائیں سنتے ہیں، ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ان کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ عندالضرورت ان کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ اپنے مزارات پر حاضری دینے والوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کی سنتے ہیں، ان کے نذرانے وصول کرتے ہیں، ان کی منہ مانگی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ خدا کے سوا جنہیں پکارتے ہیں وہ ذرہ برابر بھی اختیار اور اقتدار نہیں رکھتے (۳۵/۱۳)۔ اس سے اگلی آیت میں ہے "اگر تم انہیں پکارو تو یہ تمہاری پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔" (۳۵/۱۴) بنظر غائر دیکھا جائے تو ایصال ثواب کا عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ہر شخص کے عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ مثال کے طور پر ایک شخص روزانہ صبح سیر کرتا ہے جس سے اس کی صحت پر نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ اس کا بھائی گھر میں بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ وہ سیر کرنے والا، ہزار چاہے کہ اس کی سیر کا جو اثر اس کی صحت پر پڑا ہے اسے کسی طرح اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دے تاکہ اس کی صحت اچھی ہو جائے، وہ ایسا کبھی نہیں کر سکے گا۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ہر فرد کو اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے، کسی دوسرے کے عمل کا کوئی نتیجہ اس کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ "مرغ کی بریانی اور آئیسکریم" مردے تک پہنچائی جا سکے!

اسلام کے ساتھ یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ جب تک یہ نظام مستحکم رہا ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی لیکن جب اس کے ماننے والوں میں کمزوری آئی تو پھر یہ قوتیں ابھر کر آگئیں۔ انہوں نے رفتہ رفتہ دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا۔

یہ سے مراد ہوتی ہے، خدا اور بندے کا نجی سا تعلق، جس کا نتیجہ فرد کی نجات ہے۔
ے انسانیت بحیثیت اجتماعیہ یا نظامِ زندگی سے واسطہ نہیں ہوتا۔ مذہب اس کی ابتدائی شکل ہوتی
اور تصوف انتہائی صورت۔

اسلام صدیوں سے مذہب کی شکل اختیار اور تصوف کا پیرہن زیب تن کئے چلا آرہا تھا
ن تصورات نے ایسی پختگی اختیار کر لی تھی کہ اس کا خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ سب
ہ کے خلاف سازش کا نتیجہ ہے۔

تصوف کی اصل و اساس اس عقیدہ پر ہے کہ علم بالحواس (عقل و فکر) قابلِ اعتماد
نہیں۔ یقینی اور قابلِ اعتماد علم وہ ہے جو براہ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے اور جسے
ف والہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صوفیوں کے خیال میں اس علم کی رو سے انسان ذاتِ
اوندی کی صرف معرفت حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کر لیتا ہے! یہ عقائد اپنی
ں کے اعتبار سے قرآن کے خلاف ہیں۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہ راست تعلق
کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں تو خدا کی کتاب موجود ہے جو حق اور باطل کا یقینی اور واحد معیار ہے۔
ی کتاب کی رو سے کشف والہام، کرامات، درود و وظائف وغیرہ کی کوئی دینی حیثیت نہیں
سب فنی چیزیں ہیں اور توہم پرستی پر مبنی۔

قرآن مجید نے علم کے دو ذرائع بتائے ہیں — ایک وہ علم جو حضرات انبیائے کرامؑ
خدا کی طرف سے براہ راست ملتا تھا۔ اس میں صاحبِ وحی کی اپنی فکری کاوش کا شائبہ
ے نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کریم علم کا دوسرا ذریعہ، فکرِ انسانی کو قرار دیتا ہے جو مطالعہ، مشاہدہ
تجربہ اور تعلیم و تدریس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ علم کا یہ دروازہ ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ قرآن
بتا ہے "تم سوچا کرو" ۳۴/۳۶ (اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی سنور گئی)
س آیت پر غور فرمائیے اور پھر سوچئے کہ قرآن کریم کی رو سے عقل و فکر کا مقام کیا ہے۔
ر غور و تدبر کی اہمیت کس قدر ہے۔ نوعِ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔
ہ اپنے ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا چلا آرہا ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن
انسانی جدوجہد کا ماحصل۔ ہزار ہا سال کی مسلسل تگ و [illegible]۔ انسان کے قلب و دماغ

کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیتا ہے
اب آئیے تصوف کے دو درس افکار پر ایک نظر ڈالیں ۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی حرارت اور روشنی سے لبریز ہے ۔ وہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا کھلا اعلان جنگ ہے جنہوں نے صدیوں تک عالم انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا ۔ قرآن کہتا ہے کہ "دنیا میں اپنا حصہ فراموش مت کرو" (پہلے) "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" اسلام کی تعلیم نہیں ۔ اسلام تو کہتا ہے کہ "از کلید دین در دنیا کشاد" لیکن جس طرح صوفی اسلام کی تعبیر فرماتے ہیں اس طرح تو اسلام اور رہبانیت میں کچھ فرق نہیں رہتا اور قرآن کہتا ہے "لا رہبانیت فی الدین" ۔ اسلام قوت، حرکت اور حرارت کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس کے برعکس تصوف ضعف و ناتوانی، بیکسی و بے بسی کا پرچار کرتا ہے ۔ علامہ اقبال تصوف کے مسلک کے بارے میں ابلیس کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ۔۔۔ پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

تصوف کا عقیدہ فریب سکوں کے لئے بڑا کارگر حربہ ہوتا ہے ۔ اس سے کشمکش حیات یا جہد زندگی ختم ہو جاتی ہے ۔ خرد کی گتھیاں سلجھا سلجھا کر تھکا ہوا ذہن اس میں بڑا سکون محسوس کرتا ہے ۔

اسلام مسلمان کے قلب و نگاہ میں انقلاب کا متقاضی ہے اور انقلاب بڑی حوصلہ طلب کشمکش صبر آزما ہمت اور جہد مسلسل چاہتا ہے ۔ اس کے برعکس تصوف بیٹھے بٹھائے فریب سکون کی "جنت" کے دروازے کھول دیتا ہے ۔

طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی (ارمغان حجاز) اسلام میں تزکیۂ نفس (ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذریعہ تعلیم کتاب و حکمت بتایا ہے نہ کہ خانقاہوں کے خلوت کدوں میں مراقبے اور چلے ۔

اسلام کی عمارت دو بنیادی ستونوں پر استوار ہے ۔ وحیٔ خداوندی (جو قرآن میں محفوظ اور مکمل ہے) اور انسانی عقل و بصیرت لہٰذا کوئی نظریہ، عقیدہ، تحریک یا مسلک جو ان ستونوں کو منہدم یا متزلزل کرنے کا موجب ہو اسلام کے خلاف اور دین کی نقیض ہوگا ۔ تصوف یہاں کیا کہتا ہے ۔ ہمارے پاس ایک کسوٹی (قرآن مجید) ہے ۔ جس پہ ہر انسان کے

خیالات و نظریات کو پرکھنا چاہیے۔ کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو اس کے قول اور فعل کو اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اسے صحیح سمجھا جائے مگر اس کے خلاف ہو تو مسترد کر دیا جائے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے اور بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ صوفیائے کرام نے اپنی کرامات کے ذریعہ شد و مد کے ساتھ اسلام پھیلایا اور ہزاروں لاکھوں افراد کو مسلمان بنایا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ان حضرات نے جس قسم کا اسلام پھیلایا اس کا اندازہ تو ان مسلمانوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے پھیلائے ہوئے اسلام کے وارث ہیں۔ یہی اسلام تو ہے جو آج اسلام کے راستے میں پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ کرامات کو قربِ الٰہی کی دلیل قرار دینے والے ذرا اس حقیقت پر غور فرمائیں کہ اگر حق کے لئے کوئی باطل ذریعہ اختیار کیا جائے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ ہو، تو حق، حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید ذریعہ اور مقصد میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

تصوف نے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا ہے کہ اس سے خدا کا صحیح مقام نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اس کے صحیح مقام کے نظروں سے اوجھل ہو جانے سے ہر شئے کی حیثیت بدل گئی ہے۔ اس سے دین میں ایسی تحریف واقع ہو گئی ہے جس کا ازالہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اسلام کی سرزمین سے اجنبی پودے کو اکھیڑ کر الگ نہ کر دیا جائے۔ اس امر بیل کو شجرِ اسلام سے الگ کرنا از بس ضروری ہے خواہ اس بیل کی شاخیں کسی صحنِ گلستان سے ابھریں۔

اگر طوطی کو کسی نے بھی نہیں سنا، جب بھی وہ کم سے کم خدا کے سامنے گواہی دے گا کہ میں نے آواز لگائی لیکن طوطی کی آواز سنائی جاتی ہے، ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ نقار خانوں کو بھی کبھی کبھی طوطی کی آواز کو سننا اور دھیان دینا پڑا ہے، ساری تاریخ ان نقار خانوں کے گھن گرج اور طوطی کی نحیف آواز کی تاریخ سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ طوطی کی آواز

باقی بر صفحہ ۳

از عبدالحفیظ خاں ؔ

گستاخِ رسول سلمان رشدی واجب القتل

علامہ امام خمینی کا جرات مندانہ یہ اعلان کہ گستاخ رسول سلمان رشدی کو قتل کردیا جائے' پوری دنیا کے لئے دھماکہ خیز ثابت ہوا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور یورپین ممالک اس اعلان پر نہ صرف چراغ پا ہیں بلکہ اپنے اقتدار اور استبداد کے گھمنڈ میں ایران سے تمام سیاسی' معاشی اور سفارتی تعلقات کو توڑنے پر متحد اور متفق ہو گئے ہیں۔ امام خمینی نے کہا ہے کہ یوروپی معاشی برادری کی جانب سے معاشی تحدیدات عائد کرنے کی دھمکیوں نے ان کے تکبر غرور اور ہٹ دھرمی پر مبنی رویہ اختیار کرنے کے موقف نے یہ اچھی طرح آشکارا کردیا ہے کہ مغربی دنیا اسلام کی مخالف اور دشمن ہے۔ اور توہین اسلام اور اہانت پیغمبر اسلام کی حمایت و سرپرستی کا رویہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے اہانت آمیز ہے۔

امام خمینی نے واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ اب پوری دنیا سے ہمارے تعلقات کی بنیاد اسلام اسلامی اقدار اور خدا اور رسول کے احترام کی اساس پر ہی استوار ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر امام خمینی نے از خود تمام دنیا سے اپنے تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ امام خمینی کا ایمان پرور جرات مندانہ اعلان جہاں اسلام کی برتری و عظمت کا اعلان ہے وہیں دینی حمیت اور غیرت ایمانی کا حامل ہے۔ یہ مسلم ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت ارتداد کے ہم معنی ہے اور کسی مرتد کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ دین اسلام کی بنیاد ہی نبیؐ کی حیات، تعلیمات اور قانون شریعت پر ہے۔ عقیدہ رسالت

ایمان کا جزء ہے۔ اس کی توقیر و احترام بھی جزو ایمان ہے۔ اس کے احترام کی نفی، تکذیب، اور اہانت تقاضہ ایمان کے مغائر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فان تابو .... لعلہم ینتھون [التوبہ ۲]

ترجمہ:۔ پھر اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکواۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (قبول اسلام) کرنے کے بعد توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے ان لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔

عہد شکنی سے مراد سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اقرار اسلام سے پھر جانا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَنْ بدّلَ دِینَہُ فاقتلوہُ۔

جو شخص اپنا دین بدل دے اسے قتل کردو۔ یہ حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے اور تمام معتبر احادیث میں موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ۔ قالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَایَحِلُّ دَمُ اِمْرِءٍ مُسْلِم الا المفارق بدِینِہِ التَّارِکُ لِلْجَمَاعَۃِ

[بخاری کتاب الدیات ابوداؤد الحکم فی من ارتداد]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا خون کسی صورت میں حلال نہیں اِلّا یہ کہ وہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور جماعت سے الگ ہو جائے۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ۔

سَمِعْتُ رسول اللہ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یقولُ لَا یَحِلُّ دَمٌ اِلَّا اَحَدٌ تَدَّ بعدَ اسْلَامِہٖ فَعَلَیْہِ الْقَتْلُ۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں اِلّا کوئی ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گیا ہو اور اس کی سزا قتل

حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک موقعہ پر جب عبداللہ بن النواحہ کو پایا تو انہوں نے اس کو قتل کردیا۔ اور فرمایا کہ یہ عبداللہ بن النواحہ پہلے مسلمان ہوچکا تھا پھر مسیلمہ کذاب کی نبوت کا دعوٰی لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تجھے قتل کردیتا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس ارتداد کی وجہ سے وہ واجب القتل ہے۔

جنوب عرب میں جن لوگوں نے ارتداد کیا تھا ان کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے عکرمہ بن ابوجہل کو روانہ کرتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ:

ومن لقیتہ من المرتدین بین عمان الی حضرموت والیمن فنکّل بہ۔

ترجمہ: عمان سے حضرموت اور یمن تک جہاں مرتدوں کو پاؤ قتل کردو۔

زید بن اسلم سے مالک نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنا دین بدلے اس کی گردن مار دو۔ امام طحاوی نے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں لکھا ہے کہ:۔

مرتد کو توبہ کا مطالبہ کرنے کی کوئی حاجت نہیں ان کے نزدیک مرتد کی حیثیت حربی کافر کی سی ہے۔ ان کو توبہ کی دعوت دیئے بغیر قتل کردیا جائے۔"

حضورؐ پر ایمان کے علاوہ آپ کا احترام وتعظیم اور جلالت شان کو ہر شک وشبہ سے بالاتر تصور کرنا جزو ایمان ہے۔ اور اس میں ادنیٰ درجہ کی کمی بھی انسان کو کفر کی حدود میں داخل کردیتی ہے۔

اس لیے فقہا نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی بابت بہت شدت برتی ہے فقہا میں علامہ سرخسی کا بہت اونچا مقام ہے فقہ اسلامی پر ان کی مشہور کتاب "المبسوط" بہت مستند کتاب ہے۔ امام طاہر بن احمد بخاری نے ان کی رائے اپنی کتاب "خلاصۃ الفتاوٰی" میں جو فقہ حنفی فتاوٰی کا معروف مرجع وماخذ ہے اس طرح نقل کی ہے۔

من شتم النبي صلى الله عليه وسلم او اهانه او عابه في امور دينه
او في شخصه او في وصف من اوصاف ذاته . سواء كان الشاتم مسلماً
ـماً او غيرها وسواء كان من اهل الكتاب او غيره
ـيا كان او حربيا سواء كان الشتم او الاهانة او العيب صادراً عنه .
ـداً او سهواً او غفلة او جداً او هزلاً فقد كفر خلوداً بحيث ان تاب
يقبل توبته ابداً لا عند الله ولا عند الناس وحكمه في الشريعة المطهرة
عند متاخري المجتهدين اجماعاً والمتقدمين القتل قطعاً .

(خلاصة الفتاوى ج صـ ۳۸۶
طاہر بن احمد بخاری بحوالہ قاموس الفقہ جلد اول .

ترجمہ (تالیف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی) جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
برا بھلا کہا ۔ آپ کی توہین کی کسی دینی یا شخصی مسئلہ میں عیب لگایا ۔ آپ کی ذات
وصاف میں سے کسی پر نکتہ چینی کی تو وہ شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم ۔ یہودی و عیسائی
یا مشرک ۔ اسلامی مملکت کی پناہ میں ہو یا کسی دشمن اسلام مملکت کی پناہ میں اور یہ
ت و گستم بالارادہ ہو یا غفلت و بھول کی وجہ سے یا مزاقاً ۔ بہر صورت وہ ہمیشہ
کے لئے کافر قرار پائے گا ۔ اور اس کی توبہ تک ناقابل قبول ہوگی ۔ نہ عند اللہ
قبول ہوگی نہ عند الناس ۔ شریعت مطہرہ میں اس کا یہ حکم فقہاء کے نزدیک اجماعی
ہے ۔ اور فقہا متقدمین بھی اسے کلیتہ " واجب القتل سمجھتے ہیں ۔ "

[افلاعتہ القاری ج ۴ ص ۳۸۶]

حدود و قصاص پر اس مسئلہ کو قیاس نہیں کیا جانا چاہیئے کیونکہ حدود کی اجرائی
دارالاسلام میں ہوتی ہے کیونکہ دارالسلام میں ہی ایسا ماحول میسر ہوتا ہے کہ جو
س کو زنا ، شراب اور منکرات سے بچا سکتا ہے ۔ ور جرائم پر حد قائم کی جا سکتی
ہے ۔ مگر اسلام کے خلاف کھلا عناد اور توہین اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں
ہرزہ سرائی ، گستاخی کا جرم ایک ایسا جرم ہے کہ جس کی وجہ سے انسان مباح
الدم ہو جاتا ہے ۔ چاہے وہ دنیا کے کسی خطہ میں ہو اس کا خون حلال ہو جاتا ہے

اور اس کا قتل واجب ہوجاتا ہے۔

قرآن و حدیث اور فقہ کی ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شخص کے لئے اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے لیکن توبہ کرنے سے عنداللہ اور عندالناس معاف بھی ہوسکتی ہے۔ مگر اہانت رسول اور رسول کی ہجو کرنا ایک ایسا ارتداد ہے جس کی سزا معذرت اور توبہ سے بھی ختم نہیں ہوتی۔ قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں سلمان رشدی کا فعل اور اس کی اشاعت کھلا ارتداد ہے۔ جس پر علامہ خمینی کا اس کو قتل کرنے کا فتویٰ عین تعلیمات اسلامی کے مطابق ہے۔ اس فتویٰ کی تائید و حمایت تمام مسلمانان عالم کو کرنا چاہیئے۔ وہ نام نہاد اسلامی ممالک جو اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات کی وجہ سے مہر بلب ہیں اور اس کی تائید پر خاموش ہیں۔ ان کا رویہ اسلامی تعلیمات کے مغائر ہے۔ آج جب کہ مغربی ممالک گستاخی رسول بلکہ حمایت پر متحد ہوگئے ہیں تو مسلم حکومتوں کے حکمرانوں کو بھی اپنا فرض پہچاننا چاہیئے۔ حمیت دینی اور غیرت ایمانی کا تقاضہ ہے کہ دشمن اسلام اور غیرت ایمانی کا تقاضہ ہے کہ دشمن اسلام اور گستاخ رسول اور اس کی حامیوں کی ترک کردیں اور تمام دشمنان اسلام کے خلاف اظہار نفرت اور اظہار برات کریں۔ اور تمام باہمی اختلافات کو نظرانداز کرکے علامہ خمینی کی حمایت میں کمربستہ ہوکر اتحاد دین و ملت کا ثبوت دیں۔ یہ دین و ملت کے وقار کا مسئلہ ہے۔

یوروپین ممالک امام خمینی کے فیصلہ پر آزادی رائے اور شرافت و تہذیب کی دہائی دے رہے ہیں۔ مگر آزادی رائے اور شرافت و تہذیب کی قدریں کسی بلند اور ارفع و اعلیٰ ہستی کی توہین و اہانت کے منافی ہیں۔ آزادئ رائے کوئی بے لگام آزادی کا نام تو نہیں ہے کہ پوری ایک ملت کی دل آزاری و توہین کی بھی آزادی دی جائے۔

اظہار رائے کی آزادی کے اگر یہی تقاضے ہیں تو یوروپی ممالک اور ان کے ہم نواؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ملکی قوانین کو کالعدم کردیں کہ ان قوانین

بہرصورت چوروں، ڈاکوؤں اور اسمگلروں اور ہر بدعنوانی کرنے
کی آزادی میں خلل پیدا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح بین الاقوامی قوانین دہشتگردوں
بالکل ختم کردینا چاہیئے کہ وہ بہت سے لوگوں کو بہت کچھ کرنے اور بہت کچھ
نے سے روکتے ہیں۔

ایک مجرم جس نے دنیا کی ایک تہائی آبادی کی دل آزاری کی ہے اس کو
اور تہذیب کا سبق سکھانے کے بجائے اس کی پشت پناہی کی جارہی ہے
تہائی باعث شرم ہے۔ ان اسلام دشمن قوتوں کو تاریخ سے سبق لینا چاہئے
طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر انسانیت اور اخلاق کو پامال کرنے
قوتیں بہت دیر تک اس زمین پر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکیں ہیں۔ انہیں
رنا چاہئے کہ ان کا اقتدار کس کا دیا ہوا ہے۔ دینے والا چھین بھی سکتا ہے
روں کے لئے نہیں خود اپنی بھلائی کے لئے انہیں شرافت اور انسانیت کی لاج
چاہیئے۔ اور ایک عظیم المرتبت شخصیت کی توہین اور اہانت اور اس کی حمایت
اپنے آپ کو بچانا چاہیئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل کیوں ہے
کہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے حوالوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرتد
بہ کرکے اسلام کی طرف رجوع ہو جائے تو اس کی سزا معاف کی جا سکتی ہے۔ مگر
نے رسول اور رسول کی توہین و اہانت کرنے والے کی سزا تو بہ سے بھی معاف
ہو سکتی بلکہ وہ ہر حالت میں واجب القتل ہے۔ وہ مباح الدم ہو جاتا
دنیا کی کوئی قوت ... کہ جب بھی کوئی مسلمان اس پر
پالے اس کو قتل کر دے۔ جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ابن النواحہ کو قابو
تے ہی قتل کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اہانت رسولؐ کا جرم اتنا بڑا کیوں ہے؟
س کی سزا صرف اور صرف قتل ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے رسالت اور مقام
بالت کی اہمیت کا ادراک ضروری ہے۔ یہ کائنات خالق کائنات کی تخلیق ہے۔

ہس کا خالق، حاکم، مالک، اور متصرف ہے۔ اس عظیم ہستی نے اپنی اس وسیع
یں انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات پیدا کیا اور حکم دیا کہ وہ اس کی عبادت
عت کرے۔ جب ہی وہ انسانیت کے شرف سے مشرف ہو سکتا ہے۔
ہ اس حکم سے روگردانی کرے تو خدا کی نافرمانی کی پاداش میں خدا کی سزا کا
ق قرار پائے گا۔ اپنے اس حکم و فرمان کی آگاہی کے لئے اس نے اپنے رسول اور
بروں کو مبعوث کیا کہ وہ انسانوں کو ہدایت کا راستہ بتادیں اور گمراہی کے
تہ سے متنبہ کردیں۔ جو شخص رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرکے اللہ کی حکومت
سائے میں آجاتا ہے۔ گویا اس نے حق کو اپنالیا۔ اگر وہ اس کامل حق کے سائے
مت سے نکل بھاگتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ناحق و باطل کی
بیوں کو دوبارہ اختیار کرلیا۔ اور ایسے ناشکرے اور ناحق شناس کی سزا قتل
ہو سکتی ہے۔ دوسرے اللہ کے رسول کی رسالت کا اقرار گویا رسول کی عظمت
رار ہے۔ اگر وہ اس عظمت کا انکاری ہوجائے یا اس عظمت کی توہین پر
ے تو یہ اس سے بڑا جرم ہے کہ اس نے عظمت کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس
مت کی توہین بھی کی تو یہ توہین خباثت ذہنی کی علامت ہے۔ اور ایسے بدباطن
ر ے اور ناشکرے کی سزا قتل اور صرف قتل ہی ہو سکتی ہے۔ ایسے
ے کیڑے کو مسل دینا ہی چاہیئے۔ ورنہ وہ تمام دنیا میں اپنی گندگی پھیلا کر
ظمت و احترام کی دنیا تہ و بالا ہو جائے گی۔

(ماہنامہ رہ گزر، ضمیمہ مارچ ۸۹ سے ماخوذ)

ٹم صـ۲

۔ بہروں نے بھی سنا اور نقار خانوں میں بھی اس کی رسید دی ہے اور وہ آواز
تہ "صدا بہ صحرا" نہیں ثابت ہوئی اسی توقع پر ہم مختلف مقامات پر
جلسے کرتے ہیں، اور یہاں بھی آئے ہیں۔

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی ۔۔

مفتی محمد تقی عثمانی

ضیاء شہید رح

[ذیل کا مضمون حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے لائق فرزند نے لکھا ہے جو ایک باوقار عالم کی حیثیت سے ضیاء الحق صاحب سے ملتے اور نفاذ شریعت کے سلسلہ میں مشورے دیتے رہے ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ادارہ]

آج جب ادارے کی تکمیل کے لئے بیٹھا ہوں تو پچھلے گیارہ سال کے واقعات کی اتنی بہت سی تصویریں نگاہ کے سامنے آگئی ہیں کہ انہیں ایک مربوط تحریر میں منضبط کرنا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ اس لئے میں آغاز ہی میں یہ معذرت کر لوں کہ ؎

دریں کہ کتابِ پریشاں نہ بینی ترتیب
عجب مدار کہ چوں حالِ من پریشاں است

پچھلے گیارہ سال میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے اور صدر مرحوم کے بارے میں بہت سے لوگوں کی رائے میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں، وہی لوگ جو ابتدا میں انھیں فرشتہ نہیں کہتے اور سمجھتے تھے، ان ہی زبان سے بعد میں ان کے خلاف بڑے سخت اور ثقیل الفاظ بھی سنے گئے، بہت سے وہ لوگ جو شروع میں ان کے اسلامی مشن کی وجہ سے ان کے پرزور حامی تھے، کچھ عرصہ کے بعد ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے یہاں تک کہ انھیں اسلام دشمن یا منافق تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

مجھے ذاتی طور پر مردم شناسی کا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن حالات کے اِن گیارہ سال نشیب و فراز میں صدرِ مرحوم کے بارے میں میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں ان کے بارے میں روزِ اول جو رائے رکھتا تھا آخری دن تک اس میں کوئی قابلِ ذکر تغیر نہیں آیا۔ میں نے انہیں پہلے دن فرشتہ معصوم یا خلیفہ راشد سمجھا تھا، نہ آخر میں (خدانخواستہ) اسلام دشمن یا منافق قرار دینے کے کوئی داعیہ دل میں پیدا ہوا۔ ہاں انتخابات پر یقین، اور سوءِ عہدی یقین تھا کہ ماضی میں ہم نے جتنے حکمرانوں کے تجربے کئے ہیں۔ اور بظاہر حالات آئندہ کے لئے جو لوگ سامنے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ اپنا اصلاحی روح دینی جذبہ خود اپنی ذاتی زندگی کے حالات کے لحاظ سے اتنے قابلِ قدر ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کی شخصیت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر ان کے ساتھ نفاذِ اسلام کے مشن میں بھرپور تعاون کرنا چاہئے۔ پاکستان ہی میں نہیں، جکارتا سے کر رباط تک عالمِ اسلام کے دوسرے ملکوں میں بھی مجھے کوئی حکمراں ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اسلام پر ایسا غیر متزلزل ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق اور اسلام کی سربلندی کا ایسا ولولہ رکھتا ہو میرے ناچیز مطالعے کی حد تک وہ عالمِ اسلام کے حکمرانوں میں اس وقت واحد انسان تھے جن میں نفاذ شریعت کو لے کر آگے بڑھنے کا ذاتی جذبہ بھی تھا اور جو اس بات کی صلاحیت بھی رکھتے تھے کہ اس مقصد کے لئے وقت کے چلے ہوئے نعروں سے ٹکر لے سکیں اور واقعتہً انھوں نے بہت سے معاملات میں یہ ٹکر لے کر بھی دکھائی اور بہت سے وہ کام بھی کر دکھائے جو مغربی افکار سے مرعوب ذہنوں کے لحاظ سے اس دور میں ناممکن سمجھے جاتے تھے۔

صدرِ مرحوم کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ لادینی طاقتیں تو ان کی اس لئے دشمن تھیں کہ وہ انھیں اپنے عزائم کے راہ میں ایک زبردست کانٹا نظر آتے تھے، بعض سیاسی حلقے اس لئے ان کے مخالف تھے کہ ان کی وجہ سے انھیں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا کریڈٹ اپنے ہاتھ سے چھن جانے کا اندیشہ تھا، تیسری طرف وہ دیندار حلقے تھے جنھیں ان کی نیت سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ لیکن ان کے منہ سے نفاذ اسلام کا لفظ سننے کے

کے بعد وہ اس بات کے لئے بے تاب تھے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی تیزی
ے ساتھ ہو جس کے اثرات معاشرے پر بلا تاخیر نظر آئیں اور چونکہ یہ پیش قدمی ان کی
ست رفتار تھی اس لئے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں اور ان کی نگاہ مرحوم
ے کئے ہوئے اچھے کاموں کے بجائے ان کاموں پر زیادہ رہنے لگی جو وہ نہیں کر سکے
ں تک کہ بالآخر وہ اتنے مایوس ہوئے کہ انھوں نے سرے سے یہ تسلیم کرنے ہی سے
ر کر دیا کہ صدر مرحوم نے اسلام کی کوئی خدمت کی ہے یا کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح
وہ بھی پہلے اور دوسرے طبقے ہی کے ساتھ ہم آواز ہو گئے۔

ایک چوتھا طبقہ بھی تھا جو اس بات کی تکلیف ضرور محسوس کرتا تھا کہ نفاذِ اسلام کی
ب پیش قدمی سست رفتار اور ناکافی ہے۔ لیکن ساتھ ہی صدر مرحوم کے عہد میں جو اول
ر کام ہوئے ہیں ان کی نفی کا بھی قائل نہ تھا اور اس بات کو بھی شدت کے ساتھ محسوس
تا تھا کہ بہت سے قابلِ تنقید امور کے باوجود اس وقت نفاذِ اسلام کے مشن کے حق
ں بظاہر حالات کوئی متبادل شخصیت سامنے نہیں ہے جو اتنا کام بھی کر سکے، لہٰذا وہ
متا تھا کہ اصلاحِ حال کی بھرپور کوششوں کے ساتھ ساتھ صدر ضیاء الحق کی ذات کو بسا
یمت سمجھنا چاہئے اور بحیثیتِ مجموعی نفاذِ اسلام کے مشن میں ان کی تائید و حمایت سے
تھ نہیں کھینچنا چاہئے لیکن یہی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی یہ حلقہ پہلے تین طبقات کی
ئی ہوئی فضا سے اتنا مرعوب بھی تھا کہ صدر مرحوم کے اچھے کارناموں کی اس قدر کھل
حمایت اور تعریف نہ کر سکا جس کے وہ مستحق تھے اس کی طرف سے بھی ان کے اچھے کاموں کی
ئید و حمایت بڑے تحفظات کے ساتھ ہوئی اور اس میں بھی تنقید کا پہلو اکثر و بیشتر
لب رہا۔

اس صورتِ حال کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ شہید مرحوم کے کارنامے پس منظر میں چلے
ئے۔ اور قابلِ تنقید امور زیادہ ابھر کر سامنے آئے، یہاں تک کہ یہ جملے زبان زدِ
سام ہو گئے کہ "گیارہ سال میں کچھ نہیں ہوا" "اسلام کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا ہے"
سلام کو صرف اقتدار کو طول دینے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
لیکن اسی ماحول میں جب ۱۷ اگست کو یک بیک صدر مرحوم کا حادثۂ شہادت

باتیں تھیں؟ یا تو یہ ایک ایسا آئینہ صاف تھا جس کے بارے میں قوم نے سوچا!
تھا کہ وہ چاہے طبقات میں سے آخری رو طبقے جو اسلام کے لئے واقعۃً مخلص
تھے، اور جن کی ملک کے باشعور عوام میں اکثریت ہے جب انہوں نے صدر مرحوم
کے اس طرح اچانک منظر سے غائب ہو جانے کے بعد گرد و پیش پر نظر ڈالی
تو ان میں یک بیک یہ جانکاہ احساس ہوا کہ انہوں نے کیا چیز کھو دی ہے! اس
احساس کو ایک ایک کرکے وہ اچھے کام یاد آئے جو تنقید کے زور و شور میں گم
تھے، اور احساس ہوا کہ جن باتوں کو ہم اب تک غیر اہم، ناکافی بلکہ کالعدم سمجھ
رہے تھے، اب ہمیں ان ہی کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اس احساس نے قوم کے
باشعور مسلمان کو ایک ناقابلِ بیان غم سے، اور زبردست تشویش میں مبتلا
یہ صدمہ صدرِ مرحوم کے ساتھ عقیدت و محبت کے طوفان میں تبدیل ہو گیا،
ملک کی اس "خاموش اکثریت" نے مرحوم کی نمازِ جنازہ کے موقع پر وہ
فقید المثال نظارہ پیش کیا کہ شاید مرگلہ کی وادی نے پہلے کبھی ایسا منظر
نہ دیکھا ہوگا۔

یہ درست ہے کہ پچھلے گیارہ سال میں نفاذِ اسلام کی طرف پیش قدمی
سست رفتار تھی، یہ بھی درست ہے کہ اس زمانے میں بہت سی توقعات پوری
نہ ہوئیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں بہت سے قابلِ تنقید امور بھی پیش آئے
جن پر البلاغ کے انہی صفحات میں مفصل تنقید کی لیکن میرے نزدیک یہ
سراسر ظلم اور بڑے درجے کی ناانصافی ہے کہ شہید مرحوم نے اس زمانے
اسلام کی نمائش کے سوا نفاذِ اسلام کی سمت میں کوئی کام نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ گیارہ سال کے دوران نفاذِ اسلام و شریعت
سلسلے میں جتنا کام اللہ تعالیٰ نے شہید مرحوم کے ہاتھوں کرایا، وہ اس سے پہلے
تیس سال میں نہیں ہوا تھا۔ اور نفاذِ شریعت کے سلسلے میں ان گیارہ سال کو
پلڑے میں اور پہلے کے تیس سال کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً ان گیارہ
سال کا پلڑا بھاری رہے گا۔ شہید مرحوم کے دور میں جو قابلِ تعریف کام،

ان میں سے بہت سے کام ایسے ہیں جن کا عام لوگوں کو آج تک علم نہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کی اہمیت کا کما حقہ احساس نہیں لیکن انشاءاللہ مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے۔ یہاں خاص طور پر میں چند اہم کارناموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا مقصد مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کو ان کی اہمیت کا کما حقہ احساس ہو اور وہ آئندہ ان کے بقاء و تحفظ اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکیں۔

(۱) یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ صدر مرحوم کے زمانے میں اسلام اور شعائر اسلام کی عظمت و اہمیت کا ایک عام شعور پیدا ہوا۔ پہلے اسلام اور اسلامی شعائر سے عملی وابستگی رکھنے والوں کو قدم قدم پر تحت شکنی کا سامنا کرنا پڑتا تھا انہیں نشانہ استہزاء بنایا جاتا تھا۔ اور خاص طور پر سرکاری حلقوں میں شعائر اسلام کو عملاً فرسودگی اور دقیانوسیت کی علامت قرار دے لیا گیا تھا اور انگریزوں کی پیدا کردہ وہ ذہنی فضا نہ صرف برقرار تھی بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جس کے تحت اسلام کا نام لینے والے یا اس کے کسی شعار پر عمل کرنے والے کو معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جائے اور اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔

شہید مرحوم کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی مسلسل جدوجہد سے اس فضا میں نمایاں تبدیلی پیدا کی اور وہ فضا بنائی جس میں اسلام اور شعائر اسلام سے وابستگی کو موجب عزت و عظمت کا سبب اور سرمایہ فخر و ناز سمجھا جائے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے راستے کی رکاوٹیں دور ہوئیں جو پہلے سے اسلام کے ساتھ عملی وابستگی رکھتے تھے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب ہوئی۔

اندرون ملک کے علاوہ عالمی برادری میں بھی شہید مرحوم نے اسلام کا کلمہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ ڈٹ کر پیش کیا، وہ تاریخ کے واحد حکمران تھے جنہوں نے جنرل اسمبلی میں اپنی تقریر کا آغاز تلاوت قرآن سے کرنے کا اعزاز کیا اور اس

طرح اس عالمی پلیٹ فارم سے قرآن کریم کا پیغام پیش کیا ۔ گویا جیسے دہریہ ملک میں بھی انہوں نے تلاوت قرآن ہی کو اپنی تقریر کی بنیاد بنایا ۔

(۲) ملک میں شراب جیسی ام الخبائث کا آزادانہ استعمال کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی ۔ صدر سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی وزارت علیا کے دور میں صوبہ سرحد کے اندر شراب کی ممانعت کا قانون نافذ کیا ۔ پھر بھٹو صاحب مرحوم نے اپنے آخری دور میں پورے ملک میں شراب کی ممانعت کا قانون جاری کیا ۔ یہ دونوں قانون شراب بندی کے سلسلے میں بلاشبہ بڑے لائق ستائش تھے ۔ لیکن ان دونوں قوانین میں شراب کی ممانعت صرف مسلمانوں کے لئے تھی ۔ غیر مسلم اس ممانعت سے مستثنیٰ تھے اور شراب نوشی کی سزا بھی شریعت کے مطابق نہیں تھی ۔

اگرچہ ان قوانین کے بعد ملک میں پائے جانے والے کھلے شراب خانے بند ہو گئے تھے ، لیکن غیر مسلموں کے استثنا کی وجہ سے ایک وسیع چور دروازہ کھلا تھا ۔ غیر مسلموں کے بہانے شراب کا استعمال عام تھا بلکہ ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ لوگوں نے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کر کے شراب حاصل کی ، والعیاذ باللہ العظیم ۔

صدر مرحوم نے ۱۹۷۹ء میں ممانعت شراب کا جو آرڈیننس جاری کیا اس میں غیر مسلموں کے لئے بھی شراب کی ممانعت کر کے یہ چور دروازہ بھی بند کر دیا گیا اور شراب نوشی کی سزا بھی شریعت کے مطابق مقرر کر دی گئی ۔

اس آرڈیننس کے بعد شراب کے استعمال پر موثر پابندی عائد ہوئی اور اس گناہ عظیم کے بے دریغ ارتکاب پر موثر بریک لگا ، خاص طور سے فوج کے حلقوں میں ، جہاں شراب نوشی ایک عام وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے ۔ وہاں اس اقدام نے ایک انقلاب برپا کر دیا جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے ۔

غیر مسلموں کو شراب بندی پر مطمئن کرنا خاصا دشوار کام تھا ، لیکن صدر مرحوم نے بڑی حکمت کے ساتھ غیر مسلم اقلیتوں کو اس پر راضی کیا جس کے نتیجہ میں ان کی طرف سے کوئی بڑی مخالفت پیش نہیں آئی ۔

(۳) پھر سب سے بڑی دشواری پی آئی اے کی بین الاقوامی پروازوں میں شراب بند

کے سلسلے میں پیش آئی ۔ حکومت اور ایرلائنز کے ذمہ داروں میں تقریباً ہر شخص اس اقدام کے عواقب سے خوفزدہ تھا، کہا یہ جاتا تھا کہ بین الاقوامی پروازوں میں شراب کی سپلائی بند کرنے سے ایرلائنز کو ناقابل تلافی خسارے کا اندیشہ ہے سعودی ایرلائنز کی مثال پیش کی جاتی یہ کہا جاتا کہ وہ ایک امیر ملک ہے جو اس خسارے کو برداشت کرسکتا ہے ۔ لیکن پاکستان اس کا تحمل نہیں کرسکتا۔ مگر صدر مرحوم اس اعداد و شمار سے بنائی ہوئی اس ڈراؤنی فضا سے مرعوب نہیں ہوئے اور پوری جرات کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر "پی آئی اے" کی عالمی پروازوں میں بھی شراب بند کرنے کے احکام جاری کردیئے ۔ اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس اقدام کے نتیجے میں ایرلائنز کو نہ صرف یہ کہ کوئی خسارہ نہیں ہوا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ نفع ہوا ۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری ایرلائنز بھی ام الخبائث سے پاک ہوگئی ۔

(۴) ۱۹۷۹ء سے پہلے تک انگریز کی پیدا کردہ صورت حال برقرار تھی کہ زنا کاری جیسا گھناؤنا گناہ اگر باہمی رضامندی سے کیا جائے تو وہ کوئی جرم نہیں تھا ۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم قرار دیتا تھا اور اس میں بھی اگر ملزم عدالت کے ذہن میں یہ شبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے کہ شاید اس بدکاری کے ارتکاب میں عورت کی مرضی شامل ہو تو وہ جرم سے بری ہوجایا کرتا تھا یہ صورت حال ایک مسلمان کہلانے والے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ایسا ٹیکہ تھی کہ الفاظ اس کی شناعت کو بیان کرنے سے عاجز ہیں۔

شہید مرحوم جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں پہلی بار اس بدکاری اور اس کے مقدمات قانوناً جرم قرار دیا گیا اور اس پر شرعی سزائیں مقرر کی گئیں۔ زنا کاری کی حد شرعی (یعنی سو کوڑوں، اور سنگساری) کو بطور قانون نافذ کیا گیا۔ چونکہ مذکورہ حد شرعی کا معیار ثبوت انتہائی سخت ہے، اس لئے حد تو شاذ و نادر ہی کہیں جاری ہوسکتی ہے، لیکن قانون میں جہاں حد کی شرائط پوری نہ ہوں وہاں سخت تعزیری سزائیں مقرر کی گئیں جن پر اب عدالتیں عمل کررہی ہیں۔

۵ . صدر مرحوم ہی کے زمانے میں ملک میں پہلی بار حدود شرعیہ کو بطور قانون نافذ کیا گیا

یہ درست ہے کہ اس قانون کے نفاذ کے بعد اب تک کسی مجرم پر کوئی حد جاری نہیں ہوئی جس کی بنا پر بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ملک میں حدود شرعیہ نافذ نہیں ہیں یا اگر ہیں تو صرف نچلی عدالتوں کے لئے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں پر حدود شرعیہ کا قانون لاگو نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک حد جاری نہ ہونے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پولیس تفتیش جرائم اور عدالتی طریق کار میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اکثر [illegible] تفتیش صحیح طور پر نہیں ہو پاتی اور بعض مقدمات میں عدالتی کارروائی [illegible] رہ جاتی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حدود شرعیہ کے اجراء کے لئے شریعت نے شرائط اتنی کڑی مقرر کی ہیں کہ وہ شاذ و نادر مقدمات میں پوری ہو پاتی ہیں۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد سے جرائم متعلقہ حدود کی حد تک ملک کا قانون بلاشبہ اسلامی ہو چکا ہے۔ اور وہ صرف نچلی عدالتوں پر نہیں مجسٹریٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک ہر عدالت پر واجب العمل ہے بلکہ شروع میں فوجی عدالتیں اور فوجی مقدمات اس سے مستثنیٰ تھے۔ اب تمام فوجی عدالتوں کو بھی اس کا پابند کر دیا گیا ہے۔

چونکہ مذکورہ بالا خامیوں کی بنا پر اب تک کسی مجرم پر کوئی حد جاری نہیں ہوئی۔ اس لئے اس قانون کے اثرات بلاشبہ معاشرے پر ظاہر نہیں ہو سکے اور اس سلسلے میں عوام کو حکومت سے جو شکایت رہی ہے وہ بالکل بجا اور برحق ہے۔ لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ جس فضا میں دنیا نے حدود شرعیہ کے خلاف پروپیگنڈا کر کے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہاں صدر مرحوم نے مخالف پروپیگنڈے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالا [illegible] قوانین کو نافذ کر کے ملک میں پھیلی ہوئی اس نظریاتی بحث کو ختم کر دیا کہ حدود شرعیہ اس دور میں واجب العمل ہیں یا نہیں؟

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

تحریر قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ

وزارت تجارت میں کام کرتے ہوئے مجھے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ جب
کشمیر میں آزادی کی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی جہالاپیدا ہو کر سکھوں کی ریاست میں
مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ماں جی اور دوسرے عزیز جموں سے جان
بچا کر سیالکوٹ اٹھ آئے اب مجھے کراچی میں مکان کی فوری ضرورت پڑ گئی تاکہ انہیں
اپنے پاس لے آؤں۔

تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کے بعد مجھے جواہر لال نہرو روڈ پر (جو اب قائداعظم
کے مزار کے سامنے ہے) ایک مکان کا نچلا آدھا حصہ کرائے پر مل گیا۔ اوپر والی
منزل میں ہندو مالک مکان خود رہتا تھا۔ اس نے اپنا خاندان اور مال اسباب تو
بھارت میں بھیج دیا تھا اور اب مکان اور دکان کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے
انتظار میں یہاں رکا ہوا تھا۔ ساٹھ ستر برس کا یہ شخص بڑا سخت گیر مالک مکان
ثابت ہوا۔ ایک تو اس نے تین چار کمروں کا کرایہ اتنا لیا کہ اس میں میری آدھی
تنخواہ صاف نکل جاتی تھی۔ دوسرے وہ بجلی اور پانی کے استعمال پر کڑی نگرانی
رکھتا تھا۔ آدھی رات کو بھی ضرورتاً کسی کمرے کی بتی جلائی جائے تو سوتے ہوئے بھی
مکان کی چھت میں فوراً بیدار ہو جاتی تھی، اور وہ واویلا مچانا شروع کر دیتا تھا
"بتی بند کرو، بتی بند کرو۔ بجلی مفت نہیں ملتی۔ ساری ساری رات جلا کے تم نے کیا
ہے" ایک روز مالک مکان کہیں سے گھوم کر واپس گھر آیا تو ماں جی برآمدے میں
بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ماں جی کو بے نقط سنانی شروع کر دیں
کہ جاتے ہوئے تو نلکا بند کر کے گیا تھا، میری غیر حاضری میں پانی کھول کر نہانا کہاں جائز ہے۔ ماں
جی نے ہزار سمجھایا کہ انہوں نے نلکا نہیں کھولا، بلکہ صبح سے اپنے لئے پانی کی بالٹی بھر
کر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس شریف آدمی کو بالکل یقین نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کے
بدذات فریب اور مکر پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔

انتہی

انہی دنوں کراچی میں بلا سا ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کچھ سامان نکال باہر کر ہمارے مکان مالک نے ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے [illegible] تو نقدی بھی لٹ جائے گی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ یہ پونجی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لئے لے آیا۔ وہ روپے گن کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن ماں جی کو دس تک کے بعد گنتی ہی نہ آتی تھی۔ اس لئے مجھے سامنے بٹھا کر اس نے ڈھائی لاکھ روپیہ گنا اور اسے ایک چمڑے کی تھیلی میں تالہ لگا کر ماں جی کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

ماں جی نے اس کی امانت کی بڑی رکھوالی کی۔ رات کو وہ اس تھیلی کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ نماز کے لئے بھی وہ اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن و امان قائم ہو گیا۔ بڈھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دوبارہ گنا۔ رسید مجھے لوٹائی اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا۔

میرا خیال تھا ہماری خدمت گزاری کے عوض مالک مکان بجلی اور پانی کے سلسلے میں شاید اب ہمارے ساتھ کسی نرمی کا برتاؤ دکھائے گا لیکن ایسا خیال است و محال است و جنوں۔ اس کی وہی امانت کل کل بدستور جاری رہی۔ کئی بار تو وہ بجلی کا مین سوئچ سر شام ہی بجھا کر بیٹھ جاتا۔ اور ہم موم بتی جلا کر اپنا کام چلاتے تھے رات کو پنکھا چلا کر سونا تو بڑی دور کی بات تھی۔ ایک دو بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اس نامعقول بڈھے سے اس بارے میں جھگڑا کروں۔ لیکن ماں جی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ بے چارا دکھی ہے۔ بے گھر ہو کر بھٹک رہا ہے۔ اس وقت اس کا دل بالکل نہیں دکھانا چاہئے۔

مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا۔ جسے اس نے سندھی زبان میں پاکستان کے خلاف چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرہ ماں جی کی رکھوالی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ بڑی بے تکلفی سے اسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ

ہو

ہو کر جب بڈھا گھر واپس لوٹتا تو ہاں میں اکثر اسے چپلیں یا شربت بنا دیتی تھیں اپنے
تنے ہوئے کو چھوڑ کر اوپر چلا جاتا تھا اور تازہ دم ہو کر پھر ہیں غسل اور
نے سے محروم کرنے کے عمل میں معروف ہو جاتا تھا۔

ایک روز چندریگر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں
ان کے دفتر میں پڑی ہوئی سب فائلیں لے کر ان کے گھر آجاؤں۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم
نہ تھا۔ جب میں نے ان سے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بڑی حیرت سے بولے "تعجب ہے تمہیں
اپنے منسٹر کا گھر تک معلوم نہیں؟"

میں اس بات کا کیا جواب دیتا؟ مجھے اپنے یا دوسرے وزیروں کے گھر اس وقت معلوم
نہ معلوم تھے، نہ کبھی بعد میں معلوم کرنے کا شوق چرایا ہے۔

چندریگر صاحب کے دفتر میں تیس چالیس فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ میں نے
انہیں سمیٹ کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا اور وزیر صاحب کے بنگلے کی راہ لی۔ کوٹھی پر پولیس
کا پہرہ تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اندر جانے سے روک دیا۔ کیونکہ وزیروں کی کوٹھیوں
کے اندر صرف موٹر کاروں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

چندریگر صاحب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سردار عبدالرب نشتر
بھی تشریف فرما تھے۔

"آپ سٹاف کار میں کیوں نہیں آئے؟" چندریگر صاحب نے پوچھا۔

"سٹاف کار فارغ نہ تھی" میں نے جواب دیا۔

چندریگر صاحب نے ایک کے بعد دیگرے دو تین افسروں کے نام لئے اور بولے "ہاں
ان ہی میں سے کسی کے بچوں کو کلفٹن کی سیر کرانے گئی ہو گی۔"

کسی وجہ سے چندریگر صاحب مجھے مسٹر سوہاب کہا کرتے تھے۔ انھوں نے نشتر صاحب سے
میرا تعارف یوں کرایا "یہ میرے انڈر سیکرٹری مسٹر سوہاب ہیں، جو اپنے وزیر کا گھر
تک نہیں جانتے۔"

"سوہاب آپ کا تخلص ہے؟" نشتر صاحب نے دلچسپی کے انداز میں پوچھا۔
میں نے انہیں اپنا پورا نام بتایا، تو نشتر صاحب چند ثانیے سکینڈ کو کچھ معصوم سے مجھے

بولے "کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں ؟" مجھے اس بات سے کس قدر شادمانی ہوئی بتا نہیں سکتا کہ اس سے پہلے مجھے ان کی نیاز مندی کا شرف حاصل نہیں تھا۔ انھوں نے میرے سروس کیریئر کے متعلق پے در پے چند سوال پوچھے۔ جب قحط بنگال کی بات آئی تو وہ یکایک چونکے اور فرمایا " ہاں، ہاں، خوب یاد آیا۔ ایک بار حسین شہید سہروردی نے آپ کی کچھ مزے کی باتیں سنائی تھیں۔"

چندریگر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے کامرس، ورکس اور انڈسٹریز کو ڈیڑھ سو فائلیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کر کے رکھ دیں تو نشتر صاحب بھی فارغ ہو کر چلنے کو تیار تھے۔ انھوں نے ازراہِ نوازش مجھے اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیش کش کی۔

راستے میں ایک مقام پر کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لادے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: "یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا اثاثہ سمیٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچے ہیں اس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

نشتر صاحب کی تفننِ طبع کے لئے میں نے انہیں ہندو لینڈ لارڈ کے کچھ لطیفے سنائے تو وہ حیرت سے بولے "آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں؟ لینڈ لارڈ کیا کرایہ وصول کرتا ہے؟"

"تقریباً آدھی تنخواہ۔" میں نے بتایا۔

"سرکاری مکان کیوں نہیں ملا؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے تحلیل صاحب کی مجبوریاں اور معذوریاں بیان کیں۔ تو وہ خاموش ہو گئے دو تین دن بعد نشتر صاحب کا پی۔ اے میرے دفتر میں آیا اور لارنس روڈ پر نوشیروان جی مہتہ بلاک کے ایک فلاٹ کا الاٹمنٹ آرڈر میرے حوالے کر گیا۔ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ فلیٹ انھوں نے میرے لئے کس طرح حاصل کیا لیکن اس وقت اس گھر کا ملنا میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اگلے جہاں میں بھی خوش رکھے۔

وہاں ہمارے فلیٹ میں دو کمرے، بیڈ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بنا اتفاقات اس میں ہم تیس پینتیس لوگ گزارہ کرتے تھے۔ بہت سے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھارت اور کشمیر سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ رہے تھے۔ سب کے سب انتہائی خستہ حالی اور درماندگی کا شکار تھے۔ کوئی پاپیادہ قافلوں کے ساتھ مہینوں کے سفر کے بعد پاکستان پہنچا تھا۔ کوئی ان گاڑیوں پر سوار تھا جنہیں جا بجا روک کر لوٹا مارا جاتا تھا۔ کوئی طویل عرصے تک مہاجر کیمپوں کی دلدل میں دھنسا رہا تھا۔ کسی کو کپڑوں کی حاجت تھی کسی کو علاج معالجے کی ضرورت تھی۔ اور زندگی کے ساتھ از سرِ نو ناطہ جوڑنے کے لئے سب ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک روز میں نے اپنا بٹوہ کھولا تو اس میں فقط سولہ روپے موجود تھے۔ مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی کیونکہ ابھی پورا مہینہ نہیں ہوا تھا۔ اور اگلی تنخواہ ملنے میں ابھی آٹھ دس روز باقی تھے۔

اس زمانے میں میرے پاس کوئی بنک بیلنس نہ تھا بلکہ اس وقت تک میں نے سرے سے کوئی بینک اکاؤنٹ ہی نہیں کھولا تھا۔ بہار، بنگال، اور اڑیسہ میں میرا قاعدہ تھا کہ پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ نقد وصول کرتا تھا۔ کچھ پیسے ماں جی کو جموں بھیج دیتا تھا۔ اور باقی رقم مہینے کے آخر تک ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اب جو میں نے دیکھا کہ گھر میں دو ڈھائی درجن مہمان اور بٹوے میں صرف سولہ روپے موجود ہیں تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میرا واحد اثاثہ اوریئنٹل لائف انشورنس کمپنی کی ایک انشورنس پالیسی تھی جو چند سال قبل میں نے بھاگلپور میں خریدی تھی۔ انشورنس ایجنٹ مشہور کانگریسی لیڈر [اور بعد میں بھارت کے پہلے صدر] ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ جو پالیسیاں اس کے ذریعے لی جاتی تھیں، وہ ان پر تحفتاً اپنے والد کے آٹوگراف کا ٹکٹ بھی ضرور چسپاں کیا کرتا تھا۔ میں اپنی پالیسی لے کر کراچی اوریئنٹل انشورنس کمپنی کے دفتر گیا اور منیجر سے کہا کہ واجب الادا رقم وصول کر کے میں بیمہ پالیسی سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔ ہندو منیجر کانگریسی لیڈروں کا پرستار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا آٹوگراف دیکھ کر وہ فرطِ عقیدت سے بوکھلا گیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اس آٹوگراف کی وجہ سے پالیسی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ تیس برس بعد جب یہ پالیسی واجب ہوگی تو اپنے آٹوگراف کی وجہ سے اس کا شمار بیش بہا نوادرات میں ہوگا اور یقینی طور پر اس

اصلی قیمت اس کی عرضی قیمت سے کئی گنا زیادہ بیٹھے گی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بیمہ پالیسی سنبھال کر اپنے پاس رکھوں اور اس سے دست برداری کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے منیجر کی کاروباری فراست کی تعریف کی، لیکن دست برداری کے ارادے پر مستقل مزاجی سے اڑا رہا۔ پھر مزید دو کپ کے بعد منیجر نے حساب جوڑا اور پالیسی واپس لے کر مجھے ہزار سات سو روپئے ادا کیے۔

یہ گرانقدر رقم ہاتھ میں آتے ہی تنہا دستی کے لمحات کی یاد کافور کی طرح اڑ گئی اور میرا دماغ از سر نو آسمان سے باتیں کرنے لگا میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سستی سی سیکنڈ ہینڈ موٹر کار مل جائے تو بڑا آرام نصیب ہو۔ اب کار کے خریدار کی حیثیت سے میں نے کراچی پر ڈالی تو سڑک پر چلنے والی ہر دوسری یا تیسری کار بکنے کے لئے تیار تھی کیونکہ بمبئی جانے والے بہت سے ہندو ہوائی جہاز یا سمندری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آخری چیز اپنی کار فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی خوش پوشاک، چرب زبان ہندو نوجوان مسٹر وڈ وانی سے میری ملاقات سرِ راہ ہو گئی۔ اس کے پاس پندرہ بیس سال پرانی شورلٹ کار تھی۔ جسے وہ شام کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی عجلت میں تھا۔ اس نے اپنی کار کی مدح میں رطب اللسان ہو کر ایسے ایسے گیت گائے اور سالہا سال سے اس کی بے عیب خدمت گذاری اور بے لوث وفاداری کے اتنے قصے سنائے کہ پانچ ہزار سے شروع کر کے ڈھائی ہزار پر سودا طے کر لیا۔

مسٹر وڈ وانی کے جانے کے بعد میں نے کار چلانے کی کوشش کی تو اس نے سٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ انجن سٹارٹ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دو چار آدمی اسے کافی دور تک دھکا دیں۔

ان ہی دنوں چوہدری غلام عباس صاحب شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے کراچی آکر وہ ہمارے ہاں ٹھہرے اور ٹیلیفون پر قائد اعظم کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ قائد اعظم نے انہیں اگلے روز لنچ پر مدعو کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر انہیں سواری کی ضرورت ہو تو گورنر جنرل ہاؤس کی کار انہیں لینے وقت پر آ جائے گی۔ چوہدری صاحب نے ہمارے ہاں کار کھڑی دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ سواری کا انتظام ہے اور وہ خود ہی حاضر

ہوجائیں گے۔

سواری کا جو انتظام موجود تھا اس کی مکمل اصلیت سے ہم نے چوہدری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بولے "کوئی پرواہ نہیں ہم ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر سے روانہ ہو جائیں گے تاکہ کار کے سارے ناز نخرے اٹھانے کے بعد بھی کافی وقت ہاتھ میں رہے۔

لنچ کا ٹائم سوا بجے تھا۔ ہم دھکا لگانے والی نفری کار میں بٹھا کر بارہ بجے ہی روانہ ہو گئے اتفاق سے کار کا موڈ ٹھیک تھا اور ہم ساڑھے بارہ بجے ہی گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اے۔ ڈی سی بڑا پریشان ہوا کہ چوہدری صاحب اتنی جلدی کیوں آ گئے ہیں۔ چوہدری صاحب نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ وہ بڑی خوشی سے اے۔ ڈی سی کے کمرے میں بیٹھ کر آدھا گھنٹہ انتظار کر لیں گے۔

"انتظار کی بات نہیں" اے ڈی سی نے جواب دیا۔ "قائداعظم کا حکم ہے کہ جب چوہدری صاحب تشریف لائیں تو وہ خود پورچ میں آ کر کار کے دروازے پر ان کا استقبال کریں گے۔ اس لئے فی الحال آپ واپس چلے جائیں اور ٹھیک ایک بج کر پندرہ منٹ پر پورچ میں پہنچ جائیں۔"

اس گفتگو کے دوران کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ہم نے دھکا دے کر اسے اسٹارٹ کیا اور باہر آ کر گیٹ کے قریب ہی گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے سائے میں وقت گزارنے کے لئے رک گئے۔ سیکورٹی والے بڑے مستعد تھے۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکے اور وہاں رکنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے انھیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ حیران ہوئے کہ قائداعظم کا معزز مہمان ایسی کھٹیچر کار پر سوار ہو کر گورنر جنرل ہاؤس آیا ہے۔ سیکورٹی سٹاف کے کچھ لوگوں نے آ آ کر چوہدری صاحب کے ساتھ عقیدتاً ہاتھ بھی ملائے۔

وقت ہو چکا تھا۔ سیکورٹی کے کچھ سپاہیوں نے بڑی خوشدلی سے ساتھ دھکا لگایا اور ہم بڑے زور و شور سے پھٹ پھٹ کرتے ٹھیک سوا بجے گورنر جنرل ہاؤس کی پورچ میں جا رکے۔ عین اسی لمحے قائداعظم بھی اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے چوہدری صاحب کے ساتھ معانقہ کیا اور انہیں بازو سے تھام کر اندر لے گئے۔

محمد نسیم الدین

دریا ـ ایک استعارہ

" دریا " اردو شاعری کا ایک سدا بہار استعارہ ہے۔ اقلیم سخن میں یہ صدیوں نثر کی زمینوں اور نظم کی بحروں کو سیراب کرتا آرہا ہے لیکن نہ اس کی روانی میں کچھ فرق آیا اور نہ سیرابی میں کمی واقع ہوئی۔ آج بھی اس استعارہ دریا کے دامن میں معنی کے ہزاروں لولوئے جگمگا رہے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ دریا بھی بصورت استعارہ اپنا رخ بدلتا گیا اور فکر و خیال کے نئے جہانوں سے تلازمات اور تشبیہی علاقوں سے نئے نئے صدف چنتا گیا۔ شاعروں نے استعارے کے دریا میں غواصی کی اور اس کی تہہ سے معنی و مفاہیم کے گوہر آبدار نکالے اور ان سے عروسِ سخن کی زلفیں آراستہ کیں لیکن دریا کے دامن میں موتیوں کی کمی نہ ہوئی۔ ہزاروں شعراء نے اس کو اپنے اشعار میں باندھا لیکن اس کا سیل رواں ایک زندہ اور چلتا ہی رہا۔

اس ضمن میں سلسلۂ سخن کو آگے بڑھانے اور استعارتاً امواج دریا میں شناوری کرنے سے قبل مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ استعارہ کی تعریف کی جائے۔ استعارے میں مستعار لہ [یعنی جس کے لئے استعارہ وضع کیا گیا] اور مستعار منہ [یعنی جس سے استعارہ لیا گیا] میں سے صرف ایک کا ذکر ہوتا ہے اور دوسرے کا قرائن سے پتہ چل جاتا ہے۔ اس میں مشابہت کو مطابقت بنایا جاتا ہے۔ ایک مذکور ہوتا ہے اور دوسرا قرینہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً مرزا سلامت علی دبیر کے مشہور مرثیہ کا مقبول عام مصرعہ ہے

ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔

ریسرچ اسکالر - سنٹرل یونیورسٹی - حیدرآباد

ایسے شعر کا استعمال حضرت عباسؓ کیلئے ہے۔ اس میں لطافت یہ بھی ہے کہ حضرت عباسؓ بہادری اور شجاعت میں شیر تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ شیرِ خدا یعنی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے تھے۔ استعارے کی اس تعریف کے بعد معنوں کی تشنگی پھر لب دریا لے چلتی ہے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں دریا کا استعمال کن کن انداز سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ دریا کی اصل پانی ہے اور پانی کی اہمیت نہ صرف انسان کی مادی ضروریات کی تکمیل کے باب میں ہے بلکہ مذہبی اعتبار سے پانی صفائی اور پاکیزگی کا ذریعہ اور لطافت کا مظہر ہے۔ انسان کی روح چونکہ ایک لطیف شئے ہے اس لئے اس کو پانی سے خصوصی علاقہ ہے۔ دنیا کے ہر مذہب، مذہبی داستانوں اور مذہبی روایات میں پانی کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ہندو مذہب میں دریائے گنگا کی جو تقدیس اور عظمت ہے سو تو ہے ہی اس کے علاوہ بھی ہندو دھرم کی مذہبی روایات میں دنیا کی تخلیق کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں کہا گیا کہ کائنات کی تخلیق سے قبل صرف پانی ہی پانی تھا۔ اور پانی کے اس بحر نا پیدا کنار میں ایک اکیلے برہما جی تھے جو ایک سنہرے انڈے پر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد اس انڈے سے اس سمندر میں زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور تخلیق کا عمل نشو نما پاتا ہے۔

اسلام میں بھی پانی کی بڑی اہمیت ہے۔ چونکہ یہ دین طہارت اور نظافت کا ایک مخصوص فلسفہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن میں پانی کے تعلق سے ایک انتہائی حکیمانہ بات کہی گئی جس کی تصدیق آج کی حیاتیاتی سائنس بھی کر رہی ہے فرمایا گیا۔

وخلقنا من الماء کل شئ حی ۔ ترجمہ: اور ہم نے پانی سے ہر ذی حیات کی تخلیق کی۔ اسی طرح دنیا کے دیگر مذاہب اور دیگر اقوام میں بھی ایسی روایات۔ اساطیر اور داستانیں ملتی ہیں جن میں پانی کی بڑی اہمیت ہے کہیں یہ پانی چشمۂ آب حیات ہے تو کہیں کسی جھیل کی شکل میں جس میں گل مراد کھلتا ہے گویا انسان کے اجتماعی لاشعور Archetype میں پانی سے وابستگی ہے۔

انسانی تہذیب اور تمدن کے ارتقاء میں دریا کا زبردست اشتراک رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے تاریخ انسانی کی قدیم تہذیبیں دریاؤں کے کنارے پروان چڑھیں قدیم چینی ان ساحلوں پر گنگا اور سندھ کی تہذیب ہندستان میں اور دجلہ و فرات کے کنارے

بابل کی تہذیب عراق میں۔ دریائے نیل کی تہذیب مصر میں اور دریائے گنگا کے کنارے قدیم آریائی تہذیب کے نام بے ساختہ زبان قلم پر آتے ہیں۔ زرعی فصلوں کی آبپاشی میں دریائی پانی کا ذرائع سے نہروں کا انتظام، کشتی رانی، ماہی گیری وغیرہ ایسے فوائد ہیں جن سے نہ صرف قدیم تہذیبیں بلکہ عصر حاضر کا انسان بھی استفادہ کر رہا ہے۔ پھر تاریخ کی چند فیصلہ کن جنگیں بھی دریاؤں کے کنارے لڑی گئی ہیں۔ ان تمام حقائق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی سماج میں دریا کی کیا اہمیت ہے۔ ادب چونکہ خارجی حقیقتوں کا داخلی آئینہ ہے اس لئے اس میں بحیثیت دیگر معروضی حقائق کے موجود دریا کی جھلکیاں بھی عکس نمائی کرتی ہیں۔ بالخصوص شاعری میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے کیونکہ دریا اپنی روانی۔ گنگناہٹ۔ نرم روی۔ طوفان خیزی۔ تلاطم وغیرہ کے سبب حسن فطرت کا مظہر جمیل بھی ہے جو شاعر کے احساس جمال کو گدگداتا چھیڑتا چلتا ہے۔

اردو شاعری میں دریا کے کئی روپ ہیں اور ہر روپ میں اس کی ایک نئی بہار دیکھئے۔ یہاں یہ عاشق نا شاد کے آنسوؤں میں ڈھل گیا ہے۔ شاعر کے جی کو محبت کا روگ لگا ہے۔ معشوق سے ملنے کی کوئی صورت نہیں کوئی سبیل نہیں۔ اس کی جدائی فراق کا دکھ گہرا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے تصور میں گم آنسو بہاتا ہے۔ شدت گریہ اس کے آنسو یوں ابلتے ہیں جیسے دریا ابلتے ہیں۔ سہ

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں ۔۔۔۔ جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں ۔ د

(ناصر کاظمی) تنہائی کا دکھ گہرا تھا ۔۔۔۔ میں دریا دریا روتا تھا

غالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے ۔۔۔ (میر)

غم سے شبنم کا دل بھی آشنا ہے اور شاعر کا بھی لیکن عاشق کے رونے اور شبنم کے رونے میں فرق ہے۔ شبنم روتی ہے تو صرف قبائے گل اور دامن سبزہ تر ہوتے ہیں جبکہ عاشق کے آنسوؤں کا ہر قطرہ دریا کی سمائی رکھتا ہے۔ ۔۔۔ دکھ کے دریا کی !

(ظفر) ہم کبھی روئے جو محروم تمنا ہو کر   اک اک بوند گری آنکھ سے دریا ہو کر

(ذوق) ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

عاشق جب روتا ہے تو نہ صرف اشک آب بلکہ آنسوؤں کے ختم ہو جانے پر خون کے آنسو بہاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہوتی ہے۔

(ظفر) اشک جو امڈے دم گریہ تو پھر دریائے خوں
موج زن تھا دل سے لے کر چشم تر تک ایک سا

(میر) آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

اسی دریا اور سراب کے تلازمے سے مومن نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے۔ سراب ریگستان میں پانی کا دھوکہ ہے۔ دل کی کدورت مثال خاک اور ریگزار کے ہے۔ عشق صادق کے جذبے کی حرارت سے جب دل میں گداختگی پیدا ہوتو اس کے رونے سے دل کی ساری کدورت آنسوؤں میں بہہ جاتی ہے۔ یہ کدورت اتنی زیادہ ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دریا میں سراب ہے یا سراب میں دریا۔ یعنی جذبۂ عشق کی عظمت اور بلندی کا بیان مقصود ہے جو انسان کے قلب سے شدید کدورتیں دور کر دیتا ہے۔

(مومن) اتنی کدورت اشک میں حیراں ہوں کیا کہوں
دریا میں ہے سراب کہ دریا سراب ہے

غم کا اظہار فطری عمل ہے لیکن اس سے محبوب کی رسوائی کا بھی اندیشہ ہے اس لئے شاعر کہتا ہے کہ ضبط سے آنسو دریا کی طرح امڈے آتے ہیں مگر اس عالم میں ضبط کرنا ظاہر کرنے سے اعلیٰ بات ہے۔

(رفتاؔ) غم سے بڑھکر ضبطِ غم کی بات ہے — یہ بھی دریا ہے مگر ٹھہرا ہوا

سنجیدگی ھزار ہو غم سے مفر نہیں — دریا اسی میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں

ضبط گریہ اور گریہ زاری کی کیفیات میں شاعر کو دریا و ریگزار کی جھلک نظر آتی ہے۔

(فراقؔ) ایک عالم پر نہیں رہتی ہیں کیفیاتِ عشق
گاہ ریگستاں بھی دریا گاہ دریا بھی سراب

شام کے وقت دریا کی روانی میں ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے۔ نہ موجوں کا تلاطم ہوتا ہے نہ بھنور کا شور۔ نہ لہریں اٹھتی ہیں نہ کف اڑتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دن بھر چلتے رہنے کے بعد دریا تھک کر سوگیا ہے۔ یا دن بھر کے اضطراب اور بے چینی کے بعد اس کو سکون مل گیا۔ اب دیکھئے دریا کی اس کیفیت سے شاعر نے کیا مضمون نکالا ہے۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا — صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

دریا۔ ساحل اور موج کے تشبیہی علاقوں سے فانی نے محبت کا ایک نیا مفہوم نکالا ہے یعنی محبت خود آپ اپنا مقصود ہے اس کا کوئی اور خارجی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔

(فانیؔ) دریائے محبت ساحل ہے اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے اور نام کو ساحل کوئی نہیں

محبت ایک دریا ہے اور اس میں اترنا صرف دل والوں کے بس کی بات ہے ہر کس و ناکس محبت کی ہوس تو کرتا ہے لیکن اس تند اور تیز دریا کے دو چار تھپیڑے کھاتے ہی حوصلہ کھو دیتا ہے۔

غواصِ محبت کا اللہ نگہبان ہو — ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ — دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

(اقبالؔ)

راہ محبت کی مشکلات کو جگرؔ نے یوں پیش کیا ہے۔ محبت کے سوز و غم اور ہجر کی تپش اور جلن کے ساتھ دریا کا استعارہ ملاحظہ ہو۔

(جگرؔ) یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

حباب یا بلبلے کے تلازمے سے بھی ہمارے شعراء نے معنیٰ آفرینی کی ہے۔ چند شعر دیکھتے چلیں۔ (میرؔ) ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

(آتشؔ) کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مذکورہ بالا شعروں میں حباب زندگی کی ناپائداری کا استعارہ تھا ذیل کے شعر میں حباب کا استعارہ دیکھئے۔ (آتشؔ)

کسی کے جرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

بھنور۔ موج اور طوفان دریا کے تلازمے ہیں ان کے استعمال سے شعر کے معنوں میں تہداری ہوتی ہے۔ گردش سے آسمان کی چکرا رہے ہیں ہم
کشتی ہماری گھوم رہی ہے بھنور کے ساتھ

(اقبالؔ) سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش یہ دریا کے پار ہو گا

(فانیؔ) موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

بڑھ رہا ہوں سر پھرے طوفاں کی جانب شوق سے
حادثوں میں دم ہے کتنا آزما لیتا ہوں میں

(روشؔ) زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
ننگِ ساحل ہے وہ جسکو کوئی طوفاں نہ ملا

(رندؔ) میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

(ناصر کاظمی) تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کیا تھا

یہاں دھیان کی کشتی حقیقی بھی ہوسکتی ہے اور مجازاً عشق کا کنایہ بھی اسی طرح دریا حقیقی بھی ہوسکتا ہے یا زندگی کا استعارہ بھی۔

تصوف کے مضامین میں ہمارے شعراء نے دریا کے استعارے میں حقیقت و معرفت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ متصوفانہ شاعری میں دریا علامت ہے انا مطلق / حقیقتِ مطلق / نورِ مطلق کی اور قطرہ اس کا تلازمہ علامت ہے انسان کی انا مقید کی۔ قطرہ کی معراج یہ ہیکہ وہ اپنے اصل یعنی دریا سے واصل ہوجائے۔ دریا میں ملنے سے قطرہ دریا بن جاتا ہے۔ اسی طرح انا مقید کا کمال انا مطلق سے وصل ہے۔

(غالبؔ) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

(غالبؔ) قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

قطرہ اپنی حقیقت میں دریا ہے اور اس میں دریا کے پورے خواص موجود ہیں۔ اسی طرح انسان میں بھی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے الوہی صفات کا پرتو ہے۔ چنانچہ سمع و بصر۔ نطق و شعور۔ ارادہ و اختیار اور تخلیق و ایجاد کی صلاحیت انسان میں بھی ہے کیونکہ وہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا مظہر ہے۔ اس حقیقت کو قطرہ اور دریا کے استعاروں میں ہمارے شعراء نے خوب برتا ہے۔

(میرؔ) ــــ جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

(صباؔ) ــــ آبرو دل کی کدورت نے نہ چاہی ورنہ
یہ وہ قطرہ ہے جو بڑھ جائے تو دریا ہوتا

(غالبؔ) ــــ شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

(غالبؔ) ــــ سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

غالب کے پاس دریا کا استعارہ بوقلموں کیفیات اور گوناگوں جذبات کا ترجمان ہے مثلاً کہیں یہ گناہوں کا دریا ہے جیسے ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہیں یہ زمین کا عرقِ انفعال ہے ؎

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

کبھی یہ دریا غالب کے کلام کی روانی کو اذیوں دیتا ہے ؎

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

کہا ہے یہ طوفان اشک کی شکل میں آنکھوں میں ہے ؎

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں
شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

کہیں یہ دریا فنا کا ذریعہ بھی بنا جو حقیقی اور مجازی بھی ہے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے پاس بھی دریا کا استعارہ کئی مسائل اور حقائق کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے ۔ موج اور دریا کے استعارے سے فرد اور ملت کا تقابل دیکھئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

دریا اور موج کا استعارہ مغربی تہذیب کی مادی ترقی اور اخلاقی زوال کا اشارہ بھی ہے۔ جس کے سبب مغربی تہذیب ساری چمک دمک کے باوجود اپنے خنجر سے خود آپ خودکشی کرے گی ۔

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل — موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج — موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

ان شعروں میں دریا کے سمندر سے وصال میں خود دریا کی روانی کا اشارہ دیکر مغربی مادیت اور مادہ پرستی کے سبب مغربی استعمار کے زوال کی پیش گوئی کی گئی ہے ۔

دریا اور ساحل کے تلازمات سے عشق اور عقل کا تقابل ملاحظہ ہو ؎

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھکو — یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

دریا ۔ چشمہ اور حباب اور سبو کے تلازمات سے انسان کی انا ۔ غیرت اور خود داری کا تہذیب دیکھئے ۔

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمہ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

بگہر خود دار ہے منت کش ساقی نہ ہو — عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نے کہا تھا دَربِ اَرِنی — قرآن میں اللہ تعالیٰ انسانوں سے خطاب فرماتے
ع اقرب الیہ من حبل الورید — ہم تمہاری رگ گلو سے بھی قریب ہیں۔ دریا اور
کے استعاروں میں اقبال کہتے ہیں۔
پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

ہر۔ صدف۔ موج۔ تہہ نشینی۔ طوفان یہ سب دریا کے تشبیہی علاقے ہیں۔
سلہ دریا کے استعارے کے ذریعہ ان تلازمات میں فکر و خیال کے جو گل کھلائے ہیں
پھول۔ سہ
ے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں — ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست — وائے محرومی! خذف چین لب ساحل ہوں میں

کی ترک تنگ و دو قطرے نے، تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی، اور کشمکش دریا بھی گئی

قبال کے ہاں کبھی یہ دریا ملت بیضا کی علامت بھی بن جاتا ہے اور نہنگوں سے
قوام مجاہدہ ہیں۔ اس پس منظر میں موج۔ دریا اور نہنگ کا رشتہ دیکھئے۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

دریا کا تلاطم کشمکش حیات کا رمز ہے سہ
ں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
در تابندہ اے پروردۂ آغوش موج — لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا تیرا
اہر کی ساری بحث میں ہم نے اردو شاعری کے حوالے سے دریا کے رنگا رنگ استعارات

روایت پیش کیے۔ اختتام میں ہم دریا کی مزید چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی کی وجہ سے دریا ہمارے ہی نہیں آفاقی ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے دریا میں روانی ہے جو حرکت اور فعالیت اور ارتقاء کا نشان ہے۔

دریا میں قوت ہے۔ شوکت ہے طوفان خیزی ہے۔ یہ قہر اور مہر دونوں کی علامت ہے۔ دریا میں تخلیق کا عمل ہے۔ اس کے دامن میں لاکھوں سیپیاں، مونگے اور موتی تخلیق پاتے ہیں اور اس کی سطح پر حبابوں کے بننے اور ٹوٹنے کا عمل جاری رہتا ہے جو تخلیق اور ... سے عبارت ہے۔ دریا میں موج اٹھتی ہے موج دریا کا جزو لاینفک ہے لیکن اپنا انفرادی وجود اور شناخت رکھتی ہے۔ تخلیق کے دریا میں انسانی وجود بھی شناخت رکھتا ہے۔

دریا اعلیٰ ظرفی۔ صبر اور تحمل کی علامت اور بردباری کا نشان بھی ہے۔ دریا پر ہزار حادثے گزرتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں۔ بھنور اٹھتے ہیں۔ چٹانیں سد راہ بنتی ہیں لیکن وہ پورے وقار اور تمکنت سے بہتا رہتا ہے۔

دریا میں باڑھ آتی ہے تو تباہی و بربادی اور تخریب کی علامت بن جاتا ہے لیکن ... بعد جو زرخیزی پھیلاتا ہے تو شادابی و آبادی اور تعمیر کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح اس ... مثبت اور منفی دونوں رجحان ہیں۔

تصوف میں دریا کی وسعت حقیقت مطلق کی علامت ہے۔ یہاں یہ نور ازل کا ... بن جاتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دریا ہر جہت سے اپنی ایک نئی شان میں رواں دواں نظر آتا ہے اور شعراء کے کلام میں آکر معنی کی تہہ در تہہ سطحیں تخلیق کرتا ہے۔

آشوتوش سنہا

مفت قانونی امداد

قانون کا راج ہماری جمہوریت کی بنیاد ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا۔ نہ کوئی امیر اور نہ کوئی غریب۔ ہر شہری کو برابری کی بنیاد پر انصاف پانے کا حق ہے کیونکہ قانون کے سامنے برابری ہمارے آئین کی سنگ بنیاد ہے۔ شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سماجی، اقتصادی، اور سیاسی سبھی میدانوں میں انصاف آسانی سے پا سکے۔ لیکن ہمارے روایتی عدالتی نظام میں حال تک برابر کا انصاف حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس نظام میں تبدیلی کرنے کے بعد مساوی انصاف حاصل کرنے کیلئے مختلف پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔

ہمارے آئین کی تمہید میں سماجی اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں برابر کا انصاف پانے کا ذکر ہے۔ نیز یہ کہ اقتصادی یا دوسری نابرابریوں کی وجہ سے کوئی بھی شہری انصاف پانے سے محروم نہ رہنے پائے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ملک کے لوگ پورے طریقے سے انصاف پانے سے محروم رہ جاتے تھے کیونکہ پہلے تو لوگوں کو اپنے حقوق کے بارے میں معلوم نہیں تھا اور اگر پتہ بھی ہوتا تو غریبی اور لاچاری کی وجہ سے طاقت اور استحصالی عناصر کے خلاف ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور اگر وہ اپنے حق کے لئے لڑنا بھی چاہتے تو اس موجودہ مہنگے عدالتی نظام میں ان کو انصاف کی توقع کہاں ہو سکتی تھی اس طرح انصاف صرف امیروں کی جاگیر بن کر رہ گئی تھی لیکن ہندستان کے سابق چیف جسٹس جناب پی این بھگوتی نے اس درد کو محسوس کیا اور آئین میں موجود بنیادی حقوق کو لیکر آگے بڑھے تاکہ لوگ برابر کا انصاف حاصل کر سکیں اس لئے انہوں نے مفت قانونی مدد اور مشورے کا پروگرام شروع کیا جس کا سارے ملک میں خیر مقدم کیا گیا۔ پچھلے دس سال سے غریب اور لاچار طبقوں میں یہ یقین پیدا ہوا کہ غریبی اور کمزوری ان کے انصاف پانے کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی ہے۔ ان کی مدد کے لئے مفت قانونی مشورہ اور اگر عدالت میں حق کی لڑائی لڑنی ہے تو مالی امداد بھی

حاصل ہو سکتی ہے اور عام آدمی بھی اب انصاف حاصل کرنے سے محروم نہیں رہ سکتا ہے۔ مفت قانونی امداد پروگرام کو لاگو کرنے کے لئے ریاستی سطح پر قانونی امدادی بورڈ تشکیل دیئے گئے۔ اور ان کے یونٹ ضلعی سطح پر بھی قائم کئے گئے۔ مرکزی سطح پر مفت قانونی امداد پروگرام صحیح طریقے سے لاگو ہے۔ اور اس پروگرام پر برابر نظر رکھنے کے لئے ایک مرکزی بورڈ کام کرنے لگا ہے۔ بورڈ کو مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے ذریعہ مالی امداد فراہم کی جاتی ہے تاکہ بورڈ عوام کی مدد کر سکے۔ مفت قانونی امداد کے پروگرام کے تحت غریبوں، درج فہرست قبیلوں اور پسماندہ طبقوں اور سماج کے ہاتھوں دیگر تباہ کئے گئے لوگوں، مزدوروں اور عورتوں کو مفت قانونی امداد اور مشورہ دیا جاتا ہے۔

اس پروگرام کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو قانون کے تحت حاصل حقوق اور ذمہ داریوں سے واقف کرایا جائے اور ان میں یہ بیداری پیدا کی جائے کہ وہ صلح اور سمجھوتے کی بنیادوں پر اپنے مقدموں کا نپٹارہ کریں تاکہ آپس میں خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں۔

مفت قانونی امداد پروگرام کے تحت غریب مقدمہ لڑنے والوں کے ان کے مقدمات کے سلسلے کے سارے اخراجات شامل ہیں۔ اس پروگرام کے تحت مقدموں کی مفت پیروی کی جاتی ہے۔ وکیلوں کی خدمات مفت مہیا کی جاتی ہیں اور فیصلوں اور دوسرے دستاویزوں کی مستند نقلیں بھی ان کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

مفت قانونی مشورے کا مقصد دونوں فریقین کے مابین صلح صفائی کرانا ہوتا ہے اور ان کی صحیح رہنمائی کرنی ہوتی ہے کہ وہ قانونی طور سے کیسے آگے بڑھ سکیں۔

مفت قانونی امداد پروگرام کے تحت ابھی تک ۷۱۲۴۹۱ لوگوں کو امداد بہم کی گئی ہے جس میں تامل ناڈو میں ۳۹۷۳۹۲ اور مدھیہ پردیش میں ۲۲۲۸۷۵ لوگ تھے۔

لوک عدالتیں لوک عدالتیں بھی مفت قانونی امداد پروگرام کا ایک حصہ ہیں۔ ان میں موٹر وہیکل ایکٹ، ازدواجی زندگی، گزارا بھتہ، ملکیتیں قبضے اور لیبر قضیے وغیرہ نپٹائے جاتے ہیں۔ ان عدالتوں سے لوگوں کو کم خرچ میں جلدی سے انصاف حاصل ہو جاتا ہے۔ ان میں مصالحتی طریقہ سے فیصلہ کرایا جاتا ہے اور دونوں فریق کسی بھید بھاؤ کے احساس کے بغیر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ لوک عدالتوں میں مقدمہ کرانے والے کو کوئی خرچ نہیں کرنا پڑتا۔

ابھی تک کل ملاکر سبھی ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں دو ہزار (۸۰) لوک عدالتیں بیٹھی
ب جن میں اتر پردیش میں ۵۲۰ ' مہاراشٹرا میں ۵۵۶ ' راجستھان میں ۲۴۲ اور کرناٹک میں
۱۹ لوک عدالتیں تھیں ۔ ان سبھی عدالتوں میں کل ملاکر تقریباً (۱۲) لاکھ ۹۹ ہزار مقدموں کے فیصلے
ے گئے ۔ ان میں سے اتر پردیش میں ۲۰۷۸۰۵ ' راجستھان میں ۳۲۷۴۳۶ اور مدھیہ پردیش
ں ۲۵۵۰۷۲ مقدمے تھے ۔

لوک عدالتوں کے اجلاسوں کا اہتمام مفت قانونی امداد و مشورہ بورڈ کرتا ہے ۔ پارلیمنٹ
لیگل سروس اتھارٹی ایکٹ (Legal Seevice Authority Act) ۱۹۸۷ء کو منظوری د
ی ہے ۔ جس کے دائرہ میں مفت قانونی امداد کے پروگرام کا ہر پہلو ہے مگر یہ قانون ابھی عمل میں
یں آیا ہے ۔ مفت قانونی امداد ملک کی سبھی عدالتوں میں اس کے حقدار لوگوں کو مہیا کی جاتی ہے

مفت قانونی امداد اور مشورے کے پروگرام کی جانکاری کو عوام تک پہونچانے کے لئے پرچار
ے مختلف وسیلوں کو استعمال میں لایا جارہا ہے ۔ مختلف قسم کی رضا کارانہ تنظیموں کو جن میں سماجی او
خواتین تنظیمیں بھی ہیں ۔ اس مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے ۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً
انونی موضوعات پر مباحثوں میں اس پروگرام کی ممکنہ مشکلات پر تبادلہ خیالات کئے جاتے ہیں ۔
علیم اور طالب علموں کا بھی اشتراک حاصل کیا جاتا ہے ۔ اس طرح عوام میں انصاف پر اعتماد
بڑھتا جارہا ہے ۔ سماج میں یہ خیال قوی ہوتا جارہا ہے کہ عدالتیں صرف امیروں کے لئے نہیں
غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو ان کا حق دلا دینے کے لئے بھی ہیں ۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو
ب یہ یقین ہو چکا ہے کہ عدالت کے دروازے تک پہونچنا ہی نہیں بلکہ عدالت سے انصاف حاصل
رنا بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔

سلسلہ صفحہ ۶۱

میری جان میرے محبوب ہو تم
میری زندگانی کے مطلوب ہو تم
زر و سیم و مہر و بہاراں سے بہتر
دلِ باوفا نذر ہے تم کو دلبر

More then the sun and the
Spring and the Sea.
Is the faithfull heart will
yield to thee.

محمد نظام الدین فاروقی راز

عشقِ صادق

TRUE LOVE

سمندر کی تہہ سے نکلے ہوئے بہت سے آبدار موتی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جوہری کی نگاہ میں کبھی پرکھے جاتے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ محترم محمد نظام الدین فاروقی راز ایسے ہی دُرِ مکنون ہیں۔ وہ کبھی شہرت کے خواہاں نہیں رہے نہ اپنی اس خداداد صلاحیت شعرگوئی کو منوانے کی کوشش فرمائی۔ اردو اور فارسی کی بے پناہ استعداد کا اظہار صرف بعض مخصوص محفلوں ہی میں فرمایا کرتے تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہیں اپنے دور کی ساری اخلاقی قدروں کے حامل اپنے اس بزرگ بھائی کے مختصر تعارف کے بعد قارئین شاداب کی دلچسپی کے لئے یہاں ان کی ایک نظم پیش کی جارہی ہے جو ایک انگریز شاعر Marie Corelli کے ناول The Love سے لی گئی ہے جو نارویجین زبان کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اگر اصل نظم پیش نہیں کی جاتی تو طبع زاد معلوم ہوتی۔

نظم کا مرکزی خیال حسن و جوانی سیم و زر جیسی آنی جانی چیزوں سے ہٹ کر صرف محبت کے خاطر ہی محبوب کی چاہ مطلوب خاطر ہے۔ جس کے لئے وہ مکمل سپردگی کا اظہار کرتا ہے۔

[سیدہ مہر]

Lovest thou me for my
beauty's sake?
Love me not then.
Love the victorious
glittering sun
the fadeless marvellous
one.

یرے حسن سے ہے اگر پیار تم کو
مجھ سے کبھی تم محبت نہ کرنا۔
اں دلربا نازنیں اور بھی ہیں
بت کے قابل حسیں اور بھی ہیں
مہر درخشاں منیر و جہاں
بات ابد اور قدرت کا پیکر

Love thou me for my youth's sake
Love me not then.
Love the triumphant unperishing
Spring.
Who every year new charms
doth bring.

انی سے میری ہے گر پیار تم کو
مجھ سے کبھی تم محبت نہ کرنا
یاں دلربا نازنیں اور بھی ہیں
بت کے قابل حسیں اور بھی ہیں
رقصاں و شاداں بہار معطر
ہر سال حسنِ نو کی پیمبر

Lovest thou me for treasures
sake?
Love me not then.
Love the deep the wonderful sea
Its jewels are worthier love
than me.

یرے سیم و زر سے ہے گر پیار تم کو
مجھ سے کبھی تم محبت نہ کرنا
یاں دلربا نازنیں اور بھی ہیں
بت کے قابل حسیں اور بھی ہیں
یب و غریب اور گہرا سمندر
ے بطن میں اپنے نایاب گوہر

Lovest thou me for my Love's own sake
Ah Sweet then love me.

ہے گر چاہ میری محبت کی خاطر
ے پروانہ دل شمعِ الفت کا خاطر

باقی صفحہ ۵۱ پر

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ



دوستو حرفِ انا لاؤ نہ گفتار کے بیچ
خوار ہو جاؤ گے ہر کوچہ و بازار کے بیچ

فن سے فنکار کے کردار کا چلتا ہے پتہ
کوئی دیوار نہیں ہے فن و فنکار کے بیچ

بات تو جب ہے کہ ہیں زندہ حقائق جتنے
کسی عنوان وہ بے پردہ ہوں اشعار کے بیچ

یہ تماشہ بھی کوئی دیکھے کہ ہم اہلِ وفا
دل گرفتہ ہیں بہت انجمنِ یار کے بیچ

اک نگاہِ غلط انداز ادھر بھی ہو جائے
ہم بھی مشتاقِ کرم ہیں بھرے دربار کے بیچ

آتشِ گل کا کرم کہیئے کہ گلچیں کا ستم
حشر سا حشر بپا ہے مرے گلزار کے بیچ

ناخدا کو بھی خدا آتا ہے بے ساختہ یاد
جب ہو پتوار شکستہ کہیں منجدھار کے بیچ

بات جو کرنی ہے تو کیجئے سنبھل کر منشاؔ
کہتے ہیں کان ہوا کرتے ہیں دیوار کے بیچ

۱۱/ اسٹار کی ٹاؤن ناگپور

فاطمہ نازؔ

غزل

پھر کبھی لوٹ کے آیا نہیں جانے والا
چھپ گیا جا کے کہاں دل کو بسانے والا

موت کا وقت معین ہے ہر انسان کے لئے
آج ہے کوئی تو کل کوئی ہے جانے والا

خواب میں بھی نہ تھا ایسی تباہی کا گماں
شعلہ اٹھے گا نشیمن کو جلانے والا

کون تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتا ہے
آگیا وقت وہ جو وقت تھا آنے والا

جب بہار آئی تو معلوم ہوا ہے ہم کو
دل کے زخموں کو یہ موسم تھا کھلانے والا

کچھ تو معلوم ہو تو انہیں کیسے دیں آخر
کون تھا نازؔ تیرے ناز اٹھانے والا

No. 3

سکندر توفیق

غزل

آنسو تسبیح ہاتھ میں لے کر نام جپوں میں تیرا
دل میدان میں یادوں نے پھر ڈالا آکر ڈیرا

سکتہ ماری تیری تمنا سسکی بھر بھر کہتی تھی
اب تو ہماری بانہہ کٹی ہے اندھیاروں نے گھیرا

ایک کرن جو تیری نظر تھی، وقت کٹاری نے کاٹی
کیسی قیامت تیری ادا تھی، دھرتی بھولے پھیرا

پنچھی پھر سے اڑ جاتا ہے ڈال پتے جلتے ہیں
دنیا ساری آنی جانی پل پل جوڑے رین بسیرا

دل نے اپنی بات سنائی، ہم نے اپنی مجبوری
پل چھن دشمن، چھب تک چھنیں، سپنا چاہیں پائیں سویرا

تیرے پیچھے پیچھے چلتا کیا من کا تیکھا بانکا پن
آنچل تیرا لہرا لیتا پربت پر سے ایک پھریرا

اب تو کرو یہ رونا بند توفیق سہانی رت چل
اب کی سب ناٹک بار نہ پایا تم نے اپنا آپ بکھیرا

بیت تحسین ملک نگر حیدرآباد ۲۴

ماہنامہ

شاداب

جلد ۶ شمارہ ۵ مئی ۱۹۸۹ء حیدرآباد

قیمت : 00-5

مجلس مشاورت

زر تعاون

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
[سال]انہ	50 روپے	160 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
[دو] سال	90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 "	225 " "
[تاح]یات	1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 "	2000 " "

[تر]سیل زر کا پتہ : ماہ نامہ "شاداب" 147-5-11 ، ریڈ ہلز، حیدرآباد

[ایڈی]ٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپواکر دفتر شاداب 14-5-11 ، ریڈ ہلز، حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

۱۔	حرف اول	ایڈیٹر	۳
۲۔	زکوٰۃ کا صحیح مصرف	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۵
۳۔	نومسلم رابرٹ کینیش	شکیل الرحمٰن پیامی	۱۲
۴۔	شہاب نامہ، حج کی نیت	قدرت اللہ شہاب	۱۵
۵۔	ضیاء شہید، قسط دوم	مفتی محمد تقی عثمانی	۲۹
۶۔	محمد شمس الدین تاباں مرحوم	محمد منظور احمد منظور	۳۷
۷۔	اردو کے مسائل اور	سلیم الدین احمد	۴۱
۸۔	معمر لوگ اور کام	کے پرمیشورن	۴۲
۹۔	پانی، تسکین دہ پانی	ڈاکٹر ایس۔ ایل۔ گپتا	۴۴
۱۰۔	بھارتی ریلوے کی ترقی	راجکمار جین	۴۹
۱۱۔	روزگار کے نئے مواقع	ایڈورڈ فلیمڈ	۵۵
۱۲۔	بیالی حقیقت	ڈاکٹر منشار	۶۱
۱۳۔	نعت و قطعہ	ڈاکٹر منصور	۶۲
۱۴۔	غزلیں	فاطمہ ناز، صبیحہ نسرین	۶۳
۱۵۔	غزلیں	مومن خاں شوق۔ الفت شرقی	۶۴

حرفِ اول

اردو: اردو ہندوستانی زبان ہے، یہیں پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور بلا لحاظ مذہب و ملت عوامی دلوں پر حکومت کرنے لگی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اسی زبان میں لڑی گئی مگر آزادی کے بعد جب قومی زبان کا مسئلہ طے ہونے لگا تو کمیٹی کے اراکین ہندی اور اردو کے حق میں مساوی مساوی تقسیم ہوگئے۔ مسئلہ کا تصفیہ صدر نشین کے کاسٹنگ ووٹ سے ہوا۔ اردو میں تعلیم یافتہ، اردو کے شیدائی، بہار کے باسی صدر نشین نے ہندی کے حق میں رائے دیکر اسے قومی زبان کا درجہ دلوادیا۔ ہندی والوں نے اردو کو ہمیشہ اپنا مدمقابل سمجھا اور ہندی علاقہ سے منظم طریقے سے اردو کو دیس سے نکالا دیا گیا۔ لیکن اردو کی جڑیں ہندوستانی عوام کے دلوں میں پیوست تھیں۔ یہ برابر عوامی زبان بنی رہی۔ آزادی سے پہلے سابق ریاست حیدرآباد میں اردو دفتری زبان تھی۔ نیز سائنس ٹکنالوجی اور تمام دیگر علوم و فنون میں اعلیٰ تعلیم کیلئے جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی اور جامعہ کے سپوتوں نے اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے پوری دنیا میں نام کمایا۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا لیکن اردو کی یہ حیثیت بھی سیاست کی نذر ہوگئی۔ ریاستوں کی تنظیم جدید میں اردو کی یہ ریاست تین لسانی ریاستوں (تلگو، کنڑا، اور مراٹھی) میں تقسیم ہوگئی اور جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم راتوں رات انگریزی میڈیم میں بدل دیا گیا۔ حالانکہ ہماری جمہوریہ کا یہ تصفیہ ہے کہ انگریزی کا رواج ختم کرکے قومی زبان ہندی کو اس کی جگہ رائج کیا جائے۔ اگر جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم جاری رکھا جاتا تو اردو کتابوں کو ناگری رسم الخط میں شائع کرکے نہایت آسانی سے ہندی ذریعہ تعلیم لاگو کرکے انگریزی سے چھٹکارہ پایا جاسکتا تھا۔ ہندی علاقوں میں جو عمل اردو کے ساتھ روا رکھا گیا تھا، وہی عمل غیر ہندی علاقوں میں بھی دہرایا جانے لگا۔ اردو کو دفتروں سے نکالا گیا، اردو تعلیمی اداروں کو بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی پلیٹ فارم سے اردو کی تائید کی جاتی، الیکشن کے زمانے میں وعدے کئے جاتے، کبھی کبھی احکامات بھی اردو کے حق میں جاری کئے جاتے مگر انتظامیہ ان احکام پر عمل نہ کرتا اور احکام جاری کرنے والے بھی یہ نہ پوچھتے کہ ان احکام پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں اور اگر

نہیں ہو رہا ہے تو کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ اردو والوں نے اس صورت حال کو محسوس کیا اردو کے جائز مقام کو حاصل کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ آندھرا پردیش میں اردو بچاؤ تحریک عوامی سطح پر چلائی گئی اور عوامی مطالبہ کی قوت کا حکومت کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ وعدہ کہ اردو کے بارے میں تفصیلی احکامات جاری کئے جائیں گے۔ لیکن اس وعدہ کو ابھی تک پورا نہیں کی گئی ہے۔ اردو والوں کو چوکس اور مستعد رہنا چاہیئے۔ اور ضرورت پڑنے پر اتحاد و یک جہتی کے مظاہرہ سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے تاکہ حکومت اردو کے لئے مطالبہ کی تکمیل کرے اور انتظامیہ کو احکام کی عمل آوری کیلئے بھی پابند کرے۔

مولانا آزاد نمبر: ملک بھر میں آج کل مولانا آزاد یادگاری تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ مرکز میں وزیر اعظم خود ان تقاریب کمیٹی کے صدر ہیں۔ ہر ریاست کو بھی ان تقاریب کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ "شاداب" نے طے کیا ہے کہ یکم جون کو مولانا آزاد نمبر شائع کرے۔ لکھنے والوں سے خواہش ہے کہ اپنی تخلیقات ۱۵ رمئی تک بھجوا دیں تاکہ خاص نمبر میں شریک کی جا سکیں۔

پنڈت نہرو نمبر: نہرو یادگار صدی میں بھی پنڈت جی کی یاد کو تازہ کیا جا رہا ہے۔ "شاداب" نے طے کیا ہے کہ جولائی ۱۹۸۹ء میں ایک خاص نمبر پنڈت جی کی یاد میں شائع کر کے اپنا خراج عقیدت پیش کرے اور ہماری جنگ آزادی کے رہنما اور عوامی جمہوریہ ہند کے پہلے وزیر اعظم کی شخصیت اور کارناموں کو عوام کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ترقی کی دوڑ جاری رکھیں اور اکیسویں صدی میں شایان شان طریقے سے داخل ہوں۔ اس خاص نمبر کیلئے بھی تخلیقات ۱۵ رجون تک بھجوائی جائیں تاکہ شریک اشاعت کی جا سکیں۔

سلسلہ: زکوٰۃ کا صحیح مصرف

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔

تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں۔ اس حال میں کہ وہ خشوع بھی رکھتے ہیں۔
ان اہل خیر کی تعریف کرتے ہوئے وہ ان کو اخلاص کامل اور ہر قسم کی اغراض

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی

زکوٰۃ کا صحیح مصرف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے زکوٰۃ کے مناسب محل اور اس کے اوقات کی حکمت و مصلحت کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں :

"وہ دروازے جو صالح سلاطین نے بلا کسی تکلیف و مشقت کے زکوٰۃ کیلئے کھولے تھے اور جن کو عقل بجا قبول کرتی ہے، چار ہیں، اول یہ کہ اموال نامیہ سے زکوٰۃ لی جائے، اس لئے کہ اسکی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور نمو ملک کے باہر آنے جانے کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اموال نامیہ کی تین قسمیں ہیں۔ مویشی، کاشت، تجارت، دوسرے یہ کہ خزانہ کے مالکوں اور سرمایہ داروں سے لی جائے، اس لئے ان کو چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنے مال کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ان کی آمدنی کی مدیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس نئے خرچ سے ان کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

تیسرے یہ کہ ان اموال سے لی جائے جو بغیر کسی محنت و سعی کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ مثلاً عہد جاہلیت کے خزانے اور قدماء کے دفینے، اس لئے کہ ان کی حیثیت بالکل مفت کی سی ہے اور اس میں سے خرچ کرنا بہت آسان ہے۔ چوتھے یہ کہ عام تجارت پیشہ لوگوں سے لی جائے۔ اگر سب سے تھوڑا تھوڑا لیا جائے گا تو ان پر زیادہ بار بھی نہ ہوگا اور مجموعہ کافی ہو جائے گا۔

تجارت (مع درآمد برآمد) غلہ اور پھل زکوٰۃ کی سب سے اہم قسمیں ہیں جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے ایک سال رکھا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ درمیان میں مختلف فصلیں اور حالتیں پیش آتی ہیں جن میں پیداوار میں اضافہ کا امکان بہت رہتا ہے، اور اس کا اندازہ کرنے کیلئے ایک سال بالکل کافی ہے۔ آسان اور مطابق مصلحت یہی ہے کہ زکوٰۃ ان ہی اموال کا ایک جزو ہو مثلاً اونٹ کے گلہ سے ایک اونٹنی، گائے کے ریوڑ سے ایک گائے

بکری کے ریوڑ سے ایک بکری۔

زکوٰۃ کے مصارف اور اس کے اجتماعی نظام کا قیام

زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے سورہ براۃ کی آیت میں بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے:

"اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝"

یہ صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہیں، جو ان پر مقرر ہیں نیز ان کا جنکی دلجوئی منظور ہے (اور صدقات کو صرف کیا جائے) گردنوں (کے چھڑانے) میں اور قرضداروں (کے قرضہ ادا کرنے) میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی (امداد) میں یہ درصد فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ بڑا علم والا ہے، بڑا حکمت والا ہے۔

سورہ براۃ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی، اس وقت اسلام کی بنیادیں مستحکم ہوگئی تھیں اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جگہوں پر اپنے اعمال اور محصلین بھیجے اور ان کو اس کی تحصیل کے احکام اور آداب بھی بتائے، اور بہت سی ایسی وصیتیں کیں جن میں شفقت عامہ اور انفرادی مصلحت کے ساتھ اجتماعی مفاد بھی وابستہ تھا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرنے سے پہلے جو ہدایات دیں وہ زکوٰۃ کے قانون کی اساس اور گویا اس کا منشور ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں پس دعوت دو ان کو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ یہ بات قبول کر لیں تو ان کو یہ بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دیدیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بات بھی منظور کر لیں پس تم کو چاہیئے کہ ان کے بہترین مال پر ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرو اور مظلوم کی دعا اور پکار سے ڈرو اس لئے کہ اللہ اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اس کے احکام کے اسرار اور حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے " حجۃ اللہ البالغہ " میں لکھتے ہیں ۔

" جاننا چاہیئے کہ زکوٰۃ میں سب سے اہم مصالح دو ہیں۔ پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے، اس لئے کہ نفس اور حرص و بخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حرص بدترین اخلاق میں سے ہے، جو معاد میں انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتی ہے جو حریص ہوگا مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا۔ اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اگر زکوٰۃ کی مشق اس کو ہوگی تو یہ حرص اس سے ختم ہو چکی ہوگی۔ جو بالآخر اسکو نفع پہونچائے گی ۔

انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد معاد میں سب سے اعلیٰ اخلاق سخاوت نفس ہے جس طرح رجوع الی اللہ، انابت و عبودیت، دعا اور تضرع سے عالم جبروت سے مناسبت اور تقرب پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سخاوت، خبیثہ اور پلیت دنیاوی صورتوں اور شکلوں کو توڑتی ہے، اس لئے کہ وہ بہیمیت کی ضد ہے اور اس کی اصل یہ ہیکہ ملکوتی (فرشتوں والی صفات) غالب ہوں، اور بہیمانہ صفات ان سے دب جائیں، بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر بھی اس حکم کا اطلاق ہونے لگے جو ملکوتی صفات پر ہوتا ہے، اس کا راستہ یہی ہے کہ مال کو باوجود ضرورت و احتیاج کے راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، ظالم کو معاف کیا جائے، مصائب پر صبر کیا جائے۔ اور دنیاوی تکالیف و مشکلات، آخرت کے یقین کی وجہ سے آسان و خوشگوار ہو جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں کا حکم دیا ہے، اور ان کے حدود مقرر فرما دیئے ہیں، ان میں مال کا خرچ کرنا بھی ہے، جو بہت سے حدود و قیود کے ساتھ وابستہ ہے اور اسکی اہمیت اتنی ہیکہ ایمان اور نماز کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل نار کے بارے میں فرماتا ہے

" قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ "

ترجمہ : وہ کہیں گے ہم تو نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ ہم غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے "

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے اس لئے کہ ضعفاء اہل حاجت جمع ہوں گے

مگران کی ہمدردی و اعانت کی یہ سنت نہ ہو تو وہ بے چارے بھوک سے ہلاک ہو جائیں، اس کے علاوہ شہروں کا نظام مالی پر قائم ہوتا ہے اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے مدبرین و منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتے، ان کی معیشت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے، مشترکہ اخراجات یا چندے نہ سب کے لئے آسان ہیں نہ ممکن، اس لئے رعیت سے ان مصالح کے لئے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور ہے۔

اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم ملزوم ہیں، اس لئے شرع نے بھی اسکو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے۔

علامہ بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں، بلکہ دوسری عبادتوں کی طرح خالص اللہ کی عبادت ہے وہ کہتے ہیں

" ادائیگی زکوٰۃ کے وقت نیت کی درستی بہت ضروری ہے اس لئے کہ زکوٰۃ بہت بڑی عبادت ہے۔ جس طرح نماز کا مقصد سوائے حصول ثواب کے کچھ نہیں، چنانچہ نیت اس کے لئے فرض ہے، اگر بلا نیت کے ادا کرے گا تو جس طرح نماز بلا نیت کے نہیں ہوتی، زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی، البتہ نماز بلا نیت کے باطل ہو جاتی ہے، بخلاف زکوٰۃ کے جو بلا نیت کے ہدیہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہدیہ کا ثواب اس کو ضرور حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکار کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

زکوٰۃ کی نمایاں خصوصیات زکوٰۃ کی بہت سی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو انسان کے خود ساختہ قوانین، اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے بہت مختلف ہیں۔ ان .... مابہ الامتیاز خصوصیات نے زکوٰۃ کو ایک خاص رنگ اور مزاج بخشا ہے۔ اس کو دینی تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے اور اس کے اندر زندگی و اخلاق پر اثر انداز ہونے اور خدا و بندہ کے تعلق کو استوار اور مستحکم کرنے کی ایسی قوت و صلاحیت پیدا کر دی ہے جو کسی دوسرے دنیاوی ٹیکس میں (خواہ اس میں انصاف و اعانت کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہو) نہیں ہے اور نہ ممکن۔

تبشیر و انذار ان خصوصیات میں سب سے زیادہ بنیادی اور موثر چیز ایمان و احتساب کا

وہ روح ہے جو اس فریضہ میں جان ڈالتی ہے۔ اس روح یا اسپرٹ سے دنیا کے ٹیکس سرکاری قوانین اور معاشی حدبندیاں قدرتی طور پر بالکل محروم ہیں، بلکہ اس کے برعکس ان میں ناراضگی، زیادتی اور بددلی کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے والا یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہ ٹیکس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور اس پر اجر و ثواب ملے گا۔ بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ٹیکس لگانے والے خود اس جیسے انسان ہیں اور شاید اس سے بھی بہت تر ہیں اور اس ٹیکس سے ہونے والی آمدنی زیادہ تر تعیشات، اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے یا چند اشخاص اور مخصوص پارٹیوں کے مفاد پر خرچ ہوتی ہے اس کے علاوہ ان ٹیکسوں کے ساتھ دینی ترغیب کی کوئی قوت نہیں ہوتی بلکہ اس کے بجائے جرمانے دھمکیاں، سزائیں اور خشک سخت قوانین ہوتے ہیں جن سے عوامی ناراضگی اور بے اطمینانی و بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، قرآن و حدیث اور نبوی تعلیمات میں زکوٰۃ کا ذکر ہمیشہ فضائل، دنیا و آخرت میں اس کے نتائج ثمرات، اجر و ثواب، مال و دولت میں برکت یا زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو عذاب الیم کی وعید اور بے برکتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیاں اگیں، ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے۔ اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے، جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان یا اذیت سے کام نہیں لیتے ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف واقع ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی شریعت میں ان نصائل کے مقام و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خوب لکھا ہے۔

• انفاق کی ترغیب وفضیلت پر جو احادیث آئی ہیں ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ عمل سخاوت کے ساتھ ہو جو زکواۃ کی روح ہے اور تہذیب نفس کا کام بہت حد تک اس سے انجام پا سکتا ہے۔ بخل کی برائی بار بار اسلئے بیان کی گئی ہے کہ حرص ایسی چیز ہے جو مانع زکواۃ کو نقصان پہونچا سکتی ہے اور جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ۔

اللّٰھم اعط منفقاً خلفاً واللّٰھم اعط ممسکاً تلفاً ہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچو اس لئے کہ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

"اِنَّ الصدقة لتطفیٔ غضب الرب"

" بیشک صدقہ اللہ تعالٰی کے غضب کی آگ ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا۔ ان الصدقة تطفیٔ الخطیئة

بے شک صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے'
ایک اور حدیث میں ہے کہ " اللہ تعالٰی صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اسکو بڑھاتا رہتا ہے۔

مالداروں سے لیا جائے اور زکواۃ اور ان ٹیکسوں کے درمیان جو شخصی سلطنتوں میں غرباء میں تقسیم کیا جائے یا نئے زمانہ کی جمہوری اور عوامی" حکومتوں میں نظر آتے ہیں ایک نمایاں اور بنیادی فرق جو اس کے اثرات و نتائج پر پورے طور پر اثرانداز ہے وہ اس کی شرعی ساخت اور حیثیت ہے جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ و معجزانہ الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا۔

" تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم "

(ان کے مالت مندوں سے لیا جائے اور ان کے غرباء میں تقسیم کیا جائے) ۔

یہ زکواۃ کی وہ شرعی حیثیت ہے جو عہد اول میں نظر آتی ہے، اور جو قیامت تک برقرار

رہنی چاہیئے۔ وہ اہل اغنیاء (جو ان کے شرائط فرضیت پر پورے اترتے ہیں، اور زکوٰۃ کا منصوص اور متعین نصاب ان کے پاس موجود ہے) سے لے کر ان مصارف میں صرف کو جاتے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں اور کسی مقنن اور قانون ساز ادارہ یا شخصیت کو اس کا حق نہیں دیا ہے کہ وہ اسمیں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کر سکے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انما الصدقات للفقراء - الخ۔

صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں کا حق ہیں۔

شریعت اور احادیث نبوی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شہر کے فقراء اور اہل حاجت ہیں، زکوٰۃ کا یہ نظام ان حکومتوں میں بھی قائم رہا جو اسلامی قوانین کی تطبیق پر صد فیصد عامل نہ تھیں۔ چنانچہ فقراء و مستحقین ان حکومتوں کے سایہ میں کبھی اپنے حقوق سے کلیتاً محروم نہیں رہے اور حدود اللہ کبھی پوری طرح معطل نہیں ہوئے۔ یہ وہ حکومتیں ہیں جنکی مذمت میں بہت سے غرض مند مورخ اور مستشرق پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے داعی ہیں۔

تقویٰ، تواضع اور اخلاص زکوٰۃ کا تیسرا امتیازی پہلو اخلاص تواضع اور معنویت کی اسپرٹ کا وہ روح ہے جو ہر لمحہ اس میں جاری و ساری رہتی ہے، اس سے مراد زکوٰۃ کے آداب، اعلیٰ اخلاق اور دینی جذبات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بہت اہتمام سے بار بار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ دینے والوں کو ان صفات سے بہرہ ور ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس نے اہل خیر کو اس کی تلقین کی ہے کہ وہ احسان جتانے سے پرہیز کریں، اور اپنے صدقات و خیرات کو اس سے ملوث کر کے بے قیمت نہ بنائیں۔

اس نے ان اہل خیر کی مدح کی ہے جن کے اندر تواضع و اخلاص کی یہ روح پائی جاتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتے وقت یہ سب کیفیات ان پر طاری ہوتے ہیں۔

ارشاد ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۔

اور جو لوگ دیتے رہتے ہیں جو کچھ دیتے رہتے ہیں اور ان کے دل اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔ (باقی صفحہ ۲۴ پر)

شکیل الرحمٰن پیامی

نومسلم روبرٹ کیننگ

" قرآن مجید کے اندر مجھے اپنا کھویا ہوا اثاثہ ہاتھ آگیا تو میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ یہ دین ہمیں ہر نیکی کی ترغیب دیتا اور ہر برائی سے روکتا ہے۔ مسلمانوں سے میری استدعا ہے کہ مرتے دم تک اپنے مذہب کے ساتھ مکمل وابستگی کا ثبوت پیش کر دکھائیں "

یہ اس مرد مومن کے دل کی آواز ہے جسے اللہ پاک نے راہ مستقیم کی ہدایت سے نواز کر ظلمات کفر سے نور ایمان کی طرف آنے کی توفیق عطا کی۔ اس نے اپنے آبائی مذہب مسیحیت سے بیزار ہوکر پورے انشراح کے ساتھ اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کی صف میں شامل ہونے کو ترجیح دی، قبول اسلام سے پیشتر روبرٹ کیننگ کے نام سے معروف تھے اور اب محمد اسامہ بن عبداللہ کے نام سے جانے جاتے ہیں، عمر ۲۵ سال، پیشہ - درس و تدریس

ذیل میں ہم ان سے لیا گیا ایک انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔

سوال: آنجناب کے مشرف بہ اسلام ہونے کے ظاہری اسباب کیا ہیں ؟

جواب: جب میں ملیشیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا ان ہی دنوں اپنے مالیزین رفقاء درس کی ملاقاتوں، انکے حسن سلوک اور اخلاق کریمانہ کی وجہ سے میرے دل میں یہ تمنا انگڑائیاں لینے لگیں کہ مذہب اسلام کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائیں، اور میری یہ تمنا اس وقت برآئی جب مجھے انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ خرید کر دو ہفتہ کی مسلسل جانفشانی کے بعد حرفاً حرفاً اسکے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور اسکے بعد آپ ہی آپ کلمہ شہادت " لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ " کے الفاظ میری زبان پر جاری ہو گئے۔

سوال: مطالعہ قرآن سے آپ کے اوپر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

جواب: اس سوال کا کوئی کافی وشافی جواب دینا میرے لئے دشوار ہے، اس لئے کہ قرآن پاک

انسانوں کی زندگی پر مختلف زاویوں سے اثر انداز ہوتا ہے، میں قرآن کا مطالعہ انگریزی ترجمہ کی مدد سے ہی کرسکتا ہوں۔ اسکی اصل یعنی عربی میں، میں نہیں پڑھ سکتا، جسکی وجہ سے اسکے حسن وجمال، گیرائی وگہرائی اور قوت وتاثیر کا حقیقی ادراک میں نہیں کرپاتا، اسکے باوجود قرآن کریم کی حقیقت بیانی اور دلوں میں اسکی اثر اندازی کو پورے طور پر محسوس کرتا ہوں، اسکے اندر تخلیق کائنات رسالتِ ابدیہ اور توحید خداوندی جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، دوران مطالعہ مجھے محسوس ہوتا ہیکہ یہ سب ایک حقیقت ہے جس میں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

سوال: ماضی میں آپ جن چیزوں کے عادی تھے ان سے گریز کرنے میں آپ کو کوئی دشواری بھی پیش آئی ؟

جواب: جب سے میں اس دولت بے بہا (اسلام) سے سرفراز کیا گیا، الحمد للہ اس کے بعد سے ہر چیز میرے لئے آسان کردی گئی، لہذا شراب نوشی سے گریز، مختلف غلط عادات واطوار سے اجتناب، نماز پنجگانہ کی پابندی، رمضان المبارک کے روزوں کا اہتمام، یہ سب چیزیں میرے لئے مسئلہ کھڑا کرسکتی تھیں، لیکن توفیق خداوندی شامل حال رہی کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، اس لئے نہیں کہ اپنے اندر کوئی خارق عادت صفت یا غیر معمولی قوتِ ارادی پائی جاتی ہو، بلکہ محض خدا کی توفیق اپنے مہربان ساتھیوں کے تعاون اور تمام مسلمانوں کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے، اس رحیم مطلق نے ہی مجھے راہ حق کی رہنمائی فرمائی، ورنہ اپنی بساط ہی کیا تھی کہ ایسے پرآشوب ماحول سے دامن چھڑا کر اسلام کے خوانِ یغما کی زلہ ربائی کرسکتا،

سوال: اسلام لانے کے بعد آپ کے خاندان والوں کا ردعمل کیا ہوا۔؟

جواب: جب میں نے اپنے والدین کو اپنے دولت اسلام سے سرفراز ہونے کی خبر دی تو ان کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگے لیکن انہوں نے کوئی منفی رویہ نہیں اپنایا۔ اس واسطے کہ وہ پہلے سے بھی ہمیشہ ہماری ہمت افزائی کرتے رہتے تھے اور پھر ہمارا خاندان بھی ماشاء اللہ سنجیدہ ہے لیکن افسوس ہیکہ اب تک وہ لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، میں اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ بارالٰہا وہ دن جلد لا۔

جب میرے پورے خاندان والے تیرے محبوب کی لائی ہوئی شریعت کے مبلغ بن جائیں۔ تمام مسلمان بھائیوں سے میری مودبانہ التجا ہے کہ اپنی مخصوص دعاؤں میں ہمارے خاندان والوں کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو راہ مستقیم کی طرف گامزن فرمادے

سوال: مغربی ممالک میں اسلام کی اشاعت کیلئے مسلمانوں کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔

جواب: اگر ہم لوگ قلباً و قالباً (روحانی، جسمانی) ہر لحاظ سے اسلام کی عملی نمائندگی کرنے لگیں تو ساری دنیا کے بنی نوع انسان کے لئے اسوہ بن سکتے ہیں، لیکن جب مسلمانوں کا رویہ ہی باعث ننگ و عار ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے دشمنان اسلام کو ہوا ملے گی اور ان کی ریشہ دوانیاں تیز سے تیز تر ہوتی جائیں گی۔ اگر ہم اسلام کی تعلیمات اور اسکے اخلاق کریمانہ سے اپنی زندگی کو مزین کرلیں تو دنیا کے سامنے ایک حقیقی مسلمان کا آئینہ، بلکہ جیتی جاگتی تصویر پیش کرسکتے ہیں لہذا ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اولاً ہم اپنے آپ کی فکر کریں، اپنے اخلاق کو سنواریں معاملات کو درست کریں اسلئے کہ دین نام ہی معاملات کو درست رکھنے کا ہے پھر ہم اپنے مسلمان بھائی، بہنوں کی مدد کریں جو مسلمانوں کے معاملات کی فکر نہیں رکھتا وہ حقیقی مسلم نہیں جیسا کہ ارشادات نبوی سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر ہم لوگوں نے اتنا ہی کرلیا تو مسلمانوں کے آپسی انتشار کو ختم کیا جاسکے گا اور انکی شیرازہ بندی ممکن ہوسکے گی۔ غیروں کی نگاہوں سے غفلت کے دبیز پردے چھٹ جائیں گے اور اسلام کی حقانیت غالب ہوکر رہیگی۔ خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کو پورے طور پر اپنی زندگی نافذ کرنا ہی مغربی ممالک میں اسکی اشاعت کا سب سے موثر اور بڑا ذریعہ ہے۔

سوال: ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مستقبل میں آپکے کیا عزائم ہیں۔

جواب: پیشہ کے اعتبار سے تو میں درس و تدریس ہی کو ترجیح دوں گا اس لئے کہ دعوت کی راہ میں یہ سب سے نمایاں اور عظیم الشان کردار ادا کرتا ہے اور اسکی مدد سے میں اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرسکوں گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ میرے اندر تاحین حیات اس راہ میں قربانی کا جذبہ، حوصلہ امنگ اور توفیق مرحمت فرمائے، مجھے اور میرے تمام دینی بھائیوں کو اشاعت اسلام کیلئے ہر ممکن موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں بھرپور مدد فرمائے۔

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ قسط (۵)

حج کی نیّت

ہا انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز قائم کرنے کے لیے ہالینڈ کی ملکہ جولیانا نے اپنا ایک پورا محل عطیہ کیا تھا۔ یہ شاندار محل ہیگ کے ایک فیشن ایبل اور امیرانہ حصے میں واقع تھا۔ ایک طرف وسیع و عریض سرسبز باغ تھا۔ دوسری طرف شہر کا سب سے مہنگی دوکانوں والا بازار تھا۔ درمیان میں اینٹوں کے فرش کا ایک کھلا میدان تھا۔ محل کے الگ الگ حصوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے رہائشی کمرے تھے۔ ایک منزل پر ڈائننگ روم، کامن روم، اور لائبریری تھی۔ دوسری منزل پر لیکچر کلاس روم اور رفقاکار کے لیے کشادہ دفاتر تھے۔ دیواروں پر دیدہ زیب نقش و نگار تھے۔ چھتوں سے بڑے خوبصورت بلوری فانوس لٹک رہے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سارا ماحول شاہانہ تھا۔ پہلا کورس اسی سال شروع ہوا تھا۔ اس میں آٹھ ملکوں سے ۲۲ طلبا شامل تھے جن میں چھ لڑکیاں تھیں لڑکیوں میں پاکستان سے صرف ایک لڑکی جو بین الاقوامی امور میں ایم۔ اے۔ کا کورس مکمل کرنے آئی تھی۔ اس کا نام مس خورشید حسن تھا جو بعد میں خورشید حیدر بنیں۔ پاکستان واپس آکر انھوں نے کچھ عرصہ تک کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ پھر فارن سروس میں داخل ہو کر ہالینڈ میں سفیر کے عہدے پر فائز ہوئیں اور آج کل وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ میں خورشید نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا ہوا تھا۔ وہ نہایت صاف گو،

بے باک، بے خوف، بااصول، اور خوش خصال لڑکی تھی، پاکستانیوں کے گروپ میں ہم چھ فرد تھے۔ میٹنگ میں پہنچتے ہی خورشید نے ہمیں فوراً اپنے ڈسپلن کے چھاتے تلے دھر لیا۔ کبھی نرمی اور کبھی گرمی سے اس نے ہمیں واضح کر دیا کہ غیر ملک میں ہمیں کیا کرنا چاہئیے یا نہیں کرنا چاہئیے۔ کیا کہنا چاہئیے اور کیا نہیں کہنا چاہئیے جس سے پاکستان کے وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔ میں نے فوراً اس کی برتری اور بالادستی کو تسلیم کر لیا اور اپنی شوٹ میں اپنی زندگی کو اس کے ہدایت نامہ کے سانچے میں ڈھالنے دکھا۔ غالباً اس کی وجہ پاکستان کا وقار بڑھانا کم اور خورشید کی خوشنودی کو برقرار رکھنا زیادہ تھی۔

اپنی دیگر گوناگوں خصوصیات کے علاوہ خورشید صوم وصلوٰۃ کی پابند بھی تھی۔ اس کی ایک ہی سہیلی ایک جینی لڑکی وکٹوریہ تھی۔ دینی لحاظ سے وہ بھی اپنے مذہب کی پابند تھی۔ بارش ہو یا برف، جھکڑ ہو یا طوفان وہ ہر اتوار کو منہ اندھیرے ایک مقامی گرجے میں جاکر عبادت کرنے سے ہرگز نہ چوکتی تھی۔

اس برس رمضان شریف کا مہینہ گرمیوں میں آیا۔ ادارے میں ڈنر کا وقت تو شام کے سات بجے ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن خورشید نے ایسا بندوبست کیا کہ روزہ رکھنے والوں کے لیئے باورچی خانہ ساری رات کھلا رہتا تھا۔ ان دنوں افطاری تقریباً تو ساڑھے نو بجے ہوتی تھی ہم میں سے جو لوگ روزہ رکھتے تھے۔ خورشید خود ان کے لئے افطاری اور کھانے کا اہتمام کرتی تھی دو ڈھائی گھنٹے بعد جب سحری کا ٹائم آجاتا۔ اس وقت بھی وہ اپنے ہاتھوں ہماری سحری کا انتظام کرتی تھی۔

جون کے آخر میں میرا کورس ختم گیا۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران خورشید نے مجھے ترتیب اور اطاعت کے جس سانچے میں ڈھال رکھا تھا اس کی برکت سے میں نے واپسی پر حج کا فریضہ ادا کرنے کی نیت باندھ لی۔ اس نے حج نے اگر کچھ ثواب کمایا ہے، تو اس کے بیشتر حصہ کی حقدار خورشید ہی ہے۔

انڈونیشیا پر گئی سو برس حکومت کرنے کی وجہ سے ہالینڈ کا مسلمانوں کے ساتھ بڑا طویل واسطہ رہا ہے۔ لائیڈن یونیورسٹی کی مشرقی تعلیمات میں اسلامی علوم کا عظیم الشان مرکز بنا ہے لیکن اس کے باوجود لندیزیوں کے دل مسلمانوں کے خلاف تعصب اور تنقص

ت سے خالی نہیں۔ ہالینڈ میں ہر بچے کی پیدائش میونسپلٹی کے دفتر میں رجسٹر کرانی لازمی
اس مقصد کے لیے جو فارم بھرنا پڑتا ہے۔ اس کے ایک خانے میں بچے کا مذہب بھی
نا پڑتا ہے۔ کچھ والدین یہ خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ سن بلوغت کو پہنچ کر بچہ اپنی
یہ جو مذہب اس کا جی چاہے اختیار کر لے۔ کئی میونسپلٹیوں میں مجھے ایسے فارم بھی نظر آئے
الدین نے مذہب کا خانہ خالی چھوڑ کر اس کے نیچے اپنے ہاتھ سے یہ شرط لکھی ہوئی تھی: "ہمارا
پسند کا کوئی مذہب اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے، سوائے اسلام کے۔"
لوڈز میں آرنہم کے وسیع و عریض جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تھک کر درختوں کے جھنڈ میں
پر بیٹھا تو قریب کے بنچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سورہ رحمٰن کی تلاوت
آئی۔ ایک نہایت خوش پوشاک، فرنچ کٹ ڈاڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کیے جھوم جھوم
ر رحمٰن کی قرات کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اٹھ کر السلام علیکم کہا۔ اس نے
سلام رحمۃ اللہ و برکاتہ کہہ کر جواب دیا۔
پ ڈچ مسلمان ہیں؟" میں نے پوچھا۔
نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی بوگ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا
ستان ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب
وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے
ٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگو شپ کا کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بندرگاہوں
پ کے درمیان سامان ڈھونڈتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندرگاہ
سامان لادنے کے لیے رکا۔ گرمی اور حبس کا موسم تھا سامان لادنے والے مزدور پسینے میں
تھے۔ جہاز کے عملے نے انھیں ٹھنڈا پانی دیا تو سب نے پینے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا روزہ
بوڑھے مزدور پر ڈی بوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی حبس اور سامان کے بوجھ تلے بےحال
ا۔ دوسروں کی نظر بچا کر وہ اس بڈھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس
دے کر اشارے سے کہا کہ اسے یہاں پر کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ چپکے سے اسے پی لے
نے گلاس واپس کر دیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ اللہ کہتا ہوا چلا
گیا۔ اللہ کے ایک بندے کا خدا کی ذات پر اس قدر مکمل، بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان۔

ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس کے بعد قبول کی۔ اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جہاز کے عملے میں ڈچ زبان کا جاننے والا ایک انڈونیشی مسلمان تلاش کر لیا۔ اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا، حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جا کر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ دو برس اور مرچنٹ فلیٹ میں رہا۔ لیکن اپنا اسلام خفیہ رکھا۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد وہ آرنہم کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی۔ لیکن دو بیٹے جو ترک وطن کر کے آسٹریلیا میں آباد ہو گئے ہیں، اس نعمت سے محروم رہ گئے تھے۔

عبیداللہ ڈی ہوگ صاحب نے اپنے ایک دوست کا بھی ذکر کیا جو ہالینڈ کے ایک بڑے بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بھی کئی برس سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنی ملازمت کے دوران یہ راز افشا کرنے کی جرات نہیں کر سکتے، کیونکہ اس سے اس کی ترقی کے امکانات ہی مسدود ہونے کا خدشہ نہیں، بلکہ خود ملازمت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

یہ تعصبات صرف ہالینڈ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی اور معاشرے بھی اسلام کے متعلق اسی قسم کی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے اپنی جگہ بڑے متمدن تعلیم یافتہ آزاد خیال، متحمل، روادار اور سیکولر شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کے سیاق میں ان کی آزاد خیالی، بردباری، اور سیکولرازم بڑی حد تک سلب ہو جاتی ہے اس کی ایک وجہ تو وہ زہر ہے جو مسیحی پادری اور یہودی مذہبی پیشوا صدیوں سے اسلام کے خلاف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے پھیلاتے رہے ہیں۔ دوسری وجہ یوروپین مستشرقین کا ایک خاص گروہ ہے جس نے علم و دانش کے پردے میں اسلام اور مسلمانوں کے خدوخال مسخ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے گمراہ کن اقوال و افکار صرف دوسروں ہی کو اسلام سے بدظن نہیں کرتے بلکہ احساس کمتری میں مبتلا بعض مسلمانوں کے لئے بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں ہالینڈ میں اس گروہ مستشرقین کی ایک واضح مثال پروفیسر سنوک ہرگونین [Prof. C. Snouck Hurgronje] ہے۔ یہ صاحب لائیڈن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۸۵ء میں انہوں نے چھ ماہ جدہ میں گزارے اور پھر ایک فرضی اسلامی نام رکھ کر چھ ماہ کے لئے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حدود حرم میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب جعلی مسلمان کے بھیس میں وہاں رہے یہاں میں مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت

ترجمہ میں تو بات صرف دو جلدوں کی ایک کتاب "Mekka" نامی لکھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈچ زبان میں حج کے موضوع پر کتاب "جشن مکہ" (Het Mekkansche Feest) کے عنوان سے بھی لکھ چکے تھے، جو لوگ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی رسوائی اور مسلمانوں کے حالات کا کھوج لگانے نکلے ہوں۔ ان کے مقاصد میں خوش نہادی، غیر جانبداری اور انصاف طلبی کی تلاش سعیٔ لاحاصل ہے۔ یہ ایسی ہی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ ایک عام ولندیزی کے ذہن میں مسلمانوں کا تصور مردم گشتگی، بے راہ روی، بربریت اور بد معاملگی کے مترادف تھا۔

میونسپلٹیوں کے نظام کے مطالعہ کے سلسلے میں مجھے ہالینڈ کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک جگہ میری رہائش کا بندوبست ایک ایسے خاندان میں ہوا، جس میں پانچ بیٹیاں اور چار لڑکے تھے۔ یہ خاصا مذہبی گھرانہ تھا۔ پہلی شام جب ہم اکٹھے بیٹھے، تو سارے لڑکے اور لڑکیاں میرے گرد ہو گئے کہ بتاؤ کہ پاکستان میں تمہاری کتنی بیویاں، کتنی لونڈیاں، اور کتنے غلام ہیں۔ وہ بڑی دیر تک مجھ پر اس موضوع پر جرح کرتے رہے۔ میرے جوابوں سے مایوس ہو کر ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یا تو یہ شخص واقعی مسلمان نہیں یا ہمارے ساتھ مسلسل جھوٹ بول رہا ہے۔

جون کا مہینہ ختم ہوتے ہی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشیل اسٹڈیز میں میرا کورس پورا ہو گیا۔ وطن کو واپس لوٹنے سے پہلے میں نے حج کی نیت کر لی۔ اس سال حج کا دن اگست کے مہینے میں پڑتا تھا۔

سفر حج کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک روز میں ہیگ میں امریکن ایکسپرس کے دفتر گیا۔ ہالینڈ کے دارالخلافہ میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھے، ان میں امریکن ایکسپریس کا کام سب سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد شمار ہوتا تھا۔ یہاں ہر وقت ایسے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لمبا سے لمبا سفر کرنے کے خواہشمند تھے۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پہچانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور سیاحوں کے سنگھاٹے میل نیویارک، لندن، پیرس، جینوا، روم، بیروت، قاہرہ، ہانگ کانگ، ٹوکیو، جیسے شہروں میں ہوتے تھے۔ اس قسم کا سفر کتنا ہی طویل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو، امریکن ایکسپریس کے بحری بری اور ہوائی سفروں کے ماہر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پوری تفصیلات تیار کر دیتے تھے

ریل اور جہاز کے ٹکٹ چلنے اور ٹھہرنے کے اوقات نامے، ہوٹلوں کے پتے اور بڑے بڑے مختلف شہروں میں قابل دید مقامات کی فہرست، رقص گاہوں اور کلبوں کے ٹیلیفون نمبر...

امریکن حال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکوائری آفس کی ایک لڑکی سے ہوا اس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لہجے میں میرا استقبال کیا "گڈ مارننگ سر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ" میں نے کہا "میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں اس سفر کے متعلق معلومات حاصل کرنے یہاں حاضر ہوا ہوں۔"

"ساعُوعُودی عرے بیا ــ ساعُوعُوعُودی عیرے بیا ــ یا" لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا اور پھر امریکن انداز میں شانے سکیڑ کر میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے کوئی عجیب وغریب سوال پوچھ لیا ہو۔

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو نیم بیضوی جنبش دینے کے بعد وہ بادل ناخواستہ اٹھی اور مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی۔ سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے مجھے کن انکھیوں سے گھورا اور پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے ماہر کے حوالے کر دیا۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری شعبے میں بھیج دیا اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے منیجر کے پاس لے گیا۔

سعودی عرب کا نام سن کر منیجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک ضخیم اٹلس نکال کر اس میں مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا پھر اٹھ کر سامنے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا جس میں ساری دنیا کے ہوائی، بحری، اور بری راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے۔ میں نے جدہ، مکہ اور مدینہ پر انگلی رکھ کر منیجر سے کہا اگر میں ان تینوں شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائیگا

منیجر نے اپنی میز سے سرخ جھنڈیوں والے کئی پن اٹھا کر ان مقامات پر نشاندہی کے طور پر لگا لیے۔

دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے تھے لیکن اس نقشے میں یہ شاہراہیں بغداد اور تہران دمشق اور بیروت تک آ

اور پورٹ سعید سے ہوتی ہوئیں سیدھی آگے یا پیچھے، دائیں یا بائیں ہو کر [illegible]
اور ان کے درمیان حجاز کی سرزمین مقدس ایک تھلگ پڑی رہ جاتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک
ابھی سعودی عرب میں دولت دنیا کی ریل پیل شروع نہیں ہوئی تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ
منورہ کے نام مسلمانوں کے دل پر تو بے شک خوب نقش تھے۔ لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ
میں ان کا ذکر تک نہ آتا تھا۔ حالانکہ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ
در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے رہے تھے۔ پیدل اونٹوں پر، موٹروں پر،
ریلوں پر، کشتیوں میں، ہوائی جہازوں کے ذریعہ ... روئے زمین پر کوئی اپنا مقام نہیں
جہاں اتنی رنگتوں، نسلوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس قدر تعداد میں جمع ہوتے
ہوں۔

"مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے۔" امریکن ایکسپریس کے منیجر نے نقشوں کا سرسری جائزہ ختم
کرکے کہا۔ "لیکن مجھے دو روز کا وقت دیں تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید
مشورہ دے سکوں۔"

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر میں گیا، تو منیجر کے سامنے بہت
سے سفری گائیڈ کا انبار لگا ہوا تھا لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ
کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ اس بات میں میری مدد کرنے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا
بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ پہنچنے کے لئے سفر کا کون سا طریقہ اختیار کروں۔
"اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔" منیجر نے معذرت آمیز انداز سے کہا "ہاں
حج کے زمانے میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لئے ہوائی جہازوں، سمندری جہازوں
اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں۔ یہ انتظامات ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں
ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔"

بہر سبیل تذکرہ منیجر نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا، "جہاں تک میری معلومات کا
تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس موسم میں سعودی عرب کا سفر صحت کے لئے خطرات سے
خالی نہیں۔ گرمیوں میں وہاں کا درجہ حرارت ۱۲۵ ڈگری سے بھی اوپر پہنچ جاتا ہے [illegible]
بھی اس ملک میں حفظان صحت کا کوئی بند و بست نہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنا ارادہ [illegible]

بہلنے والے ہوں تو حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے۔
تو آپ ضرور واقف ہو گئے ؟ بیلے بیلے بحیرہ روم کے درمیان وہ خوشنما جزیرہ
چیکیلی دھوپ ہے۔ خوبصورت سیرگاہیں ہیں۔ اطالیہ کے انگوروں کی بہترین
مصر کا سابق شاہ فاروق ہے۔ دراصل کیپری آج کل دنیا بھر کے سیاحوں کا مکہ ہے
زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو میری رائے میں کیپری ضرور جائیے۔"
میں ٹیمپر کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں یہ شعر گنگناتا ہوا وہاں سے اٹھ

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

اس سفر کے متعلق بیروت، دمشق اور بغداد سے بھی سفارت خانوں، سفر
اور مقامی دوستوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں۔ وہ بڑی مایوس کن
قاہرہ سے البتہ امید کی ایک مدہم سی کرن ضرور جھلملائی۔ مصر کی انقلابی حکومت
کر رکھا تھا کہ حج سے ایک ماہ پہلے ہر تیسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر
جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لئے مخصوص تھے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا
میں ایک پاکستانی مسافر کے لئے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ بہرحال یہ خبر اس لحاظ سے اطم
کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لئے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے۔ باقی
تو مسدود تھیں یا ان پر لاعلمی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفےٰ الفخری کو سنائی تو ا
انداز سے سر ہلایا۔ "تم جا کر کوشش کر دیکھو مجھے بالکل امید نہیں کہ تمہیں
اور پھر امریکن ایکسپریس کمپنی کے ٹیمپر کی طرح مصطفےٰ الفخری نے بھی مجھے ایک
قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو تو سیدھے بیروت چلے آنا۔ وہاں میرے بہت
ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے وہاں کے
یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں آ
وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی۔"

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پید

ساز کے لئے میں نے جو بھی راستہ نکالا تھا۔ اس پر وہ الف لیلیٰ کے فیادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ نفس بہ نفیس موجود تھا یہ تو سا اس کی محبوب مقامہ تھی ۔۔۔

شام کو نیپلز واپس پہنچا تو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک اور مشکل پیش آئی جو ویٹرس میری میز پر متعین تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی نا آشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب کے متعلق کسی طرح اس پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں لیکن وہ ہر بار اپنی گردن مٹکا کر اور شانے اچکا کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کسمپرسی کو بھانپ کے قریب والی میز سے ایک نوجوان اٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا۔ "کیا میں آپ کی کچھ [illegible] کر سکتا ہوں۔۔؟"

"شکریہ" میں نے کہا۔ "میں ویٹرس کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے لئے گوشت اور شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں تو وہ لے آئے لیکن [illegible] سور کی چربی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ویٹرس آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

"نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمدللہ۔" نوجوان نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: "میں شام کا رہنے والا ہوں۔ آئیے آپ ہماری میز پر آ جائیے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے [illegible] ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ "میرا نام رشید مومن ہے۔ یہ میری منگیتر نزیہہ ہے۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آج کل نیپلز آئے ہوئے ہیں کیونکہ داناؤں نے کہا ہے۔ (See Naples [illegible] dies)"

پھر اس نے نزیہہ سے میرا تعارف کرایا۔ "آپ پاکستانی ہیں۔ الحمدللہ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے ہے نا نزیہہ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے، شراب نہیں پیتے۔ خالص [illegible] سے بھی پرہیز ہوگا۔ انڈے اور مچھلی سے بھی بھاگتے ہیں، اگر چربی میں تلے ہوئے ہوں تو [illegible] نہیں نزیہہ! ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں؟" رشید مومن نے نزیہہ سے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے" نزیہہ نے خلاف توقع کہا۔

بھی ہیں چھوٹی کمزوریاں تو نہیں ہیں ـــ۔" میں نے بھی مذاقاً جواب دیا۔
رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ نزہہہ جھینپ گئی۔
"واللہ، نزہہہ جب تم شرماتی ہو تو تمہارا چہرہ اسی طرح کی طرح عنابی ہو جاتا ہے۔"
رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا لیا پھر انہوں نے اپنے اپنے گلاس بلند کئے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ میرا جام صحت نوش کیا۔

کچھ دیر اسی طرح کی پر لطف باتیں ہوتی رہیں۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھا ہوا مزاج تھا۔ نزہہہ کے خلوص کی سادگی بڑی دلآویز تھی۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ میرے سفر حجاز کی طرف پھر گیا۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزہہہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کر چکے تھے اور ان کی آنکھوں میں سرور کی ایک لطیف سی غنودگی بھی اتر آئی تھی لیکن حج کا ذکر آتے ہی دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آپ حجاز جا رہے ہیں؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں" نزہہہ نے بڑے جوش سے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایک ایسی چمک ایک بار کھل چھلک آیا۔ جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوشنما تھا۔
"آپ نزہہہ کی باتوں میں نہ آئیں" رشید مومن نے کسی قدر تلخی سے کہا "سب جوان دل بھی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے۔"
"خدا کے لئے رشید ایسی باتیں نہ کرو" نزہہہ نے احتجاج کیا۔ "اگر تم ایسی باتیں کرو گے میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا کی قسم، کبھی معاف نہ کروں گی۔"
"میرا تجربہ ہے کہ نزہہہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔" رشید مومن نے لاپرواہی سے "میں اس کی وقتی خفگی گوارا کر لوں گا، لیکن حجاز کے متعلق اپنے دوست کو کسی قسم کی لا میں مبتلا نہ رہنے دوں گا۔"

ہوٹل ٹرمینس کے ڈائننگ روم میں بیٹھے بیٹھے اب رشید مومن کے تن بدن میں ان مغربی مستشرقین کی روح حلول کر آئی تھی جنہوں نے حج اور اسلام کے متعلق گمراہ کن کتابیں لکھ کر اپنے زہریلے تعصبات کو علم و دانش کا لباس پہنا رکھا ہے۔ رشید مومن کا ذہن بھی انہی [illegible] کی طرح آراستہ تھا۔ [illegible] ہوا ایک متعفن قے کی طرح [illegible] میز پر اندیلا

شروع کر دیا۔ ریڈ وائن کی ترنگ میں وہ بڑے جوش و خروش سے اپنی فرمائشیں بکتا رہا اور نزہیہ اس کے سامنے ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے جھنجھوڑتی تھی۔ کبھی بوتلوں کو اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی۔ کبھی نیپکن کو اپنی انگلی کے گرد یوں لپیٹ کر کھینچتی تھی کہ اس کی مخروطی بانہوں میں خون کی رگیں ابھر کر بڑی شدت سے کپکپانے لگتی تھیں۔ نزہیہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگ کے دو شعلے لپک پڑیں گے۔ اس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے ذہن سے زہر کے فوارے پھوٹ کر بہنے لگیں گے۔ ہماری میز پر بڑا شدید تناؤ ابھر رہا تھا۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کی جو ایک میٹھے ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔

"بے شک آرکسٹرا بڑی حسین دھنیں بجا رہا ہے" رشید مومن نے گویا چونک کر کہا "تم دونوں یہاں بیٹھ کر دین کی باتیں کرو میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بے چاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے۔"

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا جہاں ایک خوبصورت آراستہ لڑکی لائم جوس سے دل بہلا رہی تھی اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شیمپین پینے میں مشغول ہو گئے۔

رشید مومن دیر تک اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا۔ نزہیہ اپنی کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت، ایک عمیق غصہ اور ایک شدید انتقام چمک رہا ہے۔ وہ بار بار کچھ بولنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر کچھ کچھا کر رہ جاتے تھے۔

آدھی رات گئے جب ہوٹل ڈریسنگ کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا دونوں نشے میں دھت تھے۔

"یہ کیا واہیات ہے" رشید مومن ناراض ہونے لگا "ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں۔ چلو ہم سب کسی ایسی جگہ چلیں وہ صبح تک کھلا رہتا ہے۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں تم خوشی سے جاؤ" نزہیہ نے بیزاری سے کہا۔

"بہت اچھا۔ شب بخیر مجھے امید ہے کہ پاکستان ہمارا یہ مہمان تمہارا دل بہلاتا رہے گا۔ یہ پاکستان سے آئے پہلی مرتبہ ... ہیں ... ہم ... مگر ... تے ...

اور نزہبہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں ـ ـ ـ ـ ہا ـ ہا ہا ـ ـ ہا ہاہا ـ ـ رشید موسیٰ کی طرح قہقہے لگاتا، جھومتا، لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا

کچھ دیر نزہبہ میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھے رہی ۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں کے درمیان چھپا ہوا تھا مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اب اگر اس نے رونا شروع کر دیا تو میں کیا کروں گا؟ پھر مجھے ڈر لگتا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک آنسو گرنے لگیں گے اور میں دل ہی دل میں ان الفاظ و فقروں کی تلاش میں تھا جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دلجوئی کے لئے استعمال ہوا کرتے ہیں ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ نزہبہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں ۔ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جو جلتا دیکھتے ہی بھڑک سے شعلہ پکڑ لیتی ہیں ۔ اس کا چہرہ تھکن آلود تھا اور اس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا ۔ آؤ ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چلیں بیٹھیں یہاں پر مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے ۔

" آپ بہت تھک گئی ہیں " میں نے کہا " آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں تو زیادہ بہتر ہوگا "

نہیں میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی اس وقت میں اگر اکیلی رہ گئی تو یقیناً میرا برا حال ہو جائے گا ۔ "

" آپ اکیلی نہیں ہوں گی " میں نے کہا جب تک آپ کو نیند نہ آ جائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا

نزہبہ کچھ دیر سوچتی رہی ۔ پھر بولی " ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی ایک جگہ اکیلے رہ جائیں تو ان کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان ہو جاتا ہے ۔ "

" شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں " میں نے مذاقاً کہا " لیکن اب میں نے اس کے داؤ پیچ سے بچنا سیکھ لیا ہے "

نزہبہ ہنسنے لگی ۔ اوپر جانے کے لئے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو نزہبہ کے ساتھ رشید موسیٰ کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ بوائے عجیب انداز سے مسکرایا ۔

" آپ کی شب خوش خوش بسر ہو " لفٹ بوائے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا ۔

" شکریہ " میں نے اسے ایک سولیرا کا ٹپ دیا ۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نزہبہ کہنے لگی " اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کر رہوں پھر بھی لفٹ بوائے کی نظر میں تو وہی رہوں گی جو اس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے ۔ "

"کوئی بات نہیں" اس نے کہا۔ "انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے۔"

"ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں۔" نزیہہ ہنسنے لگی۔

"گناہ کا امکان گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کی ایک حقیقت بن جاتا ہے جس کے لئے توبہ کا دروازہ بھی کھلا رہتا ہے اور آئندہ اس سے گریز کرنا بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ لیکن بری بات کا امکان خون میں رچے ہوئے زہر کی طرح ہر وقت رگ و پے میں گردش کرتا رہتا ہے۔"

نزیہہ نے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر تکیہ لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ "یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلودہ ہوتا ہے کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

نزیہہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر اپنا سگریٹ لائٹر مجھے دیا "اس لائٹر کو دیکھو۔ اس پر بڑی خوبصورتی سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ نقش کیا ہوا ہے۔ امریکی کمپنیاں یہ لائٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لئے بنا کر بھیجتی ہیں۔"

"پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اب اس کی مدد سے سگریٹ سلگائے جاتے ہیں"، میں نے کہا۔

نزیہہ ہنسنے لگی۔ "اب وہ لطف ہوا ہے مجھے جو بھی چاہے سمجھے، لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں مسرور ہوگی۔ شاید اس وقت وہ میرے لئے دعا مانگ رہی ہو شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں جس طرح اپنے گھر پڑھا کرتی تھی۔"

نزیہہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا۔ جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا اور اس سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

"جب میں یورپ آ رہی تھی تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی عظمت سعادت مندی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر یہ قرآن مجید کی جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری سیدھی [illegible] ہو جائے گا۔"

"دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن شریف بڑا مظلوم صحیفہ ہے" میں نے جان بوجھ کر طنزیہ کہا "کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں میں باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ ہمارے ہر مسلمان گھرانے میں ایک دو قرآن خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر ضرور رکھے جاتے ہیں خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں آپ نے بھی ایک جلد اٹیچی کیس میں بند کر کے رکھ چھوڑی ہے، تو رسم زمانہ کے عین مطابق ہے"

اب نزہت کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے لگی. کس طرح مشرق وسطی میں لوگ اپنے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح لئے پھرتے ہیں بعض عادتاً یا فیشن کے طور پر، بعض محض اعصاب کی آسودگی کے لیے۔

کچھ دیر کے لئے جب میں رخصت ہونے لگا تو نزہت مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "کیا آپ میرے لئے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

"بسر و چشم" میں نے جواب دیا

نزہت کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی "جب آپ خانہ کعبہ کی زیارت کریں تو وہاں پر فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔

یہ تو بڑی آسان فرمائش ہے" میں نے کہا" وہاں پر میں آپ کے لئے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔

"آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق نہیں ہے"

نزہت نے اس نمی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی جو دفعتاً اس کی خوبصورت آنکھوں میں اتر آئی

"میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کروں گا۔ ایک بار نہیں، کئی بار اور جب میں روضہ اقدس پر حاضر ہوں گا، تو آپ کا سلام بھی عرض کروں گا۔"

روضہ اقدس کے ذکر پر نزہت نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی اسکارف اتار کر اس سے سر ڈھانپ لیا، پھر کچھ کہنا چاہا لیکن جھجک کر خاموش ہو گئی۔

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ٹوپی درست کی اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا، میں نے پھر اسے ایک سولیرا کا ٹپ دیا

کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا تو اسے دیکھ کر یہ لفٹ بوائے ایک بار پھر کن انکھیوں سے گھور کر مسکرائے گا۔ شاید رشید مومن بھی اسے ایک سولیرا کا ٹپ دے۔۔

مفتی محمد تقی عثمانی

ضیاء شہید رح

(قسط دوم)

[۶] ہمارے ملک کے ہر دستور میں یہ دفعہ لکھی جاتی رہی ہے کہ "ملک کے تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق بنائے جائیں گے" لیکن صدر مرحوم سے پہلے یہ دفعہ دستور کی ایک بے جان دفعہ تھی، نہ کبھی اس دفعہ کے تحت کسی قانون کو اسلامی بنایا گیا نہ عوام کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ کسی مروجہ قانون کو غیر اسلامی ہونے کی بنا پر چیلنج کر کے اسے بدلوا سکیں۔ علماء اور نفاذ اسلام کا مطالبہ کرنے والے حلقوں کا یہ مطالبہ سالہا سال سے چلا آتا تھا کہ دستور کی مذکورہ بالا دفعہ کو موثر اور عدالت کے ذریعے قابل تنفیذ (Justiciable) بنایا جائے۔ اور اس ملک کے عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کر کے اسی طرح بدلوا سکیں جیسے بنیادی حقوق کے خلاف قوانین کو بدلوا سکتے ہیں لیکن صدر مرحوم سے پہلے کسی حکومت نے اس مطالبے پر کان نہیں دھرے یہ اعزاز سب سے پہلے صدر ضیاء الحق شہید کو حاصل ہوا کہ انہوں نے غیر اسلامی قوانین کو عدلیہ میں چیلنج کرنے کا راستہ پیدا کیا۔ اور اس غرض کے لئے وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیلیٹ بنچ قائم کیا۔ افسوس ہے کہ عوام، علماء اور دینی جماعتوں کی طرف سے اس موقع سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور اس راستے سے قوانین کی اصلاح کرانے میں بہت کم دلچسپی لی گئی جس کی بنا پر اس اقدام سے ممکنہ فوائد حاصل نہ ہو سکے لیکن اس

د ان عدالتوں نے اب تک دستیوں غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دے کر
دیا اور ان کے ذریعے قوانین کی ایک قابل ذکر تعداد کی اصلاح ہوئی۔
چند ماہ پہلے تک مالیاتی قوانین اور مسلم پرسنل لا کو کسی عدالت میں چیلنج
ے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب شریعت آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ان قوانین کو بھی
کورٹ میں چیلنج کرنے کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اس طرح دنیا
ں پاکستان واحد ملک ہے جس کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رائج الوقت
ین کو غیر اسلامی ہونے کی بنا پر عدالت میں چیلنج کر سکتے ہیں۔ اور جب عدالت
ن کے غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر دے تو وہ قانون خود بخود منسوخ ہو جاتے ہیں
ر حکومت متبادل قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور بلا شبہ یہ صدر
وم کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے۔
ہمارے ملک کے عوام چونکہ عموماً قانونی نظام کی تفصیلات سے باخبر نہیں
ں اس لئے اس موقع سے اب بھی بہت کم فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس سلسلے
عدالت سے رجوع کرنے کا طریقہ بھی بہت سادہ اور آسان ہے۔
۷۔ قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی
س سرہ، اور دینی حلقوں کی کوششوں سے منظور ہوئی تھی، لیکن پاکستان کے ہر دستور
ں وہ ایک غیر موثر دیباچے کے طور پر شامل کی گئی یہاں تک کہ اعلیٰ عدالتوں نے یہ
فیصلے دیئے کہ محض ایک دیباچہ ہونے کی بنا پر اس کی کوئی لازمی قانونی حیثیت نہیں
ہے۔ صدر مرحوم کے دور میں پہلی بار اس قرارداد مقاصد کو آئین کا موثر حصہ بنایا گیا
ور اس طرح عدلیہ کے ذریعے ملک کے قانونی نظام کی اصلاح کا ایک دوسرا اہم دروازہ
ھلا گیا۔ ابھی اس تبدیلی کے قانونی اثرات اعلیٰ عدالتوں میں زیر بحث ہیں بعض
علیٰ عدالتوں نے اس تبدیلی کی بنیاد پر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرنے سے
نکار کر دیا ہے۔ اگر عدالت عظمیٰ نے بھی اس پوزیشن کو بھی تسلیم کر لیا تو یہ تبدیلی
ملک میں غیر اسلامی قوانین اور اقدامات کی اصلاح کے لئے ایک عظیم انقلابی تبدیلی
ثابت ہوگی۔ جو یقیناً صدر مرحوم ہی کا صدقہ جاریہ ہے۔

[۸] یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ شہید مرحوم نے ملک میں نماز کے اہتمام کے لئے یادگار خدمات انجام دی ہیں ان سے پہلے نمازی لوگوں کے لئے بھی اپنی دفتری مجبوریوں کے تحت نماز کے وقت نماز باجماعت ادا کرنا سخت دشوار تھا۔ صدر مرحوم کے احکام کے تحت تمام سرکاری دفتروں میں نماز باجماعت کا موثر انتظام ہوا، اور اب شاید کوئی سرکاری دفتر ایسا نہیں جہاں دفتری اوقات میں نماز باجماعت کا انتظام نہ ہو۔ اسلام آباد سیکریٹریٹ میں اگر دن کے ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک جاکر دیکھیں تو واقعۃً محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ مسلمان ملک کا سکریٹریٹ ہے۔ تقریباً ہر عمارت اور ہر بلاک میں نماز باجماعت کے روح پرور مناظر نظر آتے ہیں اس اہتمام کے نتیجے میں لوگوں کو نماز کی ترغیب ہوئی ہے اور نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بہت سی جگہوں پر نماز کے متصل بعد چند منٹ کے وقفے میں کوئی حدیث سنانے کا بھی معمول ہے جس کی افادیت ظاہر ہے۔

سرکاری دفاتر کے علاوہ سرکاری تقریبوں اور اجتماعات کے نظام الاوقات میں نماز کی رعایت بھی اسی دور میں شروع ہوئی، ورنہ پہلے کسی سرکاری اجتماع میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ انسان یا تو نماز سے ہاتھ دھوئے ورنہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے سخت مشکلات کا شکار ہو۔ ملک بھر کے تمام ہوائی اڈوں ریلوے اسٹیشنوں اور دوسرے عوامی مقامات پر بھی نماز اور وضو کے عمدہ انتظامات بھی اسی زمانے میں ہوئے جنہوں نے نماز کی اہمیت کی عام فضا پیدا کی ہے۔ اور اس میں صدر مرحوم ہی کی ذاتی دلچسپی کو دخل ہے۔

اس اہتمام کا یہ نتیجہ میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بہت سے وہ سرکاری افسران جو پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے، رفتہ رفتہ نماز کے عادی بن گئے اور نماز ان کی زندگی کا لازمی حصہ ہوگئی۔

خاص طور پر فوج کے ماحول میں اس زمانے میں بہت نمایاں تبدیلی آئی ہے جس کی گواہی احقر کے سامنے بہت سے فوجی افسروں نے دی ہے۔ ان میں سے ایک صاحب کے الفاظ یہ تھے " کہ میں ۱۹۵۰ء سے فوج میں ہوں پہلے عالم یہ تھا کہ جنگی مشقوں

دوران اگر ہمارے چودہ افسر ہوتے تو ان میں سے تیرہ تو یقیناً ورنہ چودہ کے چودہ شراب نوشی کے عادی ہوتے تھے۔ اور اب بفضلہ تعالیٰ یہ حال ہے کہ چودہ میں سے کم سے کم بارہ افراد نماز کے عادی ہوتے ہیں۔"

(۹) صدر مرحوم سے پہلے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی تمام دکانیں ہوٹل اور ریستوران کھلے ہوتے تھے بلکہ ان میں کھانے پینے والوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی صرف ایک آدھا تہائی پردہ "احترام رمضان" کی علامت کے طور پر لٹکایا جاتا تھا صدر مرحوم نے پہلی بار یہ حکم جاری کیا کہ رمضان میں دن کے وقت ہوٹل، ریستوران اور کھانے پینے کی تمام دکانیں بالکلیہ بند رہیں گی چنانچہ گیارہ سال سے اس پر عمل ہو رہا ہے اور اب محسوس ہونے لگا ہے کہ رمضان کا مہینہ کسی اسلامی ملک میں آیا ہے۔

(۱۰) ملک میں سرکاری طور پر زکوٰۃ کی وصولیابی اور تقسیم کا انتظام بھی پہلی بار صدر مرحوم ہی کے دور میں شروع ہوا۔ اگرچہ اس کی وصولیابی اور تقسیم دونوں کے طریق کار میں بہت سے نقائص ہیں۔ جن کی وجہ سے اس اقدامات کے اثرات معاشرے پر نمایاں نہیں ہوئے زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں بالخصوص خورد برد کی اطلاعات بھی ملتی رہتی ہیں۔ لیکن جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں، اس کی خرابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنی خرد برد کا اندیشہ تھا، شاید عملاً اتنی خرد برد نہیں ہوئی۔ زکوٰۃ کی رقم کو سرکاری خزانے سے بالکل علیحدہ رکھنے اور سرکاری ملازمین کے بجائے عوام سے زکوٰۃ کی تقسیم کا کام لینے سے اس سلسلے میں کافی مدد ملی ہے بہرصورت! اس نظام کے تمام موجودہ نقائص کے باوجود اسلام کے ایک اہم رکن کو عملاً قائم کرنے کا آغاز ضرور ہوگیا ہے۔ اب اسے موثر مستحکم اور مفید بنانے کی ضرورت ہے۔

(۱۱) صدر مرحوم ہی نے تمام سرکاری ملازمین کو قومی لباس پہننے کا پابند بنا کر ملک کو انگریزی لباس سے نجات دلائی۔ ایک ایسے لباس میں جہاں ہر چھوٹا بڑا انگریزی لباس کا خوگر تھا۔ اسی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا اور اس کے حق میں دلائل دینے کے لئے ہر وقت تیار تھا یہ تبدیلی لانا بھی شہید مرحوم کے اہم کارناموں میں سے ہے جس کے نتیجے میں پہلے سرکاری دفتروں اور سرکاری تقریبات سے انگریزی معاشرت کا یہ

نشان ختم ہوا، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا اثر عام قومی زندگی پر بھی پڑا، اور اب شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ ملک میں انگریزی لباس پہننے والے اقلیت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ لباس کے مسئلے کو کوئی جتنا کتنا غیر اہم قرار دینے کی کوشش کرے۔ لیکن زندگی پر اس کے نفسیاتی اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۲) تعلیم کے نصاب و نظام میں بھی اس دور میں خاصی تبدیلی آئی تقریباً ہر مضمون کے لئے نصابی کتابوں کی تدوین میں اسلامی افکار کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اسلامیات کو تعلیم کے ہر مرحلے میں لازمی قرار دیا گیا۔ اعلیٰ سول اور فوجی افسران کے تربیتی کورسوں میں بھی اسلامیات کو ایک لازمی مادے کے طور پر شامل کیا گیا۔ ججوں اور تفتیشی افسران کو شریعت سے روشناس کرانے کے لئے ریفریشر کورسز جاری کئے گئے اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا معیار تعلیم اسلامی علوم کے لحاظ سے ملک کی تمام سرکاری یونیورسٹیوں سے کہیں زیادہ بلند ہے اور جہاں سے اسلامی قانون کے شعبے میں بعض بہت اچھے اور قابل طلبہ فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔

(۱۳) اسلامی علوم کی تدریس میں ملک کے دینی مدارس کا معیار تعلیم ہمیشہ یقیناً ملک کی ہر یونیورسٹی کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ سرکاری یونیورسٹیوں سے اسلامیات میں بھی ایم۔ اے یا پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والے علم دین میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اس کے باوجود سرکاری حلقوں میں دینی مدارس کی سند کی کوئی قیمت نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جن سرکاری مناصب پر علماء کی ضرورت تھی وہاں بھی دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے پہنچنے کا قانوناً کوئی راستہ نہ تھا۔ صدر مرحوم نے اپنی ذاتی دلچسپی سے سرکاری طور پر دینی مدارس کی سند کو ایم۔ اے۔ کے مساوی قرار دے کر تعلیمی اداروں اور دیگر سرکاری مناصب کو علماء کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا۔

آج کل یہ فقرہ بہت کثرت سے بولا جاتا ہے کہ "صدر ضیاء کے دور میں علما کا اقتدار

بلند ہوا " میرے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں ہے ۔ علماء اگر صحیح معنوں میں علماء ہوں تو کسی کے وقار بلند کرنے کے محتاج نہیں ہوتے ۔ اللہ تعالیٰ نے علم دین کو جو وقار عطا فرمایا ہے وہ کسی کے عطا کرنے سے بے نیاز ہے ۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے واقعتہً علم دین کی دولت عطا فرمائی ہو اسے ان باتوں کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا اور نہ سرکاری طور پر منظور کرنے سے اس کی عزت میں حقیقی طور پر کوئی اضافہ ہوتا ہے ۔

لیکن مسئلہ اصل میں یہ تھا کہ جن مقامات پر علماء دین کی ضرورت تھی وہاں ان کی خدمات سے استفادہ کس طرح کیا جائے ؟ پچھلے زمانوں میں نہ صرف یہ کہ یہ راستہ نہیں کیا گیا بلکہ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی ۔ صدر مرحوم نے اپنے متعدد اقدامات کے ذریعے علماء کی خدمات سے استفادہ کی راہ پیدا کر کے جہاں جہاں علماء کی ضرورت تھی وہاں پہنچانے کے قابل قدر کوشش کی ہے ۔

[۱۴] ملک میں غیر سودی بنکاری کے نام سے جو طریق کار رائج ہوا ہے اس کی خرابی پر میں " البلاغ " کے صفحات میں بار بار لکھ چکا ہوں اور شاید اس نظام کو مجھ سے زیادہ کسی نے تنقید نہ کی ہو ، لیکن ان تمام خرابیوں اور خامیوں کے باوصف صدر مرحوم کا یہ کارنامہ بلاشبہ قابل قدر ہے کہ اصولی طور پر بنکاری نظام کو سود سے پاک کرنا سرکاری طور پر طے کر دیا گیا ، اور وہ بحث ختم کر دی گئی جس میں بنکوں کے سود کی حرمت ہی کو مشکوک بنانے کی سعی کی جارہی تھی ۔ اب بحث یہ نہیں ہے کہ بینکوں کے نظام میں تبدیلی لائی جائے یا نہیں ؟ اب بحث یہ ہے کہ تبدیلی کس طرح لائی جائے اور اب صدر مرحوم نے شہادت سے کچھ ہی دنوں پہلے بنکاری کے ذمہ داروں کے سامنے واضح لفظوں میں موجودہ طریق کار پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا اور انہیں تاکید کی تھی کہ وہ جلد از جلد اس طریق کار کو بدل کر شریعت کے مطابق بنائیں شریعت آرڈی ننس کے نفاذ کے بعد اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا ۔

[۱۵] ذرائع ابلاغ کے طرز عمل اور ان کے ذریعے بے حیائی کے فروغ پر ہم سب کی طرف سے بڑی جائز تنقید ہوتی رہی ہے ۔ اور واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ذرائع

یا طریق کار کسی بھی طرح ایک اسلامی ملک کے شایانِ شان نہیں ہے لیکن اس
شبہ نہیں ہے کہ ۱۹۷۷ء سے پہلے ذرائع ابلاغ جس برق رفتاری سے
، وعریانی کی طرف جارہے تھے۔ صدر مرحوم کے زمانے میں اس کو کچھ نہ
یب ضرور لگا ہے۔ اگر ۱۹۷۷ء سے پہلے کے اخبارات ورسائل اور
۔ ٹی۔ وی کے پروگراموں کا موازنہ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے کیا
یہ فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔

[illegible] ہر دور میں مرزائیت کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے مجروح رہا
ن سرگرمیوں پر جس قدر کاری وار صدر ضیاء الحق شہید مرحوم کے زمانے میں کیا
ں سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو
مرحوم نے ایک دستوری ترمیم کے ذریعے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے
کا اقدام کیا تھا جس نے ملک کو مرزائیت کے بارے میں صحیح رخ پر گامزن کیا
نی دستوری ترمیم کے باوجود مرزائیوں کی طرف سے اپنے آپ کو مسلمان باور
اپنی عبادت گاہوں کو مسجد قرار دینے اور اپنے کفریہ عقائد کو تبلیغ اسلام
ان سے پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے
ں کے لئے اسلامی القاب واصطلاحات استعمال کیا کرتے تھے اور ان کی
ن علانیہ جاری تھیں۔ صدر مرحوم نے ایک تاریخی آرڈی ننس کے ذریعے
ی تمام سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے پاکستان میں ان کی تبلیغی سرگرمیوں
ل انگیز پروپیگنڈے کو اس طرح تقریباً ختم کر دیا کہ ان کے سربراہ کے لئے اس
چارہ نہ رہا کہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے پاکستان سے مایوس ہو کر لندن
ستقر بنائے۔

جہادِ افغانستان کے معاملے میں صدر مرحوم کے کارنامے کسی تشریح کے محتاج
ہیں، افغان مہاجرین کی امداد اور مجاہدین کی پشت پناہی سے ان کا مقصد
ستم رسیدہ مسلمان بھائیوں کی امداد تو تھا ہی۔ اس کے علاوہ ان کا منصوبہ یہ
اس طرح افغانستان میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جو اس علاقے

احیائے اسلام کی تحریک کو سہارا دے۔ جس کے نتیجے میں پاکستان اور افغان پوری ہم آہنگی کے ساتھ نفاذ اسلام کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ انھوں نے یہ پالیسی جس کامیابی سے چلائی اس نے پوری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہاں تک کہ روس میں طاقت کو اس محاذ سے پسپا ہونا پڑا۔

یہ صدر مرحوم کے دور کے چند وہ موٹے موٹے کام ہیں جن کی بنا پر میں یہ کہنا بدترین ناانصافی سمجھتا ہوں کہ ان کے دور میں اسلام کے لئے کوئی کام نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نفاذِ اسلام کے مشن کو ادھورا چھوڑ گئے۔ ابھی اس سمت میں بہت سے جراتمندانہ اقدامات کی ضرورت تھی اور جو اقدامات ہوئے تھے ان کو موثر و مستحکم بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ لیکن ان کے مندرجہ بالا اقدامات نے اس ملک کو پہلی بار صحیح رخ دیا اور نفاذِ اسلام کے مشن کے لئے بڑی حد تک راہ ہموار کی۔ اگر آئندہ اللہ کے کسی بندے کو اس مقصد کو آگے بڑھانے کی توفیق ہوگی تو وہ محسوس کرے گا کہ اس راہ کے کتنے کانٹے صدر مرحوم چن گئے ہیں۔ آج سیاسی چپقلش کی فضا میں خواہ کچھ کہا جائے لیکن جب کبھی معاصرت کا گردوغبار چھٹے گا اور اسلام کا درد رکھنے والے کسی مورخ کو غیر جانبداری کے ساتھ ملکی حالات کے تجزیہ کا موقع ملے گا تو وہ ان تمام کاموں کو شہید مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے درخشاں کارناموں میں شمار کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

(سلسلہ جاری ہے)

شہاب نامہ سلسلہ

اور میں آج تک احساس کے اس گداز پر رشک کرتا ہوں جو نزہہہ کے مقلدین میں اسے نصیب تھا۔ نزہہہ جو ریڈ وائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ہے کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ نزہہہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی لیکن اپنی ماں کا تحفہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نزہہہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اس کا صرف اتنا حق ہے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اس کا نام وہاں لے دے۔ نزہہہ جو روضہ اقدس کے نام پر اپنے سکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ہے۔ نزہہہ جو اپنا سلام وہاں پیش کرنے سے بری طرح ہچکچاتی ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذرہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

محمد منظور احمد منظور

محمد شمس الدین تاباںؔ مرحوم

اردو زبان، اس لحاظ سے خوش نصیب رہی ہے کہ اس کے وطن ہندستان میں، ناسازگار حالات کے باوجود، ہر دور میں، شاعروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اس کے ذخیرۂ ادب میں بیش بہا اضافہ کیا، اتنا گراں قدر اضافہ کہ جسکی بدولت اس کا شمار اہم عالمی زبانوں میں ہونے لگا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے شاعروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی پرخلوص خدمات کا جس قدر بھی اعتراف کیا جائے کم ہے۔

میر تقی میرؔ جیسے بلند مرتبہ استاد غزل بلکہ شہنشاہ غزل کے بارے میں نواب سید مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے کہا تھا کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" ویسے ہر دور کے اہم شعراء کے کلام میں بھی پست اور بلند دونوں معیار کے اشعار ملتے ہیں۔

اردو کے غزل گو شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اچھے اشعار، پاکیزہ اشعار، فکر انگیز اشعار، احساس، جذبہ اور دل کو جھنجھوڑنے والے اشعار، رومانیت، کلاسکیت، عصری حسیت، نئے رجحانات، عصری تقاضوں، مطالبوں، سماجی اور سیاسی مسائل و مسئلوں کا آئینہ ہیں۔

شاعر بھی، دیگر فنکاروں کی طرح سماج کا ایک اہم فرد ہوتا ہے۔ وہ اسی فضاء میں سانس لیتا اسی ماحول میں زندگی گذارتا اور اسی معاشرہ کا رکن ہوتا ہے جس میں عام انسان اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس کا شعر آپ بیتی ہے یا جگ بیتی کیونکہ یہ کبھی آپ بیتی ہوتے ہوئے بھی جگ بیتی ہوتا ہے اور کبھی جگ بیتی ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی۔ اس طرح اس کی آواز صرف اس کی آواز نہیں، بہت سے انسانوں کی آواز ہوجاتی ہے۔ وہ ان آوازوں کو اپنے گہرے قلبی تاثر کے ساتھ، شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

اردو کے کہنہ مشق شاعر محمد شمس الدین تاباںؔ کی آواز، ایک زخمی دل کی آواز تھی، ماں کے

اشعار میں ہر زمان کے دور کے عام انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ انہوں نے اشعار کے سانچے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے عصر کے انسانوں کے جذبات اور احساسات کی بھی ترجمانی کی ہے۔

سماج کے ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے اس شاعر نے بچپن سے اپنی زندگی کی آخری سانس تک آہوں اور کراہوں کے دلدوز اور روح فرسا مناظر دیکھے۔ خود انہیں درد و کرب بھری زندگی بسر کرنی پڑی لیکن وہ اس لحاظ سے لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے مختلف اور متعدد پریشان کن مسائل سے پیدا ہونے والے درد و کرب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ہمت نہیں ہارے۔ دراصل زندگی ایک ایسی بیش بہا نعمت بھی ہے کہ اس کی دلداری کیلئے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور پھر جس شاعر نے بہر حال زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا عزم مصمم کر لیا ہو، اس کے سامنے پہاڑ جیسی رکاوٹیں بھی پرِکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ چونکہ تاباں کو زندگی سے پیار تھا اور وہ دنیا والوں کو زندگی جیسی نعمت کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف کروانا چاہتے تھے اس لئے ہر طرح کی پریشانیوں کا انہوں نے استقلال کے ساتھ سامنا کیا۔ ان کی زندگی ایک حوصلہ افزا مثال ہے ان لوگوں کے لئے جن کے قدم مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈگمگا جاتے ہیں اور جنہیں پست ہمتی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ موت، روز ازل سے ہی زندگی کا شکار کرنے کے لئے بے چینی کے ساتھ اس کی تاک میں لگی رہتی ہے۔ انسان کی زندگی کا ایک کمزور لمحہ بھی، موت کی کامیابی کے لئے بہت کافی ہے۔

بلند مرتبہ شاعر اس نکتہ سے بخوبی واقف ہوتا ہے اس لئے جہاں موت اپنا جال بچھانے میں مصروف رہتی ہے وہیں شاعر زندگی کو دوام عطا کرنے والے اپنے اعلیٰ پایہ کے فن کی تخلیق میں ہمہ تن مصروف اور منہمک رہتا ہے۔ زندگی کو موت کے پنجے سے نکال لانے کیلئے شاعر کے اعلیٰ پایہ کے چند زندگی بخش اشعار کافی ہوتے ہیں۔ اس طرح موت، مات کھا کر تلملا اٹھتی ہے۔

صفی اورنگ آبادی کے شاگرد تاباں کی زندگی چند اعلیٰ انسانی اقدار کا مجموعہ تھی۔ فروتنی، انکسار، خاکساری، بے نیازی، خودداری، ان کی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی۔

ہر ہوشمند انسان، خواب دیکھتا ہے۔ اور ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی جستجو

بےپناہ خواہش رکھتا ہے ۔ اس خواہش کے ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر تگ و دو بھی کرتا ہے وہ اپنی جد و جہد میں کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام ۔ ناکامی کی صورت میں خواب بکھر جاتے اور انسان کا دل اس صدمہ سے زخمی ہو جاتا ہے ۔ کبھی یہ صدمہ جانکاہ ہوتا ہے اور کے اثر سے زندگی جیسا بیش قیمت سرمایہ لٹ جاتا ہے ۔ تاباںؔ نے بھی چند خواب دیکھے تھے یلے حساس دل رکھتے تھے ۔ ناموافق حالات نے انہیں پریشان بھی کیا ۔ لیکن وہ کبھی مایوس یا ں نہ ہو سکے کیونکہ زندگی انہیں بے حد عزیز تھی ۔ اس کی پاسداری ہمیشہ ان کے پیش نظر ۔ اس لئے انہوں نے ہار نہیں مانی ۔ بلکہ زمانہ کی بے التفاتی کے باوجود ان کے حوصلے ہمیشہ رہے ۔

تاباںؔ شعر گوئی کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے ۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں شعر کہے ہیں چونکہ ان کی طبیعت کا رجحان، غزل گوئی کی طرف زیادہ تھا اس لئے ان کے مجموعہ کلام میں ں کی تعداد قابل لحاظ ہے ۔

غزلوں کے ان اشعار میں کہیں تغزل اور کہیں تصوف کا رنگ غالب ہے ۔ انہوں نے زبان ت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے ۔ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات میں بے ساختہ پن 'فطری بیان سلاست اور روانی' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ انہوں نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی تاباں کے اشعار میں کہیں مشاہدے اور کہیں تجربے کی روداد ہے ۔ تاباں کے شعر پڑھنے ںداز بھی بہت خاص اور اثر انگیز تھا ۔

سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے فکر انگیز اشعار کی گیرائی اور گہرائی سے خود شاعر بے خودی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے اور وہ والہانہ انداز اور سرشاری کے عالم میں شعر رہا ہے ۔

تاباں کے اشعار میں ان کے اپنے لب و لہجہ اور مسلکی اور نگ آبادی (جو شاعری میں ان کے ستاد تھے) کے رنگ کے علاوہ ۔ اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی اور فانی بدایونی رنگ سخن کی بھی جھلک ہے ۔

آنکھوں کی نیند اور دل کا چین لٹا کر انہوں نے جو اشعار چالیس سال کے دوران کہے تھے انہیں زنجیر و زنار " کی صورت میں شائع کرنے کے لئے بھی تاباں کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ۔

لیکن بالآخر ۱۹۷۸ء میں یہ مرحلہ بحسن وخوبی طے ہوگیا ۔

فنکار یا شاعر کی قدر، سماج، قوم اور ملک کی صحتمند متوازن اور ہمہ جہتی ترقی اور ادب گراں قدر اضافہ کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ فن کی بروقت حوصلہ افزائی فن کے نکھار میں معاون ہوتی ہے ۔ فنکار یا شاعر کے فن اور اس کی انفرادیت کی بقاء میں، قوم کی شہرت اور بقائے دوام کا راز مضمر ہے ۔ یہ نہ صرف زبان وادب کی زندگی بلکہ قوم اور ملک کے مقام ور اور نیک نامی میں اضافہ کا باعث بھی ہوتی ہے ۔ اس لئے حکومت اور اردو بولنے والوں ا اردو سے پر خلوص محبت رکھنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اعلیٰ فنکارانہ صلاحیت رکھنے والا کی حتی الامکان صحیح معنوں میں حوصلہ افزائی اور سرپرستی کریں ۔ تاکہ اردو ادب کے سرمایہ میں گرا تخلیقات کے اضافہ کا سلسلہ جاری رہے ۔ ■■

سلسلہ "اردو کے مسائل اور ریسرچ"

فارسی حرفوں میں لکھی جاتی ہے ۔ اسے ہندستان کی زبان ہونا چاہیئے ۔ اسی پٹنہ میں قاضی عبدالودود کے مکان پر بابو راجیندر پرشاد اور مولوی عبدالحق نے مشہور پیکٹ اس کے لئے کیا تھا کہ دونوں زبا کسطرح ایک زبان میں ڈھل سکتی ہیں ۔

اردو ریسرچ کانگریس کا یہ اجلاس اس ورثہ کو نئی نسل تک محفوظ طور سے پہنچانے کی بات کرے گا جس پر مہاتما جی فخر کرتے تھے جیسے جواہر لال نہرو ایسی زبان کہتے تھے اور جیسے مولانا آزاد گنگ جمنی تہذیب کی سب سے حسین یادگار کہتے تھے ۔ خدا بخش لائبریری میں ۲۲ جنوری سے ۲۴ جنوری تک اردو ریسرچ کانگریس کے سہ روزہ اجلاس میں ایک پورا دن خصوصی طور سے اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے رکھا گیا ۔

سلسلہ معمر لوگ اور کام

اس بات پر مصر ہونا چاہیئے کہ بزرگ لوگوں کو جو بھی وہ کام کر سکتے ہوں کرنے دیا جائے خواہ وہ غیر اہم ہی کیوں نہ ہو ۔ عمری زندگی میں کچھ نہ کچھ خدمت کرکے مطمئن ہونا ایسی خدمت ہے جو سن رسیدگی میں ضعیفی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوتی

سلیم الدین احمد

اردو کے مسائل اور اردو ریسرچ کانگریس پٹنہ

گاندھی جی جس زبان کو ہندستانی کہتے رہے وہ دراصل اردو ہی ہے جسے بہتوں نے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جی کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئی۔ یہ اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کا خوبصورت ورثہ ہے، شاندار اور جاندار زبان ہے جس کو سرکاری سرپرستی بھی ملتی جا رہی ہے۔ اکاڈمیاں بھی بنتی جا رہی ہیں ترقی اردو بورڈ بھی کام کر رہا ہے' نیشنل بک ٹرسٹ، پبلیکیشنز ڈویژن' این سی آر ٹی اور دوسرے بہت سے ادارے اردو کی کتابیں چھاپ رہے ہیں اور ترقی و ترویج میں کوشاں ہیں' ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی اردو پروگرام ہوتے رہے ہیں اور پچھلے چند سال میں اردو کی طرف پورے ملک کا رویہ بہتر ہو رہا ہے اور اسکے نتیجے میں بہت سے اچھے کام ہو رہے ہیں تاہم ایسا لگتا ہے کہ کوئی منصوبہ بند کام نہیں ہو رہا ہے اندھیروں سے یکایک اجالوں میں آجانے پر جسطرح آنکھیں چندھیا سی جاتی ہیں بس کچھ ایسا ہی عمل سمجھیں کہ ملک میں اردو کے جو لاگ چلی آتی تھی وہ لگاؤ میں تبدیلی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر خود اردو والوں کے پاس کوئی منصوبہ بندی، کوئی سسٹم' پلاننگ، کوئی دور اندیشی کوئی پروگرام نہیں ہے جس سے وہ اردو کے احوال کو بہتر بنا سکیں' اتنا کہ اگلی صدی میں نئی نسل میں اسکے پڑھنے والے مل سکیں۔

صورتحال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ کے بچے اپنے والدین کو خط لکھتے ہیں تو اردو میں نہیں لکھتے' صورتحال یہ ہے کہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح کی شاندار کتابوں کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ بے حد معیاری کتابیں سامنے آئی ہیں مگر صحیح مرحا زمین کا سیہ رات کے لئے کیا ہے۔

پٹنہ میں اردو کے سبھی بڑے ادارے ایک دو روز کے لئے یکجا ہوکر سوچیں گے' بات کریں گے کہ اس صورتحال میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟

گاندھی جی نے ایک مشترک تہذیب ایک مشترک خاندان' ایک مشترک زبان کا خواب دیکھا تھا' وہ کہتے تھے رسم الخط سے کوئی فرق نہیں پڑتا' ہندستانی جو دونوں خطوں ناگری اور اردو

[illegible]

کے پیر مشورن

معمر لوگ اور کام

آبادی امور کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس صدی کے آخر تک بھارت میں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کی تعداد 12.5 فیصد ہوجائے گی یعنی ... ۲ ء میں ہر آٹھ آدمیوں میں ایک آدمی ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا ہوگا۔ جب ہم گذشتہ دو دہوں میں شرح اموات میں ہوئی نمایاں کمی پر نظر کرتے ہیں۔ جب کہ آبادی کے اضافے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے تو صورت حال کافی سنگین نظر آنے لگتی ہے۔ ماہرین اس نتیجے پہ پہونچے ہیں کہ اگر فوری طور پر اصلاحی اقدامات نہیں کئے گئے تو آبادی پر معمر لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے اقتصادی انحصار اور دباؤ سے ہمارے ملک کی پیداواری سرگرمیاں متاثر ہوجائیں گی۔

مستند طبی معنوں میں بڑھاپا یا سن رسیدگی مبین طور پر جسمانی انحطاط کا اظہار ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا تعلق تاریخ پیدائش سے ہو اور اس لئے یہ بے مزہ بات ہے کہ پچپن یا اٹھاون سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو اس زمرے میں شامل کرلیا جائے۔ یقیناً ایسے عجیب و غریب کیس بھی ہوسکتے ہیں۔ جہاں باوجود اپنی اصل عمر کے، ایک شخص وقت سے پہلے علم الامراض کے مطابق سن رسیدگی یا بڑھاپے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے یا بوڑھا نظر آنے لگتا ہے۔

وہ اقدامات جو سن رسیدہ لوگوں کی ضروریات کے پیش نظر کئے گئے یا سن رسیدہ لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے اٹھائے جائیں گے ان کی تفصیلات علاحدہ سے ہوتی

چاہیئے۔ آج کل بزرگوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ہیں۔ وہ عام غریبی کو کم کرنے کے پروگرام نظر آتے ہیں۔ سن رسیدگی وضعیفی کے مسائل صرف غریب لوگوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ امیر لوگ بھی ان کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر دیکھ بھال کی کمی، نظر انداز کئے جانے کا احساس قریب ترین عزیز یا رشتہ دار کی طرف سے عزت و خدمت کی کمی، تنہائی کہن سالی، یادداشت کی کمزوری، عدم تحفظ، موت کا خوف وغیرہ کچھ ایسے مسائل ہیں جو سن رسیدہ لوگوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مسائل ایسے ہیں جنھوں نے ان لوگوں کو زیادہ متاثر کیا ہے جو معاشی طور پر غریب نہیں ہیں۔

کچھ تجاویز | طبی سہولیات و امداد پہنچانے اور ضعیف کی خصوصی طور پر دیکھ بھال کے کاموں کی تنظیم خاص سائنسی ڈھنگ سے کی جانی چاہیئے

ابھی حال ہی میں تریوندرم میں سینئر سٹیزنز ایسوسی ایشن، ہیلپ ایج انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن اور شعبہ نفسیات کیرالہ یونیورسٹی کے اشتراک و تعاون سے عصری سماج میں سن رسیدگی کے مسائل کے موضوع پر ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا تھا اس سلسلے میں بہت سی سفارشیں کی گئیں۔ اس ضمن میں ایک سفارش یہ کی گئی کہ سن رسیدہ لوگوں وضعیفوں کے عام مفادات کی دیکھ بھال کے لئے ایک قومی مربوط پالیسی قائم کی جائے۔ اس کے علاوہ ضلع ہیڈ کوارٹروں میں سن رسیدہ لوگوں کی دیکھ بھال اور نگہبانی کے گھر قائم کرنے، بلاک سطح پر ڈے کیئر سینٹرز (دن میں دیکھ بھال کرنے والے مراکز) قائم کرنے، رعایتی کرایہ پر ایمبولنس خدمت مہیا کرانے۔ جو لوگ کام کر سکتے ہوں ان کے لئے کام کے عوض کھانا مہیا کرنے کی اسکیم چلانے کی سفارشیں کی گئی ہیں۔

بوڑھا ہونا ایک طویل عمل ہے۔ بڑھاپے کی مثبت خصوصیات بھی ہیں۔ سن رسیدہ بزرگ ایک خاص سطح کی بلوغیت، دانشمندانہ پختگی، اظہار کے لئے قابل قدر صلاحیت و استعداد کے حامل ہوتے ہیں جو لوگ اپنی قدر و منزلت اور عزت سے واقف ہیں وہ مفت طعام و قیام کی سہولت حاصل کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ قومی پالیسی کو

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

ڈاکٹر ایس ایل گپتا

پیاس تسکین دہ پانی

ہوا اور پانی زندگی کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں ۔ سب سے چھوٹی جاندار شئے خلیہ (یونی سیلولر Unicellular) سے لے کر بڑے جانور اور انسان تک کے نامیاتی اجسام میں سب سے اہم جزو پانی ہے ۔ غذائی اجزاء خلیوں کو مہیا کئے جاتے ہیں اور وہاں سے فضول کثافت پانی کے ذریعہ باہر نکال دی جاتی ہے ۔ یہ عمل جوف دار خلیوں کے مابین بیرونی حصول سے جوف دار خلیوں کے اندرونی حصول تک سیالوں کی حرکت سے پذیری متاثر ہوتا ہے ۔

پانی جو جسم کے کل وزن کا ۷۰ فیصد حصہ ہوتا ہے بامنہ والی نالی میں تری پیدا کرتا ہے ۔ ایک بالغ انسان معتدل آب وہوا میں 1200 ملی لیٹر پانی پیتا ہے اور ٹھوس اشیائے خوراک سے 1000 ملی لیٹر پانی حاصل کرلیتا ہے ۔

پانی پیشاب کی شکل میں 1200 تا 1500 ملی لیٹر اور آنتوں کی نکاسی یا فضول کثافت کی شکل میں 100 ملی لیٹر جسم سے باہر آجاتا ہے ۔ تنفس اور پھیپھڑوں کے ذریعہ ہوا کے جذب کرنے اور خارج کرنے کے عمل سے جسم سے باہر آنے والے پانی کی مقدار مستقل ہے جو 400 - 600 ملی لیٹر کے برابر ہوتی ہے ۔ جسم میں پانی کی کل مقدار ما فیہ فرد کی پیاس اور بھوک کے ذریعہ معمول کے مطابق برقرار رہتی ہے ۔ اگر پانی پینے کی مقدار پسینہ و بول و براز اور فضلہ کی مقدار سے بڑھ جاتی ہے تو پانی جسم میں رک جاتا ہے ۔

پانی کی کوالٹی : صاف پینے کا پانی بے خوشبو اور ذائقہ میں خوشگوار ہوتا ہے ۔ پانی میں سوڈیم، کیلشیم، میگنیشیم اور آئرن (لوہا) کے ذرے پائے جاتے ہیں اور یہ اس زمین پر منحصر ہے جہاں سے پانی حاصل کیا جارہا ہے ۔ بھاری پانی میں کیلشیم سالفش (نمکیات)

(پی آئی بی)

زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں ۔ ایک عام غلط فہمی یا غلط خیال کے برعکس سخت پانی پیشاب خارج کرنے والے حصے میں پتھریاں بننے کا باعث نہیں ہوتا ہے ماسوائے اس کے کہ جسم میں وٹامن ڈی کی مقدار حد سے زیادہ ہو جاتی ہے ۔

ہمارے جیسے ملک میں آبادی کا بہت تھوڑا حصہ ہی ٹھیک ڈھنگ سے پینے کے پانی کی سپلائی کے مصارف برداشت کر سکتا ہے ۔ بیشتر گرم سیر یعنی منطقہ حارہ کے ممالک میں دیہات میں پانی کی فراہمی ابھی تک ایک بڑا مسئلہ ہے ۔ دیہی لوگ ابھی تک دریاؤں، گلیوں کے کنوؤں، تالابوں اور ٹیوب ویلوں پر انحصار کرتے ہیں ۔ پانی کی دستیابی کے جو بھی ذرائع ہیں وہ انسانوں اور حیوانوں کی مختلف ضروریات کی تکمیل کے لئے مشترکہ ہیں اس لئے ان کے آلودہ ہونے کا ہر موقع موجود ہے اس کے علاوہ غیر صحت مندانہ ذاتی عادتیں اور گرد و پیش کے قدرتی ماحول سے بے پروائی، بے التفاتی اور غفلت بھی آلودگی کا باعث ہوتی ہیں ۔

آلودہ پانی سے متعدد بیماریاں پھیلتی ہیں جیسے ٹائیفائڈ، کالیرا (ہیضہ) پیچش کیڑے اور مہلک یرقان ۔ موسم گرما کے دوران جب دریاؤں اور ندیوں کا پانی سوکھ جاتا ہے یا پانی کی مقدار برائے نام رہ جاتی ہے اور ایک جگہ ساکن ہو جاتا ہے تو وہ اور بھی آلودہ ہو جاتا ہے

پانی جسم کے اندر : پانی جسم کے اندر جذب ہوتا ہے ۔ پیٹ میں صرف آہستہ اور تھوڑا تھوڑا لیکن چھوٹی آنتوں میں تیزی سے جذب ہوتا ہے جبکہ بڑی آنتوں میں کسی حد تک کم ۔ گرم سیر علاقوں میں زیادہ رطوبات خاص طور سے پانی تنفس کے ذریعہ زیادہ کمی آجانے کی وجہ سے موسم گرما میں جسم میں پوری طرح ہضم نہیں ہوتا ہے ۔ تمام اشیائے خوراک میں ماسوائے خالص چکنائی کے پانی مختلف مقدار میں موجود ہوتا ہے ۔ ککڑی، کھیرے میں ۹۷ فیصد اور پکے ہوئے چاول میں ۷۰ فیصد کے قریب ہوتا ہے ۔

جب خوراک کیمیاوی عمل سے گزرتی ہے تو اس کے اجزاء اپنی آخری شکل کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں منقسم ہو جاتے ہیں ۔ جب کاربو ہائیڈریٹ، پروٹین اور چکنائی کیمیاوی عمل (Metabolisation) سے گزرتی ہیں تو تقریباً ۵۵، ۵۰ اور ۱۰۰ ملی لیٹر پانی خارج ہوتا ہے ۔ روزانہ خوراک کے آکسائڈیشن سے کل 301 ملی لٹر پانی دستیاب ہوتا ہے ۔ جسم میں پانی کی ضرورت بہت حد تک آب و ہوا، خوراک، عادتوں، سرگرمیوں اور جسمانی ساخت

منحصر ہوتی ہے۔ پانی کی زیادتی (زیادہ پانی پینے سے) پیشاب زیادہ مقدار میں تیار ہوتا ہے اور پانی کی کمی سے پیشاب بننے تمام رہ جاتا ہے۔ بطور ایک کلیہ کے ایک فرد کو روزانہ 200 تا 500 ملی لیٹر پیشاب خارج کرنے کے لئے کافی مقدار میں سیال اشیاء لینی ہوتی ہیں۔ منطقہ حارہ کے علاقوں میں پیشاب کی مقدار برقرار رکھنے کے لئے ایک فرد کو پانی، کاربونک ایسڈ گیس سے بھری خنک پانی کی بوتلیں، چائے یا کافی کی شکل میں مائعات و سیال اشیاء کے سات تا دس گلاس (2400 تا 3000 ملی لیٹر) لینے ہوتے ہیں۔

جسمانی افعال جسم کے تمام اہم افعال، حرکات و سکنات کا دارومدار جسم میں پانی کی صحیح مقدار کی برقراری پر ہے۔ مختلف خلیوں و ریشوں میں پانی کی زیادہ مقدار سے اسکی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خون کے بے رنگ مواد (Blood plasma) میں ۹۲ فیصد اور سرخ خون کے ذرات میں ۷۰ فیصد پانی ہوتا ہے۔ ہاضمے کا عمل معدی رطوبات و رس کے افراز پر منحصر ہے جس میں بڑا حصہ پانی ہوتا ہے۔

پانی جسمانی درجہ حرارت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ پسینہ اور تنفس کے ذریعہ رطوبات کے تبخیری عمل سے جسمانی گرمی کا درجہ برقرار رہتا ہے۔ یعنی حرارت غریزی برقرار رہتی ہے۔ پسینے کا اخراج جسمانی گرمی کے نقصان کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جبکہ جسمانی درجہ حرارت کے مقابلہ میں فضائی درجہ حرارت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ جب فضا میں نمی زیادہ ہوتی ہے تو پسینہ آسانی سے خشک ہو کر خارج نہیں ہوتا ہے۔

تقریباً ۱۷۰ لیٹر رطوبات کی مقدار روزانہ گردے سے گزرتی ہے جس میں 1.5 لیٹر پیشاب بن جاتا ہے اور باقی (۱۶۸.۵) دوبارہ جذب ہو جاتا ہے۔ سخت و پر جوش ورزشوں کے دوران پسینے کے اخراج کے باعث جسم کا وزن 2 تا 4 کلوگرام تک کم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب جسم میں پانی کی کمی کو پورا کرنے یعنی پیاس بجھانے کے لئے پانی پیا جاتا ہے تو وزن پورا ہو جاتا ہے۔ سانس لینے کے عمل سے بھی جسم میں پانی کم ہو جاتا ہے جو مقدار میں روزانہ 400 ملی میٹر تک ہو جاتا ہے۔

غلط سطح اور خرابی و علالت جب پانی زیادہ مقدار میں لے لیا جاتا ہے اور نکاسی ناکافی ہوتی ہے تو جسم میں پانی کی سطحیں غلط ہو جاتی ہیں اور خرابی و علالت کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر عضویاتی حالات و افعال معمول کے مطابق ہیں تو ایسا ہونا

مشکل ہوتا ہے۔

بین خلیاتی دباؤ میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے دماغی خلیے و ریشے جو بہت حساس اور نازک ہوتے ہیں دماغی بیماری (oedema) کا شکار ہو جاتے ہیں اور کاسہ سر کے داخلی دباؤ میں اضافہ ہو جانے سے متلی، قے، آنکھوں میں دھندلا پن، لرزہ وکپکپی، اینٹھن اور بہاں تک کہ موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

جسم میں پانی کی زیادتی یا اس کے نشے کا بڑا سبب اندرونی شریانی علاج ہے خاص کر بچوں میں جہاں علاج کا حد بہت چھوٹا ہے۔ ایک مرگی والے کو دورہ پڑ سکتا ہے اگرچہ اس کے جسم میں پانی کی مقدار معتدل ہو اور اس کا علاج پانی نہ دے کر اور خشک غذائیں دے کر کیا جا سکتا ہے۔ جسم میں پانی کی مناسب مقدار نہ پہنچانے کی وجہ سے بخار و اسہال کی صورت میں یا جراحی عمل کے بعد والی حالت میں جسم عام طور پر ابتدائی (Dehydration) ابتدائی طور پر جسم میں پانی کی قلت) کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے مرحلے کا ڈی ہائیڈریشن کم مقدار میں نمک لینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شیر خوار بچوں اور بڑے بچوں کو ان کے اپنے جسمانی وزن کے لحاظ سے زیادہ تناسب میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے گردے پیشاب کے ارتکاز کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شیر خوار بچوں کے معاملے میں جلد یا مساموں کے ذریعہ ہونے والی پانی کی کمی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی بچوں میں 1.3 ملی لیٹر فی گھنٹہ جبکہ بالغوں میں 0.5 ملی لیٹر فی گھنٹہ پانی کی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے بچے جسم میں ہونے والی پانی کی سخت کمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۲۴) گھنٹوں میں ۱۲۰۰ تا ۱۵۰۰ ملی لیٹر پانی کی مقدار جو جسم میں غذائی کیمیاوی عمل سے نکاسی پذیر ہوتا ہے ناگزیر ہے۔ بڑھتی ہوئی پیاس، منہ اور لبوں پر خشکی، لعاب دہن کی کمی (Dehydration) کی ابتدائی علامات ہیں۔ تین یا چار دن کے بعد دیگر علامات جیسے اعصابی کمزوری، سکڑی ہوئی سیاہی مائل سفید شکل و صورت اور ۷ فیصد تک جسمانی وزن میں کمی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔

ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب جسم میں رطوبات کی کمی ہوتی ہے اور اس کی جگہ سیال اشیاء نہیں مل پاتی ہیں ایسا اس وقت ہوتا ہے جب خون یا پسینہ زیادہ بہہ جاتا ہے۔ کثیر مقدار میں پیشاب نکل جاتا ہے یا قے و دست واقع ہو جاتے ہیں۔ اس سے

جسمانی محلول (Electrolyte) کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اگر سیال شئے منہ کے راستے نہیں دی جاسکتی تو جسم کے اندر دوسرے [illegible] سے داخل کی جانی چاہیئے۔ اس لئے جسم میں رطوبت کی قلت کو منہ کے راستہ دور کرنی چاہیے۔ پیچش اور معدے و آنتوں کا سوزش جیسی بیماریوں میں منہ کے راستے سیال پی کر یا لے کر جسم میں رطوبات کی کمی کو پورا کرنے کا سادہ و موثر طریقہ علاج آجکل بہت مقبول ہو رہا ہے اور ابلاغ عامہ کے ذرائع اس موضوع پر اچھی مہم چلا رہے ہیں۔ بے ہوش مریضوں کی صورت میں آنتوں تک جانے والی ٹیوب کے ذریعہ سیال مادہ جسم میں داخل کیا جاسکتا ہے قئے آوری کی صورت میں نل کا ابالا ہوا پانی قطرہ قطرہ کرکے دیا جانا مفید ہے۔

یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ڈی ہائیڈریشن ایسی ڈوسز (تیزابیت) اور انکالوسز کے ساتھ پیچیدہ تو نہیں ہے۔ عام طور پر یہ ایسی ڈوسز (تیزابیت) سے متعلق ہوتا ہے۔ پہلے کافی مقدار میں سوڈیم کلورائڈ اور پانی دینا چاہیے۔ اس طرح یہ عمل گردے کو نمک اور رطوباتی توازن کے ضمن میں داخلی جسمانی توازن کی بحالی تو میں آزادانہ کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔

راحت و آرام: ان سب کے علاوہ پانی کی مصفی کرنے ٹھنڈک پہنچانے اور تازگی بخشنے کی تاثیر سے تمام جاندار لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پانی کی ٹھنڈک پہنچانے کی تاثیر بخار، ورم اور خراشوں میں مشہور ہے۔ زیادہ دیر تک سرد غسل سے جسم کی گرمی کم ہوجاتی ہے مسلسل روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہانے سے نزلہ وزکام کا خدشہ ختم ہوجاتا ہے۔ لو لگنے کے اثر کو خنک طریقے سے پلٹس باندھکر دور کیا جاسکتا ہے۔ گرم پانی کے غسل ٹھنڈے پانی کے غسل کے مقابلہ میں زیادہ صاف دھونے کی تاثیر رکھتے ہیں کیونکہ وہ چکنے اجزاء کو حل کرنے اور بہانے کی قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ گرم پانی کے غسل سے جسم کے درد میں کمی ہوتی ہے۔ اور ـــ قئے جوڑوں کے درد اور قولنج کے علاج میں بھی گرم پانی کے غسل یا گرم پانی سے دھار نے آرام ہوتا ہے۔ پیر نے بچوں میں جسمانی اینٹھن، اعصابی تھکاوٹ اور دماغی خستہ حالی میں بھی گرم پانی کے غسل سے آرام آتا ہے۔ رات کو بستر میں جانے سے پہلے گرم پانی کے غسل سے بے خوابی کی بیماری کا بھی علاج ہوسکتا ہے۔ زیادہ مقدار میں صاف تازہ پانی پینے سے پیشاب کی نالیوں میں بننے والی پتھری کو روکا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ مقدار میں پانی کھانا کھانے کے دوران لینا چاہیئے۔ صبح سویرے ایک ٹھنڈا گلاس پانی پینے سے قبض دور ہوجاتا ہے۔ گرم پانی کو قئے آوری کیلئے بھی استعمال

راج کمار جین

بھارتی ریلوے کی ترقی

بھارتی ریلوے نظام دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد انتظامی ڈھانچے والا
سے بڑا نظام ہے۔ یہ اپنے آپ میں ترقی اور کامیابی کی ایک قابل ذکر کہانی۔
جس نے معمولی نوآبادیاتی وراثت سے اعلیٰ سطح کی خودکفالت اور تکنالوجی
ساظ سے ترقی حاصل کی ہے۔

بھارتی ریلوے نظام حصول آزادی کے وقت بہت بری حالت میں تھا
رنی جنگ عظیم کے باعث ریلوے نظام کو زبردست فشار سے دوچار ہونا پڑا
تی ریلوے نے جنگ سے بیشتر نقصانات کی تلافی بہت جلد کرلی اور بڑھتی ہوئی ضروریات
اکرنے کے لئے نقل و حمل کی مناسب صلاحیت بھی پیدا کرلی۔

بھارتی ریلوے نظام نے پیداواریت میں اضافہ کرکے اقتصادی کوششوں
زندگی حل کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ زرعی منصوبے کا کامیاب عمل
ود کا انحصار کیمیاوی کھادوں اور بہتر قسم کے بیجوں کی نقل و حمل اور مالامال علاقوں
سے شکار علاقوں تک اناج کی تیز رفتار نقل و حمل پر رہا ہے۔ بکثرت ریلوے آمد و
، ذمہ داری و بھروسہ اور کم لاگت کے لحاظ سے بہتر ریلوے نقل و حمل کی سہولیات
رعی سیکٹر کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

بھارتی ریلوے نظام نے سرکاری اور نجی دائرہ کار کی صنعتوں اور بھاری
ں کے فروغ میں بھی بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئے دریافت شدہ معدنیاتی
ز کی نقل و حمل اور تیز رفتار صنعتی ترقی و فروغ کے لئے ساز و سامان اور مال کی

مین۔ ریلوے بورڈ

نقل و حمل اس بات کی متقاضی تھی کہ منصوبہ بند معیشت کا دور شروع کیا جائے۔

جب ملک آزاد ہوا تو اس وقت بھارتی ریلوے نظام قوت محرکہ، انجنوں و ڈبوں کی تیاری، مسافت اور ڈیزائن کے میدانوں میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں نصف صدی پیچھے تھا۔ یہ نظام بنیادی طور پر درآمد شدہ بھاپ کے انجنوں [illegible] لکڑی کے ڈبوں اور سادے قسم کے شکنجوں اور پہیوں سے فٹ کئے گئے چار پہیوں والے مال ڈبوں پر مبنی تھا۔ ریلوے انجنوں کی تیاری کے ضمن میں خود کفیل ہونے کے لئے یہ پہلا قدم اٹھایا گیا جب کہ چترنجن لوکوموٹیو ورکس کارخانے میں بھارتیہ ریلوے کے ذریعے تیار کئے گئے ڈیزائن پر ۱۵۹۰ [illegible] ۱۹۵۰ء سے بھاپ کے انجنوں کی پیداوار شروع ہوئی۔

ایک دہے سے کم کے عرصے میں چترنجن کے کارخانے میں تیار کئے گئے پہلے ڈی سی بجلی سے چلنے والے ریل انجن لوکمانیہ کا افتتاح ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اور اسی کے ساتھ بھارت میں ریلوے نقل و حمل کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ چترنجن کا بنا ہوا پہلا اے سی بجلی سے چلنے والا ریل انجن "بدھان" بھارتی ریلوے نظام میں ۲۵ کلوواٹ کے اے سی بجلی سے چلنے والے انجنوں کا پیش خیمہ تھا۔

چترنجن کا کارخانہ کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ بجلی سے چلنے والے ریل کے انجنوں کی درآمد نوے فیصد سے گھٹ کر آٹھ فیصد رہ گئی۔ چترنجن لوکوموٹیو ورکس نے سپر فاسٹ ریل گاڑیاں چلانے کے لئے تیز رفتار مسافر گاڑی انجن تیار کرنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک نیک شگون ہے کہ نئی دلی سے جھانسی کے درمیان حال ہی میں شروع کی گئی ۱۴۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ملک کی سب سے تیز گاڑی "شتابدی ایکسپریس" کا انجن اسی کارخانے نے تیار کیا ہے۔ گذشتہ سال سلور جوبلی الیکٹرانک لوکو (ریلوے انجن) تیار کیا گیا تھا۔ جس کا بجا طور پر "جواہر" نام رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۶۰ کلومیٹر گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والے ریلوے انجن کے منصوبے بھی تکمیل کے مراحل میں ہیں۔

ڈیزل سے چلنے والے ریل کے انجنوں کی تیاری وارانسی میں ڈیزل لوکو موٹیو ورکس میں 1963ء میں شروع ہوئی اور اس کارخانے نے ۱۵۰ ریل کے انجن سالانہ تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ بڑے، اوسط اور چھوٹے پیمانے کی پوری انجینیرنگ صنعت نے انجنوں کی ساخت، پرزوں اور سازوسامان تیار کرنے کی دیسی صلاحیت کے حصول میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

دیسی صلاحیت کے حصول میں خودکفالت کے لئے بڑی صنعتی اکائیوں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آج بھارت میں ڈیزل سے چلنے والے ریل کے انجنوں کی درآمد صرف پانچ فیصد رہ گئی ہے جبکہ چھٹی دہائی کے وسط میں ۸۰ بڑ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ ایک ملک جو ایک صدی سے زائد عرصہ تک اپنی ریل گاڑیاں چلانے کے لئے ریل کے انجنوں کی درآمد پر انحصار کرتا تھا وہ آج ایک انتظامیہ کے تحت دنیا کے دوسرے سب سے بڑے ریلوے نظام کی گاڑیاں چلانے کے لئے ریل کے انجن تیار کر رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی کامیابی ہے۔

ریل کے ڈبے تیار کرنے کے لئے مدراس میں انڈین کوچ فیکٹری قائم کی گئی تھی ۱۹۵۵ سے اس میں ڈبوں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے 2 اکتوبر 1955ء کو کیا تھا۔

اس کارخانے میں ڈیزائنوں کے اسٹیل کی ساخت والے ڈبے تیار کئے جا رہے ہیں۔ سکینڈ کلاس ڈبے اور ایر کنڈیشنڈ ڈبے خاص کر مسافروں کے لئے آرام دہ بنائے گئے ہیں۔ یہ زیادہ محفوظ اور تیز رفتار گاڑیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے دنوں میں طویل سفر میں مضر خطرات کا اندیشہ اب ختم ہو چکا ہے اس کی جگہ رات کو سونے کی سہولت اور ایڈوانس ریزرویشن کی آسانی دستیاب ہے۔

انڈین کوچ فیکٹری آج کل آج کل تقریباً ایک ہزار سالانہ تیار کرنے کی صلاحیت کی حامل ہے۔ اور دنیا میں ریل سواری ڈبے بنانے والی بڑی فیکٹریوں میں سے ایک شمار کی جاتی ہے۔ کپور تھلہ میں دوسری سواری ڈبے تیار کرنے والی فیکٹری جس نے ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء سے کام کرنا شروع کر رہا ہے اس کی بھی تقریباً

سالانہ صلاحیت ایک ہزار ڈبے تیار کرنے کی ہے۔ ڈبوں کے جدید ڈیزائن تیز رفتار ریل گاڑیوں کے لئے بنائے گئے ہیں جو وزن میں ہلکے اور مسافروں کے لئے آرام دہ سہولیات سے آراستہ ہیں۔

ریل کے مسافر ڈبوں کی تیاری کے باعث متعلقہ ساز و سامان، پلاسٹک سے بنی اشیاء، پی وی سی فرش، ریشوں سے بنائی جانے والی اشیاء، پلاسٹک اور المونیم نکاسی سے متعلق صنعتوں کو زبردست فروغ حاصل ہوا ہے۔ بجلی کی صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا کیونکہ ہر مسافر بردار ڈبہ بجلی کی پیداوار کرنے کے لئے خود کفیل ہوتا ہے۔ نیز ڈبے میں بہتر روشنی، پنکھوں اور ایرکنڈیشنگ کے انتظام سے مسافر کو بہت سی سہولیات فراہم ہوتی ہیں۔ ڈبوں کو ایر کنڈیشنڈ بنانے سے مسافروں کی مشہور مانگ پوری ہوئی ہے۔ اس سے صنعت کے ساتھ تعاون کا ایک دوسرا باب شروع ہوا ہے۔ ریلوے نظام کے ساتھ اشتراک و تعاون کے میدان میں صنعتوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے ریلوے نظام کی ضروریات پوری کرنے میں بر وقت مدد دی ہے۔

درآمدات کے متبادل کے طور پر انڈین ریلوے نے بنگلور میں وہیل ایکسل پلانٹ (پہیہ دھری بنانے کا کارخانہ) کا ایک نیا پیداواری یونٹ لگایا ہے۔ یہ کارخانہ کاسٹ وہیل کی تیکنالوجی کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ اس سے قبل بھٹی میں ڈھلے ہوئے پہیے کی تکنالوجی کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کارخانے نے ۱۹۸۴ء میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اس نے ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۲۰۰۰۰ پہیوں کے سٹ سالانہ تیار کرنے کا نشانہ حاصل کر لیا ہے۔

پنڈت نہرو سائنسی مزاج کو فروغ دینے والے پہلے رہنما تھے جنھوں نے متعدد قومی تجربہ گاہوں کے قیام اور ملکی تحقیق و ترقی کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی۔ پنڈت نہرو کے سائنسی مزاج کے تصور سے تحریک پاکر ۱۹۸۳ء میں ریلوے تکنالوجی کے لئے لکھنؤ میں ڈیزائن ساخت اور معیار کا تحقیقی ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے قیام نے ریلوے کو غیر ملکی تکنیکی تعاون سے چھٹکارا دلایا۔ انڈین کوچ فیکٹری میں تیار کی جانے والی بوگی (ڈبہ) اور ڈیزل ریل کار کا ڈیزائن ملک میں ہی بنایا گیا اور اسے فروغ دیکر معیاری بنایا گیا۔ ب

اور بالس طرز کے مال گاڑی ڈبوں کی ڈیزائن بھی معیاری بنائے گئے۔ چترنجن لوکوموٹیو ورکس اور ڈیزل لوکوموٹیو ورکس وارانسی کے کارخانوں میں ریلوے انجنوں کے ڈھانچے پرزوں اور اجزاء کی فٹنگ اور تیاری کے میدان میں ٹیکنالوجی کے حصول میں زبردست کامیابی حاصل کی گئی ہے۔

سگنلنگ اور انٹرلاکنگ سے متعلق ٹیکنالوجی میں قابل خواہ ترقی کے باعث ریلوے کے سگنل تیار کرنے ورکشاپوں اور پرائیویٹ سیکٹر میں نازک بجلی کے سگنل کے آلات واجزاء کے فروغ اور تیاری کے میدان میں ملکی پیمانے پر نئی راہیں پیدا ہوئیں

۱۹۶۷ء - ۷۶ کی مدت تحقیق و ترقی کے میدان میں "ترقی کی دہائی" کہلاتی ہے جبکہ اربندش اور کنکریٹ کی ٹھوس پٹریوں، السٹرا سونک جانچ کی نگرانی تصادم والے عناصر کا تعین نیز پلوں کے لئے طویل المیعاد دباؤ اور قوتوں کے انتشار اور محرابی پلوں کی تعمیر کے لئے نئے طریقے وضع کئے گئے۔ بجلی سے چلنے والے ریل کے انجنوں کے اپنے ملکی ڈیزائن ایک سو تیس کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار کی مسافر گاڑیوں کی خدمات کی فراہمی کے لئے کارآمد قابل عمل مطالعات کئے گئے ہیں۔ آئی ایس او کنٹینر کی حرکت کے لئے کنٹینر فلیٹ کے دیسی فروغ سی آر ٹی اور بی او وائی ویگنوں کی دیسی ساخت کے فروغ اور تیاری، مائکرو ویو والے ٹاورز کے دیسی ڈیزائن، خودکار وارننگ دینے والا نظام اور آخری گاڑی کو چیک کرنے والے آلات کی تیاری جیسے کام مکمل ہو چکے ہیں۔

پینل انٹرلاکنگ، روٹ ریلے، انٹرلوکنگ کئی پہلوؤں والی سگنلنگ، ٹریک سرکٹنگ اور ایکسل کاؤنٹرس کے میدانوں میں کی گئی تحقیق و ترقی کے باعث ریل گاڑیوں کی آمد و رفت میں زیادہ تحفظ اور بھروسہ کا اظہار ہوا ہے۔

۷۷ - ۸۷ ۱۹ء کی دہائی "چیلنج کی دہائی" رہی مال گاڑیوں اور مسافر گاڑیوں کے لئے ائیر بریک کی شروعات ہوئی اور ریلوے نظام کو مضبوط بنانے کے لئے ہفتہ وار تنظیم کی گئی۔

اعلیٰ درجہ کے ہارس پاور والے ریل انجنوں، تیز رفتار سے چلنے والے مسافر گاڑیوں کے ڈبوں اور مال بردار گاڑیوں کے ڈبوں کے ذریعے اسٹیٹ آف آرٹ ٹیکنالوجی

کی درآمد کا کام شروع کیا گیا ہے۔

آئندہ دہے میں آر ڈی ایس او میں دستیاب سہولیات کو بہتر بنا ڈی ایس او میں افرادی قوت سے متعلق ڈیزائن اور تحقیق کے کام میں کوالٹی کے پروگراموں پر خاص توجہ دی جائے گی۔ ان پروگراموں پر ۲۱۰ کروڑ سرمایہ جاتی اخراجات عمل میں آئیں گے۔

بھارتی ریلوے نے مشینوں کی برآمد کے ضمن میں ہر وجہ کے تواب کر رکھا ہے۔ اگرچہ انڈین کوچ فیکٹری لازمی طور پر ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی نہ کہ برآمدات کے ایک ادارے کے طور پر تاہم برآمد پر اس کی کارکردگی قابل تعریف رہی ہے اس کارخانے نے اب تک گیارہ ممالک تائیوان، فلپائن، ویت نام، زمبیا، بنگلہ دیشں، موزمبیق، یوگینڈا اور کوریل گاڑیوں کے سواری ڈبے اور مال بردار ڈبے درآمد کئے ہیں۔

ریلوے کی وزارت کے تحت سرکاری دائرہ کار کے دو ادارے، [RITES] اور ارکان (IRCON) ریل ٹیکنالوجی اور ریلوے پراجیکٹ عملدرآمد میں اعلیٰ مشاورتی خدمات فراہم کی ہیں۔ ان اداروں نے تقریباً تمام ممالک افریقہ، مغرب ایشیا، جنوب مغرب ایشیا اور لیٹن امریکہ سمیت ۲۹ مم خدمات انجام دی ہیں۔ آج "رائٹس" دنیا کی سو مشاورتی فرموں میں ہے جبکہ "ارکان" بین الاقوامی سطح پر نمایاں تعمیری اداروں و کمپنیوں میں

ریلوے نظام کے تربیتی اداروں اور پروگراموں کو ہمارے کام کے مطابق بنانے اور ملازمین کو نئی ٹکنالوجی کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لائق بنانے مناسب صلاحیت و خود اعتمادی قائم کرنے کے لئے جدید ترین سہولیات سے جا رہا ہے۔ اگرچہ یہ ایک سست طریق کار ہے تاہم طویل المدتی فائدوں کا ہے جو ہمیں آئندہ برسوں کے لئے تیار کرے گا اور یہ ہماری جانب سے والی بہترین دانشمندانہ سرمایہ کاری کی ایک شکل ہے۔

ریلوے نظام دور دراز علاقوں کے افراد اور مختلف مذاہب اور

باقی

ایڈورڈ فلیرو

روزگار کے نئے مواقع

یونیورسٹی کو ڈگریاں تقسیم کرنے کا کارخانہ نہیں ہونا چاہئیے بلکہ اسے
ہن کارکردگی کا مرکز ہونا چاہئیے۔ اگر اس تصور کو عملی جامہ پہنانا ہے تو طلباء
باہر کی دنیا نیز سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان مسلسل رابطہ قائم رکھن
۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کچھ دیگر ممالک میں کسان اور سماج کے دیگر
بھی طلباء سے ان موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں جن کا تعلق مجموعی
سے سماج کے تمام لوگوں سے ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے
والے برسوں میں ہمیں سماج کے تمام طبقوں کے لوگوں کو نمائندگی دینی چاہئے
س بات کو یقینی بنانا چاہئیے کہ ہماری تعلیم ہمارے مکان و زمان کے لئے
ون ہو۔ ہم جس سماج میں رہتے ہیں اس میں ہم بامعنی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

کام کرنے کا حق ہمارے آئین میں ملک کی پالیسی کے رہنما اصولوں میں شامل
۔ یہ بلاشبہ ملک کی اقتصادی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے
روعات سے ہی جو طریقہ کار اپنایا گیا وہ اس خیال پر مبنی تھا کہ اقتصادی
سے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ معیشت کی توسیع ...
بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ لوگوں کو روزگار ملے اقتصادی ترقی ...
تے منصوبے تک قائم رکھا گیا۔ بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ محض اقتصادی
کی سمت میں کام کرنے سے سب کو روزگار کا مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا
اد پانچویں منصوبے کی تقریباً درمیانی مدت میں حکومت نے شریمتی

وزیر مملکت برائے خزانہ حکومت ہند

کی قیادت میں یہ فیصلہ کیا کہ اقتصادی ترقی کی اسکیموں کے ساتھ براہ راست روزگار کے مواقع اور اسکیمیں بھی شامل کی جائیں ۔

روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کے طریقے کار کا اظہار 1972 میں ہوا بنکوں کے کل قرضے کا ایک فیصد حصہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کے لیے سود کی امتیازی شرحوں پر منتقل کر دیا گیا تاکہ انہیں خود روزگار کے لیے کچھ رقم فراہم کی جائے ۔ چھٹے منصوبہ میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام اور قومی دیہی روزگار پروگرام جیسی اسکیمیں شروع کی گئیں ۔

یہ پروگرام بنیادی طور پر دیہی شعبہ کے لیے تھے کیونکہ یہ لیے ۔ پایا گیا کہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے زیادہ تر لوگ دیہی علاقوں میں بستے ہیں ۔ دیہی علاقوں میں بے روزگار یا مناسب روزگار نہ رکھنے والے افراد کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے ۔ زراعتی سیزن کے خاتمہ کے بعد ان میں سے بیشتر یا تو بے روزگار ہو جاتے ہیں یا انہیں مناسب روزگار مل نہیں پاتا ۔ عوام کو رعائتی شرحوں پر رقم فراہم کرنے کے لیے بہت سی اسکیمیں شروع کی گئیں تاکہ وہ خود روزگار شروع کر سکیں ۔ اگر وہ پیداواری کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کی بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو گا بلکہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی روزگار فراہم کر سکتے ہیں ۔

غریبی دور کرنے کے عمل کو نہ صرف اقتصادی ترقی کے لحاظ سے پرکھا جانا چاہیئے بلکہ دیہی عوام میں ہمت اور محنت کا جذبہ پیدا کرنے کے لحاظ سے بھی دیکھا جانا چاہیئے ۔

اگرچہ غریبی کے خاتمہ کی بہت سی اسکیمیں صحیح طور پر چل رہی ہیں تاہم ان کو مزید ثمرآور بنانے کی گنجائش ہے ۔ مثال کے طور پر تجارتی بنکوں کے ذریعہ قرض کے طور پر دی گئی رقم جمع شدہ رقم کا صرف ۳ فیصد ہے جب کہ قرض ۶۰ فیصد سے کم نہیں ہونا چاہیئے ۔ اصول یہ ہے کہ منظم طور پر سیاننہ

علاقوں سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کو سرمایہ کی منتقلی نہیں ہونی چاہئیے. گوا
صنعتی طور پر پسماندہ علاقہ ہے جہاں بے روزگاری بہت زیادہ ہے۔ اس
سے قبل یہاں کے لوگ ۔ زیادہ تر بمبئی یا ملک کے دوسرے حصوں میں چلے
جاتے تھے یا پھر مشرقی آفریقہ میں پرتگال اور برطانیہ کی کالونیوں میں جا کر
بس جاتے تھے ۔ چوتھی اور پانچویں دہائیوں تک گوا میں مواقع جہت محدود تھے
وہاں کانوں کے کام کی شروعات سے صورت حال میں کچھ بہتری آئی لیکن یہ
زیادہ دیر پا نہیں تھی اور لوگ جلد ہی آسٹریلیا ، اور کنڈا جیسے ممالک میں منتقل
ہونے لگے ۔ جب ان ممالک میں قانونی سختیوں کی وجہ سے ان ممالک میں منتقلی پر
سخت پابندیاں عائد ہوئیں تو لوگوں نے خلیجی ممالک کی طرف جانا شروع کردیا
اب خلیجی ممالک میں بھی دشوار صورت حال پیدا ہو رہی ہے ۔ تیل کی قیمتوں
میں کمی آئی ہے جس کے نتیجے میں خلیج میں روزگار کے مواقع کم ہونے لگے ہیں ۔ اب ہمیں
خلیج میں کام کرنے والے ایسے لوگوں کی جزوی طور پر انخلاء کے لئے تیار رہنا چاہئیے
ہمارے پاس اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی ہونی چاہئیے

صنعتی طور پر پسماندہ علاقوں میں صنعتیں قائم کرنے کے لیے خصوصی سہولیات
دی جاتی ہیں ۔ ہر صنعت روزگار کے کچھ مواقع فراہم کرتی ہے لیکن یہ یقینی بنایا جانا
ضروری ہے کہ جو مواقع پیدا کئے جائیں وہ لگائے گئے سرمایہ کے تناسب میں ہوں
پسماندہ علاقوں میں زیادہ سرمایہ والی صنعتوں کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہئیے اور
اصولاً ایسی صنعتوں کی اجازت ہونی چاہئیے ۔ جہاں زیادہ مزدوروں کی ضرورت
ہے ۔ دوسرا پہلو جس پر غور کیا جانا چاہئیے یہ ہے کہ کیا روزگار کے مواقع
سے اس علاقہ کے عوام کو فائدہ پہنچ رہا ہے ۔

دیہی روزگار کی سہولیات دیہی علاقوں میں براہ راست روزگار مہیا
کرنے کے لئے غریبی کے خاتمے کی اسکیموں کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہیں ۔ عرض ۔
دینے والے ادارے ضروری مالی امداد فراہم کر رہے ہیں ۔ قرض دینے کے علاوہ
یہ یقینی بنایا جانا چاہئیے کہ قرض کا استعمال پیداواری کاموں میں کیا جائے ان کا انحصار

مناسب بنیادی ڈھانچہ پر ہے۔ اس قسم کے بنیادی ڈھانچے کے نظام کا قیام ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی بعض ایجنسیوں کی ذمہ داری ہے نہ کہ مالی اداروں کی۔ لہٰذا حکومت اور مالی اداروں کے قرضہ کو مزید ثمرآور بنانے کے لئے شانہ بہ شانہ مل کر کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کھیتی باڑی اور دیہی دستکاری کو مالی طور پر زیادہ منفعت بخش ہونا چاہیئے۔ نہ صرف قرضہ دے کر بلکہ بنیادی ڈھانچہ کے رابطوں کو زیادہ مستحکم بنا کر یہ کام انجام دیا جاتا ہے۔ جب تک خام مال آسانی سے دستیاب نہ ہو محض قرضہ دینے سے ضروری نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔

دیہی قرضوں کی اسکیموں میں خام مال کی سپلائی کے ساتھ مال کی فروخت کے پہلو کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ تب ہی روزگار مہیا کرنے کے لئے لگایا گیا سرمایہ صحیح معنوں میں ثمرآور ہو سکتا ہے اور مطلوبہ روزگار فراہم کر سکتا ہے۔ قرضہ جاتی امداد کی اسکیمیں صرف دیہی عوام کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ شہری لوگوں کے لئے بھی ہیں۔ ہمارے پاس شہری علاقوں میں غریب افراد کے لئے خود روزگار پروگرام اور تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لئے یہ اسکیم۔ اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکی جتنا کہ ہونی چاہیئے تھی۔ چونکہ جو قرض دیا گیا اس کا صحیح استعمال نہیں ہو سکا۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اس اسکیم کے تحت قرضوں کو، قرض حاصل کرنے والوں کی تربیت سے وابستہ کر دیا جائے تاکہ ان کے پروجیکٹ کامیاب ہو سکیں۔ اور ان سے انہیں فائدہ حاصل ہو سکا تو لی لکڑی کا کام کرنے والوں اور دیگر دستکاروں کے لئے ٹکنالوجی کے معیار کو بلند کرنا ضروری ہے لیکن ایسے نوجوان لوگوں کے لئے تربیت اس سے کہیں ضروری ہے جن کا تعلق نئے صنعت کاروں کی پہلی نسل سے ہے۔ توقع ہے کہ تربیتی تنظیمیں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والوں کے لئے پائیدار پروجیکٹ کا مشورہ دیں گی نیز ضروری لائسنس، شیڈ، پانی اور بجلی کے کنکشن حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں گی۔

اقتصادی

تصادی ترقی کے لئے تکنالوجی ضروری ہے ۔ تکنالوجی کے معیار میں مسلسل بہتری کے بغیر ترقی مقابلہ آرائی اور معیار میں بہتری ممکن نہیں ہے ۔ استعمال جانے والی تکنالوجی مناسب ہونی چاہئیے اور استعمال کرنے والے سماج ضروریات سے ہم آہنگ ہونی چاہئیے ۔ اس طرح تکنالوجی نہ صرف پیداواریت ر اقتصادی ترقی میں اضافہ کرتی ہے ۔ بلکہ روزگار کے امکانات کو بھی وسیع کرتی ہے ۔ مناسب تکنالوجی کے استعمال کی ایک اچھی مثال خود سبز انقلاب ہے ۔ د بائی میں جب بہار کو مقامی سطح پر خشک سالی کا سامنا تھا ہم اناج کی سپلائی کے لئے غیر ملکی بحری جہازوں پر انحصار کرتے تھے ۔ اب ہم نے اپنی ریکارڈ شدہ تاریخ کی بدترین خشک سالی کا سامنا کیا ہے ۔ مسلسل تین برس تک شک سالی کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ اس خشک سالی کے علاوہ آسام اور ملک کے مشرقی علاقوں میں سیلاب نے تباہی مچادی ۔ لیکن اناج کے ذخیرہ کے معاملے یں ہمارے حالات پچھلی خشک سالیوں کے مقابلہ میں بہتر ہے یہ مناسب تکنالوجی کے استعمال کا نتیجہ ہے ۔

پچھلے برسوں میں ہم منصوبہ بندی کے عمل میں گاؤں کے لوگوں کو شریک رنے کی بات کرتے رہے ہیں ۔ آزادی کے چالیس برس بعد بھی نچلی سطح سے منصوبہ بندی کا عمل ابھی شروع نہیں ہوسکا ہے ۔ بنکنگ کے شعبہ کے لئے یہ فخر بات ہے کہ یہ ملک کا پہلا شعبہ ہے جس نے حقیقتاً دیہات کو مرکز بنا کر منصوبہ بندی کی ہے ۔ خدماتی شعبہ کے اس طریقہ کار میں بنکوں کی ہر دیہی شاخ کو گاؤں کی سلا زمرہ جاتی ضروریات پورا کرنے کے لئے ان علاقوں کے لئے سالانہ منصوبہ بنک شاخ تیار کرے گی یہ سالانہ منصوبہ مالی سال اپریل ۱۹۸۹ء سے شروع ہوں گے ۔

بنکوں کو قومی تحویل میں لینے کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ لوگ قرض لینے کے لئے قرض دینے والوں کے بجائے بنکوں سے رجوع کریں جن کے قواعد و ضوابط بہتر ہیں ۔ لیکن آج بھی لوگ قرض دینے والوں سے اتنا محفوظ نہیں ہوسکے جتنا ہونا چاہئیے تھا ۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بنک صرف متمول لوگوں کے لئے

کی نہیں بلکہ دیہی اور شہری عوام کے لئے بھی ہیں۔ قرضوں کے کیمپوں کے تصور کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

یہ واضح ہے کہ حکومت کے لئے روزگار کے متلاشی تمام لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ممکن نہیں ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبہ میں کم از کم ۴۰۰ لاکھ آسامیوں کی ضرورت ہے جبکہ منظم شعبہ ۵۰ لاکھ سے زیادہ آسامیاں فراہم نہیں کرسکتا۔ بقیہ روزگار خود روزگار کے ذریعے فراہم کیا جانا ہے لہٰذا نوجوانوں کو ان اسکیموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ اب مکان سازی کے شعبہ پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائیگا تعمیر کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ لہٰذا مکان سازی، انجینرنگ اور دیگر شعبوں میں مہارت رکھنے والوں کی مانگ ہوگی۔ اسی طرح الیکٹرونکس اور کمپیوٹر کی صنعت کو خاص طور پر ترقی و فروغ حاصل ہوگا۔ چونکہ حکومت ان کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتی ہے کیونکہ یہ ہماری معیشت کی ترقی کے لئے ضروری ہے، لہٰذا ان شعبوں میں تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی۔ دیگر شعبے جن میں ہنرمند افراد کی ضرورت ہوگی اور جو عوامی خدمات سے متعلق ہیں، وہ صحت اور صفائی ستھرائی کی خدمات اور تعلیم وغیرہ ہیں۔

سلسلہ بھارتی ریلوے کی ترقی

حصوں کے مسائل لوگوں کو باہم قریب لاکر قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا اہم کام انجام دے رہا ہے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے اس طرز کی انسانی انجینرنگ یعنی ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرکے ایک ملک کی تعمیر کے لئے ریلویز کی جانب سے کئے جارہے کاموں کی تعریف کی تھی۔

انڈین ریلویز کا ایک شاندار ماضی رہا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ریلویز نے اب تک بہت ساری ترقی حاصل کی گئی ہے اور ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور درحقیقت ابھی میلوں دور ..... میلوں دور جانا ہے۔ ہمارے لئے ترقی عمل کبھی ختم نہیں ہوسکتا بلکہ یہ ایک جاری عمل ہے۔

بیان حقیقت

نظر میں سب کی جو محترم ہے
بلاشبہ جو بشر اہم ہے
جو ہر طرح پیکر کرم ہے
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

جو خود ہے وجہ وجود عالم
حقیقتاً جو ہے فخر آدم
وہ مرتبت جس کی ہے مسلّم
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

ہے جس کی ہستی تمام رحمت
وہ ختم جس پر ہوئی نبوت
ہے ذکر بھی جس کا اک عبادت
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

وہ جس کی سیرت ہے سب سے اعلیٰ
وہ جس سے ہر سو ہوا اجالا
وہ لاج انساں کی رکھنے والا
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

حیات جس کی ہے نور ساماں
بنا جو انسانیت کا درماں
ہے ذات یزداں بھی جس پہ نازاں
کی تو نے اس ذات کی اہانت + اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

نگاہ جس کی ہے محرمانہ
ہے جس کا ہر قول عارفانہ
وہ جس کا قائل ہے اک زمانہ
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

وہ ذات اقدس کہ امی ہو کر
لٹا دیئے علم و فن کے گوہر
فدا ہے ہم سب کا جان جس پر
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

قرآن ناطق ہے جس کی ہستی
جو بہر عالم ہے فضل ربی
ہے آبرو جس سے زندگی کی
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

اذاں میں آتا ہے نام جس کا
بلند تر ہے مقام جس کا
ہے روح پرور پیام جس کا
کی تو نے اس ذات کی اہانت
اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

زمانے کا رہنما وہی ہے
شہنشہ دوسرا وہی ہے
عظیم بعد خدا وہی ہے
کی تو نے اس ذات کی اہانت + اے رشدی تجھ پر خدا کی لعنت

ڈاکٹر محمد منصور خان منصور

نعت

صاحبِ قوسین آپؐ رحمۃ اللعالمین
ہے سراپا ذاتِ اقدس ایک قرآں مبیں

بحر و بر میں تھا ظہور فتنہ ہر سو جس طرح
تھی مقدر حق تعالیٰ کو نجاتِ سرزمیں

خندہ زن تھا کفر کہ توحید عنقا ہو گئی
خانۂ کعبہ کے تھے اصنام بھی سارے مکیں

بعثتِ نبوی تھی گویا مژدہ ارض و سما
آیۂ الیوم اکملت ہوئی تب دل گزیں

تھے پریشاں مصطفیٰؐ بار نبوت کے تلے
ساتھ اقراء بسم اللہ وہ اندر ہوئی روح الامیں

کردی تھی ختم نبوت جسکے قرآں حکیم
یہ ہدایت ہے برلئے ہر زماں و ہر زمیں

ظلمتوں پر چھا گئے لیکر پیام دین حق
مثل فاروق اور خالد سرفروش و مومنین

کلمہ گو ہوتا تو کون ہوتے اگر نہ مصطفیٰؐ
آسماں ہوتا بتوں کا بوجہل کی سرزمیں

جس حریم ذات میں تھے محو جلوہ خود حضورؐ
تاب اسکے جلوے کی موسیٰ نے بھی لائی نہیں

ہادیٔ انسانیت پیغمبرؐ اسلام ہیں
دین حق اسلام محمدؐ رحمۃ اللعالمین

گرم ہے بازار جنگ خوش موت کے سوداگراں
کوئی بڑھکر آدمی سے دشمن انساں نہیں

تھیں کبھی پامال نہ اسطرح اقدار حیات
روبروئے آدمی شرمندہ ابلیس لعیں

بارگاہِ رب العزت سے دعا منصور کی
الصلوٰۃ والسلام تم پر سدا معمار دیں

سلمان رشدی

شاداں ہے کفر کہ ابن جہل پیدا ہوا
ننگ ملتؐ ننگ دنیا ننگ وطن پیدا ہوا

فکر دفن کی آڑ میں سلمان نہیں نعوذ باللہ
وارث لات و منات و عزیٰ پیدا ہوا

نابلد ہے فکر اسکی مازاغ البصر و ماطغیٰ
پاسبان دیر مرید ظن و ہوا پیدا ہوا

ہے زمانہ محو حیرت کفر سامانی پر تری
زعم عقل و فکر لیکر بولہب پیدا ہوا

ؔ رسوائے زمانہ ناول Satanic Verses میں سلمان رشدی نے سورۂ النجم کی (۱۹) ویں آیت کی شانِ نزول کے پس منظر کو مسخ کرکے پیش کیا ہے۔ اپنے طرز تحریر کو بیسویں صدی کے انگریزی ناول کی طرز پر (Magic Realism) کا نام دیا ہے۔

ؔ ۔ موت کے متعلق [illegible]

غزلیں

محترمہ ظفر ناز

کیا حال ہوا ہے دیکھو ذرا زخمی طلب ہے آنکھیں پُرنم
اے جانِ جگر آ کر اب تو سینے پر رکھ دے دستِ کرم

داتا ہے وہی آقا ہے وہی مانگو جو بھی دیتا ہے وہی
ہم نے مانگا اس سے اسی کو دیکھا ہے جب سے اس کا کرم

پا کر بھی اتنا کیا حاصل اک دن تو تجھے سب کھونا ہے
اپنے کئے پر رونا ہے بہت ہنسنے کی یہاں فرصت ہے کم

کس نے دیکھے غم کے سویرے کس نے پائے روتے اندھیرے
کس کس سے اپنی بپتا کہیں کیا کیا تو نے ڈھائے ستم

اژدر بن کر دن چڑھتا ہے ناگن بنکر رات آتی ہے
آیا ہے اب کے ساون میں کیسا زہر اگلتا موسم

لاکھوں ارماں ہیں اس دل میں اے ناز نبھے گی مشکل سے
جینے کی خواہش میں گھٹ گھٹ کر مرنا بھی تو ہے ستم

۱۴/۹/۹۹۴-۳-۱۴ [illegible] حیدرآباد

مس حبیبہ نسرین

غزل کہیں تو غزالانِ دشت و دمن سے کہنا
فسانۂ حسن و عشق سرو و سمن سے کہنا

رہے مقابل جو زلف کے سنبلِ بہاراں
بتا کے عارض کا آئینہ تم چمن سے کہنا

یہ حسن یہ ناز یہ ادا ہے تو جانِ جاناں
تمہاری ہر ایک بات شیریں دہن سے کہنا

جو ماہِ کنعانؑ کی چاہ میں ہے وہ کارواں ہے
اگر ہو گمراہ کوئی خضرِ زمنؑ سے کہنا

چراغ نسریں جلائے جاتے ہیں آنسو کے
سلام رحمت بعد مدت وطن سے کہنا

ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

غزلیں

مومن خان شوق

من کی گرھیں کھول رے بابا
ہردے کو مت تول رے بابا

نفرت کی جلتی دھرتی پر
امرت بانی بول رے بابا

ستیہ اہنسا اور ایک جہتی
تین رتن انمول رے بابا

سچائی کی راہ پہ چل کر
ہیرے موتی رول رے بابا

کل کا دن تو بیت چکا ہے
آج کے دن کی بول رے بابا

اپنی زباں پر قابو رکھ لے
بات کو پہلے تول رے بابا

ہرجائی تو بک جاتے ہیں
شوق ہے مکھ انمول رے بابا

اشرف منزل ۱۱-۳-۷۲۴ ملے پلی حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

الفت بشیر

دل میں رکھ کر یار کو ڈھونڈا کیا بازار میں
اب کوئی طاقت نہیں باقی دلِ بیمار میں

ہائے کیا دستور دنیا ہوگیا ہے آج کل
تھوڑی بھی لذت نہیں ہے دوستوں کے پیار میں

ہو بیاں کیسے سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہمیں
لطف جو آتا ہے ہم کو منزلِ دشوار میں

سوچتا ہوں جان و دل دونوں نچھاور کردوں
بات ہی کچھ ایسی پائی ہے مرے دلدار میں

ہو اجازت آپکی تو میں گلے میں ڈال دوں
سارے غم پنہاں ہیں ہمدم آنسوؤں کے ہار میں

کل نیا سورج کوئی الفت طلوع ہو جائے گا
آج تک تو زندگی کٹتی رہی افکار میں

مکان نمبر ۵-۱-۵۱۵ نامپلی حیدرآباد

مولانا آزاد نمبر

ماہنامہ حیدرآباد

اداب

جلد (٦) شمارہ (٦) جون ۱۹۸۹ء حیدرآباد

قیمت : پندرہ روپے

— : زرتعاون : —

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	25 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال 90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات 1000 "	2500 "	650 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ اداب [illegible] 11-5-[illegible] - حیدرآباد ([illegible])

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر
دفتر اداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد آندھرا پردیش سے شائع کیا

فہرست

١۔ حرف اوّل		٣
٢۔ قرآن مجید اور ماہ رمضان	مولانا آزاد	٦
٣۔ ابوالکلام : ترجمان حق ویقین	پروفیسر رضی الدین احمد	١٠
٤۔ امام الہند حضرت مولانا آزاد	مولانا ہادی نقشبندی	١٨
٥۔ اسلامی احکام وفقہ کی ترمیم	سید یوسف حسین	٢٧
٦۔ مولانا آزاد	پروفیسر سید انوار الحسن	٣٤
٧۔ یاد آزاد	ڈاکٹر کے بھگتہ وتسل رلو	٣٨
٨۔ مطالعہ ہفتہ وار "پیغام"	ڈاکٹر فیروز احمد	٤٢
٩۔ مولانا آزاد بحیثیت ادیب	سید مجیب	٧٣
١٠۔ مولانا ابوالکلام آزاد	تسنیم فاطمہ برلاس	٧٩
١١۔ مولانا آزاد شخصیت وکردار	غلام نبی مومن	٨٥
١٢۔ باکامس	سید یوسف حسین	٩٣

حرفِ اول

<u>سہ لسانی فارمولا اور اردو</u> : آندھرا پردیش میں اردو کے تحفظ و ترقی کیلئے اردو والوں کو اردو بچاؤ تحریک شروع کرنی پڑی اور عوامی قوت کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے [illegible] مطالبات کی اور ایک جامع جی او جاری کرتے ہوئے اردو مطالبات کی تکمیل کا وعدہ کیا ۔ [illegible] ہنوز شرمندہ وفا نہ ہوا برخلاف اسکے ایک جی او نمبر ۱۰۴ بابتہ مئی ۱۹۸۵ء جاری کیا گیا جس میں سہ لسانی فارمولا پر عمل درآمد اردو والوں کے مفاد کے بالکل مغائر ہے ۔

تعلیم میں سہ لسانی فارمولا کی بہت اہمیت ہے ۔ یوں تو پورے ملک میں اس پر ایسا عمل کیا گیا کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے لیکن آندھرا پردیش میں اس فارمولے پر ایسا عمل ہوتا تھا کہ تلگو اور انگریزی کے ساتھ اردو ہندی کمپوزٹ مضمون رکھا جاتا تھا جس میں اردو کے ۸۰ اور ہندی کے ۲۰ نمبر ہوتے تھے ۔ اس طرح اردو مادری زبان کے ساتھ تلگو علاقائی زبان، انگریزی بین الاقوامی زبان اور ہندی قومی زبان میں کما حقہٗ مہارت پیدا ہو جاتی تھی ۔ گجرال کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جنوبی ہند کی تمام ریاستوں کے لئے اس تجربے کو ایک مثالی نمونہ قرار دیا ۔ اگر یہ طریقہ یہاں جاری رہتا تو شمالی ہند کی ریاستوں میں بھی سہ لسانی فارمولے میں ہندی اردو کمپوزٹ مضمون کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن کانگریس دورِ حکومت کے آخری دنوں میں ہندی اردو کمپوزٹ کے تجربے کو ختم کر دیا گیا ۔ اس سلسلہ میں اردو والوں نے احتجاج کیا ۔

اس پر جی او ۵۲۵ سنہ ۱۹۸۵ء جاری کیا گیا جس میں سہ لسانی فارمولا حسب ذیل تھا ۔

۱) ۔ اردو یا علاقائی زبان پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک

۲) ۔ انگریزی چھٹی سے دسویں جماعت تک

۳) ۔ ہندی آٹھویں سے دسویں جماعت تک ۔

اردو مجلس عمل نے اس فارمولے کے خلاف [illegible] اردو داں طلبہ کو [illegible] ریاستی زبان تلگو سے کسی حد تک محروم کر دیتا ہے ۔ [illegible]

ں دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اردو والوں کے مسلسل احتجاج اور جد و جہد کے بعد حکومت نے جی او ۲۹۴ سنہ ۸۶ء جاری کیا جس میں وہ مطالبات اس طرح منظور کئے گئے کہ ۱) زبان اول کی حیثیت سے اردو پہلی سے دسویں جماعت تک اور ۲) زبان دوم کی حیثیت سے تلگو تیسری سے دسویں جماعت تک۔ مگر تیسری زبان انگریزی کو آٹھویں سے دسویں تک پڑھانا طے کیا جبکہ جی او ۲۵ سنہ ۸۵ء میں یہ صراحت تھی کہ انگریزی کی تعلیم چھٹی سے شروع ہو کر دسویں تک جاری رہے گی۔ اس جی او پر فوری احتجاج کیا گیا اور بالآخر حکومت نے جی او ۱۶۹ سنہ ۹۰ء جاری کیا۔ جس کے مطابق اردو میڈیم مدارس میں مادری زبان اردو کی تعلیم پہلی جماعت سے ہوگی، علاقائی زبان تلگو کی تعلیم کا آغاز چھٹی جماعت سے ہوگا اور ہندی یا انگریزی کی تدریس جس کا بھی طالب علم انتخاب کرے، آٹھویں جماعت سے شروع ہوگی۔ تلگو ریاستی زبان ہونے کے لحاظ سے اس کی تعلیم کی سہولت تیسری جماعت سے حاصل رہے گی جبکہ انحصار طالب علم کی مرضی پر رہے گا۔ یہ آخری احکام اردو والوں کے لئے نہایت نقصان دہ ہیں۔ جی او ۲۹۴، ۸۶ء میں تلگو تیسری جماعت سے پڑھائے جانے کا انتظام تھا۔ اس جی او میں اسے چھٹی جماعت سے کر دیا گیا اور تیسری جماعت سے تلگو پڑھنا طالب علم پر چھوڑ دیا گیا ظاہر ہے زائد زبان کی حیثیت سے وہ تلگو نہیں پڑھے گا اور تلگو میں کمزور ہو جائے گا۔ انگریزی یا ہندی میں سے ایک زبان منتخب کرنے پر اُسے ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ انگریزی چھوڑے تو بین الاقوامی سائنس و ٹکنالوجی کی زبان سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ ہندی چھوڑے تو قومی زبان کے علم سے محروم رہ کر قومی دھارے سے الگ ہو جائے گا۔ نیز آٹھویں سے کسی ایک زبان کی تعلیم سے اُس زبان میں کمزوری ہی رہیگا۔

اردو والوں کے لئے اپنی مادری زبان اردو، ریاستی زبان تلگو، قومی زبان ہندی اور بین الاقوامی زبان انگریزی سب لازم و ملزوم ہیں وہ کسی زبان سے محروم نہیں رہنا چاہتے اسلئے ہمارا مطالبہ ہے کہ سہ لسانی فارمولہ اسطرح منظور کیا جائے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں

۱) اردو مادری زبان پہلی سے دسویں تک۔ آٹھویں سے دسویں تک، اردو ہندی کمپوزٹ مضمون ۲) تلگو ریاستی زبان تیسری سے دسویں تک ۳) انگریزی بین الاقوامی زبان چھٹی سے دسویں تک۔

تلگو میڈیم زبانیں

۱) تلگو ریاستی زبان پہلی سے دسویں تک ۲) اردو مادری زبان تیسری سے دسویں تک ۳) اردو ہندی کمپوزٹ آٹھویں سے دسویں تک ۴) انگریزی بین الاقوامی زبان چھٹی سے دسویں تک

انگریزی میڈیم اسکولوں میں

۱) انگریزی پہلی سے دسویں تک ۲) تلگو تیسری سے دسویں تک یا اردو معہ اردو ہندی کمپوزٹ تیسری جماعت سے ۳) اردو معہ اردو کمپوزٹ یا تلگو چھٹی سے دسویں تک۔

مندرجہ بالا تجویز کی خصوصیت یہ ہیکہ اردو اگر پہلی جماعت سے پڑھائی جائیگی تو تلگو تیسری جماعت سے اور انگریزی چھٹی جماعت سے۔ اسطرح تینوں زبانوں کیساتھ انصاف کیا جاسکے گا۔ اور طالب علم کو مہارت حاصل ہوگی۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہیکہ اردو کے ساتھ ہندی کمپوزٹ مضمون آٹھویں سے دسویں تک تین سال پڑھایا جائیگا۔ ہماری تجویز ہیکہ ہندی مادری زبان والے بھی ہندی اردو کمپوزٹ مضمون آٹھویں سے دسویں تک پڑھیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اردو والوں کو قومی زبان ہندی سے واقفیت ہوگی۔ ہندی والے دوسری بڑی لسانی اکثریت کی زبان اردو پڑھینگے۔ دونوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں مہارت ہوگی، اردو اور ہندی تقریب آئینگی اور قومی یکجہتی کو بے اندازہ بڑھاوا ملیگا۔ اس فارمولے پر عمل قومی اتحاد و اتفاق کا ضامن ہوگا۔

مولانا آزاد نمبر مولانا آزاد نابغہ روزگار تھے اور ہمہ پہلو شخصیت کے حامل۔ جو کام بھی کیا نہایت تندہی سے کیا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ مولانا آزاد کو مرکز اور ریاستی دونوں سطحوں پر خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ "شاداب" نے بھی طے کیا کہ عقیدت کے پھول پیش کئے جائیں۔ "شاداب" کے لئے ممکن نہیں کہ اس مختصر خاص نمبر میں مولانا آزاد کی شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ اسلئے صرف ان پہلوؤں کو چن لیا گیا ہے جنکے ذکر سے ان کی یاد کو تازہ کیا جائے اور کچھ اسطرح سے ملک و قوم و ملت ان سے کچھ روشنی حاصل کرسکے اور ترقی کی راہ پر چلنے کے لئے اپنے آپ میں قوت پیدا کرسکے۔ یہ خاص نمبر قارئین کی نذر ہے وہی طے کرسکتے ہیں کہ ہماری کوشش کہاں تک ثمر آور ہوئی ہے ——— ★★

مولانا ابوالکلام آزاد

قرآن مجید اور ماہ رمضان

سکندر کا نام تاریخ کے کہنہ صفحوں کے باہر کتنوں کو یاد ہے؟ روما کے فاتح اعظم کو آج کون ہے جو عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی یاد کرلیتا ہو؟ شہروں کو بسانے والے ملکوں کو فتح کرنے والے، دریاؤں کو کاٹنے والے اور پہاڑوں میں راہ نکالنے والے اپنے اپنے وقتوں میں بڑے ہی طاقتور ہوں گے جب کہ انہوں نے ایسے ایسے عظیم الشان انقلابی کام کئے تھے، بایں ہمہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ہی ان کا وجود اور ان کے انقلابات کا ذکر بھی فنا ہوگیا اور دنیا نے انہیں یاد رکھنے کی ذرا بھی پرواہ نہ کی حتیٰ کہ وہ آج مٹ جانے والی اور قبروں اور نابود ہو جانے والے نشانوں کی طرح گمنام ہیں، اور کسی کو اتنا بھی یاد نہیں ہے کہ وہ کب تھے؟ کہاں تھے؟ اور انہوں نے دنیا میں کیا کیا انقلابات کئے۔

كَأَنْ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا

ایسا ہی ایک انقلاب روحانی تھا، جو اب سے تقریباً ۱۴ سو سال پہلے دنیا میں ہوا، جبکہ دنیا تغیر کے لئے بیقرار اور تبدیلی کے لئے تشنہ تھی اور جب کہ کوئی نہ تھا جو اس کی پیاس کو بجھائے اور اسکے لئے مضطرب ہو۔ وہ سمندروں کی طغیانی نہ تھی جو زمین کی بستیوں پر چڑھ آتی ہے بلکہ سرچشمہ ہدایت و فیضانِ الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا جو برسات کے پانی کی طرح زمین پر برستا اور اسے سیراب کردے وہ زمین کی سطح کو ہلانے والا بھونچال نہ تھا جس سے ڈر کر انسان روتا ہے اور پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر چیخنے لگتے ہیں، بلکہ عالم روح و معنی کا ایک آسمانی زلزلہ تھا جس کی جنبش نے دلوں کو غفلت سے بیدار کیا اور بے قرار روحوں کو امن اور راحت بخشی تاکہ وہ سونے کی جگہ بیدار ہوں اور رونے کی جگہ خوشیاں منائیں۔ وہ انسانوں کی درندگی نہ تھی جو اپنے ابنائے جنس کو سانپوں کی طرح ڈستی اور بھیڑیوں کی طرح چیرتی پھاڑتی ہے، بلکہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک الٰہی ظہور تھا جو نسلِ آدم کے بکھرے ہوئے گھرانوں کو یکجا کرتا اور زمین کو اسکی چھینی ہوئی امنیت اور سعادت

تو پس ملتا ہے۔

"تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسولِ الٰہی آیا جس پر تمہاری تکلیف بہت ہی شاق گذرتی ہے اور تمہاری اصلاح کا اسے بڑی ہی تمنا ہے مسلمانوں پر نہایت شفیق اور بے حد مہربان"۔ (۹ : ۱۲۸)

لیلۃ القدر : یہ انقلاب جس نے دنیا کے لیالی ولیام ہدایت کو تقدیم بدل دی، فی الحقیقت ایک مقدس رات تھی جو وادی بطحا کے کنارے جبل ابو قبیس کی ایک تنگ و تاریک غار کے اندر نمودار ہوئی اور اس شبستان لاہوتی کے اندر مشرق ربوبیت اعلیٰ سے آفتاب کلام اللہ طلوع ہوا:

"اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس "برہان مقدس" بھیجی گئی اور ہم نے تمہاری طرف ایک نہایت روشن اور کھلا نور نازل کیا۔

دنیا پر چھ صدیاں ضلالت کے سناٹے اور کفر کی خاموشی گذر چکی تھی لیکن اب وقت آگیا تھا کہ سینا کے بیابان کا خداوند اور کوہِ زیتون کی روح القدس پھر گویا ہو، اور ایام اللہ کا ایک نیا موسم بہار پھر آئے۔ پس ایسا ہوا کہ فضائے وحی الٰہی سے افق مبین پر نور روشنی کی بدلیاں چھا گئیں۔ فیضان الٰہیہ کے بحور دانہار جوش میں آ گئے، ملائے اعلیٰ اور قدوسیانِ عالم بالا میں ہل چل مچ گئی مدبرات روحانیہ اور ملائکہ سماویہ کو حکم ہوا کہ زمین کی طرف متوجہ ہو جائیں کیونکہ اب وہ آسمانوں پر مقہور و معزول نہیں رہیں۔ آسمانوں کے وہ دروازے جو صدیوں سے زمین پر بند کر دیئے گئے تھے یکایک کھل گئے۔ خزائین فیضان و برکاتِ سماویہ جن کی بخشش کا سلسلہ رک گیا تھا، پھر ساکنین ہدایت و سائلین رحمت کے منتظر ہو گئے۔ خداوند سینا اپنے دس ہزار قدوسیوں کو ساتھ لے کر فاران پر نمودار ہوا تاکہ آتشیں شریعت کو ہویدا کرے۔ اور کوہ سعیر کی روح القدس فارقلیط اعظم کی ہیئت میں متشکل ہوئی تاکہ اسکو بھیج دے جو ناصرہ کے نبی کے آئے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔

"ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا اور تم کیا سمجھے لیلۃ القدر کیا شئے ہے۔؟
لیلۃ القدر ایک عہد رحمت و دور برکت ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے
ملائکہ سماوی و روح الٰہی کا اس میں ہر طرف سے نزول ہوتا ہے سلام اس پر
یہاں تک صبح طلوع ہو جائے"۔

وہ آتش فشاں پہاڑوں پھٹتا نہ تھا جن کی چوٹیوں سے آگ ابلتی اور ہلاکت و موت بن کر اجسام حیوانیہ پر برستی ہے، بلکہ وہ فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہونے والا ابر رحمت تھا جو انسانیت کی سوکھی کھیتیوں کو سرسبز کرنے اور کائنات ارضی کی تشنگی سعادت کو سیراب کرنے کے لئے امنڈا تھا تاکہ جس طرح یروشلم کے مرغزاروں کو ہدایت کی بہشت بنایا گیا تھا، اسی طرح عرب کا ریتیلی اور بنجر زمین کو بھی شگفتہ اور شاداب کردے۔

"پس رحمتِ الٰہی کی نشانیوں کو دیکھو کہ کس طرح وہ موت کے بعد زمین کو حیات بخشتا ہے بیشک وہ مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے" (۳۰ : ۴۹) —

نزولِ قرآن : یہ قرآن حکیم اور فرقان مبین کا نزول تھا، جس نے قلب محمد ابن عبداللہ علیہ الصلاۃ والسلام کو اپنا مہبط اور مورد بنایا، جبکہ وہ غارِ حرا کے اندر بھوکا پیاسا تمام مادیاتِ عالم سے کنارہ کش ہوکر اپنے پروردگار کے حضور میں سربسجود تھا۔

"بیشک وہ پروردگار عالم کا اتارا ہوا کلام ہے، روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو ضلالت و فساد کے نتائج سے دنیا کو ڈرانے والوں میں سے ہو اور سعادت و فلاح کی طرف دعوت دے، یہ کلام نہایت کھلی ہوئی اور واضح زبان عربی میں نازل ہوا اور پچھلی کتابوں میں اسکی خبر دی جا چکی تھی"

(۲۶ : ۱۹۱)

وہ غذائے آسمانی کی طلب میں زمین کی پیداوار سے کنارہ کش ہوکر بھوکا پیاسا تھا۔ پس خداوند نے اس کی بھوک کو دنیا کی سیرابی کیلئے قبول کرلیا۔

(وَهُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ) وہ انسانیت کی غفلت و سرشاری دور کرنے کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر جاگتا تھا، پس اللہ نے اس کی بے خواب آنکھوں کو اپنے نظارۂ جمال سے ٹھنڈک بخشی (قرۃ عینی فی الصلاۃ) اور تمام عالم کے لئے اسے بصیرت عطا کی (قد جاءکم بصائر من ربکم) وہ انسانوں کو سرکشی اور تمرد کے عصیان سے نکالنے کیلئے شہنشاہ ارض وسما کے آگے سربسجود تھا، پس رب الافواج نے اس کے سر کو

الفت و یگانگت کے ہاتھوں سے اٹھایا اور زمینوں اور آسمانوں میں سربلندی، تاکہ اسکی الروح
ں کے کلام کی حامل ہو اور اس کے منہ سے خدا کی آواز نکلے :

(وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ)

سعادت البشری کا یہ پاک پیغام جسکی تبلیغ نبی امی کے سپرد ہوئی وحی الہٰی کا یہ فتح باب جو غار
ر کے عزلت گزیں پر ہوا ۔ خدا کا یہ مقدس کلام جو بلسان عربی مبین اسکے منہ میں ڈالا گیا ۔ سب سے
جس رات میں ظہور ہوا وہ "لیلۃ القدر" تھی اور لیلۃ القدر جس مہینے میں آئی وہ رمضان تھا

" رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو انسانوں کیلئے سرتاپا
ہدایت ہے اور جسکی تعلیم ہدایت و تمیز اور حق و باطل کی نشانی ہے "

مقدس : پس رمضان المبارک کا مہینہ فی الحقیقت اس سعادت انسانیہ اور ہدایت امم کے ظہور
یادگار ہے جس کا دروازہ قرآن حکیم کے نزول سے دنیا پر کھلا ، اور خدا اور اس کے بندوں میں
رد حرماں کی جگہ وصل و محبت کے راز و نیاز شروع ہوئے ۔ یہی مہینہ ہے جو اس آسمان سے
ب سے بڑی برکت کے نزول کا ذریعہ بنا ، اور یہی مہینہ ہے جو اپنے ساتھ زمین کی سب سے بڑی سعادت
۔ اسی موسم میں خدا کی رحمتوں کی پہلے پہل بارش ہوئی اور اس عہد میں دنیا کی وہ سب سے
ا خشک سالی ختم ہوئی جو صدیوں سے کائنات روح و قلب پر چھائی ہوئی تھی ۔ ہدایتوں کے
شتے اسی میں اترے :

سعادت کے قدوسی اسی میں زمین پر پھیلے ۔ خدا نے سب سے پہلے اس ماہ میں بندوں کو
ر کیا ، اور بندوں نے بھی سب سے پہلے اسی ماہ میں اسکی محبت کا جام پیا ۔ یہ پاکی اور بزرگی کا
ت تھا کہ پاک تعلیمات کا منبع بنا اور عظمت و شرف کا عہد مقدس تھا کہ خدا کا کلام اس کے
ول پر نازل ہوا ۔ پس جبکہ دنیا طرح طرح کی مادی یادگاروں کو مناتا چاہتی تھی ، تو مسلمانوں کو حکم
یا کہ وہ اس روحانی انقلاب کی یادگار کے امانت دار بنیں اور جس ماہ مبارک کو اپنی برکتوں اور
نوں کے نزول کی وجہ سے خداوند نے قبول کر لیا ہے ۔ اس کی قبولیت سے انکار نہ کریں ۔ دنیا
یزیوں کی یادگار مناتی ہے ۔ لیکن یہ سچے امن اور حقیقی رحمت کی یادگار ہے ۔ دنیا لڑائیوں کو
رکھنا چاہتی ہے ۔ یہ صلح و امنیت کے ورود کی یادگار ہے ۔ دنیا نے تخت نشینوں کو سب سے

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

پروفیسر رضی الدین احمد
ڈین علوم شرقیہ، ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

ابوالکلام، ترجمانِ حق و یقین

ابوالکلام اصلاً اور اساساً از اول تا آخر داعی حق و یقین بن کر جیے۔ ان کی ساری زندگی ان کا ذہن اور ذوق ان کی ساری صعوبتیں ساری ذلتیں ساری اذیتیں ان کا فکر اور فن ان کی کیفیتیں اور کارنامے دعوت حق و یقین کی روشن اور رنگیں نشانیاں ہیں چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں اور شخصیتیں اپنے زمانے سے ٹکرا کر اپنا تشخص کرتی ہیں۔ اس صاحب نظر نے جس گھرانے میں ہوش سنبھالا وہ تقلیدی رسم و رواج کا مقدس محل تھا۔ اس نونہال کے والد بڑے شہرت یافتہ پیر تھے۔ ان کے لاکھوں مرید تھے۔ کلکتہ میں ان کی بہت بڑی جائداد تھی اس بڑی جائداد کی آمدنی سے بھی بڑھ کر سجادہ نشینی کی بالائی آمدنی کا کیا ذکر۔ دست غیب کا شمار کون کر سکتا ہے۔ پھر ان کی علمیت عظمت اور عقیدت بھی مسلمہ تھی۔ شہرت، شرافت شائستگی اور شان و شکوہ گھر کی لونڈیاں تھیں اس ہونہار نے بچپن ہی سے ایسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں جو تصوف کے سرے سے سیاہ اور طریقت کے طوق سے سنہری اور سجی ہوئی تھیں یہ مبالغہ ہوگا کہ احمد محی الدین مادر زاد ہیں۔ بید الشی حسین، اپنے موروثی حافظے میں بے مثال اور ازلی سعادت میں ممتاز تھے۔ نو عمری ہی میں درس تعلیم کی تکمیل کر لی اور ساتھ ہی درس و تدریس کی بسم اللہ بھی کر دی۔ مولانا نے خود لکھا ہے کہ ابتدا میں ان کو جو شاگردوں کا حلقہ ملا ان میں سب سے کم عمر یہ خود تھے۔ اور ان کے شاگردوں میں سے بعض کی داڑھیاں ان کے چہرے سے بھی بڑی تھیں۔

اس براہیمی نظر نوجوان نے اس آبائی ماحول میں جو گھٹن محسوس کی اسکی تفصیل خوب خوب بیان کی ہے۔ آبائی عزت، خاندانی شہرت، وراثتی امتیاز اور تقلیدی مذہب سجادہ نشینی سنہری تخت اور پیری مریدی کا جگمگاتا تاج اتنی خداداد نعمتوں کی اس براہیمی نظر نوجوان نے نہ صرف قدر نہ کی بلکہ یوں کہہ کر انہیں ٹھکرا دیا کہ میں ان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کا عزم اور ضمیر کہتا تھا کہ آدمی اپنے اکتساب سے آدمی بنتا ہے۔ نیکی کرانے پر نہیں ملتی۔ حق و یقین کی کمائی محنت سے ملتی ہے خاندان سے نہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حق و یقین کے ایک نشے اور نغمے نے ابوالکلام کو ہر مستعار عظمت سے آزاد رکھا۔ خاندانی ٹھاٹھ، خاندانی جائداد، خاندانی شرافت، خاندانی شہرت حدیہ ہے کہ خاندانی نام محی الدین احمد بھی ان کو راس نہ آیا۔ دنیا نے اس نوجوان کو مولانا آزاد کہا اور اس نے اپنے آپ کو ابوالکلام کہا اور لکھا۔ ابوالکلام کی دینی فطرت ہر مستعار شئے سے آزاد ہی رہی۔ نام تک بھی خاندان سے لینا گوارا نہ کیا۔

ابوالکلام نے حق و یقین خود حاصل کیا تجربہ اور مشاہدہ خود کیا علم و معرفت کی دولت خود پیدا کی۔ اس اکتساب اور ریاضت نے ابوالکلام کو علم بھی بخشا ذوق بھی ودیعت کیا ظرف بھی دیا اور ذات کی تربیت بھی کی۔

ابوالکلام عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ غور کیا جائے تو عارف حق بھی تھے۔ عالم اور عارف کا فرق علامہ قشیری کے لفظوں میں یہ ہے کہ دراصل عارف وہ شخص ہے جو براہ راست یعنی حواس و عقل کے واسطے کے بغیر روحانی واردات کے طور پر علم حاصل کرتا ہے اور عالم وہ شخص ہے جو حواس و عقل کے ذریعہ بعض حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ صـ۱۴۲ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۳۔ عصر جدید کے علماء میں ابوالکلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ عالم ہی نہیں تھے بلکہ عارف حق بھی تھے اور ذوق حق کے رسیا بھی۔ ابوالکلام نے اپنے علم و معرفت کو حق و یقین کا وسیلہ بنایا۔

مسلم مفکرین نے علم و عقل کو معرفت حق و یقین کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اور معرفت حق محض عقیدہ نہیں عمل ہے۔ ابوالکلام نے کلام الٰہی کی روشنی میں اس نکتہ پر بہت زور دیا ہے کہ خدا کو ماننا خدا کے لئے مطلق اہمیت نہیں رکھتا یہ یقین انسانی کو شرف اور شان بخشتا ہے۔ یہ یقین کوئی جزوی چیز نہیں ہے بلکہ ایک کل اور کامل شئے ہے۔ کلام الٰہی نے یقین کے مقابلے میں قیاس اور شک کو رد کیا ہے حقائق کی تصدیق کی ہے توقعات کا انکار کیا ہے۔ حدیث میں خدا کو علم کہا گیا ہے جو ہر صاحب علم سے محبت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسے دین کا ستون کہا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی ستون ہوتا ہے اس (دین) کا ستون علم ہے۔ اس طرح یہ ارشاد کہ مومن کو کبھی علم سے سیری نہیں ہوتی ایک مشاہداتی حق ہے۔ امام غزالی کے نزدیک دین کا نظام چل نہیں سکتا بغیر دنیا کے نظام کے کیونکہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے۔ جس طرح پھل شجر سے، نور آفتاب سے اور بصارت آنکھ سے وابستہ ہے اسی طرح علم عقل سے وابستہ ہے۔ نہ صرف علماء اہل سنت کے ہاں بلکہ اثنا عشری علماء کے ہاں بھی علم، اور عقل کے بارے میں بعض ایسی احادیث مل جاتی ہیں جو چونکا دینے والی ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ

اذا کان یوم القیامة جمع اللہ عزوجل فی۔۔۔۔ الشہدا

یعنی قیامت کے دن اللہ سب کو میدان حشر میں جمع فرمائے گا اور تولنے کے لئے میزان کس دی جائے گی اس وقت شہیدوں کے خون سے عالموں کی روشنائی زیادہ وزنی نکلے گی۔ اس روایت کی اسلئے بہت اہمیت ہے کہ مسلک اثنا عشری میں شہدا ہی دین کے محافظ اور امام ہیں۔

علم و تحقیق کی بنیادوں پر ابوالکلام نے اپنے فکر و فن کی عمارت تعمیر کی ہے اور مغربی

منکرین کی اس روش پر تنقید کی ہے کہ وہ اسلام کو ایک مذہب عذاب اور عقاب ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سرتاسر مذہب رحمت ہے۔ ابوالکلام نے کلام الٰہی کی روشنی میں ساری کائنات کو خدا کے نظام ربوبیت و رحمت کی نشانیاں قرار دیا ہے اور نظام کائنات کی طرح خدا کی صفت ربوبیت کو بھی ایک کل نظام اور اسکی صفت رحمت کو بھی ایک ایسی تعلیم ثابت کیا ہے جسکے بعد کسی انسان کیلئے خدا کو تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا یہ وہی مسلک ہے جسے امام ابوحنیفہ نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اگر خدا رسولوں کو مبعوث نہ بھی کرتا تو بھی انسانوں پر اسکی معرفت بذریعہ عقل واجب ہوتی۔

ابوالکلام آزاد کا پورا نظام فکر اخلاق و اقدار عالیہ سے مرتب ہوا ہے۔ ان کی زندگی کے تمام نشیب فراز میں اپنی اخلاقی اقدار کی متعدد جھلکیاں ملتی ہیں اور ان کے فکر کا سمتیں بھی یقینی ہو جاتی ہیں۔ مولانا نے متعدد مضامین میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہمارے مسائل کے حل کا نقطہ اساس کیا ہے؛ یہاں یہ بات خصوصیت سے یاد رکھنے کی ہے کہ ابوالکلام کلام الٰہی کی وضاحت میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ کلام الٰہی کی روشنی تمام دنیا کے لئے ہے اس لئے تمام دنیا کے مسائل کا حل بھی ایک ہے۔ مولانا لکھتے ہیں تمہارے تمام دکھ کی دوا صرف یہی ہے خدا کے آگے جھکو اور اسکو پیار کرو اسکو اپنے سے مناؤ کہ جب تک دوست کو اپنے سے راضی نہ کرلوگے خواہ کتنی ہی محنت و مشقت کرو لیکن کبھی قبول نہ ہوگی۔ (الہلال ۱۴ مئی ۱۹۱۳ء)

ابوالکلام کی زندگی کے متعدد کارنامے ہیں وہ ایک صحافی بھی تھے ایک سیاسی رہنما بھی تھے۔ ایک بے پناہ خطیب بھی تھے ایک بہت بڑے انشاپرداز بھی تھے۔

لیکن ان کی زندگی کا کلیدی رخ وہ اخلاقی معیار محور حق و یقین ہے جسے کلام الٰہی نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام نے بار بار اور بہت اصرار سے کہا ہے آپ پوچھتے ہیں کہ مغرب و مشرق کے کن دارالعلوموں میں ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے گذارش ہے کہ الحمد للہ کسی میں بھی

البتہ رب المغربین ورب المشرقین کی اس درسگاہ میں فیضیاب ہوا جس نے اپنی نسبت کہا ہے کہ بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور ہدایت اور ہدایت کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ (الہلال ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء)

یہ عجیب بات ہے کہ ابوالکلام کا واضح فکر زندگی کے ہر شعبے میں یکساں فکر الٰہی سے منور ہے لیکن ان کی سیاسی شہرت ان کے سارے کارناموں پر چھائی ہوتی ہے۔ اگر ان کے تمام افکار کا دقتِ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو ان کا کلیدی کردار اخلاق الٰہی سے جڑا ہوا ملتا ہے۔

ایسی فکر کو فکر الٰہی سے جوڑنا چنداں دشوار نہیں ہے لیکن اپنے اخلاق اور کردار کو خدا کے اخلاق اور کردار سے منسلک کرنا ایک انقلابی کارنامہ ہے جس سے ابوالکلام کی زندگی بھری پڑی ہے۔

مثلاً وہ جنگ آزادی کے مجاہد تھے۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے زیادہ ہندو مسلم میل کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ بات مولانا نے کانگریس کے خطبے میں بحیثیت صدر کہی تھی۔ الہلال نے اس باغی نوجوان کی شہرت اسکے شوق اور شعور کا اتنا شہرہ کیا کہ لوگ اپنی شیروانی بیچ کر الہلال خریدتے تھے۔ اسکے مدیر کے لئے اس سے خاص آمدنی ہو سکتی تھی۔ لیکن ابوالکلام کی خودداری ہمیشہ ان کے لئے ایک سنگ گراں ثابت ہوئی۔ حکومت نے الہلال سے ضمانتیں طلب کی۔ روپے کی سخت ضرورت تھی ایک رئیس نے جو کہ الہلال کو جاری رکھنا چاہتے تھے ایک بڑی رقم کا چیک دیا اور یہ وعدہ کیا کہ یہ رقم برابر ملتی رہے گی لیکن ابوالکلام نے یہ چیک واپس کر دیا کہ کہیں رئیس کی اعانت سے الہلال کی پالیسی متاثر ہو سکتی ہے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس خطرے کو مول لیں اسلئے وہ ہمیشہ اور ہر جگہ گھاٹے کا سودا کرتے رہے مگر حق و یقین کی دعوت کا دروازہ کھلا رکھا۔ ابوالکلام کے شاہکار ترجمان میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے یہ لکھا ہے کہ دوسروں نے

ذوق و افکار کی ترجمانی کا کام قرآن سے لیا مولانا نے قرآن کی ترجمانی کا کام اپنے اعلیٰ ذوق اور تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتوں سے انجام دیا۔ علامہ دوسروں کے تراجم و تفاسیر ان کے ذوق و فکر کے ترجمان ہیں مولانا قرآن کے ترجمان ہیں چنانچہ مولانا کے فکر کا اساسی اصول ان کا یہی رویہ ہے فرماتے ہیں (ص ۲۳ مولانا آزاد سیرت شخصیت اور علمی کارنامے۔ (سعید اکبرآبادی)

انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے۔ ابوالکلام کے اس رویّے نے ان کے الہلال ۵ اگست ۱۹۱۲ء پیام میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ نہ صرف جدید تعلیم یافتہ حضرات ہی ان سے متاثر ہوئے بلکہ حضرت شیخ الہند جیسے جید عالم بھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ اسکی وجہ مولانا اکبرآبادی یہ تحریر کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جس چیز کا پیام دیتے تھے اور جو درحقیقت ان کی دعوت کا اصل مرکز و محور تھا وہ سب کچھ وہ تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کے دل کی آواز تھی (ص ۳۹ مولانا ابوالکلام آزاد) اسلئے مولانا آزاد کے سب سے زیادہ قدردان علمائے کرام کے طبقے میں حضرت شیخ الہند تھے (ص ۲۱۹)

مولانا کے فکر و فن پر اخلاق کی اس کڑی گرفت کی وجہ سے پروفیسر مجیب نے تذکرہ پر یہ تنقید کی ہے کہ ابوالکلام کا تذکرہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں بلکہ روحانی قوت تھا اس نے ہمیشہ کے لئے ان کو ایک معلم اخلاق اور مفکر حق و یقین بنا دیا۔ جسکے لئے سیاست صحافت ادبیت اور خطابت حق و یقین کا ذریعہ بن گئیں۔

ابوالکلام کا ترجمان ان کا شہکار ہے لیکن یہاں ان کی عظمت و معیار مستعار نہیں ہے ابوالکلام نے تقلید اور روایت پرستی کی ساری متواتر روایتوں کو چھوڑ کر صرف قرآن کی روایت کو سامنے رکھا۔ حق و یقین کی یہ دعوت اتنی متحرک اور متاثر تھی کہ سجاد انصاری کو کہنا پڑا کہ اگر قرآن اردو نثر میں نازل ہوتا تو یہ ابوالکلام کی اردو ہوتی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ خیال کہ ابوالکلام نے اپنے اسلوب کو قرآن سے منور کیا صرف اسلوب کا تجزیہ ہے

یہ ہمارے ناقدین کی کوتاہ بینی ہے کہ ان کی نظر اسلوب پر جاکر رک جاتی ہے۔ ابوالکلام کا اسلوب ہی نہ صرف قرآن سے متاثر ہوا تھا بلکہ ان کا پورا فن اور سارا کردار اسی روشنی سے منور اور متحرک تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور کا شاندار خیال کہ اگر آزادی کے بعد مولانا منصب وزارت کی بجائے مسلمانوں کی قیادت کا بار اٹھاتے تو ان کا رول زیادہ اہم ہوتا۔ یہ تنقید اس لئے بڑی گمراہ کن ہے کہ آزادی کے بعد سب سے نازک مرحلہ جدید ہندوستان کی تعمیر تھا۔ مولانا ایک سیکولر دستور کے پرخلوص مدبّر تھے۔ اور یہ ان کا شاندار کارنامہ ہے کہ آزادی کے بعد اس دستور کے سلسلے میں ان کی کوششیں کارگر ہوئیں۔ ہمارا دستور دنیا کے بہترین دستوروں کا نمائندہ ہے لیکن یہ ہمارا قومی المیہ ہیکہ ہم صحیح بات کہنے کے باوجود اس پر دیانتداری سے عمل نہیں کرتے۔ یہ ہمارے قومی ضمیر کی وہ کمزوری ہے جو ہمارے معیارِ حق و صداقت کو پست سے پست کردیتی ہے۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد دونوں کی زندگی اس پر گواہ ہے کہ مذہب اور اخلاق ساری زندگی کے محور اور مرکز ہے۔ سیکولرزم کے معنی مذہب بیزاری کے نہیں ہیں بلکہ سارے مذاہب سے رواداری کے ہیں۔ تمام مذاہب میں یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ وہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتا ہے دوسری تمام مذہبی کتابوں اور پیغمبروں کی تصدیق کرتا ہے۔ ترجمان میں یہ بحث ابوالکلام کے فکر کا روشن پہلو ہے۔

ابوالکلام کا یقین تھا کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اسلام اپنے دشمنوں سے ناامید نہیں ہوتا۔ وہ تبلیغ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے لیکن تبلیغ کے معنی جبر اور قوت سے اپنے مذہب کو پھیلانا نہیں ہے بلکہ عاجزی اور نرمی سے حق و یقین کی تبلیغ کرنی ہے۔ ابوالکلام کو اسلام کی حقانیت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا گاندھی جی کو ہندو دھرم کی سچائی کا۔ دونوں ایک دوسرے کے سیاسی حلیف تھے لیکن مذہبی اقدار میں دونوں کا زاویہ نظر واضح طور پر جدا تھا۔ گاندھی جی اہنسا کو ایک عقیدہ خیال کرتے تھے۔ ابوالکلام کے نزدیک یہ ایک سیاسی

ہتھیار تھا۔ گاندھی جی سیاسی مقاصد کیلئے اپنے جسم کو تکلیف دیتے تھے برت رکھتے
مولانا اسے جبر خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عقیدے کے لئے ہر قسم کا جبر غلط
ابوالکلام کے نزدیک آزادی انسان کا حق تھا۔ آزادی فکر بھی اس میں شامل تھی۔
فکر کو دبانا انسان کے حق میں مداخلت تھی اس مداخلت کے لئے اسلام نے جہاد کیا۔
آزادی دیتا ہے اسے سلب نہیں کرتا۔ غلامی آزادی کے سلب کرنے کا نام ہے۔ ہندوستان
میں اور خاص طور پر تعلیم زبان، تہذیب، اور مذہب کے بارے میں جو خیالات
وہ سب فکر اسلامی کے اجزاء ہیں۔

ابوالکلام نے تہذیب و ثقافت، انسانی ارتقاء انسانی آزادی مساوات اور انصاف سے
جن خیالات کا اسلام کے حوالے سے اظہار کیا ہے وہ ان کا بہت بڑا دینی اور اخلاقی
ہے۔ وزارت تعلیم کو انہوں نے دین حق کی حفاظت اور صداقت آزادی اور مساوات
کا ذریعہ بنا کر ایک مثال قائم کی۔ مولانا نے جس طرح جنگ آزادی میں ایک مجاہد
ادا کیا اسی طرح ملک کی تعمیر میں ایک معمار ملت کا فرض ادا کیا۔ جنگ آزادی کیلئے وہ
ایسے انقلاب پسند تھے جو دہشت اور تشدد کو جائز قرار دیتا تھا۔ تکرولی الند
جان کی حیثیت سے ان کا بھی یہی نعرہ تھا۔ ننگ کل نظام۔ ہر نظام کو توڑ دو۔ لیکن
نا محض تخریب نہ تھا۔ ایک نئی تعمیر کا نظام تھا اس لئے جنگ آزادی کے ایک سپاہی
کی طرح وہ تعمیر قوم اور ملک کی ترقی کے ان معماروں میں سے تھے جن کی قیادت تعمیری
بنیادوں پر بھی مستحکم اور متوازن تھی۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد دونوں کی اخلاقی اور
حیثیت معتبر اور مستحسن تھی۔ گاندھی جی کے قتل پر مولانا نے جو تاریخی تقریر کی ہے وہ
اخلاق کی ایک ایسی تعریف ہے جو فکر اسلامی کی تعمیری اور ترقی پسندی کی روشن
ہے۔ مولانا کے انتقال پر پنڈت جی نے کہا تھا کہ گاندھی جی کے انتقال کے بعد ہمارے پاس ایک
تی مولانا کے انتقال کے بعد وہ روشنی بھی نہ رہی۔ یہ روشنی حق و صداقت کی روشنی تھی اور
مولانا کے حق و صداقت کی روشنی کبھی نہیں بجھتی۔ اگر یہ روشنی تمام نسلوں کو روشن کرے۔

حضرت مولانا حالی نقشبندی
سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ بالاپور
مہاراشٹرا ۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

میں سربراہان مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس موقع پر مجھے آپ سے مخاطبت کا موقع دیا ۔ جناب نواب انیس احمد خاں صاحب ۸ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شام میں خانقاہ پہونچے جبکہ میں روضہ بزرگ کے عرس مبارک میں مصروف تھا ۔ اور خواہش ظاہر کی کہ ۲۲ر اکتوبر کے اس سیمنار میں "مولانا آزاد کے دینی افکار" پر ایک مقالہ پیش کروں ' یہ ایسا مبحث نہیں جس پر اس مختصر وقت میں قلم برداشتہ مولانا آزاد جیسی عظیم المرتبت ' فقید المثال شخصیت پر کچھ کہا جاسکے ' میں نے ہر چند معذرت چاہی مگر نواب صاحب کب ماننے والے تھے ۔ ۱۲ر اکتوبر کے کرامت نامہ سے مکرر اصرار ہوا ۔ اسی شام ناگپور ہائی کورٹ کے ایک مقدمہ میں جانا پڑا ۔ جہاں سے ۱۹ کی شام واپسی پر شدید علالت نے فرنیش کردیا ۔ اسی دوران نواب صاحب کا دوسرا حکم نامہ صادر ہوا ۔ اس اصرار پر انکار ممکن نہ ہو سکا ۔ ان حالات اور دوران علالت میں اس کم سواد سے جو کچھ بن پڑا مقالہ نہیں ایک مختصر خاکہ پیش خدمت ہے ۔

حضرات :

انیسویں صدی کے ساتویں دہے میں حضرت مولانا خیر الدین دہلوی اپنے نانا حضرت مولانا منور الدین علیہ الرحمہ کی معیت میں مکہ معظمہ پہونچے ۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام میں مقیم ہوگئے ۔ یہیں ایک اعلیٰ علوی نژاد عرب خاندان سے رشتہ مناکحت میں منسلک ہوئے جس سے ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت ہوئی ' والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا

...رت لا کے عربی فارسی اور درس نظامی تک تعلیم پائی، اور دیگر عظیم المرتبت اساتذہ سے مزید
...علم کیا۔ اسی دوران قیام میں "بزم رسیدہ" کی مرمت و درستی کروائی۔

حضرت مولانا خیر الدین مرحوم ایک ایسے خانوادۂ علم و فضل کے امانت دار تھے جس کی گزشتہ نسلوں
...عظیم المرتبت علما نے حق و حریت پیدا کئے تھے کہ ان کا ذکر آج بھی زیب تاریخ ہے۔ ان بزرگوں میں ایک
...لی اللہ بزرگ حضرت شیخ جمال الدین علیہ الرحمۃ نے جلال الدین اکبر کے مضر بدعت پر استقلال سے
...انکار کیا جبکہ دربار اکبری کے بڑے بڑے علما بدعت کی اشاعت کو عین ایمان قرار دے رہے تھے۔

حضرات :

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جب آنکھیں کھولیں تو انیسویں صدی کے اواخر میں یورپین
...قوام کی استعماریت نے دنیائے اسلام میں ایک انتشاری کیفیت پیدا کر دی تھی، محمد بن عبد الوہاب
...کی وہابی تحریک نے عرب اقوام کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور طرابلس میں سنوسیوں کی تحریک نے ملت اسلامیہ
...میں ایک نئی حرکت پیدا کر دی۔ وہابیوں اور سنوسیوں کی تحریکات زیادہ تر مذہبی تھیں، اس کے باوجود
...ان دونوں تحریکوں کا مقصد ملت اسلامیہ کا احیاء تھا۔

اخوان کی تحریک بھی اسی طرح اسلامی ممالک میں مذہبی بیداری و جوش عمل پیدا کرانا چاہتے تھے جو
...مزید اسلامی ممالک کو یورپین اقوام کی دست برد سے محفوظ رکھ سکیں۔

حضرات:

انہی حالات میں مفتی محمد عبدہ اور سید جمال الدین افغانی اتحاد ملت کے ساتھ ہر وحدت کو
...ملیت کے جذبہ سے مستحکم کر کے عالمی وفاق بنانا چاہتے تھے۔ جو یورپین سیاست و تجارت کے
...نشانہ بنانے میں ... دستبرد سے ملت اسلامیہ کو محفوظ رکھیں جن کا ہر میدان میں اسلامی
...مبلغین سے مقابلہ ہو اور ہر جگہ ... جس کا اعتراف عیسائی مشن کے بڑے
...بڑے مشنری ... جنکی تحریک کے ... ہے
... .

...... جو لوگ عیسائی بنائے جاتے اس میں سے بھی بہت سے اسلام قبول کر لیتے ......
وہ قبیلے جنکے اندر کوئی بھی مسلمان نہ تھا ...... تقریباً احکام اسلامی کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں

(آثار جمال الدین افغانی)

حضرات! اسی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی جس چنگاری نے تبلیغ اسلامی کی تحریک کو چمکایا، مسلمانوں کے مذہب کا ایک اساسی عنصر ہے۔ وسط ایشیا میں روس کے خلاف نقشبندیہ تحریک نے زور پکڑا، الجیریا میں عبد القادر کی تحریک آزادی شروع ہوئی۔ چینی ترکستان میں بغاوتیں پھیل گئیں۔ علاوہ ازیں بخارا میں مجلس اتحاد اسلام کی جدوجہد کا رشتہ نوجوان ترکوں کی تحریک سے جا ملا۔ اس زمانے میں بابائے قوم سرسید علیہ الرحمۃ کی تحریک علی گڑھ ہندوستان میں برگ و بار لا رہی تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد بھی سرسید سے مکتسبہ ہوگئے، جامعہ ازہر کی دوران تعلیم میں مولانا آزاد کو مفتی عبدہ و سید جمال الدین افغانی سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہاں کے علماء اور طلباء کی علمی صحبتوں نے روشن خیالی فکر و نظر میں گہرائی اور وسیع النظری کیساتھ اجتہاد صالح کے ذریعے اپنی ذہانت و خطابت کے اظہار کا موقع دیا چنانچہ "تذکرہ" میں مولانا یوں رقمطراز ہیں۔

...... مذہب کے دو کانداروں نے جہل و تقلید اور ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیال و تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو اجتہاد و حکمت کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدہ میں رندان بے ریا، ارباب صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں۔

حضرات!

۱۹۰۸ء میں مولانا اپنے والد ماجد کی رحلت پر زندگی کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ ایک طرف خاندانی وقار و تقدس، عظمت طریقت جبہ و دستار، مسند ارشاد و ہدایت کی دلفریب رہنمائی لیکن وہ اپنے خاندان کی اسی تقلید دعمل پر آمادہ نہ ہوسکے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے لئے

تیار کی جہاں خاندانی علم و فضل کا دامن بھی نہ چھوٹے اور ملک و ملت کی خدمت اور
کیلئے اپنی پرستی و خدا داد صلاحیت و قابلیت سے وہ کچھ کرسکتے ہیں۔ کرتے رہیں
ہ انہوں نے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں اسطرح کیا ہے۔

۔۔۔۔۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے
ں بھی کوئی تقسیم نہیں جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ اور جو کچھ جدید ہے
ہ اپنے اپنی راہیں خود نکالیں، میرے لئے وقت کی جدید راہیں ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں
م راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں، خاندانی تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے کچھ میرے
میں نے اوّل روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشہ
نہ ہوسکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔

۔۔ میرے لئے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے
ں روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گذر چکا ہو
لھ تلخیاں بھی ہر جام سے پیئے ہیں۔ اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء میں آزمائے
ب پیاسا تھا میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھی اور جب سیراب ہوا تو میری
ی بھی شاہراہ عام پر نہ تھا ۔۔۔۔۔ اسی عرصہ کے طلب و جستجو کے بعد قرآن کو جیسا
چکا ہوں میں نے اسی کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہوں۔

ت!

شاہیر اسلام میں کس کو بدیع الزماں کے لقب سے پکارا گیا اور کس کو مورخین نادر العصر
مشاہیر کو ان القاظ سے یاد کیا گیا ان کے کس کمال کے لحاظ سے یہ القاب مبنی برحقیقت
مام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہٗ بلحاظ جملہ اوصاف نابغۂ دوران و
بگار بے شمار محاسن و تنوع علمی وہ مفسر قرآن ہی نہیں جید عالم ماہر علم الکلام، زبردست
نحو تھے۔

مولانا نے اپنی تمام اجتہادی قوت قرآن کریم کے سمجھنے سمجھانے میں صرف کی "تفسیر بصائر" کے عنوان قرآن پاک کے تین حصوں میں سے دو مرتب فرما چکے تھے کہ یکایک پولیس نے چھاپہ مار کر تمام محفوظات و مسودات بغرض تحویل سرکار ضبط کر لئے۔ رہائی کے بعد محفوظات و مسودات ترمیم شدہ حالت میں ملے کہ ان کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود مولانا نے اپنے ذہن حافظہ کی مدد سے رانچی سے واپسی سے قبل ہی ضائع شدہ حصوں کو از سر نو مرتب فرما کر تیسری جلد بھی شروع کر چکے تھے۔ لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور یہ تفسیر مکمل ہو کر آگے طبع نہ ہو سکی۔ بہرکیف یہ نادر الوجود تفسیر اپنی اہمیت و افادیت و عدم تکمیل اور علمائے کرام کے اعتراضات کے باوجود مولانا کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو تمام تفاسیر میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔" مولانا کے حیرت انگیز حافظہ کی لاتعداد مثالوں میں سے اس وقت میرے اپنے ذاتی مشاہدہ کی ایک یاد تازہ ہو گئی ہے، سقوط حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا آزاد پہلی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے۔ رائل لینڈ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں جمعیت العلماء کا ایک وفد جس میں نواب میر احمد علی خاں صاحب سابق گورنر اتر پردیش، راقم الحروف ہادی نقشبندی یونس سلیم صاحب ایڈوکیٹ (سابق مرکزی نائب وزیر) انور خاں جامعی مرحوم معتمد جمعیت اور ایڈوکیٹ انیس الدین احمد مرحوم صدر جمعیت کی معیت میں مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو انیس الدین مرحوم کو دیکھتے ہی مولانا نے فرمایا "میرے بھائی میں آپ سے کہیں ملا ہوں؟" انیس الدین احمد مرحوم انتہائی پریشان کہ میں کبھی مولانا سے نہیں ملا کچھ وقفہ کے بعد مولانا نے خود ہی فرمایا "میرے بھائی مجھے یاد آ گیا ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ کی تاسیس کے موقعہ پر آپ میرے کمرے کے نگراں تھے اس قسم کی ٹوپی اور شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ نیز تمام جزئیات کی تفصیل فرمائی۔ ہم سب حیران اور انیس مرحوم کو یہ تمام باتیں یاد آ گئیں۔

حضرات!

مولانا کے مذہبی عقائد خاندانی روایات سے ایک حد تک مختلف اور وسیع تر ہونا

باوجود ان کا مسلک والد مرحوم سے الگ نہ تھا البتہ والد مرحوم جاہلیت سے مرکز ان کو چھپا رکھا تھا، لیکن اس کے لئے گوشہ نرم تھا مولانا نے اپنے زندگی کے ان اصول کی وضاحت تحریروں میں ہے جو "الہلال" اور "البلاغ" کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ "البلاغ" میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

.... قرآن حکیم ایک مجموعہ صداقت ہے اس لئے دنیا کی تمام صداقتوں کے ساتھ سیاست کو بھی جو شاندار میں سب سے پہلے جگہ دی اور جو خود چند لمحوں کیلئے کھلے طور پر چھپا تھا۔ دلائل اس کے تاج حقیقت کا طور زور لگا دیا۔ سیاست الہی فرعون کے تاج و تخت کے مسئلہ نہیں تھی اس کا کام ابوجہل و ابوسفیان کی سیادت کو محفوظ رکھنا نہ تھا وہ دنیا میں صرف میزان عدل قائم کرنے کیلئے آئی تھی، اس لئے اس نے ایک فطری مذہب کی آغوش میں اپنے آپ کو نمایاں کیا کیونکہ فطرت ہی ایک ایسی چیز ہے جو خود عدل و انصاف سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتی اور اگر وہ اپنے مرکز سے ہٹ جاتی تو دنیا کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔

صحافت!

۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری ہوا جس نے مسلمانوں کو ان کے تمام سیاسی و غیر سیاسی ... اعمال میں اتباع شریعت کی تلقین کی اور سیاسی آزادی و حریت کو دین و مذہب کی روشنی میں پیش کیا اور چند ہی سال میں اس نے مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی زندگی میں انقلاب کی ایک لہر دوڑا دی۔ "الہلال" کے بند ہونے کے کچھ دنوں بعد "البلاغ" نکلا یہ اخبار بھی اپنی سحر نگاری اور انقلاب آفرینی میں "الہلال" سے کم نہ تھا اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے اور ایک ایک سطر نے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کیا اور قوم کے جذبے جان میں نئی زندگی پیدا کر دی۔

مولانا نے جس نظر سے تعلیمات قرآنی کو دیکھا اور پرکھا اور جس طرح قدیم مفسرین اور فن تفسیر پر تنقید کی ہے وہ ان کا وسعت فہم جیسے تمام مذاہب عالم اور صحیح مفہوم قرآن سمجھتے ہیں۔ "الہلال"

میں کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

قرآن کریم کے مطالعہ تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ اسوقت تک پیش آتی رہنگی جب تک ہم اسکے بارے میں چند بنیادی اصول نہ ہو جائیں گے ۔ ۔ ۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ صدرِ اول کے بعد سے قرآن کریم کے فہم وتدبر کی راہیں دو ہوگئیں ایک قرآنی ہے اور دوسری غیر قرآنی ۔ ۔ ۔ ۔ غیر قرآنی طریقہ سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق وفکر سے پیدا ہوتے یہ علوم کسبیہ کی اشاعت ایرانی، رومی اور ہندی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقدام کا قدرتی نتیجہ تھا ۔ مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن کے مطالب اسی شکل نوعیت میں دیکھے جیسی شکل ونوعیت کی فکری حالت ان کے اندر پیدا ہوگئی تھی، رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ قرآن کے الفاظ تراکیب، اسلوب بیان، دلائل وبراہین، مواعظ وحکم سب نے ایک دوسری ہی طرح کی نوعیت اختیار کرلی قرآن کی تعلیم وبیان کی تمام تر بنیاد وضعیت اور وضعیت کے تعلق اور کاوش پر ہے نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہماک بڑھتا گیا، فطرت کے ذوق وفہم کی استعداد کم ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب لوگوں کے دماغ اس درجہ وضعیت اور وضعی طریق بحث کے عادی ہوگئے کہ کس اہم اور عظیم بات کو اسکی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتے ہیں

حضرات!

مولانا آزاد کی عظیم شخصیت اپنے علمی تجربہ، اعلیٰ قیادت برگزیدہ صحافت، زور خطابت دینی وملی دردمندی، قومی وملکی خدمات کے باوصف اپنے افکار کی بلندی، خلوت گزینی وکم آمیزی کے باعث، اجتماع متدین اور ہمیشہ متنازعہ رہی ہے ۔ جسے انہیں عوام سے ہمیشہ دور ان کی دسترس سے باہر رکھا ۔ صرف چند مخصوص افراد کے مواہبت کم لوگ ان سے قریب ہوسکے جسکی وجہ وہ اپنی کشتی کے خود ہی ملاح ومسافر رہے ۔

امام الہند مولانا آزادؒ مطالعہ قرآن نے جو فکر ونظر کی بلندی، علوئے ہمتی، حوصلہ مندی گہرائی وگیرائی کے ساتھ فہم وادراک قرآن کے باعث عظمت کردار کی شان پیدا کردی تھی جسکی

ایک جھلک میں نے بھی دیکھی ہے ۔ جس سے انتہائی متاثر اور اس کا یہاں ذکر غالباً بے موقع نہ ہوگا
۱۹۴۵ء کی بات ہے مولانا دہلی سے کلکتہ ہوڑہ میل سے جا رہے تھے جب ہوڑہ میل علیگڑھ
جنکشن پہونچی میں درجہ اول کی راہداری کے پاس کھڑا تھا ۔ جہاں مولانا کا درجہ اول آ کر رکا
جیکے دروازہ میں مولانا کے سکریٹری اجمل خاں مرحوم کھڑے تھے خاں مرحوم کی قمیص کے پھٹنے
کی آواز کیا آئی تھی کہ میں بے تحاشہ مولانا کی طرف دوڑا کہ کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے ۔

خانصاحب مرحوم اور میں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے، مولانا کے برتھ سے ملحق کھڑے ہوئے تھے
میں نے دروازہ کی جانب سے مولانا کو محفوظ کر لیا - اسی دوران پروفیسر ڈاکٹر طاہر رضوی مرحوم
صدر شعبہ جغرافیہ علیگڑھ یونیورسٹی ڈبہ میں داخل ہوئے اور طلبا سے فوری طور پر اسے خالی کروا کر مجھے
حکم فرمایا کہ میں دروازہ اور کھڑکیاں بند کر کے مولانا کی ٹونڈلہ جنکشن تک مشایعت کروں ۔

مولانا کے روبرو کی اوپر کی برتھ میں پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم اور اسکے نیچے کوئی خاتون بیٹھی
ہوتی تھیں اور مولانا کے اوپر کی برتھ اجمل خاں مرحوم کی تھی ۔ مولانا پر اس ہلڑ کا کوئی اثر نہ تھا ۔
وہ انتہائی پر سکون، اطمینان سے کسی نئی انگریزی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے ۔ نیز مولانا
کی برتھ پر بیس پچیس نئی کتابیں دو لائنوں میں جمی ہوئی تھیں ۔

افسوس اس پر غیروں نے نہیں اپنوں ہی نے اسی زمانے میں ابھی اس معمولی واقعہ کو بتنگڑ
بنا کر ہندوستان کی اس عظیم دانش گاہ مسلم یونیورسٹی اور اسکے طالب علموں کے خلاف رسوا اور بدنام
کرنے کی خاطر انتہائی غلیظ مبالغہ آمیز غلط پروپگنڈہ کیا گیا ۔ اور اب چوالیس سال گزرنے
کے بعد بھی دہلی میں مولانا آزاد سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جناب پروفیسر ڈاکٹر مونس رضا صاحب
(علیگڑھ) چانسلر دہلی یونیورسٹی نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا کہ "میں نے مولانا ابوالکلام آزاد
کو زندگی میں دو بار دیکھا ہے اولاً علیگڑھ اسٹیشن پر جب طلبا مولانا کے منہ پر تھوک رہے تھے
اور مولانا انتہائی کسمپرسی میں حیران و پریشان تھے ۔ محض مبارک گاڑی کے علیگڑھ پہنچتے ہی طلبا نے
مولانا کے ڈبہ کو گھیر لیا تھا جسے فوری طور پر خالی کروا کر کھڑکیاں اور دروازہ بند کر دیئے گئے تھے

محل نظر ہیکہ ڈاکٹر صاحب نے کسطرح مولانا کی بے بسی دکسمپرسی دیکھی جبکہ مولانا مصروف مطالعہ
مسکراہے تھے۔ جوان کی عظیم العزیمتی کی مظہر ہے۔

خاتمہ کلام میں اسی شذرہ پر کر رہا ہوں جسے مولانا ئے مرحوم نے اپنے خون دل سے رام گڑھ کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا۔

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہو، [illegible] اسلام تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہیکہ اسکی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہب اور کلچرل دائرہ میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اسمیں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اسی راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ونسبلہ صفحہ ۱۸۵

بڑا سمجھکر یاد رکھنا چاہا۔ مگر یاد نہ رکھ سکی خدا نے بتلایا کہ سب سے بڑا احسان ایک فاتحین تھا جسکی یادگار تر و تازہ رکھی گئی اور ہمیشہ زندہ رہی۔ دنیا نے ملکوں کی فتح اور زمینوں کی تسخیر کو بڑا واقعہ سمجھا اور اسکی یاد میں خوشیاں منائیں، مگر ہمیں تعلیم دیا گیا کہ دلوں کی فتح اور روحوں کی تسخیر ہی سب سے بڑی بات ہے اور اسی کی یادگار منانی چاہیئے۔

"اور ہم نے تیرے ذکر کو رفعت اور بقائے دوام عطا فرمایا"۔

[illegible]

اسلامی احکام و فقہ کی ترمیم

مولانا آزاد کی نظر میں

آج بدقسمتی سے وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہماری نشو ونما کی قوتیں نذر غفلت ہو چکی ہیں اور ہماری متاع اقبال لٹ چکی ہے۔ نہ ہمارے دل ایمان و ایقان کی شمع سے روشن ہیں اور نہ عزم و توکل اور خود اعتمادی کے جذبہ سے بیدار۔ ہمارے اسلامی علوم و فنون۔ ہمارے اخلاق و آداب ہماری تہذیب و معاشرت اور ہماری سرفرازیاں اور سربلندیاں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ اور صورتحال یہ ہو چکی ہے کہ نہ تو ماضی کی عظمتوں میں ہمارے لئے کوئی منظر عبرت و بصیرت ہے اور نہ حال کے واقعات و حادثات میں کوئی پیام تنبیہ و آگاہی۔ غرض کہ ہمارا ملی وجود برف آتش زدہ ہو چکا ہے اور اس بات کا ثبوت فراہم کر رہا ہے کہ ہم نے پہلے اللہ کو بھلایا اور بعد میں خود اپنے آپ کو بھلا دیا۔ کاش مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں اور بحیثیت مسلمان اپنی ملی زندگی کی بقاء اور اس کے تحفظ کو اوامر اسلام کے تفہیم و ابلاغ پر منحصر سمجھیں اور اپنے اعمال و کردار کو انوار تعلیمات قرآنی سے روشن کریں اور اپنی حیات اجتماعی کے حصول کیلئے نظام اسلامی سے اس طرح وابستہ و پیوستہ ہو جائیں جس طرح فلک نیلگوں کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت کے حصول کیلئے اپنے نظام شمسی سے وابستہ ہے اور اپنی زندگی کی بقاء کیلئے اسی مرکز شمس کی اطاعت و انقیاد میں ہمہ وقت مصروف ہے تو یقین فرمائیے اس کا خانہ ہستی کا ایک ایک گوشہ اور اس کا ایک ایک ف

یا وسلامتی کی جنت بن جائے گا۔

سلام دین فطرت ہے :۔ یہ حقیقت آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ اسلام جو دین رت اور دین قیم ہے اور جسکے احکام کا مرکز واساس ۔ فاطر السموات والارض کا وہ کلام ہے جسکو ری کائنات میں قرآن عظیم کہا جاتا ہے جب اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف تا قیامت ت وعدہ الہی

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ

زوال اور تغیر پذیری سے محفوظ و مصئون ہے۔ تو دنیا کی کون سی ایسی قوت ہے جو اس کے علام ہے وضوابط اور اصول وکلیات میں ترمیم و تغیر کر سکے۔ چنانچہ خود خالق کائنات نے فرمایا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا : پروردگار عالم کا کلام سچائی اور انصاف کے ساتھ

وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ درجہ اتمام و کمال کو پہنچ چکا اب ایسا کوئی نہیں جو اس کا بدلنے والا ہو۔

بلا شبہ قرآن حکیم الہی قائم و ثابت اور زندہ و پائندہ صداقت ہے جو چودہ سو سال سے ہے تاب وہدایت ورحمت بن کر افق عالم پر اس طرح چمک رہا ہے کہ اسکی سلطانی تجلی میں نیا کے کروڑ ہا افراد نشو نما پا رہے ہیں اور اپنی شمع حیات کو اس سے روشن رکھے ہوئے ہیں ۔

تاریخ شاہد ہیکہ دنیا کی جن قوتوں نے اس آفتاب بصائر و موعظت کو غروب کرنا چاہا وہ ود صفحہ ہستی سے اسی طرح نیست و نابود ہو گئیں کہ آج انکے نام ونشان کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

سلمانوں کے مذہبی احکامات میں ترمیم : کچھ عرصہ سے ملک میں اس امر کی عام شہرت ہیکہ یکساں سیول کوڈ کے دائرے وسعت میں مسلمانان ہند بھی شریک کر لئے جائیں گے تاکہ ن کی شمولیت کے بعد پورے ہندوستان میں یک رنگی و یکسانیت کا مکمل ظہور ہو یعنے جس قدر ویں یہاں آباد ہیں وہ اپنے اپنے جداگانہ اوصاف و خصائص اور امتیازی قوانین کو فنا کر کے ہندوستانی قومیت کے اندر اسطرح جذب ہو جائیں کہ وہ ہندوستانی قوم کے سوا اور کچھ نہ رہیں ۔

متحدہ قومیت کا بھی وہ تصور ہے جو آج ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل و دماغ میں نشو و نما پا رہا ہے اور مسلمان اس تصورِ قومیت کے آئینہ میں ملت اسلامیہ کے مستقبل کی تصویر دیکھ کر فکر و اضطراب کی کروٹیں بدل رہے ہیں۔ لیکن ایسا بنیادی تغیر انشاء اللہ کبھی نہ ہوگا اور مسلمانانِ ہند یکساں سیول کوڈ کے دائرے واثر و نفوذ سے یقیناً مستثنیٰ قرار پائیں گے۔

مولانا آزاد کی ہدایات : آج سے کئی سال قبل مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانانِ ہند کو آگاہ فرمایا تھا کہ اپنے وطن عزیز ہندوستان میں انہیں کس طرز کی زندگی گذارنی چاہیئے۔ اور کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیئے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین مولانا آزاد کے خیالات اور ان کی ہدایات سے واقف ہو جائیں تاکہ وہ ان کی روشنی میں اپنی ملّی زندگی کو "زندہ و تابندہ" رکھ سکیں۔

آزاد بھون (انڈین کونسل فار کلچر ریلیشن) نئی دہلی کے کتب خانہ میں مولانا آزاد کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تقریروں اور تحریروں کا ایک ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس میں نیشنل تحریک کے نام سے ایک قلمی رسالہ بھی موجود ہے۔ اس رسالہ کے چند بصیرت افروز اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا آزاد۔ قومیت اور اسلام : کے زیر عنوان منافی اسلام اور غیر منافی اسلام قومیت کی تشریح کے بعد ترکی اور ایران کی قومیت کو ناقابلِ تقلید قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ترکی اور ایران میں قومیت اور وطنیت کے نام پر جو کچھ کیا گیا اس سے ہمیں متوحش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ان ممالک کی نظیر کو سامنے رکھ کر ان کی سو فیصدی تقلید ہرگز نہ کرنی چاہیئے میرا عقیدہ ہے کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال نے جو کچھ اصلاحات مذہب کو نظر انداز کر کے کیں وہ مذہبی اصلاح کے راستے سے بھی لائی جا سکتی تھیں مصطفےٰ کمال اپنی قوم کو جس منزل پر لانا چاہتا تھا اس منزل پر لانے کیلئے مغربی نظریہ قومیت کی تقلید کرنا ضروری نہ تھا"۔

یورپ میں وطن پرستی کے نام پر جو کچھ کیا گیا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وطن پرستی کے اس نظریئے کی بنا پر جو یورپ میں پایا جاتا ہے ان ممالک میں جو کچھ کیا گیا وہ ہمارے لئے کسی بھی طرح قابلِ تقلید نہیں۔ ہمارے لئے یہاں رہ کر ہندوستانیت اور

سلام دونوں رشتوں کو باقی رکھنا ہے اور یورپ کی قوموں کی طرح ہم ملک کے لئے اسلام کے سارے رشتہ کو جو ہم کو دنیا کے کروڑوں انسانوں سے وابستہ کرتا ہے - ہندوستانی قومیت کے لئے فنا نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت زمانے کی آب و ہوا اس قسم کی ہے کہ ہر پڑھے لکھے نوجوان کے دماغ میں قومیت کا یہی تصور آتا ہے - لیکن ہمیں ہر ہر منٹ اور ہر گھڑی اس کی تردید کرنی چاہیئے۔ اور مسلمانوں کے دماغ میں اس غلط نظریئے کو ہرگز جڑ نہ پکڑنے دینا چاہیئے۔"

<u>شریعت کے قوانین جامع اور مکمل ہیں</u>: آپ نے مسلمانوں کے امتیازی اوصاف اور خصائص کے متعلق مولانا آزاد کے خیالات پڑھ لئے۔ اب آپ مولانا کے خطبہ صدارت کے ان جملوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جو آج سے کئی سال قبل کلکتہ میدان میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ [illegible] کو مخاطب کر کے واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ شریعت اسلامیہ کے قوانین جامع اور مکمل ہیں ان میں اصلاح اور ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں البتہ دیگر مذاہب میں اسلام کی یہ خصوصیت موجود نہیں ہے۔ اس لئے ان میں تبدیلی ہو رہی ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں - جو لوگ رفتار زمانہ سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذاہب کی اصلاح و ترمیم کی طرف مائل ہیں - اصلاح کا یہ سلسلہ گزشتہ تین سو سال سے قائم ہے۔ عیسائیوں نے مذہب کی اصلاح کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ عیسوی مذہب کے احکام اقتضائے زمانہ و تغیر احوال کا ساتھ نہ دے سکے - یہی حال ہمارے ہندو بھائیوں کا ہے کہ وہ جب تک منو جی کے شاستر میں ترمیم و اصلاح نہ کریں وہ مقتضیات زمانہ سے مقابلے کے اہل نہیں ہو سکتے اور ان کو ہر قدم پر منو جی کے شاستر میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو مذہبی احکام میں کسی طرح کی ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی شریعت کے قوانین جامع اور مکمل ہیں۔ [illegible]

گنجائش ہے نہ اصلاح کی۔

مولانا آزاد نے مذہب اسلام میں ترمیم و تغیر کو ناممکن العمل قرار دینے کے بعد مسلمانان ہند کو جو اہم اور بنیادی مشورہ دیا ہے اس پر بھی نظر ڈال لیجئے فرماتے ہیں۔

دوسری قوموں کو اگر زندہ رہنے کیلئے چاہتے اپنے مذاہب میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی شریعت کو اور مضبوط پکڑیں اور قوانین اسلام کی شدت سے پیروی کریں۔ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود اگر ان کے اپنے مذہب سے گریدگی و ابتعاد کامل میں مضمر ہے لیکن مسلمان اپنے مذہب سے بُعد اختیار کر رہے ہیں اور جتنے ان کی ترقی بہبود و فلاح کی ضامن ہے اس سے روگردانی کر رہے ہیں۔"

آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانان ہند حضرت مولانا آزاد کی مذکورہ ہدایات کے مطابق اپنی شریعت مطہرہ کا دامن پکڑیں اور پیکر اخلاص و عمل بن کر ملک کے چپہ چپہ میں امن و سلامتی قائم کر کے اپنے وجود کو ملک کیلئے اور حکومت کیلئے مفید ثابت کریں ہم اگر مذہب اسلام کے اطاعت گزار اور وفا شعار بن کر سچے مسلمان بن جائیں تو جس قدر ہم اپنے لئے مفید ہوں گے اسی قدر حکومت کیلئے بھی۔ مولانا آزاد نے اسی دور میں جبکہ حکومت برطانیہ نے اپنی اس پالیسی کے اعلان کے باوجود کہ وہ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی۔ مداخلت کی تو حکومت کو متنبہ کیا کہ یہ یقیناً مداخلت فی الدین ہے۔

بلاشبہ مولانا آزاد علوم و معارف اسلامیہ کے ایک بحر بیکراں تھے لیل و نہار کا شاید ہی کوئی ساعت ان پر ایسی گذری ہو جس میں انہوں نے احکام شرعیہ کی حقیقت پر غور و فکر نہ کیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اسی خطبہ الجمعیۃ الفطر کے آخری حصہ میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

احکام شریعت پر کامل ۲۵ سال تک میں نے پیہم غور و خوض کیا اور ۲۵ سال کا عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس کی کوئی صبح اور کوئی شام اس فکر سے خالی گذری ہو اور میں نے

نتیجہ پہنچا ہوں کہ واضع شریعت کا یہی منشاء ہے کہ اس کے احکام ایک اجتماعی نظام کے تحت اجراء پائیں۔ حکومت ہند میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو جو خصوصی مقام حاصل تھا اور انہوں نے ملک کی سالہاسال تک جو رہنمائی فرمائی تھی اس سے ملک کا ہر ذی شعور شخص بخوبی واقف ہے۔ سیاست علوم وفنون بالخصوص علوم اسلامیہ میں حضرت مولانا آزاد کو جو تجربہ حاصل تھا اس کا اعتراف خود گاندھی جی اور پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے چوٹی کے لیڈروں نے بارہا کیا تھا نیز انہوں نے زندگی بھر مولانا آزاد کو اپنا مستشار سمجھا تھا اور ان کے عقائد اسلامی کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہمیں کامل توقع ہے کہ موجودہ حکومت ہند بھی جب کہ مولانا آزاد کی صد سالہ تقاریب کے انعقاد کے ذریعہ مولانا محترم کو خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔ مولانا آزاد کے اسلامی عقائد اور افکار ونظریات مذہبی کا ضرور احترام کرے گی اور اپنے اس تیقن پر ثابت قدم رہے گی جو اس نے مسلمانوں کو دیا ہے وہ اسلام کے احکامات وقوانین میں مداخلت نہ کرے گی۔

<u>فقہ اسلام کی تجدید مولانا آزاد کی نظر میں</u> : مولانا آزاد کی قلبی تمنا تھی کہ فقہاء علماء اور دانشوروں کی ایک ایسی مجلس کا انعقاد عمل میں آئے جو مسلمانان عالم کی اہم ترین مذہبی معاشرتی اور عصری ضرورتوں کو سامنے رکھکر فقہ اسلامیہ مدونہ کی اصلاح وتجدید کرے۔ چنانچہ مولانا آزاد نے قلعہ احمد نگر کی نظر بندی سے رہائی کے بعد ۴ رجولائی ۱۹۴۵ء کو شملہ سے ایک بیان جاری فرمایا تھا جو ہندوستان کے اخبارات ورسائل میں اصلاح وتجدید فقہ اسلامی کے مہم کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے اس بیان میں فقہاء وعلماء فلسطین کی اس مجلس کا خیر مقدم کیا تھا جس نے اسلامی قانون پر نظر ثانی کر کے اسکو اسلام کے بنیادی اصول کے مطابق از سر نو مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا لیکن افسوس یہ مجلس یہودیوں کے جنگی عزائم کا شکار ہو کر ختم ہو کر رہ گئی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم عائلی قوانین کے بارے میں مولانا آزاد جیسے روشن خیال اور حریت پسند علماء دین کے خیالات سامنے لائے جائیں اور اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ مسلم پرسنل لا کی حفاظت کا معاملہ ملت اسلامیہ کے اندر اتفاق واتحاد کا موضوع ہے اور یہ مسئلہ مسلمانوں کی ملی اور

دیلی زندگی کے حق میں موت حیات کے مسئلہ کا حکم رکھتا ہے اس ضرورت کو مولانا سید سلیمان ندوی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد منت اللہ رحمانی، مولانا قاری حافظ محمد طیب قاسمی (مرحوم) مولانا محمد عبدالکریم پاریکھ اور ان کے احباب بڑی خوبی سے پورا کررہے ہیں۔ ملت اسلامیہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مندرجہ بالا علماء حق کا بڑا احسان ہے امید ہیکہ ملت اسلامیہ کے حساس افراد شریعت محمدی کی عمل آوری اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے موجودہ رائض کی تکمیل میں اپنے خدمات پیش فرمائیں گے۔

مولانا آزاد نے رام گڑھ کانگریس کے سیشن ۱۹۴۰ء میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا
میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم۔ اسلام کی تاریخ۔ اسلام کے علوم و فنون اور اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہیکہ اس کی حفاظت کروں۔

"بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں اشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور ساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے میں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ں میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں"

مولانا آزاد نے قومی و ملی مسائل خاص فقہی مسائل سے متعلق بیانات میں جن امور پر روشنی لی ہے۔ وہ ایسے اجتہادی مسائل ہیں جس میں عصری ضرورتوں کے تحت ترمیم ممکن ہے لیکن اسلام کے وہ بنیادی احکام اور فرائض و حدود جو قرآن اور سنت کے نصوص ظاہرہ سے ثابت اور آفتاب عالم تاب کی طرح واضح اور روشن ہے ان کو وہ عصری ضرورتوں سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے تحریف و تحریف کا دروازہ کھولنے کے ہرگز قائل نہ تھے چونکہ یہ مسائل ایک مستقل مقالہ کے طالب ہیں

پروفیسر سید نورالحسن

مولانا آزاد
ایک صد سالہ خراجِ تحسین

جب ۱۹۰۵ء میں برطانوی سامراج کے ہاتھوں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو اس کے خلاف ایک زبردست تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسے بنگال کے ہندوؤں کے خلاف برطانوی سامراج کی سازش کا ایک حصہ قرار دیا گیا جو جدوجہد آزادی کے محاذ پر سب سے آگے تھے۔

برطانوی سامراج کو امید تھی کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل طور پر ایک دراڑ پیدا ہو جائے گی۔ ایسی صورت حال ہر جگہ غالب تھی جب ایک محی الدین احمد نام کا نوجوان جو بعد میں اپنے قلمی نام ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ اس وقت کے سیاسی منظر عام پر ابھرا۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوا اور وہ کلکتہ آیا جب اس کے والد بزرگوار ۱۸۹۰ء میں یہاں آ کر بس گئے۔ اس نے فارسی و عربی زبانوں میں اسلامی تعلیم حاصل کی اور نوجوانی کی عمر میں ہی ایک عظیم عالم بن گیا۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کے دور کے مذہب کی منطق و تفریق کے قائل؟ اٹھارہویں صدی کی عقلیت پسندی اور جدید نظریہ حیات کا مجموعہ تھے۔

ابتدائی زمانہ: آزاد نے بہت سے مسلمانوں کے برطانوی سامراج نواز خیالات اور کل ہند مسلم لیگ کے نظریات کو رد کر دیا تھا۔ ان کی ملاقات شری اروبندو اور شیام سندر چکرورتی جیسے انقلابیوں سے ہوئی اور ان کے واسطے سے دیگر انقلابیوں سے تعارف ہوا۔ شروع شروع میں یہ انقلابی مولانا آزاد پر مکمل اعتماد نہیں کرتے تھے لیکن بعد ازاں انہوں نے ان لوگوں کا دل جیت لیا۔ ان کی صلاح سے ۱۹۰۳ء میں شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں بالخصوص میں خفیہ انقلابی مراکز قائم کئے گئے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد نے عراق، مصر، شام اور ترکی کا غیر ملکی دورہ کیا۔ انہوں نے انقلابیوں اور قوم پرستوں کی تحریک اور مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروکاروں سے رابطہ قائم کیا

انہوں نے کہا تھا کہ ان عرب اور ترک انقلابیوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے سے ان کے سیاسی عقائد میں پختگی پیدا ہوئی ہے ۔ انہوں نے اس امر پر بھی حیرانی ظاہر کی کہ ہندوستانی مسلمان قوم پرستوں کے مطالبوں سے بے رخی و بے اعتنائی برتتے ہیں یا ان کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو قومی جدوجہد آزادی کی قیادت کرنا چاہیئے اور وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ برطانوی لوگوں کی حمایت کیوں کرتے ہیں۔ میرا یہ یقین پہلے سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کی سیاسی آزادی کے کام میں تعاون کرنا چاہیئے ۔

غیر مسلم بھائیوں کے دوش بدوش مسلمانوں کو بھی سامراجیوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شامل کرنے کے لئے مولانا آزاد نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار الہلال شائع کرنا شروع کیا یہ جون ۱۹۱۲ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ الہلال کی اشاعت اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی اور تھوڑے عرصے میں ہی الہلال نے غیر متوقع مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی ۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی ۔ الہلال پریس کو ۱۹۱۵ء میں ضبط کر لیا گیا ۔ پانچ ماہ بعد انہوں نے البلاغ کے نام سے ایک نیا اخبار شروع کیا ۔ یہ بھی اپریل ۱۹۱۶ء میں بند ہو گیا ۔ اس وقت مولانا رانچی میں نظر بند تھے اور دسمبر ۱۹۱۹ تک نظر بند رہے ۔

گاندھی جی سے ملاقات : جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد پہلی مرتبہ گاندھی جی سے ملے ۔ خلافت اور ترکی کے مستقبل کے سلسلے میں مسلمانوں کے تاثرات سے وائسرائے کو آگاہ کرنے کے لئے ان کے پاس ایک وفد بھیجنے کی تجویز تھی ۔ گاندھی جی لوک مانیہ تلک اور دیگر کانگریسی رہنماؤں نے خلافت کے سوال پر بھارتی مسلمانوں کے موقف کی حمایت کی ۔ میرٹھ میں خلافت پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ عوامی پلیٹ فارم سے عدم تعاون پروگرام کا پرچار کیا ۔ مولانا آزاد نے ان کی پیروی کی اور ان کی مکمل حمایت کی ۔

گاندھی جی کے تیار کئے گئے پروگرام کے عمل درآمد پر غور کرنے کے لئے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا ۔ اس کے بعد ہی سی آر داس کے ساتھ مولانا آزاد گرفتار کر لئے گئے ۔ بعد میں ان کے ساتھی چند برس بھی علی پور سنٹرل جیل میں ان کے ساتھ پہنچ گئے ۔ مولانا آزاد نے تبدیلی سے

حامی اور مخالف کانگریسی رہنماؤں میں سخت اختلافات رکھے۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا اور گاندھی جی کے کہنے پر مولانا آزاد نے اسکی صدارت کی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو لوگ کونسلوں میں شامل ہونے کو تیار ہیں وہ شمولیت اختیار کر سکتے ہیں اور جو لوگ باہر رہنا چاہیں وہ کونسلوں سے باہر رہ سکتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے نمک ستیہ گرہ پروگرام کے وہ خاص حامیان میں سے ایک تھے۔ وہ گرفتار ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ برس تک جیل میں رہے۔ اس وقت تک مولانا ہندوستان کی قومی تحریک کے اہم رہنما بن چکے تھے۔ جب کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں وزارتیں قائم کیں تو مولانا آزاد کو پارلیمانی بورڈ کا ممبر بنایا گیا۔

اس عرصہ میں سچے قوم پرست انگریزوں نے مختلف طریقوں سے مسلم لیگ کی مکمل حمایت کی کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا اصل پروپیگنڈہ یہ تھا کہ یہ صرف برائے نام نیشنلسٹ ہے۔ لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں سے امتیاز برتنے سے متعلق بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے۔ مولانا آزاد نے ان الزامات کا جائزہ لیا اور کہا میں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ الزامات قطعی بے بنیاد ہیں۔ وائسرائے اور مختلف ریاستوں کے گورنروں کا بھی یہی خیال تھا۔

۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد دوسری مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کی صدارت کی۔ مولانا آزاد نے کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کے الزامات کا سختی سے جواب دیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ آقلیت ہونے کا احساس ذہن سے نکال دیں اور تحریک آزادی کے دھارے میں شامل ہوں۔ اپنے صدارتی خطبہ میں انہوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "کیا ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آزادی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا ہمت اور اعتماد سے؟ اگر ہم اسے خوف اور شک کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں مختلف راستہ اپنانا پڑے گا۔

ہمیں تب ایک تیسرے راستے کے وجود کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ ہمارے دل میں ڈر اور خوف کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ کہ ہمیں اپنے مستقبل کا جائزہ ہمت اور اعتماد کے ساتھ لینا چاہئے اور تب ہمارا لائحہ عمل قطعی اور بہ صاف ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے

ہم اپنے اندر ایک ایسی نئی دنیا محسوس کرتے ہیں جو کہ شک وشبہات کے سیاہ سایوں سے پاک صاف ہے اور جس میں اعتماد، عزم اور عمل کی روشنی کبھی ختم نہیں ہوتی ۔

ایک قابل فخر مسلمان : مولانا آزاد کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ اسلام کی ۱۳۰۰ برس کی روایات انہیں ورثے میں ملی تھیں اور وہ اپنے اس ورثے کا رائی برابر حصہ بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان احساسات کے ساتھ ساتھ دیگر بھی حقیقتیں اور حالات بھی تھے جو ان کی زندگی پر بہت اثر انداز ہوئے۔ ان احساسات کے راستے میں اسلام کبھی رکاوٹ نہیں بنا بلکہ اسلام نے انکی رہنمائی کی اور انہیں آگے بڑھنے میں مدد کی ۔ مولانا آزاد نے کہا کہ انہیں اپنے بھارتی ہونے پر فخر ہے اور وہ غیر منقسم بھارتی قومیت کا ایک حصہ ہیں ۔ تقسیم ملک سے مولانا آزاد کا دل ٹوٹ گیا تھا ۔ مولانا نے اپنے ان قریبی ساتھیوں سے بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جنھیں وہ بہت چاہتے تھے لیکن بھارت کو حصول آزادی کے لئے اسکی قیمت ملک کی تقسیم کی شکل میں ادا کرنی پڑی ۔ مولانا آزاد ملک کے پہلے وزیر تعلیم بنے اور ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء یعنی اپنی وفات تک اس عہدے پر فائز رہے ۔

مولانا کو جس چیز نے زندہ رکھا وہ ان کا بھارت اور مہاتما گاندھی کی تعلیمات میں اعتماد تھا مولانا آزاد نے (اپنی کتاب میں) لکھا ہے کہ ہم نے بھارت کو اپنی دولت دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے ۔ ہم نے ملک کو اسلام کے جمہوریت اور انسانیت کے پیغام کا بیش قیمت تحفہ دیا جسکی ملک کو سخت ضرورت تھی ۔ کثرت میں وحدت کو تسلیم کرنا صدیوں سے بھارت کا رویہ رہا ہے ۔ مولانا آزاد نے کہا کہ گاندھی جی نے ہمیں اس جدید زمانے میں رواداری، خیر سگالی اور سب سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ مولانا آزاد کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے سال میں ہم جدید بھارت کے اس عظیم معمار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جسکی خدمات کو ملک ہمیشہ یاد رکھیگا ۔

ڈاکٹر سلیم کے بھاکت مرتقسیل راؤ

2-2-1144/1/8

پوسٹ آفس لین، نیو نلّا کنٹہ، حیدرآباد۔ 44

یادِ آزاد

ھندوستان بھر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا جشنِ صد سالہ ولادت منایا جا رہا ہے۔ مجاہدِ آزادی، مفکر، عالم، مدبر، سیاست داں کی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں مولانا آزاد کے زرین کارنامے ہمیشہ روشن رہیں گے۔ نامور ادیب، رہنما، طاقتور قلم کار، محبِ وطن، مولانا ابوالکلام آزاد ۷ اگست ۱۸۸۸ء کے دن مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خیر الدین ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے مدینہ کے عالم شیخ محمد طاہر وتری کی بیٹی سے شادی خیر الدین نے کی۔ ایک دن وہ مکہ میں گر پڑے ان کی بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ علاج نہ ہو سکا۔ اہل و عیال کلکتہ آ گئے۔ لنگ باقی رہا۔ لکڑی کے سہارے چلتے تھے۔ وہ پیر تھے۔ ان کے بیشمار مرید ہندوستان کے باہر تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء کو مانک تلہ کے قبرستان میں خیر الدین آباد ہو گئے۔

چار سال کی عمر ہی میں مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ آ گئے تھے۔ بچپن میں ان کے چلنے، ملنے پھرنے، بات کرنے پر کڑی نگرانی تھی۔ دس سال کی عمر میں، اردو، عربی، فارسی میں مہارت حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی "لسان الصدق" کی ادارت سنبھالی۔ "نیرنگ خیال" میں ان کے اشعار شائع ہوئے۔ تخلص آزاد تھا۔ مولانا کئی نام سے پکارے گئے۔ مثلاً غلام محی الدین آزاد۔ ابوالکلام محی الدین آزاد، ابوالکلام آزاد دہلوی، ابوالکلام احمد، احمد المسکنی با لی الکلام آزاد الدہلوی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا سرو قد دوہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ، سفید چھوٹی داڑھی، آواز سریلی و بلند، مزاج میں تمکنت وقار، طبیعت میں شوخی اور

ظرافت، چہرہ میں ذہانت تھی۔

مغربی طرز تعلیم کے شیدا سر سید احمد خاں سے مولانا آزاد کی دوستی رہی۔ حالی و شبلی سے بھی ملاقات رہی۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں شرکت کی۔ مذہب، ادب، سیاست میں توازن قائم رکھا مولانا آزاد نے۔ انہوں نے ترکی، عراق، مصر کا دورہ کیا، جمال الدین افغانی اور دیگر انقلابیوں سے ملے۔ الازہر جامعہ میں عالموں سے ملاقات انکی ہوئی اور وہاں ان کا مطالعہ رہا۔ اتا ترک کی مہم سے روشناس تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا آزاد وطن لوٹ آئے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کی داغ بیل ڈالی۔ ۲۶ فروری سنہ ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں مسلمانوں کو اپنے حالات کا مطالعہ کرنے و ملک کے مسائل سے وابستہ ہونے کیلئے للکارا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں روحانی تجزیہ پر مضمون شائع کیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے حکومت نے انہیں شہر بدر کردیا۔ قید کردیئے گئے۔ بعد میں سنہ ۱۹۲۰ء میں رانچی قید خانہ سے رہا کردیئے گئے۔ گو انکی شادی بارہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن ان کی بیوی "زلیخا" اپنے آپ ان کی خدمت کرنے میں ہی وقف ہوگئیں۔ کئی مصیبتیں خوشی سے جھیلتی رہیں اور سنہ ۱۹۴۵ء میں چل بسیں۔

مولانا آزاد کی لائبریری میں مختلف مصنفین کی کتابیں تھیں مثلاً گوئٹے، سپینوزا، مارکس ہومکلیس وغیرہ۔ اُپنشد، وید کی کتابوں سے انکی لائبریری مالامال تھی۔ قرآن شریف کا تفصیلی مطالعہ کیا اور "ترجمان القرآن" کے مصنف رہے۔ مذہب پر کافی حاوی تھے اور عالمانہ تقریر کرتے تھے۔ اٹھائیس سے زیادہ کتابیں انہوں نے لکھیں۔ نامور تصانیف میں تذکرہ، آزاد کی کہانی، تحریک آزادی، غبار خاطر، کاروان خیال، نقش آزاد، تبرکات آزاد، ملفوظات آزاد، مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات، نگارشات آزاد، فلسفہ، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب الیرینی اور جغرافیہ عالم، خطبات آزاد شامل ہیں۔ الہلال نے عوام کو ایک نئی راہ، نیا راستہ دیا۔ ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ اس میں نثر بارعب اور پرجلال تھی۔ مولانا آزاد مفسر القرآن تھے۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد حکومت ہند کے وزیر تعلیم رہے۔ عمدہ ترین خدمات انجام

...یا [illegible] لائبریریاں میں وسعت پیدا کی۔ قومی سطح پر تحقیقاتی ادارے انکی سرکردگی میں قائم کئے ... جوشیلے انداز میں، مدبرانہ پیرایہ پر، سامعین پر اثر انداز ہوجاتے تھے۔ ایک جگہ ڈاکٹر ... مکرنے کہا تھا "مجھے کئی بار ان کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں نے ہر بار یہی محسوس کیا [illegible] ان کی تابع ہوتی ہے"

[illegible] نے مولانا آزاد کو اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

پنڈت نہرو سے مولانا آزاد کی اچھی دوستی تھی "غبار خاطر" میں ایک جگہ انہوں نے نہرو پر ... ھا تھا "نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً ان طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جو ... میں دماغ سے زیادہ جذبات سے کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت میں سر تا سر جذباتی ... واقع ہوئی ہے۔ اس لئے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے ہیں"

مولانا آزاد پر ۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کے دن فالج کا حملہ ہوا۔ تاب نہ لاسکے۔ بے ہوش ہو گئے۔ ایک مرتبہ ہوش آیا تو پنڈت نہرو کو پہچانے اور فرمایا۔

"مجھے پنجرہ میں کیوں بند رکھا ہے بس اللہ پر چھوڑ دیجئے۔"

ایسی روشن ترین شمع ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء صبح دو بجکر دس منٹ کو گل ہوگئی۔ ۳ بجے مولانا احمد سعید نے نماز جنازہ پڑھائی اور دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں جامع مسجد و لال قلعہ کے درمیان دفن کردیا گیا۔ مولانا آزاد امام الہند تھے۔ کوہ علم و فضل تھے۔ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار تھے۔ مذہب اسلام کے پابند تھے اور ماہر تھے۔ تشریح نگار تھے۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ تقریر میں ان کا ثانی نہ تھا۔ اسلوب تحریر ان کا منفرد تھا۔ صلاحیت، معاملہ فہمی، دوراندیشی، ذہانت، قابلیت کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے۔

"الہلال" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لئے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے"۔

تحریک حق و صداقت میں مولانا آزاد نے فرمایا۔

"اے لوگو کہ ایمان اور اسلام کے مدعی ہو۔ صرف دعویٰ کافی نہیں۔ اگر زندگی چاہیئے تو اسلام میں پورے پورے آجاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔ وہ انسانی ہدایت اور فلاح و عروج کا ایک بالکل کھلا دشمن ہے"

حب الوطنی کا عکس آزاد کی تصنیف میں ملاحظہ ہو۔

" میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جسکے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اسکی بناوٹ کا ایک ناگزیر حامل ہوں۔ میں اپنے اس دعویٰ سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

اقلیتوں اور خصوصاً اسلام کے ساتھ گہرا تعلق کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا۔

" گیارہ صدیاں گذر چکی ہیں اور ہندوستان کی سرزمین سے بھی اسلام اسی طرح وابستہ ہے جسطرح کہ ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے"۔

"اتحاد" کی برقراری اٹکل پر مولانا آزاد نے کبھی نہیں چھوڑا۔ مصمم ارادہ ان کا ہمیشہ یکجہتی رہا۔ ایک جگہ انہوں نے "الہلال" میں فرمایا۔

" آج اگر ایک فرشتہ آسمانوں کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر اعلان کرے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤنگا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

ابوالکلام ایک آزاد مصنف تھے۔ بے خوف و خطر انہوں نے "آزادی کی کہانی میں" چند صفحات کچھ مدت کیلئے محفوظ رکھنے کے لئے لکھدیا تھا۔ اسی بنا پر نیشنل لائبریری میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ گذشتہ سال کے اگست کے مہینہ میں ہی عوام کے سامنے ان صفحات کو پیش کیا گیا۔

باقی ص

ڈاکٹر فیروز احمد
ریڈر شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد

مطالعہ ہفتہ وار پیغام اور مولانا آزاد!

"الہلال" کے اجراء سے قبل اگرچہ مولانا آزاد صحافت کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے مگر اُس زمانے میں ان کا مزاج وہ نہیں تھا جو الہلال یا البلاغ اور اس کے بعد پیغام اور الجامعہ سے وابستگی کے دوران رہا۔ الہلال کے بعد مولانا آزاد کے سیاسی اور مذہبی افکار و نظریات میں استحکام اور ٹھہراؤ کی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت ان کے ابتدائی دور صحافت میں یکسر مفقود ہے اس زمانے میں وہ شعر و سخن سے دل بہلاتے ہیں یا پھر علمی و تحقیقی ذوق کا سامان ڈھونڈتے ہیں اسے بہ الفاظ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی صحافتی زندگی اور الہلال کے بعد کی صحافتی زندگی اور عملی سرگرمیوں کے مابین ایک بڑا فرق ہے۔ یہ بنیادی طور پر اس نقطۂ نظر کا فرق ہے جسے اختیار کرکے مولانا آزاد اس راہ پر چل پڑے جو کانٹوں سے بھری تھی، مگر اس راہ کے وہ تنہا مسافر نہیں تھے، وہ اس قافلہ کے سالار بھی نہیں تھے جو صحافت کی راہ سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے لیکن اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صحافت ان کے نزدیک ایک مقدس ذریعہ ابلاغ تھا اور اس کے توسط سے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول ان کا مطمع نظر تھا۔ اس مطمع نظر کو بروئے کار لانے میں مولانا آزاد نے جو ذہنی اور فکری ریاضت کی ہے اور اسے دوسروں کا بھی نقطۂ نظر بنانے میں جو مثالی کردار ادا کیا ہے اس کی بیشمار مثالیں پیغام کے اجراء سے قبل کے مضامین، تقاریر اور خطبات میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقۂ کار مختلف ہو سکتا ہے اور انہیں ایک سے زیادہ خانوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے، مگر مطالعہ کی ہر نہج پر اس امر کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے ذریعے اُس قومی اور ملّی شعور کو عام کیا جائے جو وقت اور زمانے کا اقتضا تھا۔

یہ کام ابتداً الہلال اور البلاغ نے کیا اور اسے زیادہ بڑے پیمانے پر انجام دینے کی ضرورت کا احساس تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے زمانے میں پیدا ہوا سلہ۔ یہاں اس بات کو اگر کسی کلیہ کا درجہ نہ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کی بیشتر اردو صحافت کسی مثبت اور تعمیری نظریے سے یکسر مبرّا تھی، یہ سچ ہے کہ مدینہ، زمیندار، ہمدرد اور کامریڈ کی شکل میں ایسے اخبارات و رسائل موجود تھے جو سیاسی نشیب و فراز سے باخبری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، ان کے ذریعے بلاشبہ عصری مسائل کی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا، مگر تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام و خواص کے نقطۂ نظر کو بدلا جائے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس راہ پر گامزن کیا جائے جو انہیں آزادی کی منزل سے قریب تر کر دے۔

یہ کام دشوار تر تھا اور اس کے لئے کسی ایسے شخص یا تنظیم کی ضرورت تھی جو مسئلہ خلافت اور ترکِ موالات کیلئے شرعی احکامات سے استنباط نتائج کر سکے۔ بدقسمتی سے علماء کا ایک طبقہ تحریکِ خلافت کا ہی منکر تھا اور اسی لئے اس کے نزدیک ترکِ موالات کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی سلہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گروہ آزادی و حریت کے اس انقلاب کا شعور نہیں رکھتا تھا جو قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے اس بے مثال دور میں نظر آتا ہے۔ مگر یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تحریکِ خلافت بھی حصولِ آزادی کے اس سفر میں صرف ایک مقام ہے، منزل نہیں، ایک ایسا مقام جہاں سے منزل کا نشان ملتا ہے اور اسی مقام یا موڑ پر ایک عظیم قائد کی فکر و نظر اور اس کی عملی صلاحیتوں کی شناخت ہوتی ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے آغاز میں ایک بار لکھا تھا

"..... اگر خدا مجھ میں سچائی اور خلوص کی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملّتِ مرحوم اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی کوئی تپش میرے دل میں موجود ہے۔

اگر طاقتی اس کی راہ میں خدمت اور خود فراموشی کی ایک آگ ہے جس میں برسوں سے

سلہ۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ "فی الحقیقت الہلال اور البلاغ کی ضرورت جس قدر اس وقت تھی جبکہ تخم ریزی کا موسم تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اب ہے جبکہ آبیاری و نگہبانی کا وقت آگیا ہے۔" پیغام ص ۲ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء

سلہ اگرچہ بعد ازاں یہ صورت حال بدل گئی تھی۔ راقم

بغیر دھوئیں کے جل رہا ہوں تو اپنے فضل و لطف سے مجھے اتنی مہلت فرمائیے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں، لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور دوکاندارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ سنبھل سکوں، وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحے کے لئے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے"

ہفتہ وار پیغام کے اجراء میں یہی جذبہ کار فرما تھا۔ یہاں ایک غلط فہمی بلکہ غلط بیانی کا ازالہ ضروری ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک جگہ "ذکر آزاد" میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ پیغام کی اشاعت ان کے اصرار پر عمل میں آئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"...... مدرسہ[1] کامیابی سے چل رہا تھا مگر خلافت اور سوراج کی تحریک کا زور بہت

---

[1] مدرسہ عالیہ کلکتہ جس کے مہتمم مولانا عبدالرزاق اور صدر مدرس مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ اس مدرسے کے تعلیمی نصاب میں تبدیلی کی گئی تھی اور نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے 'مکتب' کے بجائے 'اعلیٰ تعلیم گاہ' کا روپ دے دیا گیا تھا، اس نئی شکل میں مدرسہ کا افتتاح ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آپ جس مدرسہ میں اس وقت موجود ہیں اس کی تاسیس بالفعل ترک موالات کے سلسلے میں ہوئی ہے" (ذکر آزاد ص ۔ ۵۸)۔ گاندھی جی نے اپنی جوابی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اسکے یہ جملے قابل لحاظ ہیں۔ "آپ نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے، آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیئے۔ جو پاؤں آگے اٹھ چکا ہے، اسے پیچھے نہ ہٹائیے، اسوقت اسلام خطرے میں ہے۔ خلافت تباہ کر دی گئی، مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا گیا ہے اور ہندوستان کی قومی خودداری کو پنجاب میں شکست کر دیا گیا ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپکے ذمے اسلام اور ہندوستان کے ہیں، انہیں ادا کریں"۔ (ذکر آزاد ص ۶۱) اس موقع پر اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے یہ بھی کہا تھا کہ "طلباء کے بجائے میں اساتذہ سے عرض کرتا ہوں کہ اپنے شاگردوں کو ایسی تعلیم دیں جو انہیں سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنا دے، قومی مدرسے کے جاری کرنے سے صرف یہی مقصد ہے کہ ان میں ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو غلامی سے گریز کریں

بڑھ چکا تھا اور مدرسے جیسے ٹھنڈے کام کو میں اپنے مزاج کے مطابق نہیں پاتا تھا۔ آخر مولانا نے زور دینا شروع کیا کہ وقت کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ کلکتہ سے فوراً ایک اخبار جاری کیا جائے، روزانہ نہ سہی، ہفتہ وار سہی۔ مولانا کے ذہن میں اخبار کا تصور الہلال کا جیسا تھا لیکن میں اس تصور کی مخالفت کرتا رہا، آخر مولانا مان گئے کہ ہفتہ وار سستا اخبار نکالا جائے، جو عوام کو سادہ بول چال میں مخاطب کرے، اخبار کا نام "پیغام" تجویز ہوا اور میں اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ میری رائے تھی کہ اخبار کا نام "پیغام" نہیں جو ثقیل ہے، پیام رکھا جائے مگر مولانا اس وقت تک بھاری بھرکم الفاظ پسند کرتے تھے ؎

یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ رانچی کی نظر بندی سے رہائی (سنہ ۱۹۲۰ء) کے بعد جب ایک بار پھر مولانا آزاد سرگرم عمل ہوئے تو تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی فضاء کے پیش نظر انہیں کسی ایسے اخبار کی ضرورت کا بار بار احساس ہوا جو تحریک خلافت اور ترک تعاون کے متعلق بعض حلقوں میں پھیلائی جاری غلط فہمیوں کو دور کرتے میں معاون ہوسکے وہ لکھتے ہیں ـــ

"بحالت موجودہ یہ بات میری طاقت سے باہر ہے کہ الہلال و البلاغ کے درجہ کا کوئی رسالہ جاری کردوں، کیونکہ جب تک تحریک کی مشغولیت سے مہلت نہ ملے، اسکے لئے وقت نہیں نکال سکتا اور نہ اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ کسی پرچہ اور اخبار کو خود براہ راست مرتب کرسکوں گا .... پس اگر بحالت موجودہ اس ضرورت کا کوئی علاج میرے اختیار

اور آزادی پر جان دیں، میں جانتا ہوں کہ اسلام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے پس مدرسے کے اساتذہ طلباء میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں جس پر خلافت اور سوراج کا دارومدار ہے اور میں ایک چست ہندو ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اسلام کی سلامتی بھی میرے پیش نظر اتنی ہی ہے جتنی ہندو دھرم کی ہے" (ذکر آزاد ص ۶۲ - ۶۱)

۱ؔ۔ ذکر آزاد ص ۶۷، اجالا پریس، نمبر ۱۶ ایڈن ہسپتال روڈ کلکتہ ۱۲ سنہ ۱۹۶۰ء

یا تقاضا تھی یہی تھا کہ دیگر اہل قلم کے زیر اہتمام ایک رسالہ جاری ہو جاتا ، مسلک و مشرب کی نگرانی میرے ذمہ رہتی اور جس قدر بھی فرصت ہاتھ آتی ، وقت کے ضروری مسائل و معاملات پر میری تحریرات وقتاً فوقتاً اس میں شائع ہوتی رہتیں ۔

چنانچہ اسی غرض سے پیغام جاری کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ جن احباب نے اس کی ترتیب و اہتمام کا بار اٹھایا ہے ، ان کا مستعدی وقت کی ایک سب سے بڑی ضرورت کے لئے مقبول و مشکور ہوگی "۔ [1]

اس اقتباس کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پیغام کے محرک اوّل مولانا آزاد تھے نہ کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ، اگرچہ یہ سچ ہے کہ اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا عبدالرزاق سپرد تھی اور انہیں کی نگرانی میں یہ رسالہ آخر تک شائع ہوتا رہا ، مگر جیسا کہ مولانا آزاد نے خود لکھا ہے ، اس کے مسلک و مشرب " یعنی پالیسی کے وہی ذمہ دار اور نگراں تھے ، اس اعتبار سے پیغام کے ساتھ مولانا کی دلچسپی اور وابستگی الہلال اور البلاغ سے کسی طرح کم نہ تھی ، یہ امر بھی ہے کہ اپنی عدیم الفرصتی کے سبب وہ مستقلاً اس رسالے میں نہیں لکھ سکے ۔ تاہم پیغام کے مدیران کے ہم خیال اور ہم مشرب تھے ، اسی لئے ان کی ذات میں مولانا آزاد کو اپنے ارادے کی تکمیل نظر آئی اور وہ اس رسالے کی ترتیب و اشاعت کا سارا بار مولانا عبدالرزاق کے شانوں پر ڈال کر عصری مسائل کی وضاحت و صراحت میں مشغول ہو گئے ۔

تحریک آزادی کے دوران شائع ہونے والے جن اخبارات اور رسائل کی مکمل فائلیں تو کجا چند شمارے بھی اب بڑے بڑے کتب خانوں میں دستیاب نہیں ہوتے ، پیغام ان میں سے ایک ہے [2] ۔ یہ رسالہ تحریک خلافت کے عالم شباب میں نکلا اور اس کے بیشتر مندرجات اور مباحث اسی تحریک سے متعلق ہیں ، اور چونکہ اسے کامیاب بنانے کے لئے گاندھی جی کے

---

[1] پیغام ص ۳ - ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء

[2] اس کے چند شمارے راجستھان یونیورسٹی جے پور میں اور مکمل فائل حیدرآباد کے اردو ریسرچ سنٹر میں موجود ہے ۔ میں اردو ریسرچ سنٹر کے مالک جناب عبدالصمد خاں کا شکر گزار ہوں کہ ان کی وساطت سے پیغام کے شماروں کو دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ۔ راقم

شور سے ترک موالات کی تجویز بھی بعد ازاں تک میں شامل کرلی گئی تھی، اس لئے یہ رسالہ تحریک
یہ سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ایک قیمتی دستاویز ہے، لیکن ایسا نہیں کہ اس کا دائرہ محض
ںیں مباحث تک محدود ہو، اس کے صفحات ایسی اطلاعات کیلئے بھی وقف تھے جن سے قومی تحریک
زادی کے اس دور میں عوام کے جذبۂ حب الوطنی بڑھے اور وہ نئے عزم و حوصلے کے ساتھ سرگرم عمل
اں تاکہ "منزل مقصود" قریب تر ہو سکے، اس مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان تمام خبروں اور
اقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے، تاہم اس جانب اشارہ ضروری ہیکہ اس کے "مسلک و مشرب"
نگران مولانا آزاد نے پیغام کو لسان العصر بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا چونکہ اسکے شمارے
یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اس لئے یہاں اس کے مختلف شماروں کے اہم مضامین اور مندرجات کا مطالعہ
لچسپی کا باعث ہوگا، لیکن اس سے قبل جملہ معترضہ کے طور پر ہی سہی، چند باتیں پیغام کے ابتدائی
مارے کے متعلق ضروری ہیں۔

پیغام ایک ہفتہ وار رسالہ تھا، اس کا پہلا شمارہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء م ۲۱ر محرم ۱۳۴۰ھ کو
ر آخری شمارہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء م ۱۵ر ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ بروز جمعہ ۲۵ رپن لین، کلکتہ
سے شائع ہوا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں تحریک آزادی کے دوران مولانا آزاد نے اپنا عمر کا معتدبہ حصہ
بسر کیا تھا۔ اس کا سائز ۹×۱۲ انچ ہے اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۶ ہے، قیمت دو آنہ فی پرچہ
درج ہے۔ سرورق کے بالائی حصہ پر ایڈیٹر کا نام، مقام اشاعت، قیمت کی تفصیلات کے علاوہ
یہ بھی تحریر ہیکہ "جملہ مضامین ایڈیٹر کے نام اور عام خط و کتابت اور ارسال زر مینیجر کے نام
کی جائے، البتہ ٹائیٹل کے نیچے نسبتاً جلی حروف میں "زیر نگرانی ابوالکلام" لکھا ہے، یہ عبارت
دوسرے شمارے میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ یوں درج ہے۔

"اس میں مولانا ابوالکلام کی تحریرات بالالتزام شائع ہوتی رہیں گی" شمارہ نمبر ۱۰ تک یہی صورت
ہے لیکن شمارہ نمبر ۔ سے آخری شمارے تک اس عبارت میں مزید ترمیم کی گئی ہے اور یہ لکھا گیا ہیکہ
"جس میں بالالتزام حضرت مولانا ابوالکلام کی تحریرات شائع ہوتی ہیں" پرنٹ لائن کے نیچے جو
عبارت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغام کے پرنٹر، پبلشر اور مہتمم فضل الدین احمد مرزا
تھے، (یہ وہی مرزا فضل الدین احمد ہیں جن کی سرکردگی میں مولانا آزاد کی معرکۃ الآرا تصنیف "تذکرہ"

شائع ہوئی تھی)

پیغام کے اس شمارے کے سرورق پر مولانا آزاد کا پہلا مضمون "باب فتح و مقصود کا افتتاح" کے عنوان سے درج ہے' اس کا ضمنی عنوان "محمد علی شوکت علی کے سفر حق کا اختتام اور گرفتاریوں کی ابتداء" ہے، مضمون کا آغاز قرآن کریم کی اس چھوٹی سی آیت سے کیا گیا ہے' قفا نبک من ذکری حبیب و منزل' اس کے بعد فارسی کے یہ دو اشعار ہیں۔

باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد می دہد | ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد می دہد
جلوۂ کاروان انیست بہ ناقۂ جرس | عشق تو راہ می برد شوق تو زاد می دہد

اب اس مختصر مضمون کے بعض حصے ملاحظہ کیجئے۔

" اٹھارہ مہینے ہوئے جب محمد علی شوکت علی نے نظر بندی کا سے رہا ہونے کے بعد راہ حق و حریت میں ایک دوسرا سفر شروع کیا تھا۔ آج اعلان کیا گیا ہے کہ یہ سفر ختم ہو گیا اور مسافر منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ - یہ ان کا فرض تھا' جو انہوں نے پورا کر دیا ، لیکن ملک بھی اپنا فرض پورا کرنے کیلئے تیار ہے؟ ملک کا فرض نہ تو دلوں کے اضطراب میں ہے' نہ صداؤں کے غلغلے میں' نہ شورش و بدامنی میں' نہ جلسوں کی تجویزوں اور جوش کے اظہارات میں' نہ اسٹرائیک' نہ ہڑتال' نہ محض زبان' نہ محض قلم بلکہ ہر اُس وجود کیلئے جو ان دونوں جاں نثاروں کی عزت و محبت کا مدعی ہو' عزم کی دعوت ہے' ہمت کی پکار ہے' عمل اور قربانی کے آخری فیصلے کی طلب ہے اور صرف اسی مقصد کے عشق کی منزل ہے' جس نے انہیں پانچ سال کی نظر بندی کے بعد پھر جیل خانے کی چار دیواری میں پہنچا دیا ہے - وہ جنہوں نے ملک کی آزادی کی راہ میں اپنی آزادی قربان کر دی ہے' تم سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تھوڑا سامان' تھوڑی سی جسمانی راحت' تھوڑی سی وہمی اور خیالی آرائش' لیکن تمام تر غفلت و نفس پرستی اسی مقصد کی راہ میں قربان کر دو' سودیسی کا عہد' بائیکاٹ کی تکمیل' ترک موالات کی سچی تعمیل' مجاہدین انگورہ کی مالی اعانت' گناہ و معصیت سے دل کی پاکی اور خدا اور شریعت سے کامل اطاعت کا رشتہ یہی ان گرفتاران حق کی اصل قیمت ہے' جو ملک کو ادا کرنی ہے۔ افسوس اور ماتم اس بدقسمت کا محروم النصیبی پر جو اتنی قیمت بھی نہ دے سکے۔[1] [1 پیغام ص ۲-۱' ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء]

سودیشی کا عہد، بائیکاٹ کی تکمیل، ترک موالات کی سچی تعمیل، مجاہدین انگورہ کی مالی اعانت تو اصلاً اس عہد کی سیاسی فضا کے تقاضے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونا تحریک آزادی کو قوت اور توانائی بخشتا ہے، لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب "دل کی پاکی اور خدا اور شریعت سے کامل اطاعت" کا عہد و پیمان بھی کیا جائے کہ بغیر ایک مستحکم مذہبی بنیاد کے عزم محکم ممکن ہے اور نہ ہی عمل پیہم کی راہیں استوار ہو سکتی ہیں، پیغام کی یہ ایک خاص ادا ہے اور اس پر آج چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ مولانا آزاد مذہب کی راہ سے سیاست میں داخل ہوئے تھے، اور ان کا یہ مذہبی تصور جس وسعت نظر کا حامل ہے اس کی وضاحت کی یہاں چنداں ضرورت بھی نہیں لیکن پیغام کے اس مطالعے میں اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے تمام واقعات اور حادثات کو مولانا آزاد نے اسی نظر سے دیکھا اور اس کی تعبیر و توجیہہ کی ہے۔ اس نقطۂ نظر میں جو اعتزالی فکر مضمر ہے، اسے نظر انداز کر کے مولانا آزاد کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے پیغام کو۔

پیغام کے اس شمارے میں اداریہ (افتتاحیہ) بھی مولانا آزاد کے قلم کا ہی رہین منت ہے یہ نسبتاً طویل ہے اور اس کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ نظر بندی کے صبر آزما ایام میں مولانا پر ایک ایسا وقت بھی گذرا جب انہوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اپنے لئے کسی "گوشۂ عزلت" کے متلاشی تھے تا کہ تصنیف و تالیف کے ادھورے کام کو پورا کر سکیں، مگر بالآخر انہیں وقت کے سیلاب میں بہنا ہی پڑا، لکھتے ہیں۔

"...... میں نے جنوری سنہ ۲۰ء کے آخر تک پوری جدوجہد کی کہ موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عنوان سے انجام دوں کہ میرا قرار دادہ اسلوب عمل بھی قائم رہے اقلاً سیر و گردش کے کاموں سے الگ رہوں، لیکن حالات کی نزاکت، مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا۔ کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہی اور بالآخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تر اسی کے لئے وقف ہو جانا ہے۔

اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری سنہ ۲۰ء سے اس وقت تک کا زمانہ جو اٹھارہ ماہ سے زیادہ

ہو چکا ہے۔ تمام تر پے درپے دوروں اور عام تحریکوں کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا اور تمام وقت مشغلۂ یک قلم ملتوی کر دینے پڑے ...... ساری باتیں قیام و سکون پر موقوف تھیں اور وہ ان اٹھارہ مہینوں میں ایک شب و روز کیلئے بھی میسّر نہ آسکا، زندگی وہی زندگی ہے جو سب کے لئے مقدر ہوئی ہے، وقت وہی شب و روز کا وقت ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے، نہ سورج میرے لئے زیادہ دیر تک ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل دے سکتی ہے، ایک زندگی ہے لیکن سیکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے کیوں کر دنیا کو پلٹ دوں؟ اور کہاں سے اس طاقت کو پالوں! ایک طبع و دماغ کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں ہاتھوں کو جوڑ دیجئے۔[1]

اس اقتباس میں جوش و جذبہ کا وہی انداز ہے جسے قوت سے فعل میں لانے کے لئے مولانا آزاد اپنے ابتدائی دور زندگی میں بنگال کی دہشت پسند سرگرمیوں میں شرکت کے لئے مجبور ہوئے تھے اگرچہ وہ اس کوچے سے جلد ہی باہر آگئے تھے، مگر وہ جذبہ فنا نہیں ہو سکا اور اس نے مولانا کی تحریر اور اکثر تقریر میں جو رنگ اور روپ اختیار کیا اسکی ادنیٰ سی جھلک یہاں ملاحظہ کیجیے۔ آگرہ، منعقدہ خلافت کانفرنس میں ترک موالات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے برٹش گورنمنٹ کو یوں مخاطب کیا ہے۔

...... ہاں، ہاں میں نے سپاہیوں سے ہندستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو خدا اور اس کے رسول کے نام سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو، کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ جس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے، اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور ان کو یہ پیغام سناؤ ...... گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی، سیف الدین کچلو، حسین احمد، شنکر اچاریہ کو گرفتار نہیں کیا ہے۔ بلکہ گورنمنٹ نے آخری اعلان کر دیا ہے کہ وہ اسلام ا

---

[1] پیغام ص ۲، شمارہ نمبر ۱، جلد ۱، ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء

دنیا کی متفقہ سچائی کو گرفتار کرنا چاہتی ہے، لیکن گورنمنٹ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اس کا گھنٹہ گھر اونچا سہی، لیکن اس کے گھنٹہ سے بھی اونچی ایک طاقت موجود ہے گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ہم سے بڑھ کر دنیا میں کون ہے، مگر وہ فاطر السموات والارض بتاتا ہے کہ حقیقی طاقت اللہ تعالیٰ ہے . . . .

آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، سب سے بڑا اور سب سے بہتر جہاد کیا ہے؟ حضرت نے کچھ دیر تامل کے بعد فرمایا "سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان کر دینا۔

پیغام کا دوسرا تیسرا اور چوتھا شمارہ دو ہفتے کی تاخیر سے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین نمبروں کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس میں صفحات کی تعداد ۲۴ ص ۱۹ پر 'اعتذار' کے عنوان سے ایڈیٹر کا ایک نوٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل دو ہفتے کا التواء کسی سیاسی اسباب کی بناء پر نہیں تھا بلکہ تاخیر کی اصل وجہ پریس "مشین اور اس کی موٹر کی مسلسل خرابی" تھی۔ اسی ضمن میں ایڈیٹر پیغام نے مولانا کی عملی سرگرمیوں کے باعث ان کی کسی تازہ تحریر کے شامل نہ ہونے پر اظہار افسوس کے بعد یہ لکھا ہے کہ۔

" اس نمبر میں جو کمی ہمارے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، وہ حضرت مولانا کی تازہ تحریر کے نہ موجود ہونے کی کمی ہے، اگرچہ ایک مضمون الہلال مرحوم سے نقل کر دیا گیا ہے جو ہر طرح حالات حاضرہ کے مناسب ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسی وقت کے لئے لکھا گیا تھا۔"

ذرا آگے مزید لکھتے ہیں۔

" حضرت مولانا مدظلہ اس وقت بمبئی میں تشریف فرما ہیں اور سابق کی کثیر مشغولیتوں کے ساتھ اب مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کا بار عظیم بھی انہیں اٹھانا پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے اس مرتبہ بالکل فرصت نہ ملی اور پیغام کے لئے کوئی تازہ تحریر نہ روانہ کر سکے . . . . . .

. . . . آئندہ ہم نمبر میں وہ حضرت مولانا کے مضامین سے فیض یاب ہو سکیں گے[۲]

۲۔ پیغام ص ۱۹، ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

مدیر پیغام کا یہ نوٹ اس امر کا ثبوت ہے کہ قارئین پیغام کے نزدیک یہ رسالہ الہلال و البلاغ بدل تھا اور وہ اس کے ہر شمارے میں مولانا کی تحریر کے منتظر تھے۔ لیکن اس سے قطع نظر، یہ شمارہ اپنی ترتیب اور تزئین کے اعتبار سے ان ہی مقاصد کا ترجمان ہے جس کی تفصیل گزشتہ اوراق میں پیش کی جا چکی ہے۔ پھر بھی اس مقام پر بعض اہم مندرجات کا ذکر ضروری ہے۔

ص ۲ کا آغاز "ان الحکم الا اللّٰہ" سے کیا گیا ہے، یہ مولانا آزاد کا مضمون ہے اور الہلال سے ماخوذ ہے۔ ص ۵ پر "مقالات" کے عنوان سے "انقلاب فرانس، شمعی آزادی" کے نام سے ایک مضمون کا سلسلہ جاری ہے، یہ مضمون ص ۷ پر 'باقی آئندہ' کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحہ پر "عربی اخبارات" کے ذیل میں "جنگ اناطولیہ کی خبریں" شائع کی گئی ہیں، ص ۸ پر "رہنمایان ملک کی گرفتاری" کے عنوان سے ایک بسیط اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ ص ۱۰ پر مسئلہ عرب و شام (۲) "کے تحت علامہ سید محمد رشید رضا ایڈیٹر المنار (مصر) کے ایک عربی مضمون کا ترجمہ ہے جو ص ۱۱ پر "باقی دارد" پر ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحے کے آخری کالم پر روم اور پیرس کی دو خبریں ہیں۔ ص ۱۲ پر "عالم اسلام" کے ذیل میں مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کے بعض بیانات کی تصریح ہے جو مصری اخبار (الاخبار) میں شائع شدہ ایک خط کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ص ۱۳ پر "شام آزادی چاہتا ہے" اور جنیوا میں شامیوں کی کانفرنس" کا تذکرہ ہے۔ اسی صفحے کے آخر میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "حضرت مولانا آزاد صاحب اب تک دورے میں ہیں اور سرحدی اضلاع میں خلافِ وطن کے مقدمے کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں" ص ۱۶ پر "تحقایات" کے عنوان سے ترکوں کے متعلق برطانیہ کی پالیسی پر رائے زنی کی گئی ہے، اسی صفحے کے دوسرے کالم پر "یہودی بیت المقدس میں حکومت نہیں کر سکتے" کے عنوان سے ایک امریکن یہودی کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، یہ سلسلہ ص ۱۷ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسی صفحے کے دوسرے کالم پر "ہندوستان پہلے خوشحال تھا یا اب" کی سرخی کے تحت مسٹر شیروک ولیمز اور میجر کرافورڈ کے امرت بازار پتریکا کے مدیر بابو موتی لال گھوش کو دیئے گئے ایک انٹرویو پر رائے زنی کی گئی ہے اور آخر میں یہ لکھا گیا ہے کہ

" برطانوی عہد حکومت میں ہندوستانیوں کو جو امن و امان حاصل ہے وہ شاید مسلمانوں کے

زمانے میں حاصل نہ ہو، لیکن مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا خاص گھر بنالیا تھا۔ ہندوستان ان کے لئے کوئی مفتوحہ ملک نہ تھا جس طرح آج کل موجودہ حکمرانوں کے لئے ہے، مسلمان ہندوستان کی دولت سمیٹ کر کسی دوسرے ملک میں نہیں لے گئے، جس طرح آج کل انگریز لے جارہے ہیں اور اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کا ہندوستان آج کل کے ہندوستان سے کہیں زیادہ دولت مند تھا۔"[1]

ص ۱۸ کے آغاز میں "امریکہ کے حبشیوں کی حیرت انگیز ترقی" کے نام سے ایک مختصر مضمون ہے جس میں حبشیوں کی مذہبی، تعلیمی، تجارتی، صنعتی ترقیات اور ان کی فوجی کارگزاریوں کا ذکر ہے۔ اسی صفحے کے دوسرے کالم پر "حضرت امیر شریعت صوبہ بہار کا فرمان" شائع کیا گیا ہے جس میں حکومت انگورہ کی مالی اعانت پر زور دیتے ہوئے یہ جملے قابل لحاظ ہیں۔

"اس وقت انگورہ حکومت واحد اسلامی قوت ہے جو اسلام کی عزت ...... برقرار رکھنے کے لئے لڑ رہی ہے ...... (اس کی مالی امداد پہنچائیں اور اس امداد رسانی کو پوری سرگرمی کے ساتھ اتنے عرصے تک جاری رکھیں جب تک وہ اپنا سابق اقتدار و شان و شوکت دوبارہ حاصل نہ کرلے ......"[2]

اس کے بعد ص ۱۹ کے دوسرے کالم پر "مولانا محمد علی کا پیغام اہل ہند کے نام" شائع ہوا ہے، پیغام مختصراً درج ذیل ہے۔

"میں قید فرنگ کو نظر حقارت و نفرت سے دیکھتا ہوں، اس لئے اپنے ابنائے وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اجلاس کانگریس کے موقع پر جو احمد آباد میں منعقد ہوگا، جمہوریت ہند کا اعلان کرکے مجھکو اس قید فرنگ سے رہا کرالیں

دستخط

محمد علی (خادم کعبہ)

---

[1] پیغام ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء

[2] ، ، ص ۱۸

پھر اسی صفحے پر "اسیرانِ ملت کا مشترکہ پیغام" چھپا ہے۔ یہ پیغام ایڈیٹر کی تصریح کے مطابق بقت کیمپ صوبہ بہار سے موصول ہوا تھا۔ پیغام میں کہا گیا ہے کہ

"...... آپ سب بھائیوں اور بزرگوں سے ہماری التجا ہے کہ آپ ہماری طرف سے ہرگز فکرمند نہ ہوں بلکہ تحریکات حاضرہ میں اور زیادہ قدم بڑھائیں، نہایت گرمی اور دلچسپی سے کام کریں

...... جس قدر جلد ممکن ہو قوم اور وطن کو آزاد کر کے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں [1]۔

ص ۲۰ پر "مجلس جمیعت العلماء کا فیصلہ" شائع کرتے ہوئے کمشنر دہلی اور دیگر صوبوں کے اربابِ بست وکشاد کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد ضبط شدہ فتووں کو شائع کریں۔ واضح رہے کہ اس فتوے پر پانچ سو سے زائد علماء کے دستخط تھے اور اس کا مقصد ترکِ موالات کی اسکیم کو کامیاب بنانا تھا [2]۔

پیغام کا پانچواں شمارہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء م ۱۸ صفر ۱۳۴۰ھ بروز جمعہ شائع ہوا۔ اس کے سرورق پر قرآن کریم کی یہ آیت (۴، ۵۹) درج ہے

"..... قتل مسلم ومن یقتل ..... عذابًا عظیم"

ص ۲ پر مدیر پیغام نے ایفائے وعدہ کے طور پر مولانا آزاد کا ایک مضمون بعنوان "فیصلہ کا انتظار" شائع کیا، اس مضمون کی ابتداء میں "اسیرانِ ملت" کی گرفتاری اور ان کے مقدمے کی پیشی کا ذکر ہے بعد ازاں مولانا لکھتے ہیں۔

"..... یہ چند انسانوں کا نہیں قوموں اور ملکوں کا مقدمہ ہے اور دنیا کی کسی ٹھہرائی ہوئی عدالت میں نہیں بلکہ خدا کی ازلی و ابدی عدالت کے سامنے پیش ہو چکا ہے حق باوجود اپنی تمام بے سروسامانیوں کے مدعی ہے اور باطل اپنے تمام سامانوں اور طاقتوں کے ساتھ مدعا علیہ ہے۔ ایک طرف ہندوستان ہے اور ہندوستان کی ۳۲ کروڑ مخلوق ہے، چالیس کروڑ پیروانِ اسلام ہیں اور تمام ایشیا و افریقہ ہے۔ اجڑی ہوئی آبادیاں، ویران شہروں کے کھنڈر، خون کے سیلاب، بیواؤں کے آنسو، یتیموں کی چیخیں اور مظلوم اور روندی ہوئی زمینوں کے ایک ایک کونے، ایک ایک ذرے کی فریادیں ہیں

---

[1] پیغام ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۹

[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے "مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری" ص ۱۱۷ از اشرف علی عشی انصاری مطبوعہ ۱۹۶۲ء بمبئی

دوسری طرف انسانی تاج و تخت کا غرور ہے، ظلم کا گھمنڈ ہے، طاقت کا سرشار ہے، مہلت کے غرور ہیں، فوجوں کی قطاریں ہیں۔۔۔ یہ دونوں فریق مالک الملک اور احکم الحاکمین کے تخت کے آگے کھڑے کئے جا چکے ہیں۔ عدالت اپنا کام کر رہی ہے، قانون اٹل اور بے چارہ ہے اور حکم ناگزیر اور لابدی۔۔۔۔۔۔ کراچی کے مقدمے کی طرح یہ مقدمہ بھی نیا نہیں ہے، نہ تو نوعیت کے اعتبار سے اور نہ ہی واقعات کے اعتبار سے، نہ جرم کے اعتبار اور نہ نتیجے کے اعتبار سے۔۔۔۔ کراچی کے مقدمہ کا انتظار بے سود ہے ۔۔۔ اگر انتظار کرنا ہے تو دوسرے مقدمے کے فیصلہ کا کرنا چاہئے۔"

ص ۵-۴ پر "شذرات" کے تحت مختلف اہم خبروں اور واقعات پر تبصرے کے بعد اس صفحے کے دوسرے کالم پر "حضرت مولانا کی مشغولیت" کے عنوان سے قارئین کو مطلع کیا گیا ہے کہ "مولانا آزاد اب تک کلکتہ سے باہر ہیں اور بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کی تنظیم میں مشغول ہیں، ۲۲ ماہ حال کو کراچی جائیں گے تاکہ رہنمایان ملک کے مقدمہ کی نگرانی کریں، اکتوبر کی آخری تاریخوں میں جمیعت علماء ہند کے جلسے کی لاہور میں صدارت فرمائیں گے۔ اور اواخر نومبر میں کلکتہ واپس آئیں گے۔"[۲]

ص ۶ پر "قتل مسلم" کا بقیہ حصہ درج ہے، ص ۸ پر "انقلاب فرانس" (گزشتہ سے پیوستہ) کے عنوان سے 'انقلاب' کے موضوع پر تفصیلی مضمون ہے جو ص ۱۱ پر ختم ہوتا ہے اسی ص پر "حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہ کا برقی پیغام" شائع کیا گیا ہے، جس کی ذیلی سرخی "انگورہ کی مالی اعانت، بدیشی کپڑے کا مقاطعہ" ہے ص ۱۲ پر مسئلہ عرب و شام، سے متعلق سید محمد رشید رضا، ایڈیٹر المنار (مصر) کے مضمون کا باقی حصہ ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے ص ۱۵ تک مختلف اسلامی اور یوروپی ممالک کی خبریں ہیں۔ اس صفحے کے آخر میں یہ اعلان درج ہے

"آزادی قریب ہے ۔ ۳۰ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو یاد رکھو"

پیغام کے شمارہ نمبر ۶، ۲۸ ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء مطابق ۲۵ صفر سنہ ۱۳۴۰ھ کو شائع ہوا - اس کے

---

[۱]۔ پیغام ص ۲ نمبر ۵، جلد ۱، ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

[۲]۔ پیغام ص ۵، نمبر ۵، جلد ۱، ۲۱ ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

ابتدائی صفحے پر "انگورہ فنڈ" کے افتتاح کا اشتہار ہے۔ پھر ص ۲ تک مصری اور انگریزی اخبارات سے خبروں کا انتخاب ہے، ص ۳ کے دوسرے کالم پر بھیونڈی بازار (بمبئی) میں مولانا کا تقریر کی اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے کہ

"کل شب میں مولانا ابوالکلام آزاد موضع بھیونڈی کے باشندوں کے اصرار پر وہاں تشریف لے گئے ...... لوگ مولانا کے بہت مشتاق تھے، مولانا نے لوگوں سے اس بات کی خواہش کی تھی کہ وہ خالص کھدر کے کپڑے پہنیں، جس کا نمایاں اثر پڑا اور تین چار روز تک بھیونڈی اور قلیان کے درزیوں کو کھدر کے کپڑے سینے سے فرصت نہ ملی، یہ منظر نہایت ہی پرمسرت اور دل خوش کن تھا کہ تمام مجمع صاف کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے تھا، کیونکہ مولانا کھدر کے استعمال کو نہایت ضروری خیال کرتے ہیں، اور اس پر برابر زور دیتے ہیں۔ مولانا نے اس جلسے میں دو گھنٹہ تقریر کی اور خلافت، سوراج، ترک موالات اور سودیشی کے مسائل پر مفصل اظہار خیال کیا .... اس کے بعد انگورہ کی امداد کے لئے نہایت پرزور اپیل کی اور بھیونڈی کے باشندوں نے انگورہ کے لئے مولانا کو گیارہ ہزار روپے کی ایک تھیلی پیش کی ......" [1]

اس شمارہ کے ص ۴ پر مولانا آزاد کا مضمون "کیا آخری منزل آ گئی" بطور اداریہ شائع کیا گیا ہے، اس اداریے میں عصری مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

"...... ہم نے اوّل دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کے لئے آخری منزل قیدخانہ ہے، اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا، قیدخانوں کی کوٹھریوں میں ہوگا۔ ہم نے اسی لئے سول ڈس اوبیڈینس یعنی سیول قوانین کی نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا تھا، کیونکہ قیدخانہ کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ وہی ہے، پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آ گیا ہے؟" [2]

اس آخری منزل کی شرائط کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مزید لکھتے ہیں :

---

[1] : پیغام ص ۳، نمبر ۶، ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء

[2] : ایضاً ص ۴ اور ۵ ایضاً

"..... لیکن ابھی منزل کا نقشہ لفظوں میں جسقدر جلد کھینچ گیا، عمل میں ابھی قدم آسمان نہیں ہے، ایک ایسی حرکت جو کروڑوں غفلت پسند انسانوں میں پھیلی ہوئی ہو، بہت زیادہ کمی کی ضرورت ہے اور جب تک ہمارے دلوں کا کام پورا نہ ہو جائے، میدان کا کام شروع نہیں ہو سکتا، اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملک میں کامل قربانی، استقامت اور نظم پیدا ہو جائے..... "[1]

ص ۵ پر غازی مصطفےٰ کمال پاشا سے متعلق دو خبریں الگ الگ عنوانات سے شائع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد "حقیقی جمہوریت" کے عنوان سے ایک امریکن رسالے سے ترجمہ ہے، ص ۹ کے آخری کالم پر الاخبار (مصر) میں شائع شدہ ایک مضمون بعنوان "ہندوستانی جدوجہد کے متعلق جرمنی میں کیا کہا جاتا ہے۔" اس مضمون میں ہندوستان کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے حکومت برطانیہ کی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ص ۱۰ پر "شذرات" کے تحت کراچی کا مقدمہ، مسلم لیگ، مسٹر شاستری، آئرش کانفرنس اور واشنگٹن کانفرنس پر تبصرہ ہے، ص ۱۲ پر "غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا خطبہ یونانی شکست کے بعد" میں اس تقریر کے بعض اقتباسات کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، جو یونان کی شکست کے بعد انگورہ کی پارلیمنٹ میں کی گئی تھی، ص ۱۲ اور ۱۳ پر تمام خبریں ترکی اور یونان سے ہی متعلق ہیں، ص ۱۴ پر منشی عبد السمیع کا ایک خط بعنوان "ایک اسیر جور کا خط" شائع ہوا ہے جس میں دوران اسیری جو ایذا رسانی کی گئی تھی، اس کی تفصیلات درج ہیں۔

پیغام نمبر ۷ مطبوعہ ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کے سرورق کا نصف حصہ پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد سے متعلق ہے، پرنس ۱۷ نومبر کو ہندوستان پہنچنے والے تھے، لہٰذا ۱۷ نومبر کو یادگار دن، قرار دیتے ہوئے کامل ہڑتال اور بائیکاٹ کی تلقین کی گئی ہے۔ ص ۲ پر "چین کی حیرت انگیز ترقی" کے عنوان سے ایک مضمون میں ۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۱ء کے درمیان چین کی صنعتی، حرفتی اور تجارتی ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ص ۳ پر "یونانی اخبارات ماتم کر رہے ہیں" کے تحت ترکی کی کامیابی اور یونانیوں کی بے بسی پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اس شمارے میں دو اہم مضامین ہیں، ص ۴ پر مولانا عبد الرحمٰن نگرامی، مدرس، مدرسہ جامع مسجد کلکتہ کا مضمون بعنوان "آزادی کی قدر و قیمت، مذہبی نقطۂ نظر سے" اور دوسرا مولانا آزاد کا مضمون "کیا آخری منزل آگئی" کا دوسرا حصہ ص ۱۲ پر شائع ہوا ہے، اول الذکر مضمون کا اختتام درج ذیل جملوں پر ہوتا ہے۔

---

[1] : پیغام ص ۵ نمبر ۶، ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء

...... ہم نے مختصر طور پر محض آزادی کی قدر و قیمت کے متعلق قرآن کریم کے صاف اور صریح اشارا
جمع کر دیئے ہیں ممکن ہے کہ بہت سی آیتیں ہماری نظر سے رہ گئی ہوں۔ آزادی کے مراحل، شرائ
طریق کار ۔ یہ تمام باتیں قرآن مجید میں بہ تفصیل موجود ہیں اور کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائیں گی۔
کاش مسلمان ان آیتوں کو پڑھیں اور "ہندوستان کی آزادی" کی کوشش کو اپنا ایک مذہبی فرض
طور پر انجام دیں۔ ؎

مولانا آزاد کا محولہ بالا مضمون "جرم کا انتخاب" کے ضمنی عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس
مضمون کو بعض اعتبار سے اداریہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا ہی ایک اور مضمون "کرا
رزولیوشن" کے نام سے اس شمارہ کے ص ۴ تا ۵ پر شائع ہوا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد اندا
ہوتا ہے کہ اس موضوع پر مولانا کا یہ قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔ آغاز میں لکھتے ہیں ؎

.... ۱۹ ستمبر سے لیکر اس وقت تک میں نے کلکتہ، کراچی، بمبئی، آگرہ وغیرہ مقامات میں
جس قدر تقریریں کی ہیں، ان میں تفصیل کے ساتھ بتلا دیا ہے کہ کراچی خلافت کانفرنس کے رزولیو
نمبر ۲ کی حقیقت [illegible] ہے، کو زندانیانِ کراچی کا اصلی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اب میں چاہتا
ہوں کہ اس بارے میں اپنا بیان قلم بند کر دوں ....

.... میں بار بار اپنی تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں کہ کراچی کانفرنس میں جو کچھ کہا
ہے، وہ منجملہ ان نہایت معمولی اور عام باتوں کے لئے جو ابتدائے تحریک سے ہر موقع، ہر جلسہ
ہر تقریر اور ہر زبان سے دہرائی گئی ہیں، پھر اگر یہ آج جرم ہے تو دو سال سے گورنمنٹ کو کیا ہو
تھا کہ وہ کانوں میں تیل ڈالے پڑی رہی اور اب اچانک چونک کر سات آدمیوں کو گرفتار کر رہی ہے
تو کیوں ان تمام لوگوں کو بھی گرفتار نہیں کرتی جنہوں نے بے شمار جلسوں اور تقریروں میں اس کا
کیا۔ کم از کم میں ایک شخص موجود ہوں جس نے تحریک خلافت سے بھی پہلے سنہ ۱۹۱۶ء میں گور
کو اس اسلامی قانون سے خبردار کیا تھا اور ضرور ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی مسل میں میری د
موجود ہو۔ سنہ ۱۶ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک [illegible] سے حکومت بہار نے مجھے نظر بند
اور یہ کمیونک شائع کیا کہ کنگ کے دشمنوں سے تعلقات رکھنے کا مجھ پر الزام ہے تو میں نے ایک

؎ پیغام ص ۶، ۴ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء

یا چٹھی لارڈ چیمسفورڈ کے نام بھیجی اور اس میں تفصیل کے ساتھ وہ تمام باتیں لکھیں جو آج مستند
ت کے سلسلے میں گورنمنٹ چھیل رہی ہے، ازاں جملہ میں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر گورنمنٹ
ۃ المسلمین اور اسلامی ممالک کے مقابلے میں جنگ آزما رہی تو نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ اسکی
ہ دار مسلمان فوج کے لئے بھی قطعاً حرام ہو جائے گا اس کے جھنڈے کے نیچے جانفروشی اور خدمت
ری کے ساتھ زندگی بسر کرے ۔ ۔ ۔ ۔" [1]

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے موضوع پر مولانا کا یہ
اپنے لب و لہجے کی شدت کے باوجود حد درجہ مایوس کن ہے، اس کا ایک سبب تو مذکورہ بالا
اس میں موجود ہے، جس میں مولانا بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ جس جرم کی پاداش میں
برادران اور ان کے ساتھیوں کو حکومت نے گرفتار کیا، اصل میں وہ ان کے ذہن کی اختراع ہے،
سی لئے اگر کوئی شخص اس جرم کا سب سے پہلے مرتکب قرار پاتا ہے تو وہ خود ہیں، دوسرا سبب
ی نفسیاتی ہے، اور اس کا تعلق مولانا کے اس طرزِ احساس سے ہے کہ تحریکِ آزادی کے اس
موڑ پر وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گئے اور حکومت نے اس قدر سخت بیانات کے باوجود
تک انہیں گرفتار کیوں نہیں کیا ۔

۲۱ اکتوبر کے پیغام میں مولا[نا] ۔ ۔ ۔ تھا کہ "کراچی کے مقدمہ کا انتظار بے سود ہے" یعنی
علم تھا کہ اس طرح کے سیاسی مقدمات کا فیصلہ بالعموم کس کے حق میں ہوتا ہے، چنانچہ ۴ نومبر
س شمارے میں "رہنمایان ملت کی سزایابی" کے عنوان سے جو اطلاع دی گئی ہے، اس میں
نا آزاد کے اس یقین کی جھلک موجود ہے کہ "موجودہ جدوجہد کی آخری منزل قید خانہ ہے" اب
تبصرے کے چند جملے ملاحظہ ۔ ۔ ۔

" بالآخر گورنمنٹ وہ کر گزری جو اسے کرنا تھا، یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو رہنمایانِ ملت کے نام نہاد
مہ کا فیصلہ ہو گیا اور وہی ہوا جس کی توقع ایسی حکومت سے کی جا سکتی تھی۔
۔ ۔ ۔ ۔ لاریب! علی برادر قید کر دیئے گئے، مگر اس خدا کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس کے
م کی تبلیغ کا "جرم" ان سے سرزد ہوا تھا، اس لئے نہ تو ہندوستان کو رنج و افسوس ہے اور نہ

[1] پیغام ص ۱۴، ۴ نومبر ۱۹۲۱ء

خوف و مایوسی، اس کا صبر بے علی برادر پر تھا کہ ان کی جدائی سے وہ بیٹھ جائے، بلکہ وہ اپنے پروردگار کے نام پر کھڑا ہوا ہے کہ جسے برطانیہ کی طاقت مغلوب نہیں کرسکتی۔

ہندوستان نے "آزادی" کا مطالبہ کیا ہے اور اٹل ارادہ کرلیا ہے کہ اسے لیکر رہے گا۔ اس نے کہا ہے "آزادی یا موت"! وہ اپنے قول میں سچا ہے اور آخر دم تک اس راہ میں گامزن! اسے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جتنی قومیں اس کا سوال اپنی زبان پر لائی ہیں، انہیں یہ سب برداشت کرنا پڑا ہے، جسے وہ برداشت کررہا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ کا منتظر ہے اور اس کی روح آزادی حاصل کرنے کیلئے بے چین ہے سلہ

ص ۱۶ پر غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور حکومت انگورہ کے نمائندوں کا ایک پیام مسلمانانِ ہند کے نام شائع ہوا ہے۔

پیغام نمبر ۸۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۱ء مطابق ۱۰ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو شائع ہوا۔ چونکہ گزشتہ شمارے میں ۱۷ نومبر کو ایک "یادگار دن" بنانے کا عزم ظاہر کیا جاچکا تھا۔ اس لئے زیرِ نظر شمارے کے سرورق پر ہی مولانا آزاد کا درج ذیل پیغام شائع کیا گیا ہے۔

> "سچی خدا پرستی و دینداری، بے لوث حب الوطنی و خودداری، کامل اتفاق و اتحاد غیر مسخر قومی و ملکی طاقت، اسلام اور ہندوستان کے لئے فتح مندانہ عزم یعنی قومی زندگی کی تمام برکتیں ہم اس دن پالیں گے، بشرطیکہ اتنا قابو اپنے اوپر پالیں کہ اپنا کاروبار، لین دین، ملنا جلنا، آمد و رفت قطعاً بند کردیں، کامل امن و سکون، خاموشی و وقار کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں اور اس طرح پرنس آف ویلز کے ورود کا یادگار مقاطعہ انجام پائے۔

امن و سکون ہمارے تمام کاموں کی کامیابی کے لئے پہلی شرط ہے، صرف ہڑتال ہو، کوئی جلوس نہ نکلے، سڑکوں اور بازاروں میں ہجوم نہ کیا جائے۔ امن و سکون کے خلاف کوئی حرکت نہ کی جائے، صرف کامل ہڑتال کی جائے اور ایک دن کے لئے شہروں، آبادیوں اور بستیوں کو سنسا

سلہ پیغام ص ۱۵، ۴ نومبر ۱۹۲۱ء

بنادیا جائے' البتہ اگر ذمہ دارِ خلافت اور کانگریس کی جماعتیں چاہیں تو شام کو کامل انتظام کے ساتھ ایک جلسہ کرکے بائیکاٹ کی تکمیل کا اعلان کر دے سکتے ہیں ؎ـ

ص ۲-۳-۴ پر " شذرات " کے ذیل میں " اودھ میں زمینداری کا فتنہ " موپلہ کا ہنگامہ " سول ڈس اوبیڈینس " اور حکومتِ انگورہ " پر بھرپور تبصرے ہیں۔

ص ٦ پر قتل مسلم (٣) کا سابقہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر ایڈیٹر کے اس نوٹ کے ساتھ کہ " قتل مسلم کی بحث مکمل کرنے کے لئے ذیل میں حضرت مولانا مدظلہ کی کتاب " مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب " سے حمل سلاح علی المسلم' کا باب درج کیا جاتا ہے' جو اس بحث میں قول فیصل کا حکم رکھتا ہے "۔

ص ٨ پر مسٹر فضل الدین احمد بی اے' بی ایس سی دہلوی کا ایک مضمون بعنوان " تاریخ استقلال آئرلینڈ کی ایک عشق آمیز داستان " شائع کیا گیا ہے ۔ مدیر پیغام کے نوٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون اس سے قبل الہلال کی کسی اشاعت میں شامل کیا جا چکا ہے ۔

اس شمارے کے ص ١٠ - ١٣ پر " مواعظ و خطب " کے عنوان سے مولانا آزاد کے ایک طویل مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے' ص ١٣ پر ہی " اودھ کے زمیندار و کاشتکار ہوشیار ہو جاؤ' گورنمنٹ دھوکہ دے رہی ہے " کے عنوان سے پیغام کے خاص نامہ نگار کی ایک رپورٹ ہے' یہ رپورٹ کئی اعتبار سے بہت اہم ہے ۔

ص ١٦ پر " مصر کے جلاوطن لیڈر کا پیغام اپنے اہل وطن کے نام " شائع کیا گیا ہے' جس پر ایڈیٹر پیغام کا یہ نوٹ قابل توجہ ہے ۔

" مصر کے مشہور لیڈر علی فہمی کامل کو انگریزوں نے حال ہی میں جلاوطن کر دیا ہے' انہوں نے مصریوں کے نام ایک پیغام شائع کرایا ہے' جس کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں کیونکہ مصر اور ہندوستان کی مصیبت ایک ہی ہے اور دونوں کا علاج بھی ایک ہی ہے ..... "

پیغام کے شمارہ نمبر ٩ مطبوعہ ١٨ نومبر ١٩٢١ء مطابق ١٧ ربیع الاول ١٣٤٠ھ کے سرورق کے نچلے حصہ پر یہ عبارتیں درج ہیں ۔ " کیا ہندوستان تیار ہے "

؎ پیغام ص ١' ١١ نومبر ١٩٢١ء

سیول ڈس اوبیڈینس کی شرائط جو کانگریس نے عائد کی ہیں ایسی مشکل نہیں کہ ان پر عمل نہ ہو سکے۔ وقت حیل و حجت کا نہیں ہے۔ اگر لوگ واقعی اس کے لئے تیار ہیں تو اس کے ثبوت میں کھدر پہن لیں اور ایک ہفتہ کے اندر چرخہ چلانا سیکھ لیں اور قربانی کیلئے میدان میں نکل آئیں۔"

ص ۲ سے چارلس اسٹورٹ پارنل کے عشق و محبت کی داستان کا بقیہ حصہ شروع ہوتا ہے ص ۳ پر "مولانا آزاد کی مشغولیات" سے قارئین پیغام کو باخبر کیا گیا ہے۔ پیغام کے اسی شمارہ کے ص ۶ تا ۱۰ پر مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا ایک اور اہم مضمون بعنوان "آزادی کا سفر اور راہ مشکلات" شائع ہوا ہے، مضمون کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

..... ڈیڑھ سو برس کی گہری نیند کے بعد اب ہندوستان نے کروٹ بدلی، غلامی کی تاریک فضا میں آزادی کی کرنیں پھوٹ نکلی ہیں، ملک بڑی بے تابی سے سوراج کی طرف جا رہا ہے یہ شوق و اضطراب منزل کی طرف رہنمائی تو ضرور کر سکتا ہے۔ لیکن کیا صرف بیقراری اور بے چینی خواہش اور تمنا منزل تک پہنچنے کیلئے کافی ہے، نہیں۔ بلکہ راہ میں سینکڑوں خطرے ہیں اور قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ مہاتما گاندھی نے سچ کہا ہے کہ " ملک ایک سال میں حیرت انگیز ترقی پر فخر ضرور کر سکتا ہے لیکن ابھی اس کے تمام امراض کا دفعیہ نہیں ہو چکا ..... آئندہ سطروں میں جن باتوں کا بیان کیا جائے گا۔ وہ انہیں مشکلات کے متعلق ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسوقت جو صعوبتیں عمل کی راہ میں حائل آ رہی ہیں اور ارادہ کی کمزوری، نظم کا فقدان، طبائع کا اضمحلال جو ٹھوکریں کھلاتا ہے وہ سب تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہیں، تمام بہی خواہان ملک کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ان خرابیوں کو اپنے نفس کے "تاریک زندان آرزو" میں تلاش کریں اور اگر وہ سفر کے کامیابی کے ساتھ ختم ہونے کے متمنی ہیں تو اپنے کو اس سے پاک کرنے کی کوشش کریں[1]

ص ۱۰ پر "شذرات" کے تحت کراچی کا مقدمہ، سیول ڈس اوبیڈینس، پرنس آف ویلز کی آمد پر ہندوستانیوں کا ردعمل، وغیرہ موضوعات پر تبصرے ہیں۔ ص ۱۴ پر الاخبار مصر کے حوالے سے ایک مضمون بعنوان " حکومت انگورہ اور کردوں کی قوم" ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے اس شمارہ کے ص ۱۵ پر بدرالدین کا ایک مضمون "سوویٹ روس کا خمسہ" اپنے موضوع کے اعتبار

---

[1] پیغام ص ۶ - ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء۔

سے بے حد دلچسپ ہے، سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے بہی خواہوں کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتا ہے۔

"سرمایہ داروں کی قدیم سے یہی خصلت ہے کہ بھولے بھالے سیدھے سادے لوگوں سے کام لیا کرتے ہیں اور اخوت، مساوات اور آزادی کے الفاظ بول بول کر دنیا کو غلام بناتے پھرتے ہیں۔ یہ مکار مدعی ہیں کہ ہم نے لیگ اقوام کی شکل میں عالمگیر بین الاقوامی برادری قائم کی ہے جس سے دنیاوی اخوت و محبت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ حالانکہ اس تمام نہاد بین الاقوامی برادری کی آڑ میں شاہ پسند سرمایہ دار بدترین قاتلانہ و مجرمانہ سازشیں کرتے ہیں اور اسی مقصد کے لئے انہوں نے قائم کیا ہے" [1]

اسی صفحے پر مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک خط بعنوان "ایک اسیر فرنگ عالم کا خط" شائع کیا گیا ہے، یہ خط ۳ نومبر ۱۹۲۱ء کا مکتوبہ ہے۔ اس پر ایڈیٹر پیغام کا یہ نوٹ بھی موجود ہے۔

"ذیل میں مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک خط درج کیا جاتا ہے، جو رنگون میں تحریک خلافت کے سرگرم کارکن تھے اور جنہیں حال ہی میں برما گورنمنٹ نے ایک سال کیلئے جیل خانہ بھیج دیا ہے"

پیغام کا دسواں شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۲۱ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو شائع ہوا۔ اس کے ص ۲ پر مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا تیسرا مضمون بعنوان "آزادی کی تحریک اور حکومت کا طرز عمل" عصری تقاضوں کے پیش نظر انتہائی اہم مباحث پیش کرتا ہے۔ ص ۴ پر "جمعیۃ العلماء الہند کا تیسرا سالانہ اجلاس" منعقدہ لاہور کی تفصیلی رپورٹ ہے، اس کے بعد ص ۵ سے "قتل مسلم" کا بقیہ حصہ درج ہے۔ اس شمارے کے ص ۶ پر ایک مضمون "ایک وطن پرست راہبر" شاہ ولی اللہ کی روداد" چھپا ہے جس میں تفصیل سے شاہ ولی اللہ کی زندگی اور اسی کے نظریات و ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون آٹھویں صفحے پر ختم ہوتا ہے، پھر اسی صفحے کے آخری کالم سے "چند حقائق (برطانیہ کا طرز عمل ہندوستان کے ساتھ، سوراج یا موت" کے عنوان سے جناب بدر الدین کا ایک دوسرا مضمون شائع ہوا ہے، اس مضمون میں اعداد و شمار کے حوالوں سے یہ کہا گیا ہے کہ

---

[1] : پیغام ص ۵، ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء

ہندوستان کے روپیہ اور فوج سے برطانیہ ساری دنیا کو غلام بنا رہا ہے اور اس وقت بھی بنا رہا ہے، ترکی کی بربادی اور خلافت کی تباہی اسی ذریعے سے اس نے کی ہے اور اس وقت بھی ان اسلامی ممالک پر ہندوستانی فوجوں کے ذریعے سے وہ قبضہ جمائے ہوئے ہے..... [1]

ص ۸ سے "جارج واشنگٹن، جمہوریت امریکہ کا بانی (۲)" کی دوسری قسط شروع کی گئی ہے اور اس کے اختتام پر مولانا آزاد کا جمعیت علمائے ہند کے تیسرے سالانہ جلسے منعقدہ لاہور میں پڑھے گئے خطبہ کا پہلا حصہ درج کیا گیا ہے، اس کے بعد ص ۱۴ سے "مواعظ و خطب" والے مضمون کا بقیہ حصہ ہے، یہ مضمون پندرہویں صفحے پر ختم ہوتا، ص ۱۶ پر فوجی نوکری کے حرام ہونے کی وجہ، ہندوستان کو آزاد کرانا مسلمانوں کا شرعی فرض ہے، افضل ترین جہاد و عبادات، ولایتی مال خریدنے والے شرعاً مجرم ہیں، وغیرہ موضوعات پر تبصرے ہیں۔

پیغام کا یہ شمارہ سابقہ شماروں سے بایں وجہ مختلف ہے کہ اس کے ساتھ آٹھ صفحات پر مشتمل ایک ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے [2]۔ یہ ضمیمہ سرخ روشنائی کے ٹائپ حروف میں ہے،

---

[1]: پیغام ص ۹ مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۲۱ء

[2]: اس ضمیمے کی اشاعت کے متعلق عبدالرزاق لکھتے ہیں۔

" پرنس آف ویلس آرہا تھا۔ پیغام کلکتہ میں آگ لگا رہا تھا، انگریزوں کا سب سے بڑا مرکز کلکتہ میں تھا اور وہ پرنس کا بائیکاٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے گورنمنٹ پیغام کی آواز بند کرنے پر تلی تھی..... میں احتیاطاً اخبار کا وہ نمبر مرتب کر گیا تھا جسے لاہور جانے کے بعد نکلنا تھا۔ اخبار کو جمعہ کے دن صبح کو نکلنا تھا، مگر میں جمعرات کی صبح ہی کلکتہ واپس آ گیا، یہاں معلوم ہوا کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور اخبار کے سب مضمون اور کاپیاں اٹھا لے گئی۔ بڑا غصہ آیا.....
میں نے منشی صاحب کو بلا کر کہا، اخبار ٹھیک وقت پر نکلے گا اور آٹھ کا نہیں، سولہ صفحے کا ہوگا.. باقی آٹھ صفحے ٹائپ میں کمپوز کرائے اور سرخ روشنائی میں چھپالیے، جمعہ کے دن ہی اخبار ڈبل نمبر کی شکل میں ہر طرف بک رہا تھا۔ یقیناً یہ حکومت کی ایک شکست تھی۔

(ذکر آزاد ص۔ ۱۹۱)

ایڈیٹر پیغام نے ضمیمہ کی شمولیت کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"۔۔۔۔ جب ہم لاہور سے واپس ہوئے تو "پیغام" کی ایک کاپی کی کتابت ہو چکی تھی اور دوسری
تیار ہو رہی تھی ۔ اسی درمیان میں جو نئے حالات رونما ہوئے ہیں ان پر کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا
لئے یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ اس ہفتہ اخبار کا حجم زیادہ کر دیا جائے ۔ چنانچہ کاپی نویسوں کی قلت
وجہ سے یہ ضمیمہ ٹائپ میں نکالا جاتا ہے ، ہم نے دوسرے نمبر میں وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ کمی پوری
دیں گے ، جو اس نمبر میں لاحق ہو گئی تھی ، چنانچہ آج اس کا ایفا ہو رہا ہے ، نیز پولیس شائع ہو کر
نام میں چھپنے والے مضامین اٹھالے گئی تھی کہ آئندہ ہفتہ اس کی اشاعت میں تعویق ہو جائے گی لیکن
نمبر کے دیکھنے کے بعد اسے یقین کر لینا چاہیئے کہ قومی اخبار نویس اس سے کہیں زیادہ مستعد ہیں
تنا وہ خیال کرتا ہے ۔

پیغام کے اس شمارہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس کے مندرجات حکومت
نظر میں سخت ناپسندیدہ تھے اور وہ کسی بھی وقت اردوئے معلیٰ ، سوراج ، کرم یوگن ، کیسری
بانی ، لوکمانیہ ، کمل ، راشٹرمت ، گجراتی اور راجستھان وغیرہ کی طرح پیغام سے بھی زر ضمانت
ب کر سکتی ہے یا پھر پریس کی ضبطی کے احکامات صادر کر سکتی ہے ۔

پیغام کا گیارہواں شمارہ جمعہ یکم ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۲ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا ۔ اس
مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت نے اس سے زرِ ضمانت طلب کیا اور نہ ہی پریس کی
بطی کے احکامات صادر کئے ۔ اس کے برخلاف جو طریقہ ظلم ایجاد کیا وہ یہ تھا کہ پیغام کے ایڈیٹر
ہی گرفتار کر لیا گیا ، شاید حکومت کے علم میں یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ پیغام کی اشاعت" چند
ر پھرے نوجوانوں ؟ کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے ، اور اسی لئے اس کی آواز بند کرنے کے لئے بس اتنا
افی ہے کہ اس کے مدیر کو گرفتار کر لیا جائے ۔ زیر نظر شمارے کے ص ۱۵ پر مولانا آزاد کا ایک
مختصر مضمون" ایڈیٹر پیغام کی گرفتاری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے ۔ یہ مضمون ۲ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کا
تحریر کردہ ہے ، مولانا لکھتے ہیں ۔

"کل چار بجے بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب
سے ملاقات ہو گی ، تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا ۔ وہ اگر اسٹیشن پر ملتے

تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے، مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے، اس طرح انہوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لئے بھی میرے دل سے تقاضہ کیا، اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں۔

ان کی گرفتاری کے لئے کوئی وارنٹ نہیں جاری کیا گیا، ان سے کہا گیا کہ پولیس کمشنر نے بلایا ہے، جب وہاں گئے تو گرفتار کر لیا گیا اور دو گھنٹے کے بعد میرے مکان پر ٹیلی فون سے اطلاع دی گئی کہ ان کے لئے کھانا بھیج دیا جائے، گرفتاری کی کوئی معین بنا بھی ظاہر نہیں کی گئی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں کوئی تقریر کی تھی اور اسی کی بنا پر گرفتار کیا گیا، ۸ ڈسمبر کو مقدمہ پیش ہوگا۔ دو سال ہوئے جب یہ مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیت علم و عمل پائی، یہ ملک کے ان مخصوص اہل علم نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں انہوں نے خدمت حق و دعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتہ رفاقت و اخوت جوڑا تھا، وہ روز بروز قوی ہوتا گیا ...... میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز و رفیق کو مبارکباد دیتا ہوں، وہ بے گناہ ہیں اور ان کی گرفتاری ان کے لئے پاک عبادت ہے ...... البتہ میں اپنے دل کی اس خواہش کو دور نہیں کر سکتا کہ رفیقانِ راہ ایک ایک کرکے قید ہو رہے ہیں اور میں اب تک چھوڑ دیا گیا ہوں۔[۱]

ایڈیٹر پیغام کی گرفتاری یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو عمل میں آئی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغام کا یہ شمارہ مولانا عبدالرزاق صاحب مرتب کر چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس شمارہ کے تمام مندرجات حسب سابق ہیں۔ البتہ اس کے ص ۲ پر مولانا آزاد کا ایک ایسا بیان شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "صیاد" اپنی چالوں میں ایک بار پھر کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ بیان "شورش ممبئی"

---

[۱] "ذکر آزاد" میں مولانا عبدالرزاق لکھتے ہیں۔

"جانتا تھا، حکومت جلد گرفتار کرے گی کیونکہ کلکتہ میں پیغام ہی اکیلا اردو اخبار تھا جو...: برطانوی راج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی آتشیں دعوت دیتا تھا۔ کلکتہ میں سب سے پہلے حکیم سعید الرحمان دہلوی گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری پر کلکتہ میں ایسا مظاہرہ ہوا جیسا کبھی نہیں ہوا تھا، میں مظاہرے میں پیش پیش تھا، کریلا اور نیم چڑھا پیغام کی ایڈیٹری کے ساتھ مظاہرے کی قیادت بھی، آخر مر حکومت کہاں تک ضبط کرتی ..." (ذکر آزاد ص ۱۹۲)، [۲] پیغام ص ۱۵ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۲۱ء

کے عنوان سے پہلے بمبئی کے اخبارات میں بعد ازاں پیغام میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ص ۴ پر "شذرات" کے تحت "آزادی" "سا نیتجہ" کے عنوان سے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، اس کے چند مختصر اقتباسات قابل مطالعہ ہیں

"۱۷ نومبر کے تاریخی دن کے بعد سے گورنمنٹ نے تمام ملک میں جو "امارکی و غدر" برپا کر رکھا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ سرکاری حلقوں میں اس کا کیا جواب دیا جا رہا ہے لیکن گورنمنٹ کے لسان حال اینگلو انڈین اخبارات نہایت خوش ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس "غدر" سے خاطر خواہ نتائج نکلے ہیں اور ظلم و تشدد کی گرم بازاری نے تحریک آزادی کو سرد کر دیا ہے، خلافت اور کانگریس کمیٹیاں خاموش ہو گئی ہیں، رضا کار بھی غائب ہو گئے ہیں اور اسٹیجوں پر لکچر دینے والے بھی سہم کر رہ گئے ہیں"۔[1]

اینگلو انڈین اخبارات کی ان آرا پر تبصرہ کرتے ہوئے پیغام لکھتا ہے۔

"ہمارے خیال میں گورنمنٹ اور اینگلو انڈین طبقہ کی یہ خوشی قبل از وقت ہے اور انہوں نے نتیجہ نکالنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے، ملک ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں مرعوب ہوا اور نہ تشدد کی حماقت آمیز کاروائیاں اس میں کمزوری پیدا کر سکی ہیں، وہ آزادی کے مطالبہ میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہیں اور "پرامن جہاد" پر اسے اور بھی زیادہ اعتقاد ہو گیا ہے۔ گورنمنٹ کی سختیوں کے مقابلہ میں جو چند روزہ وقفہ ہوا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ محبان وطن خوفزدہ ہو کر میدان سے ہٹ گئے بلکہ یہ وقفہ ایسا ہی وقفہ تھا جیسا جنگ میں دشمن کے اچانک حملوں کے وقت ہمیشہ ہوا کرتا ہے"۔

پھر آگے اینگلو انڈین اخبارات کو جواب دیتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"ہم قبل از وقت کوئی بات کہنا نہیں چاہتے اور نہ اپنا راز فاش کرنا چاہتے ہیں، لیکن اتنا بتائے دیتے ہیں کہ گورنمنٹ کو اس کے تشدد کا جواب سب سے پہلے بنگال ہی سے ملے گا ..."[2]

---

[1] پیغام ص ۴، ۲ دسمبر ۱۹۲۱ء

[2] ایضاً ص ۴ " " "

اس کے بعد ص ۶ پر "کارکنانِ خلافت کے نام" مولانا آزاد کا ایک برقی پیغام ہے بلفظہٖ بعد ازاں ص ۷ پر "سویٹ نظام حکومت" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ص ۸ تا ۱۲ مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت (۲) کے لئے وقف ہے، ص ۱۳ پر مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا ایک مضمون بعنوان "سیول نافرمانی پر قرآن حکیم سے ایک نظر" شائع ہوا ہے، اس مضمون میں بہ دلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ظالم حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی ہم پر فرض ہے۔

پیغام کا بارہواں شمارہ بروز جمعہ ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔ اس سے قبل کے شمارے میں مدیر پیغام کے گرفتار ہونے کی اطلاع سے گمان گذرتا ہے کہ پیغام کا زیرِ نظر شمارہ غالباً مولانا آزاد کا مرتب کردہ ہے، اگرچہ شمارہ کے سرورق پر سابق کی طرح مدیر کا نام عبدالرزاق ہی درج ہے مگر یہ اور اس کے بعد کا شمارہ بھی چونکہ ان کی عدم موجودگی میں شائع ہوا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ۹ اور ۱۶ دسمبر کا پیغام مولانا آزاد کے ہاتھوں مرتب ہوا۔

۹ دسمبر کے پیغام کی ابتداء "بنگال میں ڈس اوبیڈینس کا شاندار آغاز" سے ہوتی ہے، اس کے دوسرے صفحے پر اداریہ ہے جسے مولانا آزاد نے "آخری منزل کے آثار پھر شروع ہو گئے" کا عنوان دیا ہے، ص ۷-۶ پر مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا مضمون "آزادی کے رہنما اور ان کے فرائض" شائع کیا گیا ہے، مضمون نگار کا مقصد یہ ہے کہ۔

"..... اصلاح کی ہر تحریک اور تجدید کی ہر دعوت مشکلات سے لبریز ہے لیکن تحریک آزادی کی رہنمائی اور مقصدِ استقلال کی پیشوائی کا راستہ اپنے اندر بہت سے پیچ و خم رکھتا ہے، ان دشواریوں سے نجات پا جانا تو ممکن نہیں اس لئے کہ جماعت کبھی بھی اپنی تمام حالتوں میں ایسی صحیح و مستقیم نہیں مل سکتی کہ کسی کجروی اور کوتاہی کے بغیر منزل تمام ہو جائے، اہل دانائی اور دور اندیشی کے ساتھ ان خطرات سے گذر جانا اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، یہی پیش وائی کی دانائی اور اصلاح و درستی کی

سلہ اس پیغام میں کہا گیا ہے کہ بنگال، پنجاب، دھلی اور میرٹھ میں سڈالیشن ایکٹ نافذ کر دیا گیا ہے، اور میری عدم موجودگی میں میرے گھر اور پریس کی تلاشی لی گئی ہے، آگے طنزاً کہا گیا ہے کہ "مقدمۂ کراچی یادگار عقلمندی کے بعد یہ دوسری عقلمندی ہے...... خود گورنمنٹ نے یہ تبلا دیا کہ سول ڈس اوبیڈینس کی سب سے زیادہ سہل اور کامیاب راہ کون سی ہے"۔

، دانش آرائی ہے جسے قرآن حکیم نے حکمت سے تعبیر کیا ہے ......"[1]

اس کے بعد کے تمام صفحات پر مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت کا باقی حصہ درج کیا گیا ہے۔

پیغام کا آخری شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ بروز جمعہ شائع ہوا ناہر یہ تیرہواں (۱۳) شمارہ ہے، لیکن اصل صورت حال اس سے مختلف ہے، جیساکہ شروع میں شارہ کیا جا چکا ہے، پیغام کا دوسرا شمارہ اصلاً مشترکہ شمارہ ہے جس پر ۲۔۳ اور ۴ نمبر کا اندراج ہے، اس اعتبار سے اس کی جملہ اشاعت کی تعداد ۱۱ ہے ۱۳ نہیں جیسا کہ بعض حضرات لکھتے یں، اس سلسلہ کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس شمارے کی اشاعت سے چھ (۶) دن قبل ہی مولانا زاد بھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ جس کی تفصیلی اطلاع اس شمارہ میں دی گئی ہے، اسی دوران مولانا بدالرزاق کے مقدمہ کا فیصلہ بھی سامنے آچکا تھا اور انہیں دو سال کی قید سخت کا حکم دیا گیا تھا، ان لات میں پیغام کے جاری رہنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ لیکن اس آخری شمارہ کے لعہ سے یہ خوشگوار احساس بھی ہوتا ہے کہ اسے ہفتہ وار نہ سہی روزانہ اخبار کی شکل میں جاری بنے کا عزم کیا گیا تھا، "اعتذار" کے عنوان سے "منیجر" نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا لعہ یہاں دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"کلکتہ میں اردو کے روزانہ اخبارات کے دفعتاً بند ہو جانے سے مجبوراً منتظمین کو ایک وزانہ اشاعت کا انتظام کرنا پڑا، اس انتظام کے باعث ہفتہ وار "پیغام" کا یوم اشاعت جمعہ کے بجائے یکشنبہ کر دیا گیا ہے، اخبار تیار تھا لیکن ٹھیک پریس میں جانے کے وقت حضرت مولانا کے کاغذات میں ان کا ایک اہم مضمون مل گیا، جس کے باعث اس اشاعت میں تاخیر ہو گئی، امید کہ قارئین کرام ہماری مجبوریوں پر نظر کر کے معاف کریں گے اور آئندہ جمعہ کی بجائے یکشنبہ کو ہفتہ وار "پیغام" کا انتظار کریں گے۔ سردست روزانہ پیغام کا صرف مقامی اشاعت کے لئے انتظام کیا گیا ہے جس میں سوائے اسوسی ایٹڈ پریس کی خبروں اور مقامی حالات کے کوئی ایڈیٹوریل مضمون یا نوٹ درج نہیں ہوتا، باہر کے

---

[1] پیغام ص ۶، ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء،

خلافت کے لئے یہ اشاعت چنداں مفید نہیں "[۱]
فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ ہفتہ وار پیغام کی اشاعت کے بعد ہی روزانہ پیغام جاری ہوا، یا اس کے بعد، لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے، اس کے منتظمین نے یہ کوشش ضروری تھی کہ حالات کے نشیب و فراز کے پیش نظر پیغام کو جاری رہنا چاہیئے۔ ان حقائق سے قطع نظر پیغام کا یہ پورا شمارہ روایت کے برخلاف ٹائپ میں چھپا ہے، سرورق پر مولانا آزاد کی ایک تحریر مورخہ ۱۰ ر دسمبر ۱۹۲۱ء شائع ہوئی ہے، اسے "جس منزل کا انتظار تھا وہ آ گئی" کا عنوان دیا گیا ہے، مولانا لکھتے ہیں۔

"..... کیسی مبارک گھڑی ہے جو آ گئی۔
خوف و ہراس کے بادل چھٹ گئے، امید کی روشنی پھیلنے لگی، فتح و مراد کا سورج نکل رہا ہے اور خدا کی رحمت و نصرت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی ہے، افسوس ان پر جواب بھی نہ دیکھیں ......"

ص ۲ پر مولانا عبد الرحمٰن نگرامی کا مضمون بعنوان "آزادی کی ایک نشانی، عصاء موسیٰ اور تحریک موالات" شائع ہوا ہے، اور ص۳ پر ایڈیٹر کی جانب سے جو نوٹ درج کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ص ۴ اور ۵ کے علاوہ ۸ پر مولانا آزاد کی جو تحریریں شائع کی گئی ہیں وہ انہوں نے اپنی گرفتاری سے قبل حالات کی نزاکت کے پیش نظر "پیغام" کے طور پر قلمبند کر لیا تھا۔ مولانا کے یہ پیغامات بعد ازاں ملک کے تمام قومی اخبارات و رسائل میں شائع ہو گئے تھے، اسی پیغام میں مولانا نے مسلمانانِ ہند کو مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ ان پیغامات کے بعد ص ۶ سے ۸ تک مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت کا آخری حصہ شائع کیا گیا ہے۔ ص ۹ پر "رفتار سیاست" کے عنوان سے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دسمبر کے اوائل سے سیاسی فضا حد درجہ مکدر ہو چکی تھی اور جب ۲۴ ر دسمبر کو عام ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا اور خلافت اور کانگریس کے رضا کار اپنی جان ہتھیلی

---

[۱] پیغام ص ۱۶ --- ۱۶ ر دسمبر ۱۹۲۱ء۔

پرنسپلز بازاروں میں دوکانداروں سے کامل ہڑتال کی درخواست کرنے لگے تو "دیسی پولیس کی تین سو وتندی بھی ملک کی ہم دردی کے جذبات سے بدل گئی اور ایک بڑی تعداد نے اسی وقت استعفیٰ داخل کردیا" [1] اسی ذیل میں تحریک آزادی کے ان مختلف مراحل سے واقفیت کے لئے یہ اقتباس بھی قابل لحاظ ہے۔

..... یکشنبہ کے روز مسٹر داس اور حضرت مولانا کی گرفتاریاں ان کے علاوہ ایڈیٹران اخبارات سیکریٹریان خلافت و ممبران کانگریس کی گرفتاریاں عمل میں آئیں، جس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ کالج خالی ہو رہے ہیں، ایم اے اور بی اے کلاس کے طالب علم رضا کاروں کی صف میں نظر آنے لگے، جیل خانے بھر گئے" روزانہ ڈھائی سو کے اوسط سے گرفتاریاں جاری ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ دوسری طرف گرفتاریوں کے بعد رہائی پر بھی زبردستی مجبور کیا جارہا ہے، جیل کے پھاٹک پر جس وقت ان گرفتارانِ آزادی کی گاڑی پہونچتی ہے تو یہ فرطِ مسرت سے اس طرح اچھلتے ہیں گویا ان کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جارہا ہے، دس دس بارہ بارہ برس کے بچے اپنی گرفتاری کے لئے سپاہیوں اور سارجنٹوں سے لڑتے ہیں اور ان کے انکار پر لوگوں سے اپنی محرومی کی شکایت رو رو کر کرتے ہیں۔ غرض ایک عجیب زندگی کا تماشا ہے...... سر پی۔سی۔رائے مشہور سائنس داں کا دل درد کے جذبات سے لبریز ہوگیا، حق یہ ہے کہ جو آنکھیں یہ معاملات دیکھیں اور پھر نم نہ ہوں...... (ان کے لئے) دنیا میں کوئی چیز موثر نہیں ہوسکتی......" [1]

ص ۱۴ پر "مختارات" کے ذیل میں "مشرق کی بیداری" کے عنوان سے مصری رسالہ المنار کے ایک مضمون کی تلخیص شائع کی گئی ہے، آغاز میں مدیر پیغام کی صراحت کے مطابق "اس ملخص میں دوران جنگ کے بہت سے ایسے واقعات ملیں گے جو اب تک ہندوستان میں شائع نہیں ہوئے تھے، مضمون کا آغاز ان جملوں سے کیا گیا ہے۔

"...... اب اس میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ مشرق بیدار ہوچکا ہے، اسکی گہری نیند ختم ہوگئی، امید کی صبح طلوع ہوچکی، جنگ عظیم کے خاتمہ نے مشرق کے ہر چھوٹے سے

---

[1] : پیغام ص ۹، ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء

چھوٹے حصے کو ہوشیار کر دیا ہے۔ یورپ اس امر کو پورے طور پر سمجھ گیا ہے کہ کل کا مشرق اور تھا اور آج کا مشرق اور ہے، یہ بہت ممکن تھا کہ انقلاب کی تحریکیں ابھی صدیوں تک نہ پیدا ہوتیں، لیکن اس عام اور تباہ کن جنگ نے ہر مشرقی آبادی کو انقلاب کا خواب دکھا دیا اور اب خواب کہ اس کی تعبیریں بھی جلد وقوع میں آنے لگیں ..... ۱؎۔

ہفتہ وار پیغام نے بھی ایک خواب دیکھا تھا، اس خواب کی تعبیر کے لئے دو مہینے اور اکیس دن تک اس نے جد و جہد کی اور اپنی جملہ اشاعتوں کے ایک سو بیالیس خطبات کے ذریعے ابلاغ و البلاغ کے برعکس عام بول چال کے لب و لہجے میں ملک اور قوم کو غلامی سے نجات دلانے اور آزادی سے قریب تر کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قومی اخبارات و رسائل کے متعلق مشہور صحافی تشار کا نتی گھوش کے ان الفاظ کو ہمیشہ قدر و منزلت حاصل رہے گی۔

"We of the Indian Press claim that our Share in the Struggle of freedom and in Suffering is of no mean importance"

۱؎ پیغام ص ۱۴، ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء

باقی سلسلہ صفحہ ۳۴۳ [illegible]

اس لئے خاتمہ کلام کے طور پر اس قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد قرآنی تصریح اور شرائط کے مطابق تعدد ازدواج کے قائل تھے انشاء اللہ اگر توفیق الٰہی مساعد ہوئی تو ان جیسے مسائل پر مولانا آزاد کے افکار کو دلائل اور براہین کی روشنی میں مرتب کرنے کی سعی کروں گا۔

وما توفیقی الا باللہ

سید مجیب
شریک معتمد مولانا ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی
میردلن دبیرپورہ - حیدرآباد ۲۳

مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت ادیب

اس حقیقت کو تو سبھی مانتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اردو نثر نگاروں میں ایک امتیازی نشان رکھتے ہیں مگر وجہ امتیاز کیا ہے۔ اس پر ابھی تک کسی نے بھی پوری طرح روشنی نہیں ڈالی۔ میں نے مولانا کی تحریروں کا ہمہ گیر اور گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے ان کے طرز خیال اور اسلوب بیان کی خصوصیات پر تفصیلی نظر ڈالنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ارباب نظر کو مسئلہ کے ایک پہلو کی طرف جو مجھے اہم اور قابل غور معلوم ہوتا ہے توجہ دلاؤں۔

لکھنے والے اردو کے ہوں یا کسی اور زبان کے جب تصنیف اور تالیف کی راہ میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی فکر اور ان کے فن کو بلوغ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے نشو ونما کے کئی مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ عام طور پر مختلف استادوں کے تقلیدی مرحلے میں رُک کر رہ جاتے ہیں مگر بعض جنکی طبعیت میں ایک خاص امنگ اور اپج ہوتی ہے ترقی کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کا اپنا سوچنے اور لکھنے کا ایک مخصوص اور مستقل انداز بن جاتا ہے اور صاحب طرز انشا پرواز کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

مولانا آزاد کے فکر وفن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نشو ونما کے جو مرحلے انہوں نے طے کئے ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک منزل تھا۔ یعنی ادبی زندگی کے ہر دور میں وہ گذرے اور سوچنے لکھنے کے ہر طرز میں ایک صاحب طرز ایک صاحب انشاء پرداز کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کی ادبی زندگی کے تین دور قرار دیئے جا سکتے ہیں پہلا دور ۱۲ برس کی عمر سے جب انہوں نے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کیا، ۲۸ برس کی عمر یعنی ۱۹۱۶ء تک جب انہوں نے تذکرہ تصنیف کیا۔ دوسرا اس کے بعد سے ۱۹۳۶ء تک جس میں وہ زیادہ تر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام میں مصروف رہے۔ تیسرا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جب انہوں نے غبار خاطر کو مکمل کیا اس کے بعد مولانا آزاد کی ادبی زندگی ایک طرح سے ختم ہو گئی۔ ان خطبوں کے سوا جو انہیں نیشنل کانگریس کے صدر یا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے دینے پڑے غالباً انہوں نے کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی۔

پہلے دور کی تحریروں میں جن کا نمونہ تذکرہ ہے کچھ تو لکھنے والے کے سن شباب اور کچھ اس زمانہ کے عام مذاق کے اثر سے شدت احساس و شدت اظہار بے قید تخیل اور بے ضبط مبالغہ غرض وہ چیزیں موجود ہیں جنہیں ہمارے نقاد رومانی اسلوب کی خصوصیتیں قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں خصوصاً الہلال کے مضامین اور تذکرے میں وہ کیفیتیں جو لکھنے والے کی طبیعت پر چھائی ہوئی تھیں صاف جھلکتی ہیں ایک اخلاقی شدت پسندی - دوسری انتہائی جدت پسندی جو خود پسندی کی حد تک پہنچ گئی ہیں اور یہ دونوں رومانی رنگ میں کس طرح نہیں کھپ تیں۔ اس لئے رومانی مزاج کو اخلاقی قید و ضبط سے وحشت ہوتی ہے اور وہ خود فکری اور خود شکنی کے دونوں کے درمیان اس طرح جھولتا رہتا ہے کہ اس میں خود اعتمادی کا توازن پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ دراصل الہلال میں مولانا آزاد کے مضامین اور تذکرے کے آہنگ و اسلوب کو ہم رومانی یا خطیبانہ اسلوب کے بجائے رجزیانہ کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ تذکرے کی ان عبارتوں کو پڑھئے اور دیکھئے کہ خواب جوانی کی غفلت اور سرمستی سے چونکنے کے بعد سب حجابوں کا اٹھ جانا اور شاہد حقیقت کا بے نقاب نظر آنا کس شد و مد سے بیان کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے

زمین و آسمان صاحب نظر سے پیدا شد

کے نعرے سے گونج رہے ہیں اُسے آپ رجزیانہ انداز بیان کے سوا اور کیا کہیں گے۔

وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی کی پیہم دعوتیں دی تھیں اب اس کا کونہ کونہ چپہ چپہ ہشیاری کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا۔ پتّے پتّے کو مکتوب بد مستور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا کہ سوالوں کے جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ سب نے نقاب اتار دیئے۔ سارے پردے جھلمل ہو گئے۔ سب ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں صدائیں بھری تھیں۔ دوسرے دور میں مولانا آزاد کا ذہن سیاسیات کے جھمیلوں کے باوجود قرآن اور قرآنیات کے مطالعہ میں ڈوبا رہا اور ان کا قلم زیادہ تر کلام مجید کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف رہا اس کا اثر ان کے ادبی طرز پر یہ پڑا کہ شدت احساس کا رخ خود بینی سے خدا بینی کی طرف مڑ گیا اور زور بیان خود نمائی کی جگہ حق نمائی میں صرف ہونے لگا اب لکھنے والے کا خطاب، پڑھنے والوں کے جذبات سے نہیں بلکہ ان کے ضمیر سے تھا اور اس کا مقصد اپنی ذہنی اور روحانی فضیلت کو جتانا نہیں بلکہ ان کی مذہبی اور اخلاقی روح کو جگانا تھا۔

مقدمۂ ترجمان القرآن کا ایک ٹکڑا سنیئے جس میں مکافات یعنے جزا اور سزا کے مسئلہ کو سمجھایا ہے اور انصاف سے کہیے کہ اب مولانا آزاد کے زعیمانہ اسلوب میں ایک نیا کلیمانہ آہنگ پیدا ہو گیا ہے یا نہیں۔

تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشہ وجود میں امتیازی قانون مکافات رکھتی ہے ممکن نہیں کہ اس میں تقصیر یا تساہل ہو۔ فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش و تپش فطرت کے وہ مکافات ہوگی جو ہر اس انسان کیلئے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈالے گا ممکن نہیں کہ تم آگ میں کود دو اور اس کے قانون مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے یعنی ٹھنڈک و رطوبت وہ مکافات ہیں جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے اب ممکن

ہیں کہ تم دنیا میں اترو اور اس کے مکافات سے بچ جاؤ پھر جو فطرت کائناتِ ہستی کا ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کیلئے مکافات نہ رکھے یہی مکافات جزا اور سزا ہے۔

آگ جلاتی ہے پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے مُنّھن سے بخار رک جاتا ہے جب اشیاء کی تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا ہے کیوں کہ یہ تمہاری زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے افسوس تم پر تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو۔

تیسرے دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت پر اس کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اسلوب پر گہرا اثر چھوڑا ہے، عمر تجربہ اور قومی زندگی کی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج کی لئے کو تیز تر کر دیا تھا۔ پھر بیس سال تک قرآن مجید کے فہم و تفہیم میں معروف رہنے سے ان کے مذاہب حساس میں جذب پر سلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب کے مطالعہ نے بھی طرف غالباً مولانا نے اسی زمانہ میں زیادہ توجہ کی۔ ان کی فکر اور تحریر میں ضبط اور اعتدال پیدا کر دیا تھا چنانچہ غبار خاطر ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء کے اسلوب میں جو ان کے زمان کا طرز بیان کی پوری نمائندگی کرتا ہے دریا فصاحت کی روانی تو بدستور قائم رہی لیکن روئے دریا کی تیزی و تندی کی جگہ بحر دریا کے جزم و سکون نے لے لی ہے۔ اب فکر کی صحت اور ہمواری توازن نے مولانا کی تحریر میں ادبیان اسلوب کی شان پیدا کر دی ہے جو جدید مغربی ادب میں بہترین انشا پردازوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس عبارت پر غور کیجئے مولانا آزاد نے فرمایا ہے۔

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کر دیتے ہیں وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اسلئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے ہر عقیدے پر عمل ہر نقطہ نگاہ جو اُسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے

ہاتھوں مل گیا ہے اس کیلئے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا پیدا ہوتا ہے موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم و گردوپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔

یہ تو جدید ادیبانہ اسلوب کا سنجیدہ رخ تھا اب اس کے ادبی رنگ اور خوش طبعی کے انداز کو ملاحظہ کیجئے۔

احمد نگر کی اس عمارت میں جس میں مولانا ابو الکلام آزاد پنڈت جواہر لعل نہرو اور دوسرے قومی لیڈر نظر بند تھے۔ اپنے کمرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

گزشتہ سال جب ہم یہاں آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ چند دنوں تک میں نے صبر کیا لیکن برداشت نے صاف جواب دیدیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی تھی۔ میں نے اٹھائی اور اعلان جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفان سقف و بام کا مقابلہ ممکن نہیں اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدے میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا اب کچھ نہ پوچھئے کہ میدان کارزار میں کس زور کا رن پڑا کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ آخر میدان اپنے ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ حریفان سقف و محراب سے بالکل خالی تھا اب دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکھٹی ہو کر میدان کا رخ نہ کرے۔ تجربہ سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزے کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی تھی اسلئے فیصلہ کیا گیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اسے کمرے ہی میں رہنے دیا جائے اب گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھانے کیلئے چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا کیا دیکھتا ہوں سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے۔ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس قدر

بھر پیسہ کیا گیا تھا وہی حریفوں کی کام جوئیوں کا ایک نیا آکہ ثابت ہوا، بانس کا ٹکڑا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا گھونسلے میں جانے کیلئے اب دہلیز کا کام دے رہا تھا تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں پھیلاتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں کہ یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اس ادیبانہ اسلوب میں چونکہ علمی طرز بیان کی بنیادی صفات یعنی فکر کی صحت اور ہمواری اور لفظ و معنی کا توازن موجود ہے اس لئے جب مولانا اسے کسی علمی مسئلہ پر بحث کرنے کیلئے کام میں لاتے ہیں تو یہ آسانی سے حکیمانہ اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مثالیں اس صفت کو نمایاں کرنے کیلئے کافی ہیں جس کی بناء پر مولانا آزاد کو اردو نثر نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل ہے یہ صفت ان کی ہمہ گیر قدرت کلام ہے اس کی بدولت انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی مختلف منزلوں میں خیال اور اظہار کے مختلف طرزوں کو یکساں حسن و خوبی سے برتا۔ اس لئے ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ابوالکلام کا لقب جو انہوں نے اختیار کیا اُن پر اسی طرح سجتا ہے جیسے ان ہی کیلئے وضع ہوا ہو۔

سلسلہ صالک

غرض مولانا آزاد مرحوم ایک جوشیلے مقرر تھے، عالم تھے، سیاستداں تھے، مذہبی رہنما تھے میر کارواں تھے۔ مشعل راہ تھے، آئے دن ان کے تصانیف کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہونے کی ضرورت ہے تاکہ قومی یکجہتی کی افزائش ہو۔

تسنیم فاطمہ برلاس
عثمانیہ یونیورسٹی آف حیدرآباد

مولانا ابوالکلام آزاد

۱

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین بھی تھے۔ اور مجاہد آزادی بھی۔ انھیں قرآن، فقہ، علم الکلام، علم حدیث پر غیر معمولی عبور تھا وہ فلسفی، مفکر اور مدبر بھی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی مولانا کا شمار اردو کے بلند پایہ اعلیٰ انشاء پردازوں میں ہوتا ہے اگر ان کا اسلوب نگارش تھا۔ تو تقریر میں بھی ان کا کوئی ثانی بلند شکل تھا ان جیسے شعلہ نواز اور جادو بیان ہندوستان نے بہت کم پیدا کئے مولانا کی خدمات ماہر تعلیم کی حیثیت سے فراموش نہیں کی جاسکتی غرض مولانا اپنی افتاد طبع ذہانت و فطانت و صلاحیت، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے ایسے انسان جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں شاید ایسے انسان کے تعلق سے خدائے سخن میر تقی میر نے فرمایا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی ان کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گزرا ان کی مادری زبان عربی تھی مولانا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک خاص مذہبی ماحول تھا ان کے والد مولوی خیرالدین ایک بہت بڑے عالم، مذہبی کتابوں کے مصنف جادو بیان واعظ باثر شخصیت اور ایک پیر طریقت تھے۔ وہ علاج کی غرض سے مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لائے اور کلکتہ میں قیام کیا۔ اور یہیں کے ہو رہے مولانا کی تعلیم و تربیت یہیں کلکتہ میں ہوئی ویسے تو مولانا نے عربی فارسی کی تعلیم مکہ معظمہ میں حاصل کی تھی البتہ درس نظامی کی تکمیل کلکتہ میں ہوئی اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذہن رسا ہونے کی وجہ سے بارہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغ پائی۔

مولانا آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ نثر نگاری کی طرف انھوں نے بعد میں توجہ کی۔ دس گیارہ برس کی عمر میں ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور کم و بیش اسی زمانے میں صحافت کی دنیا میں بھی قدم رکھا اور ۱۸۹۹ء میں بمبئی میں کلکتہ سے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا۔ ۱۹۰۰ء میں بمبئی کلکتہ کے ہفتہ روزہ اخبار "المصباح" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے پھر "احسن الاخبار" کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتے رہے۔ خدنگ نظر "الندوہ" "وکیل" وغیرہ کی اشاعت و ادارت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق پیدا کیا۔ اس دور کے بیشتر موقر رسالوں میں بھی ان کا کلام نظم و نثر شائع ہونے لگا۔ لیکن یہ وابستگی ان کے ذوق جمال و جلال کی تشنگی کو سیراب نہ کر سکی اس لیے انھوں نے مختلف اوقات میں تین اپنے رسالے جاری کیے جو ادبی نہیں تھے بلکہ یہ ایک خاص مقصد کیلئے نکالے گئے تھے۔ تین رسالے یہ ہیں ماہانہ "لسان الصدق" ہفتہ روزہ "الہلال" اور پندرہ روزہ "البلاغ" لسان الصدق سر سید کی تہذیب الاخلاق کے طرز پر تھا۔ ہفتہ روزہ الہلال اس دور میں نکالا گیا جب مولانا کی فکر میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی نے علی گڑھ کے طلسم کو توڑا۔ یہ اردو کا پہلا سیاسی، سماجی اور معاشرتی جریدہ تھا جس نے مسلمانان ہند کو بیدار کیا۔ ان کے کانوں میں آزادی کا صور پھونکا۔ اور مسلمانوں کو آزادی کی جد و جہد میں شریک کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس کے مضامین میں سچائی، خلوص، ایمانداری، سنجیدگی، ذہانت، طباعی، خطابت اور مقصد کی عظمت اور مولانا آزاد کی شخصیت کے مکمل اوصاف و خصائص جلوہ فرما تھے۔ مولانا آزاد بنیادی طور پر صحافی تھے وہ صحافت کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ الہلال کی صحافتی تحریروں کا خمار آج تک برقرار ہے یہ اخبار انھوں نے ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اخبار کے اجرا پر کسی صاحب نے مالی معاونت کی پیشکش کی اس پر مولانا نے ۲۷/جولائی ۱۹۱۲ء کے الہلال میں لکھا۔

"جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لئے ایک دھبہ سرتاسر عار ہے۔ اخبار نویسی کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں"

مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک اخبار نویسی مشن تھی اور انھوں نے یہ کام مشنری جذبے ہی سے کیا۔ مولانا نے صحافت کا معیار یہ رکھا تھا کہ جو بات بھی بیان کی جائے وہ علمی و ادبی اصول کے لحاظ سے مسلمہ و دلیل ہو اور اس کو ادب لطیف کے ایسے جامہ میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے کہ قاری کے دل میں اتر جائے مولانا نے اردو صحافت کو کلاسکی کے بلند مقام پر پہونچا دیا انھوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا۔ آزادی اور حریت قوم کے لئے ان کا دل تڑپ اٹھا۔ اور اس تڑپ اور جوش کو انھوں نے "الہلال" میں سمو دیا تاکہ وہ تڑپ ہوا ملک پہونچ کر ان کو بیدار کر سکے۔ اسی تعلق سے محترمہ اعظمی لکھتے ہیں:

"الہلال کیا تھا آزادی فکر و ضمیر کا ایک پیغام تھا اس کے لفظ ایوانوں میں گرمی اور طبیعتوں میں امنگ پیدا کر دی۔ اس کے ہر جملہ میں بجلیوں کی کڑک، بادل کی گھن گرج ندیوں کی سنسناہٹ، سیلاب کی روانی، انقلاب کی گونج اور آزادی کی للکار اور وہ سب کچھ تھا جس کی وقت کو ضرورت تھی۔"

مولانا آزاد ہماری جنگ آزادی کے میر رہے۔ اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے مولانا آزاد نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی تھی اس کی وجہ سے ہماری قومی تاریخ میں ہمیں بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔"

متحدہ قومیت مولانا آزاد کا عقیدہ تھا۔ ان کی سادی زندگی ہندو مسلم اتحاد کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ انھوں نے اس اتحاد کے لیے خود بھی جد و جہد کی اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۵/ دسمبر ۱۹۲۳ء کی سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے مولانا نے کہا "آج اگر ایک فرشتہ آسمانوں بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔"

مولانا آزاد نے ... کم عمری کے زمانے ہی سے اپنی تقریر کے جادو سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا تھا۔ اور عوام و خواص میں ان کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ان کی بے پناہ خطابت تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کی خطابت کے تعلق سے کہا تھا: خدا نے ان کو خطابت کا جوہر دیا تھا اور ایسا جوہر دیا تھا میں اپنی محدود معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں ہندوستان کے باہر شاید دنیا کے کسی ملک میں ایسے آتش نوا اور ایسے شعلہ بیان اور ایسے آتش ریز مقرر پیدا ہوئے ہوں"۔

مولانا آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں، جو ایک کامیاب خطیب کے لئے درکار ہیں۔ طاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثال حافظہ کی نعمت حاصل تھی۔ ان کی تقاریر میں جادو میں اثر آفرینی تھی۔ وہ دھیمی آنچ تھی جو قلب کو آہستہ آہستہ گرماتی ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں ایک یادگار تقریر فرمائی تھی اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گی۔ اس کے عہد شباب میں، میں نے تمہیں خطرے کی ہر راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری روایتیں تازہ کر دیں"

ابوالکلام آزاد اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کے موجد ہیں یہ اسلوب سرسید کے طرز سے یکسر مختلف ہے۔ سرسید نے جس اسلوب سے بغاوت کی تھی اور جس کو انھوں نے نکال باہر کیا تھا۔ ابوالکلام نے اس کی از سر نو تجدید کی۔ انھوں نے وہی عالمانہ انداز اختیار کیا جو سرسید سے قبل رائج تھا۔ لیکن ایک میں فرق کے ساتھ۔ اس میں انھوں نے دریا کی سی روانی، جوش اور خطیبانہ انداز کو شامل کر دیا۔ اور اس کے خمیر میں مقصدیت کا غالب کر کے ایک نیا اسلوب تیار کیا۔ یہ مقصدیت انھوں نے سرسید سے مستعار لی ان کی پرجوش فکر اور پرعظمت تحریریں دلوں کو گرماتی ہیں

جتنا ہمسر سکی نرم و نازک نیک سید ہمی سادی اور سلیس تحریریں ۔

مولانا آزاد اپنے عہد کے سب سے نمایاں اور فعال ادیب تھے اس لیے اُن کی تحریروں میں ان کے عہد کی اس کیفیت کا انعکاس سب سے زیادہ پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود خود کو سب سے بلند رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ غبارِ خاطر کے خطوط میں بظاہر لہجہ خود کلامی کا ہے مگر اندرونی تہوں میں گرد و پیش اور ہر طرف سے تکتی ہوئی گھورتی ہوئی نگاہوں کا احساس پنہاں ہے۔ انھوں نے خود کو ایک روحانی ہیرو کے روپ میں پیش کیا جو ناکامیوں، محرومیوں اور ناشناسائوں کے ہجوم میں لعنت اور ملامت کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود ان ہی سے مخاطب ہے وہ تنہا ہے مگر یہ تنہائی ہجوم میں ہی چمکتی ہے وہ خاموش ہوتے ہیں تو اس لیے کہ محشر میں ان کی خاموشی ہی الگ دکھائی دیتی ہے اور سب کچھ کہہ جاتے۔ اور یہی ان کی نثر کا وہ جوہر ہے جو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

مولانا آزاد کے مکاتیب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جزئیات نگاری اور منظر نگاری پر پوری قدرت حاصل تھی۔ غبارِ خاطر کے زیادہ تر خطوط انشائیہ کی تعریف میں آتے ہیں۔ انشائیہ نگار ایک ذی فہم تماشائی اور حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا تماشا کھلے ذہن اور روشن آنکھوں سے کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بنیادی طور پر اپنے رویہ مزاج اور طرزِ فکر میں منفرد ہوتا ہے۔ وہ کبھی اشیاء اور حقائق کو صوفی کی نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی فکر میں ڈوب کر زندگی کے مختلف گوشوں میں حسن و رعنائی کی تلاش کرتا ہے۔ کبھی اپنے مثبت رویہ اور عارفانہ بصیرت سے زندگی کی تلخیوں، پریشانیوں اور دشواریوں کو آسان اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔ کبھی خیال اور جذبہ کا یہ امتزاج مناظر فطرت کی پیکر تراشی کرتا ہے اور انھیں متحرک بنا کر نظروں کے سامنے لے آتا ہے۔ مولانا کے ہاں ایسے ہی ایک منظر کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے اِحاطہ کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے

اور سمندر کو بخود کر رہے تھے تاکہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلا رہے۔

یا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

صبح جب فضا شیر بکھرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں سے ہی ان کا نظارہ نہیں کیا جائیگا بلکہ دیمغانوں کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کرینگی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے اور کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارہ حسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف گرد و پیش میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی نثری شاعری میں ہر دو تین جملوں کے بعد ایک شعر یا مصرعہ کی خوبصورتی سے ٹانک دیتے ہیں۔ یہ شعر عموماً عربی، فارسی اور اُردو کا ہوتا ہے مگر اس شعر کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایسا بر محل اور برجستہ ہوتا ہے کہ گویا مضمون نگار نے عبارت کو زیادہ پر اثر اور رنگین بنانے کے لئے خود ہی شعر کہہ دیا ہے یا یہ شعر صرف اسی موقع و محل کے لئے کہا گیا تھا۔ ابوالکلام کی نثر دیکھنے کے بعد نظم میں کچھ مزہ نہ رہنے کی کیفیت اسی اسلوب شاعرانہ کی رہین منت ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد "غبار خاطر" کے اسلوب کے متعلق یوں رقمطراز ہیں

"میں مولانا کی ادبی تحریروں میں غبار خاطر کو گل سر سبد سمجھتا ہوں۔"

مولانا کی شخصیت اور ادبی افکار کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ وہ ایک ایسا بے کنار سمندر ہیں جن کی آغوش میں معلوم نہیں کتنے دریاؤں نے روانی سیکھی۔ ادب، سیاست، مذہب سماجیت، تنقید یہ سب ان کے سمندر کی لہریں ہیں لطف یہ ہے کہ ان سب موضوعات میں ان کا مخصوص اندازِ نگارش نمایاں ہے۔

غلام نبی مومن

مولانا ابوالکلام آزاد

شخصیت و کردار

انیسویں صدی میں عالم اسلام میں دو عہد ساز شخصیتوں نے جنم لیا۔ ایک سید جمال الدین افغانی اور دوسرے شیخ محمد عبدہٗ ۔ دونوں کا مقصدِ حیات غلبہ و استیلا اسلام تھا لیکن ایک ہی نورِ ہدایت سے مستنیر ہونے کے باوجود دونوں کا طریق کار جداگانہ تھا۔ افغانی عملی جدوجہد کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر میدانِ سیاست کو جولانگاہ بنایا اور صحافت کو آلۂ کار۔ عالم اسلام کی پستی اور زوال کو موصوف سیاسی اقتدار کے ذریعے عروج واقتدار سے بدلنا چاہتے تھے جبکہ شیخ محمد عبدہٗ نے جو سید افغانی ہی کے دوستوں اور خوشہ چینوں میں تھے مسندِ ارشاد وہدایت کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کرنا چاہا جس کا زندہ ثبوت ان کے تحریری شاہکار اور شاگرد رشید سید رشید رضا مصری صاحب المنار ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندستانی مسلمان ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی سے آشنا ہوئے جو بقول ڈاکٹر سید محمود متذکرہ بالا دونوں عبقری شخصیات کا نچوڑ تھی یعنی مولانا ابوالکلام آزاد جو ہندستان کے صفِ اول کے سیاسی لیڈر بھی تھے اور زبردست عالم دین بھی (۱) انسانی شخصیت کی تعمیر میں خاندان، تعلیم اور ماحول زبردست کردار ادا کرتے ہیں۔ مولانا ایک ایسے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس میں معروف اور حق گو علماء کی کمی نہ تھی۔ شہنشاہ اکبر کا محضر امامت پر دستخط نہ کرنے والے علماء میں مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی، مولانا آزاد کے اسلاف ہی میں سے ہیں (۲) آپ کے والد مولانا خیر الدین ایک بے باک 'حق گو' فیاض صفت' نفاست پسند' پابندِ نظم وضبط لیکن روایت پرست اور سخت حنفی عالم دین تھے

ریسرچ اسکالر و ہیڈ ماسٹر ۔ اینگلو اردو ہائی اسکول ۔ بیرل دراۓ گڑھ ۴۸۵۱۵۱

وہابیت کے سخت مخالف اور اپنے عقائد میں انتہائی متشدّد اور بے لچک تھے۔ مولانا خیرالدین کے والد شیخ محمد ہادی کا انتقال جوانی العمری میں ہوگیا تھا اس لئے ان کی پرورش ان کے نانا مولانا منورالدین نے کی جو بقول مولانا آزاد سلطنتِ مغلیہ کے آخری "رکن المدرسین" تھے اور ہندستان چھوڑ کر مکّہ میں جا بسے تھے۔ وہیں انہوں نے مولانا خیرالدین کی شادی شیخ محمد ظاہر وتری، مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی سے کردی۔ مولانا آزاد نے اپنے آبائی مکان محلہ قدوہ، متصل باب السلام مکّہ میں ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ بمطابق اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء میں آنکھ کھولی۔ گھریلو نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا، کنیت ابوالکلام اختیار کی۔

مولانا آزاد کی ابتدائی تعلیم مکّہ میں گھر پر شروع ہوگئی تھی۔ اسی دوران ان کے والد کی کہیں گر پڑنے کے سبب بائیں پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مکہ میں علاج کا معقول بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے کلکتہ آگئے جہاں ان کے معتقدین اور مریدین کی کافی تعداد تھی جن کے بے حد اصرار پر موصوف کلکتہ ہی میں مقیم ہوگئے۔ مولانا آزاد نے اپنے والد سے اردو، فارسی اور فقہ کی تعلیم کی۔ بعد میں طب بھی پڑھی۔ مولوی یعقوب سے جو ان کے والد کے خاص مرید تھے عربی اور منطق سیکھی۔ مولانا نے بعد میں انگریزی بھی سیکھی اور اس میں اتنی دستگاہ پیدا کرلی کہ بہت سی اہمات کتب کا مطالعہ کرسکیں۔ آپ نے چند سائنسی اصطلاحات کے ترجمہ پر اصلاحات کی ہیں جس سے انگریزی اور لاطینی اصطلاحات پر ان کے تبحّر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ علوم و فنون کے فطری شوق لطائفِ فنّی سے طبعی مناسبت ہونے کی بناء پر مولانا کو فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی سے فطری لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ والد کے حلقۂ ارادت میں ہر فن کے لوگ تھے۔ مولانا نے ان کے ایک مرید میتا خاں سے چوری چھپے ستار بجانا سیکھا۔ لکھنؤ میں مرزا رسوا (مصنف "امراؤ جان ادا") سے موسیقی کا درس لیا۔ مصر کے دورانِ قیام بھی آپ نے اس کی مشق کی۔ موسیقی کے تعلق سے مولانا اپنے محبوب ترین دوست نواب حبیب الرحمن خاں شروانی صاحب ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے" (۳)

مولانا کے والد انہیں اکیلے گھر کے باہر جانے نہیں دیتے تھے اور مولانا کو کھیل کود سے دلچسپی نہیں تھی اس وجہ سے ان کا سارا وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ مطالعے کا شوق اتنا گہرا تھا کہ وہ اپنا جیب خرچ بھی کتابوں کی خریداری پر صرف کر ڈالتے تھے۔ ابتدائی تعلیم والد کی سختی کی وجہ سے صرف نصابی کتابیں پڑھا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ غیر درسی کتابیں بھی چوری چھپے پڑھنے لگے۔ خاندانی جکڑبندیوں کے خلاف اسے ان کا پہلا غیر شعوری ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔ جب مولانا کی دینی تعلیم مکمل ہو گئی اور غیر نصابی کتابوں کے مطالعے کی پابندی اٹھ گئی تو ہر طرح کی کتابیں پڑھنے لگے۔ سرسید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" اور مولوی عبدالحکیم گورکھپوری کی تحریروں سے ان کے مذہبی عقائد پر کاری ضرب لگائی۔ بچپن کی خاندانی جکڑبندیوں، تقلید و روایت پرستی اور پیری مریدی کے ماحول نے انہیں ہر طرح کی غلامی سے متنفر کر دیا اور حریتِ فکر ذہن و طبع میں راسخ ہو گئی۔ نتیجہ آزاد خیالی بشمول ملک و قوم کے لئے سیاسی آزادی حاصل کرنے کی تڑپ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب آپ کی آزاد فکری الحادی عقائد کی حد کو چھونے لگی تھی لیکن ذوقِ سلیم نے رہنمائی کی اور قرآن سے گہرا شغف انہیں دوبارہ راہِ مستقیم پہ لے آیا۔ اس کے بعد دین کے راستے سے سیاسی آزادی کا حصول ان کا مقصدِ حیات بن گیا۔ مولانا نے "حزب اللہ" تحریک شروع کی جو بظاہر مذہبی لیکن حقیقتاً سیاسی تھی۔ وہ جب کسی سے بیعت لیتے تو اسے سیاسی آزادی حاصل کرنے اور سودیشی تحریک میں شامل ہونے کی تلقین کرتے۔ مولانا کی آزاد خیالی ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی کیونکہ بمبئی کے دورانِ قیام انہوں نے عیسائی پادریوں سے بحث و مناظرہ کی خاطر انجیل کا مطالعہ کیا۔ آریہ سماجیوں سے بھی مباحثے کئے۔ ان مباحثوں نے مولانا کے شوقِ مطالعہ کو مزید بڑھایا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا کو اختلافِ مذاہب اور علومِ متداولہ پر کامل دستگاہ حاصل ہو گئی۔ مذہب، ادب، سیاست، فلسفہ، منطق وغیرہ خصوصی عناوین مطالعہ تھے۔ مذاہب کے تقابلی مطالعے نے وحدتِ دین کے بجائے مولانا کو وحدتِ ادیان کے تصور سے قریب تر کر دیا جیسا کہ ترجمان القرآن (جلد اول) میں وحدتِ دین پر کی گئی بحثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے مولانا کو وسیع المشرب بنا دیا جس کی زندہ مثال "سرمد" پر لکھا ہوا مضمون ہے جس میں وہ اورنگ زیب کے مقابلے میں دارا شکوہ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی بات اعتراف کرتے ہیں کہ اس نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ ساتھ ہندو درویشوں کے سامنے بھی

اور تحقیق کی جستجو کی۔ فطری آزاد خیالی اور وسیع مطالعہ کی بنا پر مولانا روایت شکن ہوگئے اور نہ صرف مذہبی معاملات میں عدم تقلید کی روش اپنائی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں بقول خود عام ڈگر سے ہٹ کر الگ اپنی راہیں نکالیں۔

مولانا آزاد اپنے عہد کی دیگر ادبی شخصیتوں سے بھی متاثر ہوتے تھے جن میں مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد قابل ذکر ہیں۔ مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی کی تشویش پر مولانا نے شاعری کا آغاز کیا۔ چونکہ فی البدیہہ اشعار کہا کرتے تھے جو ادب عالیہ کے اسلوب اور تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے اس لئے آپ نے جلد ہی شاعری ترک کردی۔ مولانا شاعری میں روایتی انداز بیان، بندش الفاظ اور رعایت لفظی کی حدوں سے آگے نہیں بڑھ پائے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ (۴)

کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہوگیا
اس کے اٹھتے ہی دِگرگوں رنگِ محفل ہوگیا

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشا ہے یاں
میں تو بھولوں نہ کبھی انکو کبھی یاد نہ ہو

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

مولانا کی سحر انگیز شخصیت کا ایک پہلو ان کا فنِ خطابت تھا۔ وہ اپنی تقریروں سے مجمع کے ذہنی دھارے کو بڑی آسانی سے موڑ دیا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس تھا جس میں طے کیا جانا تھا کہ یونیورسٹی، برطانوی حکومت کی شرائط پر منظور کی جائے یا نہیں (۵) بعض لوگ حکومت کے اشارے پر یونیورسٹی کے مجوزہ ڈھانچے کو منظور کرلینا چاہتے تھے لیکن مولانا کی مخالفانہ تقریر کے بعد ہوا کا رخ بدل گیا اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ حکومت کی شرائط پر یونیورسٹی منظور نہ کی جائے۔ تقریروں کے ساتھ اکثر تحریروں میں بھی خطابت ہی کا رنگ غالب ہے جس کی نمایاں مثال "الہلال" اور "البلاغ" کے مضامین کے علاوہ آپ کی نادرۂ روزگار خود نوشت سوانح "تذکرہ" ہے۔

عفو و درگزر آپ کا وصفِ خاص تھا۔ ایک بار علی گڑھ اسٹیشن پر چند طلبہ نے آپ کے ساتھ نازیبا سلوک کیا تو آپ نے اسے نظر انداز کردیا۔ اگست ۱۹۴۰ء میں یحییٰ اعظمی کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "علی گڑھ کے اسٹیشن پر چند طلبہ کا جو طرزِ عمل رہا تھا اس کا

ان کی نادانی پر محمول کیجئے اور انہیں بخش دیجئے۔ اسکی ذمہ داری ان پر نہیں ہے، ان کا الزام ان پر ہے جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔" (۷) مولانا نہ کسی کو برا بھلا کہتے اور غصے کا اظہار کرتے اور نہ ہی انتقام لیتے۔ مخالفین پر طنز تو کر لیتے لیکن ملعون نہیں کہتے تھے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ان سے کسی دشمن کی برائی کرتا تو مولانا اس کی کوئی خوبی بیان کر دیتے یا تعریف کر دیتے۔ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن میں جب مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو لوگوں کا اندازہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کو برا بھلا کہیں گے لیکن ان کی زبان سے پہلا فقرہ یہ نکلا "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے" (۸)

مولانا کے کردار کی ایک عظیم خوبی ان کی خودداری تھی۔ جب آپ نے "الہلال" جاری کیا تو ایک والئ ریاست نے ایک خاص رقم کا چیک بطور عطیہ بھیج دیا۔ مولانا نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور اپنے خط میں لکھا کہ انہوں نے صرف اللہ کے فضل و کرم کے اعتماد پر اخبار جاری کیا ہے (۱

مولانا نے سخت آزمائشوں میں بھی دستِ سوال دراز نہیں کیا نہ ہی عزیز ترین دوستوں کو خبر ہونے دی۔ رانچی میں نظر بندی کے دوران بڑی عسرت کی زندگی بسر ہو رہی تھی ڈاکٹر انصاری نے بڑے اصرار کے ساتھ مدد کرنی چاہی۔ منت سماجت بھی کی لیکن آپ نے ان کی مدد قبول نہیں کی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو مولانا سے بہت قریب تھے، اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ ۲۴-۱۹۲۳ء میں مولانا انتہائی عسرت میں مبتلا تھے۔ وہ قیمتی سے قیمتی سگریٹ پینے کے عادی تھے لیکن اس زمانے میں سستے سگریٹ پر بھی قناعت کر لیتے اور ہشاش بشاش رہتے تھے ان ہی دنوں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد سبحانی ان کے مہمان ہوئے تو مولانا نے قرض لیا لیکن خاطر داری میں کمی نہ آنے دی اور نہ ہی ان لوگوں کو اپنی تکلیف کی خبر ہونے دی۔ ان دنوں کلکتہ سے باہر آنا جانا بھی کم کر دیا تھا لیکن جب کبھی باہر نکلتے تو ٹیکسی میں یا ٹرین کے فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ ٹرام میں سفر کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ (۹)

مولانا آزاد کی ہمہ جہتی شخصیت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی مقصدِ حیات کو سمجھ لیا تھا جسکے جاری کرنے کے لئے جسم اور فکر دونوں کی آزادی ضروری ہے۔ فکر کی آزادی نے انہیں آبائی تقلید کی لاش چھوڑنے پر مجبور کیا اور جسمانی آزادی کا حصول سیاسی آزادی سے وابستہ تھا اس کے لئے انہوں نے وطن کی آزادی کو نہ صرف اپنا نصب العین بنایا بلکہ ہندستان میں رہنے والے ہر مسلمان

کے لئے ضروری قرار دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ حصولِ آزادی کے لئے ملک کی تمام قوموں میں اتحاد ضروری ہے اس احساس نے ان کے ذہن میں متحدہ قومیت کا خیال پیدا کیا۔ اگرچہ یہ نظریہ سرسید کے نظریہ کے خلاف تھا جن سے وہ قدرے متاثر تھے لیکن جب انھوں نے سمجھ لیا کہ ہندستان کی آزادی کا انحصار اسی نظریہ کو تقویت پہنچانے میں ہے تو اپنی تمام عالمانہ اور صحافتی توانائی اسی نظریہ کی تبلیغ پر لگا دی۔

مولانا نے صحافتی زندگی کا آغاز گیارہ سال کی عمر میں "نیرنگِ عالم" نامی گلدستہ کے اجراء سے کیا تھا جو آٹھ مہینے بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں "المصباح" کے مدیر مقرر ہوئے جو تین چار مہینے جاری رہا لیکن جب ۱۹۰۱ء میں آپ کا تعلق "احسن الاخبار" سے ہوا جہاں مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، الجزائر وغیرہ سے تبادلے میں اخبارات و رسائل آتے تھے تو ان اخبارات کے مطالعے نے مولانا میں عالمِ اسلام کے مسائل سے دلچسپی پیدا کی — ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولانا نے اپنا اخبار "لسان الصدق" جاری کیا جو جلد ہی بند ہوگیا۔ بعد میں مولانا شبلی کے ایماء پر "الندوہ" کی ادارت سنبھالی جس میں شائع شدہ اپنے مضامین کی وجہ سے وہ ملک میں ایک مذہبی و علمی شخصیت کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں "وکیل" امرتسر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں بھی انہیں صحافتی تجربات حاصل ہوئے۔ اسی دوران تقسیم بنگال کے واقعہ اور اس کے اثرات نے مولانا کے افکار و خیالات میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ مشہور انقلابی شیام سندر چکرورتی کے توسط سے انقلابی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ان کے بدلے ہوئے خیالات سے "وکیل" کے مالک غلام محمد متفق نہ تھے اس لئے مولانا کو ۱۹۰۸ء میں اخبار سے تعلق توڑ لینا پڑا۔ اسی دوران مولانا عراق و مصر اور فرانس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں مختلف انقلابی پارٹیوں کے رہنماؤں سے ملنے پر ان کی سیاسی فکر میں مزید پختگی آگئی۔ مولانا نے مصری اخبارات، سید افغانی کے افکار، مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک اور رشید رضا کی تحریروں سے متاثر ہوکر ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے اپنا ذاتی ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا اور "حزب اللہ" تحریک شروع کی۔ اس کے بعد مولانا کی تمام تحریروں، تقریروں اور تحریکوں کا بس ایک ہی مقصد رہا یعنی ملک و قوم کو سیاسی غلامی سے نجات دلانا۔ مولانا نے شدید مخالفتوں اور مصیبتوں کے باوجود اپنی فکر اور مسلک سے انحراف نہیں کیا یہاں تک کہ احمد نگر جیل کی قید کے دوران شریکِ حیات کی شدید علالت اور موت کی خبر ملنے

کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر جنبش نہ ہوئی فرنگیوں سے رحم کا مطالبہ کرنا ان کی خود طبیعت اور مسلک کے خلاف تھا۔

مولانا کو سیاسی سرگرمیوں اور تصنیفی کاموں کے لئے بے فکری کا جو ماحول ملا وہ ان کی رفیقۂ حیات زلیخا بنت آفتاب الدین کی بدولت میسر آیا تھا۔ زلیخا بیگم نے ہجر کی سختیاں اور مالی صعوبتیں برداشت کیں لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب مولانا پہلی بار گرفتار ہوئے تھے تو موصوفہ اپنی طبیعت کے اضطراب کو روک نہیں پائی تھیں جس کے نتیجے میں مولانا ایک عرصہ تک ناخوش رہے لیکن اس واقعہ کے بعد موصوفہ نے پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے لیکن اظہار ملال سے مولانا کو کبیدہ نہیں ہونے دیا۔ مولانا کی طبیعت میں سنجیدگی و متانت تھی اور قوتِ فیصلہ میں عزم واستحکام۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی فیصلوں میں انہوں نے اپنے جذبات کو کبھی حاوی نہ ہونے دیا۔ تلخ ترین مباحثوں میں بھی نہ انہیں کبھی غصہ آیا نہ کوئی غلط لفظ زبان سے نکلا اور نہ ہی انہوں نے کسی پر الزام تراشی کی۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ شرافت قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔

مولانا کی طبیعت میں ترک واختیار کی عجیب وغریب صلاحیت تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جب علی پور جیل میں قید تھے تو وہاں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔ سگریٹ کے بے حد شائق ہونے کے باوجود یہاں آپ نے دو برس تک سگریٹ نہیں پیا لیکن رہا ہوتے ہی پھر پینی شروع کردی۔ مولانا عمدہ غذا پسند کرتے تھے لیکن حالات اور وقت نے خورد ونوش کے جو انداز دکھائے اسے بغیر کسی ناگواری کے قبول کرلیا۔ بچپن میں مولویانہ خاندانی لباس پہنا کرتے تھے جس میں آپ بالکل شہزادے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن بعد میں سرسید کے زیر اثر یوروپی طرز کا لباس پہننے لگے لیکن کانگریس میں شامل ہونے کے بعد سودیشی تحریک کے زیر اثر کھدر استعمال کرنے لگے تھے حالانکہ کھدر کی شیروانی انہیں تکلیف دیتی تھی۔ اس طرح مولانا نے اپنی کسی علت یا عادت کو پختہ ہونے نہیں دیا بلکہ جب چاہا کسی بھی عادت کو ترک کردیا اور جب چاہا اختیار کرلیا۔ (۱۰)

مولانا کی شخصیت کو پراسرار اور دلکش بنانے والی چیز ان کی تنہائی پسندی اور عوام سے دور رہنے کا رجحان تھا۔ ان کی کم آمیزی اور عزلت گزینی کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ بچپن میں والد کے مریدین از راہِ تعظیم ان کے سامنے بھی ہاتھ باندھ کھڑے رہتے تھے۔ اس ماحول سے نکل کر

جب اپنی دنیا میں آئے اور قرآن و احادیث کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو انہیں شخصیت پرستی کے تمام مظاہر سے نفرت سی ہوگئی۔ اسی لئے وہ شخصیت پرستوں، عقیدت مندوں سے دور دور رہنے لگے لیکن سیاسی مصلحتوں کی بناء پر جب بیعت لینی شروع کی تو بھی پیری مریدی کے مروجہ طریقے کو اختیار نہیں کیا بلکہ دین کے راستے سے مسلمانوں کو سیاسی راہ پر لگانے کی کوشش کی۔ عوام کی نفسیات یہ ہے کہ جس شخصیت کے بارے میں انہیں کم سے کم معلوم ہوتا ہے اور جو ان کی دسترس سے دور ہوتی ہے اس کی طرف کھنچتے ہیں اور جو آدمی آسانی سے ہاتھ آجاتا ہے اسکی قدر نہیں کرتے مولانا عوام کی اس نفسیات سے واقف تھے۔ ممکن ہے اس وجہ سے بھی وہ عوام سے دور دور رہتے رہے ہوں۔ مولانا کی خلوت نشینی کی تیسری اور میری نظر میں سب سے اہم وجہ ان کا فنکارانہ ذہن ہے۔ انہیں سبھی فنونِ لطیفہ سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ نہ صرف سخن فہم اور ادب کے جوہر شناس تھے بلکہ خود بھی شاعر، صاحب طرز ادیب اور انشاپرداز تھے۔ موسیقی سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ حکومتی پالیسی کے علاوہ غالباً یہ سبب بھی ہے کہ آزادی کے بعد جب مولانا وزیر تعلیم تھے تو آپ نے وزارت تعلیمات کے سنگیت ناٹیہ اکیڈیمی اور للت کلا اکیڈیمی قائم کی اور ساہتیہ اکیڈیمی قائم کرنے کی ترغیب دی۔ مولانا کو تصنیف و تالیف سے ایسی دلچسپی تھی کہ اگر سیاسی مصروفیتیں نہ ہوتیں تو وہ صرف اسی ایک کام کے ہوکر رہ جاتے۔ سیاسی مصروفیات کے باوجود انہوں نے قید و تنہائی کا فائدہ اٹھاکر بڑی بیش بہا تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں ترجمان القرآن، تذکرہ اور غبارِ خاطر امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کی خودداری، خودپرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی اس لئے وہ تنہائی میں اپنے تخیلات کی انجمن آراستہ کئے رہتے جہاں انہیں سکونِ قلب حاصل ہوتا۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں ہی وہ عوامی جلسوں سے خطاب کیا کرتے تھے اس کے برعکس مخصوص نشستوں میں اپنے جذبات کھل کر بیان کرتے تھے۔ اسی لئے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے "مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریقِ دعوت کے بجائے آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ (۱۱)

مولانا اپنے ارادوں میں اٹل اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ ہر حال میں اپنے اصولوں اور اپنی رائے پر قائم رہتے تھے۔ ہندستان کی تقسیم کو وہ اصولی طور پر غلط سمجھتے تھے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے راضی ہوجانے کے باوجود وہ اپنی رائے پر جمے رہے۔ مولانا جب کسی چیز کی افادیت

کو سمجھ لیتے تو اس پر مزور عمل کرتے ۔ مثال کے طور پر مصر و فرانس کے دورے میں فرانسیسی زبان و ادب کی اہمیت کا احساس ہوا تو آخر عمر تک فرانسیسی ادب سے ان کی دلچسپی قائم رہی (۱۲)

مولانا آزاد کی شخصیت ان کے خاندانی ماحول اور تعلیم سے یکسر مختلف بلکہ متضاد تھی جس کی بنیادی وجہ ان کے ذہن و مزاج کی فعالیت ہے ۔ وہ متاثر ہونے کے بجائے متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اسی صلاحیت میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے ۔

حوالے

۱ ۔ " اظہار عقیدت " ڈاکٹر سید محمود (ماہنامہ " آج کل " دہلی مولانا آزاد نمبر ۱۹۵۸ء)

۲ ۔ تذکرہ — مولانا ابوالکلام آزاد ۔

۳ ۔ غبار خاطر ——— " " "

۴ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعری — عبدالغفار شکیل (سہ ماہی " اردو ادب " علی گڑھ آزاد نمبر)

۵ ۔ آثار ابوالکلام — قاضی عبدالغفار

۶ ۔ مولانا آزاد کے چند خطوط (ماہنامہ " آج کل " دہلی ، مولانا آزاد نمبر ۱۹۵۸ء)

۷ ۔ آثار ابوالکلام ۔ قاضی عبدالغفار

۸ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد — فکر و فن — ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

۹ ۔ مولانا آزاد فقر و فاقہ میں " — مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (ماہنامہ " آج کل " دہلی آزاد نمبر ۱۹۵۸ء)

۱۰ ۔ مولانا مرحوم کی طرز زندگی " — محمد اسمٰعیل خاں (سہ ماہی " اردو ادب " علی گڑھ آزاد نمبر)

۱۱ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد " — رشید احمد صدیقی (ماہنامہ " معارف " دسمبر ۱۹۵۸ء)

بقیہ سلسلہ صفحہ ۹۳ بقیہ [illegible]

کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے مولانا آزاد کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے یا کم از کم ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی جو اس سلسلہ میں عملی کام انجام دے رہی ہے اس کی مالی سرپرستی کی جائے تاکہ سوسائٹی یہ کام وسیع پیمانے پر انجام دے سکے ۔

سید یوسف حسین
معتمد ماکامس و رکن نیشنل کمیٹی
مولانا آزاد صد سالہ تقاریب
حکومت ہند

ماکامس

مولانا ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی

مولانا ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی شہر حیدرآباد میں ۱۹۷۷ء سے قائم ہے۔ اس سوسائٹی کی جانب سے مولانا کی تعلیمات ان کے لازوال خدمات و قومی یکجہتی کے استحکام کے علاوہ فنی تربیتی ادارہ بھی چلایا جارہا ہے، جسکی تفصیلات علحدہ منسلک ہیں۔ یہ سوسائٹی صرف ادبی سماجی و صنعتی تربیتی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، جس کا مقصد مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی کرنا و مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ہر ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔

جدوجہد آزادی کے صف اول کے رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کی مستقل و موزوں یادگار قیام کے لئے "ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی" ایک عرصہ دراز سے متواتر جدوجہد میں لگی ہے۔ مالی و دیگر دشواریوں کے باوجود سوسائٹی کی جانب سے ایک چھوٹا سا صنعتی تربیتی ادارہ "ماکامس ٹریننگ سنٹر" ۸ رجون ۱۹۸۱ء کو قائم کیا گیا۔

اس ٹریننگ سنٹر کے قیام کا بنیادی مقصد کم تعلیمیافتہ نوجوانوں کو ہنر مند بنانا اور ان کیلئے روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے تاکہ وہ محنت کے ذریعہ عزت کی روٹی کما سکیں۔ ٹریننگ کے پہلے بیاچ کا افتتاح شہر کے ممتاز انجنیئر جناب سید عبدالولی قادری صاحب نے کیا۔ اس وقت ٹریننگ سنٹر میں سروے، پلمبنگ اور کارپینٹری کے شعبہ جات قائم ہیں۔ ان میں ساٹھ (۶۰) طلباء زیر تربیت ہیں۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے ٹریننگ شفٹ سسٹم دیجاتی ہے۔ ان تینوں شعبہ جات کے لئے ماہر اور تجربہ کار اساتذہ کی خدمات سے استفادہ کیا جارہا ہے۔

ٹریننگ سنٹر کے قیام سے آج تک ۳۰۰ تین سو سے زائد بے ہنر نوجوان عملی طور پر صنعتی تربیت پا چکے ہیں اور مختلف مقامات پر محنت کے ذریعہ اپنا روزگار آپ کما رہے ہیں۔ اور بہت سے نوجوان بیرونی ممالک میں ملازمت حاصل کر چکے ہیں۔ شعبہ مروسے کے طلباء کو بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے منعقد ہونے والے سرکاری امتحان میں شریک کروایا جاتا ہے۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ نان ریزیڈنشیل انوسٹمنٹ کارپوریشن حکومت آندھرا پردیش نے ہمارے ٹریننگ سنٹر میں تربیت حاصل کرنے والے طلباء کو مفت بیرونی ممالک میں روزگار مہیا کرنے سے اتفاق کر لیا ہے۔

یہ ٹریننگ سنٹر شہر کے ممتاز انجینئر صاحب جناب سید عبدالولی قادری صاحب کی زیر صدارت چلایا جا رہا ہے جبکہ اس ادارہ کو جناب قدیر زماں اور جناب اسداللہ سعید، آئی اے ایس کی سرپرستی اور علمی ہمدردیاں حاصل ہیں۔ چھ سال کے کامیاب تجربہ کے بعد ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی نے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ اس ادارہ کو وسیع تر بنیادوں پر چلایا جائے۔

امسال سارے ملک میں (۱۱ نومبر ۱۹۸۸ء تا ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء) مولانا آزاد کی صد سالہ تقاریب عظیم الشان پیمانہ پر منائی جا رہی ہیں۔ مولانا آزاد نے ملک کے پہلے وزیر تعلیم و سائنسی تحقیقات کی حیثیت سے ملک میں پھیلی ہوئی بیروزگاری اور نوجوانوں کو ہنرمند بنانے اور ملک کی صنعتی ترقی کے پیش نظر ہر ضلع و تعلقہ کی سطح پر پالی ٹکنک اور آئی ٹی آئی کے قیام کا جو فیصلہ کیا تھا وہ یقیناً مولانا آزاد کی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا۔

مولانا آزاد کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر انہیں بہتر انداز میں خراج عقیدت پیش کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم ان کے نام سے چلائے جانے والے فنی ادارہ کو مستحکم کریں تاکہ مولانا آزاد کی مستقل یادگار باقی رہ سکے۔

ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں ہے اس کو جاری رکھنے اور پروان چڑھانے کے لئے مستقل طور پر جدوجہد اور کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ سوسائٹی کے پاس ایسے کوئی ذرائع نہیں ہیں جن سے

اس سنٹر کے تمام اخراجات کی پابجائی ہوسکے۔

اس موقع پر مولانا آزاد کی مستقل یادگار کے قیام کے لئے سوسائٹی کی جانب سے جو نمائندگی کی وہ درج ذیل ہے۔

۱) پروفیسر رشید الدین خاں سابق ایم پی کی زیر قیادت سوسائٹی کے ایک وفد نے آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملاقات کر کے اس بات کی پُر زور گذارش کی کہ حیدرآباد میں قائم ہونے والی مرکزی یونیورسٹی کو مولانا آزاد کے نام سے موسوم کیا جائے لیکن حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی توجہ نہیں کی۔

۲) مولانا آزاد کے قومی و تعلیمی خدمات کے پیش نظر سوسائٹی نے اس وقت کے وزیر تعلیم پروفیسر نورالحسن اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے شخصی طور سے ملاقات کی اور ایک تفصیلی یادداشت کے ذریعہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش ۱۱ نومبر کو محکمہ تعلیمات حکومت ہند کی جانب سے "نیشنل ایجوکیشن ڈے" قرار دینے کی درخواست کی گئی۔ یہ مطالبہ ۱۹۷۵ء سے آج تک جاری ہے۔ صدر، نائب صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، تمام مرکزی وزراء و اراکین پارلیمان بشمول اپوزیشن قائدین کو طویل عرصہ میں آٹھ سو یادداشتیں روانہ کی گئیں۔ ۱۷ اراکین پارلیمان نے اس تجویز سے اتفاق کر کے وزیر اعظم کو سفارش کرتے ہوئے اس مطالبہ کی بھرپور تائید کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقاریب کمیٹی نے تحریری طور پر اس بات کا تیقن دیا کہ اس مسئلہ کو نیشنل کمیٹی سے رجوع کیا گیا ہے اور ۱۱ نومبر سے قبل اعلان کر دیا جائے گا۔ اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ جناب راجیو گاندھی وزیر اعظم کی زیر صدارت وسیع بنیادوں پر ایک قومی کمیٹی برائے مولانا آزاد صد سالہ تقاریب تشکیل دی گئی جس کی جانب سے صرف ایک سرکاری جلسہ کے اور کوئی پروگرام نہیں کیا گیا۔ اور نہ مولانا آزاد کی یادگار کے طور پر تعلیمی یا تحقیقی پراجکٹ کا اعلان کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی نے وزیر اعظم سے اس بات کی خواہش کی کہ مولانا آزاد صد سالہ تقاریب کے پرمسرت موقع پر کم از کم اقلیتوں کی فلاح و بہبود، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں

باقی ص ۳

ماہنامہ شاداب

جلد (۶) شمارہ (۷) جولائی ۱۹۸۹ء حیدرآباد

قیمت پانچ روپے

زر تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۵ سال 40 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	205 " "
تاحیات 1000 روپے	2500 روپے	650 ڈالر	300 پونڈ	2,000 " "

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپواکر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

۱۔ حرف اول	ایڈیٹر	۳
۲۔ آپ کی زبان ...	انجمن ترقی اردو پربھنی	۴
۳۔ خلافت	استاذ حسن ہضیبی	۵
۴۔ مرکزیت و خلافت اسلامیہ	سید شاہ معین الدین محمد محمود الحسینی	۱۳
۵۔ تقویٰ کیا ہے	سید خواجہ امین الدین	۲۲
۶۔ ڈاکٹر عبدالسلام حیدرآباد میں	محمد کلیم الدین احسن	۲۴
۷۔ اردو زبان و ادب	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۳۰
۸۔ ماں کی دعا	ڈاکٹر عابد رضا بیدار	۳۵
۹۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ	محمد اسحاق	۳۹
۱۰۔ شہاب نامہ، ڈپٹی کمشنر کی ڈائری	قدرت اللہ شہاب	۴۳

حرفِ اول

گذشتہ چند مہینوں سے اردو میں پتہ لکھنے کی مہم تیز کر دیا گیا ہے "ہماری زبان" میں مسلسل لکھا جا رہا ہے کہ فی الوقت کم از کم ہماری ہندی ریاستوں دلی، بہار اور اتر پردیش بھیجے جانے والے خطوں پر پتے اردو میں لکھے جائیں۔ کسی نے بتایا کہ اردو میں پتے لکھنے کی مہم سب سے پہلے محبانِ اردو کانفرنس سنبھل نے جاری کی۔ نیز یہ کہا گیا کہ " ہمارے قومی مزاج کا المیہ ہے کہ جب کوئی بات خواہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، چھوٹے شخص کی طرف سے یا نچلی سطح سے کہی جاتی ہے تو اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا اور جب وہی بات بڑی شخصیت کی جانب سے یا اعلیٰ سطح سے پیش کی جاتی ہے تو خاطر خواہ رد عمل ہوتا ہے۔ یہ صورتحال افسوسناک ضرور ہے مگر اس کا اثر یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ اچھی اور اہم بات کے پیش کرنے میں ہم صرف اس لئے ہچکچائیں کہ ہم عوامی دانست میں " اعلیٰ سطح" میں شامل نہیں ہیں۔ ہمیں تو۔

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اور اپنی آواز کو اور زیادہ تیز کر دینا چاہیئے۔ " ہماری زبان" نے بہت صحیح نشان دہی کی ہے کہ یہ بات قطعی اہم نہیں ہے کہ یہ مہم کس نے شروع کی اور کب سے شروع کی، ہم سب کا مقصد ایک ہے اور ہمارا فرض ہے کہ سب مل کر کام کریں، اور یہ کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کوئی الگ ادارہ نہیں ہے، یہ تمام اردو والوں کی نمائندہ جماعت ہے اور انجمن جو کچھ کرتی ہے اس میں تمام اردو والوں کا تعاون شامل ہے

اس مہم کو تین ہندی صوبوں تک محدود نہ رکھنے اور تمام ملک میں وسیع کرنے کے بارے میں "ہماری زبان" نے خیال ظاہر کیا کہ اس مہم کا دائرہ وسیع کیا گیا تو ہماری توجہ مختلف خانوں میں بٹ جائیگی "ہماری زبان" کے اندازے کے مطابق یہ مہم چھ مہینوں میں کامیاب ہو جائیگی اور اس کے بعد دوسرے صوبوں کی طرف اور دوسرے میدانوں کی طرف توجہ دی جائیگی۔ "ہماری زبان" کی اس تجویز سے ہم متفق ہیں، وہ کام جو اردو والوں نے شروع کر دیئے ہیں انہیں جاری رکھنا چاہیئے۔ مثلاً انجمن ترقی اردو (ہند) نے جو ورقیہ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے اس پر عمل آوری کی مہم چلانا چاہیئے

باقی صفحہ (۵) پر ★★★

آپ کی زبان اردو نہیں ہے اگر....

- آپ اردو میں دستخط نہیں کرتے۔
- آپ درخواستیں اردو میں نہیں دیتے۔
- آپ کے بچے اردو نہیں پڑھتے۔
- آپ اردو میں اپنے پتے نہیں لکھتے۔
- آپ اپنے نام کی تختی اردو میں نہیں لکھتے۔
- آپ کے یہاں اردو اخبارات و رسائل نہیں آتے
- آپ غیر اردو داں لوگوں میں اردو کو فروغ نہیں دیتے
- آپ اردو ذریعہ تعلیم کو نہیں اپناتے
- آپ اردو کو محض اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔
- آپ اپنی زبان کے تحفظ کیلئے احتجاج نہیں کرتے
- آپ اپنی زبان کے لئے مصلحتوں کا شکار ہیں۔
- آپ مردم شماری میں مادری زبان اردو نہیں لکھواتے۔
- آپ صرف مشاعروں اور سمیناروں تک سمٹ آتے ہیں۔
- آپ کو علم نہیں کہ قدم قدم پر اردو کا استحصال ہو رہا ہے۔

اگر یہی کچھ ہو رہا ہے اور آپ بھی اس میں شامل ہیں تو یقین کیجئے اردو آپ کی زبان نہیں ہے۔ کسی خوش فہمی کے بغیر اپنے ضمیر کو ٹٹولیے اور جو کچھ ہوا ہے سچ ہے اس کا اعلان کر دیجئے

دیکھنا ہے! کون اب کس کا اڑاتا ہے مذاق؟

وقت سنجیدہ ہے، لیکن لوگ سنجیدہ نہیں!

— [illegible]

[illegible]

استاذ حسن حنیفی

خلافت

اسلامی حکومت: اللہ عزوجل نے ہم سے اپنی اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کا صرف اقرار نہیں چاہا بلکہ ہم اطاعت کے فرض ہونے کے اعتقاد سے آگے بڑھ کر عملی اطاعت کے لئے مامور ہیں اور یہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرائض اور قوانین میں بعض باتوں کا حکم دیا۔ جن سے روکا جنہیں لازم اور فرض قرار دیا اور جنہیں مباح ٹھیرایا ان سب قوانین کو نافذ کیا جائے اور انہیں زندہ۔ قائم اور زمین میں متمکن واقعہ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے

اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت اس لئے بھیجی کہ وہ نافذ ہو اور کتابوں، دلوں، زبانوں سے آگے بڑھ کر دنیا میں زندہ قائم اور غالب واقعہ کی شکل اختیار کر لے۔ یہ الفاظ دیگر اسلامی نظام دنیا میں عملاً نافذ اور غالب ہو جائے۔

اسلامی حکومت یا امام حق وہ ہے جو اسلام کو اپنا دین بنائے اور احکام شریعت کے نفاذ اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ امام ابو الحسن ماوردی اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں فرماتے ہیں۔ "امامت دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست میں نبوت کی خلافت ونیابت کا نام ہے" اور امام تفتازانی امامت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں "امامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیابت کرتے ہوئے دین اور دنیا کے امور میں عمومی ریاست و حکومت ہے"

اسلامی حکومت کی ضرورت: شریعت ہی کے احکام ہیں جو ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم دین کی حفاظت اور اس کی مدافعت کریں۔ مسلمانوں کو زمین پر غلبہ اور تمکن دلائیں ان پر جو ظلم ہو رہے ہیں انہیں روکیں۔ اللہ کی دعوت کا نشر و اشاعت کا کام کریں اور قرآن مجید کے مطابق جہاد و قتال کریں تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اطاعت) سرتاسر اللہ کے لئے ہو جائے (الانفال: ۳۹)

شریعت ہی کے احکام ہمیں وہ احکام و ہدایات دیتے ہیں جو حاکم و محکوم کے تعلقات کو منظم کرنے اور حکومت کی شکل اس کے نظام اور ان کی آزادیوں کو جو افراد اور جماعتوں کو ملنی چاہئیں متعین کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ شریعت ہی ہمیں ان باتوں کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان قوانین اور شرائع کا اتباع اور انہیں جاری و نافذ کریں جو اس نے اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ اور جو یہ بھی بتاتے ہیں کہ امت مسلمہ کے دوسری قوموں سے کس طرح کے روابط ہوں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے قوانین ہیں جو امت مسلمہ اور اس کے افراد کی زندگی کا اس کے مختلف گوشوں میں احاطہ کرتے ہیں اور یہی شریعت ان سب احکام کے اور امت اور اس کے افراد کی زندگی کے اور آخرت کے انجام کے مابین ربط قائم کرتی ہے۔ اور وہ تاکید کے ساتھ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ یہ سب قوانین جس کا اس نے حکم دیا ہے ان پر اعتقاد ان کے مطابق عمل اور زندگی میں ان کا تحقق و استقرار اور اللہ کی فرمانبرداری اس کے حکم کی تعمیل اس کے حضور عاجزی و انکساری اور اس کی رضا جوئی ہی کے لئے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی بھی عمل خواہ عمل کے کرنے والے اور لوگوں کے لئے کتنا ہی مفید ہو گا۔ (عنداللہ) اسی وقت مقبول ہوگا جبکہ اس کا کرنے والا وہ شخص ہو جو دینِ حق کو اپنا کر اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہو چکا ہو۔ اور اس کا عمل اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ یہ سارا مضمون اس جامع آیت کریمہ میں ہے۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو صلوٰۃ قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں اور اللہ ہی کے لئے امور و معاملات کا انجام ہے" (الحج: ۴۱) اور یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا یہی حکومت اسلامیہ اور امام برحق کا جوہر ہے۔ اس پر سب فقہا کا اتفاق ہے اور اس کے حق میں قطعی نصوص ہیں۔

اسلامی حکومت کے قیام کے وجوب پر امت کا اجماع۔ اس کی فرضیت

حکومت اسلامیہ اور مسلم فرمانروا کی اقامت جو احکام الٰہی کے نفاذ کا ذمہ دار ہو اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی شریعت کے تقاضوں کے مطابق امت مسلمہ پر حکمرانی کرے فرض ہے مسلمانوں پر اس کی فرضیت اس اجماع سے ثابت ہے جو شریعت سے ثابت نصوص پر مبنی ہے۔

رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد ہی صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اس بات پر اجماع ہو گیا کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک جانشین ہو جو مسلمانوں کا سردار و امام ہو اور دین کی حفاظت و احکام شریعت کے نفاذ کا ذمہ دار ہو۔ اگرچہ بادی النظر میں ان کے مابین اس بات پر اختلاف رہا تھا کہ خلیفہ کون ہو مگر ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ خلیفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امام منتخب کر لینے پر بھی اجماع ہو گیا۔ اگرچہ مشہور روایت کے مطابق ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں کچھ مہاجر و انصار کی موجودگی میں ہوا تھا مگر یہ لوگ جو اس اجماع کے وقت موجود تھے اور جو اس انتخاب کے ذمہ دار تھے وہ مہاجرین و انصار میں سے اکابر صحابہ تھے۔ اور وہ اقتدار کے اعتبار سے اور قوموں اور قبیلوں کی نیابت کا حامل تھا۔ پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہوگئی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتماع میں جو مسجد نبوی میں جمع تھا خلافت کے مسئلہ کو پیش کر دیا اور انہوں نے اس طرح بات فرمائی۔

"حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی راہ پر چلے گئے (وفات پا گئے) اور اس معاملہ (دین) کے لئے ایک ذمہ دار ناگزیر ہے جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالے تو اپنی رائیں پیش کرو۔ یہ ہر گوشہ سے لوگوں کی آوازیں آگئیں" اے ابوبکر! تم نے سچ کہا اور ایسا کوئی شخص نہ پایا گیا جس نے یہ کہا ہو کہ دین کا معاملہ بغیر کسی ذمہ دار کے بھی درست ہو سکتا ہے یا یہ کہ اس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی ذمہ دار کی ضرورت نہیں۔ اس طرح سب سے افضل مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہو گیا کہ خلافت یعنی حکومت اسلامیہ کا قیام واجب ہے۔

یعنی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد اور آپ کی تجہیز و تکفین سے پہلے خلیفہ کا انتخاب اور اس پر صحابہ کا اجماع اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی ریاست و خلافت ایک نہایت اہم اور ضروری امر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد خلیفہ کا انتخاب نہ ہوتا تو خیر القرون میں ہی امت مسلمہ انتشار و افتراق کا شکار ہو جاتی۔ اور آپ کی وفات سے قبل اور بعد جھوٹے مدعیان نبوت، مرتدین اور مانعین زکوٰۃ اور قبائلی عصبیت کے جو عظیم فتنے رونما ہو گئے تھے ان کی تیز و تند رو میں اسلامی انقلاب

اور اسلامی حکومت ہی نہیں خود اسلام بہہ جاتا ۔ دراصل خلافت پر اجماع اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا بلا اجماع انتخاب حضرت صدیق ؓ کی غیر معمولی استقامت اور ان کی پشت پر صحابہ کرام کا اتحاد اور ان کی عظیم جانی نثاریوں نے اسلام اور امت مسلمہ کو ان تمام خطروں سے بچالیا ۔ آج جب کہ اسلام اور امت مسلمہ کو ہر سو شدید ترین خطرات کا سامنا ہے اس وقت سے کہیں زیادہ امام حق اور اسلامی حکومت کی ضرورت ہے ۔

دوبارہ یہ اجماع حضرت عمر بن خطاب رضؓ اور حضرت عثمان بن عفان رضؓ کی بیعت خلافت کے وقت ہوا ۔ بلکہ حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد بھی کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ ؓ کے مابین نزاع قیام امام کے وجوب کے سلسلے میں نہیں تھا ۔ دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی فریق امام کے وجوب اور مسلمان خلیفہ کے ۔ جو دین کی حفاظت اور دین کے احکام کے نفاذ کا ذمہ دار ہو ۔ قیام کی ضرورت کے سلسلے میں نزاع نہیں کر رہا تھا ۔ نزاع جو کچھ تھا وہ اس بات میں تھا کہ حضرت عثمان ؓ کے قاتلوں سے کس طرح نمٹا جائے اور حضرت علی کرم ؓ کی بیعت صحیح تھی یا نہیں ۔

حضرت علی کی خلافت کے بعد اور مختلف اسلامی فرقوں کے پیدا ہونے کے بعد (اس انتشار و افتراق کے باوجود) مسلمانوں کا اجماع مسلمان امام کے قیام کے وجوب پر ہوگیا ۔ چنانچہ اس وجوب پر تمام اہل سنت کا اتفاق ہے ۔ اسی طرح شیعہ ، معتزلہ ۔ مرجیہ اور خوارج سب کے سب اس معاملہ میں متفق ہیں ۔ بجز خوارج کے ایک فرقہ "نجدات" کے جن کی رائے یہ تھی کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے حق ادا کر دیئے جائیں (اور کسی نظم حکومت کی ضرورت نہیں ہے) ان کے نزدیک ایک امام کا قیام جائز ہے ۔ لیکن اسے انہوں نے فرض خیال نہیں کیا ۔ یہ فرقہ اب اللہ کے فضل سے مٹ چکا ہے ۔

گویا امت مسلمہ اور اس کے تمام فرقے اہل سنت ، شیعہ ، معتزلہ ، مرجیہ ، خوارج سب کے سب وجوب اقامت امامت (خلافت) پر متفق ہیں اور پوری امت کا اس پر اجماع ہے اور یہ اجماع شرعی نصوص پر مبنی ہے ۔ ان میں سے ایک نص قرآنی یہ ہے

"اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو ۔ رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں" (النساء ۵۹) ۔ آیت اولی الامر کی اطاعت کے وجوب میں

ضروری ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسلمانوں میں اولی الامر ہوں گے جن کی اطاعت ضروری
ہوگا۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں بنیادی طور پر تین اطاعتیں ہیں۔ اللہ کی اطاعت
رسول کی اطاعت اور مسلم اولی الامر کی اطاعت۔ اگر اولی الامر یا خلافت کا ادارہ اسلام میں
بنیادی اور مستقل نوعیت کا نہ ہوتا تو اس طرح اسکی اطاعت کا حکم نہ دیا جاتا اور اللہ اور اس
رسول کی اطاعت کے ساتھ مسلم اولی الامر (ارباب اقتدار) کی اطاعت فرض قرار نہ پاتی۔

مسلمہ وجوب خلافت پر اجماع کی دوسری بنیاد سنت رسول ہے۔

"میرے بعد کوئی نبی نہیں البتہ خلفا ہوں گے" صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول آپ
ان کے بارے میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ان میں سے پہلے کی بیعت کا ایفا
کرو اور انہیں ان کا حق دو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے سلسلہ میں ان سے سوال کرے گا جن پر انہیں
ذمہ دار و داعی بنایا ہے" اس حدیث میں صراحتاً خلفاء کا تذکرہ ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ
خلیفۃ الناس پر ان کے کچھ حقوق ہیں اور ان سے بیعت کرکے اس کا ایفا کرنا چاہیئے۔ اس طرح
یہ بات کہ مسلمانوں کا ایک امیر ہو جو ان کے مابین شریعت کے احکام نافذ کرے ایسے امیر کے
تقرر کا وجوب خود رسول علیہ الصلوٰۃ السلام کے عمل سے ثابت ہے کیونکہ رسول علیہ الصلوٰۃ السلام
تاحیات مسلمانوں کے سربراہ اور ان پر شریعت کے احکام نافذ کرنے کے ذمہ دار رہے۔ اس لئے
کہ آپ لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے۔ صلوٰۃ اور حج کو قائم کرتے۔ زکوٰۃ جمع کرنے اور
مستحقین میں اسے تقسیم کرنے اور دفاع اور جنگ کیلئے لشکروں کو تیار کرنے اور انہیں بھیجنے کی
ذمہ داریوں کا بار اٹھاتے رہے (اور یہ سب کام فرمانروا اور امیر المومنین کے ہیں) یہی نہیں۔
آپ کے عہد میں جو علاقے اسلام کے زیرنگین ہوئے ان کے لئے آپ نے امیر مقرر کئے چنانچہ
آپ نے باذان فارسی کو پورے یمن کا والی بنایا۔ اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے
شہر کو صنعا اور اس کے پاس کے علاقہ کا والی بنایا۔ اس طرح آپ نے مہاجر بن امیہ کو کندہ اور
صدف کا اور زیاد بن لبید کو حضرموت کا۔ ابو موسیٰ اشعری کو زبید۔ عدن۔ زمع اور ساحل
کا اور معاذ بن جبل کو الجند کا والی بنایا۔ اور عتاب بن اسید کو مکہ کا اور حج اور موسم حج کا
انتظام کرنے کا منتظم ٹھہرایا۔ نیز ابو سفیان بن حرب کو نجران کا اور علی بن ابی طالب رضا کو

یمن میں اشخاص بھیجا اور وہاں کے حاکم قضا کا والی بنایا ۔ اسی طرح ہر قبیلہ میں آپ کے مقرر کردہ والی تھے۔ جو قبیلے کے صدقات وصول کرتے ۔

مختصر یہ کہ آپ زندگی بھر خود مسلمانوں کے والی و سربراہ رہے اور ان کی قیادت و سیادت کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے زیر نگیں علاقوں میں سے ہر علاقہ میں اپنے نائب اور مسلمانوں کے سربراہ مقرر کئے۔ اس طرح آپ نے اپنے مسلسل اسوہ سے یہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں کو منظم اور رضاکی زندگی گزارنا چاہیئے۔ اور ان کا لازماً ایک سربراہ ہونا چاہیئے جو شریعت کے احکام کے مطابق ان کی قیادت کرے

درحقیقت اسلامی حکومت کی اقامت ایک ناگزیر امر ہے ۔ جو نصوص (شرعیہ) کا تقاضا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " اللہ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا (یا اس کو مکلف نہیں کرتا) مگر اتنی ہی جو اس کی وسعت میں ہے (البقرہ : ۲۸۶) اس لئے ہمارے لئے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر وہ ذمہ داری نہیں ڈالتا جو ان کی فطرت و ساخت اور ان کی قوت برداشت کے مطابق نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہم یہ بات عقل سے بداہتہً جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو احکام عائد اور فرض کئے ہیں ان کا تعلق اموال - جرائم - خونی معاملات و مقدمات - نکاح، طلاق اور اس طرح کے سب امور سے ہے۔ اسی طرح ہم پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ ہم ظالم کے ظلم کو روکیں ۔ مظلوم کو انصاف دلائیں اور قاتل سے قصاص لیں ان سب احکام کی بجا آوری لوگوں کے علاقوں کے دور دراز ہونے ۔ مشاغل میں ان کی مصروفیت اور ان کی آراء کے مختلف ہونے کے باعث (نظم) حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ ایک شخص یا ایک سے زیادہ افراد یا ایک گروہ کی خواہش ہوگی کہ وہ اس کا سربراہ ہو اور دوسرا فرد یا گروہ یہ چاہے گا کہ وہ اس پر حکم نہ چلائے یہ اس لئے کہ اس کا اجتہاد اس کی رائے کے خلاف ہے یا مخالفت برائے مخالفت کی وجہ سے ۔ بہرحال یہ ایک ضروری امر ہے جس سے کوئی مفر نہیں چنانچہ اس صورتحال کا ان علاقوں میں مشاہدہ ہوتا ہے جن کا کوئی سربراہ اور حاکم نہیں ہوتا۔ وہاں نہ کوئی صحیح اور حق حکم چل سکتا ہے اور نہ حد نافذ ہو سکتی ہے بلکہ ان کے اکثر مسلمانوں سے دین رخصت ہو جاتا ہے۔ بہرحال دین کی اقامت (حکومت کے) ذریعے

اور قوت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

انسانوں کی آراء کے مختلف ہونے۔ ان کی آراء کے اختلاف و انتشار اور ان کے باہمی کینہ عداوت کے باعث مملکت دوسرے کے تابع بہت جلد ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تنازعات اور جنگ کی شکل میں برآمد ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات سب افراد کی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتا ہے۔ تجربہ اور ایک حاکم کی موت کے بعد دوسرے حاکم کے مقرر ہونے تک کی مدت کے دوران برپا ہونے والے فتنے اس کے شاہد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ اگر دراز ہو جائے تو زندگی اور اس کے معاشی طور طریق تعطل کی نذر ہو جائیں اور ہر شخص اپنی تلوار کے بل پر اپنی جان و مال کے تحفظ میں مشغول ہو جائے اور اس کا نتیجہ بالآخر دین کے ختم ہونے اور سب مسلمانوں کے ہلاک ہونے کی صورت میں نمودار ہو۔

دین کا نظم و انصرام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تمام ضروری امور و مہمات کے سلسلہ میں امن و امان قائم ہو۔ ورنہ جو شخص اپنے جملہ اوقات میں اپنے آپ کو ظالموں کی تلواروں سے بچانے اور اپنی قوت کو غلبہ کے طریقوں سے حاصل کرنے میں مستغرق ہو وہ علم اور عمل کے لئے کب فارغ ہو سکے گا۔ جبکہ یہی دو چیزیں اس کے لئے سعادت اخروی کے حصول کا ذریعہ

دین اور جان و مال کے سلسلہ میں امن و امان کا نظم اس وقت ممکن ہے جبکہ کوئی ایسا فرمانروا موجود ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے شواہد سلاطین و امراء کے انتقال کے موقع پر فتنوں کے زمانہ میں بخوبی نظر آتے ہیں۔ اگر دوسرے فرمانروا کے جس کی اطاعت کی جاتی ہو تقرر کے ذریعہ اس صورت حال کا تدارک نہ کیا جائے اور صورت حال یوں ہی چلتی رہے تو فتنوں اور انارکی کو دوام ہو جائے تلوار کا چلنا عام ہو جائے۔ قحط کا تسلط ہو جائے۔ مویشی ہلاک ہو جائیں۔ کاروبار اور صنعتیں ٹھپ ہو جائیں اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول چلنے لگے۔ اس صورت میں کوئی بھی شخص اگر زندہ رہ جائے عبادت اور عمل کیلئے فارغ نہ ہو سکے اور اکثر لوگ تو تلوار کے گھاٹ اتر جائیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "دین اور فرمانروا جڑواں بھائی ہیں"۔

چنانچہ دین۔ دنیا۔ ملت اور عالم انسانی سب کے سب اسلامی حکومت کی

جنگوں میں ہلاکت و بربادی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اور لوگوں کے حصے میں ضیاع و کثرت
افلاس، بدحالی و تباہی آتی ہے۔

اسلامی حکومت کی اقامت ناگزیر ضرورت ہے: اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ پر کچھ فرائض عائد و واجب کئے ہیں۔ جن کی ادائیگی کی بنا ایک حکومت کی صورت میں جس کے افراد ذمہ داری میں شریک ہیں ــــ ذمہ دار ہے۔ ان فرائض کو اصطلاحاً "فرضِ کفایہ" کہا جاتا ہے مثلاً جہاد ۔ احتساب ۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر غربا و مساکین کی ضروریات میں شمولیت وغیرہ ۔ ان فرائض کی ذمہ داری سے کوئی ایک فرد تنہا یا کچھ افراد ــ خواہ وہ کوئی بھی ہوں ــ عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ۔ ان کی ادائیگی کیلئے تدبیر تنظیم اور کنٹرول کی ضرورت ہے ان ذمہ داریوں سے ایک عالی اقتداری عہدہ برآ ہو سکتا ہے ۔ جس کا ارادہ افراد کے انفرادی ارادے سے بالاتر ہو ــ جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور جو امر کریں ۔ کنٹرول اور ہدایت کر سکتا ہے ۔ اور یہ اقتدار امامت و خلافت ہی کا ہو سکتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام فرائض کی ادائیگی کے لئے خلافت ضروری اور واجب ہے ۔ اسی لئے شہرستانی نے کہا ہے

عامۃ الناس کے لئے ایک امیر کا وجود لازمی ہے ۔ جو ان پر احکام شریعت نافذ کرے ان پر حدود نافذ کرے ان کے علاقوں کی حفاظت اور ان کی مملکت کے حدود کی نگہداشت کرے ان کے لشکروں کو تیار رکھے ۔ اموالِ غنیمت اور زکوٰۃ وصول اور تقسیم کرے ۔ لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے اس کے پاس جائیں وہ مظلوم کو انصاف دلائے ظالم سے بدلہ لے ۔ عمال اور ججوں کو ملک کے ہر گوشہ میں مقرر کرے اور علماء اور داعیوں کو دین کی دعوت اور خدمت کے لئے ملک کے اطراف و جوانب میں بھیجے وہ جمعوں اور عیدین کے اجتماعات کا انتظام کرے جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے ۔ اسلامی حکومت یا خلیفہ کی عدم موجودگی کا حتمی نتیجہ ہوتا ہے شرعی احکام کے نفاذ کے تعطل ۔ اللہ کے عطا کردہ حقوق کے عدم تحفظ ۔ نیز مسلمانوں کے شیرازہ کے بکھرنے ۔ ان کی کمزوری ۔ ان کے فتنوں اور مصیبتوں میں گرفتار ہونے اور ظلم و فساد کے عام ہونے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ۔ موجودہ دور میں مسلمان ملکوں کا حال اس کی صداقت پر شاہد ہے۔

(باقی صفحہ ...)

مرکزیت و خلافت اسلامیہ

مجلس احیائے خلافت اسلامیہ : عرصہ ہوا کہ میں نے وسیع اور موثر پیمانہ پر مسئلہ خلافت اسلامیہ سے متعلق شعور کی تکمیل کے سلسلہ میں مجلس احیائے خلافت اسلامیہ* قائم کی تھی۔ دربار سلطان الہندؒ کے دیوان جی حضرت عنایت حسین صاحب کے قیام حیدرآباد کے دوران موصوف سے ملاقات اور تفصیلی گفتگو کی۔ دیوان جی مرحوم نے مکمل تعاون و اشتراک عمل کا وعدہ فرمایا تھا مگر افسوس کہ حیدرآباد سے واپسی کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور مجلس ان کی اعانت سے محروم ہو گئی

توقع ہے کہ سجادہ نشین حضرات، علمائے کرام، مشائخ عظام اور دردمندان ملت قیام خلافت اسلامیہ کے تعلق سے امکانی تعاون فرمائیں گے۔

میں نے اس سلسلہ میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خان اعلی اللہ مقامہٗ کے معزول و ملک بدر کے سانحہ پر تمام عالم اسلام کے علمبرداران جمہوریت کی اس حرکت کو مفاد ملی کے منافی اور ناقابل تلافی نقصان عظیم قرار دیا تھا۔ یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر میں نے مولانا شمس الدین احمد صاحب شطاری کامل معتمد صدر مجلس علمائے دکن کی اس تحریک کی بذریعہ روزنامہ "رہنمائے دکن" تائید کی تھی کہ جمعہ اور عیدین کے خطبات ثانیہ کی دعاؤں میں نواب میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ ہشتم کا نام لیا جائے جیسا کہ آصف جاہ سابع کا نام لیا جاتا تھا۔ نظام ہشتم خانوادہ خلافت عثمانیہ اور خانوادہ آصف جاہی کے چشم و چراغ ہیں۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمان اس عظیم المرتبت ہستی کی اتباع کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں جو امت مسلمہ کے اتفاق کے ساتھ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے منتخب ہو جائیں جن کو "اولی الامر" ہونے کا شرف

---

* [illegible]

امتیاز حاصل ہے ۔ مستقل ہو یا عارضی، خواہ کسی نہ کسی طرح تمام مسلمانوں کا ایک دینی اور ایک مذہبی پیشوا کے سیاسی مرکز و تعلقات سے وابستہ ہونا مقصد بھی ہے کہ نہیں ۔

اسلامی مرکزیت : ..... زوالِ انسانیت مکمل ہو چکا تھا ۔ ایسے میں خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام" کی بشارت لیکر تشریف لائے ۔ ناممکن تھا کہ ایک مکمل دین خاص مقام اور خاص فرقہ یا رنگ و نسل تک محدود ہوتا ۔ بلا امتیاز نسل و مقام ساری کائنات کے لئے یہی ایک دین تھا جسے تکمیلِ دین و اتمام نعمت کا مقصود پیدا کیا ۔ جمعیت و مرکزیت کے نہایت اعلیٰ اور قابلِ عمل احکام وضع کئے گئے بنیان مرصوص کی طرح زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا گیا ۔ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" کے حکم میں اتفاق و اتحاد کی اہمیت اور "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کے فرمان میں اطاعتِ امام کی ضرورت واضح کر دی گئی کیونکہ اس کے بغیر مرکزیت باقی نہیں رہ سکتی افسوس کہ ان تمام محرکاتِ اجتماع کے باوجود آج قوم کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے ۔ ہر ملک اور ہر خطہ کے مسلمان آج اپنے آپ کو اپنی حدودِ ارضی کے اندر اس قدر مقید و محبوس رکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ گویا دوسرے ممالک میں بسنے والے افرادِ قوم سے انہیں کوئی ربط و تعلق نہیں ....

دیگر متعدد اسباب و علل کے علاوہ مرکزِ خلافت کی عدم موجودگی کے باعث یہ صورتحال رونما ہوئی نظامِ خلافت ہی عالمِ اسلام کے لئے مرکزیت اور اتحادِ عمل کا بہترین مذہبی و سیاسی ذریعہ رہا ہے ۔

حضرت صدیق اکبرؓ سے لیکر سلطان عبدالمجید خان علیہ الرحمۃ تک یہ نظامِ خلافت عروج و زوال کے مختلف منازل طے کرتا رہا ۔ مگر انقلابِ ترکی نے عالمِ اسلام کی اس رہی سہی مرکزیت کا خاتمہ کر دیا ۔

مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا سب سے بڑا سانحہ سلسلۂ خلافت کا انقطاع ہے ۔ ۳۹ سے محرومی مذہب و شریعت کے بنیادی احکام سے انحراف کے مترادف ہے کیونکہ اسلام میں شریعت و حکومت دو جداگانہ چیزیں نہیں بلکہ خود شریعت نے ایک صحیح و صالح حکومت کا مطالبہ کیا ہے ۔ امامتِ کبریٰ جس مقام سے عبارت ہے وہ اجتہادِ دینی اور سیاست عملی دونوں پر حاوی ہے ۔ اسی معنی میں خلافتِ راشدہ جو منہاجِ نبوت پر تھی سامنے لا کر ...

کرتے ہیں۔ [illegible] کا تشخص [illegible] محفوظ رہا [illegible] مختلف ادوار میں قیام [illegible] سیاست حکومت و [illegible] سب [illegible] میں مرکوز رہے (اس کے بعد کی خلافت سے (خلافتِ بنو امیہ سے خلافتِ عثمانیہ تک)

" الخلافۃ بعدی ثلاثون عاماً ثم ملک بعد ذالک " کے ارشادِ نبوی کے مطابق بادشاہت کی شکل اختیار کی مگر یہ حیثیت نیابت رسالت اسلامی خصائص و مقامات سے عاری نہ تھی اور نہ اس بنا پر اس کو ختم کر دینا کوئی جائز اور شرعی عمل ہو سکتا ہے۔

<u>اقوامِ عالم کی رہنمائی</u> : خلافت " استخلاف فی الارض اور وراثت و تمکن فی الارض کا مطلب کرۂ ارض کی ایسی حکومت و سلطنت ہے جو علم صحیح اور عمل صالح کے معاوضہ میں اقوامِ عالم کو دنیا میں عطا کی جاتی ہے۔ اسی طرح سے حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں آتا ہے

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون	(اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں کو وراثت میں آتی ہے)
الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر	(وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو طاقت زمین میں قائم کر دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز قائم کریں گے) زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے)
وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً ۔	(جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے اور ان کا دین حق قائم ہو جائے گا اور خوف امن سے بدل جائے گا ۔

ان آیات میں نیابت حکومتِ الٰہی یعنی خلافت سے بحث تھی ۔ اب اس کے لئے ایک اہم ترین شرط یعنی اجتماع و مرکزیت کی نسبت کثیر آیات موجود ہیں اور صریح حکم صادر فرمایا ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا ط

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ کتنی بڑی نعمت سے سرفراز کئے گئے۔ تم آپس میں دشمن تھے یہ دشمنی محبت میں بدل گئی اور تم بھائی بھائی بن گئے (اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان مخالف دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے مگر اللہ نے ان کو جوڑ دیا یقیناً وہی غالب اور حکمت والا ہے

فرائض و مقاصد سے گریز : .... انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی یک بدست جمعیت و مرکزیت آناً فاناً ٹوٹ گئی ۔ اب ایک فوج ہے جس کا کوئی سالار نہیں اور ایک جماعت ہے جس کا کوئی امام نہیں ....

مغربی آقاؤں کے اشارہ چشم و ابرو پر رقص کرنے والے جنہیں اسرار و رموز قرآن کے فہم و ادراک کی توفیق نہ ہوئی، اپنے گھر کو آگ لگا کر تماشہ دیکھتے رہے۔ انہوں نے تخریب کو تعمیر سمجھا، اسلامیت کو وطنیت پر قربان کر دیا اور مستقبل کی ساری تمنائیں اور امیدیں برباد کر دیں ۔ اس چودھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے ۔

مقامات مقدسہ : طاعت و ثواب کی نیت سے جن مقامات کے سفر کی اجازت ہے ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس بھی ہے۔ بیت المقدس اور فلسطین کے حالات پھر اپنے وارث و امین کی توجہ کے منتظر ہیں ۔ جہاں تک حیات اجتماعی کا تعلق ہے مسئلہ خلافت اور تطہیر بلاد اسلامیہ یہ دونوں امور مسلمانوں کے صحیح فکر و عمل کے مستحق ہیں ٹھیک ہے کہ روم ایک دن میں نہیں بنا مگر کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ کم و بیش ستر کروڑ افراد ملت جن پر اللہ نے عالم انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ عائد کیا ہے کسی ربط و نظم کے بغیر زندگی بسر کریں ۔ آج دنیا حوادث و انقلابات کی زد میں ہے ۔ تغافل و تعطل پر جماعت خودکشی کے مترادف ہوگی ... کیا اس وقت مسلمانوں کے آگے کوئی حل طلب مسئلہ نہیں ہے؟ [illegible]

اسلامیہ کے مخلص، خود مند اور با اثر زعماء اپنے مرکز ارض حجاز میں سر جوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے؟ یہ علم ایک زندہ قوم کا ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا ملت اسلامیہ ایک زندہ قوم بھی ہے؟

"البلاغ" جلد اول شمارہ آغاز ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ ۱ فروری ۱۹۶۶ء

مرکز اتحاد اسلام: عیسائی اور دیگر قومیں مسلمانوں اور ان کی حکومتوں پر گہری توجہ مرکوز کرتی ہیں اور ہمیشہ اس جدوجہد میں رہتی ہیں کہ ان میں باہمی اختلافات پیدا کئے جائیں اور سازشوں کے ذریعہ مسلم ملکوں کو ایک دوسرے کی مخالف یا ایک دوسرے سے بے تعلق بنائیں تاکہ ان میں باہمی رشک و رقابت بڑھنے لگے اور وطنیت و قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہو جائیں

عالم اسلام پر ایک طائرانہ نظر متعدد کمزوریوں اور خرابیوں کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔ اس صورت حال کے متعدد اسباب ہیں۔ اس کا ایک اہم ترین سبب دینی احساس اور مذہبی تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔ عوام اور حکمرانوں کی اکثریت اس صراط مستقیم سے دور ہے جس کی جانب خود اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کی تھی۔ یورپ اور امریکہ کی طرز معاشرت اور طرز حکومت کی تقلید ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بہت زیادہ ترقی کر لی تو نام نہاد "جمہوریت" کے علمبردار بن گئے ____ اس جمہوریت کے جس سے بے شعور افراد کے ووٹوں سے قائم ہونے والی ناقص و زوال پذیر حکومت جنم لیتی ہے! ...... بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر زعماء و ارباب حکومت کوئی خاص دینی لائحہ عمل نہیں رکھتے، اسلامی اصولوں کی سوسائٹی اور اسلامی طرز کے نظام حکومت کا قیام ان کے فکر و عمل سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ وہی غیر اسلامی طرز کی جماعت سازی وہی غیر اسلامی نوعیت کی تحریک و قیادت اور وہی اخلاق و کردار جن پر اسلامی اخلاق و کردار کا شائبہ بھی نہ ہو۔ حکومتوں کی اتباع میں قومی و سیاسی جماعتوں نے بھی دین کو سیاست سے جدا کر دیا ہے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا تھا ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نسل اور وطن کا نظریہ: جن ممالک کو اسلامی ممالک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک وطنیت کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے ...... ممالک اسلامیہ یورپ اور امریکہ کی تقلید میں یہی حرکت نسل اور وطن کے نظریہ کو مذہب کی بجائے حکومت و سیاست

کا فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ غیر مسلم اقوام اپنے مذہب اور اپنے کلچر کی پابندی کرتی ہیں۔ انہیں تنگ نظری اور عصبیت کا الزام کا خوف نہیں ہوتا۔ امیر شکیب ارسلان کہتے ہیں کہ شاہ انگلستان گرجا کے امام اکبر اور محافظ دین مسیح سمجھے جاتے ہیں لیکن انہیں متعصب اور ان کی قوم کو غیر مہذب نہیں کہا جاتا یورپین اور امریکی اقوام کو جنہیں اپنی عیسائیت پر ناز ہے اور جو آپس کے سخت اختلافات کے باوجود اپنے مذہب کی خدمت واشاعت میں متحد و منہمک رہتی ہیں۔ متعصب نہیں کہتے۔ بڑی بڑی عیسائی حکومتوں نے یہودیوں کی اعانت و حمایت کی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی حکومت قائم ہوچکی۔ مملکت اسرائیل آج عرب ممالک اور بیت المقدس کے تعلق سے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک خطرہ بنی ہوئی ہے۔ یہ عیسائی اور یہودی بھی عصبیت کے الزام سے قطعاً بے پرواہ ہیں۔ تعصب وتنگ نظری کا یہ سارا خوف تو بیچارے مسلم زعماء اور مسلم حکمرانوں کو زندہ درگور کئے ہوئے ہے۔

مذہب وسیاست کی تقسیم: مسلم مملکتوں کے ارباب اقتدار اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسیحی قوموں نے مذہب کو سیاست سے علاحدہ کرکے ترقی کی ہے

علامہ اقبال نے مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

- روسو اور لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی مذہبی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کر ایسی کثرت میں تبدیل ہوگئی جس کے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیت کا ایک ہمہ گیر تصور کسی محسوس بنیاد مثلاً حب الوطنی ہی پر قائم رہ سکتا تھا ۔۔۔۔۔۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اس کا تعلق کا ملاً اگلے جہاں سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا"

کلیسائی نظام، اسلام کے عالمگیر نظام دین وسیاست اور مسلمانوں کے نظریہ نسل ووطن پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

- اسلام کا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور مجھ کو کامل یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے!

اجتماعیت و مرکزیت : لا اسلام الا بالجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ ...

(اسلام بغیر اطاعت، جماعت بغیر امیر اور امیر بغیر اطاعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)

ارشاد ہوتا ہے:

مَن اطاعنی فقد اطاع اللہ و	(جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت
من اطاع امیری فقد اطاعنی و	کی جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے
من عصی امیری فقد عصانی	میری اطاعت کی جس نے امیر سے روگردانی کی
(متفق علیہ عن ابی ہریرۃ)	اس نے مجھ سے روگردانی کی)

حجۃ الوداع کے موقع پر تلقین فرمائی جاتی ہے۔

ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب	اگر ایک غلام بھی کتاب اللہ کے ساتھ تم پر
اللہ اسمعوا واطیعوا ۔ (رواہ مسلم)	حکومت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو

مزید ارشادات نبوی کی سماعت کا شرف حاصل کیجئے۔

ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ	جو اس حالت میں مرے کہ اسکی گردن میں بیعت
مات میتۃ جاھلیۃ (مسلم)	کی رسی نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا)

بعض احادیث کا مفہوم درج ذیل ہے۔

(۱) میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے، جماعتی زندگی، سمع و طاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ، پس جو کوئی جماعت سے ایک بالشت باہر ہو گیا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال پھینکی سوائے اس کے کہ وہ پلٹ کر جماعت میں شامل ہو جو کوئی جماعت سے علٰیحدگی کی طرف بلائے وہ جاہلیت کی طرف بلاتا ہے۔ پس اس کا انجام آخرت جہنم ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ، اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، ارشاد ہوا کہ "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" ؎

؎ اس جگہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے "جماعت" سے مراد عصر حاضر کی خود ساختہ جماعتیں نہیں۔ اسلام اور تبلیغ دین کے لئے مخصوص جماعتوں کا قیام بدعت سیئہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ، اہل بیت اطہارؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہؒ، علمائے حق، کسی نے بھی اسلام اور تبلیغ کیلئے کوئی جماعت نہ بنائی۔ جماعت ... [illegible]

[illegible] کی سیاست انبیاء کیا کرتے تھے۔ ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا اس کا جانشین ہوتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ عنقریب خلفاء ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی، ہم ان کی نسبت کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا 'جس سے پہلے بیعت کی اس کی اطاعت لازم ہے' اس کا جو کچھ حق ہے اس کے مطابق عمل کرو (مشکوٰۃ 'امارت' دیکھو)

'الخلافة بعدی ثلاثون سنة' کے مطابق پورے تیس برس یعنی سنہ ۱۱ ہجری سے سنہ ۴۰ تک خلافت راشدہ کا مقدس دور کتاب و سنت کے نقشے پر قائم رہا۔ اتنی جامع الشرائط خلافت تو اس کے بعد قائم نہ ہو سکی مگر خلافت بنو امیہ سے خلافت عثمانیہ ترکیہ تک یکے بعد دیگرے جو خلافتیں قائم ہوئی تھیں ان سب میں سے ہر ایک پر خلافت کا اطلاق کیا گیا اگرچہ ملوکیت پیدا ہو چکی تھی۔ ابتدا اسی کی امیر معاویہ بن ابی سفیان نے اعلان کیا تھا۔

"ہم نے خود ملوکیت پر قناعت کر لی!"

<u>عالم اسلام اور رابطۂ خلافت</u>: نویں صدی ہجری کے آخر میں صاحب اندلس کے وزیر لسان الدین خطیب اسلامی نے عالم اسلام کے حالات سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی تھی، چند اشعار کا ترجمہ ہے

"خلافت کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور اصل و نشان دونوں مٹ گئے ہیں۔ دین اسلام پر ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، یورپ کے عیسائی جان و مال پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دین و ملت کا گلا گھٹ رہا ہے۔"

تیونس کے قاضی القضاۃ سید عبداللہ جمال الدین نے السیاسۃ الشرعیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو حکومت تونس کے نقیب الاشراف کی جانب سے شائع ہوئی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں

"یہ حدیث خلافت میرے بعد تیس برس رہے گی اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرات خلفائے اربعہؓ کی خلافت کامل تھی، خلافت کا اطلاق دوسرے ائمہ اسلام پر بھی جائز ہے۔ اسی لئے کہ ان کی عملی بیعت رسول اللہ کی نیابت کے طور پر ہوتی ہے۔ جیسے کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت [illegible]

: [illegible] (خلافت [illegible])۔

۱۹۲۰ء–۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کی جو حالت تھی اس کی وضاحت کی گنجائش [illegible]
لیکن سطورِ ذیل سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ مسلمانانِ عالم اس خلافت کی بقا کی جدوجہد
اور اس سے بلاواسطہ تعلق کو ایک اہم فریضہ تصور کرتے تھے۔ بجز فلسطین کے علاوہ مسلم عوام
کے جذباتِ عقیدت کا تقاضا کا مرکز بھی یہی باب عالی تھا!

خلافت سے وابستگی کا جو رجحان عربوں میں موجود تھا اس سے مجبور ہو کر شریف حسین
نے جریدہ "القبلہ" کے ذریعہ یہ اعلان کیا۔

"میں ہرگز خلافت کا مدعی نہیں ہوں بلکہ خلافت اسی کا حق ہے جس کو تمام عالم
کے مسلمان خلیفہ تسلیم کرتے ہوں۔ ہم کو خاندانِ خلافت سے کوئی شکایت نہیں۔۔
ہمارے دلوں میں خلافتِ عثمانیہ کا وہی احترام ہے جو پہلے تھا۔"

امیر فیصل نے "اسلامک نیوز" مورخہ ۲۳ جون ۱۹۲۱ء میں حسب ذیل بیان شائع کرایا۔

"الحمد للہ خلیفۂ معظم کے ساتھ ہماری عقیدت غیر متزلزل ہے۔ ہمیں صرف ترکوں
کی ایک چھوٹی سی جماعت "اتحاد و ترقی" سے شکایت ہے۔ عرب افسر اور عرب سپاہی
ترکوں کے دوش بدوش یونانیوں سے برسرِ پیکار ہیں۔
ہمیں خلافت کا دعویٰ نہیں۔ ہم ہمیشہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ سلطان معظم ہمارے
جائز خلیفہ ہیں۔"

امام یحییٰ اور شیخ نجد بھی خلافت کے وفادار تھے۔ مصر بھی بدستور خلافت سے وابستہ
رہا۔ بعض مخالفین نے کوشش کی تھی کہ سلطان المعظم کی بجائے خدیوِ مصر کے نام کا خطبہ
پڑھا جائے مگر یہ سازش ناکام ہو گئی۔

فلسطین کے امیر الوفد موسیٰ کاظم پاشا الحسینی نے لندن میں وفدِ خلافت کے اجتماع میں
تقریر کرتے ہوئے کہا:

"عرب کے شام، فلسطین، عراق اور افریقہ میں کوئی عرب ایسا نہیں ہے جو ہز امپیریل
مجسٹی سلطان المعظم کو اپنا خلیفہ نہ مانتا ہو۔۔۔۔۔۔ خلافت اصل میں [illegible] اتحاد
کا نشان ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان اسی کے ذریعہ ایک قوت [illegible]

۱۔ خطبہ صدارت [illegible] ۱۹۲۱ء [illegible]

سید خواجہ امین الدین

تقویٰ کیا ہے

تقویٰ کا لفظ وقایہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پورے طور پر محفوظ رہنے کے ہیں قرآن مجید میں تقویٰ کا لفظ مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن یہ استعمال مختلف مقامات پر الگ الگ معنوں میں ہوا ہے۔ مثلاً کہیں تقویٰ سے توحید مراد ہے جیسے وَاَلزَمَهُم کَلِمَةَ التَّقوٰی کہیں ایمان لانے کے لئے لفظِ تقویٰ استعمال ہوا ہے جیسے قوم فرعون لا تتقون۔ کسی جگہ تقویٰ سے توبہ مراد ہے مثلاً اهل القریٰ آمنو والتقویٰ۔ تقویٰ کا لفظ عبادت کے لئے بھی لایا گیا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے انا ربکم فاتقون۔ ایک جگہ تقویٰ بمعنی ترک معصیت استعمال ہوا ہے جیسے واتوا البیوت مِن اَبوابها واتقوا اللّٰه اور کہیں اخلاص کے مضمون میں آیا ہے مثلاً فانها من تقوی القلوب، چونکہ تقویٰ کا درجہ بہت بلند ہے اس لئے ارشادِ باری ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِینَ اتَّقَوا وَّالَّذِینَ هُم مُّحسِنُونَ۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگاری کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ

اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللّٰهِ اَتقٰکُم۔ یعنی تم میں اللہ کے نزدیک وہی لوگ مکرم ہیں جو پرہیزگار ہیں"

ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جو شخص لوگوں میں بزرگ بننے کی خواہش رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ خدا کا خوف کرے اور جو شخص زیادہ قوی بننا چاہئے اسکو لازم ہے کہ خدا پر توکل کرے اور جو شخص زیادہ دولت مند بننا چاہے اسکو چاہیئے کہ بہ نسبت اس چیز کے جو اس کے ہاتھ میں ہے اس چیز پر زیادہ بھروسہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تقویٰ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ تقویٰ وہ ہے کہ گناہ پر

بلاسے ایس اے ایس، سابق میرھکر ہلے جی آخص۔

اصرار نہ کیا جائے اور عبادت پر گھمنڈ نہ کیا جائے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے بموجب حقیقت یہ ہے کہ لوگ تیری زبان میں کوئی عیب نہ دیکھیں۔ ملائکہ تیرے افعال میں کوئی عیب نہ دیکھیں اور خدائے تعالیٰ تیرے باطن میں کوئی عیب نہ دیکھے۔ واقعی متقی وہی ہے کہ تقویٰ وہ ہے کہ انسان اپنے باطن کو خدائے تعالیٰ کے لئے اس طرح آراستہ کرے جیسے ظاہری حالت کو مخلوق کو دکھانے کے لئے آراستہ کرتا ہے۔ الحاصل متقی وہ ہے جو ممنوعات الٰہی کا مرتکب نہ ہو۔ جب تختی پر خوشنما نقوش کا اتارنا مقصود ہو تو پہلے بدنما نقوش سے اس کو صاف کرلینا ضروری ہوتا ہے۔ یہی حال قلب کا بھی ہے جس میں عقائد حقہ اور اخلاق حسنہ کے نقوش قبول کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اس لئے قلب کو حسن اخلاق اور اعمال صالحہ سے آراستہ کرنے کیلئے اعمال بد سے صاف کرلینا ضروری ہے۔ اسلام میں تہذیب نفس کا آئینہ تقویٰ قرار دیا گیا ہے کیونکہ جب تک قلب میں اتقا کا اثر نہ ہو علم الٰہی کا فیضان بھی نہیں ہوتا۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت هدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنٰھم ینفقون الخ میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے عبادات جیسے نماز و زکوٰۃ پر تقویٰ کو مقدم قرار دیا ہے کیونکہ عبادات کی قبولیت کا دارومدار تقویٰ پر ہے

آنکہ بے تقویٰ است در رہ دیں
آدمی نیست ہست دیو لعین

سلسلہ جاری

جب مسلمان ملکوں میں جہاں مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں مگر وہاں اسلامی حکومتیں موجود نہیں ہیں اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے تو غیر مسلم ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں اور کمزور ہیں اور ملحدین و مشرکین کے تسلط میں ہیں اسلام اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا کیا عالم ہوگا اس کے لئے کسی تحریر و فکر کی ضرورت نہیں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کا قیام فرض کفایہ ہے اسلامی حکومت یعنی خلافت کا قیام فرض کفایہ ہے جیسے وہ ایسا فرض ہے جس کے سلسلے میں امت کے تمام افراد گنہگار [illegible] ساقط ہو [illegible] یہاں تک کہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے جب تک اسلامی حکومت [illegible]

محمد کلیم الدین احسن

ڈاکٹر عبدالسلام حیدرآباد میں

عالمی شہرت کے حامل، نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات پروفیسر عبدالسلام کو حیدرآباد میں نوبت پہاڑ پر واقع برلا پلانیٹیریم میں بی۔ایم۔ برلا یادگاری لکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ پلانیٹیریم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر بی جی سدھارتھ نے بتایا کہ پروفیسر عبدالسلام ۱۷ رمئی کو پلانیٹیریم کی عمارت میں اپنا لکچر فلکی ذرات کی طبیعیات "ASTRO - PARTICLE PHYSICS" کے عنوان سے دیں گے۔

بی۔ایم۔ برلا پلانیٹیریم نے جدید سائنس بالخصوص فلکیات و خلائی سائنس پر خصوصاً یادگاری لکچرس کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو سال میں ایک مرتبہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ لکچر اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ یہ حیدرآباد کے لئے فخر کی بات ہے کہ پروفیسر عبدالسلام جیسے نوبل انعام یافتہ سائنسداں کے خیالات سے ہمیں اپنے شہر میں واقف ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ اس سے قبل عالمی شہرت یافتہ ماہر فلکیات ڈاکٹر فریڈ ہائل بھی اس سلسلہ میں ایک لکچر یہاں دے چکے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام ۲۹ رجنوری ۱۹۲۶ء کو پاکستان کے شہر جھنگ JHANG میں پیدا ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۶ء میں ایم اے کرنے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے جہاں پر انہوں نے ۱۹۴۹ء میں ریاضی اور طبیعیات میں ڈبل بی اے آنرز کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں کیاونڈش لیباریٹری CAVENDISH LABORATORY کیمبرج سے نظریاتی طبیعیات THEORETICAL PHYSICS میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ طبیعیات کے میدان میں ان کی بیش تر اور وسیع کاموں کے اعتراف میں ۱۹۵۷ء سے لیکر ۱۹۸۳ء تک مختلف ممالک کی تقریباً (۲۰) یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں عطا کیں۔ ان ممالک میں [illegible] کے علاوہ پاکستان، انگلستان، اٹلی، آئرلینڈ، اردن، ترکی، بنگلہ دیش، نائجیریا، فلپائن، [illegible] اور [illegible] شامل ہیں۔ ہندوستان میں انہیں گرونانک یونیورسٹی امرتسر، مسلم یونیورسٹی [illegible]

علاوہ ہندو یونیورسٹی بنارس نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۵ سے
۱۹۸۰ء تک ساری دنیا میں تقریباً ۲۰ بین الاقوامی ایوارڈس سے انہیں نوازا گیا۔ جس میں ۱۹۷۹ء
کا نوبل انعام "نظریاتی طبعیات" PARTICLE PHYSICS کے میدان میں ان کے بے مثال
کام پر دیا گیا۔ اس سال طبعیات میں یہ پروفیسر عبدالسلام کے علاوہ اور دو امریکی ماہرین طبعیات
پروفیسر شیلڈن گلاشو اور پروفیسر سٹیون وائن برگ کو بھی نوبل انعام دیا گیا تھا۔

۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء تک پروفیسر عبدالسلام نے لاہور کے گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی
میں پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ پھر انگلستان جانے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۶ء تک
بطور لیکچرر کام کرتے رہے۔ جس کے بعد ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج میں پروفیسر
برائے نظریاتی طبعیات مقرر کئے گئے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں اٹلی کے شہر TRIESTE میں
ایک ادارہ بنام بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبعیات INTERNATIONAL CENTRE
FOR THEORETICAL PHYSICS قائم کیا۔ جس کے وہ ڈائرکٹر بھی ہیں۔ یہ ادارہ
تیسری دنیا کے ممالک کے سائنسدانوں کو علم طبعیات کے جدید ترین میدانوں میں روز افزوں ہونے
والی تحقیقات سے آگاہ کرانے کے علاوہ انہیں تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے قائم
کیا گیا ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی اکیڈیمیوں اور سوسائٹیوں نے ان کی خدمات کے پیش نظر انہیں
اپنا ممبر یا فیلو منتخب کیا۔ اقوام متحدہ کی جانب سے کوئی (۹) مرتبہ انہیں مختلف عہدوں کے لئے
نامزد کیا گیا۔ یونیسکو UNESCO کے ایڈوائزری پینل برائے سائنس ٹکنالوجی اور سوسائٹی
کے وہ ۱۹۸۱ء میں چیرمین منتخب ہوئے۔ ان کے اپنے ملک پاکستان نے انہیں مختلف کام دینے کے
علاوہ "ستارہ پاکستان ایوارڈ" (۱۹۵۹ء) "پرائڈ آف پرفارمنس میڈل اور ایوارڈ" (۱۹۵۹ء)
اور "نشان امتیاز ایوارڈ" سے ۱۹۷۹ء میں نوازا۔ طبعیات میں نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسداں
ڈاکٹر عبدالسلام نے ۱۸ مارچ ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ
ان کا تعلق ایک روشن خیال مذہبی گھرانے سے تھا' اس لئے انہیں ابتدا ہی سے علم حاصل
کا شوق تھا۔ اور علم سائنس کے آج جو کمالات حاصل ہیں ان کا سہرا مذہب سے

ان کے لگاؤ اور اس پر سختی سے کاربند ہونے پر ہے۔ انہوں نے کہا کہ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک جن میں سارک ممالک بھی شامل ہیں، سائنس ٹکنالوجی سے نہایت درجہ غفلت برت رہے ہیں۔ اُن کے دفاعی اخراجات ان کے وسائل کے پیش نظر کہیں زیادہ ہیں اور سائنس ٹکنالوجی پر ان کا خرچ برائے نام ہے۔ نتیجہ یہ ہیکہ ہمارے ان ممالک کو صرف ان سائنسی ریسرچ معلومات پر تکیہ کرنا پڑتا ہے جو ترقی یافتہ ممالک ان کو دینا پسند کرتے ہیں، انہوں نے بتایا کہ چین جو سائنس ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے تھا۔ اب اپنی محنت اور کوششوں سے ان کے مقابلہ پر آگیا ہے۔ مگر ہمارے ممالک آپسی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں اور سیاست اس علمی میدان میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ سائنس ٹکنالوجی میں بھی ہم ایک ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر سلام نے بتایا کہ ہندوستان اپنی جملہ خام آمدنی کا ۳٫۷ فیصد دفاع پر خرچ کرتا ہے۔ ۳٫۸ فیصد تعلیم پر اور صرف ۰٫۹ فیصد سائنس ٹکنالوجی پر صرف کرتا ہے۔ پاکستان اپنی آمدنی کا ۷ فیصد دفاع پر، ۳٫۷ فیصد تعلیم پر اور صرف ۰٫۱۷ فیصد سائنس ٹکنالوجی پر صرف کرتا ہے۔ جبکہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک اگر دفاعی مصارف پر ۵ فیصد خرچ کرتے ہیں تو سائنس ٹکنالوجی پر ۱۰ فیصد کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہیکہ سائنس ٹکنالوجی سے کیسی ناقابل تلافی غفلت برتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر سلام نے زور دیا کہ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے لئے یہ ضروری ہیکہ وہ اپنے مالی وسائل کو مجتمع کریں اور سائنس ٹکنالوجی کی تعلیم و تربیت کے لئے پراجکٹ بنائیں۔

ڈاکٹر سلام جو تیسری دنیا کی اکیڈیمی آف سائنس کے بانی ممبر اور صدر بھی ہیں، انہوں نے بتایا کہ یہ میرا مشن ہیکہ میں ان ممالک کے انداز فکر میں تبدیلی لاؤں" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے ان ممالک میں سائنسی پراجکٹس کے فنڈس کی ضروریات پر ایک رپورٹ بھی مرتب کی ہے، گزشتہ ہفتے انہوں نے ہمارے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقات کی، موصوف نے ڈاکٹر سلام صاحب کی تجاویز و نظریات کو بے حد پسند کیا" اس پر مثبت ردّعمل کا اظہار کیا اور سائنٹفک مزاج اور بہتر ریسرچ کے لئے ماحول ساز گار بنانے اور فروغ دینے

کی ضرورت سے بھی اتفاق کیا اور ہندوستان میں خصوصاً اترپردیش میں ایسے انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔

ڈاکٹر سلام نے بتایا کہ دوسرے سارک ممالک کے سربراہوں بشمول پاکستان کی بے نظیر بھٹو، سری لنکا کے پریم داس اور نیپال کے کنگ بیرندرا سے بھی اس بارے میں گفتگو کی ہے۔ وہ سب اس میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ملکر کام کرنے سے متفق ہیں۔

ڈاکٹر سلام نے ورلڈ بینک کے صدر ڈاکٹر باربر کونابل سے بھی ملاقات کی، تیسری دنیا کے لئے سائنس ٹکنالوجی کے ان پراجکٹس پر ورلڈ بینک کی مالی امداد کی ضرورت ان پر واضح کی اور انہوں نے (۲۰۰) ملین ڈالر کی رقم اس کام کے لئے فراہم کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ یہ رقم ان تین مراکز پر خرچ کی جائے گی جو تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے لئے کیمسٹری، بیالوجی اور ٹکنالوجی کی بابت کھولے جائیں گے اور جن کے قیام کی اجازت حکومت اٹلی نے دے دی ہے۔

ڈاکٹر سلام نے بتایا کہ انہوں نے کویت کے سلطان سالم الصباح سے ملاقات کی جس کے نتیجہ پر سلطان نے عربوں کے لئے سائنس ٹکنالوجی کے میدان میں تربیت کے لئے ۲۵ ملین ڈالر منظور کئے۔ انہوں نے شاہ کویت سے درخواست کی اور توجہ دلائی کہ آج مسلمانوں کو سائنس ٹکنالوجی کے میدان میں جہاد کی ضرورت ہے۔ وہ عام مسلمانوں کے لئے بھی رقم دیں۔ ان کی درخواست کو کویتی کابینہ میں رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایران بھی گئے اور وہاں علامہ منتظری اور دوسرے قائدین سے ملاقات کی۔ ایرانی قیادت نے بھی جدید سائنس و ٹکنالوجی کو عام کرنے سے دلچسپی ظاہر کی۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ وہ بنگلہ دیش کے جنرل ارشاد سے بھی ملیں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کیلئے ان کا یہ پراجکٹ ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

ڈاکٹر بی جی سدھارتھ ڈائرکٹر برلا پلانیٹوریم حیدرآباد نے ڈاکٹر سلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ عظیم ماہر طبعیات اس وقت ٹری ایسٹ اٹلی میں قائم شدہ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر سلام کو ان کے وطن پاکستان میں اٹامک سائنس ریسرچ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۴ء تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ممبر رہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۴ء تک پاکستان سائنس کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۶۱ء سے

[illegible] تک صدر پاکستان کے چیف سائنٹیفک ڈائرکٹر بھی رہے۔ بین الاقوامی سطح پر ڈاکٹر سلام ایٹمی قوت کے پرامن استعمال کی جینوا کانفرنسوں کے سائنٹیفک سیکرٹری بھی رہے۔

ڈاکٹر سلام نے برازیل پلانیٹوریم میں فلکی ذرات کی طبعیات ASTRO PARTICLE PHYSICS پر تیسرا ولیم برازیل میموریل لیکچر دیتے ہوئے ابتدائے آفرینش کے متعلق تفصیل سے اظہار خیال کیا انہوں نے بتایا کہ سائنسدانوں نے کئی نظریات پیش کئے ہیں لیکن وہ سب ظنی اور قیاسی ہیں اور ان کی اب تک توثیق نہیں کی جا سکی۔ ابتدائے آفرینش اور عناصر کے اتحاد کے بارے میں بعض نظریات کی توثیق کے لئے امریکہ اور یورپی ممالک میں پارٹیکل ایکسلریٹرز بنائے گئے ہیں جن کی مدد سے چھوٹے ذرات مثلاً کوارکس QUARKS وغیرہ کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لیکن زیادہ بہتر نتائج کے لئے طاقتور ایکسلریٹرز کی ضرورت ہے جو فی الوقت موجودہ طبعی سائنس کی دسترس اور پہنچ سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ تاہم امریکہ میں سوپر کنڈکٹنگ کولائیڈر کی تیاری زیر غور ہے۔ جن کی مدد سے بعض نظریات کی توثیق کے دلچسپ امکانات موجود ہیں۔ ہبل (HUBBLE) نے اپنے ہبلز لا میں بتایا ہے کہ کہکشاں اور تاروں کے جھرمٹ ایک دوسرے سے بڑی تیزی سے الگ ہو گئے اور جیسا جیسا فاصلہ بڑھتا گیا ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ڈاکٹر سلام نے ابتدائے آفرینش کے بارے میں مختلف نظریات سے بحث کی اور بتایا کہ کائنات میں مسلسل توسیع سے متعلق ہبلز لا سے فی الوقت انحراف کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی تحقیقاتی نظریہ نے اب تک اس سے انحراف کا کوئی جواز فراہم نہیں کیا ہے۔ لیکن آج کل اس میدان میں جو تحقیق ہو رہی ہے اس کے پیش نظر اس صدی کو فلکیاتی سائنس میں ترقی کی صدی قرار دیا اور کہا کہ فلکیاتی علم طبعیات نے محققین کے لئے عالم کے رازہائے سربستہ کے نئے راستے کھول دیئے ہیں اور تحقیقات کا دائرہ زمین سے بڑھا کر پوری کائنات پر پھیلا دیا ہے۔

۸ مئی کی شام میں احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ڈاکٹر سلام کے اعزاز میں منعقدہ جلسہ میں انہوں نے مسلمانوں سے خاص طور پر خواہش کی کہ وہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں آگے آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ خود قرآن حکیم کی (۷۵۰) آیات ایسی ہیں جن میں تحقیق کا [illegible]

اور تحقیق و تسخیر کائنات کے بارے میں کہا گیا ہے ۔ الغرض یہ بھی کہا کہ ہر بات کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی اور دعا مانگنی ضروری ہے۔ دعا کی قبولیت کے بغیر کسی چیز کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے

ڈاکٹر سلام نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ انہیں نوبل پرائز کے اعلان کے بعد اٹلی کی ٹیلیویژن نے ان کا انٹرویو لیا اور پوچھا کہ اسلام میں کیا کمی ہے کہ اس کے صرف ایک سائنسدان نے انعام حاصل کیا حالانکہ اب تک انعام لینے والوں میں ۸۰ فیصد یہودی ہیں ۔ ڈاکٹر سلام نے جواب دیا کہ اس کا مذہب یا قومیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیا کہا ہوتا تو یورپ کے یہودیوں کو کم اور امریکی یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ انعامات نہ ملتے ۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا تعلق ماؤں کی تربیت سے ہے ۔ ہر سائنسدان اور محقق کی زندگی بنانے میں اس کی ماں کی تربیت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے ۔

آخر میں ڈاکٹر سلام نے بتلایا کہ ٹریسٹ (اٹلی) میں قائم ان کے مرکز نظریاتی طبیعیات برائے تیسری دنیا میں جس کے وہ ڈائرکٹر ہیں ، ہر سال ساری دنیا کے (۲۰) ہزار سے زائد سائنسدان جمع ہو کر سنٹر سے استفادہ کرتے ہیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سال (۲۰۰) مسلم سائنسدان سنٹر سے استفادہ کر رہے ہیں۔ نیز تیسری دنیا کے سارے ممالک بھی اپنے ہاں سائنس اینڈ ٹکنالوجی ڈیولپمنٹ سنٹر قائم کر رہے ہیں ، ہندوستان میں بھوپال یا اندور میں قائم کئے جانے والے مرکز تحقیقات سے ڈاکٹر سلام نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا

(سلسلہ صفحہ [illegible])

فرد ـــ اگر وہ اس مقصد کے حصول کے سلسلہ میں جو اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم کیا ہے اپنی مساعی بھر کوششوں میں کوتاہی برتتا ہے ۔ اس سلسلہ میں اپنے رب کے حضور شخصی طور پر جوابدہ ہے

(سلسلہ صفحہ [illegible])

البانیہ ، تونس ، اور الجزائر کے مسلمانوں نے خلافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کی نسبت اپنے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ عثمانی قوم کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا جائے۔

مراکش ، ایریٹریا ، مشرقی و جنوبی افریقہ ، بلقان ، چین ، ایشیائے وسطیٰ ، [illegible] [illegible] ، ہندوستان [illegible] ہر ملک اور ہر مقام کے ہر فرد مسلم اسی طرح [illegible] مسلمان [illegible] [illegible] کا اپنا [illegible] اور قومی فریضہ تصور کرتے تھے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اردو زبان و ادب بیرونی ممالک میں

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی نے فرمایا تھا ـــ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

استاد داغ نے تو اس شیریں تعلق کا اظہار کیا تھا اور اس معیاری اور فصیح زبان کی دھوم کا ذکر کیا تھا جو وہ خود جانتے تھے اور وہ خود بولتے تھے لیکن جب وہ یہ شعر کہہ رہے تھے تو شاید یہ شعر کہلانے والا انہیں بتا رہا تھا کہ عنقریب ہی اس شعر کا دوسرا مصرع اردو کے عاشقوں کی زبان پر اس طرح آئے گا۔ ـــ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

اور آج داغ کے انتقال کے کوئی اسی (۸۰) سال بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذکورہ مصرعے میں اردو زبان کے تعلق سے ہندوستان کی جگہ "سارے جہاں" کے دو لفظ زیادہ معنویت کے حامل ہو گئے ہیں۔ اور جب اردو کے تعلق سے ہم سارے جہاں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہم مراد لیتے ہیں یورپ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، روس، ایران، افغانستان، برما، ماریشس، مشرقِ وسطیٰ کے ممالک بالخصوص متحدہ عرب امارات، کویت، بحرین، قطر اور اپنے پڑوس میں برما کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان اور نیپال اور قدرے فاصلے پر جاپان۔

بہر طور یہاں ملکوں کے نام یا تعداد گنانا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ صرف یہ بیان کرنا مقصد ہے کہ کن ملکوں میں اردو کے تعلق سے کس کس نوعیت کا کام ہو رہا ہے

پاکستان کا ذکر میں یہاں اسلئے نہیں کروں گا کہ پاکستان میں اردو کو جو باوقار مقام حاصل ہے اس سے ہم اہل ہندوستان بخوبی آشنا ہیں ۔ صرف یہی نہیں کہ وہاں کی سرکاری زبان اردو ہے بلکہ وہاں اردو زبان و ادب کے تعلق سے کام کا جو معیار ہے خواہ وہ تخلیقی کام ہے خواہ تنقیدی اور یا تحقیقی وہ کسی بھی ملک کے علمی یا ادبی کام کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے

ہندوستان سے بہت دور امریکہ اور کینیڈا دو ایسے ممالک ہیں جہاں جا کے ہم اردو والے

…نہ آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتے۔ امریکہ کی بائیس یونیورسٹیوں میں اردو مختلف سطحوں پر پڑھائی جاتی ہے۔ دونوں ملکوں میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ اور یونیورسٹیوں سے باہر علم و ادب کا ذوق رکھنے والے دانش ور حضرات اور بالخصوص نئی نسل کے لوگ اردو پڑھنے اور اردو کے اہل قلم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے آرزومند ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں مقیم اہل ہندوستان اور اہل پاکستان کی اور اقبال کے نام پر قائم کی ہوئی انجمنیں اس سلسلے میں بہت کام کر رہی ہیں۔ اقبال کے متعلق جاننے کی تشنگی باہر کے ملکوں میں کس قدر زیادہ ہے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔

شکاگو یونیورسٹی میں چودھری نعیم اردو کے پروفیسر ہیں۔ میں ان کے رفقائے کار ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری میں اردو کتابوں کا حصہ دیکھ کے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ تعداد اور موضوعات دونوں اعتبار سے یہ ایک نادر ذخیرۂ کتب ہے۔

ان دونوں ملکوں کے طول و عرض میں کوئی بڑا شہر ایسا نہیں ہے جہاں مشاعرے منعقد نہ ہوتے ہوں۔ ان ملکوں میں میرا ایک سفر ایسا بھی تھا جو صرف مشاعروں میں شرکت کے لئے تھا۔ ایک ماہ قیام کے دوران میں کوئی بیس کے قریب شہروں میں مشاعرے منعقد ہوئے جن میں ٹورنٹو، مانٹریال، کیلگری، ایڈمنسٹن، نیویارک، نیوجرسی، واشنگٹن، لاس اینجلس، ہوسٹن، میامی، شکاگو اور بوسٹن کے مشاعرے قابلِ ذکر ہیں۔

کینیڈا میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے صرف اردو کی انجمنیں ہی کام نہیں کر رہی ہیں بلکہ وہاں اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ ایک سہ ماہی تو ایسا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی مدیرانِ جرائد اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا نام ہے "اردو انٹرنیشنل" یہ ٹورنٹو سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر ہیں اشفاق حسین جو خود اردو کے ایک اہم جدید شاعر ہیں اور جو ہندوستان اور پاکستان کے کئی بار علمی اور ادبی دورے کر چکے ہیں۔

ان کی اردو نظموں کا انگریزی ترجمہ کوئی دو برس ہوئے کتابی صورت میں THAT DAY WILL DAWN کے نام سے کینیڈا میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں اصل اردو نظمیں بھی موجود ہیں۔ دوسرا اہم جریدہ ششماہی ہے اور اس کا نام ہے "اردو کینیڈا" یہ بھی اردو کی اشاعت…

رسالہ نکلتا ہے لیکن یہ انگریزی میں ہے۔ اس کا مقصد امریکن اور کینیڈین لوگوں کو اردو ادب سے آشنا کرانا ہے۔ یہ کالج سے نکلتا ہے اور اس کے ڈائرکٹر اردو کے مشہور شاعر [illegible] ہیں جو اشفاق حسین کی طرح مستقل طور پر کینیڈا ہی میں مقیم ہیں۔ افتخار نسیم ان کے دست راست ہیں اور مل کر اردو کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔

کینیڈا اور امریکہ میں ہندوستان اور پاکستان کے جو اہل قلم مستقل طور پر آباد ہو چکے ہیں ان میں شعرا اور نثر نگار حضرات کی بھی کمی نہیں کینیڈا کا ذکر حیدر بخت، کرنل انوار احمد، حنیف اخگر، تقی قریشی اور نزہت صدیقی کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا اور امریکہ کا ذکر پرنس مظفر شکوہ، افتخار نسیم احمد خان، خواجہ خالد اور اعجاز نقوی کے بغیر۔

روس میں بھی اردو کی صورت حال بہت امید افزا ہے۔ وسط ایشیائی یوری پبلکس جیسے ازبکستان، تاجکستان وغیرہ، وہاں اردو اسکول باقاعدگی سے چل رہے ہیں۔ آج سے کوئی پچیس سال قبل وہاں کے بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے ڈاکٹر قمر رئیس کا انتخاب ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ اب وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ خود ہی ان اسکولوں میں اردو اساتذہ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

اردو کی درس وتدریس کا سلسلہ روس کی یونیورسٹیوں میں بھی باقاعدگی سے جاری ہے۔ ڈاکٹر وکٹر بالن یونیورسٹی آف لینن گراڈ میں صدر شعبہ اردو ہیں۔ ڈاکٹر تاسانیا اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ جموں میں رہنے والے میرے محترم سامعین کو شاید یاد ہو کہ ڈاکٹر وکٹر بالن ہم لوگوں کی دعوت پہ جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تشریف لا چکے ہیں۔ انہوں نے ایک لیکچر اردو افسانہ نگاری پر دیا تھا اور ایک منشی پریم چند کی افسانہ نگاری پر۔ اسی طرح سے ماسکو یونیورسٹی سے ہمارے شعبہ اردو پہ لیگا ویناسات شا اور نینا گوری ششینا بھی تشریف لا چکی ہیں۔ اول الذکر نے اقبال اور غالب پہ اور ثانی الذکر نے شاعری اور نثر نگاری پر لیکچر دیئے تھے۔

اسی لینن گراڈ یونیورسٹی میں پروفیسر زوگراف تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔ پروفیسر زوگراف اردو کے علاوہ کئی دیگر زبان وادب کے فاضل ہیں۔ میر امن کی باغ وبہار کا روسی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

پروفیسر الیکس اوزوف ماسکو یونیورسٹی میں انڈین فائی لالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اردو کی تذکیر و تانیث انداز میں افغانی گفتار سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ اردو تذکیر و تانیث کے مسئلے پر پروفیسر اوزوف کے خیالات بڑی حد تک میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئے۔ بات چیت میں امر کے بعض اصولوں کے علاوہ پریم چند، غالب اور اقبال بھی زیر بحث آئے۔

میرے معزز سامعین لڈمیلا ویسلوا کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ لڈمیلا جو ماسکو سے وابستہ ہیں اردو کی نامور اسکالر ہیں اور ہندوستان کے لکچروں اور سیمناروں میں وہ اپنے بہا مقالات پیش کر چکی ہیں۔ لکھنؤ کے حالیہ سیمنار میں ان کا مقالہ سیمینار کا حاصل قرار دیا گیا۔ قبل غالب انسٹیٹیوٹ کے سیمنار میں غالب پر ان کا مقالہ بھی بہت پسند کیا گیا۔

سوویٹ رائٹرز یونین کی چیئرپرسن مریم سلگینک اور ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر چیلی شیو اس بے تکلفی سے بات کرتے ہیں کہ من کے حیرت ہوتی ہے۔

برطانیہ تو ایک طرح سے اردو کا گھر ہے لندن یونیورسٹی میں اردو کے ایک عاشق اور عالم رالف رسل نے جو بیج بویا تھا اب ایک تناور درخت بن گیا ہے جس کے زیر سایہ نئی نسل اور طالبات پروان چڑھ رہے ہیں۔

اردو مرکز لندن کا ایک بہت بڑا علمی اور ادبی ادارہ ہے۔ اردو اور انگریزی کے نامور الطاف گوہر اس کے صدر ہیں اور مقبول و معروف شاعر افتخار عارف اس کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ ورلڈ اسلامک سینٹر لندن بھی اردو کی بڑی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ دونوں ادارے بخاری، فارغ بخاری، سوہن راہی، رشید احمد صدیقی اور عبدالرحمٰن بزمی کی کوششوں سے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔

عاشور کاظمی، بجنش لائل پوری، اور اطہر راز برطانیہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ رواں کا کام دے رہے ہیں۔ آج اگر یہ کہا جائے کہ برطانیہ کے مختلف شہروں میں مشاعرے سیمنار برطانوی تہذیب و تمدن کا حصہ بنتے جا رہے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

"یورپ میں اردو" بجائے خود ایک الگ مضمون ہے جو اس مختصر سی بات چیت میں نہیں سما سکتا

لیکن اس وقت میں اپنے معزز سامعین کو اور بالخصوص سامعین جموں کو آنا یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ سنسکرت اور اردو کے اسکالر پروفیسر ن تین جو یونیورسٹی آف کوپن ہیگن میں استاد ہیں ایک سے زیادہ بار جموں تشریف لا چکے ہیں اور جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں وہ اردو عروض پر لیکچر معزز لیکچر دے چکے ہیں۔ اس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈنمارک میں اردو کا مستقبل کس قدر شاندار ہے۔ برطانیہ، ناروے، سویڈن اور دوسرے یورپی ممالک کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اردو پروگراموں کا ذکر میں نے عمداً نہیں کیا کیونکہ یہ پروگرام وقتاً فوقتاً ہم تک پہنچتے رہتے ہیں۔

برما کے مختلف شہروں بالخصوص رنگون اور مانڈلے میں اردو کی محفلیں اکثر گرم رہتی ہیں بزم شعرائے اردو حلقۂ احمر، غالب انسٹی ٹیوٹ، اور اسلامک سنٹر آف برما چند ایسے ادارے ہیں جن کے ہاتھ میں اردو کا مستقبل محفوظ بھی ہے اور تابناک بھی۔

متحدہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین اردو مشاعروں کے خاص مرکز ہیں۔ یہاں اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام موجود ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اردو کے پروگرام باقاعدگی سے براڈ کاسٹ اور ٹیلی کاسٹ کرتے رہتے ہیں۔ عرب نژاد شاعر زبیر فاروق تو اردو میں شعر کہتے ہیں۔ "آیاتِ کرب" ان کا مجموعہ کلام ہے۔ جو عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔

اس معاملے میں جاپان بھی کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ پروفیسر آراگا تو اب شاید بوڑھے ہو چکے ہیں ان سے ملاقات کئے زمانہ ہو گیا ہے: پروفیسر سوزوکی تکیشی یونیورسٹی آف ٹوکیو میں اس وقت اردو کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے نامور اہل قلم پر معیاری مقالے لکھے جا رہے ہیں جن میں تحقیقی مقالے بھی شامل ہیں۔ ●●

(بسلسلہ صفحہ ۳۶)

ایک بہی بنیادی کام ہے۔

اور پھر اس مذکورہ بنیادی کام میں ہر شخص میں کتنا خلوص ہے، یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ کیونکہ اس میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دینا ہوگا، اسے ملے گا کچھ بھی نہیں! اردو کا کاروبار تو بہت ہو چکا اب کچھ بنیادی کام بھی ہو جائے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار
ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری
پٹنہ

ماں کی ردا۔ جو دن ہوئے نیلام ہو چکی

اردو میری وہ ماں ہے جس کی ردا پچھلے چالیس سال میں ریزہ ریزہ نیلام ہوتی رہی ہے میں نیلام پر چڑھی اس ردا کو اب واپس لینا چاہتا ہوں میرے ساتھ جس جس نے اس ماں کا دودھ پیا ہے اس سے دودھ اپنا حق مانگ رہا ہے۔

پٹنہ میں ادارہ تحقیقات اردو خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اردو ریسرچ کانگریس میں پچھلے تین برسوں سے اردو مسائل پر غور و فکر کے لئے جو سلسلہ چھڑا ہے، اس بار کی تیسری اردو کانگریس میں ادھر ادھر کے مسائل کو چھوڑ کر براہ راست بنیادی مسئلوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ پہلا مسئلہ اردو دانشوری کا جائزہ تھا اور دوسرا خود اردو زبان کی بقا کا مسئلہ تھا۔

اردو دانشوری کا جائزہ' یہ خصوصی موضوع اردو دوستوں کو اس امر کی طرف موڑنے اور توجہ دلانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا کہ اب سے پہلے ہمارے لکھنے والے اپنے اردگرد سارے مسائل پر سوچا کرتے تھے اور اپنی سوچ کو سنجیدہ تحریروں میں قلمبند بھی کیا کرتے تھے اور صرف یہ نہ ہوتا تھا کہ اہل قلم نظمیں، غزلیں، افسانے، ادبی تنقیدیں، ادبی تحقیقیں لکھ کر ہٹ جائیں۔ سرسید شعرائے دہلی کے احوال لکھتے تھے تو آثار قدیمہ پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔ اکبر اور فیروز شاہ کی تاریخوں کو بھی مرتب کرتے تھے۔ معاشرتی مسائل پر بھی قلم اٹھاتے تھے۔ شبلی اگر انیس و دبیر کا موازنہ کرتے تھے تو مابعد الطبیعاتی، فلسفیانہ اور کلامی مسائل پر بھی لکھتے تھے، تاریخ اسلام پر بھی لکھتے تھے تہذیبی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بناتے تھے اور ان علوم کی تمام شاخوں کے مطالعہ میں اور ان کے لکھنے میں اپنا وقت لگاتے تھے جو ان کے عصری سماج پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ آج ویسا کیوں نہیں ہوتا۔ اس پر بھرپور بحث کرنی تھی۔ خاص بحث ہوئی بھی۔

لیکن بات وہیں پر آ گئی کہ دانشوری کا تعلق ادب کی پہچان ہے مگر: یہ ادب جس زبان کا ادب ہے، اس زبان کا حال ہی بگڑ گول ہے تو ادب میں وہ جان کہاں سے آئے دانشوری [illegible] ہے

تو اصل، اہم بنیادی مسئلہ تو خود زبان کا مسئلہ ہوا جس پر چالیس سال کی مدت میں رنجیدہ ہو کر سوچا گیا مگر سنجیدگی سے سر جوڑ کر بھرپور انداز میں کبھی بات نہ ہوئی۔ مقصد تھا کہ اس پر کچھ دیر بات ہو کہ ہر سال سرکار اردو پر مجموعی طور سے تیس کروڑ کی رقم صرف کرتی ہے تو اس سے اردو کا بنیادی کام کس حد تک ہو پاتا ہے کس حد تک نہیں ہو پاتا۔ ریسرچ کانگریس نے یہ اجلاس اس لئے بلایا تھا کہ مخلص لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مسائل پر سنجیدگی سے کچھ دیر بات کر سکیں۔ اپنے وقت کی، اپنے آرام کی اور اپنی توانائی کی قربانی دیں تاکہ سامنے کے مسائل سے آنکھیں چار کر سکیں اور آنے والی نسلوں کے سامنے ہم کسی جگہ تو سرخرو ہو سکیں۔ اس پر گفتگو کر لیں کہ اگر اردو کا بنیادی کام نہیں ہو رہا ہے تو اس میں سرکار کی بدنیتی ہے، یا خود ہم اردو والوں کو سانس لے کر ٹھہر کر یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے کہ ہماری ترجیحات کیا ہیں۔ اس پر گفتگو کر لیں کہ بستیوں پر چھیڑ لگو کب تک، جڑیں کب تک سوکھتی رہیں گی۔ اس پر گفتگو ہو لے کہ اردو کی موجودہ تحریک اور ادب کے سربراہ موجودہ اداروں کے نگہبان اور موجودہ تنظیموں کے ذمہ داران اور سرکار کی تیس کروڑ کی رقم اردو کے لئے امداد کے مستفیدان" زیادہ سے زیادہ اگلے چالیس سال اور زندہ رہیں گے لیکن اس کے بعد" نئی نسلوں کا ایک قافلہ بھی تو آئے گا اور اس کے بعد اردو تہذیب اور اردو زبان اچھی یا بری شکل میں رہی اس کا نام تو تاریخ کا حصہ بنا ہی رہے گا۔

پھر براہ راست ایک سوال کا جواب تلاش کرنا تھا کہ: آنے والی تاریخ میں ہم سب اپنے لئے انفرادی فائدہ اٹھانے کے بجائے اس مشن کو تقویت دینے کے لئے کیا کر پا رہے ہیں، جس اہم مشن کی کامیابی اور ناکامی پر ہماری زندگیوں کے بعد اردو کی تقدیر کا انحصار ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس دنیا سے رخصت ہوں اور آنے والے سوالوں کے جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہ رہیں، کیا یہ اچھا نہیں کہ آج، اس وقت، ہم اپنے آپ سے سوال کر لیں، ایسے جواب جس میں سود و زیاں کے کاروبار سے بے نیاز ہو کر اپنی تہذیب کو بچانے کا کچھ سامان کر لیا جائے، وہ تہذیب جو اس ملک کا قابلِ فخر ورثہ ہے۔

بہت سی باتیں ہوئیں، کچھ رہ بھی گئیں، ہم لوگ اب جیسے بھی ہیں (آخر یہ بتانے تو نہیں جا سکتے!) اس لئے جب کسی قومی مسئلے پر بات ہوتی ہے تو گرمی زیادہ ملتی ہے، روشنی کم!

اردو مسئلہ میں بنیادی بات اس بار صرف اس نکتہ پر کرنی تھی کہ سرکاری نیم سرکاری اردو اداروں اور تنظیموں کو حکومت جو امداد دیتی ہے اس کے جو مصرف ہیں' ان میں "اس صدی کے بعد بھی اردو پڑھنے والے ملیں" اس نکتے کو ملحوظ رکھا جاتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اگر ایسا نہیں ہو رہا ہے تو محض بے خیالی ہے یا پھر ان کے دستور میں کوئی کمی ہے۔ اجلاس میں اردو اداروں اور تنظیموں کی قابلِ لحاظ نمائندگی سے ابہام و تفہیم کی فضا قائم رہی' ساتھ ہی اردو تحریک اور اردو ادب کے اہم لوگ بھی جلسے میں موجود تھے۔ تین مرکزی جامعات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے خود وائس چانسلر سید ہاشم علی تھے۔ جامعہ کی نمائندگی اردو کے پروفیسر حنیف کیفی کر رہے تھے دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالحق تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر سید حامد صاحب اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ ساہتیہ اکادمی سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اکادمی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ترقی اردو بورڈ نے ڈاکٹر ابو محمد سحر کو نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ اردو اکادمیوں کی نمائندگی سراج الدین صاحب' شاہد مشتاق صاحب' شین مظفر پوری صاحب' ڈاکٹر عبدالاحد صاحب' حفیظ اللہ نولپوری صاحب علاوہ ازیں بہار اقلیتی کمیشن کے وائس چیئرمین' اقلیتی کمیشن کے رکن، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ایجوکیشن ایڈوائزر' این سی۔ ای آر ٹی کے مشیر' اردو ٹکسٹ بک کارپوریشن کے مشیر' آل انڈیا ریڈیو بھی اور دوردرشن کے نجی طور سے شریک، ماہرین دس اہم اخبارات اور دو درجن سے زیادہ اردو مسئلہ سے شغف رکھنے والے مصنف' مفکر اور ادیب اجلاس میں شریک رہے۔

اردو کے سلسلے میں جہاں اصل مسئلہ پر باتیں ہوئیں وہاں اردو اور روٹی روزی کی بات اردو کے لئے سنٹر کھلنے نیز نکل آنے کی بات' پبلک مفاد سے اردو کے رشتے کی بات اور زبان اور رسم الخط کی بھی بات ہوئی۔ یہ سب اردو کے مسئلے کی جہات ہیں اور ان امور پر باتیں کرنا ضروری ہیں۔ شرکاء میں سے بہتوں نے اہم خاص گفتگو ان مسائل پر ہی کی۔ لیکن ہمیں سمٹنے، توجہ مرکوز کرنے اور غیر محدود کو محدود بنانے کی عادت نہیں رہی ہے۔ اس لئے مرکزی خیال کا دامن بیشتر ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں لوگ اس لئے نہیں جمع ہوئے تھے کہ سرکار سے کچھ طلب کریں۔ جمع اس لئے ہوئے تھے کہ پہلے آپ سے کچھ مانگیں مسئلہ اس وقت قطعی یہ نہیں تھا کہ

کس ریاست میں دوسری اور تیسری سرکاری زبان بنوایا جائے، بلکہ صرف اتنا کہ خود اردو والوں کے گھر کی زبان تو بنی رہ جائے! کوئی مالک رام یہ تو نہ کہے کہ اب میرے بعد کچھ دن میں میری کتابوں اور دیگر ذخیرے کو استعمال کرنے والا گھر میں تو کوئی رہے گا نہیں، اس لئے اس سارے اندوختے کا کرنا کیا ہے! مسلم یونیورسٹی میں پڑھنے والے بچے کا باپ اس پر تو فخر نہ کرے کہ میرے بچے کو اردو نہیں آتی، وہ انگریزی یا ہندی میں خط لکھتا ہے۔ میں اردو کی اس تقدیر کے خلاف لڑنا چاہتا ہوں جو ہم خود بنا رہے ہیں۔ یہ ان کی قدرتی سرنوشت نہیں ہوئی تھی جو ہمارے ہاتھوں لکھی جا رہی ہے! یوپی اور بہار، دہلی، حیدرآباد، بھوپال اور ٹونک، بنگلور اور میسور کا اردو بولنے والا مسلمان ۱۹۴۷ء کے بعد، پہلے بجرنگ بلی نعرے پر اب کراچی یا ڈھاکہ کا رخ نہیں کرتا، اس کی یہ کشتیاں جل چکیں، پنجاب اور دہلی کا سکھ، ہند سماچار کا ہندو قاری اور پریم چند سے گیان چند تک کی نسل کے اردو استعمال کرنے والے ان گنت ہندو بھی اپنے گنگا جمنی ورثے سے دست بردار ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہیں۔ آنند نرائن ملا اس تاریخی قافلہ کا تنہا راہی نہیں جو کہتا ہے میں اپنے مذہب سے دست بردار ہو سکتا ہوں، اپنی مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا! لیکن اردو والے ایک مدت سے بے حسی کا اس بری طرح شکار رہے کہ لگتا ہے کہ کہیں کوئی ایک کڑی ٹوٹ گئی ہے جس سے مکمل رشتۂ خیال شکستہ ہو گیا ہے۔ نتیجہ میں ساری منصوبہ بندی (اول تو منصوبہ بندی ہے ہی کہاں) جو بھی ہے گستہ، شکستہ، شکست خوردہ ہے۔

ہماری عرض یہ ہے کہ ابھی اور کچھ نہیں کرنا ہے صرف مل کے بیٹھنا ہے، بار بار ملنا ہے، جلد جلد ملنا ہے اور اردو کو اس صدی کے بعد بھی باقی رکھنے کا منصوبہ بنا لینا ہے۔

اردو مسئلے کے سفر کے پورے پھیلاؤ کو یکدم حل کرنے کی کوشش زیادہ سود مند نہیں۔ میرے خیال میں اس کی چار پانچ منزلیں تقسیم کر کے یہ سفر طے ہو تو کچھ حاصل بھی ہوتا جائے گا اور ہم تھکنے سے بھی بچ جائیں گے۔ اور پہلی منزل ان تمام اردو اداروں، اکادمیوں، بورڈوں، ریجنل سنٹروں ریاستی آرگنوں، مرکزی اور ریاستی سرکاری تعلیمی تنظیموں، انجمنوں، اہم جامعات کے اردو شعبوں کو اردو کے بنیادی کام کی طرف قطعیت کے ساتھ ایک موڑ دینا ہے تاکہ اس صدی کے بعد بھی ہمارے پڑھنے والے ہمیں مل سکیں۔ بس صرف ون پوائنٹ پروگرام لے کر چلا جائے اور اس کے لئے پانچ ورنہ منزلیں ہوں تو دس سال لگا دیئے جائیں تاکہ پچھلے چالیس سال کا [illegible] ہو سکے، اس وقت ایک

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

محمد اسحاق

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ

کوئی بیس برس قبل کی بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر ایک آل انڈیا سیمینار جوبلی ہال میں ہوا تھا۔ اس میں ملک کی مشہور سوشیل ورکر شریمتی درگا بائی دیشمکھ نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ مہاراشٹرا کے کسی اسکول میں بھائی بہن دونوں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سالانہ امتحان میں بھائی فیل ہوگیا اور بہن کامیاب ہوگئی۔ دوسرے دن ان کی ماں اور باپ دونوں ایک درخواست کے ساتھ اپنی لڑکی کو لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچے اور خواہش کی کہ بہن کو فیل کر کے بھائی کو ترقی دی جائے اس کیلئے بہن بھی راضی ہو چکی تھی

صالحہ عابد حسین نے مولانا الطاف حسین حالی کی مختصر سوانح حیات بچوں کے لئے لکھی ہے اس میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ مولانا حالی اپنی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ چھوٹی سی تھیں تو اس وقت پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ انہیں بس قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ لکھنا سیکھنا تو لڑکیوں کے لئے بہت برا سمجھا جاتا تھا مگر وہ لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ یہ توے کی کالک کی سیاہی اور لکڑی کے ٹکڑے کا قلم بنا کر چھپ چھپ کر آسان اردو کی کتاب سے نقل کر کے لکھنا سیکھ گئیں۔ ایک دن ان کی دادی (حالی کی بھاوج) نے دیکھ لیا۔ خفا ہوئیں اور حالی سے کہنے لگیں۔

"مبارک ہو۔ اب تمہاری لڑکی خط پتر لکھا کرے گی۔
خوب خاندان کا نام روشن ہوگا۔

حالی نے سنا ہنس پڑے۔ اس لڑکی کو خود لکھنا سکھایا، پھر اس کے بعد خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ہوا۔ یہ بات کوئی ایک سو برس پہلے کی ہے۔ نئی تعلیم پھیلانے کا کام

* ریٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد

سرسید نے کیا لیکن مسلمان لڑکیوں میں تعلیم پھیلانے کا کام حالی نے شروع کیا" اس زمانے میں اکبر الٰہ آبادی آزادیٔ نسواں اور تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں لڑکیوں کی تعلیم و ترقی پر گہرا طنز موجود ہے۔

؎ حامدہ چمکی نہ تھی تعلیم سے بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی بارہ تا پندرہ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ان کی نصف آبادی ۴۹ فیصد عورتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں پڑھی لکھی عورتیں صرف ایک فیصد ہیں اور مسلمان مردوں میں ۱۹ فیصد پڑھے لکھے ہیں۔ اس طرح جملہ ۲۰ فیصد آبادی پڑھی لکھی ہے اور ۸۰ فیصد ناخواندہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں علم و عقل کا ۸۰ فیصد خطہ ابھی تک بنجر ہی رہ گیا ہے۔ یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ ہماری نصف آبادی کو پڑھنے لکھنے سے دور رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ سیکڑوں برس سے ہماری بے دلی، بے توجہی اور بےحسی کا شکار رہا ہے۔ آج بھی اگر آپ اکثر ماں باپ سے لڑکیوں کی تعلیم پر گفتگو کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے لئے تعلیم کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

اوپر کی دو مثالوں سے یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہے اور پھر زمانۂ قدیم سے جو روایات چلی آرہی ہیں وہ تو لڑکیوں کی تعلیم میں زبردست رکاوٹ ہیں جس طرح ہم لڑکوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں اور ان پر جو کچھ روپیہ خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں ویسا اپنی بیٹی کے لئے نہ تو تیار ہیں اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔ چند ایک وجوہات تو ہم سب جانتے ہیں

۱۔ لڑکی کی روزِ پیدائش ہی سے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس پر جو خرچ ہوگا وہ سب پرایا ہے۔ اصل کام تو اس کی پرورش ہے اور بڑی ہو جائے تو شادی ہو کر دوسرے گھر چلی جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

۲۔ چند لڑکیوں کا حال ہمیں معلوم ہے۔ وہ چھٹی اور ساتویں جماعت تک تو بہت تیزی سے پڑھتی گئیں، اس کے بعد اسکول سے غائب رہنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ گھر میں چھوٹے بھائی بہنوں کا اضافہ ہو گیا ہے، ان کا دیکھ بھال کی ذمہ داری ان بڑی بہنوں کو لگ گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اسکول چھوٹ گیا، خاندان میں افراد کی زیادتی سے گھر بار اور چولہے کا کام

ٹوٹ گئی۔ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لئے بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ پس ان کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بہت کم میٹرک کلاس تک پہنچ پاتی ہیں۔

۳۔ ساتویں، آٹھویں جماعت تک پہنچنے تک لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں۔ مائیں فکر میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ زمانہ تعلیم کے ترک کرنے یا جاری رکھنے کے لئے فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔

۴۔ آج کل تعلیم پر اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ اسکول کی فیس، سواری کا خرچ، مہنگی کاپیاں، کتابیں، یونیفارم پر کافی خرچ آتا ہے۔ جن خاندان میں چار پانچ بچے ہوں تو ترجیح لڑکوں کی تعلیم پر دی جاتی ہے۔ غریب خاندانوں میں لڑکیاں کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کر کے سات آٹھ سال کی عمر ہی سے آمدنی میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ متوسط طبقے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ لڑکی کی تعلیم کے اخراجات کس حد تک برداشت کئے جائیں۔ اگر زیادہ قابل بھی بنا دیں تو پھر سسرال ہی کا فائدہ ہے۔

۵۔ جن گھروں میں کچھ فراغت ہے وہاں بھی میٹرک، انٹر کے بعد لڑکیوں کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب فکر ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر کہیں پیام طے نہیں ہوا ہے تو ان کی تعلیم ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کی ہوتی ہے۔ کس وقت دولہا آیا اور دوسری ٹرین سے انہیں ساتھ لیتا گیا۔ چاہے گریجویشن کا امتحان مہینے دو مہینے ہی رہ گیا ہو۔ یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ سچ یہ ہے کہ پھر کبھی نہیں دیکھا جائے گا۔

لڑکیوں کی تعلیم کیوں ضروری ہے

جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم اور ذہانت کا تعلق ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ فطرتاً لڑکیاں زیادہ محنتی اور زیادہ دلچسپی سے پڑھنے والی ہوتی ہیں۔ تعلیم میں انہماک قابل داد ہوتا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت رشک کرتی ہیں۔ اس لئے شاید مقابلے کی اسپرٹ بہت کام کرتی ہے۔ وہ اکثر لڑکوں کے مقابلے میں تعلیم میں بہت آگے رہتی ہیں۔ حال ہی میں تعلیم نسواں کے سلسلے کے ایک سیمینار میں وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے بتایا کہ یونیورسٹی میں ۴۰ فیصد طالبات ہیں۔ لیکن گولڈ میڈل پانے والوں کی فہرست میں ۷۰ فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

لڑکیوں کو ان پڑھ اور جاہل رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پر بہار درخت ساری عمر

پھول اور پھل سے محروم رہ گیا ہو۔ ایک لڑکی کی تعلیم سے پورا خاندان روشن ہو جاتا ہے۔ وہ جس گھر میں جائے گی عزت پائے گی۔ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھا سکے گی۔ خاندان کے بچوں کی رہبری کرے گی۔ ہمارے تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ جو لڑکیاں بی۔ ایڈ کامیاب ہو گئیں ان کے جلد جلد بیاہ ہو گئے۔ ان کی وجہ سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ نئے گھر، نئے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت اپنے میں پاتی ہیں۔ بہت جلد اس گھر میں باعزت مقام پیدا کر لیتی ہیں۔ پڑھی لکھی بہو سارے خاندان میں ایک جگمگاتا چراغ ہے۔ صورت شکل کے ساتھ، پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بات کرنے کا سلیقہ، تہذیب شائستگی اور خود اعتمادی ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔ جو لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں گو خوبصورت ہی کیوں نہ ہوں، اکثر انہیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ابھی تک کسی سنجیدگی کے ساتھ ملک میں تحریک کا مقام حاصل نہ کر سکا اور اس سلسلے میں ہمارے ذمہ دار لیڈر، رہنما، دانشور اور دردمند حضرات کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لڑکیوں کو کم از کم ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانا ضروری سمجھا جائے جو میٹرک تک پڑھالیں تو بہت اچھا ہے۔

عورت کی عظمت کا راز اقبالؒ نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

جب عورت پڑھی لکھی نہ ہو تو تصویرِ کائنات میں رنگ بے رنگ رہ سکتا ہے۔ ساز کے تاروں سے زندگی کے وہ سب راگ پیدا نہ ہو سکیں گے جو ایک اچھی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی باوجود تعلیم نسواں کے مخالف ہونے کے وہ بھی اس بات کے قائل ہیں۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ (قسط ۔)

ڈپٹی کمشنر کی ڈائری

گھو پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

"حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقان آفتاب طریقت ماہتاب معرفت جناب مخدوم زادہ غلام مرشد خاں صاحب پیر، لینڈلارڈ اینڈ لیڈر ۔"

یہ کسی مزار کا کتبہ نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان کا تعارفی کارڈ ہے۔ جو ایک بڑی گدی کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ پکی سڑکوں پر ماسٹر بیوک استعمال کرتے ہیں رکوں کے لئے شیورلٹ اسٹیشن ویگن ہے۔ شکار کے لئے جیپوں کا انتظام ہے۔ اس کے دس بارہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہیں جن پر وہ خود کبھی سوار نہیں ہوتے۔ تین ساڑھے رجن نسل کتے ہیں جن کی خدمت کے لئے بہت سے خادم مامور ہیں۔ کبوتروں کا بھی شوق کا ہے ماہے بٹیروں کی پالی سے بھی جی بہلا لیا کرتے ہیں۔

درگاہ شریف پیر درویشانہ ٹھاٹ ہیں لیکن مریدوں کی سہولت کے لئے کئی بڑے بڑے مقامات میں جدید طرز کی کوٹھیاں بنا کر رکھی ہیں۔ گدی کے نام دو ہزار ایکڑ اراضی وقف ہے سال بھر میں مریدان باصفا سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نذرانہ وصول ہو جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ دنیاوی مال و متاع کا اجتماع راہِ سلوک کا راہزن ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے کی سلامتی کے لئے سجادہ نشین صاحب روپیہ پیسہ جمع کرنے کی خطا نہیں کرتے اور گاہ شریف کی ساری آمدنی بڑے سلیقے سے ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں

مری، کوئٹہ، ایبٹ آباد، اور سردیوں میں لاہور، پشاور اور کراچی کے شہروں کو تحفیق پہنچایا جاتا ہے۔ سالانہ عرس کے موقع پر گاؤں کے لوگ روحانی ثواب حاصل کرتے ہیں اور اس طرح سجادہ نشین صاحب سارا سال اپنے مریدوں کی خاطر دینی اور دنیاوی مجاہدوں میں منہمک رہتے ہیں۔

سالانہ عرس شریف کا آخری دن ہے۔ محفلِ سماع کے لئے دھوم دھام کا اہتمام ہے۔ عود، لوبان اور اگر بتیاں سلگ رہی ہیں۔ گلاب پاشی بسے ہوئے ہیں۔ مشک کافور کی مہک فضا میں رچی ہوئی ہے۔ سجادہ نشین صاحب منقش لبادہ پہنے گدی پر متمکن ہیں۔ چہرے پر جمال اور آنکھوں میں جلال ہے۔ سامنے باریک چقوں کے پیچھے عورتوں کی مجلس ہے سجادہ نشین صاحب کی چشم بصیرت بڑی خوش اسلوبی سے چقوں کے آر پار گھوم رہی ہیں گدی کے بائیں ہاتھ افسرانِ ضلع کی نشستیں ہیں۔ دائیں جانب پیر بھائی، رؤسا اور سیاست پیشہ احباب براجمان ہیں۔ ایک کونے میں درویشوں کا گروہ ہے، جن پر قوالی کے دوران یکے بعد دیگرے "حال" طاری ہوگا۔ وجدان کی سہولت کے لئے لاہور سے طریقت پسند لڑکوں کی ایک پارٹی بھی آئی ہوئی ہے اور وہ باریک ململ کے کرتے اور ترچھی ٹوپیاں پہنے بڑے ادب سے دو زانو بیٹھے ہیں۔ ان سب کے درمیان قوالوں کی ٹولی اپنا ساز و سامان لئے مستعد بیٹھی ہے اور پیچھے حدِ نگاہ تک زائرین کا اجتماع ہے۔ یہ عقیدت مند دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس سواری کے لئے نہ موٹریں ہیں نہ گھوڑے اور بگیاں ہیں۔ لیکن ہر سال روحانیت کی کشش انہیں سفر وسیلۂ ظفر کی ہر دشواری اور صعوبت کے باوجود یہاں کھینچ لاتی ہے۔ شاید یہ لوگ اپنے ہل کا بیل فروخت کر کے یہاں آئے ہیں۔ شاید انھوں نے اپنی بیویوں کا زیور یا اپنی بیٹیوں کے جہیز گروی رکھ کر نذرانے کا بندوبست کیا ہے؟ شاید جب یہ واپس لوٹیں گے تو انہیں کئی کئی روز فاقوں کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کی گندم کے فالتو ذخیرے درگاہ شریف کے لنگر کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

قوالوں کی پارٹی نے بڑی خوش مستی کے ساتھ ہارمونیم کا ساز چھیڑا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی۔ حافظ کی غزل فضا میں لہرائی۔ درویشوں کے سر گھومنے لگتے ہیں، طریقت پسند لڑکے بیٹھے ہی بیٹھے بڑی ادا سے کمر مٹکاتے ہیں۔ سجادہ نشین صاحب کا سرِ چپل لہر تو بھی جنبش میں آجاتا

ہے جیسے بین کی آواز پر سانپ کا پھن لہرا رہا ہو۔ ایک ایک بول، ایک ایک تال پر روحیں بے اختیار تھرکتی ہیں۔ اکثر لوگ اپنے وقار کی بندشوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی محض سر دھننے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سیاست پیشہ اصحاب بھی اپنے منصب کی رعایت سر کی جگہ چوری چوری پاؤں ہلاتے ہیں۔ دیہاتی عقیدت مندوں کا ہجوم جو اکثر فارسی زبان سے بے بہرہ ہے نہ سر ہلاتا ہے نہ پاؤں۔ لیکن پیر بھائی، درویش اور طریقت پسند لونڈے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار گردنیں مٹکاتے ہیں، سجدوں میں گرتے ہیں، گھٹنوں کے بل کھڑے ہو ہو کر ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ راگنیوں کی تال پر جھومتے ہیں۔ اور جب قوالوں کے گلے خوب گرما جاتے ہیں تو کوئی ایک درویش ہو حق کا نعرہ لگا کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ ایک صاحب اپنی سفید داڑھی کو مٹھیوں میں بھینچ کر والہانہ رقص کر رہے ہیں۔ دو درویش ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رموز بے خودی کے راز و نیاز میں مشغول ہیں اور بار بار ترچھی ٹوپیوں والے لڑکوں سے پاس جا کر پچھاڑیں کھاتے ہیں جو ان کی وارفتگی کو سہارا دینے کے لئے خاص طور پر [illegible] ہو رہے [illegible] گئے ہیں۔ ساری محفل مودبانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ عقیدت مند جھک جھک کر دونوں ہاتھوں پر ایک ایک، دو دو، پانچ روپئے رکھ کر سجادہ نشین کے حضور میں پیش کرتے ہیں جو انہیں چھو چھو کر قوالوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اپنا فونٹین پن نذر کیا ایک صاحب نے اپنا کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ ایک کسان جو کے ستوؤں کی پوٹلی پیش کرتا ہے جسے غالباً وہ زادِ راہ کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔

جامیؔ، عراقیؔ، خسروؔ، اقبالؔ، بلھے شاہ، خواجہ فرید۔ رات کے ڈیڑھ بجے جب محفل سماع برخاست ہوتی ہے تو سجادہ نشین صاحب بڑے اخلاق سے اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے افسروں اور رئیسوں کو اس خیمے میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں جو درگاہ شریف سے ہٹ کر ایک حویلی کے صحن میں نصب کیا گیا ہے۔ اس خیمہ میں طبقہ خاص کے علاوہ اور کسی کا گذر ممکن نہیں۔ "راہِ سلوک" میں یہ خیمہ اس مقام پر واقع ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔ جلتے ہیں جبریل کے پر جس مقام پر ا کیونکہ اس خیمے میں لاہور، ملتان اور لائلپور کی نامی گرامی گانے اور مجرا کرنے والی فنکارائیں اکٹھی ہوتی ہیں۔

قوالی خدا اور مریدوں کو خوش کرنے کا ذریعہ تھی۔ فنکاروں کا مجرا فرماں رواؤں کی خوشنودی کے لئے منعقد ہوتا ہے۔ دین اور دنیا کے اس امتزاج میں سجادہ نشین کو بہت بڑی برکات کا نزول مضمر ہے: مجرے والے خیمہ میں پہنچ کر سجادہ نشین صاحب اپنی زرکار قبا اتار دیتے ہیں اور لہراتے ہوئے طرے والی سبز پگڑی بھی خادم خاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خادم اس دستارِ فضیلت کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر باہر لے جاتا ہے۔ خدا جانے اب یہ پگڑی کہاں جائے گی؟ شاید یہ پگڑی بنی بخش لوہار کے گھر چلی جائے جس کی بیٹی نے ابھی ابھی اپنی عمر کا سولہواں سال پورا کیا ہے۔ شاید یہ پگڑی روشن دین معمار کے گھر پہنچ جائے جس کی جمیلہ پر شباب کے پھول تازہ تازہ کھلے ہیں۔ شاید ......

یہ پگڑی بڑی عصمت اور وقار والی پگڑی ہے۔ اس پگڑی میں اولیائے کرام کی وراثتِ پارینہ محفوظ ہے۔ اس پگڑی کے ساتھ بزرگی، عظمت اور معرفت کی روایات صادقہ وابستہ ہیں۔ اس پگڑی کے سہارے اوتاد او ابدال اور اقطاب عرشِ منیر کے کنگروں تک پہنچتے رہے ہیں۔ اس پگڑی کی سلوٹوں سے فیض کے چشمے بہتے آئے ہیں۔ صدیوں سے بندگانِ خاص و عام کو یہ پگڑی انوار تجلیات و مشاہدات سے سرفراز کرتی رہی ہے۔ یہ بڑی مرادوں والی پگڑی ہے۔ اس پر ایجاب و قبول کے سب دروازے وا ہیں۔ یہ پگڑی خدا کی بارگاہ سے کبھی خالی نہیں لوٹتی ——
لیکن جب یہی سحر کار دستار کسی نبی بخش لوہار یا روشن دین معمار یا چراغ علی کسان کے گھر اچانک جا پہنچتی ہے تو پیاری، پیاری نازک، نازک معصوم جوانیاں سہم کر مرجھا جاتی ہیں۔ خادم خاص پگڑی اٹھائے گھر کا ایک چکر لگاتا ہے اور اسی طرح خاموش واپس لوٹ آتا ہے۔ لیکن یہ خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے کہ اے گھر والو، مبارک ہو۔ تمہاری بہو یا بیٹی پر حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقاں، آفتاب طریقت، ماہتاب معرفت کی نظر انتخاب پڑ گئی ہے اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نصیبوں پر رحمت خداوندی کا سایہ قائم رہے تمہاری کھیتیاں سرسبز لہلہاتی رہیں۔ تمہارے جھونپڑوں کو آگ نہ لگے تمہارے

مویشی کم نہ ہوں، تمہارے دالان میں تھمکریاں نہ تھمتائیں، ہو وہیل فالاؤں کے
دروازے تم پر اعالم وا نہ ہوں تو بر رضا و رغبت

” مالک، ہمارے گھر پگڑی آگئی ہے۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ از طرف سکینہ دختر
غلام محمد رعمانہ — — — “

یہ مختصر سا خط مجھے ایک روز ڈاک میں ملا۔ میں نے اسے ایک بار پڑھا۔ دو بار پڑھا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کراچی میں جو پگڑی رائج تھی اس کا تعلق دکانوں یا مکانوں سے ہوتا تھا لیکن پگڑی کا یہ نیا روپ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے پولیس والوں اور مجسٹریٹوں سے پوچھا۔ وکیل صاحبان سے دریافت کیا، لیکن یہ الجھی گتھی کسی سے حل نہ ہو سکی۔ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہم اسی رات اچانک سکینہ کے گھر پر چھاپہ مارا۔ سکینہ تو بچ گئی لیکن افسوس کہ وہ پگڑی ہمارے ہاتھ نہ آ سکی جس کی ایک ایک سلوٹ میں ریاکاری اور سیاہ کاری کے سانپ لہرا رہے تھے۔

علی بخش

ایک روز میں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک جگہ خواجہ عبدالکریم صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے دیرینہ اور وفادار ملازم علی بخش کو حکومت نے ان کی خدمات کے سلسلے میں لائلپور میں ایک مربعہ زمین عطا کیا ہے۔ وہ بے چارا کئی چکر لگا چکا ہے لیکن اسے قبضہ نہیں ملتا، کیونکہ کچھ شریر لوگ اس پر ناجائز طور پر قابض ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا، ”جھنگ لائلپور کے بالکل قریب ہے۔ کیا تم علی بخش کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟“

میں نے فوراً جواب دیا: ”میں آج ہی اسے اپنی موٹر کار میں جھنگ لے جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح اس کو زمین کا قبضہ دلوا کے چھوڑوں گا۔“

خواجہ صاحب مجھے ”جاوید منزل“ اور علی بخش سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ یہ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تم فوراً تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت

جلد تمہاری زمین کا قبضہ دلوا دیں گے۔"

علی بخش کسی قدر جھنجھلایا، اور بولا "سوچنے تو سہی میں زمین کا قبضہ لینے کے لئے کب تک مارا مارا پھرتا رہوں؟ قبضہ نہیں ملتا تو کیا مرے کر رہی۔ لاہور سے جب جاتا ہوں تو جاوید کا بہت حرج ہوتا ہے۔ جاوید بھی کیا نیچے کا کہ بابا کن جھگڑوں میں پڑ گئے ہو۔"

لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر وہ میرے ساتھ ایک آدھ روز کے لئے جھنگ چلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہے تو غالباً اس کے دل میں سب سے بڑا وہم یہ ہے کہ شاید اب میں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح علامہ اقبال کی باتیں پوچھ پوچھ کر اس کا سر کھپاؤں گا۔ لیکن میں نے بھی عزم کر رکھا ہے کہ میں خود علی بخش سے حضرت علامہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اگر واقعی وہ علی بخش کی زندگی کا ایک جزو ہیں تو یہ جوہر خود بخود عشق اور مشک کی طرح ظاہر ہو کے رہے گا۔

میری توقع پوری ہوتی ہے اور تھوڑی سی پریشان کن خاموشی کے بعد علی بخش مجھے یوں گھورنے لگتا ہے کہ یہ عجیب شخص ہے جو ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات نہیں کرتا آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک سینما کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وہ بڑبڑاتے لگا "سینما کے سامنے تو کبھی ایسا رش نظر نہیں آتا ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے۔"

ایک جگہ میں پان لینے کو رکتا ہوں تو علی بخش بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، "ڈاکٹر صاحب کو پان پسند نہیں تھے۔"

پھر شاید میری دلجوئی کے لئے وہ مسکرا کے کہتا ہے "ہاں حقہ خوب پیتے تھے اپنا اپنا شوق ہے پان ہو یا حقہ کا!"

شیخوپورہ سے گذرتے ہوئے علی بخش کو یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بار یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں پر ایک مسلمان تحصیلدار تھے جو ڈاکٹر صاحب کے پکے مرید تھے۔ انہوں نے دعوت دی تھی ڈاکٹر صاحب کو پلاؤ اور سیخ کباب بہت پسند تھے آموں کا بھی بڑا شوق تھا۔ وفات سے کوئی چھ برس پہلے جب ان کا گلا بیٹھ گیا تو کھانا پینا بہت کم ہو گیا۔"

اب علی بخش کا ذہن بڑی تیزی سے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے اور وہ بڑی سادگی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناتا ہے۔ ان باتوں میں قصوں اور کہانیوں کا رنگ نہیں

بیچ [illegible] کی کیفیت ہے۔ تب تک علی بخش کا یہ تصور انہیں بہت [illegible] اسے ذہن [illegible] وہاں تک نہیں تھی۔ صاحب جب ڈاکٹر صاحب نے [illegible] [illegible] کے [illegible] تھا۔ جب سویرے میں نے انہیں [illegible] صاف پایا [illegible] آپ کا [illegible] جائے گا میں پانچ گھڑی تک پھر ان کی آنکھوں میں ایک [illegible] سی چمک آئی اور زبان سے الحمدللہ ادا ہوا۔ میں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے

کچھ دیر [illegible] خاموشی طاری رہی ہے۔

پھر سلسلہ [illegible] کا موڑ بدلنے کے لیے میں نے اس سے ایک سوال کیا۔ پوچھتا ہوں علی بخش صاحب کیا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ شعر یاد ہیں؟

علی بخش ہنس کر کہتا ہے۔ میں تو ان پڑھ جاہل ہوں مجھے ان باتوں کی بھلا کیا عقل۔

میں نے بہت اصرار کیا۔ "آپ کو ضرور کچھ یاد ہوگا۔"

"کبھی اے حقیقت منتظر والا کچھ یاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس کو خود بھی بہت گنگنایا کرتے تھے۔"

ڈاکٹر صاحب عام طور پر مجھے اپنے کمرے کے بالکل نزدیک سلایا کرتے تھے۔ رات کو وہ [illegible] بجے ڈیڑھ بجے پاؤں اٹھتے تھے اور وضو کر کے جانماز پر جا بیٹھتے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک سجدے میں پڑے رہتے تھے۔ فارغ ہو کر بستر پر آ لیٹتے تھے۔ میں حقہ تازہ کر کے لا رکھتا تھا۔ کبھی کبھی ایک دو کش لگاتے تھے۔ کبھی آنکھیں [illegible] جاتے [illegible] [illegible]

میرا اندازہ [illegible] علی بخش کو [illegible] پیش کرتا ہے۔ لیکن [illegible] اسے قبول نہیں کرتا۔

ڈاکٹر صاحب میں ایک عجیب بات تھی۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے انہیں ایک جھٹکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے آواز دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے موقع پر میں فوراً ان کی گردن کی پچھلی رگوں اور پٹھوں کو زور زور سے دبایا کروں۔ تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے ہی دور میں دبا ہوا رہتا تھا۔ اب وہ [illegible] نے
نوٹ [illegible] کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے دردمند انسان تھے۔ گھر کے خرچ کا حساب کتاب میرے پاس ہوتا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے کام چلاتا تھا۔ ان کا پیسہ ضائع کرنے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر اوقات مطب کے مریض کے دوران میں کئی کئی اشخاص ہوتا کہ [illegible] وہاں [illegible] ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مفت علاج کیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے علی بخش انسان کو ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق چلنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ ایسی [illegible] اب ان مریضوں کے [illegible] لائلپور کے ڈپٹی کمشنر صاحب، مال افسر صاحب اور دوسرا عملہ میری بڑی آؤبھگت کرتے ہیں۔ مجھ سے خوش اخلاقی سے ملتے ہیں اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ ایک روز بازار میں ایک انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور سب کے سامنے گلے لگا کر [illegible] رو رہا تھا۔ یہ ساری عزت ڈاکٹر صاحب کی بدولت ہے۔ مرحوم کی [illegible] سر پر کچھ قرض [illegible] ہے۔ لیکن میں اس کام کے لئے بار بار [illegible] ہوتا ہے۔

• سنا ہے اپریل میں جاوید چند مہینوں کے لئے ولایت سے لاہور آئے گا۔ جب وہ چھوٹا سا تھا ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اللہ کے کرم سے اب بڑا ہو گیا ہے۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اور منیرہ بی بی بہت کم عمر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نرس کے لئے اشتہار دیا۔ بے شمار جواب آئے۔ ایک بی بی نے تو یہ تک لکھ دیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شادی کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی قدر پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ علی بخش دیکھو تو سہی اس خاتون نے کیا لکھا ہے میں بڈھا آدمی ہوں۔ اب شادی کیا کروں گا۔ لیکن پھر علی بخش سے ایک [illegible] آگئی ہے

علی بخش کا تخیل بڑی تیز رفتاری سے ماضی کے دھندلکوں میں پرواز کر رہا ہے۔ لہٰذا اسکے ہر مشغلے پر اپنے ڈاکٹر صاحب یا جاوید یا منیرہ بی بی کی کوئی نہ کوئی خوشگوار یاد آتی رہتی ہے۔ [illegible] ایک [illegible] اپنے پاس رکھتا ہوں۔ دوسری [illegible] اچھا [illegible]

[illegible]

مُلاقاتیں

"جو صاحبان ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنا چاہیں وہ سوموار اور جمعرات کے روز صبح نو بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک بے روک ٹوک تشریف لے آئیں۔"

"بے مقصد کے ملاقاتی اور سفارشی حضرات آنے کی تکلیف نہ اٹھائیں۔"

یہ اس نوٹس بورڈ کی عبارت ہے جو میں نے شروع ہی سے اپنے دفتر کے سامنے لگا دیا تھا۔ پہلے تو اس سلیس عبارت کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور پیشہ ور ملاقاتیوں اور سفارشیوں کے علاوہ اور کوئی شخص میرے نزدیک تک نہ پھٹکا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔

پیر اور جمعرات کے روز دو کلرک صبح آٹھ بجے سے دفتر کے برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے جو جو آتا تھا ان کے نام اسی ترتیب سے ایک فہرست میں درج کرتے جاتے تھے اور ملاقاتی اسی فہرست کے مطابق باری باری سب میرے پاس آتے تھے۔ اول اول شہر کے حاجت مند لوگ آنا شروع ہوئے۔ پھر آس پاس کے قصبوں سے کچھ لوگ آنے لگے اور کچھ عرصہ کے بعد دور دراز کے دیہات سے بھی طبقہ کے لوگ آنے لگے۔

شروع شروع میں ملاقاتیوں کی تعداد پندرہ بیس کے قریب ہوتی تھی۔ دو ڈھائی ماہ کے اندر ان کی تعداد سو سوا سو کے لگ بھگ پہنچ گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ایسا وقت بھی آیا کہ ملاقات

ملاقات کے روز مجھے تین تین چار چار سو لوگوں کے ساتھ ملنا پڑتا تھا۔

لیکن ملاقات کے دن اتنے لوگوں کو بھگتانا مجھ اکیلے کو آسان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب میں ایمانداری سے جائزہ لیتا ہوں تو ملاقاتوں کے یہی چند روز میری ساری ملازمت کا اصل سرمایہ نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کردار کی کمزوری یا ماحول کی کمی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ سرکاری کرسی کا چسکا بھی انسان کا طبعی بانکپن ہے۔ اس کی فطرت ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں ڈھلنے لگتی ہے اور یہ بہت حد تک یکطرفہ ہو جاتا ہے۔ دفتر کی فضا میں سانس لینے کے بعد باہر کھلی فضا میں گھومنے والے ایک دوسری مخلوق نظر آنے لگتے ہیں۔ دفتری ماحول زندگی کے ہر پہلو پر کثیف غبار کی طرح چھا جاتا ہے اور زندگی کی بے پایاں وسعت سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔

خاص طور پر ڈپٹی کمشنر کا رشتہ بنی نوع کے ساتھ بے حد محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے گرد صرف چند مخصوص عناصر رہ جاتے ہیں جو مکڑی کے جالے کی طرح اپنے تانے بانے میں جکڑے رکھتے ہیں۔

ان عناصر میں پہلا عنصر سرکاری ملازموں اور وکیل صاحبان کا ہے۔ ملازموں میں مجسٹریٹ بھی شامل ہیں۔ تحصیلدار، نائب تحصیلدار، تھانیدار، قانون گو اور پٹواری بھی۔ اور دفتر کا عملہ بھی جن میں سپرنٹنڈنٹ، ناظر، مسل خواں، پیشکار، واصل باقی نویس اور پی۔ اے پیش پیش ہوتے ہیں۔ عدالت کی کرسی کو احتراماً "عزت مآب" کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طرز تخاطب بہت سے وکلاء کا تکیہ کلام بن جاتا ہے اور وہ کمرہ عدالت کے اندر اور باہر ڈپٹی کمشنر کو اسی طرح مخاطب کرتے کرتے اس بیچارے کو عزت مآبی کے ذہنی چسکے میں بری طرح مبتلا کر دیتے ہیں۔ نارمل زندگی میں "آپ" کا لفظ کافی عزت و احترام کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن ضلع کے افسروں اور اہلکاروں کے نزدیک احترام کی یہ حد ڈپٹی کمشنر کی ذات کے لئے ناکافی اور ناموزوں ہے۔ چنانچہ وہ ہر وقت اسے "جناب" یا "حضور" کے القابات سے مخاطب کرتے ہیں۔ پہلے پہلے تو ایسے القاب کی تکرار کافی نامانوس ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر کے کان ان الفاظ کے عادی ہو جاتے ہیں اور دل و دماغ ان کے سحر آفریں سرور میں اس درجہ مخمور ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی کوئی دل جلا اسے "آپ"

کہہ کر مخاطب کرے تو یہ حرکت ڈپٹی کمشنر کی شان میں گستاخی اور حکومت کے خلاف بغاوت تصور کی جاتی ہے۔

ڈپٹی کمشنر چونکہ ضلع کی ذات پر ایک زبردست جاگیردار کی طرح چھایا رہتا ہے اس لئے پہلا حق رؤسا اور دیہات کے بڑے بڑے زمینداروں کا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات اپنے یا دوسروں کے جائز معاملات طے کرانے آتے ہیں۔ کچھ لوگ ناجائز اور سفارشیں لاتے ہیں لیکن اکثر بزرگ محض شرفِ ملاقات فرمانے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اضلاعی اصطلاح میں شرفیہ ملاقاتیں سلام کہلاتی ہیں اور معزز زمینداروں کی بیاض میں اس سلام کو بڑی سماجی اور سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اتوار کا روز ہے۔ ہفتہ بھر کی دفتری بک بک جھک جھک کے بعد جی چاہتا ہے کہ آج کچھ گھنٹے اپنی مرضی کے مطابق گزارے جائیں۔ لیکن یہ امید محض خام خیال ہے کیونکہ صبح ہی سے کوٹھی کے گرد بھانت بھانت کے معزز ملاقاتی جمع ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ معزز اس لئے ہیں کہ سلام ملاقات کے روز دوسرے لوگوں کے ساتھ تشریف لانا ان کے نزدیک کسرِ شان ہے۔ آج ان میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے پاس ۱۵ پندرہ بیس ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین ہے۔ اور ضلع کے صدر مقام میں ان کے کئی شاندار بنگلے ہیں۔ مہینہ میں ایک یا دو بار وہ پچاس ساٹھ میل کا سفر طے کر کے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنے ضرور آتے ہیں۔ جب وہ شہر آتے ہیں تو ان کے جلو میں مزارعوں اور ملازموں کی ایک فوج کی فوج ہوتی ہے۔ کتے پالنا اور شکار کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ناچ گانے کا شوق ہے۔ اور عورت ذات کے ساتھ ان کی دلچسپی الف لیلیٰ کی داستانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان کی کوٹھی کے صحن میں بندوقوں، گھوڑوں اور کتوں کے لاؤ لشکر دیکھ کر گماں ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی شہزادہ ظلِ سبحانی کے خلاف بغاوت کر کے دارالسلطنت پر چڑھائی کرنے جا رہا ہے۔

اپنے علاقے میں یہ بزرگ زمینداری کا حق ہی ادا نہیں کرتے بلکہ مقامی نظم و نسق کی باگ ڈور بھی بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ کسی مزارع کا بیل چوری ہو جائے تو تھانے میں رپورٹ ان کی منظوری سے لکھائی جاتی ہے۔ کسی کو بندوق کا لائسنس درکار ہو

اس کی درخواست زمیندار صاحب کی وساطت سے آگے بڑھتی ہے۔ مقدموں کی پیروی زمیندار کی خوشنودی کے ساتھ پروان چڑھتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مقامی افسروں اور عوام کے درمیان اس قسم کے زمیندار دیوارِ چین کی طرح حائل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ بڑی زمینداریاں ایک مضبوط چھلنی کا کام دیتی ہیں۔ جو لوگ یا جو معاملات اس چھلنی سے چھن کر گزر جاتے ہیں وہ حکام اور بالآخر حکومت کی توجہ کے مستحق بن جاتے ہیں۔ باقی ساری مخلوق زمینداروں کی پرپیچ طلسم گردشوں میں پس پردہ رہ جاتی ہیں۔ اس باریک چھلنی سے گزرنے کے لئے انسان کو خوب اچھی طرح پسنا پڑتا ہے۔ انانیت، خودداری، خوداعتمادی اور آزادی کے روڑے اس چھلنی کے مہین سوراخوں سے گزرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

چھان اور چھلنی کے اس نظام میں کئی فوائد ہیں۔ ایک طرف تو ضلع کی انتظامیہ اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی طرح عوام الناس کے شور و غوغا سے بڑی حد تک دور رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بڑے زمینداروں کی اپنے مزارعوں پر گرفت مضبوط رہتی ہے تاکہ یہ برتری وہ حسبِ ضرورت حکومت اور اپنے ذاتی مفاد میں کام لا سکیں۔ میں نے اس روایتی نظام میں کسی قدر رخنہ ڈال کر عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو زمیندارہ برادری میں بڑی تشویش پھیل گئی۔ کچھ لوگ یہ سمجھ کر ہنستے کہ یہ نوجوان اور ناتجربہ کار آدمی ہے۔ چار دن میں سنبھل کر ہمارے سامنے ہی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دوسروں نے غصے سے کہا کہ ہم لوگ مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ ہم اس بچگانہ نظام کو ایک پھونک سے اڑا کر مکڑی کے جالے کی طرح تتر بتر کر دیں گے۔

لیکن میں بھی ثابت قدمی سے اپنے طریق کار پر جما رہا۔ دن بہ دن ملاقاتیوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ کسی منچلے نے کچہری کے احاطے میں "ملاقات ہوٹل" کے نام سے ایک ہوٹل بھی کھول لیا۔ دور دراز سے آنے والے لوگ سرِ شام ہی یہاں پہنچ جاتے تھے۔ "ملاقات ہوٹل" میں بان کی چارپائی پر رات گزارتے تھے تاکہ صبح صبح ملاقاتیوں کی فہرست میں دوسروں سے پہلے اپنا نام درج کروا سکیں۔

ملاقات کے روز میں بھی ایک رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ ہر سائل کی ولدیت اور سکونت اس میں درج کر لیتا تھا۔ ہر سائل کی شکایت اس میں درج کر لیتا تھا۔ اگر معاملہ مقامی نوعیت

کا ہوتا تو متعلقہ افسر کو اپنے پاس بلا کر اسی وقت وہیں فیصلہ کر دیتا تھا۔ اگر معاملے میں کسی پٹواری، نائب تحصیلدار، تحصیلدار یا تھانے دار سے کوئی رپورٹ طلب کرنا ضروری ہوتا۔ تو عرضی پر یہ حکم لکھ کر سائل کے حوالے کر دیتا کہ یہ رپورٹ ساتھ لے کر فلاں تاریخ کو مجھے حاضر ہو۔ یہ حکم اگلی پیشی کی تاریخ میں اپنے رجسٹر میں بھی درج کر لیتا تھا۔

پہلے تو کسی کسی پٹواری یا تھانیدار وغیرہ نے ایسی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور سائلوں کو ڈرا دھمکا کر ٹال دیا۔ جب مقررہ تاریخ پر کوئی سائل رپورٹ حاصل کیے بغیر خالی ہاتھ واپس آتا، تو میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر وہ وہ [illegible] متعلقہ تھانے یا پٹواریوں کے ڈیرے پر جا پہنچتا اور سائل کے کاغذات پر آرڈر کر کے اس کے سامنے ہی کھڑے کھڑے احکام جاری کر دیتا۔ میرے اس طرز عمل کا چرچا پھیلا تو رفتہ رفتہ محکمہ مال اور پولیس کا عملہ بھی اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گیا اور لاتعداد لوگوں کے کام بڑی حد تک نچلی سطح پر حل ہونا شروع ہو گئے۔

ایک روز ایک بے حد مفلوک الحال بڑھیا آئی۔ رو رو کر بولی کہ میری چند بیگھے زمین ہے جسے پٹواری نے اپنے کاغذات میں اس کے نام منتقل کرنا ہے۔ لیکن وہ رشوت لیے بغیر یہ کام کرنے سے انکاری ہے۔ رشوت دینے کی توفیق نہیں۔ تین چار برس سے وہ طرح طرح کے دفتروں میں دھکے کھا رہی ہے۔ لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

اس کی دردناک بپتا سن کر میں نے اسے کار میں بٹھایا اور جھنگ شہر سے ساٹھ ستر میل دور اس کے گاؤں کے پٹواری کو جا پکڑا۔ ڈپٹی کمشنر کو یوں اچانک اپنے گاؤں میں دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ پٹواری نے سب کے سامنے قسم کھائی کہ یہ بڑھیا بڑی شرانگیز عورت ہے اور زمین کے انتقال کے بارے میں جھوٹی شکایتیں کرنے کی عادی ہے۔ اپنی قسم کی عملی طور پر تصدیق کرنے کے لیے پٹواری اندر سے ایک جزدان اٹھا کر لایا اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگا "حضور دیکھئے میں اس مقدس کتاب کو سر پر رکھ کر قسم کھاتا ہوں۔" گاؤں کے ایک نوجوان نے مسکرا کر کہا "جناب ذرا یہ بستہ کھول کر بھی دیکھ لیں۔" ہم نے بستہ کھولا، تو اس میں قرآن شریف کی جلد نہیں بلکہ پٹوار خانے کے رجسٹر بندھے ہوئے تھے۔ میرے حکم پر پٹواری بھاگ کر ایک اور رجسٹر لایا اور سر جھکا کر بڑھیا کی انتقال اراضی کا کام مکمل کر دیا۔

میں نے بڑھیا سے کہا "بی بی، لو تمہارا کام ہو گیا۔ اب تو خوش رہو۔"

بڑھیا کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ اپنی تسلی کے لئے اس نے نمبردار سے پوچھا "کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟"

نمبردار نے اس بات کی تصدیق کی تو بڑھیا کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اس کے بعد پلے کے ایک کونے میں کچھ ریزگاری بندھی ہوئی تھی اس نے اسے کھولا۔ سولہ آنے گن کر اپنی مٹھی میں لئے اور اپنی دانست میں دوسروں کی نظر بچا کر چپکے سے میری جیب میں ڈال دیئے۔ اس ادائے معصومانہ اور محبوبانہ پر مجھے بھی بے اختیار رونا آگیا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے کئی دوسرے بڑے بوڑھے بھی آبدیدہ ہو گئے۔

یہ سولہ آنے واحد "رشوت" ہے جو میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران قبول کی۔ اگر مجھے سونے کا ایک پورا پہاڑ بھی مل جاتا، تو میری نظر میں ان سولہ آنوں کے سامنے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ میں نے ان آنوں کو ابھی تک خرچ نہیں کیا۔ کیونکہ میرا گمان ہے کہ یہ ایک ایسا متبرک تحفہ ہے جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے مالا مال کر دیا ہے۔

ایک روز ایک پرائمری اسکول کا استاد رحمت الٰہی آیا وہ چند ماہ کے بعد ملازمت سے ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کی تین جوان بیٹیاں تھیں۔ رہنے کے لئے اپنا گھر بھی نہیں تھا۔ پنشن نہایت معمولی ہوگا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کہاں رہے گا؟ لڑکیوں کی شادیاں کس طرح ہو سکیں گی؟ کھانے پینے کا خرچ کیسے چلے گا؟ اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ پریشانی کے عالم میں وہ کئی ماہ سے تہجد کے بعد رو رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کیا کرتا رہا ہے۔ چند روز قبل اسے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ جس میں حضور نے فرمایا کہ تم جھنگ جا کر ڈپٹی کمشنر کو اپنی مشکل بتاؤ۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

سنتے تو مجھے شک ہوا کہ یہ شخص ایک جھوٹا خواب سنا کر مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے چہرے پر شک و تذبذب کے آثار دیکھ کر رحمت الٰہی آبدیدہ ہو گیا اور بولا۔ "جناب میں جھوٹ نہیں بول رہا اگر جھوٹ بولتا تو اللہ کے نام پر بولتا۔ حضور ﷺ کے نام پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔؟"

اس کی اس منطق پر جب میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو اس نے فوراً کہا "آپ نے سنا نہیں کہ با خدا دیوانہ باش و با مصطفیٰ ہشیار باش۔"

باقی صفحہ ۶۳

محمد فصیح الدین
صدر جامعہ دارالعرفان 'لال ٹیکری' حیدرآباد - ۴

دینی تعلیم کا ہمہ جہتی پروگرام

بحمد اللہ دینی علوم کی تعلیم کے لیے ہمارے ملک میں اعلیٰ دینی درس گاہیں قائم ہیں اور قائم ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ۱۵ کروڑ مسلمانوں میں سے بمشکل لاکھ ڈیڑھ لاکھ مسلمان ان درس گاہوں سے راست طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے لاکھوں طلبا و طالبات ایسے غیر دینی مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں جہاں ان کو دینی تعلیم کی ہوا تک نہیں لگتی بلکہ وہاں ایسے غیر اسلامی عقیدے ان کے دلوں اور دماغوں پر مسلط کیے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور نہ معلوم اگر یہی حال رہا تو آئندہ نسلوں کا کیا حال ہو گا۔ چناں چہ مسلمان کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ غیر دینی مدارس میں تعلیم پانے والے طلبا کو اللہ تعالیٰ کی اس کتاب سے واقف کروائیں جو رحمت اللعالمینؐ پر اس غرض سے نازل ہوئی کہ تمام عالم انسانیت کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر نور ہدایت سے فیضیاب کریں اور رسول اللہؐ کی سیرت پاک اور اسوہ حسنہ کی روشنی سے منور کریں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، وَلَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۝ سورہ ابراہیم ۝

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کو اس کو پڑھنے میں تکلف ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے اگر اسے بغیر معنی کے ناظرہ تلاوت کی جائے تو تب بھی اس کا بڑا ثواب ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کو سمجھ کر پڑھنے سے ہی اس کا

اصل مقصد پورا ہو۔

" کتاب (قرآنِ مجید) اس لیے تم پر اتارا کہ انسان کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لائے۔ تمہارے لیے رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔" ہوتا ہے۔ اور جب دنیا کی ہر کتاب سمجھ کر پڑھی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس کتاب (قرآن مجید) کو تو بدرجہ اولیٰ سمجھ کر پڑھنا چاہیے خصوصاً جب کہ اللہ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ٥ سورہ قمر۔ ہمارے علما نے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے ایسی درسی کتب مرتب کی ہیں جن سے قرآن مجید بآسانی سمجھ کر پڑھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کا عربی اور اردو قاعدہ اور مفتاح القرآن کے پانچ رسالے اس طور پر لکھے گئے کہ بآسانی ان کے طریقہ قرآن مجید پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ایسی درسی کتابوں کی نشان دہی کی جا کر تمام مسلمان چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک قرآن مجید سمجھ کر پڑھیں اور رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ اور تعلیمات سے پوری طرح واقف کرانے کے لیے ہمہ جہتی جد وجہد کا ایسا پروگرام عمل میں لایا جائے کہ دنیوی تعلیم کے حصول میں کوئی ہرج کارنہ ہونے پائے بلکہ جیسے جیسے دنیوی علوم کے پڑھنے سے ان کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے اس کے ساتھ قرآن تعلیم و سیرت کو بھی تدریجاً پڑھا جائے۔ اس پروگرام کی مختصر تشریح حسب ذیل ہے

۱۔ مسلمانوں کا ہر گھر قرآن مجید اور سیرت النبویؐ کی تعلیم کے لیے پہلا مکتب

جب کسی مسلمان کے گھر کوئی بچے کی ولادت ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کے کانوں میں اذان اور اقامت کے کلمات سنائے جاتے ہیں۔ جب وہ ۴ سال کا ہو جاتا ہے تو اس کی تسمیہ خوانی کی تقریب کی جاتی ہے۔ اس کو سورہ اقرا کی پانچ آیتیں پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا۔ لیکن ہونا تو یہ چاہیے کہ خود ماں باپ روزانہ کچھ دیر کے لیے اپنے بچوں کو ساتھ لے کر قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ سمجھ کر پڑھیں اور رسول اللہ کی سیرت و تعلیمات کا مختصر درس لیتے رہیں۔

چناں چہ اپنے گھروں کو قرآن و سیرت کی تعلیم سے منور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا ہے سورہ نور کی ۳۵ ویں آیت میں اللہ نور السموات والارض۔

ترجمہ: (اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی) اللہ کی تجلی اور تمثیل کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گھروں کو ذکر اور تسبیح سے منور کرنے کا حکم اس طرح دیا گیا ہے۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ ۳۶ ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس کے ذکر و تسبیح سے صبح و شام اپنے گھروں کو بلند و بالا کیا جائے۔

چناں چہ صبح و شام ہر گھر میں ماں باپ اپنے بچوں کے ساتھ دینی تعلیم کا درس دیتے رہیں اور کم از کم سال میں قرآن شریف کا معنی کے ساتھ ختم ہو۔

اس کے لیے دار العرفان کے مر اسلاتی کتابوں سے بڑی حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ ہماری مساجد کو ادائیگی نماز کے ساتھ قرآن اور سیرتِ طیبہؐ کی درس گاہیں بنانے کی ضرورت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مسجد تعمیر کرنے کے بعد جہاں ادائیگی نماز کا نظام قائم کیا اس میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ہماری مساجد میں رسول اللہ کی سنت کی پوری طرح تعمیل کی جانی چاہیے ہماری مسجدوں کے پیش اماموں اور خدمتیوں کے مشاہیروں میں اگر مناسب اضافہ کر دیا جائے تو وہ دل جمعی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض بھی انجام دے سکیں گے اور جب کہ ان کے مشاہروں میں مناسب اضافہ کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ درس گاہوں سے فارغ التحصیل فاضل اساتذہ اس طرح مساجد کی خدمت گزاری کے لیے دستیاب ہو سکیں گے۔

فی الوقت بعض مساجد میں صبح کے اوقات میں چھوٹے بچوں کے لیے ناظرہ خوانی کا انتظام ہے لیکن ناظرہ خوانی کے ساتھ ترجمے اور تفہیم کی ضرورت بھی ناگزیر ہے حسبِ سہولت مختلف اوقات میں تعلیم بالغان کا بھی اس طرح انتظام رہے کہ وہ بھی قرآن مجید اور سیرت کی تعلیم سے کما حقہ مستفید ہو سکیں۔

علاوہ ازیں جمعہ کے خطبات میں بھی تعلیمات قرآنی اور سیرت النبیؐ کے اسوۂ حسنہ کی ترغیب اور تشویق دلائی جائے۔ رمضان المبارک میں قرآن مجید جو تراویح میں سنایا جاتا ہے ہر چار رکعت سے قبل اس کا خلاصہ بھی سنا نا بہت مفید ہو گا اس کے لیے "قرآنی ارشادات" (تصنیف نعیم جیلانی)

جیسی کتابوں میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ محرم، ربیع الاول، عید میلاد النبی اور خلفائے راشدین اور بزرگان دین کے ولادت اور وفات کے یادگاری ایام میں ان کے حیات اور کارناموں سے مقتدیوں کو منظم طور پر واقف کرایا جا سکتا ہے مختصر یہ کہ مسلمانوں کی ہر مسجد اس طرح دینی تعلیم کی درس گاہ بن سکتی ہے اور اہل محلہ کو یقیناً اس کی ترغیب ہوگی کہ وہ اپنی مسجدوں کی دل لگنے، دوڑنے قدمے سخنے خدمت کرتے رہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ ہماری مساجد کعبۃ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اگر ہم ان کو اس طرح سنوارتے رہیں تو یقیناً وہ کعبۃ اللہ کی نورانی شعاعوں کا مرکز بن جائیں گی۔

محلہ داری مساجد کے علاوہ شہر کی بڑی مساجد میں یہ کام نہایت کفایت کے ساتھ منظم طور پر انجام دیا جا سکتا ہے اور اہل شہر اس کے تعاون میں انشاء اللہ بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے رہیں گے۔

۳۔ مسلم زیر انتظام عصری تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم کے جزووقتی انتظام کی ضرورت

ہماری سیکولر حکومت کے دستور میں اس کی صاف طور پر اجازت ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں میں اپنی مذہبی تعلیم کا جزو وقتی انتظام رکھا جا سکتا ہے (بشرطیکہ دیگر مذاہب کے خلاف کوئی نامناسب بات نہ کہی جائے) لیکن معلوم نہیں ہمارے ایسے تعلیمی اداروں میں جزو وقتی مذہبی تعلیم کے انتظام میں کیوں پس و پیش کیا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں جزو وقتی تعلیم کے انتظام میں کیوں پس و پیش کیا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں اسلام کے خلاف نئے نئے فتنے پروان چڑھ رہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے تمام اداروں میں اسلام کی صحیح تعلیم کا انتظام رہے۔ جامعہ دارالعرفان کی جانب سے ایسے تعلیمی اداروں کے لیے جو مرا اسلامی نصاب تعلیم مقرر کیا گیا ہے وہ اتنا آسان مختصر و مکمل ہے کہ اگر صرف ایک گھنٹہ اس کا درس دیا جائے تو تدریجی طور پر (کے۔ جی) کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ ثانوی امتحان کی تکمیل تک ہر طالب علم بہت جلد پورا قرآن مجید ترجمہ کے ساتھ ختم کر سکتا ہے اور ساتھ میں رسول اللہ کی سیرت و تعلیمات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے دوران بھی جامعہ دارالعرفان کے فوقانی اور امتیازی نصابی کتب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح عصری تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کے امتزاج سے دین اور دنیا کی نعمتوں اور برکتوں کا حامل بن سکتا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے تمام مسلم زیر انتظام تعلیمی ادارے مجمع البحرین کا کام انجام دیں گے بحمد اللہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار سرکاری مدارس مشن اسکول کے معیار سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور جب ان اداروں میں جز وقتی دینی تعلیم کا انتظام رہے گا تو سرپرست اپنے بچوں کو عیسائی مشن اسکول کی بجائے اپنے مدارس میں زیادہ شوق سے اپنے بچوں کو شریک کروائیں گے۔

ہمارے ٹکنیکل انجینیرینگ اور میڈیکل کالجوں میں بھی طلبا کو ان قرآنی تعلیمات سے پوری طرح واقف کروانے کی ضرورت ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو پوری طرح ہمارے لیے کس طرح مسخر کر دیا ہے اور ہم ان سے کس طرح استفادہ کرتے ہوئے آخرت کے ثمرات سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

سرکاری اور دیگر غیر دینی مدارس کے طلبا کے لیے ہمارا مشورہ

جہاں تک سرکاری اور غیر دینی مشن مدارس کا تعلق ہے جس میں ہمارے طلبا کثیر تعداد میں تعلیم پا رہے ہیں ان کے لیے ہمارا یہ مشورہ ہے کہ وہ اپنے طور پر ایسے حلقے قائم کریں جہاں جمع ہو کر جز وقتی طور پر مذہبی تعلیم حاصل کریں۔ ان کے والدین سرپرستوں کا بھی یہ کام ہو کہ وہاں کے لیے ان مدارس کے قریب کسی جگہ دینی تعلیم کا انتظام کرائیں بلکہ ایسے اداروں میں مذہبی تعلیم کے لیے مدرسین مقرر کرنے کی کوشش کی جائے۔ حسن اتفاق سے بعض ایسے تعلیمی اداروں کے قریب ہماری مسجدیں بھی واقع ہیں جہاں ایسی تعلیم کا انتظام بہت کفایت سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ سینما اور تھیٹروں کے غیر مسلم مالکین اپنے یہاں نمازوں کے اوقات میں جانمازوں تک کا انتظام کرتے ہیں تاکہ کوئی نمازی بھی ان کے تھیٹر جا سکے لیکن ایسے غیر دینی مدارس میں وضو اور طہارت تک کا کوئی انتظام نہیں رہتا بلکہ جمعہ کی نماز کے وقت بھی ان کی کلاسس جاری رہتی ہیں

اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ہماری ہر ممکن جد و جہد میں اس طرف توجہ کی جائے اور ایسے اداروں میں بھی نہ صرف اوائلی نماز بلکہ قرآنی تعلیمات کی صورت نکالی جائے۔

۵۔ گرما اور سرما کی طویل تعطیلات کے علاوہ عام تعطیلات میں بھی دینی تعلیم کا اہتمام

اس ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دینی تعلیم جز وقتی طور پر سب جگہ یعنی مسلمانوں کے گھروں سے لے کر مساجد اور مسلم زیرِ انتظام تعلیمی اداروں وغیرہ میں روز آنہ دی جانی چاہیے۔ لیکن اس کے علاوہ عصری تعلیمی اداروں کی گرمائی سرمائی اور دیگر تعطیلات میں دینی تعلیم کے لیے خصوصی انتظام ہونا چاہیے جس کے دوران قرآنی اور سیرت کی تعلیمات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے اور ان سے متعلق امتحانات بھی لیے جاسکتے ہیں تاکہ وہ تعلیمات پوری طرح ذہن نشین ہوں اور ان کی تبلیغ اور عمل آوری زیادہ بہتر طریقے پر ہو سکے۔

۶۔ اوقافی محکموں اور ادارہ جات کے علاوہ اصحابِ خیر کا فرض اوّلین

ہندوستان میں مذہبی تعلیم کی ترویج کی تمام تر ذمہ داری اوقافی اور خیراتی اداروں کے مالی تعاون پر ہے جہاں تک مسلمانوں کی عام تعلیم اور فنّی تعلیم وغیرہ ہے اس کی ذمہ داری بالکلیہ حکومت پر ہونی چاہیے ہمارے اوقاف اور اس قسم کے اداروں اور اہلِ خیر حضرات کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ اپنے وسائل مذہبی تعلیم کی اشاعت پر صرف کریں۔

۷۔ اعلیٰ دینی درس گاہوں اور عامۃ المسلمین کے درمیان جامعہ دارالعرفان ایک واسطہ

ہندوستان کی اعلیٰ دینی درس گاہوں کے چشموں سے جو علوم و فیوض کی نہریں جاری ہو رہی ہیں ان کو اخذ کرکے عامۃ المسلمین کو پہنچانے کا کام تقریباً ۴۰ سال سے دارالعرفان انجام دے رہا ہے اور بحمد للہ اس میں بڑی کامیابی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کام کو وسیع پیمانے پر منظم کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے ہر گھر تک اسے پہنچایا جائے اور کمسن بچوں سے لے کر معمر اشخاص سب ہی قرآن کو

بامعنی پڑھ سکیں اور سیرت النبیؐ اور اسوۂ حسنہ سے کما حقہ واقف ہو سکیں اور ہماری مسجدیں با ترجمہ قرآن شریف اور سیرت النبیؐ کی درس گاہیں بھی بن سکیں۔ تمام عصری ٹکنیکل فنی و غیر فنی سرکاری مشن اسکول کے مسلم طلباء و طالبات بھی قرآنی اور سیرت کی تعلیمات سے بہرہ مند ہو سکیں۔

مذکورہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے علمائے کرام اور دیگر قائدین سے ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ اس کام میں پوری طرح تعاون فرمائیں ہمارے خالص دینی جامعات اور درس گاہوں کے ارباب سے یہ استدعا ہے کہ وہ اپنے یہاں کے طلبا کو اس کام کے لیے تیار کریں اور ان کے لیے ایسا خصوصی نصابِ تعلیم کا انتظام رہے کہ جب وہ قرآن اور سیرت و حدیث سے فارغ ہو جائیں تو وہ اپنے آپ ہماری مساجد میں پہنچ کر اپنے علم و فن سے دوسروں کو اسی طرح فیضیاب کریں جیسے وہ اپنی درس گاہوں میں فیض یاب ہوئے۔

گھر گھر قرآنی تعلیم کی اشاعت کا کام بخوبی انجام دینے کے لیے جامعہ دار العرفان نے پانچ پانچ درجات کا جو آسان ترین امتحانات قرآن خوانی' قرآن دانی و قرآن فہمی اور سیرت دانی و تاریخ اسلام وغیرہ منعقد کرنے کا انتظام کیا ہے۔ اس کے ذریعے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رحمۃ للعالمین کے طفیل میں قرآن و سیرت کی تعلیم کے فیوض و برکات سے نہ صرف ہم سب مستفید ہوں بلکہ ہم دوسروں کے لیے بھی اسلام کا صحیح نمونہ پیش کر سکیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم رحمۃ للعالمین۔

بقیہ صفحہ ۵۶

یہ سن کر میرا شک پوری طرح رفع تو نہ ہوا لیکن سوچا کہ اگر یہ شخص غلط بیانی سے بھی کام لے رہا ہے تو ایسی عظیم ہستی کے اسم مبارک کا سہارا لے رہا ہے جس کی لاج رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے رحمت الٰہی کو تین ہفتہ کے بعد دوبارہ میرے پاس آنے کے لئے کہا اس دوران میں نے خفیہ طور پر اس کے ذاتی حالات کا کھوج لگایا اور یہ تصدیق ہو گئی کہ وہ اپنے علاقے میں نہایت سچا پاکیزہ اور پابند صوم و صلوٰۃ آدمی مشہور ہے اور اس کے گھریلو حالات بھی ویسے ہی تھے جو اس نے بیان کئے تھے۔


بہت سی منزلیں
طے کرلی ہیں
غلہ میں ہم خودکفیل۔
بہتر صحت۔ لمبی عمر
BANK

پنڈت جواہر لعل نہرو نمبر

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۶) شمارہ (۸) اگست سنہ ۱۹۸۹ء حیدرآباد

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال	90 روپے	270 "	65 "	36 "	205 " "
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	650 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد۔ (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

ـ حرف اول	ــــــ	۳
ـ مولانا محمد علی	پنڈت جواہر لعل نہرو	۴
ـ تقسیم ہند کا پیش خیمہ	مولانا آزاد / رئیس احمد جعفری	۹
ـ پنڈت نہرو	ڈاکٹر شنکر دیال شرما	۱۶
ـ پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جوہر	ڈاکٹر حمیدہ ریاض	۱۸
ـ جواہر لال نہرو (کچھ کہی کچھ ان کہی)	ظ ۔ انصاری	۲۴
ـ وہ گھر جو نہرو نے بنایا	کلدیپ نیر	۳۲
ـ پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ادیب	رشید الدین	۳۶
ـ ذکر پنڈت نہرو	ڈاکٹر کے بھگت وتسل راؤ	۴۰
ـ گاندھی جی اور نہرو جی	احمد رشید علیگ	۴۵
ـ نہرو ـــ ایک عظیم شخصیت	کے ۔ سی ۔ بھٹ	۵۴
ـ پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ہمہ گیر شخصیت ۔	فریدہ زین	۵۷
ـ اقلیتیں، سیکولرزم اور نہرو	ایس ۔ ایم ۔ ایچ ۔ برنی	۶۷
ـ نہرو ـــ امر نہرو، امر طاقت	جوہر ہاشمی، اسحاق ملک	۷۱
ـ نہرو ـــ نہرو جی	مومن خان شوق ۔ شجاع الدین شاہد	۷۴

حرفِ اول

عظیم بھارت کے عظیم المرتبت سپوت، جنگ آزادی کے مجسم سورما، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم، پنچ شیل اصولوں کے ساتھ عالمی امن کے پیامبر، تیسری دنیا کے غیر جانبدار ممالک کے رہنما، سائنس ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ جدید ہندوستان کے معمار پنڈت جواہر لعل نہرو ۲۷ رمئی ۱۹۶۴ء کو ملک وقوم سے جدا ہوئے۔ پنڈت جی کا جشن صد سالہ ولادت ۱۴ ر نومبر ۱۹۸۸ء کو شروع کیا گیا اور ملک میں ہر جگہ اس سلسلہ میں تقریبات منعقد کی جارہی ہیں، اخبارات ورسائل خصوصی نمبر نکال کر پنڈت جی کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ پنڈت جی نے ایک ایسی بے مثال اور روشن مثال قائم کی ہے کہ ہم اسے سامنے رکھکر ملک وقوم کی بہتر طور سے خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو اپنے لئے ایک روشن مثال بنا سکتے ہیں تو ان کی غلطیوں کا علم حاصل کرکے ان سے بچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ شاداب نے جب پنڈت جی کو خراج عقیدت پیش کرنا طے کیا تو ان کی زندگی سے استفادہ کے لئے جہاں ان کی تحریرات کو پیش کیا، اور ان کے بارے میں دوسرے رہنماؤں اور دانشوروں کی تحریرات منتخب کیں وہیں ایسے مضامین بھی شریک اشاعت کئے گئے جن میں پنڈت جی کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی گئی تاکہ تعمیر وترقی ملک میں ہمارے رہنما اور دانشور جہاں ان کے عظیم کارناموں سے استفادہ کریں وہیں ان کی غلطیوں سے بچنے کی بھی کوشش کریں۔ پنڈت جی جیسے اپنی زندگی میں ملک وقوم پر اثر انداز ہوگئے ہیں اسی طرح اپنی وفات کے بعد بھی وہ ایک "جواہر" ہیں جو ملک وقوم کی رہنمائی کیلئے مرنے کے بعد بھی چمک رہا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم اس سے روشنی حاصل کریں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو

مولانا محمد علی

(''میری کہانی'' کے دیباچہ ''پہلی بات'' میں پنڈت جی نے ۲ جنوری ۱۹۳۶ء کو لکھا ہے کہ ''یہ ساری کتاب میں نے جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک جیل میں لکھی تھی..... میں نے یہ کام اس طرح شروع کیا جیسے کوئی اپنے آپ سے اپنے دل کی باتیں کھود کھود کر پوچھتا ہے..... میں نے اپنے بعض رفیقوں کے متعلق جن کے ساتھ میں برسوں سے کام کر رہا ہوں اور مجھے دل سے عزیز ہیں، آزادی سے اظہار رائے کیا ہے..... غرض یہ آپ بیتی پچھلے زمانے کے واقعات کا ایک شخصی، سرسری اور ادھورا بیان ہے'' 'میری کہانی' ایک انوکھی آپ بیتی ہے جس میں پنڈت جی کی رنگا رنگ شخصیت جھلکتی ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا محمد علی کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے، وہ اقتباس پیش ہے)

دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا (دکن) میں ہوا۔ مولانا محمد علی صدر تھے حسب عادت انہوں نے ایک بے حد طویل خطبہ صدارت پڑھا۔ لیکن تھا وہ دلچسپ۔ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی نشو ونما کا خاکہ کھینچا اور یہ دکھایا کہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا جو مشہور وفد آغا خاں کی سرکردگی میں وائسرائے کے پاس گیا تھا اور جس کے جواب میں حکومت نے جداگانہ انتخاب کی پہلے پہل سرکاری طور پر حمایت کی تھی وہ ایک فرمائشی سوانگ تھا اور حکومت کے اشارے سے ترتیب دیا گیا تھا۔

محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کا عہدہ قبول کروں۔ ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہ تھی میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں محمد علی سے انکار نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے

اگر کہیں دوسرا شخص سکریٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کرتا
جس طرح میں کرسکتا تھا۔ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں بہت شدید ہوا کرتی تھیں اور میں
خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے۔ ہم میں الفت و محبت کے تعلقات
اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس میں
بے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی۔ میں اس معاملے میں ان کے بالکل برعکس تھا۔ مگر
اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ
۔ ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا
اسی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن
آجائے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں۔ اس وقت انھیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا
ان کی صدارت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی۔ اگرچہ معمولی اختلافات اکثر
رہتے تھے۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ تمام اراکین کو القاب و
آداب کے بغیر مخاطب کیا جائے۔ ہندوستان میں القاب کی بڑی کثرت ہے۔ مثلاً مہاتما، مولانا،
پنڈت، شیخ، سید، منشی، مولوی اور پھر مسٹر اور اسکوائر۔ اب کچھ دن سے اس فہرست میں
شری مت اور شری کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کا استعمال بے موقع اور بے ضرورت اس کثرت
سے ہوتا ہے کہ میں انہیں مٹا کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا لیکن میری ایک بھی نہ چلی
۔ محمد علی نے مجھے ایک زور و شور کا تار بھیجا جس میں صدر کی حیثیت سے یہ ہدایت کی تھی
کہ پرانے دستور کو جاری رکھوں اور خصوصاً گاندھی جی کو ہمیشہ مہاتما کے لقب سے مخاطب کروں۔
ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ محمد علی کو یہ عادت تھی
کہ ہر بیس کی قرارداد میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے مثلاً شکر کے طور
پر دعا کے انداز میں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو وہ مجھ پر برس پڑتے اور میری
بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ
مجھے یقین ہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو۔ میں نے اس پر اکثر غور کیا
ہے کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا فیصلہ اس بات
پر ہے کہ مذہب اور مذہبی کا مفہوم کیا قرار دیا جاتا ہے۔

میں مذہبی بحث سے ہمیشہ بچتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح ہم دونوں کو غصہ آجانے گا اور ممکن ہے کہ میری کسی بات سے ان کو تکلیف بھی پہنچے۔ ان لوگوں سے جو کسی عقیدے کے سختی سے پابند ہوں اس موضوع پر بحث کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا غالباً دشوار تر ہے اس لئے کہ ان کے مذہب میں آزادیٔ رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے ان کا تو ایک سیدھا اور ایک تنگ راستہ ہے جس سے مومن کو بال بھر بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہیئے۔ ہندو اس سے کچھ مختلف ہوتے ہیں اگرچہ ہمیشہ نہیں چاہے عمل میں وہ کتنے ہی کٹر کیوں نہ ہوں لیکن عام طور پر وہ مذہب کے متعلق سخت سے سخت انقلابی خیالات سننا اور ان پر گفتگو کرنا گوارا کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج کل کے آریہ سماجیوں کا نقطۂ نظر بھی اتنا وسیع اور روادارانہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک تنگ اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ ذی فہم ہندوؤں کے پاس کچھ فلسفیانہ روایات ایسی ہیں جن کا اثر ان کے اعمال پر تو نہیں پڑتا لیکن مذہبی مسائل پر عقلی نقطۂ نظر سے بحث کرنے میں ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو، جیسے قدیم ہندو فلسفی چارواک تھا، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن میں پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہندوستان میں میرے نام سے پنڈت کا لقب کسی طرح جدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ یہ یا اسی قسم کا اور کوئی لقب استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ایک مرتبہ میں ایک ترکی عالم سے ملنے گیا۔ ان کے پاس ایک تعارفی خط میں نے پہلے ہی بھیج دیا تھا اس خط میں میرا نام پنڈت جواہر لال نہرو لکھا ہوا تھا۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت متعجب اور کچھ مایوس بھی ہوئے کیونکہ پنڈت کے لقب سے

وہ اس امید میں تھے کہ ان سے کوئی مقدس اور سن رسیدہ عالم ملنے آرہا ہے

مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا۔ آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا اور ایک دن جب میں دہلی میں ان کے گھر ان سے ملنے گیا تو برس پڑے، کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملے میں بحث کئے بغیر نہ مانوں گا۔ میں نے انہیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑ سکتا لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے کہنے لگے کہ "یہ بحث تو آج ہوگی ضرور، تم سمجھتے ہوگے کہ مجھے مذہبی جنون ہے لیکن میں آج یہ ثابت کرکے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں سچا جذبہ ہے۔" انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسائل کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکا ہوں اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جدید کتابیں بھی تھیں۔ مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلس کی کتاب "خدا، نادیدہ بادشاہ" جنگ کے زمانے میں جب وہ کئی سال نظر بند رہے تھے تو انہوں نے قرآن کو بار بار پڑھا تھا اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فی صدی ایسی باتیں ہیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں اور قرآن سے الگ کرکے اپنی جگہ پر بھی انہیں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ باقی ۳ فیصدی باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فیصدی باتیں بدیہی طور پر صحیح ہیں تو باقی ۳ فیصدی بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص عقل صحیح ہے اور قرآن غلط اس طرح قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فیصدی صحیح تسلیم کرنے لگے۔

اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اس پر واقعی مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے ہیں لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔

اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ

میں، کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک وہ کانگریس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتے اور زور و شور سے حصہ لیتے رہے۔ لیکن اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی اور بیگانگی برابر بڑھتی گئی۔ اس میں غالباً کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ ان حالات کا جو ملک میں رونما ہوئے یہ لازمی نتیجہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس افسوسناک نتیجے سے ہم میں سے بہتوں کو رنج ہوا۔ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو۔ سیاسی معاملے میں بہت کم اختلاف تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔ اس بناء پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جاتا جو دونوں فریقوں کو پسند آتا سیاسی حیثیت سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ وارانہ معاملے میں پیش پیش تھے کوسوں دور تھے۔ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ وہ ۱۹۲۸ء کی گرمیوں میں یورپ چلے گئے۔ اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے لیکن ان کے واپس آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ آئے تو ناچار انہیں مخالف گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔

دو برس بعد ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی پورے زور پر تھی اور ملک کے بیشمار آدمی قید میں پڑے تھے محمد علی نے کانگریس کے فیصلے کا کوئی پاس نہیں کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مجھے ان کے جانے سے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں وہ خود اپنی شرکت سے خوش نہ تھے۔ ان کی لندن کی سرگرمیوں سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کی اصلی جگہ آزادی کی جنگ میں تھی جو ہندوستان میں چھڑی ہوئی تھی نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس کے اجلاس میں جو لندن میں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس آ گئے ہوتے تو فوراً اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور کئی سال سے ان کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ لندن پہنچ کر انہیں یہ فکر چین نہیں لینے دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہیئے اور کوئی معقول کام کرنا چاہیئے۔ حالانکہ اس وقت انہیں علاج اور آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ بہت جلد بجھا دیا۔ نینی جیل میں جب ان کی موت کی خبر پہنچی تو مجھے بہت سخت صدمہ پہنچا۔ ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبۂ صدارت کے بعض حصے ان کو پسند نہیں آئے۔ اس لئے ان پر انہوں نے بڑی سختی سے اعتراض کئے۔ انہوں

مولانا آزاد / رئیس احمد جعفری

تقسیم ہند کا پیش خیمہ

مولانا آزاد کی خود نوشت INDIA WINS FREEDOM انگریزی میں اس طرح لکھی گئی کہ مولانا ہمایوں کبیر کو لکھاتے جاتے، ہمایوں کبیر انگریزی میں لکھتے جاتے، صاف کرتے اور مولانا کو بتاتے اور معمولی ترمیم و تبدیلی کے ساتھ متن کو قطعی کر دیا جاتا۔ اس طرح کتاب تیار ہوئی۔ مولانا نے اس کتاب میں کئی انکشافات کئے جو اگر نہ کئے جاتے تو شاید حقیقت دنیا کے سامنے نہ آتی۔ انہوں نے اپنی ذات اور سیاسی جماعتوں پر تبصرہ کیا، غلطیوں کا اعتراف کیا، دوسروں کی غلطیوں کو بیان کیا۔ خاص طور پر شخصیات کے بارے میں نکتہ چینی کی جو معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے۔

رئیس احمد جعفری نے "آزادی ہند" کے نام سے اس خود نوشت کا ترجمہ کیا۔ مترجم لکھتے ہیں:

"میں نے اس کتاب کو زیادہ معنی خیز، دلچسپ اور TO THE POINT بنانے کیلئے یہ کیا کہ مولانا نے جن واقعات و مباحث اور شخصیات کو ساری کتاب میں بکھیر دیا تھا۔ الگ الگ عنوانات کے تحت یکجا کر لیا اور پھر ان پر ضروری تشریحی یا تنقیدی مواد بڑھا دیا اس طرح ہر بحث پر مولانا کے خیالات یکجا طور پر سامنے آگئے۔ اس بحث کے جن جن پہلوؤں پر متفرق اور مختلف صفحات میں مولانا نے گفتگو کی تھی، وہ سب ایک جگہ ہو گئے۔ اس طرح مولانا کے خیالات بھی تفصیل اور یکسوئی کے ساتھ سامنے آگئے۔ ان پر مجموعی حیثیت سے رائے قائم کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اور ان کے تمام پہلوؤں پر میرے لئے تنقید و تبصرہ کرنا، اور آپ کے لئے دونوں میں محاکمہ کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اس طرح کتاب کی ترتیب یکسر بدل گئی۔ لیکن اس کی افادیت اور اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

شخصیات کے سلسلے میں خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محنت اور وقت نظر سے کام لینا پڑا۔ مختلف شخصیات کا ذکر، سلسلۂ سخن میں مولانا نے مختلف صفحات میں کیا ہے۔ اصل بحث کے زور و قوت کے سامنے شخصیات کا یہ ذکر دب گیا ہے۔ مثلاً ہم کرپس مشن کے اہم ترین بحث

پر مولانا کے خیالات پڑھ رہے ہیں۔ روانیٔ سخن میں مولانا نے راج گوپال اچاری کا ذکر بھی کیا ہے جواہر لال کا بھی "قائد اعظم" کا بھی، گاندھی جی کا بھی اور دوسرے معاصرین کا بھی، ان لوگوں کے سلسلہ میں جو چبھتی ہوئی باتیں مولانا کہہ گئے ہیں، ان سے گو ہم لطف لیتے ہیں یا متاثر ہوتے ہیں۔ پھر اصل مبحث میں کھو جاتے ہیں، اور مبحث کی اہمیت پھر ہمیں شخصی تاثرات سے غافل بھی کر دیتی ہے۔

میں نے پر شخصیت کا ذکر، کتاب سے چھانٹ چھانٹ کر، الگ ایک مقالہ کی صورت میں صفحات کا حوالہ دیتے ہوئے مرتب کر لیا ہے، اس طرح زیر مطالعہ شخصیت کی پوری اور مکمل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ مولانا کے خیالات و تاثرات اس کے بارے میں اول سے آخر تک نظر کے سامنے آ جاتے ہیں مباحث سے الگ کرنے کے بعد دونوں ـــ مبحث اور شخصیت ـــ کی حیثیتیں الگ الگ متعین ہو جاتی ہیں، دونوں کا خاکہ اور نقشہ الگ الگ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اور دونوں کی مستقل حیثیت قائم ہو جاتی ہے، اس طرح کتاب کی ترتیب بھی نئی ہو گئی اور مباحث و شخصیات کا مکمل اور جداگانہ مرقع بھی مرتب ہو گیا۔ مباحث پر جب آپ مولانا کے خیالات پڑھیں گے تو کوئی مختلط مبحث آپ کو اضطراب خیال میں مبتلا نہیں کرے گا۔ شخصیات کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو غیر متعلق باتیں آپ کو اپنی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیں گی۔

کتاب کے دسویں باب "تقسیم ہند کا پیش خیمہ" کے بارے میں مترجم لکھتے ہیں۔

جس درد و سوز، قلبی، تعب اور صدمہ، نیز انتہائی قلق اور افسردگی کے ساتھ مولانا نے یہ باب قلمبند کیا ہے، اس کا ایک ایک حرف ان کے تاثرات و احساسات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ساری کتاب میں پہلی مرتبہ انہوں نے جواہر لال کے ایک اقدام کو صاف اور واضح الفاظ میں غلط اور مہلک قرار دیا ہے اپنی اس کتاب میں انہوں نے گاندھی جی، سردار پٹیل اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں پر دھڑلے سے نکتہ چینی کی ہے لیکن جواہر لال کا جب ذکر آیا ہے، تو وہ

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے ـــ نالہ رکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے

کے مصداق بن گئے ہیں۔ لیکن یہ مرحلہ ایسا آیا کہ خاموش نہ رہ سکے، دبی زبان میں گفتگو نہ کر سکے، دل کی بات زبان پر لانا ہی پڑی (مولانا ...)

(مولانا کی کتاب کا یہ باب ہدیہ قارئین ہے۔)

صدارت سے دستبرداری : بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سیاسی مسائل طے ہو چکے ہیں۔ اب میں ایک نئے مرحلے کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی صدارت مجھے سونپی گئی۔ دستور کی رو سے میرا یہ عہدہ ایک سال کیلئے تھا۔ عام حالات میں نیا صدر ۱۹۴۰ء میں منتخب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ء اور پھر ۱۹۴۲ء میں ہماری گرفتاری عمل میں آئی، کانگریس ایک غیر قانونی جماعت قرار پائی۔ لہٰذا کسی نئے صدر کے انتخاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ اس ساری مدت میں میں صدارت کے فرائض میں ہی انجام دیتا رہا۔

اب کہ حالات معمول پر آ چکے تھے، قدرتی طور پر نئے صدر کے انتخاب کا سوال پھر اٹھا، عام مطالبہ یہ تھا کہ مجھ ہی کو دوبارہ صدر منتخب ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کرپس، لارڈ ویول اور اب کابینہ وفد سے گفت و شنید کا مرحلہ میں نے ہی طے کیا تھا۔ کانگریسی احباب کا بھی عام رجحان یہی تھا۔ بنگال، بمبئی، مدراس، بہار اور یو پی کے کانگریسی حلقوں نے علانیہ اس بات کا اظہار کیا تھا کہ کابینہ وفد کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری مجھ ہی کو سونپی جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ کانگریسی ہائی کمان کے اندرونی حلقوں میں میرا انتخاب ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ کیونکہ سردار پٹیل اور ان کے رفقا چاہتے تھے کہ سردار پٹیل کو صدر منتخب ہونا چاہیئے میں نے اس مسئلہ پر احتیاط کے ساتھ غور کیا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔ میں نے طے کر لیا کہ صدارت کیلئے اپنا نام پیش کرنے کی اجازت نہیں دونگا۔

جواہر لال اور پٹیل دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو؟ میں چاہتا تھا ایسا آدمی منتخب ہو، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو، اور میری قائم کی ہوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۶ر اپریل کو میں نے اس مفہوم کا ایک بیان شائع کیا۔ اور کانگریسی احباب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کر لیں۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے۔ لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انہوں نے پبلک طور پر پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کئے۔

میرا فیصلہ غلط تھا : میں نے خوب سمجھ کر اپنے بارے میں دوبارہ امیدوار صدارت نہ بننے کا فیصلہ کیا تھا

لیکن بعد میں حالات نے جو رخ اختیار کیا، تو اپنے آپ کو میں بر سرِ غلط سمجھنے لگا اور جو لوگ کم از کم ایک سال کیلئے دوبارہ مجھے صدر رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بر سرِ صواب تھے۔

جو لوگ مجھے صدر رکھنا چاہتے تھے: مسلم لیگ کونسل اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کابینہ پلان منظور کر لیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے بھی اس فیصلہ کی توثیق کرا لی جائے۔ چنانچہ ۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو اس کا جلسہ بمبئی میں طلب کر لیا گیا، ۴ جولائی کو میں کلکتہ سے بمبئی روانہ ہوا۔ اسی ٹرین میں سرت چندر بوس بھی سفر کر رہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کا جم غفیر یہ نعرے لگاتا نظر آتا کہ مجھے کانگریس کا صدر رہنا چاہیئے۔ ہر بڑے اسٹیشن پر سرت بابو اپنے کمپارٹمنٹ سے میرے کمپارٹمنٹ میں آتے اور بار بار کہتے۔

"دیکھئے لوگ کیا چاہتے ہیں، اور آپ کیا کر رہے ہیں۔؟

کابینہ پلان میں نے منظور کرایا: آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجتماع میں کابینہ پلان سے متعلق جو تجویز تھی، میں نے پیش کی، میری تقریر نے حاضرین پر بڑا اثر کیا۔ جب رائے شماری ہوئی تو عظیم معمولی اکثریت سے کابینہ پلان کو کانگریس نے منظور کر لیا۔

لارنس اور کرپس کی تہنیت: چند روز بعد لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس کی طرف سے تہنیت کے تار موصول ہوئے۔ اس بات پر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے میری تجویز منظور کر لی۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی کہ میں نے کابینہ پلان کو بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کیا۔

اب ایسے المناک واقعات رونما ہوئے، جنہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔

جواہر لال نے کابینہ پلان درہم برہم کر دیا: ۱۰ جولائی کو بمبئی میں جواہر لال نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ کسی نمائندہ پریس نے دریافت کیا "آیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کابینہ پلان کو بحیثیت مجموعی منظور کر لیا ہے۔ جس میں عارضی حکومت میں شرکت بھی شامل ہے۔؟ — جواہر لال نہرو نے جواب دیا۔ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں بغیر کسی پابندی کے شریک ہوگی، اور ہر صورت حال سے نمٹنے اور ہر سوال کو حل کرنے میں بالکل آزاد ہوگی۔

نمائندہ پریس نے ایک اور سوال کیا کہ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کابینہ پلان میں ترمیم ہو

تغیر ممکن ہے ــــــ؟

جواہر لال نے جواب دیا ۔ کانگریس نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت منظور کی ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اس بارے میں بالکل آزاد سمجھتی ہے کہ اپنی صوابدید پر کابینہ پلان میں جس طرح کی تبدیلی یا ترمیم چاہے کرے

جواہر لال کا بیان غلط تھا : میں اس جگہ یہ بات ریکارڈ میں لے آنا چاہتا ہوں کہ جواہر لال کا یہ بیان غلط تھا ۔ یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں تھا کہ کانگریس حسب مرضی پلان میں تبدیلی اور ترمیم کرنے میں مختار تھی ۔ ہم نے اس امر پر اتفاق کر لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی ۔ مرکزی حکومت کے پاس تین اہم محکمے ہوں گے ، باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل رہیں گے ۔ ہم نے اس امر پر بھی اتفاق کر لیا تھا کہ ازروئے پلان ہندوستان تین حلقوں میں تقسیم ہو جائے گا ' اے ' بی اور سی ' یہی حلقے صوبائی گروپ کی صورت اختیار کر لیں گے ، ان شرائط میں یکطرفہ طور پر کانگریس کوئی ' تبدیلی شریک معاہدہ جماعتوں کے کامل اتفاق اور رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتی ۔

لیگ کونسل کی منظوری : مسلم لیگ نے کابینہ وفد کا پلان منظور کر لیا تھا ۔ کیونکہ اس کی رو سے وہ زیادہ سے زیادہ اس نے پالیا تھا ' جو برطانوی حکومت دے سکتی تھی ۔ لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے صاف طور پر اقرار کیا تھا کہ وہ پلان منظور کرنے کی سفارش اس لئے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر اور زیادہ کچھ نہیں حاصل کیا جا سکتا ۔

بم کا گولہ : جواہر لال کا بیان مسٹر جناح کیلئے بم کا گولہ ثابت ہوا ۔ انہوں نے فوراً ایک بیان شائع کیا کہ صدر کانگریس (جواہر لال) کا یہ بیان ساری صورت حالات پر ازسر نو غور و فکر کا محتاج ہے انہوں نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ لیگ کونسل کی میٹنگ بلائیں ' اپنے بیان میں مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ لیگ کونسل نے اس واضح یقین دہانی پر کابینہ پلان قبول کیا تھا کہ کانگریس بھی اس اسکیم کو منظور کر چکی ہے ۔ اور یہ کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کی بنیاد یہی پلان ہوگا ۔ لیکن اب صدر کانگریس یہ اعلان کر رہے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کانگریس اپنی اکثریت کے بل پر اس میں ترمیم اور تبدیلی کر سکتی ہے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اقلیتیں ' اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہیں ۔ مسٹر جناح نے کہا کہ جواہر لال نہرو کے بیان کا مدعا یہ ہے کہ کانگریس نے کابینہ پلان مسترد کر دیا ہے ۔

مسلم لیگ نے پلان مسترد کر دیا ۔ بمبئی میں ۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا ۔ اپنی افتتاحی

تقریر میں مسٹر جناح نے مطالبہ پاکستان کا پھر اعادہ کیا۔ کیونکہ اب مسلم لیگ کیلئے یہی چارہ کار رہ گیا تھا۔ کئی دن کے بحث و مباحثہ کے بعد کونسل نے ایک تجویز منظور کرکے کابینہ پلان کو مسترد کردیا نیز حصول پاکستان کیلئے راست اقدام کا فیصلہ بھی کرلیا۔

میری پریشانی : اس نئی صورت حالات نے مجھے بہت زیادہ پریشان اور دل گرفتہ کردیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے میں نے اتنی سخت جدوجہد کی تھی خود ہمارے ہی ہاتھوں برباد ہوئی جارہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ صورت حالات پر غور و خوض کیلئے جلد از جلد منعقد ہونا چاہیئے۔ ۸ اگست کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ میں نے زور دیا کہ اگر ہم صورت حال کو قابو میں لانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف کردینی چاہیئے کہ کانگریس کے خیالات اس باب میں وہی ہیں جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تجویز میں درج ہیں ___ اور کوئی شخص خواہ وہ صدر کانگریس ہی کیوں نہ ہو، ان میں تبدیلی کا مجاز نہیں۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا تذبذب : ورکنگ کمیٹی گومگو کے عالم میں گرفتار تھی۔ ایک طرف صدر کانگریس کا وقار مجروح ہوتا نظر آتا تھا، دوسری طرف وہ مفاہمت خطرہ میں تھی جو اتنی جان کاہیوں کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ صدر کے بیان کی اگر تردید کی جاتی ہے تو اس طرح خود کانگریس کی ساکھ جاتی رہے گی۔ کابینہ پلان کو اگر ترک کردیا جاتا ہے تو سارا ملک برباد ہوجائے گا۔

نئی تجویز : آخرکار ہم نے ایک تجویز کا مسودہ تیار کیا، جس میں صدر کانگریس (جواہرلال) کی پریس کانفرنس کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ لیکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے منظور کردہ ریزولیوشن کی توثیق مزید کی گئی تھی۔

مسٹر جناح کا بیان : ہمارا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی کا ریزولیشن صورت حال کو ابتر ہونے سے بچالے گا، لیکن مسٹر جناح نے ہماری یہ پوزیشن تسلیم نہیں کی۔ انہوں نے کہا جواہرلال کا بیان کانگریس کی حقیقی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کانگریس اس طرح بار بار اپنے فیصلوں میں تبدیلی کرسکتی ہے، حالانکہ ابھی انگریز موجود ہیں، اور اختیار حکومت کانگریس کے ہاتھوں میں نہیں آیا ہے، پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب انگریز چلے جائیں گے اور اختیار حکومت کانگریس کے ہاتھ میں ہوگا تو کانگریس اس پوزیشن پر واپس نہیں آجائیگی جیسی کہ جھلک جواہرلال کے بیان

میں نظر آ رہی ہے ۔

وائسرائے کا رویہ : کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اس نئی تجویز کا وائسرائے کی طرف سے فوری جواب ملا ۔ ۱۲ اگست کو جواہر لال کو عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل کی دعوت دی گئی ۔

جواہر لال کی جناح سے ناکام ملاقات : ۱۳ اگست ہی کو مسٹر جناح نے ایک بیان میں کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا نیا ریزولیشن جو ۱۰ اگست کو واردھا میں منظور ہوا ہے' الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ کانگریس کے سابقہ موقف کا ترجمان ہے انہوں نے عارضی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں جواہر لال کی دعوت تعاون مسترد کر دی ۔ ۱۵ اگست کو جواہر لال' مسٹر جناح کے گھر پر ان سے ملے ۔ لیکن بحث و گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ اور صورت حال تیزی کے ساتھ انحطاط پذیر ہوتی چلی گئی ۔

لیگ کا یوم راست اقدام : جب جولائی کے آخر میں' لیگ کونسل نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس نے مسٹر جناح کو اختیار دیا کہ وہ اس اقدام کو کامیاب بنانے کیلئے جو طریقہ چاہیں اختیار کریں مسٹر جناح نے "یوم راست اقدام" کیلئے ۱۶ اگست کی تاریخ مقرر کر دی ۔ لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ پروگرام کیا ہوگا ؟ کلکتہ میں عام احساس میں نے یہ دیکھا کہ اس دن مسلم لیگی کانگریسی کارکنوں پر حملے کریں گے ۔ اور کانگریس پراپرٹی کو لوٹیں گے اور نقصان پہنچائیں گے' مزید برآں اس وقت پیدا ہوا جب بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ اگسٹ کو عام تعطیل کا اعلان کر دیا ۔ بنگال اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔ اور جب یہ احتجاج ناکام ہوا تو اظہار ناراضگی کے طور پر وہ واک آوٹ کر گئی ۔ کلکتہ میں عام طور پر اضطراب و تشویش کا عالم طاری تھا ۔ اس لئے اور زیادہ کہ حکومت مسلم لیگ کی تھی اور مسٹر حسین شہید سہروردی وزیر اعلےٰ تھے ۔

یوم سیاہ : ہندوستان کی تاریخ میں ۱۶ اگست یوم سیاہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ بپھرے ہوئے بلوائیوں نے سارے کلکتہ شہر میں قتل و غارت اور دہشت کا بازار گرم کر دیا ۔ سیکڑوں آدمی ہلاک ہوگئے ۔ ہزاروں مجروح ہوئے ۔ کروڑوں روپیہ کی املاک و جائیداد غارت کر دی گئی ۔ لیگ کی طرف سے جلوس نکلے' شرکائے جلوس نے لوٹ مار اور مار دھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر ہندو مسلم غنڈوں کی گرفت میں آ گیا ۔ سارے شہر میں ملٹری اور پولیس تیار کھڑی تھی لیکن غیر متحرک' حالانکہ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم مردوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا

باقی صفحہ (۱۸۸) پر

ڈاکٹر شنکر دیال شرما
(نائب صدر جمہوریہ ہند)

پنڈت نہرو

کہاں سے شروع کروں؟ میری جو کچھ ہستی ہے' پنڈت نہرو کی بدولت ہے ان ہی کے زیر سایہ پلے بڑھے — وہ ہمارے آئیڈیل تھے اور مجھ پر تو ان کی خاص نظر عنایت رہی۔ ڈانٹ بھی لیتے تھے۔

ایک بار یہاں حمیدیہ ہائر سیکنڈری اسکول بھوپال میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا۔ ان ہی دنوں جبل پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا اور بہت اندھیر گردی ہوئی ...... دوسرے ڈیلی گیٹوں کی طرح میں نے بھی ہال سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ پنڈت جی کی نظر پڑ گئی۔

شنکر دیال! یہ تمہاری اسٹیٹ میں کیا ہو رہا ہے؟ بے قصور لوگ مارے جا رہے ہیں؟

مگر پنڈت جی میں تو وزیر تعلیم ہوں اور ....

اور کیا! کچھ بھی ہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے ایسا ہوا کیوں؟ تم مر کیوں نہ گئے۔ وہیں جبل پور کیوں نہ گئے؟ تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟

میں نے گردن جھکا لی۔ ایک تو ان کی ڈانٹ اور پھر بھرے مجمع کے سامنے۔ سب لوگ ٹھٹھک کر دیکھنے لگے وہ غصے میں ہاتھ پٹکتے نکل گئے۔

دوسرا سیشن تھا۔ اجلاس کے بعد' جیسا کہ عموماً فرشی نشست کے بعد ہوتا' جواہر لال باہر نکلے۔ پشاوری چپل پاؤں میں ڈالا اور حسب عادت اس کے پچھلے فلیپ چڑھانے کے لئے ایک ہاتھ سے دیوار دروازے یا کسی کے شانے کا سہارا لیا کرتے تھے۔ اس وقت میں سامنے تھا۔ اشارے سے پاس بلایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر' جوتا پہنتے ہوئے چلنے لگے۔ ہاتھ اس لئے نکالی سے ٹکایا تھا کہ میرے دل کو خبر ہو گئی اور ڈیلی گیٹوں کے مجمع کو جتا دیا کہ تب کا غصہ بیجا تھا۔ وہ بھی اور یہ بھی صرف اپنے پن کا اظہار تھا — باقی کچھ نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ فرقہ پرستی کی بو انہیں برداشت نہ تھی۔ وہ اسے ملک کے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ کہہ بھی دیا کرتے تھے کہ شنکر دیال' ایک بات گرہ باندھ لو' کمیونسٹوں کی طاقت بڑھنے

سے ہمیں اتنا خلوص نہیں۔ جو آدرش وہ رکھتے ہیں، جو نعرے وہ دیتے ہیں، تم کانگرس پلیٹ فارم سے اور بہتر نعرے بلند کرو۔ اعلیٰ آدرش دو۔ مقابلہ کرو۔ لیکن فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، تنگ نظری وہ فتنہ ہے جو آزادی کے اصل مقصد کو صدمہ پہنچانے والا اور اس کی ترقی کی راہ روکنے والا ہے۔ اس سے بے دھڑک لڑنا چاہیے۔ اسے پنپنے نہ دینا چاہیے

موقع موقع سے یہ نکتہ ہمارے ذہن نشین کرتے رہتے تھے۔

۱۴ ار نومبر [illegible]

(ماخوذ "جواہر لال نہرو" کچھ کہی کچھ ان کہی)

حضرت امام حسینؓ نے میدان کربلا میں خلافت کے لئے عظیم الشان قربانی دی ..... اس وقت اسلام کا نظام مٹایا جا رہا تھا۔ اس کو آپ نے جان دے کر روکا اور صحیح نظام کو قائم کیا۔ گویا پہلی خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ اسلام اور خلافت کے لئے ہم انگریزوں سے لڑے۔ جن میں پل کر ہم جوان ہوئے تھے۔ اسلام اور خلافت کیلئے ہم ترکوں سے بھی لڑنے کے لئے تیار تھے جنکی مدد ہم نے ہر طرح کی ......

اسلام اور خلافت کے لئے ہم شریف مکہ کے مخالف ہوئے اور سلطان ابن سعود سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ اگر خدانخواستہ ضرورت پڑی تو اسلام اور خلافت کیلئے ہم ان سے بھی لڑیں گے۔

اسلام اور خلافت کے لئے ہم نے علماء ہند اور صوفیا سے رشتہ جوڑا تھا۔ اسلام اور خلافت کے لئے ہم ایک بار نہیں ہزار بار ان سے رشتہ کو توڑیں گے۔

ہمدرد ۱۷ ار نومبر ۱۹۲۵ء

ہمدرد ۱۳ جنوری ۱۹۲۶ء

ڈاکٹر حمید ریاض
۱۰ - اسٹار کی ٹاؤن
ناگپور - 440001

پنڈت جواہر لال نہرو
اور
محمد علی جوہر

پنڈت جواہر لال نہرو نئے ہندوستان کے معمار، عالمی امن کے علمبردار، سب سے بڑے جمہوریت پرست اور جمہوریت کے معمار تھے۔ انہوں نے لگن اور سرگرمی سے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور تا عمر اسی لگن اور سرگرمی سے جدید ہندوستان کی تعمیر میں معروف رہے۔ اپنی جوانی جنگ آزادی کی نذر کردی اور آزادی کے حصول کے بعد پوری عمر ملک کی قومی زندگی کی ترتیب میں بسر کی۔ انہوں نے ہمیشہ عوام کو اپنے اعتماد میں لیا اور عوام نے ہمیشہ ان پر اعتماد کیا۔

بقول "برٹرنڈرسل" انسانی تاریخ کے تاریک دور میں نہرو دانشمندی اور امن کی حمایت میں کھڑے رہے۔

مولانا محمد علی سے نہرو خاندان کے روابط گہرے تھے۔ محمد علی ہمیشہ موتی لال نہرو کے یہاں قیام کرتے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا جوہر موتی لال نہرو کے یہاں مقیم تھے۔ جواہر لال نہرو نے اپنے والد کی سرزنش پر کھانا چھوڑ دیا تھا اور بازار سے چنے منگوا کر کھاتے تھے۔ موتی لال نے مولانا سے کہا کہ نہرو کو سمجھائیں۔ مولانا نے فوراً ملازم سے نہرو جی کو بلایا اور پیار سے تنبیہہ کی اور فوراً کھانے کے کمرے میں لے جاکر کھانا کھلایا۔ پنڈت نہرو مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ان کے والد کے ہمعصر تھے۔ انگریز کی حکمت عملی و سیاست کا برا ہو۔ دونوں کو کس طرح جدا کر دیا۔

یورپ سے واپسی پر پنڈت جواہر لال آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کلکتہ میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اس میں ترک موالات کی تحریک

پیش کی گئی - مہاتما گاندھی کے ہم خیال لیڈروں میں صرف موتی لال تھے - اور جواہر لال نہرو اس وقت ہونہار نوجوان سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ہم خیال تھے۔ محمد علی جناح خلاف تھے۔

عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں جواہر لال ڈاکٹر انصاری کے ساتھ بنارس یونیورسٹی گئے۔ وہاں طلبہ میں تحریک کی اشاعت کی۔ ہم طلبہ نے یونیورسٹی چھوڑ دیا - پنڈت نہرو نے "میری کہانی" میں مولانا جوہر سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا دکن میں محمد علی صدر تھے۔ انہوں نے ایک طویل مگر دلچسپ خطبۂ صدارت پڑھا - اس خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کا نشوونما کا خاکہ کھینچا گیا تھا - اور بتلایا تھا کہ ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کا جو وفد آغاخاں کی سرکردگی میں وائسرائے کے پاس گیا تھا اور جسکے جواب میں حکومت نے جداگانہ انتخاب کی سرکاری طور پر پہلے پہل حمایت کی تھی - ایک "فرمائشی سوانگ" تھا - اور حکومت کے اشارہ سے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا - جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف محمد علی نے ان کو کانگریس کا سکریٹری بننے پر مجبور کیا۔

ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی خاص بات پنڈت جی کے ذہن میں نہ تھی - وہ انتظامی ذمہ داری قبول کرنا نہیں چاہتے تھے - لیکن محمد علی سے انکار نہ کرسکے - یہ خدشہ تھا کہ اگر دوسرا شخص سکریٹری مقرر ہوا تو وہ صدر کے ساتھ ہم آہنگی برت نہ سکے گا۔ محمد علی کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں شدید ہوتی تھیں - خوش قسمتی کہ وہ جواہر لال کو پسند کرتے تھے - ان میں الفت اور محبت کے تعلقات تھے - دونوں ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے

مذہب کے معاملے میں جواہر لال کا معاملہ برعکس تھا - مولانا کی مذہبیت کے باوجود وہ ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کے دلدادہ تھے۔ ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی - بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا - اس لئے ان کے اکثر دوست ان سے کنارہ کش ہوتے گئے - یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آئے اور وہ بے کہے رہ جائیں -

مولانا جوہر اور پنڈت جی میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ وہ کانگریس

کی قرارداد میں کسی نہ کسی طرح خدا کا ذکر ضرور کرتے۔ جواہر لال اس کے خلاف احتجاج کرتے تو وہ ان پر برس پڑتے تھے۔ ان کو ڈانٹتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعد میں ہمیشہ جواہر لال سے کہتے تھے کہ "چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو۔"

جواہر لال مذہبی بحث سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ مبادا ان میں سے کسی کو غصہ آجائے و کسی کی بات سے کسی کو تکلیف پہنچے۔

چند سال بعد ایک دن جب جواہر لال نہرو دہلی میں ان کے گھر ان سے ملنے گئے وہ ضبط نہ رسکے اور اسی وقت ان سے کہا کہ "تم سے مذہب کے معاملے میں بحث کئے بغیر نہ مانوں گا۔ جواہر لال نے انہیں باز رکھنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک دوسرے پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ کب ماننے والے تھے۔ کہنے لگے" تم سمجھتے ہو کہ مجھے مذہبی جنون ہے۔ لیکن میں آج یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں بلکہ سچا جذبہ ہے۔

اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اپنے زمانۂ صدارت میں محمد علی کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔ یا ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہوتی گئی۔

یہ صورت آہستہ آہستہ ہوئی اس کے بعد کئی سال تک وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اور زور و شور سے حصہ لیتے رہے۔ مگر اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔ یہ ن حالات کا قصور تھا جو ملک میں رونما ہو رہے تھے۔

ان حالات سے بہت سے لوگوں کو رنج ہوا۔ فرقہ وارانہ مسائل پر باہم اختلاف رہا لیکن سیاسی معاملے میں اختلاف کم تھے۔

۔ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔ فرقہ وارانہ مسائل پر ان سے سمجھوتے کے امکان تھے کیونکہ سیاسی حیثیت سے ان رجعت پسندوں سے دور تھے جو فرقہ وارانہ مفاد کے علمبردار تھے۔

جواہر لال نے ۱۹۲۸ء میں مولانا کے یورپ چلے جانے کو ہندوستان کی بدنصیبی کہا ہے۔ ان زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے میں جان توڑ کوشش کی گئی۔ کامیابی کی امید ہو چلی اگر اس وقت محمد علی موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے لیکن ان کے واپس

آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ جب وہ آئے تو ناچار مخالف گروہ کے ساتھ ہو گئے۔

دو برس بعد ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی بڑے زور پر تھی اور ملک کے سب شمار آدمی قید میں پڑے تھے

محمد علی نے کانگریس کے فیصلے کا کوئی پاس نہیں کیا۔ اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے پنڈت جی کو ان کی شرکت کا بڑا دکھ ہوا۔ پنڈت جی کا خیال تھا کہ وہ اس شرکت سے خود بھی خوش نہ تھے۔ لندن میں ان کی سرگرمیوں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں ان کو یہ احساس ہوا کہ ان کی اصلی جگہ آزادی کی جنگ میں تھی جو ہندوستان میں چھڑی ہوئی تھی۔ نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس میں جو لندن میں ہو رہی تھی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھا ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس آگئے ہوتے تو ضرور اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ لندن پہنچ کر ان کو یہ فکر چین لینے نہیں دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہیے۔ اور کوئی معقول کام کرنا چاہیے حالانکہ اس وقت ان کو آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ جلد بجھا دیا۔ نینی تال جیل میں ان کی موت کی خبر سن کر پنڈت جی کو سخت صدمہ ہوا۔

پنڈت جی کی ان سے آخری ملاقات ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ پنڈت جی کے خطبۂ صدارت کے بعض حصے ان کو پسند نہیں آئے۔ ان پر انہوں نے سختی سے اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے جواہر لال کو متنبہ کیا۔

"جواہر! میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے موجودہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے جب نازک وقت آئے گا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ اور تمہارے اپنے کانگریسی تمہیں پھانسی کے تختہ تک پہونچا دیں گے"، کیسی دہشتناک پیش گوئی تھی' محمد علی کی وفات پر پنڈت نہرو کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ " میں اس بہادر لیڈر کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس نے آزادی کی جدوجہد میں جو قربانیاں کی ہیں اور جو کام سرانجام دیا ہے وہ تاریخ آزادی میں جلی حروف میں لکھا جائیگا۔ اور سب سے زیادہ نمایاں جگہ پائے گا۔ مولانا محمد علی جوہر ایک تاریخ ساز شخصیت تھی۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز رہنما تھے۔" آزادی کی مختلف تحریکوں کے روح رواں تھے۔ اپنے معاصرین سے نظریات اور افکار میں ان کا اختلاف ناگزیر تھا۔

● ●

جواہر لال نہرو
کچھ کہی کچھ ان کہی

لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ پنڈت جی کو ایک روز لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر دیر تک ٹھہرنا پڑا۔ ٹرین لیٹ تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے — اور مختلف دفتروں پر لگے ہوئے نئے نئے ہندی سائن بورڈ پڑھنے لگے — پارہ چڑھ گیا۔ پوچھا کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ یہ کمرہ جائے خانہ ہے یا پاخانہ؟ "شوچالیہ" یعنی کیا؟ — اور اس بورڈ کا کیا مطلب؟ لاحول ولا قوۃ

لپک کر بڑھے اور کمرے کے بورڈ پر ہاتھ ڈالا۔ وہ ذرا اونچا تھا۔ جواہر لال، ان لڑکوں کی طرح جو درخت پر سے پتنگ اتارتے ہیں، اچھل اچھل کر اس بورڈ کو جھپٹ کر کھینچنے میں لگ گئے۔ افسروں نے ایک بورڈ اتار لیا۔ جواہر لال نے وہ توڑ ڈالا اور کہا: کم از کم ہندی کو اتنا بھیانک تو نہ بنائیے۔ جواہر لال یقیناً آگاہ تھے کہ خود ان کی صاف ستھری تقریریں جب آکاش وانی (آل انڈیا ریڈیو) سے نشر ہوتی تھیں تو انہیں "ہندیایا" جاتا تھا۔ لفظ اور جملے بدل دیئے جاتے تھے۔ شاید وہ کسی ملک کے واحد وزیر اعظم تھے جن کی نفیس زبان پر سرکاری نوکر شاہی پالیسی کا رندا پھیرا کرتے تھے۔ پریس ریلیز میں بھی جو رپورٹ ان کی تقریروں کی اخباروں کو بھیجی جاتی — وہ "ہندی کرن" سے گزاری جاتی تھی۔

مسز وجے لکشمی پنڈت

: نہرو اور ان کی بہن کے سلسلہ میں ایک واقعہ حال میں ہمارے دوست اور ہم قلم دیوان بریندر ناتھ (ظفر پیامی) نے لکھا ہے۔

۵۶-۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ بھیم سین سچر ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ تب تک شملہ بھی پنجاب میں ہی تھا۔ شریمتی وجے لکشمی پنڈت، جو یو این او (UNO) میں ہندوستان کی نمائندہ تھیں، ہندوستان کی سفیر تھیں (بعد میں یو این او کی صدر بھی رہیں) وہ ذاتی طور پر شملہ آئیں اور سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئیں۔ ۲۰، ۲۵ دن رہ کر جب واپس جانے لگیں تو گیسٹ ہاؤس کی جانب سے قیام و طعام کا بل پیش ہوا جس میں کوئی ۲½ ہزار روپے بنتے تھے۔ انہوں نے کہدیا کہ

امرتیہ کے ہمارے پتے پر بھیج دینا ادا ہو جائے گا۔ مگر نہ ادائیگی ہوئی نہ اسے کسی سرکاری مد میں ڈالا گیا۔

اس واقعے کے کوئی چھ سات مہینے بعد وزیر اعلیٰ سچر صاحب پنڈت جی سے ملے۔ اہم باتیں جب ختم ہو گئیں تو چلتے چلتے انہوں نے شریمتی پنڈت کے بل کا ذکر بھی کیا۔ پنڈت جی یہ سن کر خاموش ہو گئے لیکن کچھ ہی لمحوں بعد سچر صاحب سے کہا: "آپ ذرا بیٹھیے، میں آتا ہوں" وہاں سے اٹھ کر اپنے ذاتی میز کی طرف بڑھے اور اس کی دراز سے ایک چھوٹی سی چیک بک نکالی۔ اس کے ایک طرف لکھا ہوا حساب دیکھا اور چپ چاپ دو چیک کاٹ دیئے۔ چیک سچر صاحب کو دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ سروپ (وجے لکشمی کا گھریلو نام) کی ایک چھوٹی سی بھول کی وجہ سے پنجاب سرکار کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپ یہ دو چیک لکھ لیجئے۔ ایک فوراً اور دوسرا اگلے مہینے جمع کرا دیجئے ....." یوں اس ڈھائی ہزار کے بل کی ادائیگی ہوئی۔

اس سے دیوان صاحب نے نتیجہ نکالا ہے کہ بہن اور بھائی دونوں نے اس معمولی رقم کو کسی سرکاری کھاتے سے ادا کرنے کا خیال تک نہ کیا اور نہرو کے ذاتی کھاتے میں اتنی رقم بھی نہیں رہتی تھی کہ ڈھائی ہزار یکمشت ادا کیا جا سکے۔   (۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء)

نہرو کی چیک بک: ۱۹۳۶ء میں جواہر لال نے مسلم لیگ کی مخالفانہ روش دیکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی چھتر چھایا میں ایک "مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی" بنائی اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔

اشرف مرحوم نہایت ذی علم، وسیع النظر، حاضر جواب، اور مباحثوں کے میدان جیتتے ہوئے ایک کمیونسٹ مقرر تھے۔ مجمع کو خوش کلامی اور استدلال سے باندھ لیتے تھے۔ اگرچہ وہ پوری طرح جواہر لال کے ہم خیال نہ تھے لیکن وہاں سوراج بھون (کانگریس کے ہیڈ کوارٹر، الہ آباد) میں کون تھا جو اپنے صدر رنگ صدارنگ نیتا سے پوری طرح متفق ہو۔ ڈاکٹر زیڈ احمد، رام منوہر لوہیا، راجگوپال آچاریہ وغیرہ سبھی عموماً سوشلزم کے جھنڈے تلے یکجا ہوئے تھے — بس!

۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک نے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا۔ اشرف تو کمیونسٹ تھے ہی — جواہر لال جیل میں تھے کہ وہ بمبئی چلے آئے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہیڈ کوارٹر میں کانگریس سے ناطہ ٹوٹ گیا۔

ملک آزاد ہوا تو کمیونسٹ پارٹی کی لیڈر شپ بیشتر ہندوستان میں تھی۔ پاکستان کے لئے طے پایا کہ چوٹی کے چند مسلم کامریڈ تنظیم کی خاطر بھیجے جائیں۔ سجاد ظہیر اور کے ایم اشرف ان ہی چند انقلابیوں میں سے تھے جو پردہ داری کے ساتھ اُدھر روانہ ہو گئے۔

اشرف دو سال کے بعد کراچی میں پکڑے گئے۔ جیل اور وہ بھی ناقص افراتفری کے دنوں کا جیل سہتے گئے، حفاکش اشرف کو مرض لگ گئے۔ باہر خبر آئی تو ان کی الہ آباد کے دنوں کی ایک شریک کار ہم خیال اور لائق روسی خاتون دوڑی ہوئی جواہر لال نہرو کے پاس پہنچیں کہ کچھ کیجئے۔ اشرف کو جیل کے عذاب سے بچائیے۔

پنڈت جی نے کچھ سوال و جواب نہ کیا۔ ایک رقعہ "ڈیر لیاقت!" کے نام دیا کہ یہ خاتون پہنچیں گی اگر اشرف کو رہا کردو تو وہ انہیں تمہاری مملکت سے نکال لے جائیں گی۔ "تمہارا خیر خواہ" جواہر لال۔ وزیر اعظم پاکستان نے رقعہ دیکھا، اشرف کو فوراً رہا کردیا اور بیک بینی و دوگوش مملکتِ خداداد سے باہر کا راستہ دکھادیا۔

اشرف ان خاتون کی "سرپرستی" میں لندن چلے گئے۔ اور وہیں رہے جب تک کہ خود پنڈت جی نے کہہ سن کر انہیں ہندوستان کی شہریت اور کروڑی مل کالج (دہلی) کی پروفیسری نہ دلوادی۔

اشرف کی پہلی ہم قبیلہ خاتون سے دو بچے تھے۔ جاوید اور شکیب۔ دونوں دہلی میں پڑھتے تھے۔ جاوید کو اسی علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ ملا جس میں کبھی اُن کا نامور باپ چمک چکا تھا۔ مگر تاریخ کی لکچرر شپ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی کا خرچ کہاں سے آ گئے؟ جواہر لال تک بات گئی انہوں نے اندرا گاندھی کی ڈیوٹی لگادی۔

ایک روز جب سالانہ امتحان کے فارم بھرے جارہے تھے، جاوید بن اشرف سے کہہ دیا گیا کہ ان کے ذمے یونیورسٹی کی بڑی رقم بقایا ہے، وہ امتحان میں نہیں بیٹھ سکتے۔ اور کل آخری دن ہے فارم بھرنے کا۔

جاوید بدحواس، پہلے تار دیا، پھر دہلی پہنچے۔ تین مورتی گئے۔ ملے گئے۔ اندرا جی سے کہا اب کیا کروں؟ جواہر لال ان بچوں کی تعلیم کا خرچ اپنی ذاتی آمدنی سے دیا کرتے تھے۔ یا تو آمدنی کہیں اٹکی، خرچ زیادہ نکل گیا۔ وقت پر چیک نہ پہنچ سکا۔ چیک و بنک میں فوری گنجائش نہ تھی۔ آخر باپ کی ہدایت پر بیٹی نے رات کے وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو فون کیا۔ یقین دلایا کہ تمام بقایا کا چیک

دو چار دن میں پہنچنے والا ہے۔ آپ لڑکے کو امتحان میں بیٹھنے دیجئے۔ تب جا کے مشکل آسان ہوئی۔
جاوید اشرف بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر بڑے محنتی، ذہین اور نکتہ رس نکلے، ایم ایس سی کر کے باہر گئے۔ ڈاکٹریٹ کی اور اب جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں نباتات کے سائنسی شعبے میں پروفیسر ہیں ان کے کیریئر میں لفظ "نہرو" کتنا بامعنی نکلا۔ لیکن کمیونسٹ عقیدے کے تعصب نے انہیں ایک زمانے تک جواہر لال کے اس "گناہ" کو معاف کرنے کی اجازت نہ دی کہ کانگریس ایجی ٹیشن کے دباؤ میں آکر ۱۹۵۹ء میں وزیر اعظم نے کیرالا کی کمیونسٹ حکومت برخاست کر دی تھی۔

ڈاکٹر کیدار شرما نے سنایا : میری فلم "بہاریں پھر بھی آئیں گی" سنسر میں ہفتوں سے اٹکی ہوئی تھی۔ میں دہلی پہونچا۔ پنڈت جی مجھے پہچانتے تھے۔ ملاقات کا وقت دیا۔ میں نے ان سے شکایت کی کہ سنسر بورڈ نے خواہ مخواہ چھوٹی سی بات کے لئے ہمیں الجھا رکھا ہے۔ فلم کا نام نوٹ کیا اور پوچھا: کہاں ٹھیرے ہیں آپ، میں نے بتایا۔ کہا شام سے پہلے جواب پہنچ جائے گا۔ وہی ہوا۔ اسی دن سرٹیفکیٹ ہمارے کمرے پر پہنچ گیا۔
مگر اس سے پہلے کہ میں ان سے رخصت ہوں۔ روک کر بولے، اچھا سا کوئی شعر سناتے جائیے
میں نے دریافت کیا کہ ایسا شعر سناؤں جو ایک دن یاد رہے یا ایسا جو عمر بھر لطف دے؟
بولے: ایک دن کے لئے سنائیے۔
میں نے پڑھا۔

ہمیں رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انہیں شعورِ سفر نہ تھا
کبھی راستوں میں بھٹک گئے، کبھی منزلوں میں الجھ گئے

دوہرا کر سنا ــــ اور پھر ٹھیر کر پوچھا۔ اور وہ دوسرا؟ عمر بھر والا شعر
میں نے عرض کیا: خطا معاف یہ توہینِ گلستاں ہوگی
یہ دورِ عہدِ بہاراں میں گر شمار ہوا
ظاہر ہے کہ اس طنز کا نشانہ وہ خود بھی تھے۔ مسکرا کر چپ ہو رہے اور رخصت کیا

ظ۔ انصاری

شیخ محمد عمر سلطان سعود اور نہرو

دہلی میں ۱۹۵۵ کی سردیاں شباب پر تھیں جب مجھے خیال آیا کہ ایک عمدہ سی سیاہ شیروانی ہونی چاہیئے سرکار دربار میں حاضری اور کرسی نشینی کے لئے۔ خیال پہلے بھی آیا ہوگا مگر اس بار خیال اور روپیہ دونوں ساتھ آگئے۔ چاندنی چوک سے نہایت اپ ٹوڈیٹ سیاہ سرج کا کپڑا تو لے لیا، سلوائیں کہاں! شیروانی سینے والا شہر بھر میں ایک ایسا شخص تھا شیخ محمد عمر، جس پر اخباروں خصوصاً "Reader's Digest" نے کبھی ایک فیچر شائع کیا تھا۔ یہ بزرگ اپنے ہنر میں افسانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور ۴۷ کی تباہ کاری میں کناٹ پلیس کی اپنی دکان لٹوا کر اب کشمیری دروازے والی دکان میں گوشہ گیر ہوگیا تھا۔ ملازم درزی کام کرتے، وہ صرف ہدایت دیا کرتا، البتہ چند گنی چنی ہستیوں کے کپڑے اب بھی خود ہی ہاتھ میں لیتا۔ اور یہ گنی چنی ہستیاں کون؟ وائسرائے لارڈ ویول، راشٹرپتی راجندر پرساد، ڈاکٹر ذاکر حسین، جواہر لال نہرو، ستیہ نرائن سنہا اور کرنل بشیر حسین زیدی وغیرہ ہم۔

میں سید صاحب زیدی صاحب کے بنگلے ہیلی روڈ پہونچا، انہیں راضی کیا کہ شیخ محمد عمر سے میری شیروانی سلوادیں، وہ ان دنوں بے حد مصروف تھے، مگر وہ زری وضعداری! گاڑی نکلوائی، لے کر چلے شیخ کی دکان پر پہنچ کر حسین انداز سے سلام دعا کی، بوڑھا درزی فوراً پگھل گیا، ہاں ہاں خود ہی سی کر پہناؤں گا۔

یہ وہی ہفتہ تھا جب والی نجد و حجاز سلطان سعود اپنے گیارہ شہزادوں اور آٹھ درجن وزیروں مشیروں اور بیوک (BUICK) لیموزین کاروں کے ساتھ دہلی آئے ہوئے تھے، شیخ صاحب کو جواہر لال نے بلا بھیجا۔ سلطان اور ان کے شہزادوں کے لئے اعلیٰ زربفت کی شیروانیاں سینے کا آرڈر اور ناپ دلوا دیئے۔

"شیخ صاحب، ذرا جی لگا کر، ہاتھ جھکا کر سینا یہ شیروانیاں! سلطان بن سلطان کی ہیں۔

"جی ہاں پنڈت جی، بادشاہ تو ہمارے بھی ہیں، ضرور

کیا کہا؛ تمہارے بادشاہ؟ شیخ صاحب، تمہارے بادشاہ وہاں بیٹھے ہیں راشٹرپتی بھون میں راجندر پرساد

"جی نہیں، پنڈت جی، وہ ہماری دنیا کے بادشاہ، اور یہ جو آئے ہیں، یہ دین کے بادشاہ، مکہ مدینہ ان کی سلطنت میں ہے نا! میرے ہاتھ کی شیروانی حج پر جائے گی۔

میں اپنی شیروانی کی "آخری ٹرائی" دینے جب شیخ محمد عمر کے درزی خانے کے بغلی کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں ہینگر پر زربفت کی تیار شیروانیاں جگمگا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک اپنے سائز کی دیکھ کر پہن ڈالی اور ہاتھ اٹھا کر ہوا میں آرڈر نافذ کیا کہ سعودی عرب کی تیل کمپنیاں فوراً نیشنلائز کردی جائیں۔

ابھی حکم کی تعمیل نہ ہوئی تھی کہ شیخ اندر ——— ارے، ارے آپ کیا غضب کر رہے ہیں! یہ تو شہزادے "فیصل" کی شیروانی ہے۔" وہ اس دھارمک برہمن کی طرح بولے جس کی رسوئی میں اچھوت کا سایہ پڑ گیا ہو — ۱۱ + ۱ بارہ شیروانیاں پہنا کر پنڈت جی نے سلطان سعود کے ساتھ گروپ فوٹو کھنچوایا اور ساتھ ہی شیخ محمد عمر سے اپنا مکالمہ بھی سنا دیا۔

اگلے موسم میں جب پنڈت جی سعودی عرب کے دورے پر گئے، شیخ محمد عمر بڑا سا لٹھے کا پگڑا باندھے سرکاری مہمان کے طور پر ان کے ہمرکاب تھے، کشمیری پنڈت کے طفیل انہیں حج بھی نصیب ہوا۔ زیارات بھی۔

ایڈیٹر چیلاپتی راؤ

"نیشنل ہیرالڈ" پنڈت جی کا چہیتا روزنامہ تھا۔ وہی اس کے پروردگار تھے۔ اور مشکل کے وقت رزق مہیا کرتے تھے۔ "چیلاپتی راؤ" جو پہلے سے ہی اپنی لبرل قوم پرستی اور بے باکی میں نام کما چکے تھے۔ اس کے اڈیٹر مقرر ہوتے اور آخر دم تک مختار کل ایڈیٹر رہے۔ چیلاپتی راؤ نکتہ چینی میں کسی کو بخشتے نہیں تھے اور چونکہ بے غرض جرنلسٹ تھے، ان کی عزت کی جاتی تھی۔

آزادی کے بعد یوپی کی پہلی کانگریس گورنمنٹ نے دبی زبان میں کئی بار جواہر لال سے ان کے ایڈیٹر کی شکایتیں کیں مگر پنڈت جی ان معاملات کو اندر تک سمجھتے تھے۔ کوئی اثر نہ لیا۔

ایک روز چیف منسٹر پنڈت گوبند ولبھ پنت نے کھلے لفظوں میں پنڈت جی سے ایڈیٹر ملاپ کی موجودگی میں شکایتاً کہا کہ ویسے تو یہ کانگرس کا اخبار کہلاتا ہے لیکن صوبے کی کانگریس گورنمنٹ ہی کو نشانہ بنائے رہتا ہے اور میرا تو مذاق اڑانے سے باز نہیں آتا ......"

سُنا، چھیلا جی ؟ پنڈت پنت کیا کہہ رہے ہیں ؟ ایسا کیوں کرتے ہو ؟

کچھ ایسے لہجے میں یہ جملہ کہا کہ سننے والوں کو ہنسی چھوٹ گئی

راؤ کچھ بڑبڑائے لیکن صفائی پیش نہ کی ۔

ذرا ٹھہر کر پنڈت جی نے پنت جی کو تسلی دیتے ہوئے کہا : آپ اس شخص کے لکھنے کا بُرا مت مانیے یہ خفقانی شخص ہے ۔ مجھے بھی نہیں چھوڑتا ۔ میں نے کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا ہے ۔ جرنلزم کی آزادی کا معاملہ ہے ۔ کیا کریں !

اردو کانفرنس میں

میں نے آخری بار اس کل ہند اردو کانفرنس میں نہرو جی اور مولانا کے ایک ساتھ دیدار کئے جب وسط فروری ۱۹۵۸ء میں اردو پارک جامع مسجد کے سامنے دو روزہ یادگار اجلاس ہوئے تھے ان میں اختلافی نقطۂ نظر کے نمائندے شریک تھے ۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو پہلے اجلاس کی صدارت کرنی تھی اور مولانا کو افتتاح ، مگر مولانا ذرا دیر سے پہنچے ۔ تب تک پورا ڈائس رہنماؤں سے اور ان کے ساتھ تصویر نکلوانے کے شائقین سے بھر چکا تھا ۔

جواہر لال آگے بیٹھے ۔ باڈی گارڈ پیچھے اور سامنے ۔ وہ بھی گویا حاضرین میں شریک تھے ۔ الگ نہیں اتنے میں مولانا کی سواری آئی ۔ وہ ڈائس پر چڑھے تو جواہر لال اپنی جگہ سے سر و قد اٹھے ۔ جگہ بنائی اور مولانا کو بازو کا سہارا دیتے ہوئے صدر کی جگہ لاکر بٹھایا ۔ وہ چین سے بیٹھ گئے ، تب جواہر لال ذرا پہلو دبا کر ، زانو سمیٹ کر بیٹھے ۔

یہ جواہر لال نہرو کا پشتینی کلچر تھا ۔ ان کے ہم عمروں اور ہمسروں کے بعد شاذ ہی کسی کو "حفظِ مراتب" کا یہ چلن نصیب ہو ۔

ط۔ انصاری

دواسازی کی صنعت

ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد جب میں دواسازوں کی آل انڈیا انجمن کا صدر تھا۔ جواہر لال بھی آئے۔ انہوں نے میرے کہنے پر اس کے اجلاس کا افتتاح کیا اور میری تقریر کا جواب دیا۔ میں نے استقبالیہ میں کہا تھا کہ

ملک میں آج کل صنعتوں کو، زمین اور زراعت کو قومیانے کا بہت چرچا ہے۔ حقیقت میں ہم لوگ آہستہ آہستہ ایک کلیت والی (ٹوٹل ایریٹین) ریاست کی طرف انجانے میں کھسکتے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا انجام سوویت یونین کی اشتراکی ڈکٹیٹری کی صورت میں نکلے گا یا نازی قسم کی قومی سوشلسٹ ڈکٹیٹری کی شکل میں۔ جمہوریت جس کا خلاصہ انفرادی اختیار اور آزادی ہے، وہ قومیانے اور صنعتوں پر سرکاری کنٹرول رکھنے سے میل نہیں کھاتی اس لئے ہمیں جمہوریت اور ڈکٹیٹری دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہے...."

جواہر لال میری اس تقریر پر ناراض نہیں ہوئے بلکہ میرے سوال کا مدلل جواب دیا اور بتایا کہ ایسا کوئی نظام موجود نہیں ہے جہاں صنعتوں کو پوری آزادی ہو۔ ہم درمیانی راستے پر چلنا چاہتے ہیں تمام تقریر گویا میرے سوالوں کا جواب تھی اور بار بار وہ میرا نام لے کر خطاب کرتے تھے۔

ایک بار جب انہوں نے نئی دہلی میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم دواسازی کی صنعت نیشنلائز کریں گے تاکہ دوائیں سستی اور عام ہو جائیں تو میں ان سے دہلی ملنے گیا۔ گھنٹہ بھر بات ہوئی۔ وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے غور سے سنتے رہے۔ میں نے کہا اس وقت دواسازی کی ۴، ۵ فیکٹریاں سرکاری انتظام سے چل رہی ہیں۔ گورنمنٹ پینی سلین بناتی ہے۔ ۹ آنے میں انجکشن بیچتی ہے۔ جرمنی کی پینی سلین بھاری ڈیوٹی بھرنے کے بعد یہاں چھ آنے میں بکتی ہے۔

کونین فیکٹری ۴۴ روپے فی پونڈ فروخت کرتی ہے اور انگلش ہاورڈ کونین یہاں آکر اس سے آدھی قیمت (۲۲ روپے پونڈ بکتی ہے) ناریا کی غازی پور فیکٹری کا یہی حال ہے۔ جرمنی حالانکہ اپنی افیم ہندوستان سے خریدتا ہے لیکن تیار کرنے کے بعد اور ایک تہائی قیمت ڈیوٹی بھرنے کے بعد ہمارے

مارفیا یہ سستی بیچتا ہے۔

وہ ایک ایک بات نوٹ کرتے رہے

میں نے جواہر لال جی کو بتایا کہ بیس ہزار کی معمولی رقم سے میں نے دوا سازی کا چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا تھا۔ اب وہ ستر لاکھ کی مالیت رکھتا ہے۔ اور ہر سال میرے یہاں کی دوائیں ۲،۵۰ لاکھ روپے کی امریکہ کو ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔ یہ سن کر پوچھا "کیا تمہارے ہاں کوئی یوروپین ملازم ہے؟"

میں ان کے سوال پر سُن ہوگیا۔

کوئی دس سال پہلے میں بمبئی کا شریف (SHERIFF) تھا۔ ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کرنے گیا۔ مرار جی دیسائی نے چیف منسٹر کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ہیں خواجہ عبدالحمید بمبئی کے شریف!

جواہر لال چھیڑ کر بولے "کیوں جی، پہلے تم شریف نہیں تھے کیا۔؟"

"آپ کو اردو سر دو کی پڑی ہے"

ستمبر ۱۹۵۶ء میں پنڈت جی نے انجمن ترقی اردو کے وفد کو ملنے کا وقت دے رکھا تھا۔ وفد کے لیڈر تھے: پنڈت آنند نرائن ملّا، شریک تھے کرنل بشیر حسین زیدی اور ہم دو ایک آدمی۔ سوءِ اتفاق کہ جو تاریخ ہمارے لئے مقرر تھی اس سے ایک دن پہلے مصر پر اسرائیلی حملے کے بہانے برطانیہ اور فرانس کے جہاز بھی حملے کے لئے بڑھنے لگے (جمال عبدالناصر نے نہر سوئز کو قومی ملکیت قرار دیا تو گویا سامراج نے اس کا توڑ کرنا چاہا)۔

پنڈت جی کے لئے یہ مسئلہ صرف ایک مشرقی ملک یا دوست ملک کی مشکلات کا نہیں تھا۔ وہ اسے ہندوستان کے وقار اور بے جانب ملکوں کی سلامتی کا سوال سمجھتے تھے۔ تیسری دنیا کے ایک اہم رہنما کی حیثیت سے ان کی ایک انٹرنیشنل ذمہ داری تو تھی ہی، انٹرنیشنل شخصیت کی حیثیت سے ذاتی اور جذباتی آزمائش کی گھڑی بھی آ پہنچی تھی۔

ہمارا اردو والوں کا وفد وقت مقررہ پر تین مورتی جا پہنچا۔ اندر بلوایا۔

"کہیے آپ کو کیا پریشانی ہے؟

پنڈت جی دراصل اردو کو سہ لسانی فارمولا میں جگہ ملنی چاہیئے لیکن تعلیمی نظام میں کہیں بھی۔۔

...... یوپی اور بہار میں تو اردو ......

اس سے پہلے کہ ہمارا بیان تمام ہو' وہ بھڑک اٹھے۔

" آپ صاحبان کو خبر ہے۔ اس وقت ایشیاء کے ساحل پر کیا گزر رہی ہے؟ آپ کو معلوم ہے کتنا زبردست پولیٹیکل کرائسس آیا ہوا ہے۔ ایشیاء سے یوروپ تک ہلچل ہے' طوفان ہے' بم برس رہے ہیں۔ اور آپ کو وہی اردو' اردو کی رٹ۔ اردو سر درد کی پڑیا ہے۔ لے جائیے اپنی اردو۔ بڑے بڑے مسائل ہیں۔ ان پر آنکھیں کھولئے۔ ذرا سوچیے' کتنا زبردست سنکٹ کا لمحہ ہے یہ......

ہاتھ پیک کر چپ ہو رہے۔ اور ہم سب دم بخود...... لیکن ...... اگر.... مگر کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم خود رخصت ہونے کو اٹھے۔

جب وفد رخصت ہونے لگا تو بھیا جواہر لال خاموشی سے اُٹھ کر ہال کے دروازے تک آئے اور آہستہ سے گویا مشفقانہ نصیحت کے لہجے میں بولے۔

" سنیے' آپ ذرا ہوم منسٹر پنت جی سے ملتے جائیے۔ میں نے ان سے بات کر رکھی ہے۔ مطالبات کی ایک نقل ان کو دیکر سمجھائیے گا۔ انہیں سمجھانا ضروری ہے۔ میں پھر فون کر دوں گا۔ واقعی اردو کے ساتھ یوپی میں خاص کر نا انصافی ہو رہی ہے۔ اسکی تلافی ہونی چاہیئے۔

انہیں جتنی جلدی طیش آتا تھا' اتنی ہی سہولت سے وہ شفقت اور دل سوزی تک بدل بھی جاتا تھا۔ طیش ان کے لڑکپن کی دین تھا اور شفقت ان کی اپنی ذہنی تربیت کی عطا۔ دونوں میں تال میل کا نام تھا پورم پور بھیا جواہر لال!

ترکوں نے الغائے خلافت کر دیا ہے تو خلافت کے دوبارہ قائم ہونے تک اس کے فرائض ہم کو ادا کرتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا ایک انعام ہے۔ اسلام کا نظام جمہوری ہے اور ہر شخص پر نظام خلافت کی تقویت کا یکساں فرض ہے۔

ہمدرد ۱۷ جنوری ۱۹۲۵

کلدیپ نیر

وہ گھر جو نہرو نے بنایا

امریکی مدبر ایڈورڈ اسٹولسن نے جواہر لال نہرو کی وفات پر کہا تھا "اس کی یادگار اس کی قوم ہے" یہ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ ۲۵ برس بعد اگر قوم کا جائزہ اس کے اخلاقی معیاروں سے لیا جائے اور اس کے جذبۂ انصاف اور احساس پر نظر ڈالی جائے تو نہرو کے بڑے بڑے مداح بھی تسلیم کریں گے وہ یادگار قریب قریب ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اس کے لیے بہت سا الزام اس کے جانشینوں پر آتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لیے خود نہرو کس حد تک ذمہ دار ہیں۔

مہاتما گاندھی نے جو قدریں قوم کے سامنے رکھیں اور ہند کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے جن قدروں کی پیروی کی ان میں بہت بڑا فرق ہے۔ مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کے طریقوں کے بارے میں دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔

لیکن نہرو اکثر مہاتما گاندھی کی زبان میں بات کیا کرتے تھے مثال کے طور پر انہوں نے کہا۔ میرے خیال میں بنیادی بات یہ ہے کہ غلط ذرائع سے ٹھیک نتائج نہیں نکل سکتے۔ لیکن جب حکومت کرنے کا سوال آیا تو نہرو نے کئی بار اصولوں کو خیرباد کہا۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ پرتاپ سنگھ کیرون کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنائے رکھنا اور جموں و کشمیر کے معاملات بخشی غلام محمد کے سپرد کئے رکھنا سیاسی یا عملی طور پر درست ہو لیکن اخلاقی طور پر یہ ٹھیک نہیں تھا دونوں کرپٹ تھے مگر دونوں ہی نہرو کے چہیتے تھے۔

شاید نہرو یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایک کرک اور اہل وزیر اعلیٰ خواہ وہ بے ایمان ہی کیوں نہ ہو ایک سیدھے سادھے ایماندار وزیر اعلیٰ سے کہیں بہتر ہے۔ یعنی اہمیت نتائج کی ہے ذرائع یا طریقۂ کار کی نہیں اندرا گاندھی نے اس اصول پر اور بھی زیادہ شدت سے عمل کیا اور سیاسی وجوہات کی بنا پر جگجیون رام کی حمایت کی جو ٹیکس چور تھے۔ ایل این مشرا کی پشت پناہی کی جو جماعت کے لیے رقم جمع کرنے میں بے اصولے پن کے لیے مشہور تھے اندرا جی نے کئی ایک کرپٹ وزراء اعلیٰ کی بھی حمایت کی جن کی مجرموں اور غنڈوں کے سرداروں سے ملی بھگت تھی۔

لیکن اس معاملے میں شاید اندرا گاندھی بھی اتنی زیرک نہیں تھیں جتنے آج کل رہنما ہیں لوک سبھا کے ممبر تھیا پارلیمنٹ کا ضمیر کہلاتے ہیں۔ ایسے الزامات کی موجودگی میں بھی جن کی تردید نہیں کی جاتی استعفیٰ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اس بات میں محفوظ خیال کرتے ہیں کہ لوک سبھا کے ممبران کی اکثریت ان کے ساتھ ہے یعنی اخلاق کچھ بھی نہیں ہے سیاست محض اقتدار کا کھیل ہے۔ اور اختیارات کا منبع طاقت ہی ہے اور قوم اوپر سے لے کر نیچے تک کرپشن کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اب بڑے سے بڑے اسکینڈلوں پر بھی غصہ نہیں آتا غلط اور درست کے درمیان امتیاز کی لکیر دھندلی پڑ چکی ہے اور کوئی اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ آپ اس لکیر کے کس جانب کھڑے ہیں۔ نہرو کے وقت میں بھی صنعت کاری کے نتیجے کے طور پر بعض ایسی برائیاں سماج میں آ گئی تھیں کہ ترقی کے نام پر انھیں برداشت کر لیا گیا تھا لیکن اس صنعتی ثقافت میں بھی کچھ بے ہودگی اور خرافات باقی تھی صنعت کار اور تاجر اس مافیا کا حصہ نہیں بن گئے تھے جو آج ملک پر حکومت کر رہا ہے۔

نہرو کے وقت میں سماجی نابرابری زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اگرچہ انھیں سماج وادی پر اعتقاد تھا لیکن انہوں نے سماج کے اعلیٰ طبقوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جنھوں نے اپنے قدم زیادہ مضبوطی سے جما لیے تھے کوئی ادارے یا آلات کار تیار نہیں کیے گئے۔ پیداوار کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے جو تکنالوجی اور حکمت عملی وضع کی گئی ہے اور جس میں سماجی تقاضوں کا بہت کم دھیان رکھا گیا ہے اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس میں نابرابری، عدم استحکام اور بے چینی کے عناصر نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور جس میں کشیدگیوں میں اضافہ ہو جانے کا امکان ہے۔

تاہم نہرو اختلاف رائے کے حق کو تسلیم کرتے تھے اور مخالف جماعتوں کو اپنا دشمن خیال نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ڈکٹیٹر بن سکتے تھے لیکن انہوں نے جمہوریت میں اعتقاد رکھا اور جمہوریت کا راستہ اپنایا یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید دوسروں کی بات میں بھی کچھ سچائی ہو لیکن راجیو گاندھی کا طریقہ کار ایک متعصب شخص کا سا ہے ان کی نظر میں سیاہ اور سفید کے علاوہ اور کوئی رنگ نہیں ہے اور مسائل کو حل کرنے کا ان کا واحد طریقہ پارلیمنٹ میں اپنی اندھی اکثریت کا استعمال کرنا ہے وہ اقتدار میں بنے رہنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ انٹیلی جنس بیورو اور سی بی آئی ان کے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ چناؤ کے بعد [illegible] اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے افراد کا انتخاب کرتے ہیں نہرو نوکر شاہی کی بات تو مان لیتے تھے لیکن کبھی ان کو اپنے پر غالب نہیں آنے دیتے تھے لیکن راجیو گاندھی نے نظام کو توڑنے

ڈالنے کے عمل میں مدد دی سیاست کو حصہ دار بنایا ہے۔

نہرو نے قوم کی جو یادگار تعمیر کی تھی وہ اب مضبوط نہیں رہی۔ نفرت، مار پیٹ اور تشدد کو کھلا سہارا ہے۔ دہشت گردی اور زیادہ علاقوں میں پھیلتی جا رہی ہے اور خدشہ ہے کہ بہت سی ریاستوں کے لوگ علیحدگی سانحوں جن کے ہیں نہرو اس صورت حال کے لئے الزام سے بچ نہیں سکتے کیونکہ وہ ایسے رجحانات کو ختم نہ کر سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آزادی کے کبھی سر زمین نہیں کی جہاں ملک میں استحکام لانے کا سوال تھا۔ ریاستوں کی لسانی بنیاد پر تقسیم یا تنظیم کے لیے ایک کمیشن کا تقرر بے شک پہلے چند سیاسی اقدامات میں سے ایک قدم تھا چونکہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے ناگپور اجلاس نے ریاستوں کو زبانوں کی بنا پر تشکیل کو ایک واضح نصب العین کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ لہٰذا نہرو کو ایک دن اس پر عمل کرنا ہی تھا لیکن جب اس سے کہیں زیادہ اہم امور توجہ طلب تھے تو اس کام کو ہی ترجیح کیوں دی گئی ہے۔

آج ہر ریاست ایک لسانی جزیرہ ہے جہاں اپنے علاقے کے افراد کو ترجیح ملتی ہے اور انہیں حقوق کے لیے لڑنے جھگڑنے کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ اسرائے قومی شاہراہوں کے ... مقررہ حد سے سنگ میل بھی علاقائی زبانوں میں لکھے ہوتے ہیں اور ریاستوں کے سکریٹریٹ اسرائے اپنی ریاست کی زبان کے دوسری زبان کی دستاویزات کو قبول نہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ علاقائی کونسلوں نے جو ریاستوں میں مشترکہ انداز فکر منصوبہ بندی اور لسانی عصبیتوں سے اوپر اٹھنے کے لئے قائم کی گئی تھیں انہوں نے کوئی کام نہیں کیا۔

ایک مشترکہ کل ہند زبان سے ریاستوں کے درمیان فاصلے طے ہو سکتے تھے اور اس سے اتحاد پیدا ہو سکتا تھا لیکن نہرو جی نے ہندی کی حیثیت اور مرتبے کو کم کیا جسے ہند کے آئین نے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا تھا یہ کوئی شاندار بات نہیں ہے لیکن ملک کی اکثریت کو ... سکتے تو ہم کو مزید لیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب وزیر داخلہ گووند ولبھ پنت نے جن کا میں پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری تھا ... میں ایک متفقہ رپورٹ پیش کی جس میں ہندی کو زبان خاص اور انگریزی کو ایک امدادی یا ثانوی زبان بنانے کی سفارش کی گئی تھی تو نہرو نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ رپورٹ میں ترمیم کرنی پڑی کہ امدادی کی بجائے دوسری یا ثانوی زبان کا لفظ سفارش میں شامل کرنا پڑا۔ میں انگریزی کے خلاف نہیں ہوں لیکن اگر جمہوریت جس میں تعداد کو فوقیت حاصل ہے کے کچھ معنی ہیں تو ایک ایسی زبان جسے صرف

پر ریاستیں نیم لوگ سمجھتے ہیں ایسا رابطے کا مستقل ذریعہ نہیں بن سکتی۔

نہرو شاید خطرات سے آگاہ تھے لیکن نہرو نے تین زبانوں کے فارمولے کا خیال پیش کیا جس میں اسکولوں میں ہندی انگریزی اور علاقائی زبان پڑھانے کی تجویز تھی لیکن اب ریاستوں نے عام طور پر دو زبانوں کا فارمولا اپنا لیا ہے جنوب میں ہندی کو ترک کرکے انگریزی اور علاقائی زبان رکھی گئی ہے اور شمال ہند میں کسی جنوبی ہند کی زبان کو ترک کرکے صرف ہندی اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے واضح کا مقصد ہے جب تامل ناڈو اسمبلی کے حالیہ چناؤ کے لیے کانگریس آئی نے اپنے منشور میں صرف تامل اور انگریزی زبان کو شامل کیا تو انہوں نے تین زبانوں کے فارمولے کو سرکاری طور پر خیرباد کہہ دیا۔

شاید نہرو یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر لوگوں کے کسی طبقے پر کوئی زبان زبردستی تھوپی جائے تو تجربہ لازمی طور پر ناکام ہوگا انہوں نے اتفاق رائے کی جو پالیسی اختیار کی شاید وہ اس متنوع قوم کے لیے واحد راستہ تھی جس میں ہم سب کو ایک ہی قوم کا حصہ ہونے کا احساس ہونا چاہیے۔ ایم جے۔ اکبر نے اپنی کتاب "نہرو ہند کی تشکیل" میں مغربی ممالک کو نہرو کے بارے میں سمجھنے میں اتنی ہی مدد کی ہے جتنی اٹین برو کی فلم گاندھی نے مغربی ممالک کو مہاتما کو سمجھنے میں کی تھی۔ لیکن اکبر زبان کے جھگڑے کو چھوڑ گئے ہیں حالانکہ انہوں نے مدلل طریقے سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ نہرو نے ہندوستان کے مختلف طبقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں، شمالی اور جنوبی ہند کے لوگوں شہروں اور دیہات کے رہنے والوں کو کس طرح ایک قوم کے دھاگے (دائرے) میں اکٹھا کیا جسے انگریزوں نے تقسیم کر دیا تھا اور اس میں جناح نے فرقہ پرستی کا عنصر شامل کر دیا تھا۔

لیکن نہرو نے ہی سب سے پہلے اتفاق رائے کے اصول کی خلاف ورزی کی انہوں نے کانگریس کی یہ درخواست منظور (؟) اور ناگالینڈ کے کہنے پر کیرل کی پہلی منتخب شدہ سرکار کو برخواست کر دیا اور تب سے اس مثال کی ۷۵ بار پیروی کی جا چکی ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جو قوم ان کی تصویر میں ڈھلی ہے اسے ان کی خلاف ورزیوں کی قیمت ایک دن ادا کرنی ہوگی۔

راجندر پوری نے اپنی حالیہ کتاب "ہند کی پھر سے کھوج" میں اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ "[illegible] پسند ترقی پسندی کے طور پر قبول کرکے ہم طاقتور منصوبے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی" یہ خوبصورت دیانت [illegible] نہرو کی صد سالہ برسی کے اس سال میں نہرو کی اچھی باتوں کو یاد رکھتے [illegible]

رشید الدین

پنڈت جواہر لال نہرو
ایک ادیب کی حیثیت سے

گاندھی جی کے بعد جدید ہندوستان کی قومی، سیاسی اور سماجی زندگی کی سب سے زیادہ قد آور شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو ہی کی ہے۔ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے اور عظیم ملک کے سپوت تھے بڑے باپ تھے پنڈت موتی لال نہرو اور عظیم ملک تھا ہندوستان۔ لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ انہیں بڑائی ورثہ میں ملی تھی بلکہ انہوں نے یہ بڑائی خود اپنی محنت، لگن، خلوص اور قابلیت سے حاصل کی تھی اور اسے انہوں نے مرتے دم تک قائم رکھا، جبکہ دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کا ان کی زندگی میں زوال آپ کی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ پنڈت جی بے حد ذہین آدمی تھے اور ان کی یہ ذہانت کسی ایک میدان تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ہر میدان کے مرد تھے۔ انہیں سب سے زیادہ شہرت ایک سیاسی رہنما کے طور پر حاصل ہوئی لیکن اگر وہ سیاسی میدان میں نہ بھی داخل ہوتے تو ایک ممتاز و منفرد ہندوستانی ہوتے اور ان کی ذہانت انہیں کسی نہ کسی میدان میں منصبِ شہرت پر ضرور لے آتی اور وہ گوشہ گمنامی میں ہرگز نہ رہتے۔ کچھ نہیں تو ادب ہی ایک ایسا میدان تھا جو انہیں شہرتِ دوام بخشنے کے لئے کافی تھا۔

پنڈت جی کے سیاست میں چلے جانے سے سب سے زیادہ نقصان ادب کا ہوا۔ اگر وہ سیاسی لیڈر نہ ہوتے تو ہندوستان کے بہت بڑے ادیب ہوتے اور انگریزی کے ممتاز اہلِ قلم میں ان کا شمار ہوتا۔ ویسے اب بھی وہ کوئی چھوٹے ادیب نہیں کہلائے جا سکتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی بے پناہ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنے قلم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے اور بہت سی تحریریں ان کے نوکِ قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نہ بکھر سکیں اور ہندوستان کی جدید نسل کو ذہنی بالیدگی نہ بخش سکیں۔

وہ تو بھلا ہو اُس زمانے کے انگریز حکمرانوں کا کہ انہوں نے انھیں بار بار جیل کی سیر کرائی اور

اس طرح انہیں اپنی گوناں گوں مصروفیتوں سے نجات کے بعد قلم سنبھالنے کا موقع ملا اور ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آسکیں۔ پنڈت جی جب جیل جاتے تو ان کی جیکٹ کی جیب میں ایک قلم ہوتا اور جب وہ جیل سے باہر نکلتے تو ان کی بغل میں اپنی کسی کتاب کا مسودہ ہوتا۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ زحمت میں بھی ایک رحمت ہوتی ہے بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ جیل ظاہر ہے ہر شخص کے لئے زحمت ہی ہو سکتی ہے، خصوصاً پنڈت جی جیسے آدمی کے لئے جو اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے یہ بہت بڑی زحمت تھی کیونکہ اس طرح وقتی طور پر ان کا مشن مسدود ہو جاتا تھا لیکن اس میں ایک رحمت کا پہلو بھی نکل آیا کہ پنڈت جی ایک قومی اور سیاسی لیڈر کے علاوہ ایک ادیب کی حیثیت سے بھی ہم سے روشناس ہوئے اور ہمیشہ کے لئے اپنی تحریرات ہمارے درمیان چھوڑ گئے۔

پنڈت جی بچپن سے بہت باشعور تھے اور شروع ہی سے مطالعہ کا ذوق رکھتے تھے۔ تعلیم اور وہ بھی انگلستان کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یہ پنڈت جی کے ریزیڈنٹ ٹیوٹر مسٹر فرڈیننڈ بروکس تھے جنہوں نے ان کے قیام انگلستان کے دوران ان میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ اور بعد میں زندگی بھر یہ شوق ان کا ساتھی بنا رہا۔ سیاسی زندگی میں آنے سے پہلے ان کے پاس وافر وقت تھا اور اس عرصہ میں انہوں نے بے حساب کتابیں پڑھیں اور سارا انگریزی ادب اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ جب وہ سیاسی زندگی میں آ گئے اور ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو انہوں نے سفر کے دوران مطالعہ شروع کیا۔ اور ریلوں میں پڑھنے لگے۔ اس طرح پنڈت جی نے ریل میں پڑھا اور جیل میں لکھا۔

پنڈت جی میں پڑھنے کی عادت بچپن سے تھی لیکن لکھنا انہوں نے بے حد باشعور اور پختہ کار ہونے کے بعد شروع کیا۔ ان کی پہلی تصنیف "سفر نامۂ روس" تھی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ان کے روس کے سفر کی روئیداد ہے جس میں ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد روس کی تفصیلات درج ہیں۔ اُن کی دوسری تصنیف ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر آئی جس کا نام تھا "باپ کے خط بیٹی کے نام"۔ یہ اصل میں وہ خطوط تھے جو جیل میں انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی اندرا پریہ درشنی کو لکھے تھے اور جو بعد میں آنجہانی ہی کی جگہ ہندوستان کی وزیر اعظم تھیں اور ان کی گراں بار ذمہ داریوں کو اٹھائے ہوئے تھیں۔

جیل اور خطوط کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا بلکہ چلتا رہا اور بعد میں اس نے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ کتاب تھی "تاریخ عالم کی جھلکیاں" یہ دنیا کی تاریخ ہے جس کی وجہ سے پنڈت جی نے دنیا کے مورخین میں بھی اپنا نام شامل کر لیا۔ ان کے پاس اس وقت حوالے کی کوئی کتاب نہیں تھی اور نہ مطلوبہ مواد دستیاب تھا پھر بھی انہوں نے محض اپنی یادداشت سے اپنی بیٹی کو دنیا کی تاریخ سے واقف کرایا اور بعد میں ان ہی خطوط کو ترتیب دے کر یہ کتاب تیار کی گئی۔ "جگ بیتی" کے نام سے اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے جسے مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا تھا اور مترجم تھے ڈاکٹر عابد حسین۔ یہ ترجمہ اب مفقود ہے۔ ضرورت ہے کہ مکتبہ جامعہ اس کا جدید ایڈیشن شائع کرے۔ اس کتاب کے ہر صفحہ پر آپ کو پنڈت جی کے تاریخی شعور اور سماجی ادراک کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ کتاب انشاء پردازی اور حقیقت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ زبان بیحد شگفتہ انداز بیان نہایت دلنشیں ہے۔

پنڈت جی کی تصانیف میں ان کی خود نوشت سوانح حیات بھی شامل ہے۔ یہ بھی انہوں نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح جیل میں لکھی۔ دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تصنیف (جو کافی ضخیم ہے) انہوں نے صرف نو مہینے میں لکھی ہے۔ یہ تصنیف ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے (اس کتاب کا نام "آپ بیتی" ہے) یہ ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ صرف ان کی ذاتی زندگی کی عکاسی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے پنڈت جی کی ذاتی پسند اور ناپسند اور بہت سے معاملات میں ان کے نقطۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ ان کی شخصیت کا بخوبی تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں بالکل سیدھے سادے انداز میں واقعات بیان کئے گئے ہیں اور اپنی "انا" کو کہیں غالب نہیں آنے دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا بھی "آپ بیتی" کے نام سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے جسے مکتبہ جامعہ ہی نے شائع کیا تھا اور اس کے مترجم بھی ڈاکٹر عابد حسین تھے۔ یہ ترجمہ بھی "جگ بیتی" کی طرح مفقود ہے اور اس کے جدید ایڈیشن کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے۔

اب تک میں نے پنڈت جی کی چار تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن میرے خیال میں ان کی جو سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے اس کا ذکر ابھی باقی ہے۔ یہ کتاب بھی جیل میں لکھی گئی ہے اور ایک تاریخی قلعہ میں جس کا نام مسعود نگر ہے۔ کتاب کا نام ہے "تلاش ہند" اور قلعہ ہے احمد نگر کا۔ یہ سن ۱۹۴۴ء کی تصنیف ہے۔ اسی کے ساتھ اسی جگہ اردو کے ایک ادیب نے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ کتاب کا نام ہے "غبار خاطر" اور ادیب ہیں مولانا ابوالکلام آزاد یہ مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے پنڈت جی کے ساتھ ہی قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے دوران اپنے ایک دوست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو لکھے تھے۔

"تلاش ہند" اصل میں ہندوستان کی تاریخ ہے۔ یہ بھی "جگ بیتی" اور "آپ بیتی" کی طرح ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں نئے زاویہ اور نئے انداز سے ہمارے ملک کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "جگ بیتی" کا مورخ اور "آپ بیتی" کا سوانح نگار اس میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ اور پڑھنے والے پر اپنی ذہانت اور قابلیت کی دھاک بٹھا دیتا ہے۔ یہ تاریخ انگریزوں کے دور میں لکھی اور شائع کی گئی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کھو گیا ہے جو کبھی اپنی تہذیب و تمدن، علم و ادب اور سطوت و سلطنت میں ساری دنیا میں مشہور تھا۔ ہمیں اس کی تلاش کرنی ہوگی۔ یہ تلاش ہندوستان کی آزادی کے سوائے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ "جب آزادی آئے گی اور نئے افق پیدا کرے گی تو اس وقت ہندوستان اپنے آپ کو پھر سے پالے گا۔"

جی ہاں! ہندوستان کی تلاش پوری ہو گئی اور اسے اپنے آپ کو پائے ہوئے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں وہ اپنی قدیم شان و شوکت اور سطوت و عظمت کے علاوہ روایتی بھائی چارگی، امن و شانتی اور معاشی و مادی فارغ البالی کیلئے کوشاں ہے

تو یہ تھے پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ادیب کی حیثیت سے۔ ایک ہندوستانی جنہوں نے انگریزی زبان میں لکھا اور بہت سے انگریزوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آخر میں پھر یہی کہوں گا کہ پنڈت جی اگر کچھ بھی نہ ہوتے اور صرف ایک ادیب ہوتے تو بھی بہت کچھ ہوتے۔ بقول اختر حسین "اگر نہرو کا سرمایۂ حیات ان کی نگارشات کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی ان کی عظمت و [illegible]

ڈاکٹر کے۔ جگدیش سل راؤ۔
حیدرآباد۔

ذکر پنڈت نہرو

ہندوستان کے عظیم سپوت پنڈت جواہر لال نہرو کا جشن صد سالہ ولادت چودہ نومبر ۱۹۸۹ء کو شروع کیا گیا اور اس سال اس دن ہماری پیمانہ پر تقاریب منعقد کی جائیں گی۔ ان کی وفات ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہوئی، سارے عالم میں ان کا سوگ منایا گیا ان کی عالمی سطح پر قدر تھی [illegible] ہر ایک کے دل میں سمو گئے تھے بچوں کے دلوں میں تو وہ چاچا نہرو ، ہمیشہ کے لیے رہ گئے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا جب اعادہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ پنڈت نہرو، عدم تشدد فلسفہ کے بانی مہاتما گاندھی کے شاگرد تھے ان کی ہر بات کو سنجیدگی سے قبول کر لیتے تھے۔

پنڈت نہرو امیر گھرانے میں پیدا ہوئے کئی سہولتیں، عیش و آرام انہیں میسر تھا۔ ہندوستانی تہذیب کے چرچے بھی ان کے گھر میں کئے جاتے تھے۔ الہ آباد کا آنند بھون ایک مرکز بنا تھا ماں سوروپ رانی کا پیار، موتی لال نہرو کے مشورے سے وہ مالا مال ہو چلے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں انگلستان تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلے گئے۔ ہارو میں کرکٹ کھیلے۔ کیمبرج میں اور انس آف کورٹ میں حصول تعلیم میں مشغول رہے۔

ہندوستان واپس آجانے کے بعد گو انکے اوپر بیرونی ممالک کی تہذیب کا اثر تھا لیکن اس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ اچکن چوڑی دار پاجامہ پہن لیے۔ گاندھی ٹوپی، شیروانی چوڑی دار پاجامہ جب یہ پہن لیتے تھے اور باہر نکل پاتے تھے تو نظروں سے اوجھل ہونے تک عوام انہیں گھور گھور کر دیکھ پاتے تھے۔ آزادی کی لڑائی میں جب کبھی تقریر کے لیے مائیک پر کھڑے ہو جاتے تھے تو ان کی جوشیلی تقریر سے لوگوں میں ولولہ پیدا ہوتا تھا آزاد وشیل نہرو کے نعرہ سے لوگ اکٹھا ہو گئے اور گاندھی جی کی سرپرستی میں جنگ آزادی کو آگے لے گئے۔

انگریزوں نے پنڈت نہرو کو کئی مرتبہ قید کیا ان کی بیوی کملا جب بیمار تھیں اس وقت بھی

نہرو قید میں رہے۔ جیل اندر ان کا [illegible] لکھتے رہتے تھے (۹) سال تک تقریباً ان کی زندگی کا وقت قید خانوں میں گزری خاص طور پر احمد آباد کے جیل کے دن ان کے دل میں ایک نئے ادب کو جنم دیا جیل میں جب وہ بند رہے وہاں پر کچھ پرندوں سے اور دوسرے پالتو جانوروں سے بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔

ان کی تصانیف ڈسکوری آف انڈیا، گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری، عالمی سطح پر ستاروں کی داستانیں ہیں، ادبی شہ پارے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے آئینے ہیں۔ انسانی قدروں کا تذکرہ ہے جدوجہد انسانیت سے بھرپور ہیں ان کے کارنامے ادب۔ اندرا گاندھی کو لکھے ہوئے خطوط میں مختلف ماحول کا ذکر ہے کئی جذبات کا اظہار رہا ہے مشوروں کا انبار ہے۔ جغرافیہ کی تمہید ہے تو سائنسی ایجادات کا مبدا بھی ہے۔

اپنی مشہور کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنگالی، مرہٹے، گجراتی، تامل، آندھرائی، اڑیا، آسامی، کنڑی، ملیالی، سندھی، پنجابی، پٹھان کشمیری اور اس وسیع مرکزی علاقہ کے لوگ جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے سینکڑوں ہزاروں سال اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتے ہیں اور ان میں خوبیاں، خامیاں موجود ہیں جو روایات اور عادتیں [illegible] ان کے بزرگوں [illegible] ان کے ساتھ [illegible] ان سب نے اس سارے عرصہ میں ہندوستانیت کے امتیازی نشان کو برقرار رکھا اور ان سب میں ہندوستان کی [illegible] کی اخلاقی و ذہنی صفات مشترک ہیں۔

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کے بارہ بجے ہندوستان کی آزادی پر پنڈت نہرو نے [illegible] دستور ساز اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "جب تمام دنیا سوئی ہوئی ہے ہندوستان جاگ رہا ہے یہیں آزادی حاصل [illegible] ٹھیک رات کے بارہ بجتے ہی"

ہندوستان کے وزیر اعظم سترہ سال تک رہے کئی کارنامے کر دکھائے پنڈت نہرو نے [illegible] کمیشن کی سیاست [illegible] [illegible]

سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنانے میں ۱۹۲۱ء میں بھرپور رول رہا تھا۔ ایک خاص تحفہ تھا پنڈت نہرو جی ہندوستان کی ترقی کے سلسلے میں۔

پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم کی حیثیت سے، معمار کی حیثیت سے، محب وطن کی حیثیت سے سارے جہاں میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ عالمی مسائل کا حل بھی انہوں نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ دولت مشترکہ کانفرنس میں بار بار ان کے مفید مشوروں کو تمام وزراء قبول کر لیتے تھے۔

ہندوستان ۱۹۵۱ء سے پانچ سالہ پلان، واسوودھیا، تاکہ جامع پلان تیار کئے گئے عمل آمد وہ چاہتے تھے کہ ہر ہندوستانی کے معیار زندگی کو اونچا کیا جائے تاکہ لوگ خوشحال ہو سکیں گے۔ سائنس کی ایجادات کو اپنایا گیا۔ عصری نظام کو معاشی سماجوں میں اپنانے سے زندگی کی ایک نئی لہر۔ نظام پنچایتی کے لیے، پیڑوں کے لیے سہل ثابت ہوا۔ ہندوستانی آئین کے مطابق ان کی سرکار کے عام انتخابات ۱۹۵۱ء سے ہر پانچ سال کو کروائے گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں ان کے دور میں پیش کئے گئے جس کی بنیاد ڈالی گئی۔ قومی سطح پر تحقیقی ادارے قائم کئے گئے تاکہ سائنس کی اشاعت ملک بھر میں ہو جائے۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو جب باپو جی کا قتل ہوا تھا پنڈت نہرو نے غم میں ڈوب ہو کر کہا "ہماری زندگیوں میں سے روشنی چلی گئی ہے۔ ایک طرح سے وہ روشنی ہمیشہ کے لیے رہے گی، ملک کو راہ دکھلانے والے ہزاروں سال تک ... وابستہ ہے۔ ... کے لیے روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔" انہوں نے ملک کو آزاد کیا ... غلطیوں سے ... انجام دیا ... ۔ ... کے علمبردار کی حیثیت سے ... ہو گئے ہیں۔

ہمالیہ کی وادیوں سے لے کر کنیا کماری کے پاس تین سمندروں کا ملنا بھی ان کے مطالعہ میں داخل تھا۔ وادی کشمیر میں ڈل جھیل کی خوبصورتی کا ذکر کیا۔ انہوں نے دنیا کی مشہور شخصیتوں مثلاً سقراط، شنکراچاریہ، لینن، چنگیز خان، گوتم بدھ کا بھی ذکر ... ان کی تمام ... صحافت کے میدان میں انہوں نے نیشنل ہیرالڈ کی بنیاد ڈالی۔

پنڈت نہرو انسانی قدروں کے احترام کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق ترقی کرنے کا موقع ملے۔ وہ ہر قسم کی ...

اور اوہام پرستی کے خلاف تھے۔

پنڈت نہرو لوگوں کی یکجہتی کے لیے ہمیشہ کام کرتے رہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ملک کا اولین فرض اپنی آزادی کا تحفظ اور استحکام ہے۔ اپنے تمام دوسرے کاموں کو اس کا ماتحت [illegible] ہے۔ جب کبھی آپ کوئی کام کرنا چاہیں تو اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ اس سے یکجہتی پیدا ہوگی یا پھوٹ پڑے گی اور کیا سب مذہبوں کے لوگ مل جائیں اور ایک ہو جائیں [illegible] کا مطلب ہے تمام مذاہب کی یکساں عزت اور تمام لوگوں کے لیے یکساں مواقع خواہ وہ کسی مذہب کو ماننے والے ہوں۔ اس لیے ہمیں اپنے کلچر کے اس پہلو کو اپنے ذہن میں رکھنا ہوگا کیوں کہ آج کے ہندوستان میں یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

عالمی امن کے پیامبر تھے پنڈت نہرو۔ عالمی تحریکات میں دلچسپی لیتے تھے۔ تاکہ ہندوستان عالمی سطح پر امن کی برقراری میں خاص رول ادا کرے۔ غیر جانبداری کی پالیسی کے معمار رہے۔ چین کا حملہ جب ہندوستانی سرحد پر ہوا تو انہیں صدمہ ہوا۔ کچھ [illegible] زندہ رہے تھے پھر سے صحت بگڑتی چلی گئی اور ۲۷ مئی [illegible] کے دن وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ ہندوستانی تہذیب سے گہری محبت کرتے تھے۔ انہوں نے وصیت کی دستاویز میں لکھا کہ ان کا جسم ہندوستان کے کھیتوں میں بکھیر دی جائے جہاں جہاں کھیتوں میں کسان مزدور محنت کام کرتے ہیں اسی مٹی سے میری روح مل جائے۔

چیسٹر باولس جو امریکی سفیر تھے انہوں نے کہا تھا کہ "پنڈت نہرو کو ایک محاورہ یا جملے میں بیان نہیں کر سکتے۔" کسی نے کہا تھا کہ "ایک تناور درخت گر گیا جس کا سایہ [illegible] اب پھر کبھی نہیں مل سکتا۔" گلاب کا پھول نہرو کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

کثرت میں وحدت ہی ہماری تہذیب کا آئینہ ہے یہ تمدن کا عکس بھی ہے اس کی برقراری کے لیے پنڈت نہرو نے ترقیاتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا [illegible] کا اہم [illegible] خواہ وہ [illegible] یا سائنس کا [illegible] آر [illegible] عظیم [illegible] ہر [illegible] حیدرآباد کے [illegible] سفر میں [illegible] خیالات کا ایک [illegible] میں رکھ دیا [illegible] پنڈت نہرو خواہاں تھے۔

یہ [illegible] ہم سے جدا ہو گئے

ہیں وہ ہمارے سامنے، دنیا کے سامنے وہ ایک سربراہ، [illegible]
سیاستدان [illegible] آزادی کے رہنما کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا دیا ہوا "تین مورتی بھون"
ایک [illegible] ہے جہاں ہر روز پانچ ہزار لوگ [illegible] ملاقات [illegible]
[illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] ہندوستان کے [illegible]
[illegible] میں جبر والا [illegible] ہے۔ نہرو نائٹس [illegible]
[illegible] ماہنامہ [illegible] ہے۔ حال ہی میں نہرو کی یاد میں ایک [illegible]
[illegible] جلسہ [illegible] جس میں مارگریٹ تھیاچر [illegible] وزیر اعظم برطانیہ نے [illegible] وزیر اعظم
شری راجیو گاندھی و وزیر اعظم برطانیہ مارگریٹ تھیاچر اس [illegible] کے سرپرست رہیں گے۔

[illegible] عوام خصوصاً نوجوان طبقہ نہرو کی تحریک کا [illegible] انسانی
جذبات، اور [illegible] قدروں کی [illegible] ہو جاتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کی برقراری
[illegible] ساتھ ہی ساتھ قومی یکجہتی میں اضافہ ہو پاتا ہے۔ پنڈت نہرو
کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہو سکتا ہے۔

باقی سلسلہ "تقسیم ہند کا پیش خیمہ"

تاریخ ہند کا سب سے بڑا المیہ: ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کا دن صرف کلکتہ ہی کیلئے نہیں سارے ہندوستان کے لئے یوم سیاہ تھا۔ واقعات کا موڑ ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا کہ اب کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین پرامن مصالحت ناممکن ہو گئی تھی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

جواہر لال کی جذباتیت: جواہر لال نہرو میرے محبوب ترین دوست ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کیا تھا۔ مصائب برداشت کئے تھے اور آزادی ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور اتحاد کا نشان بن گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود افسوس کے ساتھ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض اوقات وہ جذباتیت کی رو میں بہہ جاتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ نظریاتی افکار سے اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ صورت حالات کی اہمیت اور حکمت کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

احمد رشید بیگ

گاندھی جی اور نہرو جی

ہندوستان کی تاریخ میں ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا دن بڑی آزمائش کا تھا۔ جبکہ ہندوستان کا جواہر اچانک پوری دنیا کو رنجیدہ اور غمزدہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ان کے بارے میں گاندھی جی نے کہا

He was what his name signified a "JAWAHAR" That was a Jewel.

نہرو جی ایک انسان دوست، محب وطن، عالمی امن و اتحاد کے حامی اور انصاف پسند انسان تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کے ایسے رہنما تھے جن سے کسی مذہب و ملت اور کسی فرقہ و نسل کو اختلاف نہ تھا۔ ان کو اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اسی لئے ان کی آخری خواہش تھی۔

"میرے جسد خاکی کے ساتھ کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے۔ بلکہ اس کی راکھ کو آسمان کی بلندی پر لے جا کر ہوائی جہاز کے ذریعہ ہندوستان کی سرزمین پر بکھیر دی جائے تاکہ وہ راکھ ہندوستان کی مٹی میں مل جائے اور ہندوستان کا جدا نہ ہونے والا ایک حصہ بن جائے"۔

دنیا ان کو اس لئے عظیم اسٹیٹسمین تسلیم کرتی ہے کیونکہ انہوں نے عالمی امن کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے ہولناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ صرف تباہی و بربادی لاتی ہے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور علحدگی پسندی کو نہ روکا گیا تو ہندوستان برباد ہو جائے گا اور اسکی تہذیبی شناخت مٹ جائے گی۔ دیگر تمام ترقی کے راستے نہ صرف محدود ہو جائیں گے بلکہ مسدود ہو جائیں گے۔ انہوں نے ملک کی سالمیت اور فلاح امن و اتحاد میں دیکھی اور قومی یکجہتی کو ہندوستان کی دیگر چیزوں کے مقابلے میں اولیت دی۔ ان کا خیال تھا "ہر ترقی کی تجاویز سے پہلے ہندوستان کا اتحاد لازمی ہے۔ باقی سب دوم ہیں۔

ان خصوصیات کی وجہ سے گاندھی جی نے ان کو اپنا قانونی وارث ([illegible]) کیا تھا.
نہرو جی ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو سماج میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، جہاں دولت و زندگی فراوانی تھی جہاں علم و عقل کی دولت تھی

نہرو جی کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی لیکن ایک معمولی قد و قامت اور لباس کے اعتبار سے ایک "گجراتی بنیا" سے وہ قطعی متاثر نہ ہوئے۔

یہ ایک قدرتی امر تھا کہ دونوں کی مختلف انداز کی زندگی تھی۔ گھریلو ماحول، تعلیم، تجربات اور زندگی کو برتنے کے رویے بھی مختلف تھے۔ گاندھی جی کا بچپن گھر کے سخت مذہبی ماحول میں گزرا۔ نہرو جی نے ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں عام طور سے مذہب کے بے توجہی برتی جاتی تھی۔ حالانکہ ان کی والدہ ایک مذہبی ہندو عورت تھیں۔ نہرو جی نے اپنا پہلا سبق ایک انگریز گورنس سے لیا۔ گاندھی جی نے پہلا حرف پوربندر کے ایک پرائمری اسکول کی مٹی پر اپنی انگلی سے لکھا۔ اس کے بعد بھاؤنگر کے کالج میں ان کو انگریزی لکچرس سے واسطہ پڑا۔ نہرو جی ۱۹۰۵ء میں بنیادی تعلیم کے لئے Harrow بھیج دیئے گئے۔ سات سال انگلینڈ میں رہے۔ کیمبرج سے سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ لندن میں بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ گاندھی جی نے بھی قانون کی تعلیم لندن میں حاصل کی۔ انگلینڈ میں ان کو ایسے ذہین انسانوں کی صحبت ملی جنہوں نے دنیا کے مذاہب کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں مدد کی۔ نہرو جی زندگی کے شوخ مقاصد جاننے میں فخر محسوس کر رہے تھے اور آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے زیر اثر زندگی کی خوبصورتی اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاندھی جی لندن میں شراب عورت اور گوشت سے پرہیز کر رہے تھے۔ نہرو جی کے پاس ایسی کوئی قید نہ تھی۔ وہ زندہ دل، فیشن پرست، جدید طرز زندگی کے دلدادہ، خوش پوش اور قریب قریب مغرب زدہ تھے۔ ان کی دلچسپیاں موسیقی، گالف، کوئین کلب میں ٹینس کرکٹ میں تھی۔

۱۹۱۲ء میں جب وہ انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کی عمر ۲۳ سال تھی اور الٰہ آباد ہائیکورٹ میں اپنے والد موتی لال نہرو کے جونیر کی حیثیت سے وکالت کے پیشے میں دلچسپی لینے لگے تب ہی تلک اور اینی بیسنٹ کے انتہا پسند خیالات کی ہوم رول لیگ میں شامل ہوئے لیکن پھر بھی انھیں زندگی کا مقصد

مقصد نہیں ملا۔

بہرحال گاندھی جی کا چمپارن اور کھیرا (KHERA) کا آندولن اور (ROWLETT ACT) کے مخالف تحریک شروع ہو گئی تھی، جب کانگریس کا سالانہ اجلاس ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں ہوا تو جلیانوالہ باغ کا حادثہ رونما ہوا جو انگریزوں کے ظلم و ستم، قتل عام اور مارشل لا کے پاگل پن کا ثبوت تھا۔ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی لیکن اس تحریک کی تاریخی اہمیت اس لئے ہے کہ گاندھی جی اور نہرو جی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اس اجلاس کی حیثیت اس لئے بھی بلند ہے کہ گاندھی جی کو "مہاتما" کی شکل میں دیکھنے کے لئے عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُمنڈ آیا جو اس بات کی دلیل تھا کہ آزادی کی قدر و قیمت اور سیاسی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ دوسرے یہ کہ گاندھی جی کے سیاسی نظریات کے سلسلے میں نہرو جی کو مکمل یقین ہو گیا تھا اور بعد میں وہ ان کے کام کرنے کے ڈھنگ سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰-۲۲ء میں عدم تعاون تحریک نے ان کو کشش دیا اور ان کے خیالات میں عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی۔ ان کی زندگی میں سادگی آئی، سبزی خوری کی طرف مائل ہوئے اور مستقل انہوں نے گیتا پڑھنی شروع کی۔ اسی دوران ان کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں یونائیٹڈ پروونس (اتر پردیش) کے مقام چوری چورا میں تشدد ہو جانے کی وجہ سے جب اس عدم تعاون کی تحریک کو واپس لے لیا گیا تو نہرو جی کو اعتراض ہوا اور انہوں نے گاندھی جی کے خیالات اور سیاسی حرکات و سکنات کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

آزادی کے پچیس سال کی صعوبت بھری طویل جد و جہد میں ان دونوں کے درمیان مستقل اختلافات بڑھے مگر بھارت کی جنگ آزادی کی تحریک میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ مستقل گفت و شنید کے ذریعے مختلف عوامی مسائل کے سیلاب کے سلسلے میں معلومات کے دروازے کھلے جس سے لوگوں کی عملی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا۔ دونوں کے درمیان تعلقات میں بھی فرق آیا۔ کیونکہ دونوں حضرات ملک کے حالات اور مسائل کا اپنے اپنے ڈھنگ، اپنے تجربات، اور اپنی اپنی ذہنی سطح کی روشنی میں جائزہ لے رہے تھے۔ گو کہ نظریاتی اختلافات مزید پیدا ہوئے مگر مقصد کی یکسانیت نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب رکھا۔

۱۹۲۷ء میں یورپ سے واپسی کے بعد نہرو جی جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے۔ اور "مکمل آزادی" کے حامی تھے۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان کلکتہ کے اجلاس میں گرما گرم بحث و مباحثہ

ہوا اور تب ہی اتفاق رائے ہوا جب کانگریس نے مکمل آزادی کے اعلان کا فیصلہ کیا۔

گاندھی جی حقیقت میں نہرو جی کے اصل نظریات کے خلاف نہ تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ حالات کے تقاضے کے تحت صحیح اور مناسب طاقت کا استعمال کیا جائے۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے نمک ستیہ گرہ نے بھی نہرو جی کے دماغ میں شکوک پیدا کر دیئے تھے چونکہ ان کا خیال تھا کہ آزادی کی جد و جہد کے سلسلے میں اس طرح کا آندولن بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس تحریک کا جوش اور ولولہ پورے ملک میں دیکھ کر نہرو جی کو بہت تعجب ہوا اور وہ اس "معمولی جماعت" کے انسان کی طاقت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اسی طرح نہرو جی ارون پیکٹ سے بھی ناخوش تھے جو سیول نافرمانی تحریک کو ختم کرنے کیلئے کیا گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ سے متعلق عدم تشدد کے سوال پر اختلاف نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی لیکن یہ تمام اختلافات اس وقت صلح میں تبدیل ہو گئے جبکہ گاندھی جی نے اپنے خیالات کو کانگریس کی رہنمائی کے سلسلے میں نہ تھوپنے کا سوچ لیا۔

گاندھی جی نہرو جی سے اس لئے متاثر تھے کہ ان کی بین الاقوامی معاملات پر گہری نگاہ تھی اس لئے باوجود اختلاف رائے کے وہ ان کی سوچ اور ذہانت سے متاثر تھے۔ تقسیم ملک کے مسئلے پر نہرو جی اور گاندھی جی کے اختلافات کافی بڑھ گئے تھے۔ اس سے گاندھی جی دل برداشتہ اور غمزدہ ہو گئے تھے دراصل گاندھی جی تقسیم ملک کے خلاف تھے اور جب وہ اپنی حمایت سے محروم ہو گئے تھے انہوں نے فوج کے تبادلے کے مسئلے پر مباحثے سے اپنے آپ کو دور رکھا اور پٹیل اور نہرو جی کو کھلے میدان میں آزاد چھوڑ دیا۔

جس طرح سیاسی مسائل اور معاملات میں ان کے خیالات مختلف تھے، ساتھ ہی ہندوستان کی تعمیر نو اور نئے سماج کی تشکیل میں بھی ان کے نظریات میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن دونوں نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں ملک کے نئے نئے مسائل کا سدباب کیا اور مل کر کام کیا۔ باوجود یہ کہ ان کے افکار میں اختلاف تھا۔

یہ ایک عام خیال تھا کہ گاندھی جی ایک مذہبی انسان تھے اور نہرو جی کا نظریہ مذہب کے مقابل

اعتقاد تھا۔ ان کی نظر میں مذہب ایک رسمی تقلید پسندی تھی اور روایتی مذہبیت ایک بیکار کی چیز۔ ان کا نظریہ تھا کہ جب مذہب کے بے بنیاد اعتقادات کا استعمال کیا جاتا ہے تو "فراریت" اس کا ماحصل ہوتا ہے لیکن گاندھی جی کی صحبت میں وہ مذہب کے پس پشت بہنے والی روحانی قوت سے آشنا ہوئے۔ تب انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مذہب نے انسان کو بہترین اقدار دی ہیں اور مذہب انسان کے اطمینان قلب کا ذریعہ ہی نہیں ایک اہم ضرورت بھی ہے۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پورے طور سے مادیت پسند نہ تھے۔ گاندھی جی کی نظر میں مذہب صرف ایک رواج کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس روئے زمین پر انسان کا بنیادی مقصد نجات (MOKSH) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان دنیا سے بیزار ہو جائے۔ بلکہ انسان کو مکمل نجات تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ خدمت خلق کا قائل ہو اور جب گاندھی جی "خدا سچ ہے" "سچ خدا ہے" کے نظریے تک پہنچے ہیں۔ یعنی "سچ" خود اپنی عظیم اخلاقی اور روحانی قدر رکھتا ہے۔ اس طرح مذہب اخلاق سے جڑ جاتا ہے۔ اس طرح نہرو جی بھی سیاست کی روحانی طاقت کے قائل ہو گئے تھے ایک موقع پر نہرو جی نے کہا کہ "وطن کی خدمت ایک مذہب ہے اور جو یہ کرتا ہے وہ مذہبی انسان ہے" تو گاندھی جی نے اس امر پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ دونوں عدم تشدد کی پالیسی پر بھی اختلاف لئے رکھتے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ نظریۂ عدم تشدد ہی سماج کے اختلاف کو ختم کرنے اور سچائی کو پھیلانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ نہرو جی عدم تشدد کی پالیسی کو ہر وقت اور ہر حالت میں تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ صرف ایک پالیسی تھی جو کہ صرف برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی میں استعمال ہو سکتی تھی لیکن بیرونی حملے کے خلاف بطور ہتھیار استعمال نہیں ہو سکتی۔ اس لئے دوسری جنگ عظیم کے دوران جبکہ جاپان نے حملہ کرنے کی دھمکی دی تو دونوں کے درمیان اختلاف کھڑا ہو گیا۔ لیکن دھیان رہے گاندھی جی کا نظریہ عدم تشدد حملہ آور کے خلاف مقابلہ کرنے کے سلسلے میں بزدلانہ رویے کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک تشدد بری چیز ہے لیکن بزدلی اور غلامی اس سے زیادہ بری ہے۔ وہ کبھی نہیں سمجھتے تھے نہ حملہ آور کے مقابلہ میں عدم تشدد کا طریقہ بطور ہتھیار استعمال ہو سکتا ہے۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دونوں ملکوں کی معاشی ترقی کے سلسلے میں الگ الگ نظریات

رکھتے تھے۔ نہرو جی گاندھی جی کے TRUSTEE SHIP کے اصول پر یقین نہیں رکھتے تھے ایک سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے نہرو جی نے سرمایہ داری اور زمینداری کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی طاقت استعمال کرنے میں کسی قسم کا کوئی ذہنی کرب محسوس نہیں کیا، چونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ سب ہی زمیندار اور سرمایہ دار اپنی دولت کی ٹرسٹی شپ کو پسند کریں گے۔

نہرو جی کے نزدیک ملک میں امیری اور غریبی کے درمیان کی خلیج اسی وقت دور ہو سکتی ہے جبکہ صنعتوں کو قومیالیا جائے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ ملک سے غریبی زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت سے دور ہو سکتی ہے۔ لیکن نہرو جی ملک کی ترقی میں "صنعت" پر یقین رکھتے تھے۔ مگر دونوں کا مقصد ملک کی غریبی کو دور کرنا تھا۔

آزاد ہندوستان کا وزیر اعظم بننے کے بعد ہندوستان جیسے عظیم ملک کیلئے زراعت کی ضرورت اور اہمیت کو انہوں نے محسوس کیا اور مختلف موقعوں پر زراعت کی ترقی کیلئے ٹھوس اقدامات کئے اور ساتھ ہی صنعت اور دفاعی طاقت پر بھی پوری پوری توجہ دی۔ اسی طرح بڑے پیمانوں کی صنعت کے ساتھ چھوٹے پیمانے کی صنعت کی ترقی کے لئے بھی زور دیا۔

۱۹۵۵ء میں انہوں نے کہا تھا:

"پنچ سالہ پروگرام میں ہم نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں بڑے پیمانے کی صنعتوں اور دیہاتوں کے درمیان توازن برقرار رکھا ہے۔"

دوسری طرف گاندھی جی نے جدید مشنری کے دور میں بھاری صنعت کی اہمیت کو محسوس کیا لیکن وہ زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت کی جگہ پر اس کو بہتر خیال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے شہروں کے ذریعہ گاؤں کا استحصال شروع ہو جائے گا۔

ایک جگہ موریس زنکن نے اپنی کتاب "ایشیا اور مغرب" میں صحیح اشارہ کیا ہے کہ "ساٹھ سال کی مادی پلاننگ نے جاپان کو جنرل ٹوجو دیا اور ایک صدی کی انگریزی تعلیم نے ہندوستان میں پنڈت نہرو پیدا کیا۔"

ایس۔ سی۔ بھٹ

نہرو — ایک عظیم شخصیت

لینن اور واشنگٹن کی طرح جواہر لعل نہرو کی قسمت میں بھی نہ صرف بھارتی جدوجہد آزادی میں ایک قدآور ممتاز شخصیت (مگر صرف مہاتما گاندھی کے بعد) بننا لکھا تھا بلکہ ایک جدید ملک کا معمار بھی بننا لکھا تھا۔ اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں ہی انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں، جو تحریک آزادی کا ایک اہم آلۂ کار تھی، بلند مقام حاصل کیا۔ اور کانگریس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس وقت صرف ایک ہی سکریٹری ہوا کرتا تھا اور بلا شبہ یہ ان کے لیے باعث امتیاز تھا۔ صرف پانچ سال کے اندر، جبکہ وہ ابھی چالیس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے، نہرو کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں جہاں مکمل آزادی کو جدوجہد کی آخری منزل قرار دے دیا گیا تھا، کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اپنے وقت کے ممتاز وکیلوں میں سے ایک اور کانگریس کے ایک رہنما۔ نیز گوناگوں شخصیت کے مالک موتی لعل نہرو کے اکلوتے بیٹے ہونے کے ناطے جواہر لعل نہرو نے بلاشبہ اپنی زندگی کی ایک روشن شروعات کی۔ موتی لال نے اپنے بیٹے کو انگلینڈ کے بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی لیکن اپنی نسل کے بہت سے بھارتی افراد کے خلاف جواہر لعل نہرو انگلینڈ سے ایک "بھورے صاحب" بن کر نہیں لوٹے۔ اگرچہ نہرو نے برطانوی آزاد خیالی کی روایت سے بہت کچھ حاصل کیا تھا مگر انھوں نے ملک کے لیے کچھ کرنے کے جذبے کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیا تھا اس لیے انھوں نے یورپ کے سیاسی اور بین الاقوامی رجحانات کا مطالعہ کیا جو بعد میں کافی کارآمد ثابت ہوا اور اسی مطالعہ نے انھیں دنیا کا ایک ایسا نظریہ، خیال عطا کیا جس کی تحریک آزادی کے دیگر رہنما حامل نہیں تھے۔

یہ فطری بات تھی کہ جواہر لعل نہرو نے قانونی پیشے میں قدم رکھا کیونکہ وہ اس کی

قوت حاصل کر چکے تھے اور اس پیشے میں ان کے والد کی زبردست کامیابی اور شہرت نے بھی ان کے لیے ایک ساز گار ماحول پیدا کر دیا۔ تاہم، مزاج کے لحاظ سے نوجوان نہرو کو اس پیشے سے کوئی خاص رغبت نہ تھی اور اس وقت سیاسی افق پر حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ انہیں بے دھڑک اس میدان میں کود پڑنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس عدالتوں میں جانے کے لئے شاید ہی وقت ملتا ہو۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں بھارتی نسل کے لوگوں کی عزت و وقار کے لئے جدوجہد کی نمائندگی کر کے کامیابی حاصل کر چکے تھے اور بھارتی سیاست کے منظر عام پر پہنچ چکے تھے۔

نہرو نے اپنی گاڑی کو گاندھیائی سیاست سے ہم آہنگ کیا وہ مہاتما کے براہ راست طریقوں اور برطانوی حکومت سے جنگ کے لیے تیاری کی طرف متوجہ ہوئے یہ طریقہ اب بھی کانگریسیوں کا اہم ہتھیار شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء تک جب گاندھی جی پوری طرح کانگریس پر حاوی ہو گئے تھے تو موتی لعل نہرو بھی، جو کافی خوشحال اور اعلیٰ زندگی گذارتے کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے رفیق بن چکے تھے، اعلیٰ فکر کو اپنا لیا۔ لیکن وہ اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو عدالت کے ذریعہ سزا ئے قید ہو گی اور جیل کے قیدیوں کی طرح انہیں بھی سخت زندگی گذارنی پڑے گی۔ موتی لعل نہرو نے، جیسا کہ پنڈت نہرو نے لکھا ہے، الہ آباد میں واقع اپنے محل جیسے مکان کے فرش پر سونے کی مشق کرنے لگے تاکہ انہیں یہ احساس ہو سکے کہ ان کے بیٹے اور خود ان کے لئے جیل کی زندگی کتنی سخت ہو گی۔

جلد ہی باپ اور بیٹا دونوں مہاتما گاندھی کے ساتھ ہو لئے اور اگرچہ موتی لعل نہرو اور گاندھی جی کے درمیان لجسلیچر میں داخل ہونے کے معاملے پر خیالات میں نا اتفاقی تھی، کیونکہ اس وقت لجسلیچر کو بہت کم اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے اور اسی مناسبت سے تبدیلی کے حامیوں اور مخالفوں کے نام نہاد گروپ بھی بن گئے۔ پھر بھی باپ بیٹے اور گاندھی جی کے درمیان ایک زبردست نزدیکی رشتہ قائم ہو گیا۔ مہاتما گاندھی نے نوجوان نہرو میں ایک ایسے رہنما کی جھلک دیکھی جو نوجوانوں کے تخیل پر پورے اترتے تھے، انھوں نے نہرو میں "موہنا سنئے خیالات، بیداری کی ایک دنیا، جو بہت زیادہ عملی تھی، بھی پایا۔ نہرو کو اپنی زندگی کی شروعات میں بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ واحد شخص جو بھارتی عوام میں ایک تحریک پیدا کر سکتا ہے، جو شہروں، قصبوں اور گاؤں میں تحریک چلا سکتا ہے، وہ کوئی اور نہیں بلکہ گاندھی جی ہیں اور اگرچہ کچھ معاملوں پر گاندھی جی سے نا اتفاقی بھی ہوئی اور مہاتما گاندھی کے چند ایک خیالات سے انھیں اختلاف بھی رہا مگر وہ ہمیشہ گاندھی جی کے حامی رہے ہیں۔

گاندھی جی کے نقش قدم پر :-

گاندھی جی اکثر انہیں اپنا سیاسی جانشین کہا کرتے تھے۔ قید و بند کی طویل مدتوں کے باوجود، جس کا فائدہ انھوں نے تصنیف و تالیف کے کام انجام دے کر اٹھایا تھا، نہرو نے حیرت ناک طور پر انگریزوں کی تلخی سے اپنے آپ کو آزاد رکھا۔ انھوں نے زندگی کی اچھی چیزوں کے لیے اپنے مزاج کو اسی مطابق بنا لیا۔ اگرچہ انھوں نے مکمل طور سے سماج کے غریب اور کمزور طبقوں مثلاً لکڑی چننے والے، اور پانی بھرنے والے، جیسے گاندھی جی نے دریدر نارائن کا نام دے دیا تھا، کے ساتھ اپنی پہچان کرائی تھی۔ عام لوگ بھی اپنے آپ کو ان کی طرف ہی کھنچا ہوا پاتے تھے۔ ایک ایسی شخصیت کی طرف جو ان لوگوں کو چاہتا ہو۔ ایک ایسا شخص جس نے لوگوں کی خاطر عیش و عشرت کی زندگی کو قربان کر دیا ہو۔ بھارتی عوام اس شخص کی کافی عزت کرتے ہیں جو کسی کے لیے کچھ قربانی دے۔ اور پھر ایک ایسا شخص جو گاندھی جی کے نہایت قریب ہو۔

جیسے ہی بھارت کو آزادی ملی، نئے آزاد ملک کی سربراہی کے لیے نہرو کا انتخاب بالکل فطری بات تھی۔ سردار پٹیل، جو جدوجہد آزادی کے دوسرے عظیم رہنما تھے، ان کے نائب اور سینیئر رفیق بن گئے اور ان دونوں رہنماؤں نے اسی وقت ایک ساتھ مل کر ایک عظیم ملک کی تقسیم سے جڑے چھوٹے بڑے مسائل کا نپٹارا کیا۔ جب دونوں ملکوں میں تقریباً دو کروڑ افراد کی منتقلی کا مسئلہ سامنے آیا اور جلد ہی دونوں رہنماؤں نے ملک کی تعمیر کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ جب کہ سردار پٹیل نے اپنے آپ کو ملک کے اتحاد کے کام میں مشغول رکھا اور انگریزوں سے وراثت میں ملے بھارت کے مقابلے میں ایک بہت بڑے بھارت کی تعمیر کی جس میں انھوں نے تقریباً 550 شاہی ریاستوں کو آزاد بھارت میں ضم کرایا۔ ادھر نہرو نے ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا۔ حصول آزادی کے چند ماہ کے اندر اندر نہرو نے اڑیسہ میں ہیراکڈ اور دیگر بیراجوں جیسے بڑی صنعتی اسکیموں جیسے ترقیاتی پراجیکٹوں کی بنیاد ڈالی۔ بھاکڑا پراجیکٹ تھا، جس نے پنجاب کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور اسے بھارت کے غلہ خیز خطے میں تبدیل کر دیا، کام جلد ہی شروع کیا گیا اور اس پراجیکٹ کی بنیاد رکھتے ہوئے نہرو نے ترقیاتی پراجیکٹوں کو بھارت کے نئے مندروں کی تشبیہ دی تھی۔ مگر آج ہماری زیادہ تر توانائی یا قوت مندروں اور مسجدوں کے تنازعوں پر برباد ہوتی ہے اور لوگوں میں رہنمائی کی کمی ہے لیکن نہرو نے کہا تھا کہ ہمیں پیچھے کی جانب دیکھنے کی بجائے آگے کی طرف

دیکھنا چاہیئے ۔

تعمیر ملک

آزادی کے ٹھیک تین سالوں کے بعد پہلے وزیر اعظم نہرو نے منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا اور ۱۹۵۱ء میں پہلے پنجسالہ منصوبے کا آغاز ہوا ۔ وہ خود قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے چیرمین رہے تھے جسے ۱۹۳۹ء میں سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے قائم کیا تھا ۔ اب بہ حیثیت وزیر اعظم کے نہرو نے آزاد بھارت کے باضابطہ منصوبہ بندی کمیشن کی چیرمین شپ کا عہدہ سنبھال لیا تھا ۔

منصوبہ بندی کا دور شروع ہو گیا اور جلد ہی اس کے نتائج حاصل ہونے لگے ۔ مگر سبز انقلاب جیسے نتائج تو وفات کے بعد برآمد ہوئے ۔ لیکن انھوں نے ہی اسکا بیج بویا تھا ۔ اور ابتدائی برسوں میں ان پودوں کی پرورش کی تھی ۔ سرکاری دائرہ کار کے ایک بڑے ادارے کی بنیاد رکھی گئی ، لوہا اور فولاد کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا اور ایسے وسیع کیا گیا ، تیل کی تلاش کی گئی ، اور تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی قائم کئے گئے ۔ انہوں نے جو پیشنگوئی کی تھی کہ تیل صاف کرنے کے کارخانوں سے فوائد حاصل ہوں گے تو ، اس کا مطلب یہ تھا کہ ملک میں پیٹروکیمیکل والی اشیاء اور ان کی بنیاد پر دیگر صنعتوں کی مصنوعات تیار کرنے والی صنعتیں قائم ہوں گی ۔ واقعات کی بناء پر ان کا کہا ہوا سچ ثابت ہوا ۔ انہوں نے گاؤں کے لئے کمیونٹی کے ترقیاتی پروگرام بھی شروع کئے اور بعد میں پنچایتی راج کی بنیاد رکھی ۔

آزادی کے پہلے سال کے اندر اندر انہوں عظیم نیوکلیائی سائنسداں [illegible] کی قیادت میں ایک ایٹمی توانائی کمیشن قائم کیا اور ان کی مسلسل سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی خدمات کے اعتراف کا ہی نتیجہ تھا کہ بعد کے سالوں میں اچھے نتائج برآمد ہوئے اور اس طرح بھارت خاص نیوکلیائی کلب کا ممبر بن کر ابھرا ۔ نہرو نے بارہا سائنسی مزاج پیدا کرنے پر زور دیا اور اس بات کا یقین دہانی کرائی کہ سیکولر بھارت میں تمام مذاہب کو مساوی درجہ حاصل ہے ۔ بھارتی روایات کے تئیں ان کے دل میں بہت زیادہ عزت تھی اور ان کی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد ان کی خاک کو ہمالیہ کی چوٹیوں پر بکھیرا جائے اور گنگا ندی میں بہایا جائے کیونکہ گنگا سے انھیں بڑی عقیدت تھی ۔

عالمی برادری :-

نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے والے ایشیا افریقہ کے پہلے

ملک کے رہنما ہونے کے ناطے نہرو کا یہ یقین تھا کہ دیگر ملکوں کو آزادی دلانے اور اسے محفوظ رکھنے میں بھارت کو ایک اہم کردار ادا کرنا چاہیئے ۔ جب ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا مشکل حالات کا سامنا کر رہا تھا اور ڈاکٹر سکارنو " اور ان کے رفقائے کار جو جیلوں میں قید تھے ' اقتدار دینے سے انکار کر رہے تھے ، نہرو نے دلّی میں ۱۹ ملکوں کی ایک کانفرنس جس کے دباؤ کے نتیجے میں ڈچ کو انڈونیشیا چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ اسی طرح جب ناصر کے دور میں ۱۹۵۶ء میں انگریز اور فرانسیسی فوج نے اسرائیلیوں کے اشتراک سے مصر پر حملہ کیا تھا تو نہرو اس کے خلاف عالمی رائے عامہ بیدار کیا ۔ جس کے نتیجے میں حملہ آوروں کو اپنے قدم واپس لینے پڑے ۔

نہرو نے ناوابستہ تحریک کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو نہیں چاہتے تھے کہ بھارت طاقتور بلاکوں کی سرد جنگ میں کسی کی حمایت کرے اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسری طاقت بھارت کی قسمت کا فیصلہ کرے ۔ انہوں نے پہلے کہا تھا کہ بھارت ایک خارجہ پالیسی اختیار کرے گا ۔ ایک ایسی خارجہ پالیسی جو تمام ملکوں کے درمیان امن اور دوستی کی ہو لیکن بھارت کی شان میں کوئی کمی نہ آنی چاہیئے اور بھارت کو یہ آزادی حاصل ہو کہ کسی معاملے میں اس کی حقیقت حال کو دیکھ کر ہی فیصلہ کرے چاہے اس سے کسی بلاک کو خوشی ہو یا ناراضگی ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بھارت ان ملکوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرے گا جو اب بھی اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ بھارت جنوبی افریقہ کے افراد سے اپنے کو وابستہ کرے گا ، جو نسلی امتیاز کے خلاف اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ اس وقت اندرونی اور خارجہ دونوں پالیسیوں میں مشکلات رونما تھیں اور اس کے کچھ خطرناک نتائج بھی برآمد ہوئے مثلاً 1962 میں چین کے ساتھ جنگ ۔ مگر نہرو نے بھارت کی عزت و شان اور مفادات کو قربان کئے بغیر ملک کے اندر ترقی کی راہ پر چلتے ہوئے عالمی سطح پر امن کا راستہ اختیار کیا ۔

گونجتی ہوئی کیفیت

انہوں نے بھارت کو ایک عظیم آئین کے تحفے سے بھی نوازا جسے عظیم

ذہنوں اور دانشمندوں نے تیار کیا تھا، جس کے وہ خود رہنما تھے۔ وہ نہ صرف بھارت کے سیکولر اور جمہوری آئین کے اہم معماروں میں سے ایک تھے، جب کہ آس پاس کے تمام ممالک بنیاد پرست اور آمرانہ نظام اختیار کر رہے تھے بلکہ اس وقت انہوں نے اپنے جمہوری عزم کی ایک انوکھی مثال پیش کی۔ وہ ایک عظیم پارلیمنٹیرین تھے اور کٹر حزب مخالف کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ بحث و مباحثے میں شرکت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور ہندو اصلاحی قانون پیش کرنے کے پس پشت ان کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ اسی قانون نے قانونی طور سے بھارتی خواتین کو آزاد ہونے کی بنیاد عطا کی۔ بھارتی خواتین زنجیروں کے توڑنے کا کام مکمل ہوا جس کی شروعات گاندھی جی نے کی تھی۔

نہرو نہ صرف کثیر کتابوں کے مشہور و معروف مصنف تھے بلکہ انہوں نے بھارت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنے سترہ سالوں میں دستاویزات کا ایک مجموعہ بھی لکھا۔ ان کی میز پر کچھ بھی پڑا نہیں رہتا تھا اور دن میں موصول ہونے والے خطوط کا اسی رات جواب لکھ دیا جاتا تھا اور دوسرے روز اسے روانہ کر دیا جاتا تھا۔ وہ بڑے خوش طبع انسان بھی تھے۔ جب لاسہ میں قائم مقام بھارتی پولیٹیکل آفیسر نے، جو بعد میں ایک سینئر سفیر بھی تھے، ایک طویل رپورٹ بھیجی تو نہرو نے اسے پڑھ کر ایک نوٹ ریکارڈ کیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس رپورٹ میں جو چیز میرے لئے دلچسپی کا باعث ہوئی وہ افسر کے دستخط تھے۔ ان کے داماد فیروز گاندھی جب پارلیمنٹ میں تجارت کے کسی معاملے پر بحث کر رہے تھے وزیر خزانہ چنتامن دیش مکھ سے پوچھا کہ ڈالمیا کے ساتھ کسی خاص صنعت کار کا کیا رشتہ ہے تو دیش مکھ نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ صرف داماد کا رشتہ ہے۔ اس جواب پر نہرو پہلے شخص تھے جو خوب زور سے ہنسے اور پھر پورا ایوان ہنس پڑا۔

اگر وہ اس ہنگامہ خیز عہد میں پیدا نہ ہوتے تو نہرو شاید ایک استاد ہوتے یا پھر تاریخ کے مصنف ہوتے۔ مگر ایک اچھے استاد کی طرح انہوں نے پوری زندگی اچھی چیزیں سیکھیں اور پھر بعد میں بھارت نیز دنیا کے لوگوں کو نصیحتیں دیتے رہے۔ ان کی نصیحتوں کا موضوع یہ ہوتا تھا کہ کیسے لوگ اپنے آپ کو جدید بنائیں، دقیانوسی ترک کریں، سائنسی طریقہ اختیار کریں اور خود کفیل بنیں، پُرامن اور متحمل بنیں۔ اسلحے اور میزائلوں کی بجائے دلیلوں اور گفتگو پر یقین رکھیں۔ آخر کار انہوں نے تاریخ میں امر مقام حاصل کر لیا۔

فریدہ زین

پنڈت جواہر لال نہرو۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں بعض شخصیتیں ایسی پیدا ہوئی ہیں
ن پر زمانہ ناز کر سکتا ہے۔ شخصیت اگر عظیم ہو تو اخلاقی قدروں کی حامل رہتی ہے۔ شخصیت کی
ا محض علم و فضل، دولت و ثروت کی بنا پر تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ شخصیت وہ ہوتی ہے جو کسی ایک
وبہ، ملک یا براعظم کی شہرت سے گذر کر عالمی شہرت حاصل کر لیتی ہے۔ ایسی ہی وضعدار شخصیت
ت جواہر لال نہرو کی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ

"ہندوستان میں دو شخص پیدا ہوئے ایک مرد خدا (گاندھی جی) اور دوسرا مرد آدمی (نہرو جی)"

پنڈت جی کی ہمہ گیر شخصیت میں دھنک کے کئی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بیک وقت قائد
، نقیب تھے، نقاد تھے مفکر تھے مقرر تھے رہنما تھے، ریفارمر تھے فنکار تھے، معمار تھے،
برداشت تھے، پرستار وطن تھے، مسیحا تھے، چارہ گر تھے یوں سمجھئے بقول مجنوں گورکھپوری

وہ ہندوستان کے جسم کی صحت، اس کے دل و دماغ کی روز افزوں قوت اس کے نفس کی
رافت یعنی بہ حیثیت کل ہندوستان کی مائل بہ ارتقاء سالمیت کی ضمانت تھے۔

گاندھی جی کی طرح جواہر لال نہرو کا مقصد بھی نظری نہیں عملی ہے۔ جواہر لال کا سیاسی
ب پارلیمانی طرز کی نمائندہ حکومت ہے۔

ان کے نزدیک سیاسی جمہوریت وہ تھی جس میں فرد کی بنیادی جمہوریت اور اس کے معاشی
حق کے تحفظ کو پیش نظر رکھا جائے۔ وہ ایک تخلیقی ذہن کے حامل تھے۔ اس لئے ہر میدان میں
ہوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ ان کی نگاہ وسیع اور مطالعہ ٹھوس تھا شاید اس لئے وہ فلسفہ
ت کے پل صراط سے وہ بڑی آسانی سے گذر گئے۔

پنڈت جی کی زندگی پھولوں کی سیج سے شروع ہو کر کانٹوں کی وادی میں کھو گئی انہوں نے
ان بوجھ کر اپنا سب کچھ لٹایا۔ شاید وہ پہلے مسافر تھے جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی سب سے

امیر کہلائے۔ اپنی کتاب "تلاش ہند" میں لینن کے اس قول کو نقل کر کے وہ مکمل اس کی تصویر بن گئے:

"انسان کی سب سے عزیز متاع زندگی ہے اور چونکہ اس کے مقدر میں ایک ہی دفعہ جینا ہے اس لئے اسے اس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے میری ساری زندگی اور ساری قوت دنیا کے سب سے بڑے مقصد کے لئے موقوف تھی...."

یہی وجہ ہے کہ شعور کے بیدار ہوتے ہی بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے بیڑا اٹھائے، مصیبتوں کی پالکی کاندھے پر لادے، بحر و صحرا کی پرواہ کئے بغیر کل کے ہندوستان کے لئے بیج بونا شروع کیا۔ انہوں نے خواب دیکھے، خواب سجائے اور خواب بیچے۔ تاریکی میں شمع جلائی، فولاد کو موم کیا، پتھر سے شیشے کو کاٹا، صحرا کو باغ و بہار کیا اور ہند کو گلزار بنایا۔

دان کے ذہنی ارتقاء کا سفر اس وقت شروع ہوا جب وہ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے۔ ویسے امارت نے ان کو کبھی غربت یا افلاس کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن ہندوستانی عوام کی مظلومی اور مایوسی کو انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ انگریزوں کی حاکمانہ ذہنیت کا اندازہ انہیں ہونے لگا تھا بلندی اور پستی کے کھیل کا وہ بغور مطالعہ کرنے لگے تھے۔ انہوں نے مغرب سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حاکم اور محکوم کے رشتے کو بھی اچھی طرح جان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریکٹس میں دل نہ لگا اور سیاسی میدان کی آبیاری کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

مذہب کی چنگاری ان کے دل میں آئرش اتالیق بروکس کے سبب سے سلگ اٹھی اور وہ تھیو سوفی کے نئے مذہب کے معتقد تھے۔ گھر میں اکثر محفلیں ہوتیں اور ان صحبتوں سے وہ متاثر ہوتے گئے۔ انگریزی ادب کے مطالعے کا چسکہ بھی بروکس نے لگایا اور سائنس سے ان کی دلچسپی کا سبب بھی بروکس ہی ہے۔ پنڈت جی کے نزدیک مذہب کا ایک صحت مندانہ رجحان تھا۔ وہ مذہب کو خدا اور انسان کے درمیان کی ایک انفرادی چیز خیال کرتے تھے۔ وہ اگرچہ ماورائی طاقت کے قائل تھے مگر بیرونی اور خارجی معاملات میں اس کا دخل غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لئے مہاتما گاندھی کی طرح مرن برت کے طریقہ کار کی تقلید نہ کر سکے۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کے وہ قائل نہیں تھے بلکہ انسانیت کے پیرو تھے انسانیت نواز تھے۔ انہوں نے اپنی نظر کو تنگ اور دل کو کبھی محدود نہ ہونے دیا وہ عظیم ہندوستان کا عظیم شخصیت تھے۔ انسانوں کی تقسیم ان کے نزدیک انسانیت پر داغ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے برہمن ہو کر

بھی برتری کا یہ مقام دلایا۔ چھوت چھات کے خلاف نعرے لگائے، بھائی چارگی، سیکولرزم کا اور گودے کے فرق کو مٹایا۔ بین الاقوامی ربط پیدا کیا۔ وہ مارکسٹ یا کمیونسٹ نہیں ہوتے بلکہ مارکس کی تھیوری سے متاثر ہو کر سیاست اور معیشت کا ایک معتدل اشتراکی تصور اپنایا۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک ان کی توجہ صرف اپنے ہی صوبے تک محدود رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان ان کا زیادہ تر وقت جیل میں گذرا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انتخابی مہم کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا بلکہ یوں کہیے کہ سیاحی کی اس کا خلل خواہ اثر ان کے دماغ نے قبول کیا شائد اس لئے انہوں نے ایک جگہ لکھا۔

" جو چیز مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی وہ ہندوستان کی وسعت اور اس کی رنگا رنگی نہ تھی بلکہ اس کی روح کی گہرائی جس کی تہہ تک میں نہیں پہونچ سکا۔"

پنڈت جی آزادئ ہند کی تحریک کے ساتھ عوامی زندگی سے وابستہ ہوئے اور عوام کے اتنے قریب آ گئے کہ ہندوستان کا ہر شہری انہیں اپنا مسیحا چارہ گر سمجھنے لگا۔ بقول آل احمد سرور

" وہ ہندوستانی تھا، وہ مشرقی تھا، وہ مغربی تھا وہ عالمی ذہن رکھتا تھا۔۔۔۔ وہ ہندوستان کی ننگی بھوکی جنتا کے دل کی ہر دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا۔ عوام ہی سے اسے طاقت اور گرمی ملتی تھی وہ ان کا عاشق تھا اور عوام اس کے عاشق تھے۔"

" پنڈت جی کا غم، غم جاناں نہ رہا غم عالم بن گیا۔ ان کی کسک اور تڑپ ہمالیہ کے دامن سے کنیا کماری تک پھیل گئی۔

کسی بھی قوم کا سرمایہ اس کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ مگر میراث میں ملی ہوئی توانائی کے بل پر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ قوم، صحیح معنوں میں اس وقت خود کو کامیابی کے زینے طے کروا سکتی ہے جبکہ وہ اپنی ذاتی اپج، صلاحیت اور فکر و عمل سے نئے راستے تلاش کرے۔

ذہن بیدار ہو، دل روشن ہو اور عمل کا جذبہ صادق ہو تو نہ صرف انفرادی الجھنیں مٹ سکتی ہیں بلکہ عالمی پیچیدگیوں کے مسائل بھی حل ہونے لگتے ہیں پنڈت جی کا دل گداز، ذہن باشعور اور عمل پیہم رہا۔ اس لئے انہوں نے نہ صرف قوم کو تسخیر کیا بلکہ دلوں میں بھی جگہ بنالی۔

پنڈت نہرو ایک جمہوری دیش کے وزیر اعظم تھے۔ جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت

ہے جمہوریت میں اکثریت کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ فرض بھی ہوتا ہے کہ وہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اشتراکی جمہوریت کے نقیب تھے۔ اور بہ حیثیت وزیر اعظم انھوں نے علوم و فنون کے دائرے کو وسیع کیا۔ صنعت و تجارت کو قومیایا، زمینداری کی ناانصافیوں کو دور کیا۔ غیر جانبدارانہ پالیسی کو اپنایا۔ کسانوں کو بھارت کا رکھوالا بنایا۔ مزدوروں کے لئے راہیں ہموار کیں۔

فرد جمہوریت کا سنگ بنیاد ہے۔ جمہوریت کا بنیادی اصول مہاتما گاندھی نے بتایا کہ کمزور ترین فرد کو انتہائی شہ زور کے برابر مواقع حاصل ہو۔ اسی بنیادی حقوق اور فرائض سے متعلق پنڈت نہرو کے کراچی ریزولیوشن میں نہ صرف مذہبی آزادی بلکہ اقلیتوں کے کلچر، ان کی زبان ان کے رسم الخط کے تحفظ کا بھی ذکر ہے۔

۱۹۳۷ء میں پنڈت نہرو نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا بائیکاٹ کر کے صوبائی وزارت تشکیل دینے سے انکار کیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کا کانگریس سے الحاق کیا۔ کانگریس سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے درمیان باہمی تعاون پیدا کیا اور مسلم عوام [illegible] میں تھیں۔ انھوں نے قیشنل پلاننگ کمیٹی کا نگریس ۱۹۳۸ء کے قیام پر کہا تھا، گو ہم نے اپنے کام کی ابتدا کسی واضح اجتماعی نظریے کے ماتحت نہیں کی تھی لیکن ہمارے اجتماعی مقاصد بالکل صاف اور واضح تھے اور ہمارے منصوبوں کے لئے مشترک بنیاد بن سکتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو گاندھی جی نے کہا۔

"جواہر لال ایک جواہر ہے جس کی روشنی بھارت کے پست طبقے کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام پسماندہ انسانوں کے لئے بھی ہے"

اور سچ تو یہ ہے کہ جواہر لال نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام اور کام زندہ رہے گا وہ اپنے دل کی گہرائی میں توازن اور ہم آہنگی تلاش کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد تباہ حال پنجاب کی آبادکاری کے مسئلے کو پنڈت جی نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ آج بھاکڑا ننگل اپنے وجود پر ناز کرتا ہے کیونکہ نہرو نے اسے ایشیا کے سب سے بڑے تیرتھ استھان سے تعبیر کیا تھا اور درحقیقت فیکٹریاں اسکول اور کارخانے نئے دور کے وہ خزانے ہیں جن سے آج کا ہندوستانی اپنے دامن کو مالا مال کر سکتا ہے۔

ایک سائنٹیفک دماغ وہ ہوتا ہے جو زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں صحیح راستہ دکھاتا ہے اور جس میں تعصب اور توہم پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ پنڈت جی ایسا ہی دماغ لیکر آئے تھے۔ اور ایسے ہی دماغ کی تربیت پر زور دیتے رہے۔ سائینس کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ عوام کے معاشی معیار کو بلند کرتی ہے بلکہ سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط کے اندیشوں سے باہر نکال لاتی ہے۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں اگر پوری نہ ہو پائیں تو تعمیری کاموں میں سدِ راہ بن جاتی ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لئے نہرو جی نے کہا تھا۔

"زندگی روٹی سے عبارت نہیں لیکن روٹی کے بغیر اس کا کام بھی نہیں چلتا" سائینس کی ترقی پر انہوں نے ہمیشہ ہی زور دیا۔ وہ اسی کوشش میں لگے رہے کہ قوت جو سائینس کا عطیہ ہے اور روحانیت جو دل کی دولت ہے۔ ایک دوسرے سے تال میل پیدا کرلے۔ جواہر لال کے نزدیک سائینسی تعلیم کا بنیادی مقصد ہمارے فکر و عمل میں تیز گامی اور تیزی پیدا کرے۔ ہر چیز کے افکار اور قول کا معیار اس کی سچائی ہے اور سچ کا حسین چہرہ روشن اجالوں میں ہی نظر آتا ہے۔

بعض مفکروں کے خیال میں قوت ایک ایسی چیز ہے جو حواس انسانی پر غالب رہتی ہے اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہے۔ پنڈت جی اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے ٹرامبے کے جوہری توانائی کے افتتاح کے وقت کہا تھا۔

"ہندوستان صرف پُر امن اغراض کی تکمیل کے لئے جوہری توانائی سے استفادہ کرے گا۔"

۱۹۵۰ء میں انہوں نے پلاننگ کمیشن قائم کیا جس کے ذریعہ وہ تیز رفتار معاشی ترقی چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ منصوبہ بندی کے سبب ہندوستان کے وفاقی طریقہ کار میں نئے رابطے بن جائیں گے معاشی ترقی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سائینس ایک واحد ذریعہ تھا جس سے وہ اس ملک کی آخری منزل تک پہونچنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دن میں سترہ گھنٹے کام کرتے ہوئے بھی ان کے اُجلے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ ان کے سکریٹری نے ان لفظوں میں اس بات کی وضاحت کی۔ "..... یوں لگتا ہے جیسے روح نے جسم پر انتہائی فتح یابی حاصل کرلی ہو اور خدمت خلق کے جذبے نے انسانی ڈھانچے کے عام میکنزم پر غلبہ پالیا ہو۔"

نہرو کا سماج وار مختلف ادوار سے گزرا انہوں نے بھارتی اور عالمی صورتحال کو پیش نظر

رکھ کر اپنا ایک فلسفہ بنایا تھا۔ وہ بھارتی معیشت کو ایک نئی شکل دینا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کا سہارا لیا۔ ایک موقع پر انہوں نے لیبارٹریوں کو مستقبل کے مندر کہا تھا۔ سنہ ۱۹۶۱ء کو آل انڈیا ریڈیو سے اپنے نشریئے میں اس بات کو کھل کر کہا تھا کہ وہ [redacted] سے کس طرح نپٹنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نسل پرستی اور نو آبادیات کی مخالفت برطانیہ کے ساتھ دیرینہ [redacted] پر رضامندی، مساوات کی بنا پر گروہ بندی کا شکار ہوئے بغیر ریاست ہائے متحدہ امریکہ، سوویت یونین اور چین کے ساتھ تعاون کی بات کی تھی۔

ایشیاء اور افریقہ کے دانشور نہرو جی کی سوانح اور ان کی تصانیف "تاریخ عالم کی جھلکیاں" سے متاثر ہو کر نو آبادیات کے خلاف انقلاب لانا چاہتے تھے سچ تو یہ ہے کہ سامراج واد کے خلاف ہندوستان نے اہم رول انجام دیا تھا۔ انہوں نے فوج اور سیاست کا اشتراک نہ ہونے دیا اور کسی بھی فوجی بلاک کے ساتھ معاہدہ بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ پنڈت جی کسی بھی قیمت پر جمہوریت کا سودا کرنے کے مخالف رہے۔ جمہوریت سے ان کا اٹوٹ رشتہ بندھا تھا کہ وہ اسے کسی بھی طور پر مجروح نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہندوستانی سیاست کو فوجی اثر سے بچائے رکھا۔ آج جب ہم پڑوسی ممالک میں فوج کے عمل و دخل کی وجہ سے جمہوریت کی بنیادوں کو ہلتا دیکھتے ہیں تو ہمیں پنڈت جی کی باریک بینی اور دور رسی کے قائل ہونا پڑتا ہے

امریکہ کے سفر میں کولمبیا یونیورسٹی سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"یہ ضروری نہیں کہ بنی نوع انسان کی قسمت کا فیصلہ جسمانی طاقت ہی سے ہو۔ ہر لڑائی میں یہ چیز بے حد اہمیت رکھتی ہے کہ وہ کس طرح سے لڑی جاتی ہے اور کیونکر ختم ہوتی ہے۔"

پنڈت جی کی امن دوستی ایسی نہ تھی کہ خنجر آستین میں چھپا ہو اور چہرے پر معصومیت کا نقاب ہو انہوں نے اپنے ملکی مسائل میں بھی ہمیشہ پر امن حل کی تلاش کی۔ ایٹمی تجربات کو روکنے ان کی آواز سب سے بلند تھی۔ فوجی طاقت کو بڑھانے پر انہوں نے بہت کم زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ سائنس کی برکت سے دنیا مستفید ہو۔ نہ کہ اسے تخریب کے لئے استعمال کیا جائے۔ حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ چین کے معاملے میں انہوں نے سفارتی رشتے کو منقطع نہیں کیا۔ غیر جانبدار تحریک کا جنم پنڈت جی کے ذہن میں عالمی امن کا [redacted] ہوا۔ اس تحریک کی افادیت کا آج سارا عالم معترف ہے بالخصوص تیسری دنیا کی امیدیں اس تحریک سے

وابستہ ہوگئی ہیں ۔

ہندوستان میں سیکولرزم کا آغاز مہاتما بدھ کی جلائی ہوئی شمع سے شروع ہوا۔ اشوک اعظم نے اس شمع کی لو کو تیز کیا۔ نانک اور کبیر نے اس شمع کی آگ ہندوستانیوں کے سینے میں جلائی جو روح کی گہرائیوں تک پہونچ گئی۔ اکبر اعظم نے اس روشنی کو تیز تر کردیا۔ باپو نے اجالوں کے خواب دیکھے اور جواہر نے یہ اجالے ہند کے چار سو بکھیر دیئے۔

نہرو جی کی شخصیت امن دوست کی حیثیت سے مسلّم ہوکر رہ گئی۔ روئے عالم نے انہیں بے مثال رہنما کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔ فیلڈ مارشل منٹگمری نے کہا "تجربہ اور ذاتی مشاہدے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ روئے عالم پر محض چار ایسی شخصیتیں ہیں جنھیں قومی رہنما کہا جا سکتا ہے وہ ہیں جواہر لال نہرو، جنرل ڈیگال، مارشل ٹیٹو اور ماوزے تنگ۔"

اور شائد اسی لئے نہرو جی کے لڑکپن میں ہی موتی لال نے کہدیا تھا کہ "میرا بیٹا ممکن ہیکہ مشہور بیرسٹر نہ بن سکے لیکن مجھے یقین ہیکہ وہ بڑا آدمی ضرور بنے گا۔

جواہر لال نے سیاست کی سنگلاخ وادی کا سفر کرتے ہوئے کبھی ایسے طریقوں کو نہ اپنایا جو محض پروپگنڈے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے دور ہی رہے۔ اپنی شہرت اور بڑائی کا ان کے دل میں کبھی خیال نہ آیا۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ وہ جلسہ گاہ میں نمایاں جگہ پر بیٹھنے کے قائل نہیں رہتے تھے۔ ان کی اس حرکت پر مولانا محمد علی سخت نالاں رہتے اور کہتے۔ "جواہر لال کو نہ جانے خود کو چھپانے میں کیا ملتا ہے"۔ مگر نہرو جی جانتے تھے کہ نافۂ مشک بند کرکے رکھنے پر بھی اپنی خوشبو فضا میں بکھیر دیتا ہے۔ ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہیکہ انہوں نے قومی زندگی اور سیاست کے میدان میں ذریعہ اور مقصد دونوں کی پاکیزگی کا اصول جو اہل اخلاق اور فلسفہ میں زیر بحث رہا استعمال کیا۔ انہوں نے ماضی اور مستقبل کے صحیح راستے کو سمجھا اور سمجھایا اگرچہ ان کا رخ مستقبل کی طرف ہے مگر وہ ماضی کی اعلیٰ قدروں اور کارناموں کو دیکھتے ہوئے اس طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ پنڈت جی کے پیش کردہ زرین اصول پنچ شیل کی معنویت اس پر آشوب دور میں جبکہ دنیا تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے ایک سہارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پُرامن بقائے باہمی کا حل ان ہی اصولوں میں مضمر ہے۔

تہذیب ایک ایسے درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں اسکی سرزمین میں پیوست ہونی چاہیئے

تاکہ اس میں قوت پیدا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں چاروں طرف سے دھوپ بھی ملے تاکہ اس میں شگفتگی آئے اور نئے پھول اور پتے نکلتے رہیں۔

پنڈت جی بھارتی انقلاب کے قائد، گاندھی جی کے دست راست، سامراج دشمن بھارتی عوام کے محبوب تھے۔ بچوں سے ان کا پیار ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ بچوں کا عشق اس بنا پر بھی تھا کہ وہ مستقبل کے معمار ہیں آنے والے کل کے ہندوستان کے ر
وہ بچوں کے بارے میں ہمیشہ یہی خیال رکھتے تھے کہ یہ نئی نسل پرانی لعنتوں سے ہوگی۔ ان کے دل و دماغ روشن ہوں گے۔ بچوں کا یہ بھارتی چاچا بالکوں کو اپنے خط میں سبق دیتا ہے "میں حال میں امریکہ، کناڈا اور انگلینڈ گیا وہاں کے بچے مجھے بے حد ا ان سے میری دوستی ہوگئی اور جب کبھی موقع ملا میں ان کے ساتھ کھیلتا رہا ہر جگہ کے بچے ہیں لیکن آپس میں دوری پیدا ہوتی ہے بڑے ہونے کے بعد"

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"میں نے کسی سے نفرت نہیں کی تمہاری طرح کہ تم آپس میں کھیلتے بھی ہو لڑتے ہو اور مل بھی جاتے ہو۔"

بچوں کی فلم ل کی تحریک کو ارتقائی منزلوں کی طرف لے جانے والے پنڈت جی ہی وہ چاہتے تھے کہ جب فنون لطیفہ اور پرفورمنگ آرٹ کے فن کے تین الگ اکیڈیمیاں قا اس کے ساتھ بچوں کی فلم سوسائٹی ننھے بچوں کی ضروریات کی تکمیل کر سکے - وہ ایک ایسی کی تزئین کرنا چاہتے تھے جو حال اور مستقبل کے درمیان کی کڑی ہو۔ بچوں سے ان کی شد ایک دلچسپ واقعہ یوں ہے کہ ایک پارٹی میں دو بچیاں میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھ پنڈت جی اپنی عادت کے مطابق ان دونوں بچیوں کو اپنے قریب بلا کر بٹھا لیا اور کچھ پیار و شفقت سے بات کرتے رہے ان بچوں کی چھوٹی بہن جو صرف تین سال کی تھی برآ میں بیٹھی اپنی بہنوں کے ساتھ ان کا پیار بھرا برتاؤ دیکھ رہی تھی - جب پنڈت جی واپس لگے تو وہ دوڑ کر ان کے قریب پہونچی اور رک رک کر کہا "جب میری بہنیں بڑی ہو جائیں سب سے کہیں گی پنڈت جی نے ہمیں پیار کیا تھا اور اپنی گود میں بٹھایا تھا - بتائیے میں پنڈت جی اس استفسار پر چونک پڑے - انہوں نے کار سے اتر کر بچی کو گود میں لے لیا

دیر تک اس سے پیار کرتے رہے اور اس کی دلداری کرتے رہے۔

پنڈت جی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے لیے عید کا دن ان کی سالگرہ کا ہوتا ہے۔ وہ سوچا کرتے ان کی یہ سالگرہ روز کیوں نہیں منائی جاتی۔

پنڈت جی نے اپنی بیٹی کو ملکی معاملات سے بے خبر نہیں رکھا اور ایسا صحیح جانشین دیا کہ وہ نیا ہندوستان جس کا کونپل ابھی ابھی پھوٹی تھی اسے اندرا جی نے اپنا خون جگر دیکر تناور درخت بنادیا۔ پنڈت جی عورتوں کے حقوق کے حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ڈیموکریٹک ملک میں مرد اور عورت کو مساویانہ حقوق دیئے جائیں۔ ترقی نسواں سے متعلق وہ ہمیشہ ہی پیش پیش رہے (انہی کی کاوشوں سے ہندو سکسیشن ایکٹ سنہ ۱۹۵۵ء اور ہندو میرج ایکٹ سنہ ۱۹۵۶ء کی تدوین عمل میں آئی) ان کا دماغ مذہبی تعصب سے بالکل پاک تھا ان کے قریبی دوستوں میں مولانا محمد علی، مولانا آزاد، چودھری خلیق الزماں، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں جیسے لوگ شامل تھے۔ کئی مسلم نوجوانوں کو انہوں نے اپنے خرچ سے تعلیم دلوائی۔ ملازمتیں دلوائیں سن رسیدہ مسلمانوں کی مالی امداد کی۔ مسلمانوں سے ان کی دوستی وفا کی حد تک تھی۔ وہ انسانیت کا ایسا نمونہ تھے جس میں مدبرانہ اور مفکرانہ عنصر بھی شامل تھا۔ یوں سمجھئے کہ وضعداری ان پر ختم ہوگئی تھی۔ انہیں فرقہ وارانہ ذہنیت سے نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دلی فرقہ واریت کی آگ سے محصور ہوگئی تو جامعہ بھی فسادیوں سے گھر گیا۔ عین ایسے لمحات پر وہ خود وہاں پہونچ گئے اور رات وہیں بسر کی کیونکہ انہیں آنے والے خطرے کا احساس ہو چکا تھا اور اس طرح انہوں نے اپنے فرض کو نبھایا۔

فسادات کے وقت اپنے کمپونڈ میں رفیوجی کیمپ رکھا جس میں سو مسلم خاندان پناہ گزیں تھے اور انہیں راشن بھی سپلائی کیا جاتا تھا۔ فسادات کی وجہ سے دوکانیں بند تھیں۔ صرف سرکاری دوکان سے راشن دیا جاتا تھا۔ ایک بار لوگوں نے دیکھا کہ حکومت کی راشن شاپ میں ایک شخص کیو (لائن) میں سب کے ساتھ کھڑے ہیں۔ شاپ کا آدمی انہیں پہچان گیا تھا وہ تھے ہند کے وزیر اعلیٰ جواہر لال نہرو۔ بھگدڑ مچ گئی۔ سب نے کوشش کی کہ وزیر اعظم کو سب سے پہلے راشن دیدیا جائے لیکن انہوں نے کہا۔ "نہیں۔ اس جگہ میں عام لوگوں کی طرح کھڑا ہوں۔ مجھے کیو سسٹم کے مطابق راشن ملنا چاہیئے۔

غرض پنڈت جی کو کن کن زاویوں سے دیکھا جائے جس رنگ میں بھی انہیں دیکھنے کی کوشش کریں اس میں وہ پورے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔
ایک ادیب کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنا لوہا منوالیا۔ انگریزی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔ وہ فطرتاً ایک انشا پرداز تھے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا انگریزی زبان میں۔ ان کا اپنا ایک منفرد انداز بیان تھا جس میں شگفتگی تھی۔ ان کے بارے میں پرل بک نے کہا تھا۔

"اگر انہوں نے سیاسی زندگی میں اپنی صلاحیتیں اپنے ملک کے لئے وقف نہ کی ہوتیں تو ان کے قلم سے جو کتابیں عالم ظہور میں آتیں آج دنیا ان کتابوں سے محروم ہو گئی"

ان کی قوت تخلیق نہایت ہی تیز اور متحرک تھی۔ ان کی پالیسی محب مند تھی۔ ان کا ضمیر صاف تھا۔ ان کی شخصیت بے داغ تھی ان کا عمل بے لوث تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اشتراکیت اور جمہوریت کے سچے نقیب تھے۔ مہاتما گاندھی نے ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر کہا تھا۔

"جواہر لال کے سوا اس پھولوں کے تاج (صدارت) کو کوئی نہیں پہن سکتا کیونکہ ان پھولوں میں کانٹے بھی ہیں"

یہ کانٹے جواہر لال نے پلکوں سے چن لئے اور بھارتی عوام کے لئے ایسی راہیں ہموار کر دیں جس پر وہ بلا خوف و خطر گھوم پھر سکیں۔ وہ نباض وقت تھے۔ وسیع النظر تھے ہر دل عزیز تھے بلاشبہ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی وطن پرستی کے جذبے کا اس سے زیادہ کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی وصیت میں واضح طور پر سمجھا دیا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی راکھ ہندوستان کے ہر حصہ پر بکھیر دی جائے تاکہ وہ اس مٹی کا ایک جزو بن جائیں شائد ایسی ہی شخصیتوں کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا:-

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سابق سیکرٹری اطلاعات و نشریات
ایس ایم ایچ برنی، صدر مرکزی اقلیتی کمیشن

اقلیتیں، سیکولرزم اور نہرو

غیر مذہبیت انگریزی لفظ "سیکولرزم" کا ترجمہ ہے جو لاطینی لفظ سیکولم سے اخذ کیا گیا ہے اس لفظ کے معنی ہیں "اس عہد کا" یعنی جو دنیاوی معاملات سے متعلق ہو اس کا واسطہ مکمل طور پر دنیاوی زندگی سے وابستہ ہو آخرت سے نہیں۔ یہ سماجی اخلاقیات کا ایک سسٹم ہے جو اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اخلاقی اقدار و معیار اور انسانی برتاؤ کا تعین مذہب کا حوالہ دیئے بغیر صرف موجودہ زندگی اور سماجی بہبود کو مدنظر رکھ کر کیا جائے۔ مغرب میں سیکولرزم کے متعلق عام لوگوں کا یہ غالب رجحان ہے کہ یہ کا ایسا نظم ہے جو تمام طرح کے مذہبی عقائد اور عبادت کو نامنظور کرتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مطابق "اس کا تعلق غیر روحانی معاملات سے ہے" تاہم بھارت میں مختلف مذاہب والے سماج میں ہم اس نظام کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ مرحومہ مسز اندرا گاندھی نے ٹھیک ہی کہا تھا "غیر مذہبیت نہ لا مذہبیت ہے اور نہ ہی مذہب سے روگردانی ہے یہ تو سب مذاہب کے تئیں مساوی عزت کا جذبہ ہے۔ جس کے بغیر ملک کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

بھارت میں کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی مذہبی بن سکتا ہے تاہم اس کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے سب سے زیادہ اہم بات سمجھنے کے لیے یہ ہے کہ بھارت ایک سیکولر ریاست ہونے کے ناطے ہر مذہب کی انفرادی طور اور اجتماعی آزادی کی ضمانت دیتا ہے کسی فرد کو بلا لحاظ مذہب ایک شہری کی شکل میں تسلیم کرتا ہے اور آئینی نقطۂ نظر سے یہ نہ خاص مذہب سے وابستہ ہے اور نہ ہی کسی مذہب کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور نہ ہی مذہب میں دخل اندازی کرتا ہے۔ یہاں سبھی غیر مذہبیت کے حامی ہیں۔

پروفیسر ڈی ڈی جان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ غیر مذہبیت ملک کے کردار سے متعلق دو بنیادی عقائد پر مبنی ہے۔ ان میں سے ایک ہے سرکار کا اجتماعیت کے اصول سے انکار

یعنی انسانی بہبود کی ایسی سرگرمیاں ہیں جن میں حکومت کا کوئی کردار نہیں ہے۔ سیکولر مملکت کا دوسرا بنیادی پہلو یہ ہے کہ یہ ایسا سیاسی ڈھانچہ نہیں ہے جو خیالات سے خوفزدہ ہو کر رہے جیسے کہ دیگر سیاسی ڈھانچوں کے متعلق مانا جاتا ہے۔

بھارت کی تاریخ خیالات و جذبات کی مسلسل تحریک کی تاریخ رہی ہے جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں آئی تبدیلی کے نتیجے میں مختلف [illegible] باہمی اختلاط سے وجود میں ابھری ہے۔ اس باہمی میل جول اور ہم آہنگی نے بھارتی تہذیب کو مخلوط۔ مشترک شکل عطا کی ہے جس میں مختلف اجزاء اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے حصے بنے ہوئے ہیں تاہم مخلوط تہذیب ایک مسلسل عمل ہے جس کا اپنے آپ میں کوئی [illegible] یہ ایک تجربہ ہے [illegible] مسلسل دروں بینی اور [illegible] اس کی خصوصیات ہیں۔ پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ "بھارت کو مضبوط، سیکولر اور متحد ملک بنانے کے لیے اسے ماضی کی بہترین روایات کے عناصر اور سائنس کے موجودہ تحفظوں کا امتزاج بنانا چاہیے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے حیدرآباد کے اجلاس میں انہوں نے کہا تھا کہ بھارت مختلف مذاہب، تہذیبی و ثقافتی روایتوں اور متنوع رہن سہن و عادات کے باوجود ایک ملک ہے جس کی اساس یکجہتی اور ہم آہنگی پر ہے، جیسا کہ اشوک اعظم کا خیال تھا کہ باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے تئیں باہمی عزت و احترام سے ہی ہم پورے بھارت میں مضبوط پائیدار اور باہمی طور پر معاون سماج کی تعمیر کریں گے۔

" نہرو جی نے بھارتی سیکولرزم کی وضاحت یوں پیش کی :"

مذہب پوری طرح آزاد ہے، مگر سرکار مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا احترام کرتی ہے۔ سب کی حفاظت کرتی ہے اور سبھی کو مواقع فراہم کرتی ہے اور اس طرح رواداری و تعاون کا ماحول بناتی ہے۔

مذہبی رواداری کا جذبہ ہمارے سیکولر نظریے کا اہم پہلو رہا ہے پنڈت جواہر لعل نہرو کے خیالات و نظریات ہماری گزشتہ [illegible] ذہنی نقطۂ نگاہ سے وجود میں آئے ہیں۔ نہرو جی نے اپنی سوانح حیات میں تحریر کیا ہے کہ بھارت اور دیگر کسی مقام پر بھی مذہب یا کسی بھی [illegible] منظم مذہب کو [illegible] دیکھ کر میرا دل خوف سے لرز جاتا ہے اور میں نے کئی بار اس کی نکتہ چینی کی ہے اور اسے کلیتاً ختم کرنے کی آرزو کی ہے۔ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ مذہب کے معنی ہیں

اندھا عقیدہ اور ردِعمل۔ دقیانوسی انداز فکر اور کٹرپن۔ استحصال اور نا انصافیوں کی مخالفت اس لیے پنڈت نہرو نے ایسے سیکولر طرزِ حکومت کا تصور کیا کہ جس میں ہر شخص اور ہر فرقے کو مذہبی اور ثقافتی معاملات میں اپنے طرز سے زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہو۔ یہ نہرو جی کی بصیرت تھی کہ ہمارے آئین کو ایسی ہیئت عطا کی گئی جس میں سیکولر طرزِ حکومت کو اختیار کیا جا سکا۔ یہ سچ ہے کہ آئین میں کہیں بھی سیکولرازم کی تعریف نہیں کی گئی حالانکہ اس کی دفعہ (۲) ۲۵ میں سیکولر سرگرمی کے الفاظ کا ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم آئین کی جو روح مضمر ہے وہ سیکولرازم سے ہی حاصل کیا گیا ہے ۴۲ ویں آئینی ترمیم کے ذریعہ آئین کی تمہید میں بھارت کے سیاسی ڈھانچے کی تعریف میں دو لفظ سیکولر اور سماج وادی جوڑے گئے۔ تاہم اس سے پہلے بھی اس بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا کہ آئین نے ہمارے سماج کی گوناگونی کو مدنظر رکھا ہے اور آئین کی دفعہ ۲۵ سے ۳۰ تک میں واضح طور پر کہا گیا کہ شہریوں کو اپنے ضمیر کے اظہار کی آزادی، اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی آزادی اپنے مذہب کی عبادت اور تبلیغ کرنے کی آزادی ہے۔ دفعہ (۲۹) اور (۳۰) میں اقلیتوں کو اپنی زبان، طرز تحریر اور تہذیب کی حفاظت اور اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کی آزادی ہے۔ آئین میں یہ بھی دیا گیا ہے کہ ان اداروں کو امداد دیتے ہوئے حکومت اس بنیاد پر تفریق نہ برتے گی کہ ان کا انتظام لسانی یا مذہبی طور پر اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہی نہیں آئین میں کسی لسانی اقلیت کے گروہ کے بچوں کو ابتدائی درجات میں تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی سہولیات فراہم کرنے کی بھی ضمانت دی گئی ہے ہمارے آئین میں کہیں بھی "اقلیت" کی تعریف یا وضاحت نہیں کی گئی ہے تاہم اس کا لفظ استعمال مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ اور پارسی مذہبی اقلیتوں اور دس لسانی اقلیتوں کے بارے میں استعمال تک ہی محدود ہے سال ۱۹۸۱ء میں ہوئی مردم شماری کے مطابق کل آبادی کا تقریباً ۱۶.۴۶ فی صد حصہ اقلیت ہے ان میں سے ۱۱.۳۵ فی صد مسلمان ہیں۔
اقلیتی فرقے نہ صرف تعداد اور تاریخی پس منظر بلکہ تعلیمی و اقتصادی حیثیت اور صورت حال کے نقطۂ نظر سے بھی کافی مختلف ہیں مسلمان اور نئے بدھ مت اختیار کرنے والے تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں جب کہ بالخصوص پارسی اور بالعموم سکھ اچھی مالی حیثیت کے مالک ہیں عیسائی ترقی کے مختلف مراحل میں ہیں صرف سیکولرزم میں ہی مختلف اقلیتی فرقوں کے افراد کو اپنی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کا اچھا موقع مل سکتا ہے۔

بھارت میں نئے سماج کی تعمیر ہو رہی ہے۔ نیا سماج انصاف اور مساوی برتاؤ پہ ٹکی ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ جو اقلیتیں ابھی پس ماندہ ہیں انہیں غریبی کی سطح سے اوپر لانے کی کوششیں کی جائیں۔ دوسرے الفاظ میں انہیں اقتصادی ترقی کے تمام فوائد حاصل ہونے چاہیئے۔ اقلیتوں میں اب بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ انہیں مناسب سہولیات میسر نہیں کرائی گئی ہیں قومی اتحاد کو مضبوط بنانے اور اس خیال کو دور کرنے کے لیے بامعنی اور ٹھوس اقدامات کئے جانے چاہیئے۔

کیوں کہ سماجی۔ اقتصادی ترقی جمہوری طرز حکومت کے ڈھانچے کے اندر ہی کی جانی ہے لہٰذا اقلیتوں کو اقتدار میں شریک کرنا ضروری ہے۔ یہ مانگ کئی طرح سے ظاہر ہوتی رہتی ہے اقلیتوں کی ایک اہم شکایت یہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں انہیں مناسب نمائندگی نہیں ملتی ہے۔ ملازمتوں میں اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنا تو ممکن نہیں تاہم ان کے لیے انتخاب اور تقرری کے کاموں میں ان طبقات پہ خصوصی توجہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اقلیتی فرقے کے امیدواروں کو ایسی تربیت بھی دینی ہوگی جس سے وہ اکثریتی فرقے کے امیدواروں کا مقابلہ کر سکیں۔

اقلیتی فرقوں کے ان تمام مسائل پر حکومت نے غور کیا ہے اور انہیں سلجھانے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ ان اقدامات سے حکومت کے سیکولر طرز پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے درحقیقت یہ حکومت کے سیکولر رویہ کے مطابق ہے اس لیے ہم سب کو اس ملک کو حقیقی معنوں میں جمہوری اور سیکولر جمہوریہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سماجی ترقی کے لیے ہمیں جانفشانی سے کوششیں کرنا ہوں گی تاکہ خوشحالی کا فائدہ سماج کے سبھی طبقوں کو میسّر ہو سکے۔

باقی صفحہ ۴ مولانا محمد علی جوہر

نے دیکھا کہ کانگریس آگے بڑھ رہی ہے اور اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ جارحانہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہ جارحانہ طبیعت رکھتے تھے اس وجہ سے انہیں یہ بات پسند نہیں آتی تھی کہ وہ تو پچھلی صف میں بیٹھے رہیں اور کوئی دوسرا ان سے آگے نکل جائے۔ انہوں نے مجھے اس موقع پر یوں متنبہ کیا "جواہر لال میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے موجودہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ جب برا وقت آئے گا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے اور تمہارے اپنے کانگریسی تمہیں پھانسی کے تختے تک پہنچا دیں گے۔" کیسی ہیبت ناک پیشین گوئی تھی!

جوہر ہاشمی

نہرو
ایک عظیم رہنما

رواں دواں نظر آتا ہے روشنی کا جلوس
یہ زندگی کی علامت نہیں تو پھر کیا ہے
دلوں میں، آنکھوں میں، انفاس کی اداؤں میں
وفا، خلوص، محبت نہیں تو پھر کیا ہے
کیے ہیں تو نے ہی آباد دل کے ویرانے
گلاب تجھ سے مہک اٹھے گلستانوں میں
تری حیات نے پھیلائی پیار کی خوشبو
تجھ ہی سے روشنی باقی ہے آشیانوں میں
وہ تیرا نام جو کرنوں کا روپ دھار گیا
فضا میں پھیل گیا تیز روشنی کی طرح
بنا جہاں کیلئے امن و آشتی کا نقیب
ہوا طلوعِ محبت کی زندگی کی طرح
یہ لہلہاتے ہوئے کھیت یہ رواں نہریں
کسان کی ہے تمنا یہ زندگی کی نمود
یہ صنعتوں کا شب و روز تیز تر پھیلاؤ
روایتوں کا چلن جن سے ہو گیا مفقود
وفا کے ساز سے ابھری ہیں پیار کی لہریں
یہ جھیل جس میں سدا جھولتے رہیں گے کنول
زمانہ یاد رکھے گا اسی طرح تجھ کو
دل و نظر کو ہے جیسے عزیز تاج محل

اسحاق ملک،
سلطان پورہ حیدرآباد، آندھرا پردیش

امر نہرو امر طاقت

وقارِ عزم بے پایاں
شکوہِ ہوش انسانی
وہ تھا ذہن رسا کا ایک مجاہد
وہ نہرو
وہ نہرو جس نے آزادی کے سارے بھید کھولے
وہ نہرو جس نے انگریزوں کے تار و پود بکھرائے
وہی نہرو جیالا تھا
اجالا ہند کے تن کا
جسے تاریخ صدیوں بعد تک بھولے نہ بھولے گی
یہ اک روشن حقیقت ہے
یہ اک ظاہر صداقت ہے۔
نشانِ راہِ منزل کا تعین کر دیا جس نے
نئے بھارت کے تن میں اک نیا دم بھر دیا جس نے
امر یہ شان، یہ عظمت
امر نہرو امر طاقت

مومن خاں شوقی
شرف ولا ۲۳-۷-۳۰-۱۱ ملے پلی، حیدرآباد

نہرو

وہ ایسا تھا رہبر
جسے کام سے پیار تھا
تو آرام جس کے لئے
زندگی بھر حرام
وہ بے مثل رہبر
محبت کا پیکر
وفا آشنا
وہ بھارت کا رتن
مساوات، امن اور ترقی کا پیکر
جو ہم میں نہیں ہے
مگر یاد اس کی
ہمارے دلوں میں
رہے گی سدا جاوداں، مہرباں

شجاع الدین شاہد
اندھیری، بمبئی 400093، مہاراشٹرا

نہرو جی

دیش کی شان بڑھا گئے ہیں نہرو جی
دیش کی آن بڑھا گئے ہیں نہرو جی
دیکر امن کا پیغام ساری دنیا کو
انسانیت کا مان بڑھا گئے ہیں نہرو جی
تم نے پیار محبت کا پیغام دیا
بھارت کو دنیا میں اک نام دیا
پھول سے کومل دل والے تھے نہرو جی
اور دکھی لوگوں کے رکھوالے تھے نہرو جی
دیش کے سب لوگوں سے تھا پیار انہیں
بچوں کے بھی متوالے تھے نہرو جی
سچ مانو تو دھرتی پر اوتار تھے وہ
دشمن کے بھی یاروں کے بھی یار تھے وہ
ان کے آدرشوں کا پالن کرنا ہے
دیش کی رکھشا میں ہی جینا مرنا ہے
عہد کریں ہم نہرو جی کی برسی پر
سب کے دکھ اپنے من میں بھرنا ہے
ایسے لوگ ہی مر کے امر ہو جاتے ہیں
نہرو، گاندھی، آزاد، شیکھر ہو جاتے ہیں

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۶)، شمارہ (۹) ۔ ستمبر ۱۹۸۹ء قیمت = 5/ پیسے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	نعیم جاوید	کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

زرِ تعاون

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
۳ سال	۹۰ روپے	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	۱۰۰۰ روپے	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ۔ ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

اقبال اور کے چند شعر		۳
مسلمانوں کا عائلی قانون	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۴
عالم اسلام اور خلافت	سید شاہ محی الدین محمد محمد الحسینی	۱۴
یقین محکم، عمل پیہم	پروفیسر عبدالسلام	۱۵
شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	۲۶
مولانا ابوالکلام آزاد : ایک جائزہ	نجم تراب	۳۳
توارث، ماحول اور تعلیم	محمد اسحاق	۳۶
نئی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں	پروفیسر اکبر رحمانی	۴۳
عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی	کمال الدین علی خاں	۵۷
نہرو روزگار یوجنا	سائمن جونز	۶۱

اقبال کے چند شعر

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے، تری آرزو بدل جائے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا، ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

مرے مقام کو انجم شناس کیا جانیں
کہ خاکِ زندہ ہوں میں، تابعِ ستارہ نہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

مسلمانوں کا عائلی قانون

(خطبہ صدارت اجلاس نمبر ۹ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ منعقدہ ۴، ۵ مارچ ۱۹۸۹ء بمقام کانپور۔)

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزو ہے کہ ان کا عائلی قانون (Personal Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمان اس عقیدے پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے جو انسان کا بھی خالق ہے، اور اس کائنات کا بھی، اس کی ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۚ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (سورۃ الملک۔ ۱۴)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا؟ جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانے کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی، حال، مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے۔

اس لیے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید ملت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لیے بنایا گیا ہے جو ایک زندہ جاوید ملت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لیے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (Logical contradiction) اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعملی نفاق (Hypocrisy) کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے بارے میں عقلی و شواہد اور مسلم اور غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلاء، جزی و انصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرہ چشم" ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

متعدد انصاف پسند مغربی فضلاء اور معاشرتی و تمدنی تاریخ کے ماہرین نے ان قرآنی اور شرعی تعلیمات کی برتری کا اعتراف کیا ہے جو عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق و تحفظات پر مشتمل ہیں۔

ہم یہاں دو تین شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک مغربی فاضلہ کا ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی و اصلاحی تحریک کی قائد اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیاسوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، کسی خاتون کی شہادت اس لیے بھی اہم اور قیمتی ہوتی ہے کہ وہ عورت کے معاملے میں حساس ہوتی اور اس کی طرف سے دفاع میں دلچسپی رکھتی ہے، مسز اینی بسنت Mrs. Annie Besant کہتی ہیں :-

"....ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانے تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا۔ جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائیداد، وراثت، کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، ایک زوجگی اور تعدد ازواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔[۱]"

مسٹر (N.J. Coulson) لکھتے ہیں :

بلا شبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملے میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملے میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے، اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں.... اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اسے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی

تبدیلی ہوئی ہے، وہ عدت کو اس میں شامل کرتا ہے۔[۹]"

مذہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

"پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفّی شوہر کے ترکہ کی جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہوگئی، اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہوگیا کہ وہ اسے وہ سب چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم اور شاعری سے دل چسپی لینے لگیں، اور کچھ نے استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتوں نے اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزّت کی جانے لگی ہے۔[۱۰]

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے ؟ وہاں کا معاشرہ انتشار و زوال کے آخری مرحلے پر پہنچ گیا ہے، عائلی زندگی کی ابتری اور معاشرتی ربط و تعلق کی کمزوری، بے وقعتی اور مذہب و اخلاق سے اس کی آزادی اور آخری درجے کی جنسی بے راہ روی نے پورے یورپ سے ملک نہیں بلکہ مغربی تہذیب کو اس انجام کے قریب لاکر کھڑا کردیا ہے، جو قدیم یونانی، رومی، ساسانی تہذیبوں کو پیش آیا اور تار میں صرف ان کا نام رہ گیا، اس انجام سے اس کو اس کی مادّی وصنعتی، علمی وتحقیقی ترقیاں جو نقطۂ عروج پہنچ گئی ہیں اور جنگی اسلحہ وسیاسی طاقت، اور دنیا کے اقوام و ملل پر حاکمانہ و سرپرستانہ و ناصحانہ محتسبانہ اثر و نفوذ بھی روک نہیں کہ جس گھر کا شیرازہ اندر سے درہم برہم ہوچکا ہو، اس کو نہ کوئی چیز طاقت بچاسکتی ہے، نہ باہر کی مدد، بقولِ اقبالؔ ؎

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح ؛ دیکھیے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

N.J. Coulson. Islamic Surveys: A History of Islamic Law (Edinburg—1971). P. 14

Encyclopedia of Religion and Ethics. (New York. 1912) Vol. V.P.271

وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو تہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے اور اس میں ہزاروں دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مغرب میں عائلی زندگی اور معاشرت کا جو بحران (Crisis) پایا جاتا ہے اور اس کا اعصاب و اخلاق پر جو اثر ہے، اس کے لیے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے:

"شہری خانہ بدوش کی ایک نسل ہے جو خاندان کے مرکز سے بہت دور جا چکی ہے، اور جو اپنے کام میں روحانی سکون کی متلاشی ہے جس کے ذریعے اسے حرارت اور تقویت حاصل ہوتی ہے لیکن (کام کا) نگران اگر احمق ثابت ہوا، یا مشاہرہ ناکافی ہوا، یا ملازمت غیر محفوظ یا غیر منفعت بخش ہوئی تو اسے قلبی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی فریب میں مبتلا تھا، اس کے دل کو ایک گہری چوٹ لگتی ہے یا شاید اس چوٹ سے اسے انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے اندر تو پہلے سے ہی خلا موجود تھا، اور پھر اس انکشاف کے بعد وہ پستول کا سہارا لیتا ہے، یا پھانسی کے پھندے کا، یا پھر نشہ آور گولیوں کا، اور صرف یہ نوٹ چھوڑ جاتا ہے کہ "خاک شدم"[1]

ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کیلئے تیار ہیں، ہمارے علما نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے۔

حاضرین کرام! ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں مذہبی آزادی اور ملی تشخص کے نہ صرف جواز و امکان کا اعتراف بلکہ احترام کیا ہے، اس خصوصیت کی نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کو بھی پسند کیا گیا ہے، اور اس کو ملک کی عزت و عظمت اور نیک نامی و شہرت کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ اور اسی کے لیے لا مذہبی (Secular) اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) کو سب سے زیادہ سہل العمل بے خطر اور قابلِ قبول نظام سمجھ کر قبول کیا گیا ہے، اور یہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام و ملل، تمدنوں، تہذیبوں اور علوم و فنون، اور فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اس حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف المذ

عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب و عقائد، اپنے تمدنوں اور تہذیبوں، اور اپنے معاشرتی و عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت و دفاع میں صرف کرنے کے بجائے، ملک کی تعمیر و ترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت و مقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لیے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی، جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں :

"امن عامہ، اخلاق اور صحت نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ و اشاعت کا یکساں حق ہوگا۔"

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی و نفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی، اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم و فیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی، لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی اور قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں جس نے بہت وقت لیا، اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئی ہوں گی، عجیب و غریب تضاد اور دستور ہند کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اسی دستور کے دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون کی دفعہ (Uniform civil code) شامل کی گئی، اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے :

"مملکت، ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لیے یکساں مدنی ضابطہ Uniform civil code کے حصول کی سعی کرے گی۔"

اس مسئلے کے دو بڑے محرک ہیں؟ ایک یہ کہ "سلطانی جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے اور "عائلی قانون" (Personal Law) زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے، اور عائلی قانون کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ، اور خواہشات و ضروریات کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اور بدقسمتی سے

دوسرے آسمانی مذہبوں اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی گروہوں اور فرقوں بالخصوص
ریلی نسلوں میں بھی تخیل پایا جاتا ہے، ان قوموں اور فرقوں میں اس تعاون میں حالات اور ضروریات
کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل مفقود تھا اور یہی حقیقت
ہے، اس لیے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانے کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل
جانے اور حالات تبدیل ہو جانے سے تمدن و تہذیب اور لباس و معاشرت کی طرح ان میں بھی اصلاح
ترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض و واجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزا میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی و
وحدت کا وہ عالمگیر رجحان ہے جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت و شدت کے ساتھ
پروپیگنڈہ کیا گیا اور اس میں ادب، شاعری، علم و سیاست اور صحافت و خطابت سب نے بڑا حصہ
لیا ہے، یورپ سے (جہاں تقریباً ایک مذہب، ایک طریقۂ زندگی، ایک تہذیب لیکن متعدد دنیا
پائی جاتی ہیں) یہ خیال ان مشرقی و ایشیائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب مختلف تہذیبیں اور
مختلف معاشرتی و عائلی نظام بھی پائے جاتے ہیں، لیکن یہ مذہب، تہذیبیں اور مختلف معاشرتی نظام
باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشار و تضاد کا اصل سبب ہمیشہ سیاسی اغراض اور سیاسی جماعتوں
اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خواہش ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل مذہبی اور
معاشرتی وحدت کے باوجود دو دو خون آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق و ایشیا کا دامن
بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً و ابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن
اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں۔ اور ان کا عائلی قانون و معاشرت
تقریباً ایک ہے پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے
اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہیے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم
میں بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑ پڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے
ہوں۔

دور کیوں جائیے آپ اپنے ملک بلکہ شہر کی عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آئیے کہ مسلمان
مدعی ہے اور مسلمان ہی مدعا علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے

گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے۔ ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے کہ اس میں بھی عائلی قانون (Personal Law) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی خانہ جنگی اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت، دولت پرستی کے جنون، حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور اس نظام و نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورتِ حال میں قطعاً ایک ذرے کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو، طوطے کی طرح اس بات کو دہراتے رہنا سطحیت (Shallowness) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

اس موقعہ پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہیمر (E. Bodenheimer) نے فلسفہ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنے اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے لیے کافی ہے، وہ کہتا ہے:

"کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لیے انتہائی مشکل ہوگا۔ لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظام قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو، اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لیے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پر خطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنسن نے کہا ہے:

"ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضروریات اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور

اندرونی تحفظات کی خلاف ورزی کرے گا ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی، اور وہ اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا۔[1]

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے اگر کسی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر و ترقی میں گرم جوشی و خلوص اور سکون و مسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی، بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کر سکتا ہے جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لیے ہدام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم، آپ امین اور محافظ کا لفظ تو بڑا ہے، اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں اصلاحی کام کرنے والوں (Social Workers) اور بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں لیکن "دین" اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (School of thought) اور خاص مطالعہ و غور و فکر اور تجربے کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحد لکیر (Line of demarcation) ہوتی ہے جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حدِ فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالٰے نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اظہار کے لیے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسان کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدِ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (Sociology) کا علم، تہذیب و تمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ مستقل

ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب و تمدن اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ کہ وہ ایک "دین" ہے، اس کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو برسے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور یہ ان کی زندگی اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا۔ بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا اور وہ ان کے لیے ایسی مدبر قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے امتیوں کے لیے ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝	اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں،
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝	یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اور ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)
(سورۃ النجم۔ ۳-۴)	
مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ	تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو ہم نے اس کو ایک
وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ	نور کی طرح آپ کے سینہ میں اتارا، اور اس سے ہم اپنے
نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ	بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں، اور
مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي	بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (سورۃ الشوریٰ۔ ۵۲)	

علم و تجربہ، اور روحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم فضلا سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا۔ اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ جو شخص نبوت اور روحی کی حقیقت سے واقف نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے، اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی و علمی حقیقت ہے کہ کئی مذاہب ایسے رہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات سے

دائرے میں لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے، جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی بھی ہے، گہرا بھی، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی، متعین بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ (سورۃ البقرۃ ۲۰۸) "اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تمہارا صریح دشمن ہے"

اس لیے اگر مسلمان مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔

حضرات! فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ، معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر موثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود!) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت نظامِ تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، اس کو ہم دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کرنا چاہیے اور یہ ہمارا شہری آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور، اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔

عالم اسلام اور خلافت اسلامیہ

دس کروڑ مسلمانان روس و سائبریا کے جذبات کی ترجمانی ان کے نمائندہ اور قومی کونسل کے صدر جناب صدری مقصودوف نے صلح کانفرنس میں کی۔ طویل اور مدلل یادداشت پیش کی گئی تھی*
خود اس وسیع براعظم ہند میں تحریک خلافت نے جو کیفیت پیدا کی تھی اس کی یاد ابھی لاکھوں کے دلوں میں باقی ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ سلاطین، قائدین اور عامۃ المسلمین خلافت کو اتحاد و مرکزیت اسلام کی اساس سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کی ساری جد و جہد ترکی اور ترک قوم کے نام پر تھی۔ خدا کے نام پر نہ تھی۔ وہ "الملک للّٰہ والحکم للّٰہ" کے ایقان اور "قوام ملت ما لا الٰہ الا اللّٰہ" کے ادراک سے محروم تھی! خلیفۃ المسلمین کی کمزوریاں مسلّم مگر اس کی تباہی و بربادی کا جواز کہاں سے نکل آیا؟ دشمنانِ دین کی مرادیں پوری ہوئیں جبکہ اتحاد و مرکزیت اسلام کا یہ آخری قلعہ مسمار ہوگیا!

موجودہ حالات میں اصول اجتماع اور جاذبۂ دین کا ذکر بے محل تو معلوم ہوگا لیکن کوئی یہ بتائے کہ مسلمانوں نے حیات ملی کا کیا اہتمام کیا ہے؟ وہ کونسی بنیاد ہے جس سے متاثر ہو کر بصرہ کے حسنؓ، فارس کے سلمانؓ روم کے صہیبؓ اور حبشہ کے بلالؓ کی طرح مختلف ممالک کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور نہ صرف جمع ہو جائیں بلکہ ان میں سے کوئی مرد مومن اس اخوت اسلامی کا مظاہرہ کرے جو سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کی محرک تھی:

سلمان منا اھل البیت (سلمان ہم اہل بیت رسولؐ میں سے ہیں)۔

(باقی صفحہ پر)

---

* : خطبہ صدارت علامہ سید سلیمان ندوی (خلافت کانفرنس)

پروفیسر عبدالسلام

یقینِ محکم، عملِ پیہم

میں جھنگ کالج میں ۱۹۴۰ء میں بارہ کی عمر میں داخل ہوا۔ چار سال یہاں گزارے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج ہوتا تھا یعنی وہاں فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلباء کی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق اساتذہ ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین مرحوم تھے۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد قریشی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق فاروقی کے استاد خواجہ سراج الدین جنہوں نے سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ حساب میں لالہ [illegible] اور لالہ رام لال فزکس کے استاد لالہ [illegible] اور کیمسٹری کے استاد لالہ ہیت رائے تھے۔

میرے تعلیمی کیریئر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی ہر کامیابی اس کالج کی تعلیم اور میرے محلہ کے اساتذہ کی شفقت کا مرہونِ منت ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔ اس کی میں ایک مثال عرض کروں۔ فرسٹ ایئر کے دوران میں نے انگریزی کے بہت سے نئے اور خوبصورت لفظ سیکھے اور پسند آئے اور میں اپنی تحریر میں ان مشکل اور بعض اوقات متروک لفظوں کو بے تعلق اور بے محل استعمال کرنے لگا۔ استادِ گرامی جناب شیخ اعجاز صاحب نے کئی دفعہ تنبیہ فرمائی۔ میری طرف سے تعاون نہ ہوا۔ سہ ماہی امتحان آیا۔ جناب شیخ صاحب نے مجھے بارک فرمایا۔ ہر متروک اور بے محل کے استعمال پر فی لفظ پانچ نمبر کے حساب سے نمبر کاٹ لئے۔ ظاہر ہے کہ میرا کوٹل صفر کے قریب جا پہنچا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کی کلاس میں میرا پرچہ لانے کے بعد ہر لفظ لفظ کا تذکرہ ساری کلاس کو سنایا اور کئی ہوجھ مجھ پر حملے کیے۔ اس پر تحریر تھا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ میروی بترکستان است

اس وقت مجھے یہ خصوصی سلوک بہت ناگوار گزرا لیکن اب غور کرتا ہوں تو یہ سراسر شفقت تھی نوازش تھی کرم تھا۔ اس [illegible] کا اثر یہ ہوا کہ کم از کم انگریزی خصوصیت میں بے محل لفظ استعمال کرنے کی عادت چھوٹ گئی۔

میری تعلیم اساتذہ کی مرہون منت تھی اس سے زیادہ قبلہ والد صاحب کی نگہ اور ان کی دعاؤں کی مرہون منت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان صوبۂ پنجاب کے لئے ایک قسم کا اکھاڑہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں مختلف اسکولوں کے پہلوان دنگل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سناتن دھرم اور آریہ اسکولوں کے طلباء اس دنگل کے نامی پہلوان تصور کئے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلا میں مگھیانہ کچہری میں قبلہ والد صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ رزلٹ کی کاپی دوپہر کے وقت لاہور سے مگھیانہ اسٹیشن پہونچی والد صاحب نے آدمی بھیج رکھا تھا۔ کاپی ان کے دفتر میں لائی گئی۔ ساتھ لاہور سے مبارک بادوں کے تار آنے لگ گئے۔ جس طرح میں نے عرض کیا ہے اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ ایک نیشنل event کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ ہندو کمیونٹی community کی علم دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں مگھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا۔ رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ چونکہ پولیس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ کی طرف سے جانا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے وہ ہندو دوکاندار جو عموماً گرمی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے بیٹھکوں پر دوکانوں کے چھپروں کے سائے تلے سوئے ہوتے تھے جس وقت میں سائیکل پر سے گزرا اس روز وہ سب کے سب اپنی دوکانوں میں میرے آنے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقشہ ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔

میں جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور اور وہاں سے کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج میں انگریزوں کی علم نوازی کا ایک نیا مشاہدہ ہوا۔ کیمبرج کے کلاس میں طالب علم اس انداز سے بیٹھتے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہوں۔

لیکچرار کے آنے سے پیشتر ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں اگر طالب علم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم کھینچ لکیریں ڈالنے کے لئے استعمال کررہا ہوگا۔ اس کی نوٹ لینے والی کاپیاں ایسی اعتماد سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویسی لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالب علم براہ راست اسکولوں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے کم تھے لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور ڈھنگوں کا یہ عالم تھا جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے جن میں ان کے اسکولوں کا استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا کہ عزیزم تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا، سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن ہو سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لئے نیا تھا۔ کیمبرج میں بی اے کا امتحان آپ زندگی میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں، آپ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہوسٹل کا ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک آپ بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں۔ دس سے بارہ بجے تک ایک پینی جرمانہ لیکن اگر آپ ۱۲ بجے کے بعد آئے تو سات دن کی (Gating) ہوگی اور اگر سال کے دوران ۳ بار ایسا ہوا تو آپ کو کیمبرج سے نکال دیا جائیگا۔ کیمبرج میں ہر طالب علم Adult تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار گنا جاتا ہے۔ اس سے بے جا تعرض نہیں ہوتا لیکن اسکے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ ہیں جنھیں وہ طالب علم مردانہ وار قبول کرتے ہیں۔

کیمبرج کا طالب علم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے دن جب میں (St. Johns College) پہنچا میرا ۲ سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو ٹیکسی پر چلا آیا لیکن جب کالج پہنچ کر پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا بکس ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے وہ (Wheel Barrow) ہے۔ آپ اسے اٹھائیے اور باقیوں کیا تو اپنے کمرے میں لے جائیے۔ یہ پرانے قصوں کی بازخوانی محض ذاتی حظ لینے نہیں کررہا۔ میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں اور ان سے پہلے یہ

داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے۔ کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے وہ زندگی بھر شاذ ہی بدلتی ہے۔ لیکن میں شخصی کردار کے بارے میں عرض نہیں کروں گا۔ میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے۔ دو سو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ اس بات کو اب تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں لیکن اس طویل عرصے میں ہم اپنے اندر احساس یگانگت، احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔

آزادی کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصور مختلف زبانوں میں چلتا آیا ہے۔ آج کے تصور کے لحاظ سے دنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی ہیں جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجئے امریکہ کے یونائیٹڈ اسٹیٹس میں انگریز، جرمن، اطالین، سویڈش، فرانسیسی سب قبیلوں سے لوگ بستے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں۔ یہ ہی وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی علیحدہ قومیت کے لئے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں، ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں، مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جیسے ایک melting pot میں پگھلا کر ان قبیلوں کا ایک واحد قومیت میں منسلک کر دیا ہے۔ اسکولوں میں ہر بچے کو امریکن کا نسٹی ٹیوشن حفظ کرائی جاتی ہے۔ امریکی ہیرو ان کے زبان زد ہوتے ہیں دن رات وہ امریکی ترانے سنتا ہے۔ ادیب لکھنے والے شاعر، افسانہ نویس ان طرح

ہے یکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطے سے محبت اسکے شہری کے خمیر میں ہیں رچ بس جائے۔ امریکہ کے ہر شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے درس دیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور اختیار وہ یورپ کے ملکوں سے جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے مناسبت ہوتی ہے۔ جس سے اس کا کھانا اس کا پینا اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے۔ اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کے لیئے کوشاں رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اسکولوں کالجوں اور اخبارات، رسائل اور ٹی وی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کے احساس کو شعوری طور پر اجاگر کرے۔

میری دوسری گزارش ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اقتصادی طور پر پس ماندہ ہیں۔ یہاں ایک فرد کی اوسط آمدنی ستر ڈالر کے قریب بنتی ہے۔ ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی اوسط آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ ہے، جاپان کی پندرہ گنا زیادہ ہے ایران کی آٹھ گنا زیادہ ہے، ترکی کی آٹھ گنا زیادہ، عراق، الجیریا، شام، مصر کی فی کس آمدنی ہماری نسبت سے چھ گنا زیادہ ہے۔ افریقہ میں یوگنڈا کی فی کس آمدنی ہماری نسبت سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں۔ مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی پنجاب سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور تعالی خدا زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے۔ اگر انگریز جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہ تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھایا۔ اگر کلائیو کی پلٹن لاک رائفلوں، بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فیلہ سوزان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا۔ کیا یہ فن اس قوم نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے لیے تعلیم کے ذریعے انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا۔

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانے کی مرہون منت تھی۔ رومی توپ تو اس فن میں ۱۵۲۶ء کے بعد بھی مزید تحقیق کرتے رہے لیکن بد قسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں باقاعدہ تجربہ گاہ بناتے۔ آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں۔ رومی ترک کا مسجد کا تصور اپنے زمانے میں یہ تھا کہ ہر شاہی جامع کے ایک طرف اسپتال بنے گا، دوسری طرف مدرسہ۔ صرف دینی درس ہی نہیں ہوگا، اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہونگے۔ بد قسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی۔ وہ اپنی یادگاریں مزار اور مقبرے تو چھوڑ گئے، مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکن پر رزق کھولا اور اسے ایک نئے بر اعظم سے نوازا تو کیا یہ اسکے اس عمل کا بدلہ نہ تھا جس نے اسے بے کنار سمندروں میں نئے بر اعظم کی دریافت میں طوفانات سے لڑوادیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی انڈسٹری کی دھاک ساری دنیا میں بٹھادی ہے تو اس میں جاپانی نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو ٹیکنالوجی کی تعلیم کے لیئے نازل نہیں ہوتے۔ ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ شمار کیا جاتا تھا۔ اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے۔ برٹش لے لینڈ نے منی موریس کی تیاریاں کی، جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں بجائے 1000.c.c کے جاپانی 600.c.c کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاور پیدا کرتا ہے۔ یہ کسطرح ہوتا ہے؟ بیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسر شاونس نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انہیں اس دریافت پر نوبل پرائز ملا۔ ان کا پیٹنٹ توڑنے کے لیئے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوششیں شروع ہوئیں اور اس میں کامیاب ہوئیں کہ اس وقت سے الیکٹرونکس میں بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انہوں نے وہ ایجاد یا وہ دریافت کی بلکہ انہوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں شائع کر دیا تاکہ جو چاہے ہندوستانی پاکستانی ہو، عرب ہو، ایرانی ہو، ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو ترقی دے سکتا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو بیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی جیسے فن میں ناآشنا تھے۔ ایک امریکن

ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے تھے اور جاپانیوں نے انھیں لنگر جاہ تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے ایک چوری ہوئی وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہو گیا اور دوسرے دن اسے پھر واپس کر دیا گیا جاپانی اسکے نعل کو غور سے دیکھنے اور نعل بندی سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی دھات سازی اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کی نعل بنا سکتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آخرہ داخلے ہوتے ہیں لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے ہیں۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ اس لیے نقلیں نہیں ہوتیں۔ امتحان کے پرچوں کے دروازے اور شیشے توڑے نہیں جاتے۔ ساری قوم سب والدین طالب علم امتحان کے بخار کا شکار ہوتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل اسکول میں طالب علم بارہ سال کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل اسکولوں کو میرے طالب علمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھ لیجئے۔ ان پانچ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو ۱۲ مضامین پڑھنا پڑتے ہیں جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا۔ وہ بارہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وطنیات ۲۔ چینی زبان ۳۔ دو غیر ملکی زبانیں۔ انگریزی، روسی یا جاپانی
۴۔ ریاضی ۵۔ فزکس ۶۔ کیمسٹری ۷۔ بیالوجی اور زراعت ۸۔ تاریخ
۹۔ جغرافیہ ۱۰۔ آرٹس ڈرامہ میوزک ۱۱۔ ورک شاپ۔

طالب علم پورے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ چینیوں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ ہر جدید طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار ۱۰/۱۲ برس کے طالب علم کیلئے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کیلئے میں فزکس اور ریاضی دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس کے لیے کلاس میں گیا۔ ریاضی میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ دو سالہ طالب علم درجہ لامتناہی پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ بی اے میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر صنعتی ٹیکنیک کو چین میں قائم کریں گے ان کی نئی نئی زندگی ہمارے دو سال ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان چالیس سالوں میں انہوں نے قومی سطح پر الیکٹرونکس کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولاد سازی ۴ ہزار ٹن سالانہ سے شروع کر کے آج انگلستان کے برابر دو کروڑ ٹن تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب نازک مشینی پرزے بناتے ہیں، مگ ۲۱ ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالب علم اپنے اسکولوں اور اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتہ میں ایک دن ورکشاپ پریکٹس میں صرف کرتا ہے۔ جس اسکول کا میں معائنہ کرنے گیا تھا، اس میں یہ کیفیت تھی کہ ۱۲ سال سے ۱۴ سالہ طلبا کا ایک گروپ ٹرانسسٹر کے اجزا تیار کر رہا تھا۔ دوسرا گروپ پوٹاشیم کا بائیونیٹ معدنی صورت سے لے کر (Grinding Titration) وغیرہ کرنے کے بعد بوتلوں میں بند مارکیٹ کے لیئے تیار کر رہا تھا۔ ۱۲ سالہ طالب علموں کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے باقی طلبا کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں۔ ان پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے شرماتے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے ڈالے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمیں اس محنت سے شرم نہیں آتی، ضروری ہے کہ ہم اپنے طالب علمی کے زمانے میں پیداواری ہوں، جونک نہ ہوں، ہمارے چین میں یونیورسٹی کالج اور اسکول کے طلبا اور اساتذہ اپنی تعطیلات گرما فیکٹریوں اور کارخانوں میں گذارتے ہیں۔

آپ میری باتوں میں مبالغہ سمجھیں گے۔ یقین مانیئے مجھے بھی اگر کوئی سناتا کہ اتنا بڑا ملک اس قدر یک جہتی سے چل رہا ہے۔ تو ہرگز نہ مانتا لیکن اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاؤں۔ ایک بار نہیں تین بار چین کا سفر کر چکا ہوں مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ ۸۰ کروڑ انسان اسی طرح قوم کا مفاد رکھ سکتے ہیں نہ صرف اپنے ذاتی منافع کو فنا کر سکتے بلکہ اس سے بھی زیادہ قوم کی خاطر اپنی انفرادی خودی کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس قوم کا ہر فرد دن رات ایک طریقے پر کام کرتا ہے۔ ان کے شہر جو ۱۹۴۹ء میں مکھیوں سے بھنبھناتے تھے پیکنگ جہاں شاہی محل کے عقب میں ڈراگن سمندر کے نام سے معروف گندگی کی تیس فٹ چوڑی نہر تھی جو ۳۰۰ سال سے صاف نہ ہوئی تھی' یہ شہر اب آئینہ کی طرح صاف ہیں) اور یہ صفائی مالک روبوں کی مرہون منت نہیں۔ یہ صفائی وکیلوں استادوں طالب علموں سیاست والوں' دکانداروں کی مرہون منت ہے یہ کام اسٹوڈنٹس یونینوں سے لیا گیا تھا اور وہ اس معاملے میں مقدم اور پہل کرنے والی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ چینی نظام شاید قائم اس لیئے ہے کہ یہ مساویانہ نظام ہے چینی وزیر سائیکل پر دفتر آئے گا۔ سرکاری کار تب استعمال کرے گا جب وہ آپ کا مہمان کی حیثیت سے خیر مقدم کرنے آئے گا۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہے کہ قوم ایثار کرتی ہے لیکن یہ کہنے کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم کا اس قوم کے اس عزم سے کہ ٹیکنالوجی اور فن' سیکھے جائیں گے' براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ چین سے پہلے میں انگلستان اور جاپان کی مثالیں عرض کر چکا ہوں۔

چین کے بیان میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا میں عرض کر رہا تھا کہ انگریز نے انڈسٹریل ٹیکنیک ایجاد کیے اور انہیں تعلیم کے ذریعہ اپنی قوم میں پھیلایا۔ اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر معدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے اپنی ساری قوم میں ہنرمندی پھیلا سکتا ہے' اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی SKILL سیکھے گا' اسے بڑھائے گا۔ اگر یہ قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لیے سبق نہیں

سب ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ غریبی تو دالبی لعنت ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمن کا ایک واقعہ پیش ہوتا ہے۔ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ میں کیمبرج میں طالب علم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سڑکوں پر تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء کی ایک پارٹی کو امریکن کمرشل کمیٹی والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کیلئے دعوت دی۔ تقریباً ۔۔۔ کے قریب طالب علم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک ۔۔۔ بھی ایسی نہ تھی جو صحیح وسالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ ۔۔۔ تھا ہمارے لیئے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے قیام میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید ۲۵ روپیئے ماہوار ملتے تھے۔ اس مشاہرہ سے شاید وہ ۔ے وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ میر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک مجلد سے چھپی ہوئی اور انتہائی خستہ حالت میں پھٹی ہوئی ڈکشنری کی کاپی تھی۔ یہ سُن کر کہ ایک پنجابی وارد ہے وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ ڈکشنری میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی ہے یہ مقامات میرے لیئے بھی بہت مشکل تھے اور اس بیچارے کی یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمائیے مجھے معلوم نہیں کہ وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم ٹکنالوجی کا علم زبانوں کا علم یعنی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا یہ معنی ہی نہیں بنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزار سکتے ۔۔۔ نہیں کریں گے ۔۔۔ نہیں

دیکھیں گے، اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے، علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے شاید اس میں ہمارے لیے کچھ سبق ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں یہ داستان چیرمین ماؤ نے بیان کی تھی وہ اسے آپ ہر چینی کی زبان سے سنیں گے۔

"پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا اس کا نام "پیرِ کم عقل" تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی لیکن اس کے دروازے کے سامنے تائی ہانگ اور وانگ وو کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دور کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جس کا نام "پیرِ دانش مند" تھا اس پر کم عقل بوڑھے سے کہا میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو دور کر سکو گے۔ کم عقل بوڑھے نے جواب دیا تمہارا کہنا درست ہے لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہوں گے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہ ہوں گے ہر کھودنے کیساتھ ان کی طوالت کم ہی ہوگی بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو جائے گی۔

پیرِ کم عقل کی بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا۔ دو فرشتے آئے اور انھوں نے ان پہاڑوں کی لعنت دور کر دیا۔"

میری عرض صرف یہ ہے سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انھیں اپنے حلقہ اثر میں جہاں تک ممکن ہو دور کرنے میں کوشاں ہو جائیے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ آمین

یہ فکر نہ کیجئے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہو گی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے خداوند تعالیٰ کی پاک ذات ان میں برکتیں ڈالے گی۔

ڈپٹی کمشنر کی ڈائری

اس زمانے میں کچھ عرصہ کے لئے صوبائی حکومت نے ڈپٹی کمشنروں کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ سرکاری بنجر زمین کے آٹھ مربعے تک ایسے کاشتکاروں کو طویل میعاد پر دیے جا سکتے ہیں جو انہیں آباد کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ میں نے اپنے مال افسر کو بلا کر کہا کہ وہ کسی مناسب جگہ کراؤن لینڈ کے ایسے آٹھ مربعے تلاش کرے جنہیں جلد از زیر کاشت لانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئے۔ غلام عباس مال افسر نے غالباً یہ سمجھا کہ شاید اراضی میں اپنے کسی عزیز کو دینا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پکی سڑک کے نزدیک نیم آباد سی زمین ڈھونڈ نکالی اور رحمت الٰہی کے نام الاٹمنٹ کی ضروری کارروائی کر کے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔

دوسری پیشی پر جب رحمت الٰہی حاضر ہوا تو میں نے یہ تحفہ اس کی خدمت میں پیش کر کے اسے مال افسر کے حوالے کر دیا کہ قبضہ وغیرہ دلوانے اور باقی ضروریات پوری کرنے میں وہ اس کی پوری مدد کرے۔

تقریباً نو برس بعد میں صدر ایوب کے ساتھ کراچی میں کام کر رہا تھا کہ ایوان صدر میں میرے نام ایک رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ یہ ماسٹر رحمت الٰہی کی جانب سے تھا کہ اس زمین پر محنت کر کے اس نے تینوں بیٹیوں کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے اپنے گھر میں خوش و خرم آباد ہیں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ حج کا فریضہ بھی ادا کر لیا ہے اور اپنے گزارے اور رہائش کے لئے تھوڑی سی ذاتی زمین خریدنے کے علاوہ ایک کچا سا کوٹھا تعمیر کر لیا ہے۔ ایسی خوشحالی میں اب اسے آٹھ مربعوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اس الاٹمنٹ کے مکمل کاغذات اس خط کے ساتھ واپس ارسال ہیں تاکہ کسی اور حاجت مند کی ضرورت پوری کی جا سکے۔

میں یہ خط پڑھ کر کچھ دیر تک سکتے میں آ گیا۔ میں اسی سوچ میں گم سم بیٹھا تھا کہ صدر ایوب کوئی

بات کرنے کے لئے میرے کمرے میں آ گئے۔

کس سوچ میں گم ہو؟ انہوں نے میری حالت بھانپ کر پوچھا۔

میں نے انہیں رحمت الٰہی کا سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی نہایت حیران ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہ اچانک بولے "تم نے بڑا نیک کام انجام دیا ہے۔ میں تو ابھی کلکٹر کو لاہور ٹیلیفون کر دیتا ہوں کہ وہ یہ اراضی تمہارے نام کر دیں۔"

میں نے نہایت لجاجت سے گزارش کی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔ یہ سن کر صدر ایوب حیرانی سے بولے "تمہیں زرعی اراضی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں؟"

"جی نہیں سر" میں نے التجا کی۔ "آخر میں فقط دو گز زمین ہی کام آتی ہے وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتی ہے۔"

میرا اندازہ ہے کہ میری یہ بات سن کر صدر کچھ چڑ سے گئے۔ زمین حاصل کرنے کے وہ خود بڑے رسیا تھے۔

ایک روز میری ایک ملاقات بشیراں طوائف تھی۔ وہ بڑے ٹھسے سے دفتر میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے رنگین لباس سے حنا کے عطر کی باسی باسی خوشبو آ رہی ہے اور اس کی آنکھیں رتجگے اور رونے کی آمیزش سے سوجی ہوئی ہیں۔ میں اس کی تراش خراش کا سرسری سا جائزہ لے کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں اور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی جانب ٹکٹکی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

بشیراں طوائف کھنکار کر گلا صاف کرتی ہے۔ "سرکار میری بات سنو۔" اس کی آواز میں ایک بلغمی سا بوجھ اور کھردرا پن ہے۔

"کیا بات ہے؟"

"میری بات سنو سرکار۔" وہ دوبارہ تھکن آلودہ آواز سے کہتی ہے۔

"سن تو رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟"

لیکن بشیراں مطمئن نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا مدعا یہ ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بات کروں۔ لیکن میں بدستور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتا ہوں۔ اس پر بشیراں طوائف ایک ہچکی لے کر رونے لگتی ہے۔ میں گھبرا کر اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں اور کسی انجانے خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ اس کی بڑی بڑی سوجی ہوئی

آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہیں۔ مجھے رہ رہ کر ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کی جگہ خون کے قطرے یا کچے گوشت کے لوتھڑے گرنے لگیں گے۔

مجھے اپنی جانب متوجہ کرکے بشیراں طوائف دوپٹہ کے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ ازسرنو نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ایک میکانکی عمل ہے۔ اس میں ہونٹوں کے پھیلاؤ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں۔

"سرکار! میرے گھر پر کل رات میونسپلٹی والوں نے چھاپہ مارا ہے۔" وہ اپنی شکایت شروع کرتی ہے۔

"کوئی وجہ ہوگی؟"

"کوئی وجہ ہوتی تو میں کبھی شکایت نہ کرتی۔" وہ خود اعتمادی سے کہتی ہے۔ "مجھے ناحق دق کیا جاتا ہے۔ میں بارہ برس سے اسی جگہ بیٹھی ہوں۔ اپنی محنت سے روزی کماتی ہوں۔ منڈی کا داروغہ، کمیٹی کا انسپکٹر اور شہر والے لوگ سب مجھ سے خوش ہیں۔ لیکن پانی پت سے پناہ گیر جواب میرے محلے میں آکر آباد ہوئے ہیں۔ ہر روز میرے خلاف عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ مجھے اس مکان سے نکال دیا جائے تاکہ ان کی بہو بیٹیوں پر خراب اثر نہ پڑے اور ----"

"مکان کس کا ہے؟" میں بات کاٹ کر پوچھتا ہوں۔

"میرا ہے سرکار۔ لالہ شنکر داس نے ہجرت کے وقت میرے نام کروا دیا تھا۔" بشیراں نے اپنی پٹاری سے لالہ شنکر داس کے کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

"بحالیات کے محکمے سے بھی اجازت لی ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کنفرم ہے۔" اس نے محکمہ بحالیات کے کاغذات بھی میز پر دھر دیے۔

"سرکار میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر حج کے لئے رقم جمع کی ہے۔ کراچی سے حج کا قرعہ بھی میرے نام آگیا ہے۔ اب اگر میں حج پر چلی گئی تو پانی پت والے کمیٹی سے مل کر میرے مکان پر قبضہ کر لیں گے۔ حاضری کا بلاوا تو آگیا ہے اگر نہ گئی تو اس کا عذاب کون بھگتے گا؟ آخر میں نے بھی تو قوم کی بہت خدمت کی ہے۔"

"کیا خدمت کی ہے؟" میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

وہ اپنے تھیلے سے آزاد کشمیر فنڈ، قائداعظم ریلیف فنڈ، قائداعظم میموریل فنڈ، بیوہ گھر

اور یتیم خانوں میں دیئے گئے چندوں کی رسیدیں نکال کر میز پر ڈھیر لگا دیتی ہے۔

یہ دیکھ کر میں عجیب مخمصے میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ یہ پیشہ ور بد نام عورت ماہی بے آب کی طرح حج پر جانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اللہ ور سول کا کوئی قانون اسے اس عظیم سعادت سے محروم نہیں کر سکتا۔ لیکن جھنگ میونسپلٹی کا قانون اس کا مکان چھین سکتا ہے۔ اگر اس کا مکان چھن گیا تو وہ حج پر جانے سے رہ جائے گی۔ اگر دس نمازی اور متقی حج پر نہ جا سکیں تو شاید جنت کی آبادی میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی لیکن اگر یہ طوائف حج پر جا کر توبہ کرنے سے رہ گئی تو دوزخ کے شعلے کس کے لئے سرد پڑیں گے؟۔

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہوں اور آغا شجاعت علی صاحب ایس۔ پی کو ٹیلیفون پر یہ صورتِ حال سناتا ہوں۔ آغا صاحب بڑے بااخلاق، شائستہ اور نیک خو پولیس افسر ہیں۔ وہ اپنی نرم آواز میں بڑے جذبے سے کہتے ہیں، "میں اس قضیے سے واقف ہوں آپ اسے ضرور حج پر جانے دیں۔ اس کا مکان کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس کی غیر حاضری میں پولیس اس کے مکان کی حفاظت کرے گی۔"

واپس آ کر میں بشیراں سے کہتا ہوں "تم ضرور حج پر روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے مکان کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہاری واپسی تک پولیس اس کی حفاظت کرے گی۔"

"خدا سرکار کو سلامت رکھے۔" وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جلدی جلدی آزاد کشمیر فنڈ، قائداعظم ریلیف فنڈ، قائداعظم میموریل فنڈ، بیوہ گھر اور یتیم خانوں کے چندوں کی رسیدیں سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے۔

اندر ہی اندر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس سے کہوں کہ جب تم حرمین شریفین کی زیارت کرو تو میرے لئے بھی دعا کے دو لفظ بول دینا لیکن ڈپٹی کمشنری کا شدید احساس کمتری مجھے یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بشیراں محض ایک طوائف ہے۔ یوں بھی محمد صدیق اردلی دیر سے دفتر کے دروازے پر منڈلا رہا ہے اور میرا اس قدر وقت "ضائع" کرنے پر بشیراں کو بڑی سنگدلی سے گھور رہا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ میرے دفتر سے باہر نکلے تو محمد صدیق اپنی خالص گوجرانوالی زبان میں اسے دو چار گالیاں بھی سنا دے۔

ایک دور افتادہ گاؤں کا نمبردار ملاقات کے روز آیا اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ سے

ایک ملنگ نے گاؤں میں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔ دوپہر کے وقت موسم گرما کی شدید تمازت میں بھی وہ آگ جلا کر باہر دھوپ میں بیٹھتا ہے اور دن بھر چلم پیتا رہتا ہے۔ دور دور سے لوگ اپنی مرادیں لے کر اس کے پاس آتے ہیں۔ کسی سے وہ گھی کا کنستر وصول کرتا ہے کسی سے گندم کی بوری یا چاول یا چینی کے اَنبار۔ خاص طور پر عورتوں سے سونے چاندی کی مُرکیاں، انگوٹھیاں اور چوڑیاں تک اتروا لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی فرمائش پوری نہ کرسکے تو وہ جلال میں آکر سائل کی جانب کچھ پڑھ کر ہاتھ جھٹکتا ہے۔ اس عمل سے سائل کے بدن کا کوئی حصہ مفلوج سا ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے چارپائی پر لٹا کر گھر لے جاتے ہیں جہاں پر ڈیڑھ دو ماہ وہ یہ اذیت کاٹ کر ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے اس طرح کے درجنوں کیس اس علاقے میں رونما ہو چکے ہیں۔ نمبردار نے کہا " ساری آبادی اس کے خوف سے سہمی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں کیا نہ کریں۔"

یہ عجیب واقعہ سن کر مجھے شوق چرایا کہ میں خود وہاں جا کر اس بھید کا کھوج لگاؤں۔ حفظ ما تقدم کے طور پر میں نے سول ہسپتال سے ایک اسٹریچر منگوا کر گاڑی میں رکھوا لیا اور ایک اردلی اور نمبردار کو اپنے ساتھ بٹھا کر گاؤں کی جانب روانہ ہوگیا۔ پچاس پچپن میل کا سفر تھا۔ راستہ بھر میں لگاتار آیت الکرسی اور چاروں قل صمیم قلب سے پڑھتا رہا۔ میں نے گاڑی گاؤں کے قریب رکوائی۔ نمبردار اور اردلی سے کہا کہ وہ گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہیں میں اکیلا ملنگ کے ڈیرے پر جاؤں گا اگر میں نصف گھنٹہ تک واپس نہ آیا تو وہ اسٹریچر لے کر وہاں آجائیں۔

ڈیرے پر ایک کالا بھجنگ، فربہ بدن، کریہہ المنظر شخص دھوپ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا اس کے چہرے پہ ڈاڑھی کے بال اس طرح لٹک رہے تھے۔ جیسے کھجور کے درخت کی شاخوں سے تیز تیز لانبے لانبے کانٹوں کے گچھے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ سامنے آگ کے الاؤ کے قریب چند چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چٹائیوں پر کچھ مرد اور چند عورتیں ادب سے دوزانو بیٹھی تھیں۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ باری باری ہر شخص ملنگ کو مخاطب کرتا تھا " حضرت جی، میری عرض سنو۔" لیکن سرخ سرخ آنکھوں والا ملنگ کسی کی عرض سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ بلکہ کش پر کش لگا کر گم صم بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں

میں نے ملنگ کو للکارا۔ ارے او بدمعاش غنڈے بولتا کیوں نہیں۔ کیا تو گونگا ہے؟

یہ سنتے ہی چنالیوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر بھاگ گئے اور دور کھڑے ہو کر مجھے نصیحت کرنے لگے۔ "شہری بابو تجھے معلوم نہیں۔ یہ جلالی بابا ہے۔ تم کو بھسم کر ڈالے گا۔"

میری للکار سن کر ملنگ بھی غصے میں آگیا۔ اس نے چلم ہاتھ سے رکھ دی اور زور سے چنگھاڑ کر سر و قد کھڑا ہو گیا۔ میرے وجود میں بھی کوئی اسپرنگ کھل در میں بھی اس کے ساتھ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ملنگ نے پانچ سات بار زور زور سے جھٹک کر میری جانب اپنا ہاتھ مارا۔ ایک دو لمحے کے لئے میرے بازو ذرا سی ملکی سی سنسناہٹ تو ضرور ہوئی۔ لیکن فوراً ہی رفع بھی ہو گئی۔ اپنے عمل کی اس ناکامی پر ملنگ گھٹنوں میں سر دے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران نمبردار اور میرا اردلی بھی دوڑ کر وہاں آگئے۔ اب گاؤں کی آبادی کا بڑا حصہ یہ تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ "یہ کوئی شیطانی عامل ہے۔ اللہ کے کلام کی برکت سے اس کا عمل ٹوٹ گیا ہے۔ اب تم بے خوف ہو کر آگے آؤ اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر اس کے ایک ایک جوتا لگاؤ۔"

یہ سن کر گاؤں کا ایک زندہ دل نوجوان زور زور سے لاحول پڑھتا ہوا آیا اور ملنگ کو زمین پر الٹا لٹا کر اس کی پیٹھ پر گھوڑے کی طرح سوار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد باری باری مرد اور عورتیں اور بچے آتے اور لاحول پڑھ کر ملنگ کو ایک دو جوتے رسید کر جاتے۔

میرے کہنے پر نمبردار نے ملنگ کا حجرا بھی کھولا، جو گھی کے کنستروں، شہد کی تولوں، گندم اور چاول کی بوریوں، نئے کپڑوں کے بنڈلوں اور سونے چاندی کے زیورات کے ڈبوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ میں مقامی معززین کی ایک کمیٹی بنا کر یہ سارا مال غنیمت اس کے سپرد کر دیا کہ جن جن لوگوں کی ملکیت ثابت ہو وہ مال انہیں لوٹا دیا جائے۔ اگر کچھ اشیا بچ جائیں تو انہیں غریب غربا میں بانٹ دیں۔

اس کے بعد میں ملنگ کو اپنی کار میں بٹھا کر جھنگ لے آیا۔ میں نے اسے بہت کریدنے

کی کوشش کی کہ اس نے یہ شیطانی اور سفلی عمل کب اور کیسے سیکھا ہے؟ لیکن سارا راستہ وہ چپ سادھے بیٹھا رہا۔

جھنگ پہنچ کر میں وہاں کے ایس۔ پی۔ آغا شجاعت علی کے ہاں گیا اور سارا ماجرا سنا کر پوچھا، کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟

آغا صاحب بولے: "مقدمہ تو دائر ہو سکتا ہے لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ایسے مقدمات میں بیشتر لوگ ملنگوں کے خلاف گواہی دینے سے کتراتے ہیں اس لئے ایسے مقدمے کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں ہمارا "چھتر انچارج" بڑا ماہر ہے وہ دو دن میں "چھترا" کر کے اس کے سر سے شیطان کا بھوت اتار دے گا اس کے بعد ہم اسے ضلع جھنگ سے نکال باہر کریں گے۔ جہاں اس کے سینگ سمائیں وہاں چلا جائے۔"

دو بڑے زمینداروں کا تذکرہ کئے بغیر میرے ملاقاتیوں کا سلسلہ تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔

ایک روز ایک بڑے زمیندار صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ خود تو بڑی حد تک ناخواندہ تھے لیکن تعلیم کے فضائل اور فوائد پر ایک طویل تقریر کرنے کے بعد بولے "جناب آپ اس پس ماندہ ضلع کے لئے نیکی کا ایک اور کام بھی کرتے جائیں۔ فلاں گاؤں میں اگر ایک پرائمری سکول کھول دیا جائے تو اس علاقے پر یہ ایک احسان عظیم ہو گا۔ اگر آپ حکم فرمائیں تو بندہ اسکول کے لئے زمین مفت، کمروں کی تعمیر کے لئے ۲۰ ہزار روپے نقد اور ایک استاد کی ایک برس کی تنخواہ اپنی جیب سے ادا کرنے کے لئے حاضر ہے۔"

میں نے ان کی روشن خیالی اور فیاضی کی تعریف کر کے کہا: "نیکی اور پوچھ پوچھ؟ آپ جب فرمائیں گے، سکول کھولنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ بھی کوشش کروں گا کہ اس اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے عزت مآب وزیر تعلیم کو بذات خود یہاں مدعو کیا جائے۔"

زمیندار صاحب خوش خوش میری جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے تشریف لے گئے۔

(باقی صفحہ ... پر)

مولانا ابوالکلام آزاد
"ایک جائزہ"

تجمل اشرف
بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ
صدر معلم
اندرا گاندھی گرلس اردو اسکول
پربھنی

ت نے مولانا ابوالکلام آزاد کے روپ میں ہمارے ملک کو ایک انمول رتن عطا کیا تھا ان کی ت ایک تراشا ہوا ہیرا تھی وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ مایہ ناز عالم دین' بلند پایہ قرآن' بے مثل ادیب' شعلہ بیان خطیب' قابل فخر صحافی' اور عظیم المرتبت مفکر ہونے کے ھ ساتھ وہ عظیم محب وطن اور مجاہدین آزادی کے کاروان کے سالار بھی تھے۔

مولانا آزاد ایک جامع ذہن و شخصیت کے مالک تھے۔ اور عہد حاضر کی نئی نسلیں عمل کے کتنے ہی سبق مولانا کے علم و اخلاق سے سیکھ سکتی ہیں۔ ہندوستان پر اسلامی تہذیب ے اثرات کا ایک مجسم نمونہ مولانا آزاد کی ذات تھی۔ جن کی صفات اس کی زندگی ہی میں افسانہ بن چکی ں۔ اور آج ضرورت ہے کہ اس افسانے کی حقیقت کا ادراک اور اعتراف کیا جائے۔ مولانا آزا ابلتی ورانہ و قائدانہ خدمات کا قرض ابھی آزاد ہندوستان کو ادا کرنا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے بالکل سچ کہا ہے کہ "اس صدی کے شروع میں ہندوستان کے مسلمانو ب غفلت سے جگانے اور ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کے لئے تین آواز ہوئیں۔ ایک اقبال کی بانگ درا' ایک محمد علی کا نعرہ تکبیر' اور ایک ابوالکلام آزاد کا رجز' ممکن لفظوں کے پرستاروں کو ان تینوں کے پیغاموں میں فرق معلوم ہوتا ہو مگر معنی کے محرم تینو یان سے ایک ہی بات سنتے اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دین کی تجلی سے دنیا کا دروازہ کھولو اور اسلام کے اسم اعظم سے آفاق کو تسخیر کرو۔"

مولانا آزاد ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جن کے کارنامے صدیوں تک فراموش میں کئے جا سکتے بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ان کی گوناگوں صفات زیادہ سے زیادہ واضح اور روشن ہوتی جائیں گی۔ مولانا آزاد ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے دار و گیر سے خاص طور سے متاثر ہوا تھا۔ ان کے والد حضرت مولانا خیر الدین

قادری نقشبندی سلسلہ کے صوفی بزرگ تھے۔ دہلی چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس طرح یہ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اور علم و فضل کی بہترین روایات انکی ماں اور باپ دونوں سے وراثت میں ملی تھیں۔ مذہب اسلام کے اصولوں اور قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ نے مولانا کے نقطہ نظر میں وسعت اور جامعیت پیدا کر دی یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی سیاست میں فراخدلی اور مذہبی رواداری کے عناصر ملتے ہیں۔

مولانا جب سیاست میں داخل ہوئے اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو جداگانہ کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کیمپ سر سید احمد خاں کا تھا دوسرا کیمپ علماء کا۔ سر سید احمد خاں کا کیمپ عملی حیثیت سے ایسے وفاداروں کا کیمپ بنایا جا رہا تھا جو برطانوی حکومت کی مدد کرنا چاہتا تھا دوسرا کیمپ جو برطانوی حکومت کے خلاف تھا اور قومی جنگ میں شریک ہونا چاہتا تھا اپنا الگ راستہ تلاش کر رہا تھا اور رہنمائی کا طلب گار تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا آزاد نے مشہور اخبار "الہلال" جاری کیا۔ انھوں نے اپنے قلم سے کبھی تلوار کا کام لیا اور کبھی نشتر کا۔ کبھی تلواریں پھول کھلائے ہیں اور کبھی شاخ گل پر دھار رکھی ہے۔ "الہلال" کے ابتدائی دور میں مولانا آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ لکھتے ہیں۔

"آہ کاش مجھے وہ صور قیام قیامت ملتا جسکو لے کر پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگان خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیوں کہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ دنیا کو دیکھتے ہو اس کی نہیں سنتے جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔"

مولانا آزاد کی زندگی طوفانوں کی زندگی تھی۔ ایک ایک لمحہ حیات کبھی شرارہ اور کبھی سیلاب بنا رہا۔ اس طوفان و ہیجان کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو "الہلال" اور "البلاغ" دیکھئے قلم سے جہاد کیسے ہو سکتا ہے مولانا آزاد نے کر دکھایا ہے۔

عصر حاضر میں مہاتما گاندھی جی نے اور پھر مولانا آزاد، پنڈت نہرو نے گہرے تہذیبی و کلچرل مسائل پر غور و فکر کیا۔ ان تینوں کے مزاج اور فکر و نظر میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔

ہندوستانی کلچر کے نظریہ کے فروغ میں مولانا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مولانا آزاد ہندو کلچر اور مسلم کلچر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ متحدہ ہندوستانی کلچر کے قائل تھے اور ایک آفاقی کلچر کی سمت دیکھتے تھے۔ دراصل مذہب اسلام کے اصولوں اور قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ نے مولانا آزاد کے نقطہ نظر میں وسعت اور جامعیت پیدا کردی اور میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد کی نظر ہمیشہ قرآن مجید کی ان تعلیمات پر مرکوز رہی جہاں پر اللہ تعالیٰ نے عالمی رواداری اور باہمی یگانگت پر زور دیا ہے۔

مولانا آزاد خود بھی تمام عمر ہندوستانی کلچر کی وحدت میں کثرت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے اپنے لباس اور وضع قطع میں مخصوص طرز کے حامل رہے اکثر و بیشتر تنگ نظروں نے ان پر اس بارے میں تنقید کرنے کی کوشش کی۔ شاید اپنے مخصوص طرز زندگی سے وہ تنگ نظر ساتھیوں کو یہ دکھلانا چاہتے تھے کہ اپنی انفرادیت کھو دینا قومیت کے لئے ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

مولانا آزاد مذہب، سیاست، ادب، رسم و رواج ہر میدان میں اجتہاد کے قائل تھے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا۔ تاریک راتوں میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں امام الہند کہتے تھے مگر عرشِ ملسیانی مرحوم ان کو امام انسانیت کہتے تھے۔

مولانا آزاد نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں انسانیت، محبت اور رواداری کا درس دیا ہے۔ آزادی ہند کی خاطر اور پھر آزاد ہندوستان کی تعمیر کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا وہ اپنے ہی اس شعر کی زندہ تصویر تھے۔

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی مرے جسم زار میں
اک جان ہے سو وہ بھی نہیں اختیار میں

مصطفیٰ اسحاق
ریٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن

توارث ماحول اور تعلیم

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کالج میں انگلش کی لکچرار ہیں اور ان کے شوہر ایک محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان کی شادی ہوئے ۲۲ برس ہو گئے، تین لڑکے ہیں لیکن میاں بیوی ایک دوسرے سے ناراض اور شاکی ہیں۔ ایک دوسرے کی شکایت کرنے میں دونوں ہی ایک سے بڑھکر ایک ہیں۔ ان صاحبہ نے کہا دیکھئے بھائی! میرا بڑا لڑکا بہت نیک فطرت اور خاموش طبیعت کا ہے۔ بی۔ ای کے فائنل میں پڑھتا ہے۔ ہمارے جھگڑوں سے تنگ آکر اب چند مہینوں سے کسی رشتہ دار کے ہاں جاکر رہ گیا ہے۔ سب سے چھوٹا مجھے بہت چاہتا ہے اور میں بھی اس کو عزیز رکھتی ہوں لیکن دوسرا نمبر بڑا ضدی، پڑھنے لکھنے میں اڑیل اور غصیلا ہے، میں نے مذاقاً کہا — "تم عزیز باپ کے جیسا ایک تو نکلنا چاہیئے تھا" اس پر وہ خاتون مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ ۲۲ برس بعد بھی میاں بیوی میں ان بن کیوں ہے۔ یہاں کسی ماہر تعلیم کی بات یاد آتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میاں بیوی دونوں کئی برس ساتھ ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔ دونوں ایکدوسرے کیلئے اجنبی رہتے ہیں۔ ان کا حال کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دو معصوم بچے اندھیرے میں سہمے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں

آپ اب بہت غصے میں ہیں۔ سامنے والے سے کہہ رہے ہیں "تجھ جیسا دنیا میں نہ ہوگا" تیرے جیسا دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا"۔ بات تو غصہ کی ہے لیکن آپ نے اپنی زبان سے فطرت کی ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ سچ مچ اسوقت روئے زمین پر نہ تو آپ جیسا اور نہ اس جیسا کوئی اور موجود ہی نہیں ہے۔ باوجودیکہ نقشہ ایک سا ہونے، آپ کا ثانی کوئی نہیں۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ قدرت کا تجربہ ہی نہیں بلکہ ہر نمونہ نیا، نرالا اور بے مثل ہوتا ہے۔ ایک وقت جو نمونہ ڈھل چکا ہے پھر اس کا اعادہ نہیں ہوتا صورت شکل ہی میں نہیں، عادات واطوار، فطرت و مزاج میں منفرد ہوتا ہے۔

کسی گھر میں اگر چار یا پانچ بچے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ لڑکی ماں کی جیسی ہے، لڑکا باپ کا سا ہے۔ کوئی دادی کی طرف گیا ہے تو کوئی نانی کی طرف، کوئی دادا کی چال پہ آیا ہے تو کوئی نانا کی مسکین طبیعت پایا ہے۔ آخر ایسا کیوں؟

ماہر حیاتیات نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی اگر چالیس گنا ہو جائے تو اس تمام آبادی کے جنگل میں صرف دو افراد ایسے مل سکیں گے جن کے انگشت کے نشان یکساں ہوں گے۔

دو جڑواں بچے باوجود شکل و شباہت میں زبردست مماثلت رکھنے کے ان میں بھی ذہنی، جسمانی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان لامحدود اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی نشو و نما میں دو عناصر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو ہے توارث اور دوسرا ماحول

توارث وہ سب کچھ ہے جو بچہ بوقت پیدائش اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اسے راست ماں باپ کا عطیہ کہا جا سکتا ہے۔ توارث وہ تمام قوتوں اور امکانات کا مجموعہ ہوتا ہے جو بوقت استقرار حمل عضویہ میں موجود رہتا ہے۔ یا کسی عضویہ کا کل ساز و سامان ہی توارث ہے۔ ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ بچے کی جسمانی ذہنی صلاحیتیں، ناک نقشہ، رنگ روپ اور قد وغیرہ کا تعین سب اسی لمحہ ہو جاتا ہے جبکہ حمل قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کسی قسم کا اور اضافہ نہیں کیا جا سکتا

ایمرسن (Emerson) کا خیال ہے کہ توارث صرف ماں باپ کا ہی عطیہ نہیں بلکہ اسکے خون میں ہمارے قریبی اور بعیدی دور دور تک کے بزرگ شامل ہیں۔ "ہم ان تمام کا جن سے ہمارا تعلق رہا ہے ایک جزو ہیں"۔ توارث کا ایک طویل سلسلہ ہمارے آبا و اجداد سے ملا ہوا ہے ہمارے وجود کے لئے جن ہزاروں نسلوں نے کام کیا ہے ان کی جسمانی اور ذہنی خصوصیات بھی ہم کو ملی ہیں۔ ماں باپ کی ساری خصوصیات بچوں میں نہیں ملتیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم صرف ۲۰ پشتوں کے بزرگوں کا شمار کریں جنہوں نے ہماری انفرادیت میں حصہ لیا ہے تو ان کی تعداد دس لاکھ ہوگی اور اگر ہم پچاس پشتوں تک چلے جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ کروڑ سے بھی زیادہ ہو جائیگی۔ ابتدائے آفرینش سے ہم اندازہ کرنے سے قاصر ہیں اس لئے ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جو نمونہ ڈھل چکا ہے دوبارہ اس کا اعادہ ہونے نہیں پاتا۔

ماحول ان ہیجانات کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کی وجہ سے کسی ذی حیات میں اسکی قدرتی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ ہیجان (ISTIMULUS) ہر وہ قوت کا نام ہے جو ہماری شخصیت پر

کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی قوت ہم پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے ہم اپنے کام میں مشغول ہیں، گھڑی کی ٹِک ٹِک، بچے کے رونے کی آواز، چڑیا کے چہکنے کی آواز ہمارے کانوں میں آتی ہے لیکن ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہ سب ہمارے ماحول سے خارج ہے لیکن جب کوئی چیز میز سے گر جائے تو فوراً ہماری توجہ اس طرف جاتی ہے۔ یہ مہیج ہے۔ آب و ہوا، سردی، گرمی، غذا، لباس یہ سب ہمارے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم خیالات، مہارتیں سب ہی مہیجات کی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔

توارث کے اثرات : توارث کے سلسلے میں چند بنیادی باتیں عام ہیں۔ بچے ماں باپ جیسے ہوتے ہیں۔ انسان سے انسان کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور بلی سے بلی کے بچے پیدا ہوں گے۔ بلند قامت ماں باپ کے بچے بھی اونچے قد کے ہوں گے۔ پست قامت ماں باپ کے بچے بھی پست قد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عادات و اطوار اور ذہنی لحاظ سے توارث کا اثر دیکھنے میں آیا ہے۔ سر فرانسس گالٹن نے کئی ایک تحقیقات کی ہیں۔ اس نے بعد تحقیق بتلایا ہے کہ ۹۷۷ قابل اشخاص کے خاندانوں میں ۵۳۵ قابل رشتے دار پائے گئے۔ اسی طرح ۹۷۷ معمولی افراد کے خاندانوں میں صرف ۴ لائق افراد مل سکے۔ اچھے قابل گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں میں قابل بننے کے ۳۰۰ گنا زیادہ احتمال ہے۔ اسی طرح اخلاقی و معاشرتی خصوصیات کا تعلق توارث سے ہے یا ماحول سے، لیکن تعلیم و تربیت کا کتنا اثر ہوتا ہے، اس بحث میں گئے بغیر مندرجہ ذیل چند دلچسپ مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ توارث کے کتنے دور رس اثرات ہو سکتے ہیں۔

جیوکس کا خاندان Juke's Family :- مسٹر ڈک ڈیل نے ۱۸۷۷ء میں ایک خاندان جیوکس کی تحقیق کی۔ وہ ۱۷۲۰ء تا ۱۸۷۷ء تک تقریباً ڈیڑھ سو برس کے واقعات اور اعداد اس خاندان کے جمع کئے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ایک آوارہ مزاج شخص Max Jukes تھا۔ اس نے اپنی ہی جیسی ایک بدکار آوارہ عورت سے شادی کی۔ ۱۹۷۷ء تک اس کی پانچ نسلیں ہوئیں جن میں ۱۲ سو افراد کا پتہ چلا۔ ان میں ۳۱۰ بھکاری، ۷ قاتل، ۶۰ چور، ۵۰۰ حرام کاری میں مبتلا، ۱۳۰ مجرم، ۴۴۰ عیاشی اور اوباشی میں مبتلا ہو کر اپنی جسمانی حالت تباہ کر چکے تھے۔ ۳۰۰ کا زمانۂ شیر خوارگی میں انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ۲۰ ایسے تھے

جنہوں نے کچھ کاروباری پیشہ سیکھا تھا، اور ان میں کئی دس جیل میں کچھ ہنر سیکھنے والے تھے اس ناکارہ خاندان پر ریاست نیویارک کو دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم برداشت کرنی پڑی۔

ڈاکٹر گاڈرڈ نے خاندان کیلی کاکس (Kallikak family) کا مطالعہ کرکے دلچسپ نتائج پیش کئے ہیں۔ ۱۷۷۵ء میں ایک نوجوان شخص مارٹن کیلی کاکس، ۲۱ سالہ نوجوان انقلابی افواج میں شامل تھا۔ وہ کسی سرائے میں ایک ناقص العقل لڑکی سے ملوث ہوا۔ اس لڑکی کے بطن سے ایک ناقص العقل لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کی آل اولاد سے ۴۸۰ افراد کا پتہ ملا۔ ان میں ۳۶ ناجائز اولاد تھے، ۳۳ عیاش، ۲۴ شرابی، ۳ سزا یافتہ مجرم، ۸ قحبہ خانے چلانے والے، ۸۲ کا انتقال زمانہ شیر خوارگی میں ہو چکا تھا، ۱۴۳ ضعیف العقل اور ۳ مرگی کا شکار تھے۔

اسی نوجوان نے کچھ دنوں بعد ایک شریف گھرانے کی ذہین لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کے ۴۹۶ نام لیواؤں کا پتہ چلا جن میں سب کے سب قابل تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد گورنر، یونیورسٹی کے پروفیسر ادیب اور بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیئے کہ دوران حمل بعض مائیں اپنی ہونے والی اولاد پر اثر ڈالنے کے لئے سوچتی ہیں، بعض اونچے گھرانے کی عورتوں کا خیال ہے کہ دوران حمل پڑھنے لکھنے میں مشغول رہنے سے بچہ ذہین ہوگا، یا پھر خوبصورت تصویر دیکھتے رہنے سے لڑکی حسین ہوگی۔ یہ سب خیال خام ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بچہ کی حقیقی فطرت کا تعین اسی وقت ہو چکتا ہے جب کہ حمل قرار پاتا ہے۔ لیکن ہمیں ان باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آئندہ بہت کچھ بچوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں میں اعلیٰ خصوصیات پیدا کرنے کے مواقع ہیں۔ اگر مجرم لڑکا مجرم ہی ہوتا اور نیک شخص کا بیٹا نیک ہی نکلتا تو پھر ساری تعلیم و تربیت بیکار ہی سمجھی جاتی۔ مقام شکر ہے کہ طفل انسانی پیدائش کے وقت نہ تو نیک ہے نہ بد۔ اس کے والدین اور اس کا آئندہ ماحول اس کو ایک خاص طریقے پر تیار کرتا ہے۔

کل مولود یولد علی الاسلام۔

ہر بچے کی فطرت پیدائش کے وقت سلیم یا نیک ہوتی ہے۔ اوپر کی چند مثالوں سے واضح

ہو چکا ہوگا کہ ہر بچہ کچھ نہ کچھ طبعی استعداد یا ذہانت لے کر دنیا میں آتا ہے۔ متعدد طلباء کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینے کے باوجود ان کی لیاقت اور قابلیت میں بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ جنگ کی خاصیت ہے کیونکہ ماحول تو یکساں ہے اور نیم کا درخت خواہ بہشت میں بویا جائے مگر اس کی کڑواہٹ میں کمی نہ ہوگی۔" ہٹلر یا مصطفیٰ کمال کسی گمنام جزیرے میں پیدا ہوتے تو اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے ان وحشی قبائل میں بھی سرداری حاصل کر لیتے اور اپنی لیڈری اور جنگی صلاحیت کا ثبوت دیتے۔ تان سین کو اکبر کا دربار نہ ملتا تو شاید اس کو اتنی شہرت نصیب نہ ہوتی۔ بعض کا خیال ہے کہ بچے کی نشو ونما میں ماحول کا تین چوتھائی بلکہ ۹۰ فیصد حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ذہین بچے کو مناسب ماحول مل جائے تو وہ زمانے کا قابل شخص بن سکتا ہے اور ایسا ماحول نہ ملے تو وہ مرجھا کر اپنی جگہ رہ جاتا ہے۔ آج بھی بہت سے غریب طلباء ایسے ہیں جنھیں مواقع ملتے تو وہ بہت کچھ ترقی کر جاتے۔ سینکڑوں برس سے زمانہ اور سماج نے ان کے ساتھ سخت بے اعتنائی اور ناانصافی برتی جس کی وجہ سے وہ گوشۂ گمنامی میں رہ گئے۔ ؎

بہت سے گوہر شاہوار باقی رہ گئے ہونگے کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہونگے کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک اذفر کی

(طبا طبائی)

یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ توارث میں اب کچھ اضافہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن قدرت نے بچے کو صلاحیتیں دینے میں جو فیاضی دکھائی ہے، اس کو زرخیز ماحول کے ذریعہ ہم ممکنہ حد تک نشو ونما دے سکتے ہیں۔ بیج کتنا ہی اچھا ہو اگر مناسب زمین، کھاد، روشنی، پانی، ہوا نہ ملے تو اس کی ساری صلاحیت رائیگاں جائے گی۔ فرد، توارث، ماحول کا حاصل ضرب ہے نہ کہ توارث اور ماحول کا حاصل جمع۔ فرد کی مختلف صلاحیتوں کے نشو ونما کی اچھی مثال بائبل اور قرآن میں دی گئی ہے۔ آسمان سے بارش تو سب ہی زمین پر ہوئی، جہاں کی زمین زرخیز تھی وہاں کے پودے سرسبز و شاداب زوروں پر آگئے، کم زرخیز زمین پر نشو ونما اوسط رہی، لیکن وہ بنجر پتھریلی زمین میں سارے بیج جل کر رہ گئے۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ تعلیم وہ بارانِ رحمت ہے جو ساری جماعت کے طلباء پر یکساں برستی ہے۔ کچھ طلبا بہت تیز ہوتے ہیں کچھ اوسط اور کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔

تعلیم کی اہمیت : ۱۔ غریب گھروں میں بہتر ماحول نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اس لئے اسکول ہی ایسا مقام ہے جہاں پر بہت اچھا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ ہر بچہ اپنی ذاتی قابلیت کے مطابق سیکھ سکے اور ترقی کر سکے۔ بہت سے غریب گھرانے ایسے ہیں جہاں بچے کوئی اخبار رسالہ یا کتاب برسوں میں بھی نہیں دیکھ پاتے، لیکن اسکول کی لائبریری، ریڈنگ روم، چارٹس کے ذریعے بہت ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح غیر نصابی مصروفیات سے دوسرے طلباء کے ساتھ مل جل کر لڑکا بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ گھرانے کے اور ذہین طلباء کیلئے الگ اسکول قائم نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں اچھے معیاری اسکول اور غیر معیاری اسکول الگ الگ ہوتے جا رہے ہیں جو جمہوری مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے اثرات بہت پیچیدہ اور دور رس ہیں جس کا معاشرہ کو اندازہ نہیں ہے۔

۲۔ انفرادی توارث کے علاوہ اجتماعی توارث بھی پایا جاتا ہے جس کو Social Heritage کہتے ہیں۔ ہماری کئی نسلوں نے ہمیں فنون لطیفہ، ادب، عمارات، تاریخ قانون، روایات، رسم و رواج مذہب و ثقافت کی شکل میں اجتماعی توارث دیا ہے۔ مشہور عمارہ قلعے، مندر، مسجد، ہمارے آباؤ اجداد کی شان و شوکت کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی ماحول میں دریا، پہاڑ، وادیاں، جنگل، جانور وغیرہ شامل ہیں۔ میوزیم اجتماعی توارث کا خزانہ ہوتے ہیں۔ نمائش، آرٹ گیلری لائبریری وغیرہ ایک نسل سے دوسری نسل کے تسلسل کا بہترین ذریعہ بلکہ ورثہ ہیں۔ اس سماجی توارث سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انھیں ان تمام ورثے سے سیر و تفریح، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ واقف کروانا ضروری ہے۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی لیکن تعلیم کے دوران سب بچوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے، کسی کو ہرگز نکما اور بے کام کا نہ سمجھا جائے، اس کی ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دی جائے۔ تعلیم کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر سیکھنے اور سمجھنے کے بعد شخصیت میں تغیر آتا جائے گا اور ترقی کرتی جائیگی جتنا ماحول زرخیز ہوگا، شخصیت کی نشو و نما بھی اسی انداز سے ہوگی۔

گھر پر والدین ہوں یا اساتذہ، اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ تعلیم کے دوران بچوں کو سزا دینے کا طریقہ، ڈانٹ ڈپٹ نہایت نقصان دہ ہے، تعلیم کا عین مقصد ہی اس سلوک سے فوت ہو جاتا ہے۔

۴ - اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے وقت عام طور پر لوگ عہدہ، معیار اور دولت دیکھتے ہیں۔ دیکھنے اور پرکھنے کی چیز اس گھر کا ماحول تعلیم و تربیت، قابلیت و صلاحیت ہوتی ہے اس لئے شادی کے وقت لڑکے یا لڑکی کی صحت جسمانی، تعلیمی معیار، سلیقہ اور صلاحیت اور مزاج کا میلان دیکھنا چاہیئے تاکہ ان کی آئندہ نسل اچھی ہو پھلے پھولے اور ترقی کرے۔

(ماخوذ "شہابنامہ")　۴:

کوئی ہفتہ بھر بعد اسی علاقے کے ایک اور بڑے زمیندار ملنے آئے۔ چھوٹتے ہی انہوں نے روہانسا ہو کر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ "جناب میں نے کیا قصور کیا ہے کہ مجھے اس قدر کڑی سزا دی جا رہی ہے؟ بندہ بالکل بے گناہ ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اس شکوے کی وضاحت طلب کی کہ ان کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے اور کون یہ ظلم کر رہا ہے؟ انہوں نے گلوگیر آواز میں تفصیل سنائی پچھلے ہفتے سکول کے بارے میں جو شخص ملنے آیا تھا وہ یہ سکول اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ میرے گاؤں میں کھلوا رہا ہے۔ ہمارے درمیان پشتوں سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے مویشی چرا لاتے تھے، کبھی ایک دوسرے کے مزارعوں کو قتل کرا دیتے تھے، کبھی ایک دوسرے کی فصلیں اجاڑ دیتے تھے۔ لیکن اب وہ کمینہ میرے گاؤں کی نسلیں برباد کرنے پر اتر آیا ہے اسی لئے آپ سے سکول کھولنے کا وعدہ لے کر گیا ہے۔"

فروغ تعلیم کے فضائل پر یہ نرالی منطق سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے گزارش کی۔ "آپ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے کیوں نہیں دیتے؟ جو پیشکش انہوں نے کی ہے۔ اگر وہی بار آپ بھی اٹھا لیں۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کے گاؤں میں بھی بیک وقت ویسا ہی سکول قائم کر دیا جائے گا۔"

یہ سن کر ان کی کسی قدر تشفی تو ہوئی لیکن اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی اپنی فیاضی کی پیشکش لے کر دوبارہ میرے پاس نہ آیا۔ کچھ عرصے میں نے یہ واقعہ مسٹر یوسف صاحب کو سنایا تو وہ مسکرا کے بولے۔ "حیران ہونے کی بات نہیں تعلیم جیسی خطرناک وبا کو اپنے اپنے گاؤں سے دور رکھنے کے لئے دونوں نے اسے اپنا مشترکہ فرض سمجھ کر گٹھ جوڑ کر لیا ہوگا۔ بڑی زمینداریوں اور جاگیروں میں ابھی تک تعلیم ہی کو سب سے بڑا اور تباہ کن دشمن سمجھا جاتا ہے۔"

پروفیسر کبیر رحمانی

نئی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں

نئی تعلیمی پالیسی پر گزشتہ ڈیڑھ برس سے پورے ملک میں بحث و مباحثہ ہو رہا ہے لیکن اب تک مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کی طرف سے کوئی خاص ردِ عمل سامنے نہیں آیا ہے نئی پالیسی کس حد تک ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کیلئے مفید ہے۔ کیا اس میں مسلمانوں کو بھی تعلیمی لحاظ سے دوسری ترقی یافتہ اقوام کے برابر لانے کیلئے ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا یا نہیں؟ کیا ان کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کیلئے حکومت نے کچھ مراعات دیں یا نہیں؟ ان کی مادری زبان اردو کے ساتھ انصاف کیا گیا یا نہیں؟ اور آئین ہند نے اقلیتوں کو جو تعلیمی ثقافتی اور مذہبی حقوق دئیے ہیں ان کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا گیا یا نہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر تبادلۂ خیال اور سنجیدگی سے غور و فکر کرنا بے حد ضروری ہے۔ اقلیتوں کے نقطۂ نظر سے نئی قومی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لے کر اس کی خامیوں کا پتہ لگا کر پالیسی کے نفاذ سے پہلے ہی انہیں دور کرنے کیلئے اجتماعی طور پر کوشش کرنا چاہیئے مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس نئی تعلیمی پالیسی سے بڑی حد تک ناواقف ہے۔ بہت سی تنظیموں نے بھی اس کی اہمیت کو نہیں جانا ہے۔

پس منظر: نئی تعلیمی پالیسی یہ پہلی قومی سطح کی پالیسی نہیں ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۶۸ء میں ہندوستانی ماحول اور قومی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق کوٹھاری کمیشن نے قومی سطح پر تعلیمی پالیسی مرتب کی تھی۔ یہ پہلی پالیسی تھی جس نے انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے جوئے کو اتار پھینکا تھا۔ بدقسمتی سے اس پالیسی کے مقاصد کے حصول میں ہماری حکومت بری طرح ناکام ہوئی۔ اس پالیسی کے مقاصد میں قومی یک جہتی کو فروغ دینا اور سوشلسٹ طرز کے معاشرے کا قیام شامل تھا۔ کوٹھاری کمیشن کی سفارشات پر صدق دل کے ساتھ عمل نہ ہو سکا۔ چند ہی ریاستوں میں موثر طریقے سے عمل آوری ہوئی لیکن کہیں بھی قومی یکجہتی کو استحکام نصیب

نہ ہوا۔ گزشتہ دہائی میں تو علاقہ پرستی، لسانی تنازعات فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی منافرت بنیاد پرستی (Fundamentalism) اور تشدد کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا جس کی وجہ سے ملک کی سالمیت اور قومی اتحاد کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ ان باتوں کے علاوہ اخلاقی قدروں میں گراوٹ، بدعنوانیاں، رشوت کا عام چلن، ذات پات کی تفریق میں روزافزوں اضافہ، قدیم رواجوں (جیسے رسم ستی وغیرہ) کا احیاء غربت اور بے روزگاری جیسے مسائل نے تشویشناک صورتحال پیدا کردی۔ حالیہ چند برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جس تیزی سے ترقی ہوئی ہے اس نے بھی نظام تعلیم اور اس کے پورے ڈھانچے کو ایک "چنوتی" (چیلنج) دی ہے چنانچہ اس تناظر میں پورے تعلیمی نظام کا ازسرنو جائزہ لینے اور حال و مستقبل کے چیالنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ عام آدمی سے لیکر دانشور تک موجودہ نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے ایوان حکومت میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگی تھی چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نے قوم کے نام اپنے نشری پیغام میں قومی تقاضوں اور سائنس اور ٹکنالوجی کے چیلنج کے پیش نظر ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کا اعلان کیا۔

جولائی ۱۹۸۵ء میں مرکزی وزارت تعلیم نے "تعلیم کی چنوتی" Challenge to Education کے نام سے ایک دستاویز شائع کی جس میں اس بات کا اقرار کیا گیا کہ ملک کو درپیش داخلی اور خارجی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کا سب سے موثر ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ دستاویز کے باب (I) میں کہا گیا ہے کہ :

"........ ملک اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑا ہے جو بچے اب پیدا ہونگے اپنی ابتدائی اسکول کی تعلیم اس صدی کے آخر تک حاصل کرتے رہیں گے۔ ظاہر ہیکہ جو بچے مستقبل کے چیالنج اور زمانے کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں گے وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہوں گے جو انہیں ایسے مواقع فراہم کرے گی جسکی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی......

ملک داخلی اور خارجی چیلنجوں کا جس قدر کامیابی کے ساتھ سامنا کرے گا اسی پر مستقبل کے شہریوں کی زندگی کی کوالٹی کا تعین ہوگا۔ تعلیم ہی ان چیلنجوں کا

مقابلہ کرنے کیلئے سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ صرف تعلیم قومی تعمیر
کیلئے لوگوں کو ضروری علم، منصوبہ بندی کا احساس، مقصدیت اور خود اعتمادی
عطا کر سکتی ہے۔ اگر تعلیم کی توسیع کیلئے موزوں اقدامات نہیں کئے گئے تو
اقتصادی ناہمواری، علاقائی عدم توازن اور سماجی ناانصافی مزید بڑھ جائے گی
جسکے نتیجے میں انتشار اور تناؤ پیدا ہونگے۔" (ص ۷ اور ۹)

اس طرح یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ ملک کے موجودہ بگاڑ اور خرابیوں کو دور کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ کوٹھاری کمیشن نے بھی تعلیم کو پُر امن سماجی تبدیلی کا واحد وسیلہ بتایا تھا۔ اب تک تعلیم کو غیر افادی اور غیر پیداواری سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن اب تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کیا گیا اور یہ مان لیا گیا کہ تعلیم ملک کی ترقی میں سرمایہ کاری ہے تعلیم میں سرمایہ لگانا وقت اور دولت کا ضیاع نہیں بلکہ قوم اور معاشرے کیلئے نہایت فائدہ مند ہے۔ اس تصور کی وجہ سے آج ہماری حکومت نے تعلیم میں سرمایہ کاری کا فیصد ۳ ½ سے بڑھا کر ۶ کر دیا ہے (۲۰ سال پہلے کوٹھاری کمیشن نے اس کی مانگ کی تھی)

تعلیم کی چنوتی سے یہ تعلیمی دستاویز ۷۷ صفحات اور ۴ ابواب پر مشتمل تھی۔ اس میں ملک کی موجودہ تعلیمی صورتحال کا نہایت صاف گوئی سے جائزہ لینے کے ساتھ اسکی خامیوں اور کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان خامیوں کو دور کرنے کیلئے مستقبل میں کئے جانے والے اقدامات کی نشاندہی بھی کی گئی تھی اس دستاویز کی اشاعت کا مقصد موجودہ نظام تعلیم کی تحدیدات و مشکلات کے پیش نظر ایک حقیقت پسندانہ پالیسی مرتب کرنا بھی تھا۔ غرض یہ دستاویز حکومت کی ناکامیوں کا ایک مرقع تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت نے اپنی ناکامیوں کا کھل کر اعتراف کیا تھا۔ تقریباً ایک سال اس دستاویز پر ملک گیر بحث ہوتی رہی۔ اخبارات ریڈیو اور دوردرشن پر مذاکرات ہوئے۔ مختلف تعلیمی و سماجی تنظیموں اور انجمنوں نے اسے سیمینار اور سمپوزیم کا موضوع بنایا اور اپنی آراء سے حکومت کو آگاہ کیا۔ ہر ریاست نے بھی دستاویز سے متعلق اپنی تجاویز اور رپورٹ مرکزی وزارت تعلیم کو بھیجی۔

ریاست مہاراشٹر جو تعلیم کے معاملے میں متحرک اور بیدار اور مشہور ہے۔ یہاں حکومت نے لوگوں کی رائے جاننے کیلئے سابق وزیر تعلیم مدھوکر راؤ چودھری کی زیر قیادت ایک کمیٹی تشکیل دی۔

اس کمیٹی نے مختلف مقامات پر اجلاس کرکے دانشوروں، سماجی ورکروں، ماہرین تعلیم، اساتذہ کی انجمنوں اور دیگر رضاکار سماجی و تعلیمی انجمنوں سے صلاح و مشورہ کیا اور ان کی پیشکردہ آراء و تجاویز کی روشنی میں مجوزہ تعلیمی پالیسی سے متعلق رپورٹ مرتب کی گئی۔ شائد دوسری ریاستوں میں بھی اس پر عمل کیا گیا ہو لیکن کہیں سے یہ خبر پڑھنے کو ملی اور نہ سننے کو کہ ریاستی حکومتوں نے قومی سطح پر تشکیل دی جانے والی پالیسی کے تعلق سے اقلیتوں یا ان کے نمائندوں اور تنظیموں سے بھی تبادلۂ خیال کیا ہو اور ان کی رائے جاننے کیلئے کوشش کی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا اس سے بڑھکر افسوسناک و تعجب خیز بات یہ ہیکہ اس تعلیمی دستاویز میں اقلیتوں اور اردو زبان کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا گیا۔

اس دستاویز میں ملک کی پسماندہ ذاتوں اور قبائل کو نیز کمزور طبقات کی تعلیمی و سماجی فلاح کیلئے مزید سہولتیں اور مراعات دینے کی تجویز کی گئی تھی لیکن ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی کا جائزہ لیا گیا نہ انہیں دور کرنے کیلئے کوئی تجویز پیش کی گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس ملک میں اقلیتوں کا کوئی وجود نہیں اس کے نتیجے میں اقلیتوں میں حکومت کے تئیں ناراضگی پھیلنے لگی اور ان کے دلوں میں یہ خوف و اندیشہ جڑ پکڑنے لگا کہ کہیں قومی نظام تعلیم اور قومی نصاب کی آڑ میں ان سے وہ تعلیمی ثقافتی و مذہبی حقوق ساقط یا غیر موثر نہ کر دیئے جائیں جو آئین ہند کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے تحت دیئے گئے ہیں اور جن کے تحفظ کی ضمانت بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ راقم الحروف اور بعض مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ مقام شکر ہیکہ حکومت نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے احساسات ضروریات اور مسائل کو سمجھا اور وعدہ کیا کہ وہ اقلیتوں کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کی تعلیمی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی چنانچہ ۸ رمئی ۱۹۸۶ء کو لوک سبھا نے اور ۱۳ رمئی ۱۹۸۶ء کو راجیہ سبھا نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کا جو مسودہ منظور کیا اس کی دفعہ 4—8 میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ

some minority groups are educationally deprived or backward Greater attention will be paid to the Education of these

Groups in the interests of Equality and Social Justice. This will be naturally include the constitutional guarantee given to them to Establish and administer their own Educational Institutions and protection to their languages and culture."

یعنی بعض اقلیتی جماعتیں تعلیمی اعتبار سے محروم اور پسماندہ ہیں۔ مساوات اور سماجی انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان اقلیتی جماعتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ ایسا کرتے وقت آئین ہند کا خاموش کا لحاظ رکھا جائے جس کے تحت اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی آزادی اور ان کی زبان و ثقافت کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔"

اس صریح اعلان سے اقلیتوں کے اندیشے بڑی حد تک دور ہو گئے۔

عملی پروگرام: اب تک یہ ہوتا رہا کہ پالیسیاں بنتی رہیں لیکن ان کا موثر طور پر نفاذ نہ ہوا نہ ان کے نفاذ کی راہ میں درپیش دشواریوں کو دور کرنے پر توجہ دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پالیسیاں منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے ناکام ہوگئیں۔ اس کی بین مثال ۱۹۶۸ء کی قومی تعلیمی پالیسی ہے۔ ماضی کے تلخ تجربے سے درس لیتے ہوئے ہماری حکومت نے اس بار صرف پالیسی بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی موثر عمل آوری کیلئے باقاعدہ عملی پروگرام مرتب کرکے پارلیمنٹ سے اس کی منظوری بھی حاصل کرلی چنانچہ عملی پروگرام کی دستاویز میں ان تمام اقدامات کی صراحت کردی گئی ہے جو نئی تعلیمی پالیسی کی تکمیل کیلئے ضروری ہے۔

اس "عملی پروگرام کا چودھواں باب" اقلیتوں کی تعلیم" کیلئے وقف ہے۔ یہ باب آئین ہند کی دفعات ۲۹، ۳۰، اور ۳۵۰ (الف) کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ حکومت نے پہلی بار یہ اعتراف کیا ہے کہ ان دفعات کے تحت اقلیتوں کو جو تعلیمی و ثقافتی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے اس پر عمل آوری میں ناہمواری رہی ہے۔ وزارت داخلہ نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ قومی سطح پر مسلمان اور نوبودھ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔

Ministry of Home Affairs have identified Muslims and Neo Buddhists as Educationally Backward at National Level (page: 116)

وزارتِ داخلہ نے اقلیتی جماعتوں (مسلمانوں) کی تعلیمی پسماندگی کی "شناخت" کا فیصلہ کافی تاخیر سے کیا۔ اب مسلمانوں کی پسماندگی اس حالت پر پہنچ گئی ہے کہ احمد آباد کے ایک تحقیقاتی ادارے کی رپورٹ کے مطابق وہ ملک کے معروف پسماندہ طبقات (Backward classes) سے بھی زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں اس لئے عملی پروگرام میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کو بقیہ سماج کے برابر لانے کیلئے خصوصی اقدامات پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے تاکہ وہ قومی ترقیاتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

(الف) ۸۷-۱۹۸۶ء کیلئے پروگرام: حکومت نے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کیلئے مرحلہ وار پروگرام بنایا اس منصوبے کے تحت محکمۂ تعلیم اقلیتوں کی بہبود کیلئے ۸۷-۸۶ء میں مندرجہ پروگرام عمل میں لائے گا۔

(۱) جن علاقوں میں اقلیتوں کی بڑی تعداد آباد ہے وہاں دس کمیونٹی پالی ٹیکنیکوں کے ذریعے ٹیکنیکل مہارت بہم پہنچانا۔

(۲) قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے نصابی کتابوں کا جائزہ لینا فی الحال NCERT نے نصابی کتابوں کا جائزہ لینے کا کام شروع کردیا ہے۔

(۳) اقلیت کے تعلیمی اداروں کے منتظمین، پرنسپل حضرات اور اساتذہ کو نئی تعلیمی پالیسی سے واقف کرائیے اور ان کے زاویۂ نگاہ کو نیا رخ دینے والے تربیتی پروگراموں کو این سی آر ٹی (نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، دہلی) بتدریج عمل میں لائے گی۔

(۴) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) وہ اسکیم جس کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں کو امداد دی جاتی ہے تاکہ وہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کے طلبہ کو مقابلے کے امتحانوں (Competitive Exams) کیلئے تیار کریں آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کے طلبہ اعلیٰ عہدوں پر اور مناصب کیلئے منعقد ہونے والے مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہو سکیں اور اس طرح ان کے دلوں سے احساسِ محرومی د

(ب) ساتویں منصوبے کے بقیہ سالوں (۸۸-۱۹۸۷ اور ۹۰-۱۹۸۹ء) کے دوران عمل میں لائے جانیوالے پروگرام

۸۷-۱۹۸۶ء کیلئے جو پروگرام متعین کیا گیا ہے وہ آئندہ بھی ساتویں پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک جاری رہے گا۔ این سی آر ٹی، وزارت سماجی فلاح و بہبود اور محکمۂ تعلیم نے علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کشمیر، عثمانیہ اور مرٹھواڑہ یونیورسیٹیوں کے وائس چانسلروں سے ریسورس سنٹر Resource Centre قائم کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا ہے۔ یہ تربیتی مراکز اپنے اپنے حلقوں کے اقلیتی تعلیمی اداروں کی تربیت اور رہنمائی کریں گے۔ ان تربیتی مراکز تک کے قیام کی اسکیم ابھی وزارت تعلیم کے زیر غور ہے اور اس مقصد کیلئے ۶۵ لاکھ روپے کی مانگ کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ساتویں پلان ہی کے دوران اقلیتوں کی آبادی والے علاقوں میں مزید ۵ کمیونٹی پالی ٹیکنک قائم کئے جائیں گے۔

(ج) طویل میعاد پروگرام ابتدائی طفولیت اور روایتی درسگاہوں کی تعلیم

عملی پروگرام تین روایتی طرز تعلیم کی درسگاہوں یعنی ہمارے دینی مدارس کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے، اسکیم یہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں سائنس، میتھس اور انگریزی رضاکارانہ طور پر پڑھانے کی کوشش کی جائے گی اس کے علاوہ مذکورہ تعلیمی اداروں اور ان علاقوں میں جہاں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی کثیر آبادی ہے ابتدائی طفولیت کے تعلیمی مراکز قائم کئے جائیں گے۔

ابتدائی طفولیت کی نگہداشت اور تعلیم بڑا مفید پروگرام ہے۔ اس کے تحت بچوں کی صحت اور غذا کا خاص خیال رکھا جائے گا اور ان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور جذباتی نشو و نما کیلئے وسائل مہیا کئے جائیں گے۔ اب تک اقلیتوں کے بچے اس مفید پروگرام سے محروم رہے ہیں۔ تغذیہ بخش غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھی ہمارے بچے ذہنی اعتبار سے کمزور ہیں۔

"عملی پروگرام" میں مزید کہا گیا ہے کہ مذکورہ روایتی درسگاہوں میں سماجی اعتبار سے مفید اور پیداواری کاموں کا بھی اجراء کیا جائے گا۔ اس مقصد کیلئے محکمۂ تعلیم ایک مرکزی امدادی اسکیم تیار کرے گا۔

پرائمری تعلیم : پرائمری تعلیم سے متعلق "عملی پروگرام" میں کہا گیا ہے کہ

(۱) اقلیتوں کی تعلیمی سہولتوں کے بارے میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو جن اعداد و شمار کی ضرورت رہتی ہے ان کی فراہمی کا مستقل انتظام ہوگا۔ یہ کام ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

(۲) لسانی اقلیتوں کے اساتذہ کی جائیدادوں (POSTS) کی منظوری اور ان کے تقرر کرنے میں جو تاخیر ہوتی ہے اسے دور کرنے کیلئے ریاستی حکومتیں یہ اختیارات ضلع کلکٹر کو تفویض کریں گی۔

(۳) اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں کی دستیابی اور ان زبانوں میں نصابی کتابوں کی طباعت کے انتظام کا جائزہ لے کر ضروری اقدامات کرنے کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر ہوگی۔

(۴) اقلیتی زبانوں کے اساتذہ کیلئے ٹریننگ کی سہولتوں کا جائزہ لے کر جہاں ضرورت ہو وہاں ان سہولتوں میں اضافہ کرنے کی ذمہ داری بھی ریاستی حکومتوں پر ہوگی۔

(۵) اقلیتی پرائمری اسکولوں کے نصابی وقت کا ۱۵ فیصد مقامی حرفتوں اور ہنروں پر صرف کیا جائے گا ــــ اہل حرفہ اور کھیت مزدوروں کے بچوں کیلئے شام کی کلاسیں شروع کی جائیں گی۔

- مڈل اور اعلیٰ ثانوی تعلیم اقلیتوں کی متوسط اور اعلےٰ ثانوی تعلیم کے بارے میں عملی پروگرام" میں مندرجہ ذیل اسکیمیں تجویز کی گئی ہیں۔

(۱) ریاستی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت S-C-E-R-T ' تربیتی مراکز (RESOURCE CENTRES) اور پیشہ وارانہ رہنمائی کے ریاستی ادارے اقلیتی تعلیمی اداروں کے اساتذہ کیلئے دوران ملازمت سائینس، ریاضی، سماجی علوم (سوشل سائنسیں) انگریزی اور کیریر (CAREER GUIDANCE) جیسے اہم مضامین میں ٹریننگ دیں گے فی الحال این سی ای آر ٹی کے پاس اس قسم کی ٹریننگ کی اسکیم ہے لیکن آئندہ ہر ریاست میں اساتذہ کی ٹریننگ کی اسکیم پر عمل کیا جائے گا اور یہ کام ایس سی ای آر ٹی انجام دیں گی۔

(۲) ایس سی ای آر ٹی کے ذریعے اقلیتی تعلیمی اداروں کے منیجروں اور پرنسپل حضرات کو جدید تعلیمی طریقوں سے باخبر رکھنے کیلئے تربیتی کورس کا انتظام کیا جائے گا - یہ کام بھی قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت چھوٹے پیمانے پر کر رہی ہے۔

(۳) اقلیتی تعلیمی اداروں میں قومی یکجہتی کی خاطر اور سہ لسانی فارمولے کے تحت علاقائی زبان کے استادوں کا تقرر کیا جائے گا یہ کام ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

۶) اقلیتی اداروں میں طلبہ کی کمزوریاں کو دور کرنے کیلئے کوچنگ یا خصوصی تدریس کا انتظام۔ یہ ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

۷) کمپیوٹر سے ابتدائی آگاہی کی جو اسکیم ہے اس میں اقلیتی تعلیمی اداروں کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے گی۔

ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیم : عملی پروگرام میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی معاشی حالت کو سدھارنے اور انہیں خود مکتفی بنانے کیلئے پیشہ وارانہ اور ٹیکنیکل تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کی اسکیم پیش کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت :

۱) اقلیتوں کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں ووکیشنل کورسز جاری کئے جائیں گے۔

۲) اس بات کا اطمینان کیا جائے گا کہ پالیسی میں مندرج ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیمی پروگراموں سے اقلیتی تعلیمی ادارے پوری طرح مستفید ہوں

۳) ان علاقوں میں جہاں اہلِ حرفہ اور کاریگر اقلیتوں کی کثیر آبادی ہے وہاں کرافٹ ٹریننگ انسٹیٹیوٹ قائم کئے جائیں گے جن میں ۸۰ فیصد نشستیں اہلِ حرفہ یا کاریگروں کے بچوں کیلئے مخصوص ہوں گی۔

تعلیم نسواں : اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کیلئے [illegible] تعلیم کو فروغ دینا بےحد ضروری ہے چنانچہ عملی پروگرام میں کہا گیا ہے کہ

۱) چونکہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں میں عورتوں کی خواندگی اور لڑکیوں کے اسکول میں داخلے کی شرح سب سے کم ہے اس لئے لڑکیوں کے اسکول قائم کرنے، خواتین ٹیچرس کے تقرر، لڑکیوں کے ہوسٹلوں کی تعمیر اور حصولِ علم کی طرف انہیں راغب کرنے کیلئے دن کے کھانے اور مفت یونیفارم کی ترغیبات میں اقلیتوں کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔

۲) اقلیتوں کی کثیر آبادی والے ہر ضلع میں لڑکیوں کو حرفہ و ہنر ([illegible]) میں تربیت دینے والے پروڈکشن کم ٹریننگ سنٹر قائم کئے جائیں گے۔ جہاں تک ممکن ہو، ان میں خواتین ٹیچر رکھی جائیں گی۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

تعلیم بالغاں اور تعلیم اطفال : "عملی پروگرام" میں یہ اسکیم پیش کی گئی ہے کہ تعلیم بالغاں اور تعلیم اطفال کی رضاکارانہ تلقین کیلئے اقلیتوں کے پیشہ وروں کو تربیت دی جائے گی

ہر اقلیتی تعلیمی ادارے کے ساتھ ایک تربیتی مرکز کو منسلک کیا جائے گا جس کا کام ان اسکیموں کے تئیں لوگوں میں بیداری پیدا کرنا ہوگا علاوہ ازیں ان تعلیمی اداروں کے نگرانوں یا سپروائزروں کی بھی تربیت کی جائے گی ۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں کریں گی ۔

لائبریری ریڈنگ روم اور تعلیمی توسیع کا پروگرام

اقلیتوں کے علاقوں میں علم سے لگن، مطالعہ کا شوق اور سیاسی و سماجی شعور پیدا کرنے کیلئے لائبریریاں اور مطالعہ گاہیں (ریڈنگ روم) قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائیگی۔ کچھ اقلیتی حلقوں میں تجربے کے طور پر تعلیم کی توسیع کا کام پائلٹ پروجیکٹ کے طور پر کیا جائے گا ۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں کریں گی اور وہی مالی وسائل بھی فراہم کریں گی ۔

اقلیتوں کے زیر انتظام تعلیمی ادارے

(۱) ہر ریاست اقلیتی اسکولوں کے قیام اور انہیں تسلیم کرانے کی درخواستوں پر بلا تاخیر فیصلہ کرنے کیلئے واضح رہنما خطوط اور ہدایات تیار کرکے انہیں وسیع پیمانے پر تشہیر کرے گی ۔

(۲) اقلیتوں کی فلاح و بہبود کیلئے بنائے گئے پروگراموں کی صحیح تعمیل اور نفاذ کیلئے مانیٹرنگ کا معقول انتظام کیا جائے گا ۔

(۳) اقلیتی تعلیمی اداروں کا ایک ریاست گیر فیڈریشن قائم کیا جائے گا تاکہ تعلیمی ترقی کے پروگراموں کی موثر عمل آوری ضروری سازو سامان [illegible] کی فراہمی، تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے اور اساتذہ کے مفادات کی حفاظت کیلئے تعاون حاصل کیا جا سکے ۔ ان تنظیموں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے گا اور انہیں مالی امداد سے بھی نوازا جائے گا۔

اقلیتوں کی کثیر آبادی والے علاقوں کا لحاظ

"عملی پروگرام" میں اقلیتوں کی آبادی کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق تمام مذہبی اقلیتوں کی کل آبادی ہندوستان کی کل آبادی کا ۱۷٫۴ فیصد بتائی گئی ہے ۔ ان میں مسلمانوں کا تناسب ۱۱٫۴ فیصد، عیسائیوں کا ۲٫۴، سکھوں کا ۲ بودھوں کا ۰٫۷ ۔ اور جینیوں کا ۰٫۵ ہے ۔ حکومت نے ۴۰ ایسے اضلاع کا اعلان کیا ۔ جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی پائی جاتی ہے ۔ ان چالیس اضلاع کے نام مندرجہ ذیل ہیں ۔

اتر پردیش : (۱) رامپور (۲) بجنور (۳) مرادآباد (۴) سہارنپور (۵) مظفرنگر

(۶) - میرٹھ (۷) بہرائچ (۸) گونڈہ (۹) غازی آباد (۱۰) پیلی بھیت (۱۱) دیوریا
(۱۲) بارہ بنکی (۱۳) بستی

مغربی بنگال ۔ (۱۴) مرشد آباد (۱۵) مالدہ (۱۶) مغربی دیناج پور (۱۷) بیر بھوم
(۱۸) ندیا (۱۹) ۲۴ پرگنہ (۲۰) کوچ بہار (۲۱) ہاوڑہ

کیرالا (۲۲) ملاپورم (۲۳) کوذی کوڑ (۲۴) کنانور (۲۵) پال گھاٹ (۲۶) وائی ناڈ

بہار (۲۷) پورنیہ (۲۸) کٹیہار (۲۹) دربھنگہ

کرناٹک (۳۰) بیدر (۳۱) گلبرگہ (۳۲) بیجاپور

مہاراشٹرا : (۳۳) بمبئی عظمیٰ (۳۴) اورنگ آباد

آندھرا پردیش (۳۵) حیدرآباد (۳۶) کرنول ــ ہریانہ (۳۷) گڑگاؤں

مدھیہ پردیش (۳۸) بھوپال راجستھان (۳۹) جیسلمیر

گجرات : (۴۰) کچھ

ریاستی حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ دیگر اقلیتوں کی کثیر آبادی والے اضلاع کو بھی اس میں شمار کر سکتی ہیں۔ ان اضلاع کے اعلان (بہرحال NO) کرنے کا مقصد یہ ہیکہ نئے اسکول کھولتے وقت ان کا لحاظ رکھا جائے گا تاکہ اقلیتوں کے بچوں کی رسائی تعلیم گاہوں تک بخوبی ہو سکے۔ دراصل ان اضلاع میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا ہے تاکہ تعلیمی پسماندگی دور ہو سکے۔

وظائف (اسکالرشپ) کی اسکیم : کمزور طبقات کے طلبہ کو میرٹ اور آمدنی کی بنیاد پر وظائف دیئے جائیں گے اور اچھے اور معیاری تعلیمی اداروں میں انہیں داخل کرانے میں تعاون کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یا تو ان کی فیس معاف کی جائیگی یا فیس میں انہیں رعایت دی جائے گی۔ نیز اہل حرفہ اور دوسرے کمزور طبقوں کو اس مزدوری کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے گا جو ان کا بچہ اسکول جانے کی وجہ سے نہ کر سکا۔ یہ اسکیم بھی ریاستی حکومتیں عمل میں لائیں گی۔

تنظیمی اور انتظامی مسائل (۱) بنیادی جائزہ کے علاوہ معینہ وقوف سکنے سلسلہ ...

کے ساتھ ایسے جائزے لینا جن سے شرح خواندگی اور تعلیمی اکتساب میں اضافے کی رفتار معلوم ہوتی رہے کثیر آبادی والے اقلیتی علاقوں کی اسکولوں کی اصلاح اور ترقی کیلئے معین وقفوں سے مختلف پہلوؤں پر تحقیقاتی مطالعے کرنا تاکہ کمزوریاں دور کرنے والے اقدامات کو بہتر اور موثر بنایا جاسکے یہ کام بھی ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

(۲) مرکزی اور ریاستی سطح کے مختلف تعلیمی بورڈوں اور صلاح کار کمیٹیوں میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کو موثر نمائندگی دی جائیگی۔

(۳) اقلیتی تعلیمی ترقی کیلئے وضع کردہ مندرجہ بالا اقدامات کا موثر تعمیل سے باخبر رہنے کیلئے مرکز اور ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ایک سیل قائم کیا جائے گا۔

(۴) ہر سال اقلیتوں سے متعلق تعلیمی پروگراموں پر نظر ثانی کی جائے گی۔[۱]

"عملی پروگرام" کا تنقیدی جائزہ: تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی ترقی کیلئے اور اسے سماج کے دیگر ترقی یافتہ طبقوں کے برابر لانے کیلئے حکومت نے جو پالیسی اور "عملی پروگرام" وضع کی ہے وہ خیر مقدم کئے جانے کے قابل ہیں۔ کافی غور و فکر کے بعد یہ اسکیمیں بنائی گئی ہیں اور اگر ان پر صدقِ دل سے عمل کیا گیا تو یقیناً ان سے اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی دور ہونے میں مدد ملے گی اور ان کی شکایتوں (Grievances) میں کمی بھی ہوگی۔ لیکن بعض مبصرین کو ان کی موثر عمل آوری پر شبہ ہے۔ پچھلے تجربات اس بات کے شاہد ہیں کہ پالیسی بنانے والوں اور پالیسی کو عمل میں لانے والی بیوروکریسی کے نقطۂ نظر میں شدید اختلاف رہا ہے۔ نفاذ کے دوران پالیسی کے مقاصد سے اکثر غفلت برتی گئی نتیجتاً حکومت کی نیک نیتی کے باوجود اقلیتوں کے فائدے کے بیشتر پروگرام ناکامیاب رہے ہیں۔ اس وقت بھی ان پروگراموں کو عمل میں لانے کی تمام تر ذمہ داری ریاستی حکومتوں کو سونپ دی گئی ہے۔ اقلیتوں کے تعلق سے بیشتر ریاستی حکومتوں کا کیسے غیر منصفانہ اور متعصبانہ طرز عمل ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ریاستوں کے عمال اقلیتوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ وہ ایسی فلاحی اسکیموں کی راہ میں قانون کی غلط اور گمراہ کن تشریح کرکے روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔

---

[۱] یہ تفصیلی پروگرام آف ایکشن (مطبوعہ اگست ۸۶ء) صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۱ سے ماخوذ ہے۔

سرکاری افسران کے اس رجحان کو روکنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ یہ ساری فلاحی اسکیمیں کاغذ کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ شائد اس بار ایسا نہ ہوگا کیونکہ یہ فلاحی پروگرام پارلیمنٹ کا منظور کردہ ہے اور اس کی موثر عمل آوری سے باخبر رہنے کیلئے مرکز اور ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ایک خصوصی سیل قائم کیا جارہا ہے۔

اگر اقلیت بیدار رہے تو سرکاری افسران کو اسکیموں کی عمل آوری کیلئے مجبور کر سکتی ہے۔ بعض ماہرین اور مبصرین نے اس اندیشے کا بھی اظہار کیا ہے کہ "جو پروگرام تجویز کئے گئے ہیں ان کو چلانے کیلئے جس قدر رقم کی ضرورت ہے غالباً وہ فراہم نہ ہو پائے گی۔ پچھلے منصوبوں میں تخفیف کا بڑا بار اکثر صحت اور تعلیم کے پروگراموں کو اٹھانا پڑا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پچھلے تجربے کی طرح یہ پروگرام بھی غیر موثر رہے۔ ایک اور پروگرام جو پہلے بیشتر کا شکار رہا وہ تعلیم بالغان کا پروگرام ہے" یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے۔ آنے والا وقت ہی اس کی تصدیق یا تکذیب کرے گا۔

ایک شکایت ہمیں ضرور ہے۔ اقلیتوں سے متعلق پالیسی مرتب کرتے وقت اردو زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے.... نئی تعلیمی پالیسی نے جس سہ لسانی فارمولہ کو منظور کیا ہے، اس میں اردو کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ وہی فارمولا ہے جو گزشتہ دس پندرہ سال سے مختلف ریاستوں میں رائج ہے۔ اس فارمولے کے خلاف اقلیتوں نے ہمیشہ احتجاج کیا ہے اور اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف ماہرین تعلیم اور حکمراں طبقے کو توجہ مبذول کرائی ہے۔ توقع کی جارہی تھی کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کے ساتھ ناانصافی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مادری زبان کا سیدھا اور صاف مطلب یہی ہے وہ زبان جو بچہ اپنے گھر میں سیکھتا، بولتا اور سمجھتا ہے۔ اس سے مراد ریاست کی زبان لینا سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اردو بولتی ہے۔ یہی ان کی مادری زبان ہے اور تعلیم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دینی چاہیئے۔ اگر اقلیتوں کو ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت نہ ہوگی تو ان کی تعلیمی پسماندگی کیسے دور ہوگی؟

ان خامیوں کے باوجود مندرجہ بالا پروگرام میری نظر میں اقلیتوں کی منفعت کا ہے۔ مرکزی اور ریاستی تعلیمی بورڈوں ــــ اور صلاح کار کمیٹیوں میں اقلیتوں کی نمائندگی کی تجویز بھی ایک دیرینہ مطالبہ کی تکمیل ہے۔ اب یہ اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اسکیموں کی موثر عمل آوری کیلئے بیداری کا ثبوت دیں۔ اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہ ہونے دیں۔ اپنے ح

اور مراعات کو حاصل کرنے میں غفلت نہ برتیں۔ مندرجہ بالا پروگرام پر عمل ہو رہا ہے یا نہ اس کا جائزہ لینے کیلئے قومی اور ریاستی سطح پر انجمنیں تشکیل دی جائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں آنے والا دور اُن کیلئے بڑا آزمائشی ہے۔ ذراسی غفلت ولاپرواہی انہیں قعرِ مذلت میں گراسکتی ہے۔

"مسئلہ عالم اسلام اور خلافت اسلامیہ"

علامہ اقبالؒ نے یہی بات اس طرح بیان کی۔

ازنسب تعمیر بنیاد امم	یا وطن وابستہ تقدیر امم
ملّت مارا اساس دیگر است	آں اساس اندر دلِ ما مضمر است

مختلف مکاتب خیال کی حکومتیں برطانوی دولت عامہ اقوام (BRITISH COMMON WEALTH OF NATIONS) میں اور متضاد نقاطِ نظر، مذاہب رنگ و نسل، زبان و ثقافت کی حامل قومیں ادارہ اقوام متحدہ (UNITED NATIONS ORGANISATION) کے مرکز پر جمع ہوسکتی ہیں تو مسلم مملکتوں کے نمائندے اور عامۃ المسلمین کے رہنما خداؐ اور رسولؐ کی ہدایات کی اتباع میں اپنا ایک "وفاق" تشکیل نہ دے سکتے؟ ایک مرتبہ وسیع تر زاویہ نگاہ کے ساتھ عرب و عجم کی حدود و قیود سے ماورا انساب و اوطان کے امتیازات سے بالاتر ہوکر خدا اور رسولؐ کی رضا جوئی اور ملّت اسلامیہ کی خدمت و رہنمائی کے لئے مسلمان حجاز مقدس میں ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور اس کی رحمت وبرکت کا مشاہدہ کریں جو ان کے حصہ میں آئے گی۔

کمال الدین علی خاں
بی ایس سی ایل ایل ایم

عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء کو پارلیمنٹ میں پنچایت راج ترمیمی بل پیش کیا۔ یہ دستوریہ ۶۴ ویں ترمیم ہوگی اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گوا کے ہندوستان میں انضمام کی غرض سے ایک ترمیمی بل پیش کیا تھا جو دستور میں ۱۲ ویں ترمیم تھی۔ اس کے بعد شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں جیب خاص کی مسدودی کیلئے ایوان میں جو بل پیش کیا تھا وہ دستور میں ۲۶ ویں ترمیم تھی۔ اس طرح ہندوستان کی پارلیمانی تاریخ میں شری راجیو گاندھی تیسرے وزیر اعظم ہیں جنھوں نے دستور میں ترمیم کیلئے بل پیش کیا۔

ایوان میں پنچایت راج ترمیمی بل کی پیشکشی مرکزی حکومت کی عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ دستور میں یہ ۶۴ ویں ترمیم ایک انتخابی مہم ہے برخلاف اسکے یہ عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی کی ایک پرخلوص مساعی ہے۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے ملک کے پنچایت راج ادارے غیر کارکرد بن گئے تھے۔ پنچایت راج اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ کئی ریاستوں میں پنچایتوں کے میعادی انتخابات پابندی سے منعقد نہ ہونے اور طویل عرصہ تک ان کی منسوخی اس کے علاوہ ان اداروں میں درج فہرست اقوام و قبائل اور خواتین کی ناکافی نمائندگی اور مالی ذرائعوں کی کمی نیز ان اداروں کو ناکافی اختیارات کی حوالگی سے ان کی کارکردگی سست اور غیر موثر ہو گئی۔

مذکورہ کوتاہیوں اور دستور کے آرٹیکل ۴۰ کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے ان اداروں کو فعال بنانے کی غرض سے ایک مربوط ترمیمی بل پیش کیا۔ مجوزہ بل دستور کے نویں حصہ میں ایک اضافہ ہے جسکی رو سے تمام ریاستوں کیلئے ضروری ہیکہ وہ سہ درجاتی پنچایتی نظام یعنی

گرام پنچایت درمیانہ سطح کی پنچایت اور ضلع پنچایت قائم کریں ۔ تاہم ایسی ریاستیں جنکی آبادی ۲۰ لاکھ سے کم ہو انہیں درمیانہ سطح کی پنچایتیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اس بل کی رو سے تمام نشستوں کو پُر کرنے کیلئے راست چناؤ ضروری ہیں ۔ بل کا مقصد مرکزی حکومت کی اس شدید تعلق خاطر کا اظہار ہیکہ بنیادی سطح پر جمہوری ڈھانچہ یا نظام فروغ پائے ۔

پنچایت راج نظام ترمیمی بل میں اس بات کی گنجائش فراہم کی گئی ہیکہ اراکین پارلیمان اسمبلی اور نچلی سطح تک پنچایتوں کے صدر نشینوں کو پنچایتی راج نظام میں نمائندگی کا حق حاصل رہے لیکن انہیں حق رائے دہی کا اختیار نہیں رہیگا ۔ مجوزہ ترمیمی بل کے دفعہ ۲۴۳ ڈی (د) کی رو سے درج فہرست اقوام و قبائل کو ہر ایک پنچایت میں ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے گی ۔ اسی دفعہ کے زمرہ (۲) کی رو سے کل نشستوں کا ۳۰ فیصد درج فہرست اقوام و قبائل کی خواتین کیلئے محفوظ رہے گا ۔

مذکورہ تحفظات سے درج فہرست اقوام و قبائل اور خواتین کو پنچایت راج نظام میں موثر نمائندگی حاصل ہوگی ۔ اس قانون سازی سے یہ بات عیاں ہوتی ہیکہ مرکزی حکومت درج فہرست اقوام و قبائل اور خواتین کو ملک کے جمہوری نظام میں شامل کرنے کی سچی خواہش رکھتی ہے ۔ اس ۷۴ ویں ترمیمی بل میں پنچایتوں کی مدت کار پانچ سال مختص کی گئی ۔ تاہم اگر یہ اپنی مدت کو پورا کرنے سے قبل تحلیل کردیئے جائیں تو قانونی طور پر اس بات کی گنجائش فراہم کی گئی ہیکہ چھ ماہ کے اندر دوبارہ رائے دہی کی جائے اور پنچایتیں اپنی باقی ماندہ مدت کو پوری کرلیں ۔ بہرحال یہ ضروری ہیکہ کسی بھی پنچایت کی تحلیل کے اندرون چھ ماہ دو انتخابات منعقد ہوں ۔

آئینی طور پر ریاستی سرکاروں کیلئے لازم ہوگا کہ وہ پنچایتوں کی تشکیل کیلئے رائے دہی کروائیں اور لمبے عرصے تک انتخابات کو معرض التوا نہ رکھیں ۔ مجوزہ بل کے دفعہ ۲۴۳ (الف) کی رو سے ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کیلئے ضروری ہیکہ وہ پنچایتوں کو قانونی طور پر اس طرح مستحکم کریں کہ وہ آزادانہ طور پر کام کرسکیں اور آئینی طور پر انہیں اقتدار اور ذمہ داریوں سے لیس کریں تاکہ وہ معاشی ترقی اور سماجی انصاف کے حصول کیلئے پلان مرتب کرسکیں نیز معاشی ترقی اور

انصاف اور شیڈول ۱۱ میں درج کردہ امور کی عمل آوری کرسکیں۔ مجوزہ بل کے ۱۱ویں شیڈول میں حسب ذیل ۲۹ امور یا موضوعات درج کئے گئے ہیں جو پنچایتوں کو منتقل کئے جائیں گے۔

۱) زراعت اور زرعی توسیع ۲) زمینی فروغ اور اس کا تحفظ ۳) چھوٹی آبپاشی پانی کا انتظام پانی کی نکاسی ۴) افزائش نسل حیوانات، دودھ کی صنعت، مرغی پالن ۵) ماہی گیری (۶) جنگلات اور جنگلاتی فارمنگ (۷) چھوٹی جنگلاتی پیداوار ۸) چھوٹی مصنوعات بشمول خوراک کی ڈبہ بندی ۹) کھادی اور دیہی مصنوعات ۱۰) دیہی رہائش ۱۱) پینے کا پانی ۱۲) ایندھن اور چارہ ۱۳) سڑکیں، کلورٹ پل اور دوسرے ذرائع ترسیل (۱۴) دیہی برقی نظام اور برقی سربراہی ۱۵) غیر رسمی توانائی کے ذرائع (۱۶) غریبی ہٹاؤ پروگرام ۱۷) تعلیم بشمول ابتدائی اور ثانوی تعلیم ۱۸) فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم ۱۹) تعلیم بالغان اور غیر رسمی تعلیم ۲۰) کتب خانے ۲۱) تہذیبی سرگرمیاں ۲۲) مارکٹ اور میلے (۲۳) صحت عامہ (۲۴) خاندانی بہبود (۲۵) زچہ و بچہ کی نگہداشت ۲۶) سماجی بہبود بشمول جسمانی اور ذہنی معذورین کی فلاح (۲۷) بہبودی پسماندہ طبقات بالخصوص درج فہرست اقوام و قبائل (۲۸) عوامی تقسیم کا نظام (۲۹) سماجی املاک کا تحفظ

مجوزہ بل کی (۱۱) ویں شیڈول سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مرکزی حکومت معاشی ترقی اور سماجی انصاف کے حصول کے عمل میں دیہی عوام کو شامل کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے پنچایتوں کی اہم ذمہ داریوں میں ریاستی حکومتوں کی جانب سے تفویض کردہ فروغی اسکیموں کی عمل آوری ہے۔ ان ذمہ داریوں میں غریبی کے خاتمہ کیلئے کئے جانے والے اقدامات کو بے حد اہمیت حاصل ہوگی۔

مجوزہ بل ریاستی قانون ساز اداروں کو اس بات کیلئے بااختیار بناتا ہے کہ وہ پنچایتوں کو ٹیکسوں کے محاصل جمع کرنے اور اسے خرچ کرنے کے اختیارات تفویض کرے اور اسے ریاستی خزانے سے مالی امداد دے۔ اس بل میں ریاستی فینانس کمیشن کے خطوط پر ایک فینانس کمیشن کے قیام کی گنجائش بھی فراہم کی گئی ہے جو ان پنچایتوں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کریگا یہ فینانس کمیشن ہر پانچ سال میں ایک دفعہ قائم ہوگا۔ اسکے علاوہ کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل آف

انڈیا بھی پنچایتوں کے مالی امور کی دیکھ بھال کرے گا اور اپنی رپورٹ گورنر کو پیش کرے تاکہ اسے ریاستی اسمبلیوں میں پیش کیا جا سکے۔ ان تمام امور کا جائزہ لینے پر یہ بات حقیقت سے نظر آتی ہے کہ مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کے اختیارات میں دخل اندازی کا ارادہ رکھتی۔ اس کے برعکس وہ دستور ہند کی رو سے ریاستی حکومتوں کو عطا کئے گئے اختیارات کا پورا احترام کرتی ہے۔

مجوزہ بل میں آزادانہ اور صاف ستھرے پنچایتی انتخابات کیلئے الیکشن کمیشن کو گردانا گیا ہے۔ الیکشن کمیشن پنچایت کی تینوں سطحوں پر انتخابات کی نگرانی کرے گا۔

اس ترمیمی بل میں ریاستی حکومتوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کن اسباب و حالات کے تحت پنچایتوں کو معطل، برخاست یا منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بقول وزیر اعظم "ہم امید کرتے ہیں کہ ریاستی قانون ساز مجلس ان اسباب کی وضاحت کرینگی جن کی بنیاد پر گورنر، پنچایتوں کو معطل یا منسوخ کر سکے گا اور گورنر ریاستی حکومت صلاح اور مدد سے آئین کے مطابق عمل کرے گا۔"

دراصل مرکزی حکومت بنیادی سطح پر جمہوریت کو مستحکم کرنا چاہتی ہے، مجوزہ میں گورنر کے اختیارات بے حد محدود ہیں جبکہ ریاستی قانون ساز مجلسوں کو وسیع اختیارات دئیے گئے ہیں۔ پنچایت راج ترمیمی بل کے سلسلہ میں بعض اصحاب حکومت پر عجلت کا الزام لگاکر اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ حکومت پنچایتی نظام پر ایک سال قبل نظر ثانی شروع کر دی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ حکومت نے قومی بیداری کو عملی شکل دینے کیلئے قدم اٹھائے۔ بعض سیاستدانوں کی جانب سے یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ ۶۴ ویں ترمیمی بل وجہ سے دستور کے بنیادی ڈھانچہ میں ترمیم کی جا رہی ہے یا اسے تبدیل کیا جا رہا ہے لیکن اس استدلال میں بھی کوئی سچائی نہیں ہے۔ مجوزہ بل کی عمل آوری سے نہ تو دستور میں کوئی تبدیلی میں آئیگی اور نہ ترمیم اور نہ ہی اس سے بنیادی حقوق اور حکومت متاثر ہوگی

مرکزی حکومت نے "جواہر روزگار یوجنا" کی عمل آوری کیلئے پنچایتوں کو ۲۰۰۰ ہزار کروڑ روپے منظور کئے ہیں لہذا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بات کی ضمانت حاصل کرے

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

سائمن جوزف

نہرو روزگار یوجنا

اجرتی روزگار کے پروگرام جن سے روزگار کی کمی والے دنوں میں غریبی سے متاثرہ دیہی عوام کو مزید روزگار فراہم ہوتا ہے۔ غریبی کے خاتمے کے ہمارے پروگراموں کے اہم جزو ہیں گاؤں میں رہنے والے افراد کو روزگار فراہم ہونے کے علاوہ، ان پروگراموں سے سماجی جنگل، پانی تالاب، چھوٹی آبپاشی، مٹی کے تحفظ، دیہی سڑکوں، اجتماعی عمارتوں جیسے پائیدار اجتماعی اثاثے بھی قائم ہوتے ہیں۔

گاؤں میں روزگار کے مواقع فراہم کرنے والے دو موجودہ پروگرام قومی دیہی روزگار پروگرام (NREP) اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام (RLEGP) ہیں۔ قومی دیہی روزگار پروگرام ۱۹۸۰ء میں شروع کیا گیا تھا اور ساتویں منصوبہ میں بھی جاری ہے۔ اس پروگرام پر عمل درآمد کیلئے مرکز اور ریاستی حکومتیں نصف نصف اخراجات برداشت کرتی ہیں ۔۔ دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام اگست ۱۹۸۷ء میں سو فیصد مرکزی پروگرام کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ حالانکہ دونوں ہی پروگراموں نے کافی پیشرفت کی ہے اور مقررہ نشانوں سے زیادہ کامیابی حاصل کی لیکن اسکے باوجود ان میں کچھ خامیاں تھیں۔

ان پروگراموں سے گزشتہ ۸ برسوں میں صرف ۵۵ فیصد گاؤں کو مستفید کیا جا سکا ہے۔[۱۱] پروگراموں کی دو بڑی خامیاں نامناسب سرمایہ کاری نیز عمارتوں اور سڑکوں جیسے اقتصادی طور سے غیر پیداواری کاموں پر زیادہ خرچ (تقریباً ۴۸٪) فیصد تھیں۔ تاہم ان پروگراموں کے سبب سالانہ تقریباً ۷۰۰ ۔ افرادی دن مہیا کیے گئے۔

غریبی کے خاتمے کے موجودہ پروگراموں کے بارے میں ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ ان پروگراموں کے فوائد لوگوں تک پہنچنا چاہیئے لیکن ان فوائد کا ایک بڑا حصہ بچولیوں کو پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے مرحلوں پر رقم کا خورد برد کیا جانا ایک حقیقت ہے جسکی نشاندہی مختلف

ماہرین نے بارہا کی ہے - یہ بات غریبی کے خاتمے کے تقریباً تمام پروگراموں کیلئے پرکھے
جن کے تحت امداد غریب افراد کو براہ راست روزگار کے مواقع پیدا کرنے والے پروگراموں یعنی
این آر ای پی اور آر ایل ای جی پی کے معاملے میں تو ایسا ہونا لازمی ہے

غریب لوگوں کیلئے اپنے منصبوں میں بامقصد روزگار مہیا کرنے میں حکام کی نااہلیت پر اکثر و بیشتر انکی نکتہ چینی بھی ہوتی رہی ہے - روزگار کے ایسے مواقع پیدا کرنے کیلئے جن سے گڑھے کھودنے اور پھر انہیں بھرنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے مختلف پروگراموں کی نکتہ چینی کی جاتی رہی ہے -

جن دوسری کمزوریوں کی اکثر نشاندہی کی جاتی ہے ان میں ایک سی کئی اسکیموں کا ہونا زیادہ حل ہونا اور رقومات کا غیر مناسب استعمال ہے -

جواہر روزگار یوجنا: ان سب کی اور بہت سی دوسری چیزوں کی دیہی روزگار پیدا کرنے نئی زبردست اسکیم جواہر روزگار یوجنا کے تحت تقسیم کی جارہی ہے

یہ یوجنا جدید ہندوستان کے معار اور صاحب بصیرت شخصیت کے تئیں ایک خراج عقیدت ہے ان کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ بھارت کے دیہات میں بے روزگاروں اور مناسب روزگار نہ رکھنے والے افراد کی پریشانیوں کو کم کیا جائے -

دیہی سطح پر اختیارات کی منتقلی اس یوجنا کو پنچایتی راج اداروں کے ذریعہ عملی جامہ پہنایا جائے گا - اس اسکیم کے تحت دیہی پنچایتوں کو اپنی دیہی روزگار اسکیمیں چلانے کیلئے مناسب رقومات دی جائیں گی - توقع ہے کہ پروگرام کے فائدے ماضی کے مقابلے میں زیادہ براہ راست طور پر دیہی عوام تک پہونچیں گے - اس کے علاوہ پروگرام کا انتظام عوام کو سونپنے سے انتظامیہ پر آنے والی لاگت کم ہو جائیگی -

جیسا کہ وزیر اعظم نے پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے کہا پروگرام پر عملدرآمد زیادہ کھلے اور واضح طور پر ہوگا - ہر گاؤں کو پتہ ہوگا کہ پروگرام کیلئے کتنی رقم دستیاب ہے اور کس اسکیم پر رقم خرچ ہو رہی ہے - اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسکے گاؤں کے کن لوگوں کو اسکیم کے تحت روزگار مل رہا ہے - انہوں نے کہا کہ اسکیم کے تحت روزگار حاصل کرنے والے ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنا معاوضہ مل رہا ہے اور دوسروں کو کتنا مل رہا ہے - جن لوگوں کے ساتھ

دھوکہ کیا جائے گا یا ان کے حقوق سے محروم رکھا جائے گا وہ اس کے تدارک کیلئے ووٹ کے حق کا استعمال کر سکتے ہیں اور کسی پنچ یا سر پنچ کو جو اپنے اختیارات اور ذمہ داریوں کا غلط استعمال کرتا ہے اسے اس کے عہدے سے ہٹا سکتے ہیں۔ جمہوریت سے فلاحی ریاست کو دیہات کے لوں تک پہنچنے کا موقع ملے گا۔ جہاں وہ رہتے ہیں اور کام کرنا چاہتے ہیں۔

دیہی سطح پر مناسب منصوبہ بندی نئی اسکیم کے تحت متعلقہ لوگوں کیلئے روزگار کے با معنی مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ عملدرآمد کئے جانے والے خصوصی اقدامات منصوبہ بندی کمیشن وضع کرے گا۔ اس سلسلے میں دیہی سطح پر مناسب منصوبہ بندی اور کارآمد پروجیکٹ کلیدی حل ہیں۔

لیاتی تقسیم جواہر روزگار یوجنا کے تحت سال ۸۹-۱۹۸۸ کیلئے ۲۱۰۰ کروڑ روپے کی کثیر رقم مخصوص کی گئی ہے جبکہ اس پر ۲۶۲۵ کروڑ روپے خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ اس سے دیہی علاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے ۴۴۰ لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ان میں سے ہر خاندان کے ایک فرد کو سال میں ۵۰ سے ۱۰۰ افرادی دنوں کا روزگار حاصل ہوگا یعنی اسے ۵۰ روپے ماہانہ کی آمدنی ہوگی۔ بادی النظر میں جہاں تک ان خاندانوں کی بنیادی ضروریات کا تعلق ہے یہ اقتصادی فائدے کم نظر آسکتے ہیں لیکن ۵۰ روپے ماہوار کی رقم اتنی کم نہیں ہے۔

سب سے بڑا انقلابی قدم یہ ہے کہ فی الواقع ہر ایک پنچایت کو اس اسکیم میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہر ایک پنچایت کو اس اسکیم پر عملدرآمد کیلئے ہر سال ۸۰ ہزار روپے سے ایک لاکھ روپے تک ملیں گے۔

مرکزی امداد اس اسکیم کے تحت مختص کردہ کل رقم کا ۸۰ فیصد ہوگی ہر ریاست میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والی آبادی کی مناسبت سے اس ریاست کو رقم دی جائے گی۔ اضلاع کیلئے مزید رقم کا تعین ان کی پسماندگی کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ اس کا معیار زرعی مزدوروں کا تناسب اور زرعی پیداواریت کی سطح ہے۔ پہاڑوں، ریگستانوں اور جزائر جیسے جغرافیائی لحاظ سے امتیازی علاقوں کی ضروریات کی تکمیل پر بھی توجہ دی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت روزگار کے تیس فیصد مواقع خواتین کیلئے مخصوص ہونگے۔ اس اسکیم سے خانہ بدوش قبیلے بھی مستفید ہوں گے۔ دیہی روزگار پروگراموں قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کو جواہر روزگار یوجنا میں ضم کردیا گیا ہے یہ قدم خاص طور سے اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ ایک ہی کام دوبارہ نہ انجام دیا جائے۔

جواہر روزگار یوجنا ان پر خلوص کوششوں میں سے ایک کوشش ہے جو ملک سے غریبی کو کم کرنے اور بالآخر اسے بالکل ختم کرنے کے سلسلے میں حصول آزادی کے بعد سے ملک میں کی جارہی ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد سب سے بہتر طور پر وزیراعظم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"ہمارا مقصد ان تمام کنبوں یعنی ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ دیہی کنبوں میں سے ہر ایک کنبہ کو مستفید کرنا ہے ہمارا مقصد ان کنبوں کو درپیش مصیبتوں کو کسی حد تک کم کرنا ہے۔ خصوصی طور پر ہمارا مقصد ان مشکلات کو کم کرنا ہے جن کا سامنا ان کنبوں کی خواتین صدیوں سے بڑے صبر و تحمل اور تحمل اور ہمت کے ساتھ کررہی ہیں ہمارا ارادہ ہے کہ پنچایتیں قائم کرکے ان عظیم مقاصد کو حاصل کیا جائے۔"

سلسلہ "عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی"۔
منظورہ رقم ٹھیک ڈھنگ سے خرچ ہو اس لئے بل میں کمپٹرولر و آڈیٹر جنرل آف انڈیا کو حسابات کی نگرانی کا مجاز گردانا گیا ہے۔

اگر ۶۴ ویں ترمیمی بل کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو اس بات پر متفق ہونا پڑے گا کہ مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کے اختیارات میں مداخلت کی خواہشمند نہیں برعکس اس کے مجوزہ بل ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی رو سے عوام کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی عمل میں آئیگی جس کے لئے وزیراعظم پوری قوم کی جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ حیدرآباد

شاداب

جلد (۶) شمارہ (۱۰) ـــــــــ اکتوبر [illegible]

قیمت -/5

زرتعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ ۵۰ روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال ۹۰ روپے	270 "	65 "	36 "	205 " "
تاحیات ۱۰۰۰ روپے	2500 روپے	650 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11، ریڈ ہلز - حیدرآباد (اے-پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپواکر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد، اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اول	ایڈیٹر	۳
زکوٰۃ کا مصرف	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۵
خلافت	ڈاکٹر حسن الدین احمد	۱۳
ڈاکٹر ناظر یار جنگ	مولانا ہادی نقشبندی	۲۵
رشید الدین	محمد عبدالوحید خاں	۳۱
آج کے سماج پر سائنس کے اثرات	خلیل اکمل	۳۵
تعلیم اور خواتین کی ترقی	وی بھاسکرن	۳۹
کیا اردو کوئی زبان ہے ؟	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۴۳
اردو کا مسئلہ	ماخوذ	۴۴
پنڈت جی اور اردو	پروفیسر میر تراب علی	۴۶
اقلیتوں کیلئے وزیر اعظم	محمد اسحاق	۵۲
حرف منطق (تبصرہ)	محمد لطیف احمد	۵۶
گہوارہ علم و ہنر (〃)	محمد یعقوب الرحمٰن	۶۰
لفظوں کا بدلنا (〃)	مومن خاں شوق	۶۲
اردو زبان کی عظمت	محمد سالم المحضار العیدروس	۶۴

حرف اول

اردو دوسری سرکاری زبان

اردو خالص ہندوستانی زبان ہے، یہیں پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور اب ہندوستان کے حدود سے نکل کر بین الاقوامی زبان بن گئی ہے۔ آزادی سے پہلے ہی ہندوستان گیر زبان بن چکی تھی۔ دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں اسی زبان میں آزادی کی جنگ لڑی گئی۔ مگر آزادی کے بعد جب قومی زبان کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو اردو اور ہندی کو مساوی ووٹ ملے اور صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ اردو والوں نے تو ہندی کو قومی زبان تسلیم کر لیا۔ لیکن ہندی والے اردو کو دیس نکالا دینے اور اسکی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں برابر مصروف رہے۔ خصوصاً اتر پردیش میں جہاں اردو ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ رائج تھی اسے ختم کرنے کی کوششیں زیادہ سے زیادہ رہیں۔ اردو کے ساتھ انصاف کرنے کیلئے دستخطی مہم چلائی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ محضر خود صدر جمہوریہ کو پیش کیا مگر اسے اس طرح سرد خانے کی نذر کیا گیا کہ خود ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ بنے تو وہ بھی اس سلسلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ پورے ملک میں خصوصاً اتر پردیش میں اردو مدرسے ختم کر دیے گئے۔ اردو تعلیم مسدود کر دی گئی۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی بجائے سنسکرت کی تعلیم دی جانے لگی۔ اردو تعلیم کیلئے آرڈیننس نافذ کیے گئے۔ بغیر عمل آوری کے ختم ہو گئے۔ اتر پردیش نے ایک اردو بل پیش کیا تو اسی حکومت کے ایک وزیر نے اس کی مخالفت کی۔ اب حکومت نے غالباً الکشنی مصلحت کی بناء پر اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کیا تو اسی حکومت کے محکمہ قانون نے مشورہ دیا کہ "اردو کو "دوسری سرکاری زبان" بنانے کے بجائے "دوسری زبان" بنایا جائے۔ حکومت نے جیسے ہی بل پیش کیا اردو مخالفین نے اسمبلی میں دھرنا دیدیا اور گڑبڑ کر کے بل پاس نہ ہونے دیا۔ دھرنا رات بھر جاری رہا اور دوسرے دن سخت گڑبڑ اور متعدد بار اجلاس ملتوی کیے جانے کے بعد بل پاس کر دیا گیا، تبھی دھرنا ختم کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ پوری اسٹیٹ میں گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ جا کر اردو کی مخالفت کی راہ ہموار کی جائے گی۔ بدایوں میں ایسے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ٹرین سے

-مسافروں کو کھینچ کر مار دیا گیا کہ تقسیم ملک کے بعد کے ہنگاموں کی یاد تازہ ہوگئی۔

اردو کو سب سے پہلے بہار میں دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اب اتر پردیش میں حکومت نے یہ قانون پاس کر دیا ہے۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود حکومت کا یہ اقدام لائق ستائش ہے۔ لیکن اس بل کے پیش ہوتے ہی مخالفتوں کا جو بے ہنگم سلسلہ شروع ہوا ہے اس سے اردو والوں کو چوکنا ہو جانا چاہیئے کہ ان کی مہم پوری نہیں ہوئی بلکہ ابھی شروع ہوئی ہے اس قانون کے پاس ہونے کے بعد بھی انہیں اپنی جد و جہد جاری رکھنی ہوگی۔ خصوصاً اردو تعلیم کا انتظام۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو کی تعلیم، دفاتر، عدالتوں وغیرہ میں اردو کا استعمال، بہار اور اتر پردیش کی طرح دوسری ریاستوں خصوصاً آندھرا پردیش میں اردو کا دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جانا، ان تمام امور کیلئے سخت جد و جہد کرنی ہوگی اور الکشن سے پہلے کرنی ہوگی۔ تبھی کامیابی کی راہ ہموار ہوگی۔

اردو کے مخالفین سب سے بڑا اعتراض یہی کرتے ہیں کہ اردو بولنے والوں کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ دستور کے مطابق اسے سرکاری زبان قرار دیا جا سکے۔ یہ حقیقت سبھی جانتے ہیں کہ مختلف وجوہ کی بنا پر مردم شماری میں اردو والوں کی تعداد کم بتائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ اردو ہی ایک زبان ہے جو پورے ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے اور پورے ملک میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے اردو والے اس پر کمر ہمت کس لیں تو یقین ہے انہیں کامیابی ہوگی۔

- زرِ تعاون کی عدم وصولی کے باوجود "شاداب" آپ کو بھجوایا جا رہا ہے
- "شاداب" آپ کو پسند ہے تو زرِ تعاون روانہ فرمائیے
- اگر ناپسند ہو تو خط سے اطلاع دے دیجئے تاکہ آپ کے نام "شاداب" بند کر دیا جائے اور ادارہ نقصان سے بچے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

زکوٰۃ کا مصرف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے زکوٰۃ کے مناسک، محل اور اس کے اوقات کی حکمت و مصلحت کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:"

وہ دروازے جو صالح سلاطین نے بلا کسی تکلیف و مشقت کے زکوٰۃ کیلئے کھولے تھے، اور جن کو عقل بھی قبول کرتی ہے۔ چار ہیں، اوّل یہ کہ اموال نامیہ سے زکوٰۃ لی جائے، اس لئے کہ اس کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور نمو ملک کے باہر آنے جانے کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اموال نامیہ کی تین قسمیں ہیں، مولیشی کاشت و تجارت، دوسرے یہ کہ خزانہ کے مالکوں اور سرمایہ داروں سے لی جائے اس لئے کہ ان کو چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنے مال کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ان کی آمدنی کی مدیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس سے ان کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

تیسرے یہ کہ ان اموال سے لی جائے جو بغیر کسی محنت و سعی کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ مثلاً عہد جاہلیت کے خزانے اور معدنیات کے دفینے اس لئے کہ ان کی حیثیت بالکل مفت کی سی ہے، اور انہیں سے خرچ کرنا بہت آسان ہے، چوتھا یہ کہ عام تجارت پیشہ لوگوں سے لی جائے تاکہ ان پر زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔ اور مجموعہ کافی ہو جائیگا۔

تجارت (مع درآمد برآمد) غلّہ اور پھل زکوٰۃ کی سب سے اہم قسمیں ہیں جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کیلئے ایک سال رکھا گیا ہے۔ وجہ یہ کہ درمیان میں مختلف فصلیں اور حالتیں پیش آتی ہیں جن میں پیداوار میں اضافہ کا امکان بہت رہتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کیلئے سال بالکل کافی ہے۔

آسان اور مطابق مصلحت یہ ہے کہ زکوٰۃ ان ہی اموال کا ایک جزو ہو مثلاً اونٹ کے

گلہ سے ایک اونٹنی کا ٹنے کے ریوڑ سے کاٹنے' بکری کے ریوڑ سے بکری۔

زکوٰۃ کے مصارف اور اس کے اجتماعی نظام کا قیام :- زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے سورہ برأۃ کی آیت میں بیان فرمائے ہیں ارشاد ہے :

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ
وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

"صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہیں' جو ان پر مقرر ہیں' نیز ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے' اور (صدقات کو صرف کیا جائے) گردنوں کے چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں' سب فرض ہے اور اللہ کی طرف سے اور اللہ بڑا علم والا ہے' بڑا حکمت والا ہے"۔

سورہ برأۃ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی' اس وقت اسلام کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے' اس کے بعد زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جگہوں پر اپنے عمال اور محصلین بھیجے اور ان کو اس کی تحصیل کے احکام اور آداب بھی بتائے گئے اور بہت سی ایسی وصیتیں کیں جنمیں شفقت' حکمت اور انفرادی مصلحت کے ساتھ اجتماعی مفاد بھی وابستہ تھا' چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل کو ۱۰ھ میں یمن روانہ کرنے سے پہلے جو ہدایات دیں وہ زکوٰۃ کے قانون کی اساس اور گویا اس کا مرکزی نقطہ ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا۔

"تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں' پس دعوت دو"

کو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اگر وہ یہ بات قبول کرلیں تو ان کو یہ بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کی اغنیاء سے لیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بات بھی منظور کرلیں پس تم کو چاہیے کہ ان کے بہترین مال پر ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرو۔ اور مظلوم کی دعاء اور پکار سے ڈرو اس لئے کہ اللہ اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اس کے احکام کے اسرار اور حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیئے کہ زکوٰۃ میں سب سے اہم مصالح دو ہیں پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے۔ اس لئے کہ نفس اور حرص اور بخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حرص بدترین اخلاق میں سے ہے، جو معاد میں انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتی ہے، جو حریص ہوگا۔ مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا، اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائیگا۔ اگر زکوٰۃ کی مشق اس کو ہوگی تو یہ مرض اس سے ختم ہوچکی ہوگی، جو بالآخر اس کو نفع پہونچائیگی۔

انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد معاد میں سب سے اعلیٰ اخلاق سخاوت نفس ہے، جس طرح رجوع الی اللہ انابت و عبودیت، دعا اور تضرع سے عالم جبروت سے مناسبت اور قرب پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سخاوت [illegible] اور پست دنیاوی صورتوں اور شکلوں کو توڑتی ہے، اس لئے کہ وہ بہیمیت کی ضد ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ملکوتی (فرشتوں والی صفات) غالب ہوں اور بہیمانہ صفات ان سے دب جائیں، بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر بھی اس حکم کا اطلاق ہونے لگے جو ملکوتی صفات پر ہوتا ہے، اس کا راستہ یہ ہی ہے کہ مال کو باوجود ضرورت و احتیاج کے راہ خدا میں خرچ کیا جائے، ظالم کو معاف کیا جائے مصائب پر صبر کیا جائے اور دنیاوی تکالیف و مشکلات، آخرت کے یقین کی وجہ سے آسان و خوشگوار ہوجائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں کا حکم دیا ہے۔

اور ان کے حدود مقرر فرمائے ہیں ان میں مال کا خرچ کرنا بھی ہے جو بہت سے حدود و قیود کیساتھ وابستہ ہے، اور اسکی اتنی اہمیت ہے کہ ایمان اور نماز کیساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ اہل نار کے بارے میں فرماتا ہے۔

"قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ"

ترجمہ "وہ کہیں گے ہم تو نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ ہم غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے، اور مشغلہ میں رہنے والوں کیساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔"

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے اسلئے کہ ضعفاء و اہل حاجت جمع ہوں گے اگر ان کی ہمدردی و اعانت کی یہ سنت نہ ہو تو وہ سب بھوک سے ہلاک ہو جائینگے اس کے علاوہ شہروں کا نظام مال پر قائم ہوتا ہے اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے مدبرین و منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کیوجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتے، ان کی معیشت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے، مختلف انواع یا چندے نہ سب کے لئے آسان ہیں نہ ممکن، اس لئے رعیت سے ان مصالح کے لئے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور ہے، اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم ملزوم رہیں، اس لئے شریعت نے بھی ایک کو ایک دوسرے کیساتھ ہم آہنگ رکھا ہے"۔

علامہ بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں، بلکہ دوسری عبادتوں کی طرح خالص اللہ کی عبادت ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"ادائیگی زکوٰۃ کے وقت نیت کی درستی بہت ضروری ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ بہت بڑی عبادت ہے۔ جسطرح نماز کا مقصد سوائے حصول ثواب کے کچھ نہیں چنانچہ نیت اس کے لئے فرض ہے۔ اگر بلا نیت کے ادا کریگا تو جسطرح نماز بلا نیت کے نہیں ہوتی، زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی۔ البتہ نماز بلا نیت کے باطل ہو جاتی ہے۔

بخلاف زکوٰۃ کے جو بلا نیت کے ہدیہ ہو جاتی ہے چنانچہ ہدیہ کا ثواب اس کو فرض کا حاصل ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نیکو کار کے عمل کو ضائع نہیں کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی نمایاں خصوصیات:

زکوٰۃ کی بہت سی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو انسان کے خودساختہ قوانین اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے بہت مختلف ہیں۔ ان ..... مابہ الامتیاز خصوصیات نے زکوٰۃ کو ایک خاص رنگ اور مزاج بخشا ہے، اس کو دینی تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے اور اس کے اندر زندگی و اخلاق پر اثر انداز ہونے اور خدا و بندہ کے تعلق کو استوار اور مستحکم کرنے کی ایسی قوت و صلاحیت پیدا کر دی ہے جو کسی دوسرے دنیاوی ٹیکس میں (خواہ اس میں انصاف و اعانت کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہو) نہیں ہے اور نہ ممکن ہے۔

زکوٰۃ کا صحیح مصرف — تبشیر و انذار:

ان خصوصیات میں سب سے زیادہ بنیادی اور موثر چیز ایمان و احتساب کی وہ روح ہے جو اس فریضہ میں جان ڈالتی ہے۔ اس روح یا اسپرٹ سے ٹیکس سرکاری قوانین اور معاشی حد بندیاں قدرتی طور پر بالکل محروم ہیں، بلکہ اس کے برعکس انہیں ناراضگی، گرانی اور بددلی کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ کہ ٹیکس دینے والا یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہ ٹیکس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور اس پر اجر و ثواب ملے گا۔ بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ٹیکس لگانے والے خود اس جیسے انسان ہیں اور شاید اس سے بھی پست تر ہیں اور اس ٹیکس سے ہونے والی آمدنی زیادہ تر عیاشات اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے یا چند اشخاص اور مخصوص پارٹیوں کے مفاد پر خرچ ہوتی ہے، اس کے علاوہ ان ٹیکسوں کے ساتھ دینی ترغیب کی کوئی قوت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بجائے جرمانے، دھمکیاں، سزائیں اور خشک سخت قوانین ہوتے ہیں جن سے ناراضگی اور بے اطمینانی و بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا قرآن و حدیث اور نبوی تعلیمات میں زکوٰۃ کا ذکر بعض فضائل و ترا... آخرت ... ر ... ن ...

نتائج ثمرات، اجر و ثواب، مال و دولت میں برکت، یا زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو عذاب الیم کی وعید اور بے برکتی کیساتھ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ
أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ
مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ
لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ
الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا
وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے نہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیاں اگیں، ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے۔ اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان واذیت سے کام نہیں لیتے ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلامی شریعت میں ان فضائل کے مقام واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خوب لکھا ہے:

"انفاق کی ترغیب و فضیلت پر جو احادیث آئی ہیں ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ عمل سخاوت کیساتھ موجود زکوٰۃ کی روح ہے اور تہذیب نفس کا کام بہت حد تک اس سے انجام پاسکتا ہے، بخل کی برائی بار بار اس لئے بیان کی گئی ہے کہ حرص ایسی

چیز ہے جو مانع زکوٰۃ کو نقصان پہونچا سکتی ہے اور جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ

اللّٰھم اعط منفقا خلفا و اللّٰھم اعط ممسکا تلفاۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچو اس لیئے کہ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے، دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

"ان الصدقۃ لتطفی غضب الرب"

"بے شک صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی آگ ٹھنڈا کر دیتا ہے"۔

ایک مرتبہ فرمایا:

ان الصدقۃ لتطفی الخطیئۃ

بے شک صدقہ گناہوں کو اسطرح بجھا دیتا ہے جسطرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کو بڑھاتا ہے"۔

مالداروں سے لیکر غرباء میں تقسیم

زکوٰۃ اور ان ٹیکسوں کے درمیان جو شخصی سلطنتوں میں یا نئے زمانہ کی جمہوری اور عوامی حکومتوں میں نظر آتے ہیں ایک نمایاں اور بنیادی فرق جو اس کے اثرات و نتائج پر کلی طور پر اثر انداز ہے وہ اس کی شرعی ساخت اور حیثیت ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ و معجزانہ انداز میں اسطرح بیان فرمایا:

"توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم"

(ان کے دولت مندوں سے لیا جائے اور انکے غرباء میں تقسیم کیا جائے)

یہ زکوٰۃ کی وہ شرعی حیثیت ہے جو عہد اوّل میں نظر آتی ہے، اور جو قیامت تک برقرار رہنی چاہیئے" وہ ان اغنیاء (جو انکے شرائط فرضیت پر پورے اترتے ہیں، اور زکوٰۃ کا مخصوص اور معین نصاب ان کے پاس موجود ہے) سے لے کر ان مصارف میں صرف کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں اور کسی حکومت اور قانون ساز ادارہ یا شخصیت کو اس کا حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ۔ صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں کا حق ہیں۔

شریعت اور احادیث نبوی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شہر کے فقراء اور اہل حاجت ہیں زکوٰۃ کا یہ نظام ان حکومتوں میں بھی قائم رہا جو اسلامی قوانین کی تطبیق پر سو مری عامل نہ تھیں چنانچہ فقراء و مستحقین ان حکومتوں کے سایہ میں کبھی اپنے حقوق سے کلیتاً محروم نہیں رہے اور حدود اللہ کبھی پوری معطل نہیں ہوئے یہ وہ حکومتیں ہیں جن کی مذمت میں بہت سے غرض مند مورخ اور مستشرق پیش پیش نظر آتے ہیں بلکہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے داعی ہیں۔

تقویٰ، تواضع اور اخلاص کی اسپرٹ

زکوٰۃ کا تیسرا امتیازی پہلو اخلاص تواضع اور ممنونیت کی وہ روح ہے جو ہر لمحہ اسمیں جاری و ساری رہتی ہے اس سے مراد زکوٰۃ کے آداب، اعلیٰ اخلاق اور دینی جذبات ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید نے بہت اہتمام سے بار بار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ دینے والوں کو ان صفات سے بہرہ ور ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس نے اہل خیر کو اسکی تلقین کی ہے کہ وہ احسان جتانے سے پرہیز کریں، اور اپنے صدقہ و خیرات کو اس سے ملوث کر کے بے قیمت نہ بنائیں۔

اس نے اہل خیر کی مدح کی ہے جن کے اندر تواضع و اخلاق کی یہ روح پائی جاتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتے وقت یہ سب کیفیات ان پر طاری ہوتی ہیں۔

ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ

اور جو لوگ دیتے رہتے ہیں جو کچھ دیتے رہتے ہیں اور ان کے دل اس بات سے

ڈاکٹر حسن الدین احمد

خلافت تحریک اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی

[رابطہ الادب الاسلامی العالمیہ کی جانب سے ۷، ۸ اور ۹ اکتوبر کو حیدرآباد میں مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی۔ یہ مقالہ اس میں پڑھا گیا]۔ [ادارہ]

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب انگریز، سلاطین عثمانیہ سے، جن کو صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب حاصل تھا، برسرپیکار تھے تو ہندوستانی مسلمانوں کو خلیفہ ترکی سے گہری عقیدت تھی۔ جب انگریزوں نے ہندوستان میں فوجی بھرتی کی اور مسلمان فوجیوں کو ترکی کے خلاف استعمال کیا تو مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ جو جنگ آزادی انگریز سامراجیت کے خلاف لڑی جارہی تھی اس نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ یہ موڑ تحریک خلافت تھا جو آزادی کی منزل تک پہنچنے کیلئے قریبی راستہ ثابت ہوئی۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمان علماء نے خلافت تحریک کو موضوع بناکر جو ادبی اور علمی حصہ لیا اس کو اسلامی ادب کے زمرہ میں شامل کرنے کا زیادہ جواز ہے۔ بہ مقابلہ اس ادب کے جو سیاسی یا قومی جدوجہد کے سلسلہ میں یا محض انگریزی تہذیب کی مخالفت میں وجود میں آیا۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے سلسلہ میں جو ضخیم ادبی ذخیرہ معرض وجود میں آیا اس میں مسلمانوں کا حصہ (contribution) نسبتاً زیادہ ہے اور جو ادب مسلمانوں کی دین ہے اس میں علماء کا اثر واضح اور نمایاں ہے۔

تحریک آزادی ہند کے سلسلہ میں مسلم علماء کی حیثیت ہر اول دستہ کی ہے۔ انہوں نے آزادی کے حصول کے سلسلہ میں ہر قسم کی قربانیاں دیں اور ساتھ ہی قلم کے ذریعہ بھی شاندار جدوجہد کی۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوتے ہی لندن ٹائمز نے اپنے ایک دل آزار اور اشتعال انگیز

مضمون CHOICE OF THE TURKS میں ترکی پر سخت حملے کئے اور ترکوں کی کھلم کھلا تضحیک کی۔ حالانکہ ابتداء میں ترکی شریک جنگ نہ ہوا تھا۔ بلکہ ترکی کے اتحادیوں کی طرف سے شریک جنگ ہونے کے امکانات تھے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی حمیت خلیفہ اسلام کی یہ مخالفت اور تذلیل برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے مسلسل چھتیس گھنٹے میں ایک جوابی مضمون لکھ کر کامریڈ میں شائع کیا۔ اس جرأت کیلئے کامریڈ کی ضمانت ضبط ہوئی اور اس کے بعد کامریڈ دوبارہ جاری نہ ہو سکا۔

مولانا محمد علی نے تقریر و تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اب مسلم لیگ ۱۹۰۶ء کی مسلم لیگ نہ تھی۔ جس کے قیام کا مقصد مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو بڑھاوا دینا تھا۔ جب مسلم لیگ کا جدید لائحہ عمل پیش ہوا اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ انگریز عالمگیر جنگ میں الجھے ہوئے تھے تو ظاہر ہے کہ حکومت کو تشویش ہوئی۔ علی برادران کو گرفتار کیا گیا۔ اس قید فرنگ کا سلسلہ دسمبر ۱۹۱۹ء تک رہا۔ جبکہ علی برادران بیتول جیل سے رہا ہوئے۔ اس موقع پر خلافت اسلامیہ کے متعلق کچھ صراحت ضروری ہے۔ خلیفہ قرآن مجید کا اہم تعارفی لفظ ہے جو سہ حرفی مادہ خلف سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پیچھے رہ جانے، بعد میں آنے یا کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ سلف کی ضد ہے جس کے معنی مقدم ہونے کے ہیں۔

خلافت کے لغوی معنی قائم مقامی کے ہیں۔ "انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا" (۶ : ۱۶۵) عام طور پر اس کے معنی یوں لئے جاتے ہیں کہ "انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب مقرر کیا گیا۔ جو درست نہیں۔ انسان نہ تو اللہ تعالیٰ کا نائب ہو سکتا ہے نہ قائم مقام۔ زمین پر ہر آن فرمانروائی حاکمی، شاہی اور خدائی سب اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے قانون "بقائے اصلح" کے تحت ایک نوع مخلوق کو دوسری کا جانشین یا قائم مقام بناتا رہا۔ تاآنکہ اس نے انسان کو خلیفہ یعنی دوسری انواع کا جانشین بنایا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں بھی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بناتا ہے۔ جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھو دیتی ہے اور اللہ کے مقررہ احکام کی پابندی نہیں کرتی تو اس قوم سے اقتدار کو چھین کر اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو اس کا جانشین بنا دیتا ہے۔

اور اقتدار سے نوازتا ہے جو باایمان ہو اور عمل صالح کو اپنا شعار بنا چکی ہو، اس طرح خلیفہ کے مرادی معنی سردار اور صاحب اقتدار کے ہیں۔

جب رسول اکرم ؐ نے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایمان والے اور عمل صالح کرنے والے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون اور اپنے وعدے کے مطابق رسول اکرم کی قیادت میں اس جماعت کو زمین کا خلیفہ بنایا اور اقتدار عطا کیا۔ رسول اکرم ؐ اس جماعت کے سربراہ تھے۔ آپ کے بعد جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو متفقہ طور پر اپنا امیر منتخب کیا تو وہ بجا طور پر خلیفۂ رسول کہلائے۔ اس طرح مابعد قرآن لٹریچر میں لفظ خلافت اس عظیم ادارے کیلئے استعمال ہوا جو رسول کی جانشینی اور دنیا کی امامت کا فرض ادا کر رہا تھا۔

خلافت کی بنیاد پچھلے کسی سیاسی نظام مثلاً قیصر و کسریٰ کے انداز پر نہیں رکھی گئی بلکہ وہ ایک الگ انداز کا نظام تھا جس کی بنیاد دین پر رکھی گئی تھی۔ اس کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی تھی کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلم عوام کو جو ملکی اختیارات حاصل ہیں ان کی حیثیت ایک مقدس امانت کی ہے اور خلیفہ مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر ہے۔

"منہاج نبوت" کی صراحت بھی ضروری ہے۔ منہاج کے معنی ہیں راستہ، دستور یا طریقہ رسول اکرم ؐ آخری نبی تھے۔ آپ کے بعد فرائض نبوت مسلمانوں کی جماعت کے تفویض ہوئے۔ یہ ایسا عظیم اعزاز اور ذمہ داری ہے جو سابق میں کسی امت کو نہیں ملی۔ اس طرح امت مسلم خلافت اسلامیہ کے ذریعہ "منہاج نبوت" پر قائم ہے۔ خلافت اسلامیہ ایک دینی ادارہ اور شرعی ضرورت ہے۔ "اعلائے کلمۃ الحق" اخوت اسلامی، مسلمانوں کے ناموس کے تحفظ اور مسلمانوں کی مرکزیت کے لئے ادارہ خلافت ناگزیر ہے۔ ارکان اسلام کی عمل آوری یعنی اقامت صلوٰۃ، انتظام زکوٰۃ فرائض حج اور حکم جہاد کے لئے بھی خلافت ضروری ہے۔ کوئی اور ادارہ خلافت اسلامیہ کا بدل ہرگز نہیں ہوسکتا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر مسلمانوں کو خلافت اسلامیہ سے گہری وابستگی اور عقیدت تھی۔ عملاً تمام دنیا کے مسلمان خلیفۂ ترکی کو اپنا امیر تسلیم کرتے تھے۔ ایسے علاقوں کے مسلمان بھی، جہاں خلیفہ کی حکومت نہ تھی (جیسے کہ ہندوستان) خلیفہ کو روحانی امام مانتے تھے۔ ایک زمانے میں

خلیفۃ المسلمین کی وہ عظمت اور شان تھی جو یورپ کے بڑے بڑے حکمرانوں کو لرزہ براندام کردیتی تھی۔

ہندوستان میں انگریز حاکم تھے۔ تمام دنیا میں انگریز سامراجیت کے تحت جو مسلمان تھے ان کی تعداد خلیفۃ المسلمین کی حکومت میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ یہاں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی۔ جب انگریزوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے ترکی کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا تو مسلمانوں نے خود کو عجیب موقف میں پایا۔

اس پس منظر میں جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہوا جس نے بدیسی حکمرانوں کو پریشان کردیا۔ اس وقت تک کانگریس ایک معتدل جماعت تھی۔ جس کا نصب العین برطانوی حکومت کے زیر سایہ حکومت خود اختیاری قائم کرنا تھا۔ گاندھی جی جنگ میں انگریزوں کے حامی تھے اور عدم تشدد کے عقیدے کے باوجود فوجیوں کی بھرتی میں حکومت کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ تحریک خلافت میں گاندھی جی کو نئے امکانات نظر آئے۔

خلافت کمیٹی ۲۴ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک جلسۂ عام میں بمبئی میں قائم کی گئی جس میں پندرہ ہزار مسلمان شریک تھے۔ خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی۔ پھر ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کا اجلاس بنگال کے فضل حق کی صدارت میں ہوا۔ اس میں انہوں نے اپنی اس سے پہلے کی تجویز کا اعادہ کیا کہ خلافت تحریک میں غیر مسلموں کا تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ اس اجلاس میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ نے شرکت کی۔

گاندھی جی نے "وار کانفرنس" میں شرکت کے بعد وائسرائے کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس کے آخر میں لکھا تھا "میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء سے کہئے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کردیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل درد سے بے چین ہے۔ اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے ان کے درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے۔ سلطنت کی حفاظت کی ہر صورت

ہے کہ ذمہ داری کے ساتھ اسلامی ممالک کے حقوق کی حمایت کی جائے۔ مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے"۔ اس طرح گاندھی جی نے تحریک خلافت کی مکمل تائید کی۔

اس کے بعد ہی خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس بھی ہوا جس کی صدارت خود گاندھی جی نے کی۔ جس میں راؤلٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ مولانا محمد علی کی جیل سے رہائی سے قبل ہی خلافت تحریک اور راؤلٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کی تحریک دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو چکی تھیں۔

علی برادران ڈسمبر ۱۹۱۹ء میں جب بیتول جیل سے رہا ہوئے تو تحریک خلافت کے روح رواں بن گئے۔ چند ماہ کے عرصہ میں ملک کے طول و عرض میں (۶۹) خلافت کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ تحریک خلافت میں عوام جوق در جوق داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمین نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو تمام ملک میں یوم خلافت منایا گیا۔ اس دن عام ہڑتال ہوئی۔ خلافت تحریک آزادی ہند اور مسلمانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا محور بن گئی۔

مولانا محمد علی ایک وفد لے کر انگلستان گئے جہاں برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج کے سامنے انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات پُر اثر انداز میں پیش کئے۔ لائڈ جارج نے پچھلے وعدوں کو نظر انداز کیا اور مولانا محمد علی مایوس ہو کر لوٹے۔

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو خلافت کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ جس کی صدارت مولانا محمد علی نے کی۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ برطانوی فوج میں شریک نہ ہوں۔ کراچی کے جلسہ کے بعد مولانا محمد علی دورے پر روانہ ہوئے۔ والٹیر اسٹیشن پر ان کو گرفتار کیا گیا اور فوج میں بغاوت پھیلانے کا مقدمہ قائم ہوا۔ اور دو سال کی قید کا حکم ہوا۔ اس سے ان کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

چار سال نظر بند رہکر مولانا آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی صدارت میں خلافت کانفرنس کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئی۔ جس میں یہ طے پایا کہ اگر حکومت خلافت تحریک کے مطالبات کو تسلیم نہ کرے تو مسلمان تمام وفادارانہ تعلقات

منقطع کرلیں گے۔ مولانا نے اس کانفرنس میں ترک موالات کو مسلمانوں کا مذہبی فرض قرار دیا۔

یہاں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جب غیر مسلموں کی تحریک خلافت میں شمولیت کا فیصلہ کیا گیا تو اس وقت مولانا محمد علی جیل میں تھے اور جس وقت خلافت تحریک کے مقاصد کے حصول کے لئے عدم تعاون کی تجویز کو قبول کیا گیا تو مولانا محمد علی وفد لے کر انگلستان گئے ہوئے تھے۔

تاریخ آزادیٔ ہند کا یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس کی ابتداء مسلمانوں نے کی اور شاندار طریقہ پر کی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ظالمانہ ردعمل کا وہ بری طرح شکار ہوئے جب جنگ آزادی دوسرے دور میں داخل ہوئی تو اس وقت تک غیر ملکی سامراج اپنے پیر مضبوط کر چکا تھا اور اہل ملک پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ ملک کی سیاسی فضا سرفروشانہ اقدام چاہتی تھی۔ اک نئے جذبہ عمل کی ضرورت پیش آئی تو ایسے وقت میں دوسری مرتبہ مسلمانوں نے نہ صرف اپنا تن من دھن لگا کر اس تحریک کو تقویت پہونچائی۔ بلکہ اس تحریک کے لئے انگریزوں کی مخالفت کا بنیادی مسالہ فراہم کیا۔ سنہ ۱۹۲۰ — ۲۱ء کے دوران تقریباً اسّی ہزار آدمی جیل گئے۔ جن میں آدھے سے زیادہ مسلمان تھے۔ ان میں موتی لال نہرو کے فرزند منظر علی سوختہ بھی تھے۔ جو ۱۹ر دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں گرفتار ہوئے۔ خلافت تحریک نے بقول گاندھی جی آزادی کے جذبے کو ترقی دی۔

ابتداء ہی سے تحریک خلافت اور تحریک آزادی ہند کا باہمی سمجھوتہ کچھ ان مضمر شرائط پر تھا۔ اگر تحریک خلافت کامیاب ہوئی تو اس کا سو فیصد فائدہ تحریک آزادیٔ ہند کو ہوگا کیونکہ یہ بات تو طے تھی کہ ہندوستان کے مسلمان۔ بہر حال حدودِ خلافت سے باہر ہی رہیں گے۔ اگر تحریک خلافت ناکام ہوئی تو اس کا کوئی مضر اثر تحریک آزادی ہند پر تو پڑے گا "اس" مضمر سمجھوتہ کی نزاکت کو گاندھی جی کی فراست نے سمجھ لیا تھا۔

تحریک خلافت کی وجہ سے کانگریس کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ تحریک خلافت نے آزادیٔ ہند میں دل کھول کر حصہ لیا اور گاندھی جی کو بڑا سہارا دیا۔ الہ آباد میں مجلس خلافت نے تحریک عدم تعاون کی تجاویز کو منظور کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ابتدا ہی سے یہ منشا تھا کہ مذہب کے راستے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں لایا جائے - چنانچہ انہوں نے ایک جماعت "حزب اللہ" بنائی - سیاست مولانا کے نزدیک دین کا ایک جز تھا - تحریک خلافت سے مولانا نے وہ کام لے لیا پھر اس درمیان تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی -

مولانا آزاد نے شروع سے تحریک خلافت کا ساتھ دیا - اپنی غیر معمولی تحریری و تقریری صلاحیتوں کے ذریعہ اس تحریک کو توانائی بخشی - انہوں نے "قول فیصل" میں خلافت تحریک کو آخری اسلامی تحریک قرار دیا جس نے مسلمانان ہند کے سیاسی مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا - "الہلال" اس تحریک کا اہم آرگن تھا - سرسید کی احتیاط پسندانہ روش اور انگریز سامراجیت کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے مسلمانان ہند کچھ عرصے سے ملک کی سیاسی سرگرمیوں سے نہ صرف الگ ہو گئے تھے بلکہ اس کی مخالفت کیلئے بیوروکریسی کے آلۂ کار کی طرح کام کرتے تھے - مسلمان اس خیال کے حامی تھے کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے - اگر ہندوستان آزاد ہوا تو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی - مولانا آزاد نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ بے خوف ہو کر قومی تحریک میں ہندوؤں کے دوش بدوش کام کریں - مولانا آزاد کی ان ہی مساعی کے نتیجہ میں تحریک خلافت اور سوراج نے متحدہ سرگرمی کی صورت اختیار کی - ترک موالات کی اصطلاح مولانا آزاد ہی کی دین ہے - یہی ترک موالات آگے چل کر NON - CO - OPERATION کی شکل میں نمودار ہوئی - اور گاندھی جی نے اس تحریک کو نہایت خوبی اور کامیابی سے چلایا -

تحریک خلافت کے سلسلہ میں اکابرین کی تحریریں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں - تحریک خلافت کے دوران جو صدارتی خطبے، مضامین، مکاتیب اور نظمیں لکھی گئیں وہ اردو ادب اور اسلامی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں - جو نظمیں لکھی گئیں ان میں "صدائے خاتون" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اس نظم کے اکثر مصرعے زبان زد خاص و عام ہو گئے -

جنگ عظیم میں اتحادیوں کے مقابلہ میں ترکی کو شکست ہوئی - ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکی نے التوائے جنگ کے صلحنامے پر دستخط کئے - اور مئی ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں نے شرائط صلح ترکی پر نافذ کئے اور ترکی کو انتہائی ذلت آمیز معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا - یہ دقیقہ حکومت برطانیہ

کیلئے اس وجہ سے مشکلات کا موجب تھا کہ دوران جنگ برطانیہ نے مسلمانوں سے اور صیہونی جماعت سے بیک وقت متضاد وعدے کئے تھے۔ برطانیہ کی مثال ان سیاسی جماعتوں کی سی تھی جو الکشن کے دوران وعدے کر لیتے ہیں اور جب ایفاء کرنے کا وقت آتا ہے تو ٹال مٹول کرتے ہیں مسلمانوں کی حد تک جو مسئلہ تھا وہ خلافت اسلامیہ کی برقراری اور حرمین شریفین اور بیت المقدس کو خلیفہ کے اقتدار میں رکھنے کا تھا۔ اب "قلم درکف دشمن" کا معاملہ تھا۔

دوسری طرف خود ترکی کے اندرونی حالات نے ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے عجیب صورتحال پیدا کردی۔ یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو کمال اتا ترک نے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا۔ خلیفہ وحیدالدین کو معزول کردیا گیا۔ جمہوریہ کے ساتھ بے اختیار خلیفہ کی موجودگی ایک بے معنی بات تھی۔ چنانچہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو کمال اتا ترک نے خلافت کا خاتمہ کردیا اور ترکی ایک دنیوی اور وطنی حکومت بن گئی۔ ان اچانک اور انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستان میں خلافت تحریک ختم ہوگئی۔ مسلمان ایک نئی اور عجیب صورتحال سے دوچار ہوئے۔ وہ ادارہ ہی نہ رہا جس کی اطاعت کی جائے اور جس کی بقاء اور حمایت کیلئے ہندوستان کے مسلمانوں نے اتنی بڑی تحریک چلائی تھی۔

جن لوگوں نے تحریک خلافت کی پرزور تائید کی تھی ان کا موقف بڑا نازک ہوگیا۔ انگریز سامراج کے پٹھو ان کا مذاق اڑاتے۔ گاندھی جی نے اپنے موقف کی وضاحت یوں کی "اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی تحریک نے ہماری قوم کو بیداری عطا کی۔ اب میں پھر اس جذبہ بیداری کو سونے نہ دوں گا۔

ساٹھ سال بعد آج ہم تحریک خلافت پر نظر ڈالتے ہیں تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ تحریک خلافت کے دو اہم پہلو تھے۔ ایک مانگنے کا پہلو یعنی حکومت برطانیہ سے مطالبات کرنے کا پہلو اور دوسرا مسلمانوں کے مطالبات کو سامنے رکھ کر اور ان کے احساسات کو بنیاد بنا کر انگریز سامراجیت کے خلاف احتجاج کرنا اور عوامی تحریک چلانا۔

جہاں تک مانگنے کی پالیسی کا سوال ہے۔ مولانا محمد علی نے اس کام کو انجام دیا۔ اور مانگنے کی پالیسی کا حق ادا کردیا۔ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمد علی وفد لے کر انگلستان گئے اور

انوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا یہ مطالبہ تھا کہ عثمانی سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے اور ں کے ٹکڑے نہ کئے جائیں اور اپنی مانگ کو پرزور انداز میں پیش کیا لیکن مانگ مانگ ہی ہوتی ہے نگنے کے اس طریقہ کار پر سنجیدگی سے غور کرنے پر تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان زعماء نے اس بات پر یوں غور نہیں کیا کہ وہ انگریزوں سے اسلامی خلافت کی ضمانت کا مطالبہ کر رہے ہیں جبکہ کے تعلق ہے انگریز سامراجیت سوچ سمجھ کر قطعی رائے پر پہنچ چکی تھی بلکہ نہایت درجہ اہتمام کر چکی تھی کہ سلمانوں کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے۔ سامراجیت نے سلطان عبدالحمید کو آلۂ کار بنا کر ان کے ذریعہ کی کے حالات ابتر کر دیئے تاکہ اسلامی مرکزیت کا خاتمہ کرنے میں آسانی ہو۔ سلطان عبدالحمید کے ذریعہ ترکی کے قلعوں کے فوجی استحکامات کو جہاں سے ترکی کی مدافعت کی جاتی تھی غیر مسلح کر دیا۔ لیکن انگریزوں نے سلطان عبدالحمید کو محافظ اسلام مشہور کیا۔ لہٰذا "جاہ طلب غلامانِ فرنگ" سے ان کی بیجا تعریف کروائی گئی۔

غالباً مانگنے کی اس پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اقبال نے خلافت تحریک میں راست حصہ نہیں لیا۔ ان کا نقطۂ نظر اس قطعہ سے واضح ہوتا ہے۔

نہیں تجھکو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے چلا تو گدائی
خریدیں نہ جسکو ہم اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مسلم زعماء کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ عیسائی اور خاص طور پر انگریز ایک عرصہ سے مسلسل اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے اور جزیرۃ العرب کو خلافت ترکی کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ کرنل لارنس نے اس سلسلہ میں جو کام کیا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ انگریزوں کی ذہنیت اس سے پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

جب برطانوی جنرل ٹاون شینڈ غازہ کے مسلح شہر پر حملہ آور ہوا اور اس کو پسپا ہونا پڑا تو فرانس سے جنرل الن بری کو بھیجا گیا۔ الن بری نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بلیر شیبہ اور ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو غازہ کو فتح کیا۔ پھر الن بری نے ترکوں کو جافہ تک ڈھکیل دیا اور ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس فتح کر لیا۔ ان کامیابیوں پر برطانیہ کے وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے کہا "الن بری نے صلیبی جنگوں کے سلسلہ کی آخری جنگ لڑی اور اس میں ایسی فتح حاصل کی کہ اس کے بعد اس سلسلہ

سلسلہ کی جنگیں ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئیں - انگریزوں کی اس ذہنیت کے پیش نظر مانگنے کی پالیسی کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے - مختصر یہ کہ مانگنے کی پالیسی بے معنی تھی -

جہاں تک دوسرے پہلو یعنی احتجاج کا سوال ہے مولانا آزاد کے تعلق سے مسلمانوں کے احساسات کو بنیاد بنا کر اس کو جنگ آزادی کا ایک موثر حربہ بنایا -

اس بات کو بھی تسلیم کرنے پڑے گا کہ خلافت تحریک کے دوران خلافت اسلامیہ کے تعلق سے ایسا اسلامی ادب وجود میں نہیں آیا جسکو تحریک خلافت کی دین کہہ سکیں - واقعہ تو یہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کے تعلق سے جو عظیم اسلامی لٹریچر پہلے سے موجود تھا اس کو بھی شایان شان طریقوں پر عوامی لٹریچر بنا کر پیش نہیں کیا گیا - مثلاً خود ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے خلافت اسلامیہ کے عنوان پر " ازالتہ الخفاء " کے نام سے جو مایہ ناز کتاب تصنیف کی ہے، ضرورت تھی کہ اس کی بنیادی باتوں کو عام فہم انداز میں مسلم عوام تک پہنچایا جاتا - مختصر یہ کہ اس تحریک کو وہ فکری اجزاء فراہم نہیں کئے گئے جو خلافت اسلامیہ جیسے عظیم ادارے کا بقاء کیلئے ضروری تھے - اور جو اجزاء اسلامی لٹریچر میں پہلے سے موجود تھے -

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک حد تک وہ اجزاء فراہم کئے - خاکسار تحریک کے بانی و سربراہ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی تحریک خلافت سے وابستہ نہیں رہے لیکن انہوں نے فکری طور پر خلافت کے تعلق سے اہم لٹریچر " تذکرہ " کی شکل میں دیا - اگر زیادہ سے زیادہ فکری اجزاء فراہم کئے جاتے اور مسلمانوں کی ذہنی تربیت ان خطوط پر ہوتی تو خلافت تحریک کا وہ حشر نہ ہوتا جو سنہ ۱۹۲۴ء میں ہوا - بلکہ خلافت کے قیام کی کوششیں فوری شروع ہو جاتیں اور ان کا تسلسل باقی رہتا

تحریک خلافت کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ اس تحریک میں ہوش سے زیادہ جوش تھا - بڑے پیمانہ پر چندے جمع کئے گئے - چندوں کی فراہمی میں باقاعدگی نہ ہونے سے مخالفین کو انگشت نمائی کا موقع ملا - پھر جمع کیا ہوا سرمایہ ترکی کو بھیجنے کا واحد ذریعہ حکومت تھی جبکہ مافی الضمیر کو سمجھنا ضروری تھا -

جب ترکی میں خلافت کو ختم کر دیا گیا تو امت اسلامیہ کی اہم شخصیتوں نے جن میں برصغیر کے مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی، علامہ عنایت اللہ خان مشرقی روس کے موسیٰ جار اللہ،

مصر کے محمد علی علوبہ پاشا اور سید رشید رضا مدیر المنار انڈونیشیا کے سعید عمر، شکر و قوتلو عرب
لیگ کے مفتی امین الحسینی شامل تھے۔ باہم صلاح و مشورہ کر کے سنہ ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں ایک
جمعیت حج کے اجتماع کے موقع پر قائم کی اور اس کا نام موتمر العالم الاسلامی رکھا۔ یہ ادارہ اس
وقت تک قائم ہے۔ دنیا کے باسٹھ (۶۲) ملکوں میں اسکی شاخیں یا ملحقہ ادارے قائم ہیں جو
کوشش کر رہے ہیں کہ خلافت اسلامیہ کا پھر سے احیاء ہو۔

خلافت کو ختم ہوئے پینسٹھ (۶۵) سال گزر گئے۔ ان پینسٹھ (۶۵) سالوں میں ملت
اسلامیہ کو ایسا نقصان پہنچا جس کا تصور میں لانا مشکل ہے۔ بیسویں صدی کے فوائد سے ہم مستفید
نہ ہو سکے۔ دنیا میں آزادی اقوام کی ہوا چلی مسلم ممالک کو جو برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے
غلام تھے آزاد کیا گیا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسلام تو عرب و عجم کی تقسیم کا
روادار نہ تھا۔ اب خود عرب کی ریاستیں بیسیوں ذیلی وحدتوں میں بٹ گئیں۔ خلافت عثمانیہ کے
خاتمہ کے بعد سامراجی طاقتوں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس نے اپنے ساختہ و پرداختہ مسلمان
حکمرانوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو انتشار و اختلاف میں الجھائے رکھا۔ مسلمان حکمران اپنے شخصی مفاد
کی بناء پر سامراجیوں کے آلہ کار بن گئے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی افکار سے مرعوب ہے احیاء
خلافت کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ خلیفہ کی عظمت ذہن سے محو ہو گئی۔
لفظ خلیفہ کو وہ معنی دیدیئے گئے جو اس کی عظمت کے منافی ہیں۔ خلیفہ بین الاقوامی سطح پر مسلمان
عالم کے اقتدار کا مظہر ہوتا ہے اور یہ یک وقت دنیا میں ایک ہی خلیفہ ہوتا ہے۔ اردو میں خلیفہ
حجام، نائی وغیرہ پیشہ کرنے والے آدمیوں کو کہتے ہیں۔ پھر صوفیوں کی اصطلاح میں مرشد اپنے جن
مریدوں کو بیعت لینے کی اجازت دیتے ہیں ان کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ خلیفہ کے معنی خواہ سوقیانہ
ہوں یا صوفیانہ اصل لفظ کی جو عظمت تھی ذہنوں میں باقی نہ رہی اور گلی گلی میں خلیفہ ہو گئے۔ لیکن یہ
بات خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس دینی ضرورت کو تسلیم کرنے تیار ہے اور ملت کا
سواد اعظم اس انتشار و اختلاف سے بری ہے جس میں دشمنان اسلام کے خود غرض ایجنٹ الجھے ہوئے ہیں
ہر قوم کو اپنے ورثہ کے تحفظ کی خواہش ہوتی ہے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ مسلمانوں کیلئے
یہ ورثہ خلافت اسلامیہ کا تسلسل ہے۔ خلافت کا احیاء ہی سے مسلمانوں کے بلکہ عالم انسانیت

کے تمام مسائل انشاء اللہ حل ہوں گے ۔

بعض گوشوں سے اس قسم کے شیطانی وسوسے پیدا کئے جاتے ہیں کہ خلافت کا احیاء مشکل یا ناممکن ہے ۔ مسلمانوں کا ذہن اس تعلق سے بالکل صاف ہونا چاہیئے ۔ اگر خلافت ایک دینی ضرورت اور انسانیت کی موجودہ خرابیوں کا واحد حل ہے تو اس کا احیاء ہونا چاہیئے اور ضرور ہوگا ۔ ضرورت وسیع پیمانہ پر اس احساس کو عام کرنے کی ہے ۔ وہ دن دور نہیں کہ خلافت کا احیاء ہوگا اور باب عالی سے ایسے فیصلے صادر ہوں گے جو انسانیت کیلئے فلاح کا موجب ہوں گے اور الٰہی نظام سربلند و کامران ہوگا ۔

سلسلہ ص ۱۲

ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں پروردگار کے پاس واپس جانا ہے ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ
وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ

تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں ۔ اس حال میں کہ وہ خشوع بھی رکھتے ہیں ۔

ان اہل خیر کی تعریف کرتے ہوئے وہ ان کو اخلاص کا بل اور ہر قسم کی انفرادیت سے آزادی سے متصف قرار دیتا ہے ۔

مولانا ہادی نقشبندی
سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ بالاپور (برار)

ڈاکٹر ناظر یار جنگ نامور عاشق علیگڑھ

ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ کے مورث اعلیٰ حضرت قاضی شاہ ضیاء الدین علیہ الرحمۃ ۷ ادیں صدی عیسوی کے اوائل میں بدور شہنشاہ بابر ہندوستان آئے۔ بوجہ صوفی منشی، خاندانی عظمت و وقار علم و فضل اور شیخ طریقت، امارت دار القضاۃ معمور ہوتے اور اودھ کے ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ نیوتنی کو مستقر بنایا۔ یہیں ۹۰۹ھ ۱۵۸۱ء میں وفات پائی اور آسودہ خواب ہوئے۔ آج بھی یہاں آپکی خانقاہ اور عمارات ہیں۔

دور مغلیہ میں آپکے اخلاف بھی اعلیٰ ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ کئی پنج ہزاری فوجی دستہ کے سپہ سالار اور کمانڈر ہوئے۔ بوجہ قضات و مشائخی، عدل و انصاف اس خاندان کی گھٹی میں پڑا۔ جسکے پیچ و خم سلجھانے کی روایت مستقل طور پر چلی آرہی ہے۔ چنانچہ ناظر الدین حسن کے دادا محمد غازی الدین حسن الملقب بہ محمد حسن خاں (ابن حضرت شاہ اسد اللہ قدس سرہ مدفون بریلی) سشن جج آگرہ میں ۱۸۴۲ء میں سر سید علیہ الرحمہ کے ساتھ منصف تھے۔ نیز آپ کے دادا حضرت مولوی محمد حسن خاں مرحوم حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج ہوئے جو بعد وظیفہ ۱۹۰۴ء میں فوت ہوئے۔ جسٹس نظام الدین حسن (بی۔اے، بی ایل) والد نواب ناظر یار جنگ مرحوم کی تعلیم الہ آباد اور کلکتہ میں ہوئی۔ یہ اپنے جد امجد یعنی اپنے وقت کے صوفی صافی عالم و فاضل بزرگ حضرت شاہ اسد اللہ قدس سرہٗ کے آستانۂ بریلی کے سجادہ نشین ہوئے

جسٹس مرحوم کی ملازمت کا آغاز برار کے ضلع آکولہ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری سے ہوا۔ مرحوم قاضی مولوی سید شاہ امام الاسلام نقشبندی سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ بالاپور (برار) کے رفیق خاص شعبہ تعلیمات سے متعلق تھے۔ لہذا موصوف نے ہندوستانی اسکول کے نام سے

پورے ضلع آکولہ میں اردو مدارس کا جال بچھا دیا۔

سرسید علیہ الرحمۃ سے جسٹس نظام الدین حسن متاثر تھے۔ اور علیگڑھ تحریک سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ اسٹریچی ہال میں آپ کے نام کا کتبہ اسکی تعمیر میں آپ کی شرکت کا مظہر ہے۔ مرحوم اپنے مخصوص مزاج، اصول پرستی میں انتہائی سختی، اسلامی تہذیب و تمدن کی دلدادگی، مشرقی تہذیب و ثقافت سے گہری دلچسپی، دینی فکر و عمل سے وابستگی، عدل گستری و معدلت پروری کی بناء پر آج بھی عزت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ نواب ناظر یار جنگ کی تعلیم تربیت اپنے والد کے زیر سایہ سخت نگرانی و پابندی میں ہوئی۔ مولوی نظام الدین حسن ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج رہے۔

ڈاکٹر ناظر یار جنگ (جسٹس ناظر الدین حسن) کی ولادت ۲۰ مارچ ۱۸۸۲ء کو نیوتنی ضلع اناؤ (اتر پردیش) میں ہوئی۔ ابتدائی مکتبی تعلیم میں عربی خاص طور پر پڑھائی گئی۔ ۱۸۹۱ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں داخل ہوئے۔ جہاں گیارہ سال زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۰۲ء میں عربی کے ساتھ گریجویشن کیا۔ اور ۱۹۰۶ء میں مزید تعلیم کیلئے یورپ گئے: کیمبرج (لندن) میں ایم اے ایل ایل بی کیا اور ڈبلن سے ایل ایل ڈی کی ڈگری لی۔ ۲ جنوری ۱۹۰۹ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کر کے وہیں پریکٹس کے ساتھ فرانس۔ اسکاٹ لینڈ، جرمنی اور سوئیزرلینڈ گئے واپسی میں قاہرہ، مراکش، ہسپانیہ، اور قسطنطنیہ ہوتے ہوئے وطن آگئے۔ ۱۹۱۰ء میں حسب خواہش والد مرحوم لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔

نواب ناظر یار جنگ اپنی ذاتی شرافت نفس، وجاہت، خوش خلقی، ذی مروتی، ہمدردی قوم و ملت اور علیگڈھ سے بے پناہ محبت و عقیدت کی بناء پر تھوڑے ہی عرصہ میں عظمت و شہرت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سید محمود کے تقرب نے جنگ آزادی میں شرکت کا موقع دیا اور لیبر پارٹی کی صدارت تفویض ہوئی۔ مچھلی والان کانپور کے مقدمہ مسجد کی پیروی نے مزید نیکنامی سے ہمکنار کیا۔

حکومت حیدرآباد نے جس سے آپ کا جدی تعلق تھا، ناظر الدین حسن کی قانونی صلاحیت و قابلیت سے متاثر ہو کر عدلیہ کیلئے آپ کی خدمات حاصل کیں چنانچہ ابتداً ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۶ء تک آپ اورنگ آباد، میدک اور گلبرگہ میں سشن جج رہے اور ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے جہاں سے آپ ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

خلد آشیاں آصف سابع نے ۱۹۲۳ء میں بموقع سالگرہ ہمایونی یکم رجب المرجب ۱۳۴۲ھ خطاب 'نواب ناظر یار جنگ بہادر' سے ملقب کیا۔ اور سبکدوشی جج ہائیکورٹ پر وکنیت پائیگاہ نامزد کیا جو ایک اعلیٰ اعزاز کے ساتھ منفعت بخش اور کثیر سہولتوں کا باعث ہوتی لیکن مرحوم نے بعد وظیفہ حسب طرح وکالت نہ کی اسی طرح بلا لحاظ ناگواری اعلیٰ حضرت پائیگاہ کی وکنیت کو بھی ...نا کے منافی سمجھ کر قبول نہ کیا۔ جہاں ہائیکورٹ کے یہاں سرکاری ٹیلیفون ہوتا ہے لیکن مرحوم نے سفارشوں اور غیر ضروری گفتگو میں تضیع اوقات سے بچنے کیلئے اپنے مکان 'منزل عدل' میں آخر وقت تک اس کی تنصیب نہ ہونے دی۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی مورخ بین الاقوامی شہرت وعظمت، نواب ناظر یار جنگ مرحوم سے بُعدِ عمر کے باوجود بوجہ ہم مشربی، ذہنی و فکری ہم آہنگی، ذوقِ علمی، اصول پرستی اور ایک ہی ادبِ علمی کی فرزندی کے اس درجہ قریب، یک جان دو قالب تھے کہ روزانہ ایک ساتھ چہل قدمی کرتے تمام مشترکہ مصروفیتوں، جلسوں اور تقاریب میں ساتھ ساتھ شریک ہوتے اور ایک دوسرے کی کامیابی پر دل سے خوش ہوتے۔ پروفیسر شروانی مرحوم "ناظر سبحانیؒ" اور نواب مرحوم "ہارونؒ" سے مخاطب فرماتے۔ اسی طرح ان دونوں خاندانوں میں بھی اس درجہ قربت و موافقت تھی کہ ہر دو خاندان ایک دوسرے کے دکھ درد اور شادی غمی میں نہ صرف شریک ہوتے بلکہ ان کی کوئی تقریب ان سب کی شرکت کے بغیر تکمیل نہ پاتی۔ نواب مرحوم کی بڑی صاحبزادی بیگم حامدہ حبیب اللہ سابق وزیر اتر پردیش اور سابق رکن راجیہ سبھا، صدر اردو اکیڈیمی اتر پردیش نیز نائب صدر مرکزی ترقی اردو بورڈ ہیں بڑے صاحبزادے کمال الدین حسن ماسکو میں مع اہلیہ، روسی کتب کے مترجم ایک عرصہ سے ہیں۔ منجھلے صاحبزادے غازی الدین حسن اور چھوٹے مظفر الدین حسن ہیں۔ ان تینوں کی کالج کی تعلیم علیگڑھ میں ہوئی۔ پروفیسر شروانی مرحوم کی بڑی صاحبزادی خالدہ خاتون کی تعلیم محبوبیہ اسکول میں ہوئی — گرل گائیڈس میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ مصطفیٰ کمال خاں شروانی، مسعود احمد خاں شروانی اور صاحبزادی عاتکہ خاتون کی اعلیٰ تعلیم جامعہ عثمانیہ میں ہوئی۔ لڑکے جب سٹی کالج میں زیر تعلیم تھے ایک ساتھ نواب مرحوم کی موٹر میں جاتے اور دوپہر کالج میں سب مل کر نواب مرحوم کے ہائیکورٹ کے چیمبر میں کھاتے۔ غرض یہ دونوں خاندان ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے ہیں۔

"منزل عدل" نواب ناظر یار جنگ کے مکان کا نام ہے جو حیدرگوڑہ میں انکی علمی وسماجی مصروفیتوں کا مرکز، اور عدل وانصاف اور قانونی مسائل سے انکی دلچسپی کا مظہر رہا ہے۔ جہاں سر سلطان، سر تیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو اور بھولا بھائی دیسائی اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ حصول وظیفہ کے بعد اپنی قانونی دلچسپی کو برقرار رکھنے کیلئے مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ قانون کی اعزازی پروفیسری قبول فرماکر لا کلاسس لیں اور اکثر ممتحن رہے۔ اور لا کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ناظر یار جنگ مرحوم کے ہم زلف تھے۔ جب حیدرآباد تشریف لاتے تو سعود احمد خاں شروانی کو نواب مرحوم اپنے خاندانی تعلقات کی بناء پر انکی میزبانی کے فرائض سپرد کردیتے جو تا قیام مولانا مرحوم کے پروگرام کی تکمیل میں شریک رہتے اور ہمہ وقت موٹر کار کے ذریعہ سواری کی سہولت فراہم کرکے سعادت حاصل کرتے۔ اسکا تذکرہ مولانا نے مرحوم نے صدق جدید میں انتہائی تشکر و مسرت سے کیا ہے۔ مزید برآں سعود شروانی سلمہٗ کو نواب مرحوم سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ پروفیسر شروانی مرحوم کے گرامی نامہ سے ہوتا ہے جو انہیں محبوب آباد ضلع ورنگل میں جہاں وہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کے منیجر تھے، موصول ہوا۔ "سعود میاں ..... تمہیں یہ معلوم کرکے بیحد ملال ہوگا کہ میرے قدیم دوست و شفیق بھائی ناظر یار جنگ کا ۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مسلم یونیورسٹی رائیڈنگ کلب اپنی اعلیٰ تربیت، وشاندار خوبصورت سبز ڈریس کی وجہ سے یونیورسٹی کی روایتی عظمت وشان کا مظہر ہے۔ ناظر یار جنگ مرحوم پولو اور گھوڑ سواری کے انتہائی شوقین تھے۔ رائیڈنگ کلب کے کپتان تھے۔ اپنی فطری دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے اپنے دور کپتانی میں کلب کو کافی ترقی دی۔ اسی بنا پر "کمانڈر" کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہم درس و رفقا ناظر یار جنگ کے بہت ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ بیرسٹر عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، مظفر محمد خاں جوی۔ جسٹس اسماعیل گورکھپوری۔ سرشاہ سلیمان۔ سیدراس مسعود۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سر محمد یعقوب راجہ مہندر پرتاب، قاضی عبدالغفار۔ چودھری خلیق الزماں۔ بیرسٹر محمد وسیم۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی۔ حاجی موسیٰ خاں شروانی۔ مولانا حسرت موہانی۔ ہارون خاں شروانی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحومین وغیرہ وغیرہ۔

مدرسہ اعزاء حیدرآباد۔ یتیم خانہ انیس الغربا۔ حامد علی تعلیمی وقف اور دیگر کثیر ثقافتی ادبی

اور سماجی اداروں کی عاملہ اور عہدوں پر فائز رہ کر مرحوم آخر وقت تک انتہائی عرق ریزی سے انکی صیانت فرماتے رہے۔ ۲۶ تا ۲۸ ستمبر ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا صدارت کی جس میں قائد اعظم محمد علی جناح اور نواب بہادر یار جنگ شریک رہے۔ ۱۹۴۳ء میں برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں اجلاس تعطیلات ایسٹر میں ملکہ پور برار میں آپکی صدارت میں انتہائی کامیاب رہا۔ جس میں آپ نے اپنے علمی تجربات ومفید مشوروں سے رہنمائی فرمائی۔

نواب ناظر یار جنگ کا علمی ذوق اور مطالعہ کتب کا شوق اس درجہ وسیع تھا کہ وہ کثیر رسائل و کتب خود خریدتے نیز مختلف کتب خانوں سے کتابیں حاصل کر کے پڑھتے، پابندی سے جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوتے اور اپنی عالمانہ تقریروں سے سامعین کو مستفید فرماتے البتہ خطبہ صدارت اور مخصوص مضامین کے علاوہ بہت کم لکھتے جسکی وجہ سے پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم فرماتے کہ "اگر بھائی ناظر جیسا پڑھتے تھے اتنا لکھتے تو دنیائے تصانیف میں بھونچال آجاتا"۔ منزل عدل کا کتب خانہ خانوادہ ناظر یار جنگ مرحوم کی تین پشتوں نے اپنے علمی ذوق مزاج کے مطابق جمع کیا جو قدیم وجدید، کمیاب ونایاب کتب کا ایسا عظیم ذخیرہ ہے جس سے تحقیق و تدقیق کے طالب علم کافی استفادہ کرسکتے ہیں۔ بحیثیت صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ نواب ناظر یار جنگ اکثر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رفاقت میں شریک جلسہ ہائے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور بارہا انکی صدارت بھی فرمائی۔ ایک موقع پر مولانا مرحوم نے فرمایا "نواب صاحب! سالہا سال سے ہم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تقاریر کر رہے ہیں لیکن اس کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ جواباً نواب مرحوم نے کہا "کہاں سے آئے گا! جبکہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل پیرا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ مبارک کے چالیس پیوندوں کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ہمارے لباس میں ایک بھی پیوند نہیں ہوتا"۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے ناظر یار جنگ کو نہ صرف تعلق و دلچسپی تھی بلکہ بے پایاں محبت بمنزلہ عشق کے تھی۔ اسکی ترقی سے بے انتہا خوش ہوتے اور جب بھی اس پر کوئی افتاد پڑتی دلگیر ہوکر تڑپ جاتے۔ اس کی امداد واعانت پر ہر طرح ہمہ وقت مستعد و کمربستہ رہتے، حیدرآباد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علیگڑھ کلب کے روح رواں اور بانیوں میں سے تھے۔ اور سقوط حیدرآباد کے بعد وہ اپنی رحلت ۱۶ر جولائی ۱۹۶۶ء تک مستقل صدر رہے۔ باوجود علالت و نقاہت برادرانِ

علیگ کے اصرار و خواہش پر اسٹریچر سے سنگ بنیاد رکھا۔ ان کے اعتراف خدمات میں بموقع یوم سرسید ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء علیگڑھ کلب ہال میں جو ان کے نام سے موسوم ہے ان کے رفیق دیرینہ پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم کے دستِ مبارک سے مرحوم کی رنگین تصویر کی نقاب کشائی کرائی جو انکی خدمات کی یاد ہمیشہ تازہ کرتی رہیگی۔

ناظر یار جنگ و علیگڑھ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ بالفاظ دیگر علیگڑھ ان کے تخلص کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب بھی کسی علیگ سے ملتے خوش ہوتے۔ حتی المقدور اس کار براری میں ہر طرح امداد و معاونت فرماتے۔ یہی صورت پروفیسر ہارون خاں شروانی کی تھی ان دونوں بزرگوں سے راقم الحروف (ہادی نقشبندی غفرلہ) کا دس پانچ سال کا نہیں نصف صدی کے قریب تعلق رہا۔ قریبی ربط کی بنا پر انکی اعانت و شفقتوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ علیگڑھ سے متعلق جہاں بھی کوئی جلسہ و تقریب ہوتی مرحوم اس میں ضرور شریک ہوتے۔ سید غلام پنجتن مرحوم نے اپنی نظم میں یہ مصرعہ ٹھیک ہی تو کہا تھا ؎

کوئی آئے یا نہ آئے آئینگے نواب ناظر یار جنگ

چار پانچ سال کا ذکر نہیں نصف صدی کی بات ہے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۶۰ء تک ڈاکٹر ناظر یار جنگ ایم اے۔ او کالج کے ٹرسٹی اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے۔ یہ اعزاز شاید ہی کسی اور اولڈ بوائے کو ملا ہو۔ اسی دوران ایم اے۔ او کالج مسلم یونیورسٹی میں منقلب ہوا۔ ترکِ موالات نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو جنم دیا۔ ۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی کی جوبلی ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں رحمت اللہ کمیشن کے نتائج سامنے آئے۔ ۱۹۳۴ء میں بانی یونیورسٹی کے پوتے سر سید راس مسعود مرحوم کی وائس چانسلری سے علٰیحدگی کا المیہ پیش آیا۔ ۱۹۴۷ء میں وطن عزیز کی تقسیم کے مواقعات سے مسلم یونیورسٹی دوچار ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں مرکزی وزیر تعلیم چھاگلا جی کی تدوین کردہ پالیسی نے مسلم یونیورسٹی کو موت اور زلیست اور حصول اقلیتی کردار کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اور پچاسی سالہ بوڑھا شیب شباب تک مادرِ علمی کے تحفظ کو حبّ کرتے ہوئے ۱۷ ربیع الاول ۸۶ء کو اپنے مالکِ حقیقی کے حضور میں پہنچ گیا۔　انا للہ وانا الیہ راجعون

حق مغفرت کرے۔ اپنے ایک عاشقِ صادق سے مادرِ علمی محروم ہوگئی۔

محمد عبدالوحید خاں

رشید الدین
شخص اور قلمکار

یکم اگست ۱۹۸۹ء کی بات ہے نظامت ترجمہ کے صیغہ اردو میں شرافت کے پتلے' مرنجان مرنج' باغ و بہار اور ایک خاموش مترجم جناب رشید الدین صاحب کو جو تیس سال سے اس گرانقدر ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے تھے' نائب ناظم (اردو) کے عہدہ جلیلہ پر متمکن کر دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ شخصیت جو متین ہے خود اپنے بارے میں اظہار کرنے اور تعلّی سوتے کھولنے سے رہی۔ ۲۵ سال ہم مشرب ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے رہنے اور اس اوق اور سنگلاخ زمین کی پیشہ وارانہ زندگی میں شب و روز بتانے کے بعد میں اپنے ناچیز قلم کو روک نہ سکا۔ کیسے خاموش سا بنا رہتا۔ برسوں دفتری تعلق خاطر رہا فرجیسے ترجمہ کرتے اور کرواتے اور رہبری کرتے دیکھا ہے۔ حوصلہ بلند کرتے' دقتوں کو سہل بناتے بھی دیکھا ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ دوران ملازمت قدیم اردو مسودات پر کام کرتے اور انہیں دوسری زبان کا جامہ پہناتے' وقت عرق ریزی اور جملوں کی روح سے آشنائی کرتے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ ۲۵ سال قبل ۱۹۶۴ء میں جبکہ جامعہ عثمانیہ سے میں نے ایم اے (عمرانیات) کی تین سال قبل ہی تکمیل کر لی تھی اور نظامت ترجمہ میں جونیر مترجم کی حیثیت سے مامور ہو گیا تھا مگر لا ابالی پن' غیر ذمہ دارانہ مزاج اور سیلانی پن کے باعث ملازمت سے معزول ہو گیا۔ کیسی انسان دوست ہمدرد مخلص شخصیت تھی جو میرے غریب خانہ پر کھڑی سب اردو کی خدمت کے لئے آواز دے رہی تھی۔ اس وقت سے آج تک تراجم کی ذمہ داری اور اخلاص کے پتلے کی رفاقت ناتواں اعصابی نظام کے ساتھ نبھا رہا ہوں اور انشاءاللہ آئندہ بھی نبھاؤں گا۔

قاضی رشید الدین صاحب کا جنم بیجاپور میں ہوا۔ ناگپور میں بچپن گزارا' اورنگ آباد

کا زمین بڑی مردم خیز ہے۔ اس مٹی سے یہ خمیر اٹھا ہے۔ ویسے عمر کے سفر میں مجھ سے ایک سال چھوٹے مگر دفتری عمر اور تجربہ میں اور دفتری انسلاک میں مجھ سے مکمل چار سال متجاوز ہیں۔ کہنہ مشق اور تجربہ کار اور مشاق بھی ہیں۔ اورنگ آباد اس لحاظ سے فخر و امتنان اور عزت و شرف کا باعث ہے۔ اس ارض نے ایک ایسے سپوت کو جنم دیا ہے جو گزشتہ تیس سال یعنی تین دہوں سے اردو تراجم جیسے خشک، ادق اور بیزار کر دینے والے پیشہ میں اپنا دل لگا کر اپنا سب کچھ اسے ارپن کر رہا ہے۔ یہ مذاق و دل لگی کی بات نہیں ہے "اتفاق امر بھی نہیں ہے یا منصوبہ بند بات بھی نہیں، اچھے اچھوں کے قدم ترجمہ کی زمین سے اکھڑ جاتے ہیں، طبیعت کو لگاؤ ہونا چاہیئے۔ گزشتہ ۲۵ سالوں میں، میں نے رشید الدین صاحب کو اردو تراجم سے کبھی بیزار و شاکی نہیں دیکھا، ہزاروں صفحات انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد بھی اور پروف کی اصلاح کے بعد بھی اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآمد ہو کر بھی ان میں ایک طالب علم کا شان پائی۔ تکبر، طمطراق پیشہ وارانہ شان اغماض ان سے کوسوں دور ہے۔ بسا اوقات اپنے کام پر بے جا اعتماد بھی انسانوں میں کمزوری پیدا کر دیتا ہے مگر وہ اس سے بھی مبرّیٰ ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جبکہ حیدرآباد کی نظامت ترجمہ کے صیغہ اردو میں مترجمین کی جائیدادیں مخلوعہ ہوئیں تو ۹۹ امیدواران، جن میں ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی اور جید مترجم اور اہل وکلاء شامل تھے اپنی قسمت آزمائی کر رہے تھے مگر رشید الدین صاحب کو محض ۲۲ سال کی عمر میں ان کی ذاتی صلاحیت، ذوق و شوق، تحریر کی ادا، افتادِ طبع سے گرفتار ترجمہ کیا گیا، حقدار کو حق ملا۔ علاقہ مرہٹواڑہ سے اس اردو دوست اور قابل ہستی کو جو اردو پرست ہے اور اردو کی خدمت کی راہ دیکھ رہی تھی، منتخب کر لیا گیا۔ اس حیات عارضی میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اپنی پسند کا کام ملتا ہے اور ایسے لوگ جب تک پیشہ وارانہ زندگی سے وابستہ رہتے ہیں، شکوہ و شکایات کا بازار گرم نہیں کرتے ہیں۔ یہی حال رشید صاحب کا ہے، مسٹر گیاسش نائب ناظم (اردو) کے وینکٹ لنگا راؤ، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) نے جو قدیم عثمانین اور اردو ذریعہ تعلیم کے طیلسان تھے، رشید صاحب کا انتخاب کیا تھا اور رشید صاحب نے جب تک لنگا راؤ صاحب

حیات رہے انہیں مایوس نہیں کیا۔ اکثر رشید صاحب کہتے ہیں کہ میں اورنگ آباد سے جہاں بر روزگار میسر آچکا تھا محض اردو کی خدمت اور ترجمہ کے لئے اسے تیاگ کر حیدرآباد آیا ہوں۔ تنی ہمت، کتنا حوصلہ دل میں لے کر یہ نوجوان عنفوان شباب کی ۲۲ ویں منزل میں وارد حیدرآباد ہوا۔ ان کا ورود تمام اہل اورنگ آباد کیلئے باعث فخر ہے۔

میں نے کارِ سرکاری کے دوران اس امر کا مشاہدہ، تخمینہ اور محاسبہ کیا ہے کہ پیشہ و شخصیت میں کیفیات ایک سی نہیں ہوتی ہیں لیکن جب میرا اس نظامت تراجم کے صیغہ اردو سے منسلک ہوا تو رشید صاحب ۲۷ سال کے نوجوان اور تراجم سے نبرد آزما تھے، خشک، ادق اور بہت جلد اکتاہٹ پیدا کر دینے والے میدان سے اکثر لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ترجمہ پیشہ ہو تو عذاب بن جاتا ہے۔ گزشتہ ۲۵ سال سے میں اور رشید صاحب تراجم کے طالب علم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اب پی۔ ایچ۔ ڈی اسکالرس ہیں۔ میں ان لوگوں سے زیادہ واقف ہوں جو مشکلات اور زائد کام بار گے معوضہ سے گھبرا جاتے ہیں، مگر میں نے رشید صاحب کو کبھی ایسا نہیں پایا چاہے وہ اردو سے انگریزی ہو یا انگریزی سے اردو ہو انہیں گھبراتے یا پہلو بدلتے نہیں دیکھا۔ کام کرنے، کام لینے اور کام کروانے کے فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ کتنی مستعدی ہے ان کی ذات میں، کیسے چاق و چوبند ہیں وہ، بہت ہی فعال شخصیت ہیں رشید صاحب

دفتری اور پیشہ وارانہ زندگی کی ایک بات سپرد قرطاس کرتا ہوں، تراجم کی نظر ثانی شخصیت کو ہویدا کر دیتی ہے۔ شخصیت کی شرافت، انداز اسکا بھرم سب نظر ثانی میں نظر آتا ہے، کسی جونیر مترجم کو پیشہ میں ابھرتے ہیتوں دینا ان کا کبھی وطیرہ نہیں رہا۔ شخصیت کو سامنے رکھکر کبھی وہ نظر ثانی نہیں کرتے بلکہ ایک غیر مناسب لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا مناسب لفظ تحریر کر دیتے ہیں۔ دفتری اخلاق و طہارت، اس کا پہلا اظہار ہے۔ ورنہ کسی بھی پیشہ میں گھاگ، کہنہ مشق، تجربہ کار اور باعتماد اصحاب ان موقعوں سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتے ہیں، جونیر مترجموں کی دفتری و پیشہ وارانہ عمر کا پاس و لحاظ بڑے حوصلہ کی اور صبر آزما بات ہے مجھ سے اکثر یوں گویا ہوتے ہیں کہ "ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے" میں محض اور صرف اردو ترجمہ اور اردو خدمت کیلئے اورنگ آباد سے آیا ہوں۔ آپ کے

نظریات کے مطابق سرکاری ملازمین کو صرف اسلئے دفتر جانا چاہیئے کہ اپنی اور متعلقین کی زندگی سنور جائے۔ وہ دفتر کو معاشی گروہ سے ملقب کرتے ہیں۔ دفتریت کو کبھی ترجمہ کے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔

لوگ اکثر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ عہدوں، کرسیوں، آسامیوں سے شخصیات فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ان عہدوں، کرسیوں اور آسامیوں سے شخصیتوں کو عزت، توقیر، قدر و منزلت ملتی ہے مگر میرا ذاتی خیال اور تجربہ ہے کہ ان مذکورہ عہدوں کرسیوں کو شخصیات سے توقیر ملتی ہے۔ ان عہدوں کا شان ان سے دوبالا ہو جاتی ہے۔ رشید صاحب کی شخصیت بڑی مقبول ہے۔ ترجمہ خشک اور ادق ہوتا ہے مگر حیرت ہے کہ رشید صاحب نے ظرافت و ترجمہ کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ زندہ دلان حیدرآباد کے رکن بھی ہیں اور اردو کے ایک اچھے مزاح نگار بھی۔

آپ، فطرتاً اور بنیادی طور پر ظریف، مسرور اور ہنسنے ہنسانے والی شخصیت ہیں۔ خاموشی سے ایسا ظریفانہ جملہ چست کر دیتے ہیں کہ محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ نظامت تراجم، صیغۂ اردو میں اتنی ہنسی اور خوشی کا ماحول نعمتِ غیر مترقبہ ہی تو ہے رشید صاحب مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے پہلے بیاچ کے گریجویٹ ہیں ویسے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے (اردو) اعزاز سے کامیاب کر کے وہ عثمانین بن چکے ہیں۔ دفتری آداب کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں نوکری و ذمہ داری سے مذاق ٹھیک نہیں۔ خشک ترین پیشہ سے وابستہ اس مترجم کا تین تصانیف اب تک منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ان میں ایک تو وہ مقالہ ہے جو ایم۔اے (اردو) جامعہ عثمانیہ کے لئے بغرض حصول ڈگری تحریر کیا گیا "حیرت بدایونی حیات و کارنامے" مجھے یاد ہے کہ ممتاز شاعر اور مرحوم ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ شاذ تمکنت نے بڑے ہی تمکنت سے اس پر تبصرہ میں یہ تاثر دیا تھا کہ یہ مقالہ امتحانی نقطۂ نظر سے نہیں ادبی نقطۂ نظر سے رقم کیا گیا ہے جو اس مقالہ کی عظمت کا باعث ہے۔ دوسری تصنیف "خواہ مخواہ" اور تیسری کتاب "ذکر رفتگاں" ہے۔ عبارت سہل اور جملے مربوط ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان

(باقی بر صفحہ ۵۹)

خلیل اکمل (سائنٹسٹ)

آج کے سماج پر سائنس کے اثرات

ہمارے سماج کی ترقی کا انحصار سائنس کی ترقی پر ہے ۔ کیونکہ وہ سائنس ہی ہے جس نے ہمارے لئے بیش بہا معلومات فراہم کئے ۔ آرام و آسائش اور تفریح کے سامان مہیا کئے ۔ وہ سائنس ہی ہے جس نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی راہیں ہموار کیں ۔ اور انسان کے مشاہدہ میں وسعت اور استدلال میں معقولیت پیدا کی ۔ ہمارے روزمرہ کی مصروفیات سائنس ہی سے کنٹرول ہوتی اور تکمیل پاتی ہیں ۔ سائنس ہماری روایات ، توہمات اور عقیدوں کی نفی کرکے جدیدیت کے اصولوں کو اپنانے کی تعلیم دیتی ہے تاکہ ہمارا سماج صحت مند رہ سکے ۔ سائنس قوموں کی تہذیب و تمدن کو سنوارتی ہے اور دائرہ انسانیت کو وسیع کرتی ہے ۔ اسی لئے آج سائنس کو دنیا کے تمام علوم میں ایک کلیدی اہمیت حاصل ہے ۔ سائنس ہمارے وسائل کی نشاندہی کرنے کا ذریعہ اور انسان کے فطری تجسس کا نتیجہ ہے اور اسی تجسس کی وجہ سے آئے دن نت نئی ایجادات وجود میں آتی ہیں ۔ سائنس کی ترقی کے کوئی حدود مقرر نہیں کئے جا سکتے جس کا اندازہ سائنس کی دنیا میں ہونے والی ایجادات اور دریافتوں کے لامتناہی سلسلہ سے ہو سکتا ہے ۔ سائنس کائنات کو کھوجنے ، سمجھنے اور انسان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے ۔ چنانچہ آج ہندوستانی سائنسدانوں کی محنت و کاوشوں کے نتیجہ میں جو تحقیقات رونما ہوئے ہیں ان کا اعتراف اب دنیا کے سبھی ممالک کرنے لگے ہیں اور آج ہمارے معاشرہ کی ترقی ہر طرح سے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ ہوتی جا رہی ہے ۔ اور ہمارا ملک سائنس کے ہر محاذ پر تیزی سے گامزن ہے ۔ اسی لئے ہمارے سماج کی فلاح و بہبود سائنس کی ترقی کے بغیر ممکن نہیں ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا تھا کہ " زندگی کی جملہ سمتوں اور شعبوں میں سائنس نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے ۔ مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جو سائنس کے دوست ہیں "۔

آج کل ہمارے معاشرہ کی تعمیر و تشکیل پر زور دیا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے طریقے اور تحقیق امور انجام دیئے جائیں جو ہمارے سماجی حالات میں سدھار لا سکیں۔ اور ملک سے غریبی دور کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکیں۔ یہ کام ہمارے انداز فکر میں تبدیلی لائے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا اسلئے سائنسی شعور پیدا کرنا سائنسی مزاج بنانا، سائنسی ذوق پیدا کرنا اور اس پس منظر میں ایک نئے کلچر کو فروغ دینا ضروری ہے۔ آج جبکہ سائنس کے فروغ کی بات کی جاتی ہے اس کا مفہوم بے حد وسیع ہے۔ ملک کی ترقی کا مطلب صنعتی ترقی نہیں بلکہ اس ترقی سے مراد ملک کی اقتصادی اور سماج کی ایسی ترقی ہے جس میں سائنس کا کلیدی کردار ہو۔

سائنس ایک روشن مستقبل کی حامل ہے۔ جس کا ثبوت ہمارے سماج کے مختلف ترقیاتی پراجکٹ سے ہو سکتا ہے۔ جن میں مواصلات حمل و نقل، تعلیم و صحت عامہ ایٹمی توانائی، خلائی تحقیق، زراعت اور دفاع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک نے بلاشبہ ان تمام شعبوں میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس ترقی نے ہمارے عوام کا مزاج نہیں بدلا۔ کیونکہ ایک عام آدمی کو سائنس کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم نہیں کئے گئے اس لئے کوشش یہ ہو کہ سائنس ٹکنالوجی کی ترقی سے ہمارے ملک کے ہر فرد کو فائدہ پہنچے۔ ورنہ ہم سائنس و ٹکنالوجی کے ذریعہ اپنے ملک و سماج کے مستقبل کی تعمیر نہ دیکھ سکیں گے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر شئے اپنے تعمیری اور تخریبی پہلو رکھتی ہے۔ چنانچہ سائنس کے مثبت اثرات ہمارے آج کے سماج پر حصول رہائش، صنعتی انقلاب، خلائی تحقیق، الکٹرانکس و کمپیوٹر کے فروغ کی شکل میں رونما ہوئے ہیں۔ رہائش انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے لیکن آئے دن زمین اور تعمیری سامان کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے سبب یہ مسئلہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن نیشنل بلڈنگ آرگنائزیشن کی طرف سے عمارتی سامان خصوصاً سمنٹ اور لوہے کا متبادل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آرگنائزیشن ہذا نے اینٹوں، چونے، فلائی آئش اور آم کی لکڑی کو استعمال میں لاکر کم آمدنی والے گروپ اور اقتصادی طور پر کمزور لوگوں کیلئے ایسے مکان بنائے ہیں جن پر ۱۱ ہزار اور ۵ ہزار کی لاگت آتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہرہ دون نے عمارتی لکڑی کی ایسی ۸۰ غیر معروف اقسام دریافت کی ہیں جو ہمارے ملک میں مقامی طور پر دستیاب

ہوسکتی ہیں اور یہ تعمیر کیلئے نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک میں بھاری صنعتوں کا انقلاب آیا۔ لیکن ہماری معیشت میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان میں مختصر سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے فروغ سے علاقائی عدم توازن دور ہوسکتا ہے۔ روزگار کی فراہمی میں چھوٹی صنعتیں بہت معاون ہیں۔ اور ان کے ذریعہ دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اس لئے ان صنعتوں کو ترقی دینے کیلئے کئی تربیتی مراکز اور سروس انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ہیں جہاں جدید سائنسی اصولوں سے صنعت کاروں کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ آج کی سائنس کل کی ٹکنالوجی کہلاتی ہے اب سائنس و ٹکنالوجی کے مابین فاصلہ گھٹتا ہی جارہا ہے اب یہ دونوں لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ رہائش اور صنعت کے بعد سائنس نے ہمارے سماج پر خلائی ٹکنالوجی کی شکل میں اپنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ چنانچہ سٹیلائٹ اور ٹی وی کے ذریعہ نشر ہونے والی تفریحی اور معلوماتی پروگراموں نے ہمارے سماج میں کافی ہلچل مچادی ہے۔ اس کے علاوہ سیٹلائٹ ٹکنالوجی کی مدد سے زیر زمین پانی کے ذخائر کا تعین۔ سمندر میں پوشیدہ معدنی خزانوں کی دریافت۔ طوفان و باد و باراں کی پیش قیاسی اور زمین کی زرعی موزونیت کا اندازہ لگایا جارہا ہے۔

سائنس کا ایک اور شعبہ الکٹرانکس آج ہمارے سماج کے ہر شعبہ پر اثرانداز ہے۔ اس شعبہ کی لاثانی تخلیق کمپیوٹر ہے جسکو ہماری سوسائٹی کیلئے بیش بہا عطیہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی کوئی ۵ نسلیں ہمارے مختلف خدمات پر مامور ہیں۔ کمپیوٹر سے نہایت پیچیدہ اور مشکل مسئلہ سرعت اور صحت کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے۔ کمپیوٹر سائنس نے کافی ترقی کی ہے چنانچہ آج منی۔ مائکرو اور سوپر کمپیوٹر ہماری سوسائٹی کے روح رواں بن چکے ہیں۔ یوں تو کمپیوٹر تجارت، بینک کاری اور ریلوے ریزرویشن میں مدد دیتا ہی ہے لیکن فیاکٹریوں میں اس سے وہ کام لیا جاتا ہے جو ایک مزدور کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ لوہے اور فولاد کی صنعت میں شہتیر اور فولادی چادروں کو ایک ایسا مشینی انسان تیار کرتا ہے جو کمپیوٹر سے چلتا ہے۔ اس کے علاوہ خام تیل کی صفائی، معدنیات سے کھادسازی اور کارخانے کی مختلف اشیاء کی تیاری میں بھی کمپیوٹر سے کام لیا جارہا ہے۔ و نیز طبی میدان میں

مریضوں کے ریکارڈ محفوظ رکھنے اور ان کیلئے مختلف ادویات کی موزونیت کا پتہ چلانے کیلئے کمپیوٹر استعمال ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ کمپیوٹر موت اور زیست کے تفاوت کو باقی رکھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ ہمارے سماج پر سائینس کے مثبت اثرات جس قدر دلچسپ اور فائدہ مند ہیں اس کے منفی اثرات ان سے کہیں زیادہ مہلک اور خطرناک ہوسکتے ہیں سائنس کا تخریبی دائرہ کافی وسیع ہے چنانچہ اس دائرہ میں جوہری و نیوٹران بم اور دوسرے کئی تباہ کن ہتھیار آتے ہیں جس سے آن واحد میں ساری انسانیت نیست و نابود ہوسکتی ہے مثلاً ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بموجب آج دنیا میں کوئی ۶۰ ہزار جوہری ہتھیار موجود ہیں جو ہماری معمولی غلطی یا لاپرواہی سے ساری دنیا کو تباہی کے غار میں ڈھکیل سکتے ہیں

آلودگی ہمارے سماج کیلئے سائنس کی ترقی کی دین ہے۔ آلودگی چاہے فضائی ہو کہ آبی - یہ سطح زمین پر بسنے والے ہر جاندار خصوصاً بنی نوع انسان کیلئے ایک مستقل خطرہ ہے - فضائی آلودگی کا وجود زمانہ قدیم ہی سے تھا لیکن آج ہماری صنعتی ترقی سے اس میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ فضاء کو آلودہ کرنے میں پٹرول اور کوئلہ کو بطور ایندھن استعمال کرنے والے ذرائع حمل و نقل بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ہندوستان میں ہر سال کوئلہ اور دیگر ایندھن کے جلنے سے تقریباً ۲۰ لاکھ ٹن کاربن مانو آکسائیڈ - ۲ لاکھ ٹن ہائیڈروجن سلفائیڈ گیسیں - ۱۰ لاکھ ٹن ہائیڈرو کاربنس اور ۵ لاکھ ٹن دیگر مہلک ذرات ہوا میں شامل ہوجاتے ہیں جس سے ہوا میں آکسیجن گیاس کا تناسب بگڑ جاتا ہے جس کے سبب تنفس کی بیماریاں، امراض قلب، بلڈ پریشر اور کینسر جیسے خطرناک امراض لاحق ہوجاتے ہیں۔ نیز بجلی گھروں کی فلک بوس چمنیاں بھی ماحول کی کثافت میں ہولناک اضافہ کرتی ہیں جس کا اندازہ بجلی گھروں کے قرب و جوار میں رہائش پذیر لوگوں کو ہی ہوسکتا ہے - کیونکہ ایک اوسط درجہ کے بجلی گھر سے روزآنہ ۳۰ ٹن راکھ خارج ہوتی ہے۔

آبی آلودگی ہمارے لئے اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنی کہ فضائی آلودگی ہندوستان کے اکثر شہروں اور دیہاتوں میں پینے کا پانی عموماً تالابوں، دریاؤں اور کنوؤں سے دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن آج ہماری صنعتی ترقی کے باعث فیکٹریوں سے خارج ہونے والا فاضل پانی مسلسل آلودگی پیدا کرتا رہتا ہے۔ اگر ان ذخائر آب کی بروقت صفائی عمل میں نہ لائی جائے تو یہ تالاب اور کنٹے ہیضہ، ٹائیفائیڈ، یرقان جیسے وبائی امراض پھیلا سکتے ہیں۔ آج ہندوستان کے کئی دریا آبی آلودگی کا شکار ہیں جن میں کاویری۔ دامودر

(باقی بر صفحہ [illegible])

وی ۔ بھاسکرن

تعلیم اور خواتین کی ترقی

تعلیم کے مساوی مواقع کی فراہمی کا تصور انسانی حقوق کے بنیادی عناصر میں سے ہے اگرچہ کہ اس حقیقت کو نظریاتی طور پر بہت وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم عملی طور پر اب بھی اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں جنکی وجہ سے تعلیم کے مساوی مواقع کی فراہمی ابھی تک حقیقت نہیں بن سکی ہے ۔ وہ طبقہ جو ابھی تک موثر طور پر تعلیم کے مساوی مواقع سے محروم ہے وہ خواتین ہیں جو کہ دنیا کی آبادی کا نصف حصہ ہیں ۔

تعلیم خود شناسی کی کنجی ہے ۔ لڑکیوں کو چونکہ مستقبل میں ماؤں کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوتی ہیں اس لئے ان کیلئے تعلیم ناگزیر اور انسانی حقوق، اعلان نامے کی دفعہ ۲۶ کے عین مطابق ہے ۔ خواتین کو انکی امیدوں اور آرزوؤں، انکی حقیقی صلاحیت اور حقوق کی جانکاری فراہم کرنے میں تعلیم ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے ۔ جنسی تعصب کو ختم کرنے سے متعلق سرگرمیوں اور سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ان کی مکمل شرکت کیلئے تعلیم نہایت ضروری ہے ناخواندگی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے لیکن اگر خواتین جو کہ بچوں کے اوائیلی استاد کے فرائض انجام دیتی ہیں، ناخواندہ ہوں تو اس کا اثر نوجوان نسلوں کے مستقبل پر پڑ سکتا ہے ۔

ناخواندگی بھارت میں ایک اہم مسئلہ ہے اور ناخواندہ لوگوں میں بڑی تعداد خواتین کی ہے آج بھارت میں ۶۰ کروڑ ناخواندہ بالغوں میں ۷۵ فیصد تعداد خواتین کی ہے ۔ کل آبادی میں ناخواندہ افراد کا تناسب کم ہوا ہے لیکن خواندہ افراد کی مجموعی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے ۔

خواتین کیلئے برابر کے تعلیمی حقوق حاصل کرنے میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں، سماجی اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی وجوہات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں جو لڑکیوں اور خواتین میں غلط رویے پیدا کرتی ہیں ۔

لڑکیوں کیلئے تعلیم کی شروعات اور خاتمہ گھریلو ذمہ داریوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں والدین کی

عدم دلچسپی سے منسلک ہے جبکہ والدین لڑکوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں۔

اقتصادی طور پر کمزور گھرانوں میں ماں، تھک جانے یا بیماری کی وجہ سے ۱۰ سال اس سے زیادہ عمر والی لڑکیوں کو بازار سے سامان لانے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے اور گھر کو دیکھنے کا کام سونپ دیتی ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہیکہ گھروں میں لڑکیوں سے کام لینے اور زرعی کام لینے کا رجحان بہت زیادہ ہے جسکی وجہ سے لڑکیوں کو تعلیمی اعتبار سے کامیاب رہنے کے باوجود اسکول چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں اسکولوں سے زیادہ غیر حاضر رہتی ہیں۔

خاصکر دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی جلدی شادی، زیادہ بچوں کی پیدائش اور مالی مجبوریاں لڑکیوں کو پڑھائی ختم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جلد شادی کا تعلق روایات سے ہے۔ بہت سے والدین لڑکیوں کو اسکول اسلئے نہیں بھیجتے کیونکہ اس سے مناسب لڑکا ملنے میں دشواری آسکتی ہے۔

ہماری معیشت میں مردوں اور عورتوں کو جو رول دیئے گئے ہیں وہ غیر مساوی اور مختلف ہیں۔ غیر مساوی اسلئے ہیں کہ مرد کا سماجی اقتصادی اور سیاسی رول اس طرح بڑھایا جاتا ہیکہ اس سے خواتین کو نقصان پہنچتا ہے۔ سماج میں اس نامساوی نظام اقدار سے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کیلئے تعلیم کی وہ اہمیت نہیں جو لڑکوں کیلئے ہے۔ صرف مرد ہی عورتوں کی حوصلہ شکنی نہیں کیا کرتے۔ عورتیں بھی بیٹوں اور بیٹیوں میں امتیاز کرتی ہیں۔ اور اپنے آپ کو کمتر اور کمزور سمجھتی ہیں۔

بچوں کو پالنے اور گھریلو کاموں میں اور خاندانی اور سماجی معاملات میں خواتین کو برابر کا شریک سمجھا جانا چاہیئے۔ روایتی طور پر خواتین کے ذریعہ کئے جانے والے کاموں کا سارا بوجھ انہیں پر ڈال دیا جانا صحیح نہیں ہے اور اسکی تصحیح کی جانی چاہیئے۔ کوئی عورت ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی جب ہی کر سکتی ہے جبکہ وہ بچوں کی نشو و نما حفظان صحت غذائیت، گھریلو کام کاج اور سماجی روابط کا علم رکھتی ہو۔ اس کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہیکہ عورت کو گھریلو کام سے کتنا وقت بچتا ہے اور اسکو اپنے شوہر اور خاندان کے اراکین سے کتنی مدد اور تعاون ملتا ہے۔

بچے کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نشو ونما میں ماں کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ اپنے ماحول، کھانے پینے کی عادت، سماجی طور طریقوں، ہنر، اقدار اور رویے وغیرہ کے بارے میں ماں سے سیکھتا ہے۔ اسی لئے ماں کی صحیح تعلیم ہونا بہت ضروری ہے۔

آزادی کے بعد خواتین کیلئے علیحدہ وزارت سمیت اہم ترقیات کے باوجود خواتین کی مکمل طور پر برابری اور تعلیم کے حقوق کی تکمیل ابھی تک نہیں ہوئی ہے یہ صحیح ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ خواتین کا ایک طبقہ قومی دھارے میں شامل ہو گیا ہے تاہم ان کی اکثریت کو اب بھی مزدوروں سے کم درجہ دیا جاتا ہے۔ جب ملک آگے بڑھ رہا ہے تو ہم خواتین کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتے۔

رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعہ اس برائی کے خاتمہ کیلئے کوششیں کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

کچھ تجاویز

لڑکیوں اور ان خواتین کیلئے جنھوں نے اسکول چھوڑ دیا ہے یا کبھی اسکول نہیں گئیں علمی خواندگی پر پروگرام تیار کئے جانے چاہئیں۔ ان کو ان کے شہری حقوق کے بارے میں تعلیم دی جانی چاہئے تاکہ لڑکیوں میں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو اور لڑکے لڑکیوں کو ہر میدان میں اپنے برابر سمجھیں۔

اسکولوں میں لڑکیوں کی تعلیم جاری رکھنے کیلئے نصاب کو طلباء کے سماجی اور اقتصادی ماحول کے مطابق ان کی ضروریات کے لحاظ سے بنانا چاہئے۔ اساتذہ کو اس بات کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ نصاب کو لچکدار ڈھانچے میں تیار کر سکیں مثلاً یہ کہ وہ تعطیلات میں تبدیلی کر سکیں تاکہ دیہی علاقوں میں چھٹیاں اس زمانے میں ہوں جب فصل کٹتی ہے۔ کریش کا انتظام ہونا چاہئے تاکہ لڑکیاں گھروں میں بچوں کو کھلانے کے بجائے اسکول جا سکیں۔ حکومت کو مدد اور ترغیب کے ذریعہ پرائمری تعلیم کے لئے داخلوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ کھانے اور پینے کے پانی کی سپلائی اور صحت اور خاندانی بہبود کے مراکز جہاں ضروری ہوں قائم کئے جانے چاہئیں وہ والدین و لڑکیاں جو کسی وجہ سے اسکول نہیں جا پاتے ان کے لئے شام میں کلاسیں لگنی چاہئیں حکومت کو اسکول سے باہر تعلیم کا پروگرام بنانا چاہئے تاکہ خواتین کو گھر اور سماج میں ان کے رول کی تعلیم دی جا سکے۔

لڑکیوں اور خواتین کی تربیت اور تعلیم تاحیات ہونی چاہئے۔ اپنے بچپن سے ہی لڑکیاں

کو اس بات کا احساس دلایا جانا چاہئے کہ ان کو پڑھائی دوبارہ شروع کرنے اور تربیت حاصل کرنے کے مواقع ہمیشہ دستیاب ہوں گے چاہے ان کی عمر اور خاندانی صورتحال کچھ بھی۔ لڑکیوں کو اسکولوں کی طرف راغب کرنے کیلئے مناسب روزگار حاصل کرنے کے سلسلے میں انکو رعایتیں دینا ضروری ہے۔ عمر اور دیگر ضوابط میں نرمی جس سے وہ بچوں کو پالنے کی ذمہ داریوں سے نمٹ سکیں مناسب جگہوں پر تعیناتی اور تبادلے وغیرہ کی سہولیات تاکہ ان کے کنبہ پر اثر نہ پڑے کچھ ممکنہ اقدامات ہو سکتے ہیں۔

سماجی تعصبات اور تنگ بندی چیزوں کو ختم کرنے کیلئے صرف تعلیم ہی کافی نہیں ہے کیونکہ تعلیم خود ثقافت اور سماجی روایات کا آئینہ دار ہے۔ لہذا تعلیم میں جمہوری اقدار پیدا کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ عوام میں زیادہ بیداری پیدا کی جائے اور ان کیلئے معلوماتی مہمیں شروع کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کو تعلیم و تربیت فراہم کی جائے۔ ذہنیت کو بدلنے کیلئے بہت کچھ کیا جانا ضروری ہے تاکہ خواتین پر مردوں کے تسلط کی پرانی روایت کو ختم کیا جائے۔

(بقیہ صفحہ ۳۸) اکتوبر ۸۹ء

اور کرشنا کے علاوہ بمبئی کی دریائے کالبجر اور بڑودہ کی میلسئے ماہی اور کلکتہ کی دریائے ہگلی قابل ذکر ہیں۔ آبی آلودگی کا نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ دریاؤں میں مچھلی کی افزائش نسل میں انحطاط ہو رہا ہے جس سے ایک مخصوص طبقہ کی معیشت متاثر ہو رہی ہے۔

صنعتی ترقی کا دوسرا خطرناک پہلو مہلک گیاسوں کا اخراج ہے۔ جو صنعتی انتظامیہ کی لاپرواہی کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے۔ جسکی زندہ مثال شہر بھوپال میں یونین کاربائیڈ پلانٹ سے متھائل آئسوسیانیٹ نامی مرکب کے اخراج سے دی جا سکتی ہے۔ اس حادثہ کو ہندوستان کی تاریخ میں "صنعتی آلودگی سے عظیم المیہ" سے یاد کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ غرض سائنس کے اثرات ہمارے سماج پر نفع بخش اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کوشش اس بات کی کی جائے ہمیشہ سماجی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنسی علوم پر عمل کیا جائے ورنہ انفرادی منفعت کے حصول کی کوشش میں یہی سائنس سارے معاشرہ کو تباہ کر دیگی۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

کیا اردو کوئی زبان ہے

اردو دنیا کی شائستہ اور شیریں زبانوں میں سے ہے۔ وہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر وسیع علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ دنیا میں اسکے بولنے والوں کی تعداد "آؤٹ پوسٹ لک" (امورِ خارجہ کے رسالہ) کی رو سے ۲۲۰ ملین اور یونسکو کوریر کی اطلاع کے مطابق ۱۶۰ ملین ہے۔ عددی اعتبار سے روسی، ہسپانوی اور جاپانی کا نام اردو کے بعد آتا ہے۔ اردو کے کتب خانے (کتابیں اپنے آبا کی) اردو کے قلم، اردو کی تعلیم و تحقیق اور اردو کے نشریے کسی ایک برّاعظم تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی مقبولیت نے ہر ملک کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

ہندوستان میں اردو کے بولنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ نئے اعداد و شمار کے مطابق اس کے بولنے والوں کی تعداد ۳۶ ملین کے قریب ہے جو ہالینڈ کی آبادی سے دگنی ہے۔ اس کی غزلوں کا سرمایہ، اس کے قصے، اس کا مزاح، اس کی انشا، اس کے مرثیے، اس کے شہر آشوب اور اس کی متفکرانہ شاعری باعث صد نازش ہے لیکن جس طرح ایک شہزادی کا بے مثال حسن جادو کے آئینے میں بدنما اور بھیانک نظر آتا تھا، اسی طرح غلط فہمیوں کے ظالم آئینے میں اردو کی ہر خوبصورت بات بدنما معلوم ہوتی ہے سب سے پہلے تو یہ بات کہی گئی کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے۔ ہندی کا شیلی ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، مولانا آزاد کی تقریریں اور تصنیفیں ہندی میں ہیں۔ مغلِ اعظم ہندی کی فلم ہے۔ سہراب مودی کی مرزا غالب جو صدر جمہوریہ کے انعام کی مستحق ٹھہری وہ ہندی کی فلم ہے۔ حضرت امیر خسرو، بہادر شاہ ظفر اور مرزا غالب کے سیریل سب ہندی میں ہیں یہ لوگ سفید گلاب پر لال رنگ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ سرخ گلاب ہیں۔ ان حرکتوں سے حقیقت نہیں بدل سکتی البتہ اس مشترکہ تہذیب کو نقصان پہنچتا ہے جو ہماری سب سے بڑی دولت ہے

تراکیب و تکلف لاکھ کرو، فطرت کہیں چھپتی ہے اکبر
جو مٹی ہے وہ مٹی ہے، جو سونا ہے وہ سونا ہے

اردو کا مسئلہ

ایک دلفریب تجویز

یوپی کانگریس (آئی) کے صدر بلرام سنگھ نے یوپی میں اردو کے مسئلہ کو حل کرنے کی ایک بظاہر بہت دلکش اور بہت اچھی تجویز پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو کو آٹھویں کلاس تک لازمی زبان بنادیا جائے اس طرح اردو خود بخود یوپی میں دوسری زبان بن جائے گی۔ یہ دلکش اور دلفریب تجویز یوپی میں حکمراں پارٹی کے ریاستی صدر کی جانب سے پیش ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی بہت اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اہمیت کا تقاضہ ہیکہ اس پر بے رحمی سے بے لاگ اور غیر جذباتی انداز میں کھل کر اظہار خیال کیا جائے۔ کیونکہ کچھ دنوں سے یہ افواہ۔ محض افواہ کا بھی خاصہ زد ہے کہ یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا آرڈینینس آنے ہی والا ہے۔ یہ افواہ ابھی تک خبر نہیں بن سکی ہے اور یوپی کانگریس (آئی) کے صدر بلرام سنگھ یادو کی اس تجویز سے ایک طرح اس کی تردید بھی کردی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسئلہ کا حل بس یہی ہے کہ سہ لسانی فارمولہ پوری طرح قبول ہو اور نافذ کرکے آٹھویں کلاس تک اردو کو لازمی دوسری زبان بنادیا جائے تو اردو خود بخود دوسری زبان بن جائے گی۔ یہاں خود بخود کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اردو کو باضابطہ طریقے سے دوسری زبان قرار دینے کی پھر کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ جناب بلرام سنگھ یادو نے یہ تجویز اخلاص اور پوری ہمدردی سے پیش کی ہے۔ ماضی میں سابق وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا بھی اخلاص سے یہ تجویز پیش کرچکے ہیں۔ تجویز تو دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ دلفریب اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بڑی حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے وہ یہ کہ ابتدائی اور ثانوی درجات تک اردو کی تعلیم کا سارا مطالبہ صرف ان عوام سے تعلق رکھتا ہے جو اردو کو اپنی مادری کہتے ہیں۔ اس سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور اردو کو اپنی تہذیبی وراثت سے اپنے لئے ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سارا تجربہ بتلا رہا ہیکہ

اردو کو مادری زبان کہنے والوں کو یہ حق دینے سے بھی انکار یا احتراز کیا جاتا رہا کہ وہ اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلا سکیں۔ سہ لسانی فارمولہ کے نفاذ میں اردو کی جگہ زبردستی سنسکرت کو جگہ دینا اور اردو کی جگہ سنسکرت کے استادوں کا تقرر اسی زیادتی کی روشن مثال تھا۔ جہاں حالات اتنے ناموافق ہوں وہاں آٹھویں کلاس تک اردو کو لازمی دوسری زبان بنانے کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا

اس تجویز کا سب سے خطرناک پہلو جبر کا وہ عنصر ہے جو اس تجویز میں شامل ہے۔ آخر تمام طالب علموں کو دوسری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے پر مجبور کرنے کا کیا جواز ہے اور یہ کیسے ممکن ہے؟ اس جبر کا شدید ردعمل لازمی ہے اردو پڑھنے والے صرف اس جبر کے خلاف ہیں۔ ان کو اردو پڑھنے سے زبردستی محروم کیا جاتا ہے۔ وہ زبردستی دوسروں کو اردو پڑھانے پر اصرار کرتے ہیں اور نہ ان کو اس کا حق ہے کہ وہ زبردستی اردو کو سب کے گلے سے نیچے اتارنے کی کوشش کریں لسانی جبر ایک بدترین جرم ہے۔ اردو والے اس کے مجرم ہونے پر تیار نہیں ہو سکتے۔

جناب بلرام سنگھ یادو نے اردو سے سچی ہمدردی کا ثبوت اس لئے دیا ہے کہ انہوں نے سہ لسانی فارمولہ کو پوری طرح قبول کرنے اور نافذ کرنے پر زور دیا ہے۔ یوپی ہی نہیں سارے ہندستان میں اردو کے مسئلہ کا حل صرف یہی ہے کہ جو ماں باپ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے ہیں ان کا راستہ بند نہ کیا جائے۔ سہ لسانی فارمولہ کے بموجب ان کو اپنے بچوں کو انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم کی سہولت فراہم کی جائے۔ سہ لسانی فارمولہ ایمانداری سے قبول کیا جائے اور ایمانداری سے اس پر عمل کیا جائے تو اردو کے بنیادی مسئلے کا حل نکل آتا ہے۔ اب تک کا تلخ تجربہ یہی رہا ہے کہ اردو تعلیم کے مسئلہ کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا اور اردو کے نام سے لیپا پوتی کے بہت سے کام ہوتے رہے ہے۔ یوپی میں اردو کی ابتدائی تعلیم ہمارے مدرسوں اور مکتبوں کی وجہ سے سلامت رہ سکی، دینی تعلیمی تحریک نے سب سے زیادہ یہ کام کر دکھایا لیکن یہ سب سرکاری مزاحمت، ناپسندیدگی، دبی دبی اور کبھی بہت کھلی مخالفت کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ مدرسوں اور مکتبوں کو سرکاری مدد اور اعانت کیا ملتی ان کا گلا گھونٹنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کوشش اس لئے ناکام رہی کہ اردو کے یہ تعلیمی ادارے آزاد اور خود کفیل تھے۔ سرکار کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود حال ہی میں ان پر جو چھاپہ مار حملہ ہوا ہے وہ کون بھول سکتا ہے؟ ندوۃ العلماء پہ

باقی بر صفحہ ۵۵

حبیب حق سید علی سید اللہی
صدر شعبہ اردو، شری شیواجی کالج
پربھنی - مہاراشٹرا

پنڈت جواہر لال نہرو اور اردو

کوی رابندر ناتھ ٹیگور نے سری پنڈت جواہر لال نہرو کے لئے کہا تھا کہ وہ ایسے انسان تھے جو اپنے کارناموں سے بڑے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو دنیا کے ان گنے چنے رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے جریدۂ عالم پر نقش دوام ثبت کئے ہیں۔ جمہوریت کی عالمی تاریخ میں نہرو خاندان کی طرح شاید ہی ایسا کوئی خاندان موجود ہو جس نے اپنے ملک وقوم کی بقاء کیلئے اتنا ایثار، اتنی قربانیاں اور ایسی جدوجہد کی ہو۔

پنڈت نہرو کے حسن قبول کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ جمہوری قدروں کے امین تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں کون سے نکات قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کے ذہن میں ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کی زبان اردو سے بے پناہ لگاؤ تھا ان کا ان کا پورا خاندان جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار رہا ہے اقلیتوں کے تحفظ، ان کی شناخت کی بقا نیز ان کی زبان کی حفاظت میں اس خاندان نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔

اردو کے نامور شاعر جوش ملیح آبادی نے اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں پنڈت نہرو کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت، اپنے رنگ کی طاقت، اپنی انکھوں کی مروت، اپنے تبسم کی حلاوت، اپنے خاندان کی وجاہت، اپنے دل کی آفاق دار آغوش وسعت اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے جو اس کرہ خاکی پر صدیوں کے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں سہ

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا وجود ہندوستان کا افتخار، ایشیا کا وقار، عالم انسانیت کا وقار تھا۔ وہ ان عالم اجسام
مایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے جسکو شام اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے
آباد کے معنی خیز سنگم پر گنگا جمنی چھینوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔"

معمار ہند پنڈت جواہر لال نہرو کے آبا و اجداد اٹھارویں صدی کے اوائل میں کشمیر کی پر فضا
یوں میں جا بسے تھے۔ اس زمانے میں نہرو خاندان کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے موسوم ہوگیا۔
شروع ہی سے ان کا خاندان اہل علم کا گھرانا رہا ہے۔ پنڈت نہرو کے اجداد میں جو نام ملتے ہیں
میں راج کول کا نام سر فہرست ہے راج کول سنسکرت اور فارسی کے جیّد عالم تھے ۱۷۱۶ء
دوران شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جب فرخ سیر تخت نشیں ہوا اور اس نے
یر کا پہلا سفر کیا تو اسکی ملاقات راج کول سے ہوئی اور ملاقات ہی میں فرخ سیر ان کی علمی
اقت، دانش مندی اور ان کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا اور انہیں اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔
رانہیں نہر کے کنارے بنی ایک رہائش گاہ اور جاگیر عطا کی۔ نہر کے کنارے رہنے کی مناسبت
سے کول خاندان کے افراد نے نہرو کا لقب اختیار کرلیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کا خاندانی
لقب کول سے نہرو ہوگیا۔

پنڈت نہرو کی ہمشیرہ محترمہ وجے لکشمی پنڈت نے اپنی کتاب "اپنی کہانی۔ وجے لکشمی پنڈت
کی زبانی" میں لکھا ہے کہ "میرے دادا پنڈت گنگا دھر نہرو آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے
دربار میں محکمۂ پولیس کے سربراہ تھے۔ میری دادی فارسی میں خاص شُد بُد رکھتی تھیں۔ دوران
گفتگو، فارسی اشعار استعمال کرتی تھیں۔ میرے دادا جوانی میں فوت ہوگئے۔ اس وقت میرے
والد موتی لعل نہرو ابھی کمسن تھے چنانچہ ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی نند لعل نہرو نے کی۔
والد صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی پھر الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اردو انکی
مادری زبان تھی۔ فارسی ان کی پسندیدہ زبان تھی۔"

انسان کے کردار کی تشکیل میں اسکی جبلی صلاحیت کے ساتھ تربیت اور ماحول کا بھی بہت
دخل ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو کو ابتدا ہی سے سنسکرت اور اردو کا ملا جلا ماحول ملا تھا۔ اس ضمن
میں خود پنڈت جی نے لکھا ہے "ایک اور شخصیت جو لڑکپن میں میرے بہت قریب تھی وہ

والد صاحب کے منشی مبارک علی تھے ۔ وہ بدایوں کے رہنے والے تھے ۔ اور کسی زمانے میں ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے مگر ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان کے کنبے کو تباہ و برباد کر دیا تھا ۔ اس تباہی ومصیبت سے گذر کر وہ بے حد گداز قلب بن گئے تھے اور خصوصًا بچوں کیلئے تو وہ بے حد شفیق تھے ۔ جب کبھی میں افسردہ ہوتا تو وہ مجھے تسلی وتشفی دیتے اور میری دلجوئی کرتے ۔ ان کے چہرے پر لمبی سی سفید نورانی داڑھی تھی اور میری نوجوان نظروں میں وہ قدیم معلومات کا خزانہ تھے ۔ میں ان کے پاس لیٹا گھنٹوں الف لیلہ اور دوسرے قصے کہانیاں اور ۱۸۵۷ء کے غدر کی باتیں سنا کرتا ۔"

حصول آزادی کے بعد اردو پر اور اردو والوں پر کیا گزری اس کا علم سب کو ہے ' اردو بیک جنبش قلم حکومت کے دائرہ اختیار سے خارج کردی گئی ۔ اس کی تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اردو کے سینکڑوں اساتذہ کی ملازمتیں یکسر ختم کر دی گئیں ۔ اس صورتحال نے اردو والوں کو بہت پست حوصلہ کر دیا تھا اور وہ اس ناانصافی پر احتجاج کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے ۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اردو کا نام لینا کوئی مجرمانہ فعل ہے ' انتہا یہ تھی کہ جو لوگ کسی سے صرف اس لئے محبت کرتے تھے کہ وہ اردو کا شاعر ہے یکایک ان کی محبت بیگانگی میں بدل گئی ۔

عصبیت کا ایک طوفان تھا جسکی زد میں سب سے پہلے اردو آئی ۔ اب اس طوفان کے محرکات ونتائج کا تجزیہ کرنا فعل عبث ہے ۔ بس اتنا معلوم کرلینا کافی ہے کہ آزادی کے بعد ماحول اردو کے فروغ وبقا کے لئے سازگار نہیں تھا ۔ اس ماحول سے صرف اردو والے پریشان نہیں تھے بلکہ وہ لوگ بھی پریشان تھے جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی ۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی تقریریں اور تحریریں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں ۔ پنڈت نہرو جانتے تھے کہ اردو کو صرف قانون کے ذریعہ زندہ نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس کے لئے فطرتوں کو بدلنا ضروری ہے ۔ اس لئے وہ وقتاً فوقتاً اردو کے حق میں آواز بلند کرتے رہتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا اردو کو یکسر ختم کر دینے کی جو مہم جاری تھی وہ رک گئی اور دھیرے دھیرے ماحول کو زہر ناکی دور ہونے لگی ۔ اردو کے سیاق وسباق میں پنڈت نہرو کے اس کارنامے کو بھلایا نہیں جاسکتا کہ انکا

کرشمہ ساز شخصیت نے اردو کے خلاف مہم جوئی کو ختم کر دیا۔

جب دستور ساز اسمبلی میں ابھی دستور پر بحث چل رہی تھی کہ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے "زبان کا مسئلہ" پر ایک بصیرت افروز مضمون سپرد قلم کیا تھا اور اردو بولنے والوں کو صاف او مرتح الفاظ میں اسکی ترقی اور اسکے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔ پنڈت نہرو نے دوران مضمون فرما "میں یہ مضمون وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مصنف کی حیثیت سے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں جسے زبان کے مسئلہ سے دلچسپی ہے۔

میری یہ دلچسپی مسئلہ کے سیاسی اور بد قسمتی سے فرقہ وارانہ پہلوؤں کی وجہ سے ہے لیکن مسئلہ کے وسیع تر تمدنی پہلو، مذکورہ پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں کسی زبان کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن زبان میں جو حسن ہوتا ہے اس کے روزمرہ میں جو موسیقی ہوتی ہے او الفاظ میں جو سحر اور طاقت ہوتی ہے اس کا دلدادہ رہا ہوں۔ جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ناگری رسم الخط حاوی ہوگا لیکن چونکہ میں تمدنی اور سیاسی نقطۂ ہائے نظر سے تخریبی پالیسی کو غلط سمجھتا ہوں اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اردو رسم الخط کی جہاں ضرورت ہو اسے تسلیم کیا جائے اور اسے سکھایا بھی جائے ۔۔۔۔۔

اردو رسم الخط کو تسلیم کرنا چاہیئے خصوصاً جہاں تک دستاویزات اور دوسرے کاغذات کے پیش کرنے کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اردو رسم الخط کے سکھانے کا بھی ان اسکولوں میں انتظام کرنا چاہیئے جہاں کافی طلبہ اس کے سیکھنے کے خواہشمند ہوں۔

(بحوالہ ماہنامہ - معاصر - پٹنہ - جولائی ۱۹۴۹ء)

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے اردو کی بقا و فروغ اور اسے اس کا جائز مقام دلانے کیلئے ہمیشہ کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ملک کے دستور میں اردو کو ملک کی (۱۴) قومی زبانوں میں شامل کیا گیا اور اسطرح اردو کو دوسری زبانوں کی طرح پھلنے پھولنے کے لئے تمام دستوری حقوق حاصل ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا اہم قدم سہ لسانی فارمولہ تھا جسکے تحت ہر اردو بولنے والا بچہ اسکول میں اردو ایک زبان کی حیثیت سے پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح پنڈت جی اپنی فہم و ادراک سے اردو کیلئے راستہ فراہم کر دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اردو سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار اکثر وبیشتر پریس کانفرنسوں، پبلک جلسوں اور پارلیمنٹ میں کیا ہے۔ دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا تھا۔

"اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زندگی کی دھڑکنیں موجود ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر اردو کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔ یہ ان زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کا ذکر دستور میں موجود ہے اور یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ بے شک وہ ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اردو پاکستان کی زبان نہیں ہے۔ پاکستان تو کیا ہندوستان کے علاوہ کوئی ملک اس زبان کے متعلق اپنا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

(پریس کانفرنس - منعقدہ ۲۵ اکتوبر ۵۶ء نئی دہلی)

پنڈت جی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں وگیان بھون نئی دہلی میں محکمۂ نشریات و اطلاعات کے تحت اردو اخبارات اور کتابوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اردو ہندوستان کی یک جہتی کا نمونہ ہے۔ اور نمونہ محض زبان ہی کا نہیں بلکہ طرز فکر، ادب اور تہذیب کا بھی۔ اردو حقیقتاً ہندوستانی زبان ہے۔ اسکو اجنبی سمجھنا جہالت ہے۔ ہمیں حقیقت کو پہچاننا چاہیئے اور اس زبان کو ترقی دینا چاہیئے۔"

پنڈت نہرو دراصل مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علامت تھے۔ اردو زبان وادب اور اردو شاعری کے بڑے عاشق تھے۔ اکثر وبیشتر پارلیمنٹ میں برجستہ اور برمحل اردو اشعار سنا کر داد وتحسین وصول کیا کرتے تھے۔ اردو زبان وادب کی ادا شناسی انہیں اپنے گھر سے ملی تھی۔ سبھی کو معلوم ہے ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو نے ان کی شادی کا دعوت نامہ صرف اردو زبان میں اس لئے چھپوایا تھا کہ ان کی مادری زبان تھی۔ بعض حضرات کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ نہرو جی کا اردو رسم الخط بھی بہت خوبصورت تھا۔

پنڈت نہرو اردو کو عوامی زبان سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ پنڈت نہرو کانپور چھاؤنی میدان کے جلسۂ عام سے مخاطب تھے۔ اردو ہندی میں تقریر کر رہے تھے کہ آج کل ہندوستان میں مذہبی فرقوں میں لڑائی کا سبب روحانیت کا فقدان ہے۔ جب انہوں نے "روحانیت" کا لفظ اپنی زبان سے ادا کیا تو انہیں احساس ہوا کہ اس کے معنی شاید حاضرین جلسہ نہ سمجھ سکے ہوں اسلئے

انہوں نے ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات سے اس کا ہندی لفظ دریافت کیا۔ کسی نے بتا دیا جسے سن کر پنڈت جی نے فوراً مانا۔ پر کہا کہ "روحانیت" کے معنی سب سمجھتے ہیں اس لئے بہت مشکل لفظ کی ضرورت نہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اعلیٰ انسانی واخلاقی قدروں کو سنوارنے میں بڑا موثر رول ادا کیا ہے۔ اگر پنڈت جی آزادی کے بعد ان اقدار کو مٹ جانے دیا ہوتا تو آج ہندوستان کے حالات کچھ اور ہوتے۔ بقول کسی شاعر کے۔

آبیاری کی تھی جس پودے کی اپنے وقت میں
جلوہ گر ہیں آج اس میں بیس پتوں کے گلاب

پنڈت نہرو نے اردو کے لئے فضا آفرینی کی اور محترمہ اندرا گاندھی نے اس فضا کو اردو فروغ کے لئے کارآمد کیا۔ پنڈت جی اور محترمہ اندرا گاندھی کو اس بات کا شدید احساس تھا اردو والوں کے مطالبات جائز ہیں اور ان مطالبات کا پورا کرنا ایک جمہوری حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اردو کو سارے جمہوری حقوق مل گئے لیکن آزادی ہند کے بعد اردو جس کسمپرسی کا شکار تھی اگر اس کا موازنہ آج کے حالات سے کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ مایوسی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن اردو کو اس کے جائز جمہوری حقوق مل جائینگے۔ پنڈت جی نے اردو کی خدمت کا صحیح راستہ چنا تھا اگر اس راستے کو اپنایا گیا تو اردو اپنی منزل پر ضرور پہونچے گی۔

محمد اسحاق
ایم اے - ایم ایڈ، ریٹائرڈ پرنسپل

اقلیتوں کیلئے وزیر اعظم کا پندرہ نکاتی ہدایت نامہ

ملک کی اقلیتوں کیلئے وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کا پندرہ نکاتی ہدایت نامہ شائع ہو چکا ہے جو کسی غلط فہمی سے پروگرام کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے اس کے چند ایک اہم نکات سے بالخصوص مسلم اقلیت کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ان رہنمایانہ اصولوں کے جاری کرنے کی چند ایک سیاسی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں لیکن ہمیں ان وجوہات سے بحث نہیں۔

اتنی بات تو ضرور ہے کہ مرکزی حکومت نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ملک میں ایک بڑی اقلیت ایسی ہے جو غربت اور جہالت کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور ملک گیر ترقی کے دور کے جو فوائد ہر شعبہ میں اکثریتی طبقہ نے حاصل کئے ہیں۔ ان میں مسلم طبقہ کا حصہ برائے نام ہی رہا ہے۔ خود اس ہدایت نامہ کے جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طبقہ کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہوتی رہی۔

چند دن قبل ہمارے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے دہلی میں ابوالکلام آزاد صدی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ آزادی کے بعد سے ملک میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ کھلا اعتراف وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ آزادی کے چالیس برس بعد آج مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے اب اس کے لئے کوئی خاص سروے اور اعداد و شمار جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

جدید قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے ایکشن پروگرام کے چودھویں باب میں، جو اقلیتوں کے تعلیمی پروگرام سے متعلق ہے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیمی لحاظ سے قومی سطح پر پسماندہ طبقات ہیں۔

مساوات اور سماجی انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان طبقات کی تعلیمی ترقی پر زیادہ توجہ دی جائے۔ (صفحہ ۱۱۵) سارے ہندوستان تعلیم کا فیصد ۲۷ ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فیصد ۲۰ کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اقلیتی طبقات پانچ کل آبادی کا 17.5 فیصد ہیں۔ ان میں مسلمان 11.4، عیسائی 2.4، سکھ 2.0، بدھسٹ 0.7 اور جین 0.5 فیصد ہیں۔ دوسری اقلیتوں کے افراد میں وہ تعلیمی پستی اور معاشی بدحالی نظر نہیں آتی جو مسلمانوں میں عام ہے۔

<u>اہم نکات</u> : اس پندرہ نکاتی ہدایت نامہ میں ۷ نکات فرقہ وارانہ منافرت کی روک تھام سے متعلق ہیں (۵) ملازمتوں میں بھرتی، نمائندگی اور تعلیم سے متعلق ہیں اور باقی (۳) عام نوعیت کے ہیں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے۔ آزادی کے بعد سے کوئی سولہ ہزار فسادات ہوئے۔ اگر انہیں آزاد ہند کی مدت میں پھیلا دیا جائے تو ہر دوسرے تیسرے روز ایک فساد ہوا ہے۔

ان نکات میں خاص طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (کلکٹر) اور پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں کو ان فسادات کی روک تھام کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور ہدایت دی گئی ہے کہ فسادات سے متاثرہ حساس علاقوں میں ایسے عہدیداروں کو تعینات کیا جائے جن کا ریکارڈ ان فسادات کی روک تھام کیلئے اچھا رہا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر عہدیدار اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی کرتے ہیں جن عہدیداروں کا ریکارڈ اچھا ہو گا ان کی ترقی کے وقت خاص خیال رکھا جائے گا۔ جب فسادات کی روک تھام ان کے فرائض میں داخل ہے تو پھر ان کی ترقی اور تقرر کس طرح پندرہ نکات کا جزو بن سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ بہار میں اکثر ہندو مسلم فسادات عید و تہوار کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ انگریز گورنر نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ جہاں کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوگا، اسی تاریخ سے وہاں حکام اپنے آپ کو معطل سمجھ لیں۔ احکام آتے رہیں گے اور تحقیقات ہوتی رہے گی نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس تک وہ انگریز گورنر رہا اور کسی دن کوئی فساد کی اطلاع نہیں آئی۔

ہماری مرکزی حکومت بھی بجائے ۷ نکات جاری کرنے کے صرف ایک بات یہ کہہ دیتی کہ جہاں کہیں جس ضلع میں فساد ہوگا وہاں کے متعلقہ عہدیدار فوری معطل کر دیئے جائیں گے۔ چاہے اس

پر عمل ہوتا یا نہ ہوتا لیکن اس کا اثر دیکھنے کے لائق ہوتا۔

تعلیمی پسماندگی کی جانب ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ اعلیٰ عہدیداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی دراصل تعلیم یافتہ افراد ہی کی ہو سکتی ہے۔ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ۱۰۰ میں صرف دو ہیں باقی ۲۲ فیصد میں ۱۸ فیصد افراد ایسے ہیں جنھیں خواندہ یا حرف شناس کہا جا سکتا ہے شدہ بدھ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں ظاہر ہے کہ اعلیٰ عہدوں کیلئے ان کا مسابقت میں آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خاص طور پر ریلوے، قومیائے ہوئے بنکوں اور پبلک سیکٹر کے تحت قائم شدہ صنعتوں میں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی بھرتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

ان شعبوں میں ہر سال دس ہزار آسامیاں خالی ہوتی ہیں لیکن ملک کے ایک اہم شعبہ ڈیفنس یا فوج کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے حالانکہ دفاعی خدمات میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ صرف سکھ ایسی اقلیت ہے جو آبادی کا صرف ۲ فیصدی ہونے کے باوجود دفاعی خدمات ان کی نمائندگی ان کے فیصد سے زیادہ ہے۔ جہاں تک پولیس اور دوسرے زمروں کا تعلق ہے ریاستی حکومتوں سے خواہش کی گئی ہے کہ اقلیتوں کا خیال رکھا جائے۔ ان نکات کے علاوہ اقلیتی امیدواروں کے لئے مسابقتی امتحانات میں شرکت کے لئے کوچنگ کا خاص انتظام کیا جائے سلکشن کمیٹیوں میں اقلیت کو نمائندگی دی جائے اور مرکزی وزارت داخلہ میں ایک سکشن ہوگا جو ہر سال ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہو پا رہا ہے اس پر نظر رکھے گا۔

ہمیں ان تمام نکات کی سنجیدگی اور اخلاص پر کوئی شبہ نہیں ہے لیکن جہاں تک ان کے نفاذ عمل آوری کا سوال ہے وہ نہایت مشکوک ہے حال ہی میں حیدرآباد میں سب انسپکٹر پولیس کی ... سے زائد آسامیوں پر بھرتی ہوئی جس میں ۷ مسلم امیدواروں کو لیا گیا۔ پولیس کے ذمہ دار عہدیدار نے تنقیدوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے ۳۸ فیصد مسلم امیدواروں کا تقرر کیا گیا یہ فیصد مسلم آبادی نہیں بلکہ ان امیدواروں کا ہے جو اس امتحان میں شریک رہے۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے جس پر ہمارے لیڈر اور دانشوروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارے فنی اور پیشہ وارانہ کالجوں کا تعلق ہے وہاں مسلم طلبہ

کی تعداد بڑی تشویشناک حد تک گر چکی ہے۔ بعض اعلیٰ کورس میں چار پانچ برسوں میں ایک مسلم امیدوار بھی منتخب نہیں ہوسکا۔" ان سب باتوں کا صرف ایک ہی حل رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے کالجوں تعلیمی اداروں اور ریاستی و مرکزی حکومت کی سرکاری جائیدادوں میں ۱۰ فیصد نشستیں اور جائیدادیں مختص کردی جائیں۔ بنگال کی حکومت نے مسلم امیدواروں کو ۱۰ فیصد کی حد تک اسامیاں دے کر سارے ملک کو مشعل راہ دکھائی ہے۔ جو کچھ اقلیتوں کی بھلائی و بہبود کے لئے ہدایت نامہ جاری کیا گیا ہے ان پر عمل کروانا آسان نہیں ہے۔

ہماری گزارش ہے کہ مسلم لیڈر شپ اور دانشوران نکات پر غور کریں اور اس مطالبہ کو منوانے کی کوشش کریں جو موجودہ حالات اور طویل تجربہ کے بعد یہی ایک قابل عمل حل نظر آتا ہے ورنہ چند اور برسوں میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کہاں تک پہنچ جائے گی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

ایک بڑے دینی تعلیمی کنونشن کے باوجود صورت حال پوری طرح اطمینان کی نہیں ہوئی ہے۔ مدرسوں اور مکتبوں کی سلامتی کی جنگ لڑنے والے بیچارے اردو والے اس دلکش مگر دلفریب تجویز پر کیسے خوش ہوسکتے ہیں کہ آٹھویں کلاس تک یوپی میں اردو کو لازمی دوسری زبان کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

اس تجویز سے ایک بڑا فائدہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ صرف اس تجویز کو بنیاد بنا کر اردو کے مسئلے پر حکمراں پارٹی، اپوزیشن اور ہندی کے حامیوں سے کھل کر بات چیت کی جاسکتی ہے۔ ان سے کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس تجویز کو بہت بہت شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے معذرت کرتے ہیں کہ یہ تعلیم کے معاملے میں لسانی جبر کا عنصر داخل کرتی ہے۔ اور ہم اردو والے لسانی جبر کی ہر شکل و صورت کے مخالف ہیں۔ ہم دوسروں پر کسی جبر وستم کیلئے تیار نہیں اور اپنے اوپر ہونے والے لسانی جبر کے خلاف فریادی ہیں اردو ایک بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن ان ہی کا سرمایہ ہے جن کو اس سرمایہ کی ملکیت کا دعویٰ ہے جن کے لئے اردو ایک زبان' تہذیب' ایک طرز زندگی کی علامت ہے اردو ہر حال میں ایک خاص ذہن و مزاج کی پیداوار ہے اور ایک خاص ذہن و مزاج پیدا کرتی ہے یہ اچھا ہو یا برا ہو ہم کو عزیز ہے ہم اس کو اپنے صرف اپنے لئے سلامت رکھنا چاہتے ہیں اور بس۔

(ماخوذ ــــ سرائم لکھنؤ)

تبصرہ

نام کتاب : حرفِ منطق

شاعر : عبدالعزیز منطق امجدی

ناشر : ادارہ غالب، تکیہ محبوب شاہ مومن پورہ ۔ ناگپور

تبصرہ نگار : محمد لطیف احمد، لکچرر اردو فارسی، ناگپور

عبدالعزیز منطق امجدی کی غزلوں کا مجموعہ "حرفِ منطق" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ سنتروں کا شہر اور مہاراشٹر کی دوسری راجدھانی ناگپور میں رہ کر منطق نے اپنی موزونیت طبع اور شعری صلاحیتوں کو صرف غزل کیلئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اور اسی کا ثمر "حرفِ منطق" کی شکل میں محفوظ ہے۔ چند سالوں میں شعری مجموعے اس کثرت سے شائع ہو رہے ہیں کہ "افراطِ زر" کی طرح "افراطِ شعر" پیدا ہو گیا ہے۔ گویا زیراکس مشین ہے۔ ایک منٹ میں پچاس نئی غزلیں۔

کتنے ہی ایسے شاعر ہیں۔ جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوتے ہیں۔ اگر ان کو وسائل و ذرائع میسر ہوتے تو ان میں کوئی میر اور غالب ضرور ہوتا۔ اسی بات کو منطق کے بھتیجوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ جسکی وجہ سے اپنے چچا کا مجموعہ کلام شائع کر دیا۔ "حرفِ منطق" ۸۰ صفحات پر مشتمل ۶۴ غزلوں کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ کلیم یزدانی نے اسے مرتب کیا ہے۔ اور حاجی ابوالکلام نے ان کی غزلوں کی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ غزلوں کی اصلاح مشہور ماہرِ فنِ عروض و کہنہ مشق شاعر شارق جمال نے کی ہے۔ منطق نے اپنے تخیل و اپج سے شاعری کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرنی ہے۔ لیکن اس عمارت کو سنوارنے، بے عیب بنانے، حسن و خوبصورتی پیدا کرنے اور نقش و نگار سے آراستہ کرنے کا کام شارق جمال نے کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ تاج محل بن کر نظارۂ جمال کی دعوت دے رہا ہے۔ اور دلوں کو گرما رہا ہے۔ بھلا کونسا ایسا دل ہے جو تاج محل کو پسند نہ کرے گا۔ یقیناً منطق کے کلام کو ہر صاحب ذوق پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ اور شرفِ قبولیت بخشے گا۔ "حرفِ منطق" میں شاعر کا اصل سرمایہ غزل ہے۔ لیکن ایک حمد، دو نعت اور ایک منقبت بھی موجود ہے۔ نعت میں پختگی روانی اور عقیدت کی جھلک و دمک ہے۔ شاعر دامنِ حضور صلعم تھامے ہوئے ہے۔ حضرت شارق جمال نے "قطعۂ تاریخ طباعت" میں منطق کی شاعری

کے سلسلے میں اس طرح لکھا ہے ۔

اس کے اک اک لفظ میں ہے نکتہ دل کی بات کا — اس کے اک اک شعر میں اظہار ہے جذبات کا

بار آور ہے یقیناً محنت شاعر کا نخل — اس کی ہر تخلیق میں ہے حکمت و منطق کا دخل

کچھ تصویریں ایسی ہوتی ہیں ۔ جن کا رنگ پھیکا ہوتا ہے آنکھوں میں کوئی چمک نہیں ہوتی ۔ خیالوں پر کوئی سرخی نہیں ہوتی لیکن دل میں اتر جاتی ہے اور اپنا ایک لاثانی نقش چھوڑ جاتی ہے ت اگر دل سے نکلے اور دل میں جا بیٹھے تو سمجھ لو کہ فن کا حق ادا ہو گیا ۔ یہی خوبی منطق کی ہے ۔ ، بہت ہی مخلص ، سادہ مزاج اور شریف واقع ہوئے ہیں ۔ خود کہتے ہیں ۔

اجلے لباس تم کو مبارک ہوں دوستو — اپنی تو کٹ رہی ہے بڑی سادگی کے ساتھ

جسطرح وہ سادگی پسند ہے اسی طرح ان کا کلام بھی سادہ ، سلیس اور رواں ہے ۔

منطق نے شاعری کی ایک ایسی دکان کھولی ہے جس میں ہر قسم و ہر نوع کا سامان دستیاب ہے ن کی دکان میں غزل کی روایتوں کی دلکشی و رعنائی بھی ہے ، سماج و ماحول پر تنقید بھی ۔ حسن و شق کی پیار بھری داستان بھی ۔ معشوق کی زلفیں ، شراب و مینا ، ساقی و میکدہ کا ذکر بھی ہے ۔ طن پرستی و حب الوطنی کا درس بھی دیا ہے ۔ جنگ کے خلاف علم بھی بلند کرتے ہیں ۔ اخلاقی درس بھی ی ہے ۔ خالص طنز کے نشتر بھی چلائے ہیں ۔ اپنے زمانے کے حالات کی عکاسی بھی کی ہے ۔ اور اردگرد کے ماحول پر تنقید بھی کی ہے ظلم و استبداد کے خلاف آواز بھی اٹھائی ہے ۔ واقعات نگاری بھی ہے ۔ اور سماج کے وہ عناصر جو اژدہے کی طرح منہ پھاڑے کھڑے ہیں ۔ ان کو اجاگر بھی کیا ہے ۔ بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں شاعر نے خود اپنا تعارف پیش کیا ہے ۔ اس طرح مختلف مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے ۔

اہل ہنر بھی جانتے ہیں علم داں مجھے — لکھا ہے نام میرا بھی اک فلسفی کے ساتھ

جرم کاروں نے سیاست میں قدم رکھا ہے اب — اس کے بدلے یہاں خوں ایسے بہایا جائے گا

قہر برسائیں گی اہل جہاں کی آنکھیں — مہربانوں کو بھی جلاد کا ثانی دیکھا

جھنجھوڑ دیجئے خوابیدہ ذہن انسان کو — جہاں کو پھر ہمیں اک انقلاب دینا ہے

—

دل سے نکال پھینکئے تم جنگ کا خیال — منطق لڑائیوں سے تباہی وطن کی ہے

اے راہبر نوید لو جلد آئیں گے وہ دن بھی — ایران کا وہ نقشہ تم پر کبھی عیاں ہوگا۔

پھر تیری ضرورت ہے اے عزم براہیمی — آزر کی تراشیدہ مورت کو مٹانا ہے

جس قوم کی فطرت میں ہے شان جوانمردی — اس قوم کی قسمت کو بیدار سمجھتا ہوں

زردار آگے بڑھ گئے دولت کی راہ میں — مفلس غموں کا بوجھ اٹھانے میں رہ گیا

کیوں اترتے تیرے پند و نصیحت کسی دل میں — واعظ تیری گفتار میں تاثیر کہاں ہے۔

رہزن بدل کے بھیس جو بستی میں آگئے — جو پاسبانِ شہر تھے سب دھوکہ کھا گئے

بارہا ہم نے پڑھا ملک کے اخباروں میں — عصمتیں بکتی ہیں ہر شہر کے بازاروں میں

اوز حساب روح خود آئے گی جسم میں — جانے دو جائے گی کہاں مجھے چھوڑ کر کہاں

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر اپنے خارجی ماحول، سماج، معاشرے، اپنے عہد کے نشیب و فراز، حالات و واقعات اور بدلتے ہوئے زمانے سے پوری طرح باخبر ہے۔

حالات زمانے کے پڑھ لیتا ہوں چہروں سے — ماتھے کی لکیروں کو اخبار سمجھتا ہوں

ان کی غزلوں میں نہ کوئی ابہام ہے نہ کوئی پیچیدگی اور نہ ہی رمزیت اور اشاریت ہے جو نئی غزلوں میں جلوہ گر ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنے خیالات، جذبات، احساسات کو غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

شہر ناگپور کی زرخیز زمین جہاں ادب و شاعری کی آبیاری کر رہی ہے۔ اس کے ماحول میں شاعروں کی آواز فضاؤں میں گونجتی رہتی ہے۔ اس لئے منطق کی شاعری میں بھی ہماری شاعری کی روایتی آب و تاب نظر آتی ہے۔ جو ناگپور کا امتیاز ہے؛ تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی قوت، رخیال کی صحت نے منطق کے کلام کو قدیم و جدید کا لطیف امتزاج بخشا ہے۔ تعارف میں حاجی والکلام لکھتے ہیں کہ :-

"ان کی شاعری کو روایت اور جدیدیت کا امتزاج کہنا غلط نہیں ہوگا"

منطق کا اسلوب بیان و طرز ادا اکتسابی ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ وہ فکرِ سیماب اکبرآبادی اور داغ کے اسلوب سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔

داغ کا کا اسلوب لے کر فکر سیمابی کیا تھا   آپ منلق شاعر علم دہنر ہو جایئے

انہوں نے "اظہاریہ" میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف بھی کیا ہے اور دوسری طرف اقبال اور غالب کے اشعار بھی خوب سمجھتے ہیں ۔

منلق مجھے قسمت سے حاصل ہے سخن فہمی   اقبال کے غالب کے اشعار سمجھتا ہوں

ان کا اپنا دعویٰ کہ ان کی عزت و آبرو شہرت و نام آوری کا سبب صرف ان کے اشعار ہیں بلکہ وہ سرخرو ہو گئے ہیں حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے ۔

میری عزت کو سب منلق مرے اشعار تھے   شاعری مجھکو جہاں میں سرخرو کرتی رہی

یہ حقیقت ہے کہ انسان جس چیز پر اپنا وقت، محنت، صلاحیت، قابلیت صرف کرتا ہے وہ اسے حاصل ہو جاتی ہے ۔ منلق نے اپنی تمام توانائی صرف شاعری پر صرف کی ہے ۔ تب کہیں جاکر انہیں یہ کہنے کا حق حاصل ہوا ہے ۔

منلق مری لگن نے کیا مجھکو سرخرو

کتاب کا گیٹ اپ رنگین، دیدہ زیب ہے ۔ خوبصورت کتابت و طباعت سے آراستہ ہے

یہ ذرہ اپنی جگہ آفتاب جیسا ہے

پتہ چلا ہمیں منلق کو آزمانے سے

سلسلہ صـ ۳۴

کا تام ان کی شخصیت میں حلول کر گیا ہے، کسی بات پر برا نہ ماننے کی اور دل موہ لیتی ہے ۔ کوئی خاکہ ہو، یا شخصیت کا تجزیہ ہو اس وقت تک مکمل نہیں جب تک کہ شخصیات کے تحت، ذاتی کمزوریوں کو واشگاف نہ کیا جائے، رشید صاحب میں اگر کوئی کمزوری ہے تو یہ کمزوری ہے کہ وہ تلخ و نامناسب بات کو بھی پی جاتے ہیں ۔ سختیوں پر صبر کرتے ہیں ۔ تعلقات میں بدمزگی پیدا نہیں ہونے دیتے ۔ خوش مذاق ہیں اور کہتے ہیں کہ "میاں ٹالا دینا چاہیئے"

میں نے محسوس کیا کہ یہ ادا انسانی حیات اور نفسیات میں اہم ہے ۔ کہتے ہیں مترجم ترجمہ کرتے کرتے اصلیت کھو بیٹھتا ہے مگر ترجمہ کے ساتھ وہ ادیب بھی ہیں، علم دوست اور انسان دوست بھی ہیں ۔ وہ عہدہ دار کم ہیں اور دوست زیادہ ۔

تبصرہ

تبصرہ نگار: محمد یعقوب الرحمٰن

نام کتاب : گہوارۂ علم و ہنر
شاعر : جگن ناتھ آزاد
قیمت : ۲۵ روپئے
ملنے کے پتے : انجمن ترقی اردو ہند - اردو گھر - راؤز ایونیو --- نئی دہلی ۔
۲): مکتبہ جامعہ اردو بازار --- جامع مسجد دہلی ۔

اردو دنیا میں پنڈت جگن ناتھ آزاد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ ہمارے ملک میں علامہ اقبال کے نام اور کلام کو نہ صرف عوام بلکہ خواص تک پہنچانے میں موصوف کی کوششوں کا بڑا دخل ہے ۔ علامہ اقبال سے بے انتہا عقیدت نے ان کی زبان کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ اکثر ان کے کلام پر علامہ کے غیر مطبوعہ کلام کا گماں ہوتا ہے ۔

اپنے وطن عزیز کی شاندار روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ صاف ستھری زبان اور سلجھے خیالات نے ان کے کلام کو علامہ اقبال کے کلام سے قریب تر کرنے میں موثر رول ادا کیا ہے ۔

جگن ناتھ آزاد نے سیلانی طبیعت پائی ہے ۔ پچھلے دنوں روس بھی ہو آئے ۔ گہوارۂ علم و ہنر اسی سفر کی دین ہے ۔ اس مختصر مگر اہم کتاب میں ۳۱ نظمیں شامل ہیں ۔

اہل علم و دانش سے موصوف کو جو عقیدت ہے اس کا اندازہ نظم "تعبیر خواب" کے اس شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ۔

احترامانہ ذرا شہر و خیاباں سے گذر
کہ اسی دیس میں ہیں پشکن و چیخوف کے گھر

ہمارے علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی ورثے سے اہل روس کی دلچسپی اظہر من الشمس ہے ۔ اجنبی دیس میں پہونچ کر ان کی زبانوں سے اپنوں کے تذکرے سن کر جگن ناتھ پھولے نہیں سماتے اور بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ۔

میرے عزیز وطن !
عجب مقام پہ لاتی ہے مجھکو وقت کی رو

کہ ہر زبان سے تیرا ہی ذکر سنتا ہوں
کسی زباں پہ ہے گاندھی، کسی پہ راما ئن

. . . .

تیرے ادب کو کوئی ماں کا دودھ کہتا ہے
(نظم لیتھوانیا میں ایک دن)

غیروں کی زبان سے اپنوں کا ذکر آزاد کو بھارت کے شاندار ماضی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور وہ اپنے ماضی کو اسطرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

میں سوچتا ہوں کہ تیرے چراغ شوق کی ضو
کہاں کہاں نہ گئی۔

گہوارۂ علم وہنر کی دوسری اہم نظمیں "کریملن" "تیری عظمت کو سلام" اور "لینن" ہیں ۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ روس کے علمی، ادبی و ثقافتی سفر کے مطالعہ کے شائقین کے ساتھ ساتھ عام قاری کیلئے بھی "گہوارۂ علم وہنر" میں بہت کچھ ہے۔ کتاب نہ صرف شاندار بلکہ جاندار بھی ہے ۔ سر ورق انتہائی سادہ، عبدالغنی راجستھانی کی جاذب نظر کتابت اور دیدہ زیب گیٹ اپ کو دیکھتے ہوئے اس گرانی کے دور میں کتاب کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ۔

تبصـــرہ

تبصرہ نگار: مومن خاں شوق
اشرف ولا، ٹولی چوکی، حیدرآباد

لفظوں کا بدن (شعری مجموعہ)
مصنف: شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
پبلشر: " " " "
صفحات: ۱۲۴، قیمت: ۱۵/- روپیے
طباعت: نوری پریس کانپور، اترپردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

نام شفیع اللہ خاں، تخلص راز اٹاوی ہے۔ آپ ۱۲ر اپریل سنہ ۱۹۳۲ء کو محلہ ثابت گنج اٹاوہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے، ایم اے (تاریخ) سے کیا اور درس تدریس کو اپنایا اور آج کل شوزاق کالج (اٹاوہ۔ یوپی) سے منسلک ہیں اب تک تین مجموعہ "تنہائی زادے" "قلم کا لہو" اور "چور ما" منظرعام پر آکر مقبولیت پا چکے ہیں۔ آپ کا کلام ملک کے ہر معیاری اور ہر مزاج کے جرائد میں اکثر و بیشتر چھپتا رہتا ہے۔

راز اٹاوی اردو کے مشہور و معروف کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں خلوص و محبت سنجیدگی وقار اور فن کی آگاہی، بیان کی شگفتگی، فنی بصیرت اور بیان کی دلکشی بدرجہ اتم موجود ہے۔ راز صاحب اخلاقی قدروں کو بڑے مثبت اور جمالیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری میں کئی جگہ قدیم و جدید لب و لہجے کا خوبصورت سنگم ملتا ہے۔ ان کی شعری فکر کا بہاؤ ایک صاف و شفاف نہر کی مانند ہے جو اپنے بہاؤ سے قرب و جوار کے ماحول کو تازگی دیتی ہے۔ انہوں نے روایت کا پوری طرح احترام کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ زمانہ کا بھی بلند قدری سے ساتھ دیا ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ راز صاحب نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور برتا ہے۔ "لفظوں کا بدن" سے چند اشعار پیش کر رہا ہوں مطالعے سے آپ خود ہی شاعر کے کلام کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

زندگی کی تلاش میں ہم لوگ — موت کے درمیاں سے گزرے
راز ہر لفظ اک معمہ ہے — کون سمجھے گا زندگی کی کتاب

آپ آئیں تو روشنی ہو جائے — گھر کا تاریک کونا کونا ہے
ان کے ہاتھوں میں ہے یارب اہتمام روشنی — زندگی گزری ہے جن کی تیرگی کی قید میں
تمام دن جو گناہوں کا کاروبار کرے — تمام رات دعا کے ثواب مانگے ہے
آدمی تو ہیں بہت انساں نظر آیا نہیں — لٹ رہی ہے عظمت انساں کسے آواز دوں
آدمی تو خاک کے بستر پہ سو جاتا ہے راز — جاگتی رہتی ہے لیکن زندگی فٹ پاتھ پر
ذرا سی دیر میں دنیا تباہ ہو جائے — تباہیوں کا وہ ساماں، ہوا میں اڑتا ہے
صرف یہ اہل نظر سمجھے ہیں راز — ہے نئی تہذیب نابینا ابھی
کیا خبر تھی کہ خاک کا پتلا — آسمانوں کے خواب دیکھے گا۔
ہمیں سے آپ وہی نظریں بدل کر بات کرتے ہیں — سکھائے تھے جنھیں آداب بزم زندگی برسوں
روش روش پہ شہیدوں کا خون چھلکا ہے — بتا رہی ہیں بہاروں کی سرخیاں یارو
گریہ کناں زمیں ہے، فلک اشکبار ہے — انسانیت کا خون بہانے چلے ہیں لوگ
جب اندھیرے زمیں پہ بڑھتے ہیں — عرش سے روشنی اترتی ہے۔

۱۲۸ صفحات کے اس شعری مجموعہ میں کتابت کی غلطیاں ایک آدھ جگہ رہ گئی ہیں لیکن مجموعی طور پر کتابت اور طباعت گوارا ہے۔ اس مجموعہ کو ادب میں مقام ملنا چاہیے تاکہ مشک کی طرح ان کی شاعری دنیائے ادب میں مہکتی رہے۔

عمر سالم المحضار العیدروس

اردو زباں کی عظمت

سعودی عرب کے نوجوان شاعر عمر سالم المحضار العیدروس شعر و ادب سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں، عربی کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی عشق ہے۔ اردو میں شاعری کرتے ہیں اور عربی شاہکاروں کا منظوم ترجمہ کر کے اردو سے روشناس کرتے ہیں۔ اپنی اردو شاعری کی وجہ سے اکثر و بیشتر دنیا بھر میں منعقد ہونے والی شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت فرماتے رہے ہیں، ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں اپنی شعری تخلیقات پر انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں، عمر سالم اردو کو بین الاقوامی زبان بنانے میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں، گزشتہ سال انہوں نے ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف معتمد عمومی مسلم ورلڈ لیگ کی صدارت میں جدہ میں کامیاب اردو عربی مشاعرہ منعقد کیا اور اب بین الاقوامی مشاعرہ کے انعقاد کیلئے مصروف عمل ہیں۔ اردو کے بارے میں موصوف کا ایک قطعہ اور ایک نظم شاداب کے قارئین کی نذر ہے۔ [ادارہ]

روشن ہے شمعِ اردو پروانے آگئے ہیں
ہر گوشۂ جہاں سے دیوانے آگئے ہیں
جام و سبو و کاسہ و پیمانے آگئے ہیں
سب شیخ اور برہمن میخانے آگئے ہیں
کس تمکنت سے نکلی صدا کن بیان ٹھہری
سب جسم ٹھہرے یہ جان جان ٹھہری
اردو زباں کی شہرت کا اب نہیں ٹھکانہ
اس کی افادیت کا ہے معترف زمانہ
ہر شخص گا رہا ہے اب ایک ہی ترانہ
ہر شاخ گلستاں پر اردو کا آشیانہ
تہذیب کی امیں ہے اقدار کی امیں ہے
اشعار کی امیں ہے افکار کی امیں ہے
کردار کی امیں ہے دستار کی امیں ہے
اردو زبان سارے سنسار کی امیں ہے
ہم سب کا ربط باہم اردو زبان ٹھہری
ہر نسل اور زمیں کا یہ آسماں ٹھہری

قطعہ

اردو کسی نواب کی جاگیر تو نہیں
اہل جنوں کے پاؤں کی زنجیر تو نہیں
اک ربط کی زبان ہے تکفیر تو نہیں
اردو سے عشق کرنے پہ تعزیر تو نہیں

ماہنامہ — حیدرآباد

شاداب

جلد (٦٦) شمارہ (١١) — نومبر ۸۹ء

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری	رشید الدین	کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

قیمت -/5

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال	90 〃	270 〃	65 〃	36 〃	205 〃 〃
تاحیات	1000 〃	2500 〃	650 〃	300 〃	2000 〃 〃

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147 - 5 - 11، ریڈ ہلز، حیدرآباد (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپوا کر دفتر شاداب 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی) سے شائع کیا

فہرست

حرف اول	ایڈیٹر	۳
رابطہ ادب اسلامی ۔ رپورٹ	محمد رابع حسنی ندوی	۵
محمد عبدالحق اور اورنگ آباد	رشید الدین	۱۲
ناظر پچا ۔ چند یادیں	مصطفیٰ شروانی	۱۹
قانون سرکاری زبان	اداریہ روزنامہ "سیاست"	۲۱
اردو زبان میں تحقیق و تخلیق کے مسائل	محمد عبدالوحید خاں	۲۳
برگ و بار ۔ ایک جائزہ	سید اعظم ہاشمی	۲۶
بھارت میں تعلیم ۔ ایک جائزہ	پی آئی بی	۳۴
تعلیم بالغان اور قومی یکجہتی	پی آئی بی	۳۶
قومی شعار	پی ۔ روندرناتھن	۴۰
سمگن واڑی	پی آئی بی	۴۶
شہاب نامہ : یورپ کے صوفی	قدرت اللہ شہاب	۴۸
ہمارا سفر کشمیر	قاضی محمد علی الدین	۵۷
چنا جور گرم	رؤف خیر	۶۰
غزلیں	ثریا صولت و بدیع الزماں خاور	۶۱
بھری برسات	غازی القوصیبی / قاضی سلیم	۶۲
غزلیں	حمید انصاری و الفت شرفی	۶۴

حرف اول

آندھرا پردیش میں اردو ہندی منچ

ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد نے ایک دفعہ پھر ملک کے اتحاد اور یک جہتی کو بنائے رکھنے کیلئے قدم اٹھانے میں پہل کی ہے ۔ چار سو سال قبل اس شہر کے بانی محمد قلی قطب شاہ نے ہندوستانی ملی جلی تہذیب کی بنا ڈالی تھی ۔ وہ کئی زبانوں سے واقف اور فارسی تلگو و ہندی زبانوں کا ماہر تھا ۔ اس نے ایک نئی عوامی زبان کی ترویج کی ۔ اور اس میں شاعری کی ۔ اس کے ضخیم دیوان کی بدولت اردو والے اُسے اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہتے ہیں اور ہندی والے ہندی کا پہلا صاحبِ دیوان ۔ اس کے بعد اردو اور ہندی میں دوری بڑھتی گئی ۔ اور آج نتیجہ یہ ہے کہ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا قانون پاس ہوا تو کئی بے گناہوں اور اس قضیہ سے غیر متعلق لوگوں کا خون بہایا گیا ۔ شمالی ہندی علاقے میں اردو کی مخالفت کی جاتی ہے تو جنوبی غیر ہندی علاقے میں ہندی کی مخالفت کی جاتی ہے ضرورت ہے کہ یہ دونوں مخالفتیں ختم کی جائیں اور اردو ہندی والے دونوں ملکر ہندی کو قومی زبان بنوائیں اور اردو کو رابطہ کی زبان ہونے کا اعتراف کریں گویا یہ مہاتما گاندھی کی "ہندوستانی" ہو جو دیو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے ۔ اور یہ وہی زبان ہو جو عام طور پر پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ اس سمت میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کے لئے کمر ہمت باندھکر حیدرآباد کے منچلوں نے "آندھرا پردیش اردو ہندی منچ" کا قیام عمل میں لایا ہے ۔ اس کے صدر جناب سید لطیف سیٹھ ہیں اور نائب صدر شریمتی اوماشانتی گوڑ ، جنرل سکریٹری شری پرشوتم پرشانت اور سکریٹری جناب حفیظ خاں مذاق ۔

گورنر شریمتی کمود بین جوشی نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو منچ کی رسم افتتاح انجام دیتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے امن و یکجہتی ، بھائی چارگی اور اتحاد اور تمام

لیے جو کام اور کاز کیلئے کام کیا ہے اور آج جب کہ ملک میں لسانی انتشار پھیل رہا ہے اردو ہندی منچ قائم کرکے نہایت ضروری، اہم اور بر محل اقدام کیا ہے۔ اور لسانی یکجہتی کی راہ میں ملک کو ایک راہ دکھائی ہے۔ مشہور صنعت کار راجہ رام شرن سنگھی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کیا کہ اردو ہندی دو بہنیں ہیں اور ایک ہی ماں کی اولاد، دونوں زبانیں ایک ساتھ آگے بڑھ سکتی ہیں اور ہندی منچ نے بھی بیڑہ اٹھایا ہے۔ ہمارے ممتاز اور سینیئر صحافی شری بدھ ویرجی نے خطاب کرتے ہوئے سنگھی صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اردو ہندی دو بہنیں ہی نہیں ہیں بلکہ جڑواں بہنیں ہیں البتہ ایک نے فارسی کا لبادہ اوڑھ لیا اور دوسری نے سنسکرت کا۔ اب اردو نے بڑی حد تک یہ لبادہ اتار پھینکا ہے اور آسان اور عوامی زبان بنتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندی کو بھی آسان اور عوامی زبان بنایا جائے۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں جڑواں بہنوں میں نہ صرف اختلاف کے بیج بوئے بلکہ انہیں سوکنوں کے درجہ میں لا کھڑا کیا، حیدرآباد نے اردو ہندی منچ بنا کر ملک کو لسانی یکجہتی کا راستہ بتایا ہے۔ دونوں زبانوں کو جوڑنے اور ترقی دینے کا کام شروع کیا ہے۔

منچ کے صدر جناب سید یٰسین سیٹھ نے اپنے خطبہ صدارت میں اردو ہندی کو جوڑنے اور ترقی دینے کے کام کی ضرورت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ دونوں زبانوں کو ملانے کے متعدد اقدامات کے منجملہ منچ اردو شعر و ادب کو دیوناگری رسم الخط میں اور ہندی تخلیقات کو اردو رسم الخط میں شائع کرنے کے انتظامات کریگا۔

- زر تعاون کی عدم وصولی کے باوجود "شاداب" آپ کو بھجوایا جارہا ہے۔
- "شاداب" آپ کو پسند ہے تو زر تعاون روانہ فرمائیے
- اگر ناپسند ہو تو خط سے اطلاع دے دیجئے تاکہ آپ کے نام "شاداب" بند کر دیا جائے اور ادارہ نقصان سے بچے

محمد رابع حسنی ندوی
معتمد رابطہ ادب اسلامی، پوسٹ بکس ۹۳
لکھنؤ۔ یوپی   رابطۃ الادب الاسلامی

معتمد کی رپورٹ

[رابطہ ادب اسلامی کا پانچواں سالانہ مذاکرہ علمی ۶ - ۸ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ۷ - ۹ اکتوبر ۱۹۹۱ء حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ مذاکرہ کا عنوان "تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ" تھا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے "خلافت تحریک اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی" پر مقالہ پڑھا جو شاداب اکتوبر ۱۹۹۱ء میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اب معتمد رابطہ جناب محمد رابع حسنی ندوی کی رپورٹ پیش ہے جس سے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مساعی کا اندازہ ہوتا ہے آئندہ صدر رابطہ محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خطبہ پیش کیا جائے گا جس سے آئندہ لائحہ عمل کیلئے روشنی حاصل کی جا سکیگی ۔ ادارہ]

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی خاتم المرسلین محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

اما بعد، حضرات! رابطہ ادب اسلامی کا یہ ادبی اجلاس جو مذاکرۂ علمی کے نام اور کام سے منعقد کیا جا رہا ہے، پانچواں سالانہ اجلاس ہے، اس سے قبل لکھنؤ میں دو، جے پور و اورنگ آباد میں ایک ایک مذاکرہ علمی منعقد ہوئے، جن میں نہ صرف ہندوستان کے بلکہ بیرون ہند کے بھی مندوبین نے شرکت کی۔ ہمارے اس پانچویں مذاکرۂ علمی میں بھی بیرون ہند کے متعدد حضرات تشریف لائے ہیں اور بعض آنے والے ہیں، اس وسیع شرکت سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کام کی اہل علم و ادب نے کتنی قدر افزائی کی ہے۔

رابطۂ ادب اسلامی ہند کی طرف سے آج یہ پانچواں سالانہ مذاکرۂ علمی حیدرآباد میں منعقد ہو رہا ہے۔ ادب کے مختلف پہلوؤں کو اسلامی تصور کی روشنی میں اجاگر کرنے اور ان کو

ملہ پہونچانے کیلئے تقریباً چار سال سے سنجیدہ اور ٹھوس طریقہ سے کوشاں ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے "ادب اسلامی کی حقیقت و ضرورت" افسانہ، تنقید و سوانح نگاری کا اسلامی ادبی جائزہ" حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والے ادب کا جائزہ۔ "اسلام اور مغربی نظریات ادب" نعت گوئی کا ادبی جائزہ، جیسے مضامین کو اپنے مذاکرات علمی کا موضوع بنایا۔

حضرات! رابطہ ادب اسلامی کی اس انجمن کی تشکیل کی ضرورت آج سے آٹھ سال قبل ندوۃ میں منعقد کئے جانے والے ادب کے ایک عظیم عالمی سمینار میں محسوس کی گئی تھی، پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کے سلسلہ میں مختلف مشوروں کے بعد مکہ مکرمہ میں عرب اور برصغیر کے چند اہل علم دانشوروں نے اس کی تشکیل کا فیصلہ کیا، جس کو باضابطہ طور پر ادب اسلامی کے دوسرے عالمی اجتماع میں ندوۃ العلماء ہی میں ۱۹۸۶ء کے آغاز میں منعقد کیا گیا اور جس میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور متعدد عرب ممالک کے مشہور ادباء اور ممتاز اہل علم جمع ہوئے تھے، باقاعدہ قائم کیا، ادب اسلامی کی اہمیت اور ضرورت کے سلسلہ میں جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندوی کی توجہ دہانی اور عملی پیش قدمی کو جو خصوصیت حاصل رہی تھی، اس کو محسوس کرتے ہوئے اس انجمن کا ان کو صدر منتخب کیا گیا۔ اور صدر دفتر لکھنؤ میں رکھا گیا۔ لیکن کام کی وسعت و عالمیت کے پیش نظر دفتر کو دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک صدر دفتر کے عرب و جوار کے ممالک کے لئے، اور دوسرا علیا دعربیہ اور اس کے پڑوس کے ممالک کے لئے مخصوص کیا گیا، اور دونوں شعبوں کے لئے ایک ایک نگران کار و سربراہ مقرر کیا گیا، جو صدر انجمن کی ہدایت و اجازت سے کام انجام دے، چنانچہ دفتر کے دونوں حصے صدر انجمن اور مجلس شوریٰ کی رہنمائی میں اپنی ذمہ داریوں تین سال سے زیادہ مدت سے باقاعدہ انجام دے رہے ہیں۔ اس میں ادب اسلامی کے موضوعات پر لٹریچر کی تیاری، مجالس مذاکرہ کا انعقاد اور دیگر علمی و ادبی کام شامل ہیں۔ اس میں برصغیر ہند و پاک اور متصل علاقہ کے شعبہ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، اور جنوبی افریقہ میں اپنے مندوب مقرر کئے جنھوں نے رابطہ ادب اسلامی کی مقامی شاخوں کی تشکیل کی اور مناسب نہج پر کام کا آغاز کیا۔ ملیشیا میں بھی اس سلسلہ میں کچھ سلسلہ جنبانی ہوئی

صدر دفتر اور اس کے متعلقہ شعبوں نے ادب اسلامی کے سلسلہ میں کچھ لٹریچر بھی شائع کیا ہے، اور اس رخ پر بھی خاصا کام ہو رہا ہے۔ عرب اور اس سے متصل خطے میں سعودی عرب، اردن، مصر کے علاوہ ترکی میں بھی ادب اسلامی کے نمائندے اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ ابھی حال میں استنبول میں ایک کانفرنس اور سمینار بھی منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ اور بچوں کے ادب پر پُر مغز مقالے پیش کئے۔

حضرات! ادب اسلامی کا موضوع واقعتاً دلچسپی اور قدر دانی کا ہے، اس کے ذریعہ ایک طرف ذوق ادب کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے لیکن دوسری طرف دین و ملت کا ایک جائز اور ضروری تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ادب کے ساتھ اسلامی کیوں؟ ادب ایک آزاد فن ہے، اس کو کسی بھی شکل میں پابند سلاسل کیوں کیا جائے۔ اس پر اسلامی کی قید کیوں لگائی جائے؟

حضرات! ادب کا میدان کار، ہمارے ارد گرد کا یہ عالم، ہماری متنوع زندگی اور پھر ہماری ذاتی شخصیت ہے۔ یہ تین حقیقتیں ہیں، ان حقیقتوں کے بارے میں انسانوں کے تصورات مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی اساس خدا، کائنات اور زندگی کے بارے میں انسانوں کے تصورات کا اختلاف ہے، مذہب کے حامل لوگوں کے تصورات علاحدہ اور مذہب سے باغی لوگوں کے تصورات علاحدہ ہیں، دنیا پر جب سے یورپ کے صنعتی اور فکری انقلاب اور فلسفوں اور افکار کا اثر پڑا، متمدن دنیا کے ذہن میں ایک خاص تبدیلی آئی، یورپ مذہب سے باغی ہوا تو اس نے اپنے اثر و طاقت سے تصورات کی مذہبی اساس کو بہت نقصان پہونچایا، اور طرح طرح کے آزاد فلسفے اور نظریے پیدا کئے جو نہ تو ہمارے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ تھے اور نہ ہمارے مشرقی ذہن سے۔ جب خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں خیالات میں تبدیلی آئی تو فطری طور پر ادب میں جس کا دائرہ عمل ان ہی سے متعلق ہے، تبدیلی آئی، اور اس میں طرح طرح کے نظریے وجود میں آ گئے، جن کا سرا خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں یورپ کے ملحدانہ تصورات سے ملتا ہے۔ اس طرح موجودہ دنیا پر یورپ کے سیاسی اور فکری تسلط کے نتیجہ میں ادب و ثقافت کی قدروں میں تبدیلی کا ایک ایسا سلسلہ

قائم ہوا جس سے بہت سے خاکے ٹوٹ گئے اور نئے خاکے بنے، اور لوبار بنے اپنے نئے نئے گھروندے بنائے، جو کلاسیکیت اور اسکے بعد رومانیت اور متعدد نظریات سے گزرتے ہوئے جدیدیت کی نئی شکلوں کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے سلسلہ میں ہم جو بھی رائے قائم کریں لیکن ہمارے مشرق کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ادب کے اسالیب اختیار کرنے میں اور اس کی نظریاتی بنیادیں مقرر کرنے میں جو بھی تنوع اختیار کیا جائے، اس میں خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں ہم کو آسمانی رہنمائی کی پابندی کرنا ہے۔ اس کا دامن نہیں چھوڑنا ہے، بالفاظ دیگر ہم کو ادب سے انسانوں کو خدا سے دور اور ہوا و ہوس کا شکار نہیں بننے دینا ہے۔ اس ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہمارے پاس اسلام کے بتائے ہوئے اصول سب سے اعلیٰ اور مطابق ضرورت اصول ہیں، جن میں ادب کو پوری حریت و وسعت عطا کرنے کے ساتھ خدا بیزاری، انسان آزاری اور خواہش نفس کی غلامی پر پابندی لگائی گئی ہے، ہمیں یہ پابندی قبول کرنا ہوگی ورنہ ہم پورے عالم کے انسانی نظام کو ایسا نقصان پہونچانے کا باعث بنیں گے جس کی تلافی آسان نہ ہوگی۔ یہی وہ دعوت ہے جس کو ادب اسلامی کے عنوان سے ہم دیتے ہیں۔

حضرات! ادبی کام ایک قسم کا فکری کام بھی ہے جس میں ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پیغام رسانی کی جاتی ہے، خاص طور پر وہ ادبی کام جو ادیب کی طرف سے بقصد و ارادہ ہو خواہ وہ شاعری کے دائرہ کا ہو یا خطابت و افسانہ نگاری اور دیگر نثری اصناف کا۔ لیکن وہ براہ راست فکری کام نہیں، اس میں علمی و تحقیقی اسلوب کو اصل ذریعہ نہیں بنایا جاتا بلکہ پرتاثیر تعبیری انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس تعبیری انداز کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں کبھی معنی و بیان کے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی خود معنی و مضمون کی شگفتہ و پرکشش ترتیب و انداز سے، گاہے تفصیل، گاہے اختصار سے، نیز حسب موقع دیگر معنوی پہلوؤں کی آمیزش سے، پھر مخاطب کی نفسیات اور جذبات کی باشعور رعایت سے کام لیا جاتا ہے۔

ان ذرائع کی رعایت کے ساتھ جو بات بھی کہی جاتی ہے خواہ علمی ہو، خواہ فکری، ادب کے زمرہ میں داخل ہو جاتی ہے، اور ان ذرائع اور طریقوں کے فرق سے ادب کی بیشمار قسمیں

بن جاتی ہیں، بالآخر ادب زندگی کے تمام ذہنی کاموں کو پر اثر بنانے کا سب سے کامیاب اور وسیع طریقہ بن جاتا ہے۔

ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت و صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ وہ محقق و مفکر ہو اور خواہ جاہل و عامی۔ اسی کی وجہ سے ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے، اسی لئے ادب کے ذریعہ سے کبھی اصلاح عوام کا کام لیا گیا۔ کبھی پوری پوری قوم کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈالنے کا کام لیا گیا، اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا

برصغیر میں برطانوی استعمار کے قدم یہاں کے قائدین و حکمرانوں کی سیاسی غلطیوں سے جمے لیکن پھر عوامی سیاسی جدوجہد اور ادب کے مختلف ذرائع سے ان کے قدم اکھاڑے گئے، استعمار کے یہ قدم صرف سیاسی میدان ہی میں اکھاڑے نہیں گئے بلکہ ذہنی و فکری میدان میں بھی اکھاڑے گئے، اس سلسلہ میں سیاسی میدان میں اگر سیاسی کوششوں کا خاصا دخل رہا ہے تو ذہنی میدان میں اصل کام ادب نے کیا ہے، برطانوی استعمار کے اثرات شروع ہونے کے وقت سے ادب کے میدان میں جو جدوجہد اور اصلاحی کام ہوا ہے اس کی ابتدا شاہ ولی اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی اصلاحی و سیاسی جدوجہد کی سلوٹوں میں نظر آتی ہے، اس میدان میں خود انہوں نے اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے اپنی پراثر تحریروں اور اپنے موثر رسائل و کتب سے برصغیر کے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ پر اثر ڈالا جس کی گونج علمی و ادبی حلقوں میں آج تک سنائی دیتی ہے، ان کے قافلہ میں وہ علمائے دین اور ادباء شامل ہوئے جن میں سے بعض نے برطانوی استعمار کو اپنا ہدف بنایا اور بعض نے ملت اسلامی کے تھکے ہارے شکستہ دل و شکستہ ذہن افراد کو سنبھالنے کی کوشش کی، اس سلسلۂ زریں کی ممتاز ہستیوں کے تذکرے ان کے اثر پذیر ادب کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں، فکر اسلامی کے حامل عظیم شاعر سر محمد اقبال، غیرت اسلامی کے حامل شعراء، ظفر علی خاں، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی اور علامہ شبلی نعمانی، جن کی موثر نظموں اور اشعار نے جذبۂ اسلامی کو مہمیز کیا، برطانوی استعمار سے

نبرد آزما ادبا وشعراء میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد، اور اسلامی قدروں کے علمبردار علماء وادباء میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی، اور اسی سلسلہ میں حکایت نگاری سے کام لینے والے ادباء میں مولانا عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور بچوں کے ادب کے سلسلہ میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام سر فہرست آتا ہے، یہ حضرات اور ان ہی جیسے متعدد دیگر حضرات برصغیر کی ادبی تاریخ میں نگینوں کی طرح نظر آتے ہیں ۔

برصغیر میں اسلامی ذہن ودماغ کی حفاظت کا کام ان ادباء کے ذریعہ بہت شاندار طریقہ سے انجام پایا، اسی کے ساتھ ساتھ ان حضرات نے ادب کے سنجیدہ معیار اور اس کی مثالی روش کو بھی بخوبی برقرار رکھا، ان میں کئی نہ صرف یہ کہ صاحب اسلوب ہیں بلکہ اردو کے اساطین ادب میں شمار کئے جاتے ہیں ۔

جنگ آزادی اور اصلاح عوام کے کام کے لئے جس طرح تحریری ادب نے ایک بڑی ذمہ داری پوری کی ہے، اسی طرح خطابی ادب نے بھی بڑا معرکہ سر کیا ہے، اس میدان میں بھی برصغیر نے بڑے بڑے آفتاب ومہتاب دیکھے ہیں، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے خاص طور پر بڑی داد حاصل کی ہے ۔

ہمارا یہ سمینار ان ہی شخصیات کے تذکروں اور ان کے ادبی کارناموں کی یادوں سے اپنی محفل سجانے جا رہا ہے، ہم ان کا مقام مزید سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان سے سبق لیں گے اور اپنے ادبی سفر کے لئے ان سے سوغات بھی حاصل کریں گے ۔

ہمارا یہ سمینار حیدرآباد میں منعقد ہو رہا ہے جو برصغیر کا ایک مشہور اور اسلامی ثقافت وتاریخ کا شہر ہے، اس کے انعقاد میں مقامی طور پر مجلس ادبیات اسلامی حیدرآباد کے زیر انتظام شہر کے ممتاز فرزند اور عظیم معالج وطبیب جناب ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب صدر مجلس استقبالیہ اور ممتاز مشیر قانونی اور سماجی شخصیت جناب سید جمیل الدین صاحب سکریٹری مجلس ادبیات اسلامی حیدرآباد ناظم استقبالیہ کی فکر ومحنت کا بڑا حصہ ہے ہم ان کے بہت شکر گزار ہیں کہ

انہوں نے ادب اسلامی کے اس اہم اور نیک کام میں رابطۂ ادب اسلامی کے خادموں کا ہاتھ بٹایا اور کام کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ ہم ان کے ساتھ ان کے رفقاء کے بھی شکر گزار ہیں جو ان کے ساتھ نظم و انتظام کے اس کام میں ان کے شریک کار رہیں۔

ہم ان ادیبوں اور اسکالروں کے بھی بہت شکر گزار ہیں جنہوں نے ہماری دعوت پر تکلیف شاقی اور ہمارے سیمینار میں آکر شرکت کی، اس سے نہ صرف یہ کہ ہماری محفل کو رونق و عزت حاصل ہوئی بلکہ ادب کے میدان میں اسلامی ذہن رکھنے والے مردان کار ادیبوں کی کمک پہونچی، جو اس راہ پر چلنے والے قافلہ کو منزل کی طرف بڑھائے گی اور رہنمائی کرے گا، ہم ان سب حضرات کا دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

والحمد للہ اولاً و آخراً۔ والذی بفضلہ تتم الصالحات، وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین۔

اردو کتب، اخبارات و رسائل خرید کر پڑھیے

سلسلہ صفحہ ۲

حالانکہ راقم الحروف کو حیدرآباد سیول سروس کے لئے منتخب نہیں کیا گیا مگر نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کا مندرجہ بالا صداقت نامہ ہمارے دو خاندانوں کے اب تقریباً ایک صدی کے تعلقات کا ثبوت ہے۔ نواب ناظر یار جنگ مرحوم مغفور کے والد جناب نظام الدین حسن علم جغرافیہ کے بھی ماہر تھے اور جولائی ۱۹۷۴ء میں آپکے صاحبزادہ جناب مصطفیٰ کمال الدین حسن صاحب نے جناب فیاض الدین نظامی مرحوم کی سرپرستی میں مولوی نظام الدین کا ایک معلومات آفریں کتابچہ THE DIRECTION OF THE KABA شائع کیا۔ جس میں کعبۃ اللہ شریف کے جغرافیائی محل وقوع کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب یہ عظیم المرتبت شخصیتیں اپنے رب کے جوار میں محو خواب ابد ہیں، خدا مغفرت فرمائے۔ آمین

رشید الدین
ڈپٹی ڈائرکٹر، محکمہ ترجمہ، حیدرآباد، اے پی

مولوی عبدالحق اور اورنگ آباد

اگرچہ کام کرنے کیلئے کسی خاص جگہ اور زمانہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کام کرنے والا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی خاص مقام یا خاص زمانہ کسی شخص کو بطور خاص راس آجاتا ہے اور اس مقام اور اس زمانہ میں کیا ہوا اس کا کام رہتی دنیا تک یاد رہ جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے تعلق سے میر عثمان علی خان سابق فرماں روائے حیدرآباد کے زمانے میں اورنگ آباد میں کیا ہوا مولوی عبدالحق کا کام ایک ایسا ہی کام ہے۔ ہم اس کام کو اس زمانہ اور اس مقام سے علحدہ نہیں کر سکتے۔ باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اورنگ آباد میں رہ کر مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کیلئے جو کام کیا اور اس زمانہ کی حکومت نے جس طرح انہیں اس سلسلہ میں تعاون بہم پہنچایا یہ اپنی مثال آپ ہے۔

مولوی صاحب پیدا شمال میں ہوئے۔ پڑھے لکھے اور بڑے شمال میں ہوئے۔ مگر رہے جنوب میں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام دکن اور خصوصاً اورنگ آباد میں گزارے۔ مولوی صاحب کی زندگی اور جدوجہد کے بارے میں اورنگ آباد کو خاص مقام حاصل ہے جس کا مولوی صاحب کو بھی اعتراف تھا۔ اس شہر کے پرفضا، پرسکون اور تاریخی ماحول میں مولوی صاحب نے اردو کا جو کام کیا اسے آنے والی نسل کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ مولوی صاحب تقریباً پچیس برس اورنگ آباد میں رہے اور یہ دوران کی زندگی کا بڑا تخلیقی دور رہا۔ اس سلسلہ میں حکومتِ وقت اور عہدہ داران بالا نے بھی انہیں خصوصی رعایتیں عطا کیں اور انہوں نے حکومت کی ملازمت کرتے ہوئے اردو کیلئے بھی بہت کچھ کیا۔ یہیں وہ ڈکشنری والے عبدالحق ہوئے۔ یہیں انہوں نے دکنی مخطوطات اور قدیم شعرائے دکن کے تذکرے مرتب اور شائع کیے۔ یہیں وہ اردو والے عبدالحق ہوئے کیونکہ اورنگ آباد ہی سے انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی، علمی، ادبی اور

تحقیقی رسالہ "اردو" جاری ہوا اور انہیں وہ بابائے اردو بھی کہلائے۔ غرض مولوی صاحب کی زندگی میں اورنگ آباد کو بڑا دخل رہا ہے اور ان کا سوانح نگار ان کی سوانح حیات میں ہمیشہ اورنگ آباد کے لئے ایک الگ باب مختص کرے گا۔

مولوی صاحب ۱۸۷۰ء میں اترپردیش کے مشہور قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہاپوڑ اور پنجاب کے مقام فیروز پور میں ہوئی جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ ہائی اسکول کے لئے مولوی صاحب علی گڑھ گئے اور پھر وہیں سے انہوں نے بی اے پاس کیا۔ کالج میں ان کے مضامین انگریزی ادب، فلسفہ اور ریاضی تھے۔ ریاضی سے انہوں نے خاص دلچسپی لی تھی لیکن آگے کام قدرت نے ان سے اردو کا لیا۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں اس زمانہ کے سرکردہ لوگوں میں سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، عماد الملک، شبلی نعمانی اور حسین سید محمود وغیرہ سے مولوی صاحب کو فیض صحبت رہا۔ اس طرح مولوی صاحب کی حیثیت اس نسل اور ہماری نسل کے درمیان ایک کڑی کی سی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد محسن الملک نے مولوی صاحب کو انگریزی مراسلت اور مضمون نگاری کے کام کے لئے بمبئی بلالیا۔ دو سال کے بعد ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر افسر الملک نے جو اس زمانہ میں ریاست حیدرآباد کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے) انہیں حیدرآباد بلالیا اور ان کی طبیعت کی مناسبت سے فوج کا رسالہ "افسر" ایڈٹ کرنے پر مامور کیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب مدرسہ آصفیہ حیدرآباد کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ چند سال بعد ہوم سکریٹریٹ میں اردو مترجم مقرر ہوئے۔ پھر سراج یار جنگ کے عہدہ نظامت میں تعلیمات میں مددگار مہتمم ہوئے اور میدک ڈانھرا پردیش پر تقرر ہوا۔ اس کے بعد صدر مہتمم بنادیئے گئے اور اورنگ آباد تبادلہ عمل میں آیا۔ صوبہ اورنگ آباد کے پانچوں اضلاع اورنگ آباد، عثمان آباد، بیڑ، پربھنی اور ناندیڑ آپ کے تحت تھے۔ سابق حیدرآباد کا یہ پورا صوبہ اب مہاراشٹرا میں شامل ہے کیونکہ سابق ریاست میں یہ مراٹھی زبان کا علاقہ تھا۔

اس عہدہ پر عرصہ دراز تک فائز رہنے کے بعد جب اورنگ آباد میں کالج قائم ہوا تو یہ اسکے پرنسپل بنادیئے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں پروفیسر وحید الدین سلیم کا انتقال ہوگیا تو جامعہ عثمانیہ کی اردو

یہ پروفیسری ان کے حصہ میں آئی ۔ کیونکہ اس زمانہ میں ساری ریاست حیدرآباد میں اردو کی پروفیسری پر آپ سے زیادہ قابل اور کوئی نظر نہیں آیا ۔ چنانچہ بعد اصرار آپ کو حیدرآباد بلالیا گیا ۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے حیدرآباد میں اردو کی حالت مستحکم دیکھ کر دہلی کو اپنا مستقر بنایا تاکہ برطانوی ہند میں ایک مرکزی مقام سے اردو کے لئے کام کیا جاسکے ۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ میں استعفیٰ پیش کرکے وہ دہلی منتقل ہوگئے اور انجمن کا پریس اور دفتر وغیرہ بھی جو اب تک اورنگ آباد ہی میں تھا ، دہلی منگوالیا گیا ۔ تقسیم ہند تک آپ دہلی میں رہ کر اردو کے لئے کام کرتے رہے اس کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں اردو کالج قائم کیا ۔ کراچی میں ایک اردو یونیورسٹی قائم ہوجائے یہ ان کی عین خواہش تھی مگر اس خواہش کو دل میں لئے ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کی صبح آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ اب تو اسے بھی ربع صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ۔

یہ تھے مولوی عبدالحق کے مختصر حالات زندگی ۔ ان پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے کام کرنے کے مراکز چار رہے ، اورنگ آباد ، حیدرآباد ، دہلی اور کراچی مگر ان چاروں مراکز میں جو کام اورنگ آباد میں ہوا اور جو انس مولوی صاحب کو اورنگ آباد سے زیادہ کسی دوسرے مرکز کو میسّر نہیں آیا ۔ دراصل اورنگ آباد ہی وہ مقام ہے جہاں مولوی صاحب کی زندگی کی کایا پلٹ ہوتی اور انہوں نے اردو کے لئے کام کرنا شروع کیا ۔ ہوا یوں کہ مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کو جس (جس کی بنا ۱۹۰۳ء میں پڑی تھی) کوئی اچھا معتمد نہیں مل رہا تھا ۔ خود شبلی بھی اپنی زندگی میں دیگر مصروفیات کی بناء پر اس کے لئے زیادہ وقت نہیں دے پا رہے تھے ۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو عین کسمپرسی کی حالت میں تھی کہ بعض لوگوں کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی ۔ اس وقت مولوی صاحب اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیمات تھے چنانچہ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب کو انجمن کا صدر بنا دیا گیا اور مولوی صاحب نے اپنی محنت اور لگن سے تھوڑے ہی دن میں اس کے مردہ تن میں جان ڈال دی ۔ اس زمانہ میں انجمن ترقی اردو اور مولوی صاحب لازم و ملزوم ہوگئے تھے ۔ اسی لئے رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ "انجمن ترقی اردو عبدالحق کا مختصر تخلص ہے "

اورنگ آباد میں مولوی صاحب کا قیام شہر سے باہر رابعہ درانی کے تاریخی مقبرہ (جسے عرف عام میں بی بی کا مقبرہ کہا جاتا ہے) کے کمپاؤنڈ میں تھا ۔ اس بنگلہ کے ایک حصہ میں وہ رہتے تھے اور دوسرے

میں انجمن کا دفتر تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی میں جو باغ ہے اس کے بھی مولوی صاحب سرکاری طور پر نگراں تھے۔ صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے مولوی صاحب کو دورے کرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ ضلع اورنگ آباد اور علاقہ مرہٹواڑہ کا ایک ایک شہر ایک ایک قصبہ اور ایک ایک گاؤں مولوی صاحب کا دیکھا ہوا تھا وہ سرکاری دوروں پر جاتے تو انجمن کا کام بھی کرتے اور مقامی متمول لوگوں سے چندہ بھی اکٹھا کرتے۔

اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانہ میں مولوی صاحب علی الصبح اٹھ جاتے اور اٹھتے ہی سیر کے لئے مقبرہ کے پیچھے کی پہاڑیوں میں چلے جاتے وہاں سے آنے کے بعد ناشتہ وغیرہ کرتے تھے۔ ناشتہ پر جب تک دو تین اور لوگ نہ ہوں مولوی صاحب کو مزہ نہیں آتا تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد دفتر چلے جاتے اور کام میں مشغول ہو جاتے۔ یہ کام سرکاری ہوتے جس میں بعض دفعہ انجمن کا اہم کام بھی شامل ہو جاتا۔ شام میں چائے نوشی، حقہ نوشی اور کچھ گپ شپ ہوتی اور رات میں کھانے کے بعد پھر کام شروع ہو جاتا جو رات کے ایک دو بجے تک چلتا رہتا۔ یہ کام انجمن کا ہوتا جس میں کبھی کبھی اہم سرکاری کام بھی شامل ہو جاتا۔ اس طرح صبح سے شام تک اور شام سے رات دیر گئے تک سرکاری کام چلتا یا انجمن کا مولوی صاحب کا ذاتی کام ایک نہ ہوتا۔ مولوی صاحب کے زندگی بھر تجرد کو اپنایا ان کا اوڑھنا بچھونا سب کچھ اردو ہی تھی۔ انجمن کے وہ اعزازی معتمد تھے۔ انجمن کے فنڈ میں سے ایک پیسہ اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ ہاں بارہا اپنی تنخواہ میں سے بہت کچھ انجمن کے کام پر لگا دیتے۔ اب اگر ایسے شخص کو بابائے اردو کا لقب ملے تو یہ کوئی باعث تعجب نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے واقعی اردو سے محبت کی اور اردو کیلئے وہی کچھ کیا جو ایک باپ اپنی بیٹی کے لئے کرتا ہے۔ دنیا میں شاذ ہی ایسے بے لوث لوگ پیدا ہوں گے جنہوں نے ایک تحریک کے پیچھے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہو اور اس سے کچھ نہ لیا ہو۔ مولوی صاحب اردو کے ایسے ہی بے لوث خدمت گار تھے۔ جنہوں نے تن من دھن سے اردو کی خدمت کی اور ہاتھ جھاڑتے اس دنیا سے چلے گئے۔

اپنے قیام اورنگ کے زمانہ میں مولوی صاحب نے اردو کے تعلق سے اس شہر میں کئی علمی اور ادبی تقریبات بھی منائیں جس میں حیدرآباد سے سرکردہ لوگ آکر شریک ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں جب مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کے پرنسپل تھے انہوں نے کالج میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈرامہ "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" بہت ہی اہتمام سے اسٹیج کروایا تھا جس میں شریک ہونے حیدرآباد سے

سر اکبر حیدری (وزیر تعلیم سابق ریاست حیدرآباد) اور مسعود جنگ (ناظم تعلیمات سابق ریاست حیدرآباد) بھی آئے تھے۔ حیدرآباد اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے جو بھی بڑا آدمی آتا وہ مولوی صاحب سے ملے بغیر اورنگ آباد سے نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار اس زمانہ کے وزیر اعظم حیدرآباد سرکشن پرشاد بہادر بھی اورنگ آباد آئے تو مولوی صاحب سے ان کی قیام گاہ پہونچ کر بطور خاص ملاقات کی ایک خاص عادت مولوی صاحب میں یہ تھی کہ ان سے کوئی بھی شخص کسی بھی وقت مل سکتا تھا۔ ان کے پاس چھوٹے بڑے، امیر غریب، پڑھے لکھے، غیر پڑھے لکھے، ہندو مسلمان، اردو داں اور غیر اردو داں کی کوئی قید نہیں تھی۔ جب وہ صدر مہتمم تعلیمات تھے تو اس زمانے میں اورنگ آباد میں اکثر ان کے ٹیبل پر اصلاع سے شکایتیں لے کر آنے والے چپراسیوں کو چائے پیتے دیکھا گیا۔ ان کی قیام گاہ پر ہمیشہ شام کے وقت اورنگ آباد کے سرکردہ لوگوں کا اجتماع رہتا تھا۔

۱۹۲۱ء میں مولوی صاحب نے اورنگ آباد سے انجمن کا سہ ماہی اردو رسالہ "اردو" کے نام سے جاری کیا جس کے علمی ادبی اور تحقیقی مضامین آج بھی اردو کا ایک قیمتی سرمایہ بنے ہوئے ہیں۔ تین سال تک یہ لیتھو میں نکلتا رہا پھر اس کے بعد ٹائپ میں چھپنا شروع ہوگیا۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد میں انجمن کے بھی لیتھو اور ٹائپ دونوں پریس تھے۔ اس زمانہ میں مولوی صاحب نے دکنی مخطوطات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور بڑی جستجو اور کھوج کے بعد شائع کئے۔ چنانچہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی "معراج العاشقین" (جو اردو کی پہلی نثری کتاب ثابت ہوئی)۔ ملا وجہی کی "قطب مشتری" اور نصرتی کی "گلشن عشق" مولوی صاحب نے اسی زمانے میں مرتب اور شائع کیں۔ اس زمانہ میں رسالہ "اردو" میں بھی مولوی صاحب کے بڑے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کی کتابیں "اردو زبان پر فارسی کا اثر" اور "اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا حصہ" اسی زمانہ میں لکھی اور شائع کی گئیں۔ اورنگ آباد ہی سے مولوی صاحب نے ۱۹۲۷ء کے اختتام میں "آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری" کا اردو ترجمہ "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کے نام سے مرتب اور شائع کیا جس میں ان کے ساتھ اردو کے بہت سے سرکردہ لوگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ طالب علموں کے لئے ایک ڈکشنری "اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری" اور ابتدائی انگریزی سیکھنے والوں کے لئے پاپولر انگلش اردو ڈکشنری" شائع کرائی۔ غرض اورنگ آباد میں رہ کر مولوی صاحب نے اردو کے لئے جو کام کیا اس

فرصت ہے۔ اورنگ آباد شہر سے انہیں اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور مستقل طور پر وہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مقبرہ کے پیچھے کی پہاڑیوں میں وہ اپنا ذاتی بنگلہ بھی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے زمین بھی خرید لی تھی اور تعمیر کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں مگر وہاں قریب ہی پارسیوں کا قبرستان تھا اسلئے پارسیوں نے ان سے درخواست کی کہ مکان بن جانے سے ان کے قبرستان کی بے حرمتی ہوگی۔ اس درخواست پر مولوی صاحب نے وہاں مکان بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تمام تیاریاں جوں کی توں دھری رہ گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں جب وحیدالدین سلیم کا انتقال ہوا تو آپ بصد اصرار اورنگ آباد چھوڑنے پر راضی ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر رہے، پھر بھی آپ نے یہ شرط لگادی تھی کہ وہ بیس دن حیدرآباد میں رہیں گے اور دس دن اورنگ آباد میں۔ چنانچہ ارباب اقتدار نے اسے بھی قبول کر لیا تاکہ وہ انجمن کا کام دیکھ سکیں۔ اس طرح انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں ہی رکھ کر مولوی صاحب اس کی نگرانی کرتے رہے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو کا دفتر دھلی منتقل نہ ہو گیا۔ اس طرح اورنگ آباد میں وہ کوئی ۲۵ سال رہے۔

اورنگ آباد سے مولوی صاحب کو کتنی عقیدت تھی اس کا اندازہ ان نجی خطوط سے ہوتا ہے جو مولوی صاحب نے اپنے آخری ایام میں اپنے بعض کرم ساتھیوں کو کراچی سے لکھے تھے۔ مثلاً اپنے اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد کے ساتھی اور شریکِ کار مولوی غلام ربانی کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں

> "تمہارا خط پہنچا۔ یہ خط کیا ہے اس میں میری زندگی کا ایک باب پنہاں ہے یہ پھر مجھے وہیں لے گیا جہاں سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے لئے مجھے معلوم ہوا کہ میں مقبرہ میں ہوں اور تم میرے ساتھ کام کر رہے ہو اور وہاں کے پرفضا اور دلربا ماحول کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ مقام (مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد) مجھے اب بھی سب سے زیادہ پسند ہے اور یہ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس کی زیارت کر لوں۔ میں نے اپنے کام کی بنیاد وہیں ڈالی اور برا بھلا جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا اسی پرفضا اور فرحت انگیز مقام پر ہوا۔"

ایک اور خط میں محمد علی صاحب (سابق منتظم دفتر اورنگ آباد کالج) کو لکھتے ہیں:

"میں نے بے شک تم سب کو ہدایت کی تھی کہ اورنگ آباد نہ چھوڑنا مگر انقلاب زمانہ ہے کہ پہلے مجھے ہی چھوڑنا پڑا مگر اس کی محبت اب تک میرے دل میں موجود ہے
ہاشمی صاحب (سید ہاشمی فرید آبادی) کہا کرتے تھے کہ اورنگ آباد کے قدر داں اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق۔ یہ بھی تم جانتے ہو کہ برا بھلا جو کچھ مجھ سے بن پڑا اس کا زیادہ تر حصہ اورنگ آباد ہی میں بیٹھ کر کیا۔ پھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں"۔

اورنگ آباد کے قیام کے دوران جہاں مولوی صاحب نے اردو کیلئے اتنے بیش بہا کام کئے وہیں چند ایسے لوگ بھی تیار کئے جو اردو والوں کو مولوی عبدالحق کی یاد دلاتے رہیں گے۔ وہ نہ صرف خود کام کرنا جانتے تھے بلکہ لوگوں سے کام لینے اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ انہوں نے اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانے میں جن لوگوں کو تیار کیا ان میں اختر حسین لاگپوری، مولوی غلام ربانی، شیخ چاند، سکندر علی وجد، ہاشمی فرید آبادی، عابد حسین اور وہاج الدین شمیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کو مولوی صاحب کی دریافت کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال مولوی صاحب کی زندگی میں اورنگ آباد شہر کا ایک خاص رول رہا ہے اور مستقبل میں جہاں بھی عبدالحق کا ذکر ہوگا وہاں اورنگ آباد کا ذکر ہوگا وہاں عبدالحق کا بھی ذکر آئے گا۔

سلسلہ صفحہ

حکومت کے وعدہ کی تکمیل ہے۔ ایسے وقت جبکہ ریاست ہریانہ نے اردو کو پوری ریاست ہریانہ میں چیف منسٹر مسٹر دیوی لال نے جو صرف اردو یا ہندوستانی جانتے ہیں اردو کے تحفظ کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ ہماری ریاست نے اردو کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ جو وعدے اردو بچاؤ تحریک اور انجمن ترقی اردو سے کئے گئے تھے انہیں پورا کیا جائے۔ حکومت کے مجرمانہ تغافل کی اس سے بڑھکر اور کیا حد ہو سکتی ہے کہ اردو والے تیسری جماعت سے تلگو تعلیم کا لزوم چاہتے ہیں مگر حکومت تیسری یا پانچویں جماعت کی سہولت سے انتشار پیدا کر رہی ہے۔ اب قانون سرکاری زبان میں نئی مجوزہ ترمیم نے حکومت اور تلگو دیشم قائد این ٹی آر کو یاد دلایا ہے کہ وہ اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر سکے بلکہ اسکی صرف خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔

[اداریہ سیاست، مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۹ء]

مصطفیٰ اشروانی
۳۰۶-۶-۲۰۲، ہمایت نگر
حیدرآباد ۲۹

ناظر چچا۔ چند یادیں

جناب حضرت مولانا ہادی نقشبندی کا سجادہ نشین روضہ نقشبندیہ بالاپور (برار) کے نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کا سوانح پر مبنی ماہنامہ "شاداب" کے اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں شائع شدہ بصیرت افروز مضمون سے صاحب سوانح کی عظیم المرتبت شخصیت کا وہ پہلو نمایاں ہے جو سعدی شیرازی کے اس شعر کی مکمل اور جامع تعبیر تھا۔

کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من ۔۔۔ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

جناب سید منظر علی صاحب نے ۱۳۲۵ھ میں شائع شدہ اپنی تصنیف "منظر الکرام" میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کے اجداد کے متعلق اس دلچسپ حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ نہ صرف نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم کے والد جناب نظام الدین حسینی صاحب سابق رکن عدالت العالیہ آصفیہ اور ڈپٹی کمشنر صوبہ برار تھے بلکہ آپ کے جد مولوی محمد حسینی صاحب مرحوم بھی فیض یاب رکن عدالت العالیہ تھے۔ ایک اور اہم پہلو یہ کہ نواب ناظر یار جنگ مرحوم نے جب مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں MOHAMMADAN ANGLO-ORIENTAL COLLEGIATE SCHOOL میں داخلہ لیا اس وقت اسکول کے نصاب میں عربی زبان و ادب کو خصوصیت سے اہمیت دی جاتی تھی اسی بنا پر نواب صاحب مرحوم کو گھر پر بھی عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علیگڑھ میں ناظر الدین حسینی کو "رد کمانڈر" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اسلئے کہ مرحوم فوجی قواعد، گھڑ سواری اور پولو میں مہارت رکھتے تھے۔ اور علیگڑھ میں تعلیم کے علاوہ اوقات میں رائیڈنگ کلب میں اپنی شہسواری کے کمال دکھاتے تھے۔

ناظر الدین حسینی مرحوم کے گھڑ سواری کے اس شوق نے حیدرآباد میں نواب سر افسر الملک مرحوم کی توجہ مبذول کی اور ناظر چچا کو یہاں IMPERIAL SERVICE LANCERS

میں سواری کی مشق کا موقعہ ملا ۔

میرے والد ماجد پدر محترم پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم مغفور نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر مرحوم کے مقربین میں تھے دونوں لندن اور کیمبرج میں بھی یک جان و دو قالب تھے ۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک ہمارا قیام نوبت پہاڑ کے دامن کوہ میں جنرل احمد اشرف مرحوم کمانڈر افواج آصفی کے مکان میں رہا ۔ نواب ناظر یار جنگ بہادر کا قیام گاہ بھی قریب ہی تھی بعد میں نواب صاحب مرحوم اپنی ذاتی قیام گاہ " منزل علی " حیدرگوڑہ منتقل ہوتے جیسا حضرت مولانا ہادی نقشبندی نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے جب میرے بھائی مسعود احمد خاں شروانی صاحب اور میرا داخلہ سٹی کالج میں ہوا تو جب بھی ہمارے والدین حیدرآباد سے باہر تشریف لے جاتے ہم نواب ناظر یار جنگ مرحوم کے مکان میں منتقل کر دیئے جاتے اور وہاں سے نواب صاحب کے ہمراہ سٹی کالج جاتے تھے لیکن عام طور پر ہم چارلس ہن بھائی اپنی ہی موٹر میں اپنے اپنے اسکول یا کالج جاتے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے ناظر چچا مرحوم کی پر وقار شخصیت سے متاثر ہوئے علی الصبح چہل قدمی کے بعد ناظر چچا ہمارے مکان تشریف لاتے اور دیر تک والد ماجد مرحوم مغفور سے زیادہ تر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے موضوع پر گفتگو رہتی ۔

۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو جب راقم الحروف نے حیدرآباد سول سروس میں داخلہ کے لئے درخواست پر ناظر چچا مرحوم سے صداقتنامہ پر اپنی رائے تحریر فرمانے کی خواہش کی تو مرحوم نے فارم پر بول اپنے اور ہمارے خاندان سے دیرینہ روابط کا تذکرہ فرمایا ۔

" مصطفیٰ کمال شروانی بی اے عثمانیہ ایک بہت نامور اور باوقار خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو ہندوستان میں ایک اہم مقام رکھتا ہے ۔ ان کے والد جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی نظام کالج کے سابق پرنسپل اور پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ اور ان کے جد نواب حاجی محمد علی خاں شروانی کا شمار عظیم مصنفین میں ہوتا ہے ۔ ان کے خاندان کے افراد سے فرداً فرداً تذکرہ میسر حاصل ہے میرا گزشتہ ۵۰ سالہ قریبی تعلق رہا ہے ۔ "

شرح دستخط ناظر یار جنگ ایم اے ایل ایل بی
بار ایٹ لا ریٹائرڈ ہائی کورٹ جج "

۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء

باقی پر صفحہ "

قانون سرکاری زبان میں ترمیم اور اردو؟

حکومت آندھرا پردیش نے قانون سرکاری زبان ۱۹۶۶ء میں مزید ترمیم کے ذریعہ کمپنیوں اور کارپوریشن میں تلگو کے استعمال کیلئے جو پہل کی ہے ۔ وہ ریاست کی سرکاری زبان تلگو کے وسیع تر اور ہمہ گیر استعمال کیلئے اپنے فرائض کی تکمیل اور ضرورت ہے لیکن قانون سرکاری زبان آندھرا پردیش ۱۹۶۶ء جو ہماری ریاست کا یہ امتیازی وصف بھی ہے کہ ایک لسانی ریاست نے اقلیتی زبانوں کے تحفظ کا بھی قانونی موقف واضح کر دیا ہے ۔ یہ نئی ترمیم اس دفعہ کے مغائر ہے جس میں اردو کے استعمال کا سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے ۔ یہ ترمیم چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ کے اس بیان اور اس تیقن کے بھی مغائر ہے، جو انہوں نے اقبال مینار کے افتتاح کے موقعہ پر دیا تھا کہ جہاں اردو بولنے والے (۱۵) فیصد ہوں وہاں اردو دوسری زبان کی طرح استعمال ہوگی ' انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کے تحفظ کیلئے اپنی زندگی وقف کر دیں گے ۔

تلگو دیشم کے برسر اقتدار آنے کے بعد نہ صرف اردو بلکہ دوسری لسانی اقلیتوں کے تمام مسائل نئی پیچیدہ نوعیت اختیار کر گئے ہیں ۔ اردو اکیڈیمی کی اب تک تشکیل جدید نہیں کی گئی ' اگرچہ کہ اکیڈیمی عضو معطل ہے ۔ آندھرا پردیش کی اکیڈیمی تو سارے ملک میں فعال اور ماڈل ہونا چاہئے تھا ۔ وینگل راؤ نے جب اردو اکیڈیمی قائم کی ' انہوں نے اکیڈیمی کو مثالی بنانے کی اپیل کی تھی ۔ آج یہ حال ہے کہ اردو اکیڈیمی نے گزشتہ (۵) سال میں کسی قسم کی کوئی ادبی علمی سرگرمی نہیں دکھلائی ۔ ڈاکٹر جینا ریڈی نے دکھنی ادب پر تحقیق کیلئے جس پراجکٹ کیلئے رقمی منظوری کا اعلان کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا ۔ الغرض اردو اکیڈیمی " ہر چند کہیں ہے نہیں ہے " کے مصداق ہے ۔ ملک کی دوسری اکیڈیمیوں کی مصروفیات دیکھ کر ہم اپنی اردو اکیڈیمی کے بارے میں صرف آہِ سرد بھر کر رہ جاتے ہیں

اقلیتی کمیشن کا جہاں تک سوال ہے اس کی تشکیل جدید ہنوز عمل میں نہیں ' اسی کمیشن کے

سکریٹری مسٹر اے آر راؤ کا ایک بیان جو انہوں نے نیلور میں دیا ہے اخبار ہندو میں دو تین دن قبل شائع ہوا ہے۔ اس لائق ستائش آئی اے ایس عہدہ دار نے بڑی جرأت سے کہا ہے کہ کمیشن کی توسیع نہ ہونے سے کمیشن کے کئی کام متاثر ہیں۔ وہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو کوئی سرٹیفکٹ بھی جاری نہیں کر سکتے کمیشن کی رپورٹیں فیصلہ کی منتظر پڑی ہیں۔ مسٹر راؤ نے کمیشن کی کارکردگی کے لئے مختلف تجاویز اور مشورے دیتے ہوئے رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس آندھرا پردیش نے گزشتہ روز ایک صحافتی بیان میں کہا ہے کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے بارے میں حکومت آندھرا پردیش نے جو تیقنات دیئے تھے اور ایک جامع جی او کی اجرائی کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ موجودہ موقف یہ ہے کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے سر پر ننگی تلوار لٹک رہی ہے۔ اقلیتی فینانس کارپوریشن کے بارے میں مسٹر راؤ نے اس ادارہ کے لئے (۵) کروڑ کے فنڈ کا مشورہ دیا تھا۔

اقلیتوں کے تعلق سے حکومت کی پالیسی کے اس پس منظر میں اردو کا مسئلہ تو بہت پیچیدہ اور نازک ہو گیا ہے۔ آندھرا پردیش کے قیام سے قبل آندھرا قائدین نے اردو کو اس ریاست کی دوسری بڑی سرکاری زبان تسلیم کیا تھا۔ آندھرا پردیش کے اردو دانوں نے دوسری ریاستوں کی طرح اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ اس لئے نہیں کیا کہ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کا اردو سے متعلق کھلا ذہنی اور فراخدلانہ رویہ تھا' مگر جب ریاست میں ایک علاقائی پارٹی برسر اقتدار آئی اس نے تیقنات کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ نہ صرف اردو بلکہ ملنگانہ سے بھی ناانصافی جاری ہے۔ علاوہ تلنگانہ تحریک کے دوران اخبارات' انجمن ترقی اردو اور اردو بولنے والوں نے آندھرا پردیش کی حمایت کی تھی۔ مگر آج تلگودیشم نے لسانی اقلیتوں کو بری طرح نظر انداز کر دیا ہے اور کسی دستوری اور قانونی ذمہ داری کا لحاظ کئے بغیر تلگو کے سرکاری استعمال کے لئے اقدامات کئے جارہے ہیں۔

ریاستی حکومت نے اردو بچاؤ تحریک کمیٹی کے قائدین سے ایک جامع جی او کا وعدہ کیا تھا۔ مگر "وہ کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں" کے مصداق آندھرا پردیش کے قیام سے اب تک جتنے بھی جی او جاری ہوئے ہیں وہ سب ایک کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ غالباً یہی جامع جی او کا بدل ہے۔

باقی پر صفحہ ۱۸

محمد عبد الوحید خان
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو
گلبرگہ یونیورسٹی

اردو زبان میں تحقیق و تخلیق کے مسائل

اردو زبان کو لشکری زبان و لسان کا نام دیا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کے الفاظ اردو میں جذب ہو گئے ہیں۔ پنجاب میں اردو، مختصر تاریخ ادب اردو، تاریخ ادب اردو اور اردو لسانیات پر جتنے بھی نگارشاتِ قلم اور افکار و تردد کے نتائج سامنے آئے ہیں وہ اس امر کے غماز ہیں کہ اردو ایک لشکری زبان ہے۔ ایک مخلوط کلچر، تمدن و تہذیب و ثقافت اس میں موجزن ہے۔ تمام مشترکہ کوششوں و کاوشوں ہی کے ذریعہ اردو زبان مالا مال ہوئی ہے۔ اردو زبان کو غالب جیسا لسان الکلام جدید فلسفیانہ اموشگافیوں کا مالک مذہب دین عقائد اور سماج کا زبردست نباض ملا تو دوسری طرف پیغمبرانہ صفات و کمال کا حامل قرآن کا سچا مفسر اور قرآنیات کا ماہر نقیب ہوا۔ میر کی تنگ مزاجی انکا زندگی سے حوصلہ کھینچ لینے والا نظریہ دوسری طرف اردو سے وابستہ ہوا۔ قنوطیت اور رجائیت کے یہ نظریات، افکار و تخیلات اردو کے جلوہ میں چلتے ہیں۔ میرے اس مختصر سے مقالہ کا عنوان ہے "اردو زبان میں تحقیق و تخلیق کے مسائل" اور بات اسی پہلو کے گرد گھومتی چاہیے۔ نگار کو اسی جانب منڈلانا چاہیئے۔

اردو تحقیق و ریسرچ کا ماضی ہر کس و ناکس کے سامنے واشگاف اور ہویدا ہے، جو شعوری کام معراج العاشقین سے لیکر عہد جدید تک ہوا ہے۔ اس میں گہرائی و گیرائی اور اپنے عمیق پن اور خلوص میں تبدیلیوں اور اختلافات کی ایک دنیا آباد ہے۔ اردو ریسرچ کا کام اصل میں صحیح موضوعات اور حالات حاضرہ کے تقضیات کی انہام و تفہیم کے بعد درست جہتوں میں تحقیق کے ڈانڈوں کو ملانا ہے۔ سابق کے مقابلے میں آج طلباء سہل انکار اور تن آسانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ سہل موضوعات یا ایسے عنوانات و شخصیات کے تحت جن میں محنت و سعی کم کرنی ہو یا دقت پسندی کا

سامنا نہ کرنا پڑے، طلبار کام کر رہے ہیں خصوصاً دکنی ادبیات دکنی زبان اور اردو کے کلاسیکی ادب پر کام کرنے سے تحقیق کی دنیا آباد کرنے سے طلبار ذرا سا گھبرا جاتے ہیں ۔ میں نے کثرت سے ایسے طلباء و طالبات کا مشاہدہ کیا ہے جو اردو زبان کے تمدنی و ثقافتی پس منظر کے مطالعہ کو دکنی زبان دکنی کلچر دکنی ادب دوکنی معاملات پر ترجیح دیتے ہیں اس کا لب لباب اور حتمی نتیجہ یہ کہ ایم۔اے اردو کے نصاب میں دکنی جلد اختیاری مضمون ہونے کے دکن کے ایک پرچہ کو لازمی کر دیا گیا ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو طلبا برادری میں دکنی زبان کا مذاق پیدا ہو ۔ میرا اپنا نجی و ذاتی خیال یہ ہے کہ دکنی زبان میں تحقیقات و ریسرچ کے بہت وافر خزانے موجود ہیں ۔ مگر اکثر ریسرچ اسکالرس کی طبیعت اس سے ابا کرتی ہے ۔ وہ محض اس لئے کتراتے اور ڈرتے ہیں کہ طبیعت اس سے لگاؤ نہیں کھاتی ہے ۔ مگر بہتر ریسرچ گائیڈس واساتذہ کے تحت کلیات پر کام کیا جاسکتا ہے ۔ صرف ضرورت طلبار کو سمجھانے اور کام لینے کی اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کی ہے ۔

ہندوستان کی ۱۲۷ جامعات اور درس گاہوں میں بعض اوقات ایک ہی موضوعات پر محض لاعلمی اور غفلت سے تحقیقات کا جارہی ہیں اردو زبان میں کسی موضوع کے ایک ہی پہلو پر ایک ہی انداز سے دو تین مختلف جامعات میں جو کام ہوتا ہے ۔ اس سے تحقیق میں معکوس اضافہ ہوا کرتا ہے ۔ میری تمنا ہے کہ ہندوستان کی تمام جامعات آپس میں ایک ربط پیدا کریں کسی بھی موضوع ریسرچ سے پہلے دیگر جامعات سے اس تعلق سے ربط قائم کیا جائے اور استفسار کیا جائے کہ اس موضوع پر ماقبل کام اور تحقیق موجود تو نہیں ہے ۔ اور اگر تحقیقات انجام دی گئی ہوں تو کیا اس کا امکان ہے کہ دیگر نوعیت سے اس کا احاطہ کیا جاسکتا ہے ۔ ہر جامع کے شعبہ اردو کے سربراہ کو یہ کام انجام دینا ہے ۔ تخلیق و ریسرچ کیلئے ہر طالب علم کا ذہن موزوں و مناسب نہیں ہوسکتا ہے ۔ صرف اور محض ایسے طلباء و طالبات کو ایم ۔فل اور پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا جانا چاہیئے جو کہ ریسرچ اور تحقیقات کے معیار پر پورے و کھرے اترتے ہوں ۔ طبیعت اور ذہن کو ریسرچ اور تحقیق سے لگاؤ رغبت و خواہش ہونی چاہیئے محض ڈگری سند اور ڈاکٹریٹ کے حصول و تمنا کو مقصد علم نہیں بنا چاہیئے ۔ ڈاکٹریٹ کے ڈگری کے حصول سے ڈگری تو ملے گی مگر ذوق نظر نہ ملے گا ۔ صلاحیت، قابلیت ولیاقت ریسرچ کے لئے ضروری امور ہیں ۔ سنجیدگی

تہذیبی لگن اور استقلال سے اور باہر اور موضوعات اور خصوصی موضوعات پر ملکہ و دسترس و نگاہ رکھنے والے معلمین و اساتذہ کی رہنمائی ضروری ہے ۔ ایسے ہی اساتذہ طلباء کے طبیعتوں میں ریسرچ کا مذاق پیدا کرسکتے ہیں ۔

بعض اوقات مالی سودمندیوں اور رقمی فوائد کے لئے طلباء ریسرچ کے میدانوں میں در آتے ہیں بسا اوقات اس میدان سے ریسرچ اور تحقیقات کی تکمیل و اشاعت سے قبل بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ان کا ایسا معذور ہونا ادب پر اس لحاظ سے احسان ہے کہ ناقص ادب کی تخلیق کم ہوجاتی ہے ۔ یہ اللہ کا احسان ہے ۔ طلباء و طالبات کی طرز عبارت عبارت آرائیوں اور تحریری ٹھوس صلاحیتوں کو پرکھنے کے بعد ریسرچ میں اچھے موضوعات کے ساتھ داخلہ دیا جانا چاہیئے اور مسلسل کام لینا چاہیئے مناسب قد و خال اور ترتیب سے ریسرچ کا کام ہونا چاہیئے کم از کم دو تین سال میں تحقیقات کو مکمل ہونا چاہیئے تھیں فوٹوگراف ڈیسرٹیشن مقالہ جات میں ایسی باتیں اور ایسے امور ہونے چاہیں کہ لوگ ان سے چونک جائیں نت نئی باتیں سامنے آئیں ۔ لگن و دلچسپی ہی اسکی ضامن ہے ۔ محض عبارت آرائی طبع وقتی وقت گزاری مقصود نہیں ہونی چاہیئے ۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے مطالعہ اور گہرا مطالعہ اس کا رگ جان ہے ۔ کثیر مطالعہ کثیر مشاہدہ غور و فکر مختلف مکاتیب فکر و خیال کا مطالعہ اختلافات کا درست نوعیت سے جائزہ ادبی بحث و تمحیص کا مطالعہ اور ان ہی ذاتی رائے کا اظہار تخلیق کار کے لئے بہت ضروری اور اہم ہے ۔ تخلیق وہی کرسکتا ہے جو تخلیقی ذہن کا مالک ہو ودیعت شدہ قابلیت صلاحیت رکھتا ہو ۔ ہر تخلیق کار ماہر نہیں ہوسکتا وسعت مطالعہ طبیعت میں ٹھیراؤ خداداد صلاحیت تحریری صلاحیت زبان پر دسترس قابو زبان کو برتنے لکھنے کا سلیقہ و قرینہ تخلیق کی جان عزیز ہے ۔ مشورے اور صحیح مشورے اور ہدایتوں پر عمل آوریاں بھی اچھی تخلیق کی محرک) ہوا کرتی ہے ۔ مگر اصل بات کثرت مطالعہ غور و فکر وافر ہو اور مناسب بات مناسب انداز پر کہی جائے ۔ بات دل سے نکل کر دل میں پہونچتی ہے دل پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ تخلیق کا ایک کرب ہوتا ہے تخلیق کار جب تخلیق کرلیتا ہے تو اس ہی نیتجتاً کرب سے آزاد ہوجاتا ہے ۔ جتنا تخلیق کار ٹھوس ہو جسکا جتنا مطالعہ کثیر ہوگا تخلیق عمدہ ہوگی

باقی بر صفحہ ۳۳

سید اعظم ہاشمی
جونیر لکچرار، مدینۃ العلوم جونیر کالج، ناندیڑ

برگ و بار — ایک جائزہ

اختر الزماں ناصر اردو ادب کیلئے محتاج تعارف نہیں، مرہٹواڑہ کے ادبی افق پر چمکنے والا یہ ستارہ قدیم و جدید روایات کا پاسبان و محافظ ہے ۔ موصوف کا تعلق برسوں درس و تدریس سے رہا ۔ اور اسی پیشہ کی عظمت و وقار کا معیار بن کر سبکدوش بھی ہوئے ۔ جن سعید روحوں کی رفاقت و سرپرستی میں ناصر کے شعری خمیر کی تعمیر ہوئی ان میں قابل ذکر سعید احمد ندوی، صادق مروش، نذر علی، درد کاکوروی جیسے وارثانِ ولی و سراج تھے ۔ جب ہی تو ان کا تراشا گیا پاکیزہ پیکر سخن علم و ادب کا نور بن کر ادبی فضا پر محیط ہو گیا ۔ عموماً شاگردوں کی عظمت میں استاد کی عظمت کو پرکھا جاتا ہے ۔ یہ قاعدہ کلیہ نہ صحیح مروجہ قواعد کا اک جزو لاینفک ضرور ہے ناصر کے شاگردوں کا اکثر گروہ نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے بلکہ علم و ادب میں نمایاں مقام بھی رکھتا ہے ۔ راقم الحروف نے جب بھی ناصر کے شاگردوں کو ناصر سے ملتے دیکھا تو یہی محسوس کیا کہ شاگردانِ رشید کے جبینوں کی نیاز مندیاں اپنے [illegible]د کی عظمت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں ۔ یہ والہانہ عقیدت اس دور نامسعود میں بہت کم نظر آتی ہے ۔ آج کا کوئی معلم عزت و وقار کے اس اوج ثریا پر مشکل ہی سے نظر آتا ہے ۔

راقم السطور کو کبھی ناصر کی شاگردی کا شرف حاصل نہ رہا ۔ پھر بھی ایک عرصہ سے واقف ضرور ہوں ۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں ناندیڑ کی فضائیں علم و ادب کی خوشبوؤں سے معمور تھیں ۔ جن ادبی نشستوں میں ناصر رہا کرتے میرا جانا رہا ۔ مرحوم الف الدین موظف مدار ملاس شعری نشستوں کا اہتمام کیا کرتے جن میں مقامی معروف شعراء اپنا کلام سنایا کرتے ۔ محمد عمر صدیقی اطہر جو مولانا کے نام سے مشہور ہیں ۔ ڈاکٹر خواجہ عزیز الدین مرحوم، محمود عشق، جاوید ناصر جو کبھی جاوید اختر تھے ۔ نعیم احمد فہیم، یونس فہمی انیس، اختر الزماں ناصر کو انفرادی حیثیت حاصل تھی

جو آج بھی برقرار ہے۔ غزل گوئی اور درس اقبالیات کی بنا پر اسوقت بھی وہ علم و ادب کے مجسم پیکر سمجھے جاتے جب وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک ارسطو ہیں جو اپنے علمی سکندروں کو جہاں بینا بنانا چاہتا ہو۔

یہ کا یہ مجسم کردار جب مستند تخلیق شکل اختیار کر جائے تو ایسی ہی شخصیتیں مہر و ماہ طرح افراد کی نظروں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس شخصی التعریف و توصیف کے بعد میں نفس معقولات کی طرف قارئین کی توجہ چاہتا ہوں۔

یہ ایک معروف و معلوم صداقت ہے کہ تخلیقات جب کبھی شائع ہوتی ہیں تو یہ قارئین کی ملک ہو جاتی ہیں۔ قاری اسکو جسطرح چاہے پڑھے سمجھے اور نتیجہ اخذ کرے اس کا اپنا حق ہے اس کے حُسن و قباح کو جانچنا مروجہ ادبی اقدار سے موازنہ کرنا یا عروض علم کی کسوٹی پر جانچنا۔ جرح و تعدیل کے بعد فیصلہ کرنا۔ یہ ناقدین ادب کا کام ہے۔ مجھے ناصر سے حسن ظن ہے اس لئے یہ ایک تاثراتی جائزہ ہے۔

اس ادبی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تخلیقی نگارشات کو اس کے پس منظر میں دیکھا جائے کیونکہ ادیب یا شاعر اپنے گردو پیش ہی سے تخلیقی مواد حاصل کرتا ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کی روایات کا پابند رہتا ہے اگر فرسودہ روایات کو دیکھتا ہے تو انحراف کے راستے بھی تلاش کرتا ہے۔ معشیت کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق رہا ہے معاشی ستم ظریفی کے بطن سے رقص گاہِ عالم میں حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جیسے میر تقی میر نے لکھا ہے

ہم کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب ہم نے　　درد و غم کتنے جمع کئے تو دیوان کیا

بہادر شاہ ظفر اپنی بے بسی کا جائزہ جو طوائف الملکی کے سبب تھی اسطرح لیتے ہیں

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ساحر نے تو ادبی مواد کیلئے زندگی کے حادثات کو شاعری کیلئے محرک اول کا درجہ دیا۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں　　جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ان اشعار میں روح اثر کی جھلک واضح طور پہ دیکھی جاسکتی ہے۔ نقد اصول بھی تشریح و

ادبی پس منظر کے پیش نظر ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اس اظہر من الشمس سچائی کو ناصر
وہ منظور سے گذارشِ احوال واقعی" میں اسطرح رد کیا ہے۔

" شعر نہ کسی تلخ تجربے کی بازگشت ہوتا ہے اور نہ کسی تخلیقی کرب کا نتیجہ۔ کسی واردات کو سبھی دیکھتے ہیں۔ بیان بھی کر سکتے ہیں۔ شاعر نہ تو اسکو دیکھتا ہے اور نہ کسی حد تک سمجھتا ہے مگر بیان ضرور کرتا ہے"۔ اور اسی کو تخلیقی کرب کا نام دیتا ہے"

اس بیان میں دو متضاد باتیں جو کسی بھی نقاد کو قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہیں۔ کلیم الدین احمد جیسا سخت ناقد جس نے غزل کو "نیم وحشیانہ صنف سخن" کہا شعر کو تلخ تجربہ کی بازگشت قرار دیتا ہے۔ اگر اشعار یوں ہی لفظوں کے پیکر میں ڈھل جائیں تو عام سطح پر کہی ہوں تمام باتیں شاعری ہو جائیں۔ شعری و نثری تخلیقات کا فرق مٹ جاتا۔ جذباتیت جو انسانی زندگی کا اصل محور ہے بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ دوم یہ کہنا کہ" نہ اسکو دیکھتا اور نہ کسی حد تک سمجھتا ہے۔ بیان ضرور کرتا ہے اسی کو تخلیقی کرب کا نام دیتا ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ناصر دور حاضر کے قلمکاروں پر طنز کر رہے ہیں۔ میری نظر میں تخلیقات ہمیشہ کرب کا نتیجہ ہی ہوتی ہیں۔ اور اسی کو ادب کی دنیا میں گرانقدر نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ شاعر اک مرتبہ جن حالات و حادثات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اس کے ذہن پر اسطرح قابض ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد وہ جو بھی کہتا ہے وہ تخلیقی کا نتیجہ ہی ہوتی ہیں۔ شائد اسی بات کے پیش نظر ناصر نے اس طرح دامن بچانا چاہا کہ " میری شاعری تو کسی تلخ تجربے کا عکس ہے اور نہ میں نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے جتنے قریب سے دیکھنے کا دعویٰ اور شاعر کرتے ہیں"۔ اسطرح کوئی بھی تنقید نگار ان کے پہلے متنازعہ بیان کو یعنی" شاعر نہ اسکو دیکھتا ہے اور نہ کسی حد تک سمجھتا ہے مگر بیان ضرور کرتا ہے' جو انہوں نے دوسروں کیلئے طنز کے طور پر استعمال کیا خود انہیں پر نافذ کر دے گا۔

ناصر کے مختلف اشعار میں حالات، زندگی کے تجربے، حادثات نظر آتے ہیں اور ہمت باندھتی والی باتیں بھی نظر آتی ہیں۔ جبکہ شاعر انکو اپنی زندگی میں نہیں پاتا۔ ایسی صورت میں میرے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ میں ناصر کے اس دور کو آپ کے سامنے رکھوں جس میں

انکی شعوری خمیر کی تعبیر ہوئی ہے

ڈاکٹر مسعود علی خاں آئی سی ایس کا رجامعہ عثمانیہ کے مطابق جو ORAL HISTORY کی تدوین میں نمایاں رول انجام دے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ماضی قریب کے لوگ انتہائی خوددار و وضع دار و تہذیب و اخلاق کے پیکر ہوا کرتے تھے۔ فارغ البالی۔ مرفع الحالی وضعداری انسانی عظمت، علمی تفوق اس دور کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مزید یہ کہ اپنی خاندانی وضع داری نے معاشی بحران کا مقابلہ کرنا سکھایا تھا مگر نہیں ناصر ان حالات میں پروان چڑھے جو کہ اردو ادب کیلئے ساز گار تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں" مشاعرے اور صرف مشاعرے تہذیبی اقدار کے پاس بان و نگہبان تھے۔ یہی خیر خواہان ادب تھے اور یہی مربیان شعر و سخن' یہی خیر خواہان ادب و مربیان شعر و سخن جو تہذیبی اقدار کی پاسبانی کے جذبے سے سرشار تھے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقات میں زندگی کا اظہار تو کیا لیکن وضع داری کے سبب اپنی تخلیقات کو زندگی کا نام نہیں دیا' اور انہوں نے اپنی تخلیقات میں لفظوں کی معرکہ آرائیاں شروع کر دی۔ لفظوں کے صدف میں زندگی کے تلخ تجربات کو چھپانا چاہا گویا کہ نظر انداز کرنا چاہا۔ جبکہ زندگی کی کڑوی سچائیاں عموماً وضع داری کا خول چیر کر برگ و بار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اسی بات کو ناصر نے شائد تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے اور اپنی وضعداری کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن خاں فراق کے متعلق یوں فرماتے ہیں" فراق اردو ادب کے ڈاکٹر جانسن تھے انکی ذہانت انکے شعروں و تنقیدی مضامین میں اتنی ظاہر نہیں ہوئی جتنی ان کی نجی زندگی میں گفتگو میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ گفتگو میں محفوظ نہیں ہیں اور انہیں کوئی باسوئل نہیں ملا جو ان کے ہر جملے کو نہ سہی یادگار جملوں کو ہی قلمبند کرتا رہتا!

ٹھیک یہی رائے ناصر پر چسپاں کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ تعلیم و تعلم کے میدان جسقدر مشہور ہیں اور جدس اقبالیات کے موقع پر شوکت گفتار قادر الکلامی کا ثبوت دیتے ہیں ان کی بیدار مغزی اور حاضر جوابی کو دیکھ کر غالب کے سنجیدہ ادبی لطیفوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ان تمام تر صفات سے متصف ہونے کے باوجود وہ برگ و بار سے الگ نظر آتے ہیں۔ یہ علم و ادب کا مجسم پیکر خود اپنے متعلق یوں قلمطراز ہے۔

"میری رائے میں یہ سارا کلام روایتی ہونے کا ملزم گردانا جائے اور کسی اعتنا کا مستحق نہ ٹھہرے" کلام کا روایتی ہونا جرم نہیں اگرچہ کلام روایتی ہو اور اس میں موجودہ زندگی کی پیچیدگی کا حل نظر آئے تو اسے مستحسن نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ شعری محرکات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ناصر کا یہ کہنا کہ میں جن مصائب و آلام سے گذرا ہوں انکی پرچھائیاں تک میرے کلام میں نہیں یہ کتنی عجیب بات ہیکہ شاعر مصائب و آلام سے گزرنے کو تسلیم کرتا ہے مگر اسے ادب کے سرمایہ کیلئے ضروری نہیں سمجھتا۔ جبکہ کلام میں ان ہی مسائل کا ذکر ملتا ہے جس سے انسان ہمیشہ دوچار ہوتا رہتا ہے میں اسکو ناصر کی کسر نفسی پر محمول کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ قاری اپنے ذوق و مزاج کے اعتبار سے بھی تخلیق کے معنی و مفاہیم کو ضبط ادراک میں لاتا رہتا ہے اور حالات پر منطبق کرتا رہتا ہے۔ مرزا غالب کا یہ کہنا "قید حیات" "بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انسان کہیں نہ کہیں حادثات زندگی سے متاثر ہو ہی جاتا ہے۔ اور اگر یہ شاعر ہوتا ہے تو اپنی شاعری میں اور ادیب ہوتا ہے تو اپنے نثری تخلیقات میں رقم کرلیتا ہے اور اس کا حل پیش کرتے ہوئے قاری کو ان حادثات زندگی سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

دوسری جگہ غالب کا یہ کہنا "گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی" اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ ہر شعر میں زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو تو ہوتا ہی ہے۔ یہ الگ بات ہیکہ قاری اپنے ذوق و فہم کے اعتبار سے اُسے قبول کرے۔

اسطرح شاعر کا مصائب و آلام سے گذرنا۔ مگر کلام میں اس کے ذکر سے باوجود دامن بچانا گویا ادب برائے زندگی کے نظریہ کو رد کرتا ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر ان اشعار کا ذکر نہ کیا جائے جو اپنی طرف توجہ مبذول کرولنے کی تمام تر صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ اسلئے نہیں کہ ان کے موضوعات اچھوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ لفظوں کے انتخاب نے معنوی حسن پیدا کردیا ہے۔ اس دور نامحمود میں ہمیں صالح اور صحت مند و پاکیزہ ادب کی سخت ضرورت ہے جس میں زندگی کے مسائل اور وقت ... جس میں زندگی سے حوصلوں کا گہرا شعور ملے ناصر بھی اپنے گرد و پیش کی زندگی کے کرب کو سمیٹ کر

نسان کے کرب واضطراب کی داستان سناتے ہیں اور اضطراری کیفیات سے نکلنے کا راستہ بتلاتے ہیں۔ یہی بات ان کے ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔

محبت نام تھا اک مصلحت کا — میں دھوکہ کھا گیا طرز بیاں سے
کوئی اپنا بھی نہیں کوئی پرایا بھی نہیں — میں وہ بے کس ہوں کہ تنہا بھی ہوں تنہا بھی نہیں
انہیں توڑا گیا مسلا گیا روندا گیا ناصر — کیا تھا جرم کلیوں نے چمن میں مسکرانے کا
شاید فریب ترک تعلقات ہی دے سکوں — ترے ستم ہی نے جینے کا گر سکھایا ہے۔
لہو امڈا تری آنکھوں سے آنسو بن کے ٹپکے گا — ارے وہ مسکرا کے رقص بسمل دیکھنے والے
اب طواف حرم سے کیا حاصل — دل میں آباد ہیں صنم خانے

ان اشعار کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس کرتے دیر نہیں لگے کہ آج کے معاشرہ کا انسان تنہا اور کرب واضطراب کی شدت سے دوچار ہے۔ ناصر آج کے انسان کو زمانے کی نیرنگیوں سے نبرد آزما ہو کر جینے کا گر سکھلاتے ہیں تاکہ وہ مرکز حیات سے ہٹ نہ سکے، ایسا لگتا ہے کہ ناصر نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

ناصر کا تقریباً کلام فرسودہ روایات سے بغاوت کا درس دیتا ہے جو زندگی ایک دھارے سے بہے وہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ حالات کا غلام بن کر زندہ رہنے کے بجائے انسانی عزم واستحکام کو اس ... ابھارتے نظر آتے ہیں۔

گلشن میں اذن ... سوئی نہیں مگر — سوئی ہوئی بہار کا شانہ ہلا تو دیں

جب ہم یہ عزم اپنے جلو میں لیکر چلتے ہیں تو پرخار راستوں کے نشیب وفراز کی کیفیات کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ زندگی کی بل کھاتی شاہراہ اتنی آسان بھی نہیں کہ دیوانہ وار چلا جا سکے۔

سانس الجھی ہوئی کراہوں میں — زندگی گھل رہی ہے آہوں میں

زندگی ہمیشہ انسان کے لئے کشش کا باعث رہی ہے اور جس نے زندگی کو جس نقطہ نگاہ سے دیکھا اس نے ویسا ہی نظریہ پیش کیا۔ یہ تمام نظریات افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ چاہے وہ اولیاء کرام کا نظریہ ہو چاہے وہ موجودہ دور کے مفکرین سماجیات کا۔ دونوں کے مابین ایک صالح نظریہ حیات بھی ہے کہ زندگی شعور کے مسلسل سفر کا نام ہے اور جس کا جتنا شعور ظرافت

کے ساتھ بیدار ہوگا کامیابی وکامرانی اسی کے ساتھ ہمرکاب ہوگی۔

اس نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے "برگ وبار کا جائزہ لیں" تو پتہ چلتا ہے کہ ناصر نے حقیقت پسندانہ نظریہ زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر زندگی کی صحیح تعریف اس دور نامسعود میں ادا نہیں کی جا سکتی ۔

زندگی پھول نہیں سنگ سخت ہے اے دوست ___ ترے ستم ہی نے جینے کا گر سکھایا ہے
زندگی سے دوستی کی ہے نبھاتے جائیے ___ بجلیاں کوندا کرے تنکے بچھاتے جائیے
زندگی دوست ہے نہ دشمن ہے ___ زندگی ہے تباہ اک فن ہے
تھک کر جو گر گیا ہوں تو کیا اٹھ بھی جاؤں گا۔
اے ہمسفر یہیں گرد بس کارواں نہیں
یہ نہ ہو تو جب تو زندگی کیسی ___ آگ اے دل بجھی بجھی کیسی

پھر عزم کی راہوں کا یوں تعین کرتے ہیں ۔

نرم موجوں سے الجھنا عزم کی توہین ہے ___ رخ تو ناصر تند دھاروں کا بدلنا چاہئیے

ہمارے عزم واستقلال کو مضبوط بنانے کیلئے کافی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو جو تصویر سامنے آئے گی وہ یہی ہو سکتی ہے۔ سہ

یہ ہار کی تصویر ہے یا فتح کا منظر ___ تم اپنا ہی ٹوٹی ہوئی شمشیر سے پوچھو

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناصر نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی بہترین تصویر پیش کر خود احتسابی کا یہ دلفریب اسلوب ناصر کو ان کے ہم عصروں میں امتیازی درجہ دیتا ہے۔

ناصر کی شاعری میں محبت کا ایک پہلو یہ بھی نظر آتا ہے کہ غم حیات کے مقابلے دارا عشق بے معنی سی بات ہے ۔

غم حیات کہاں اور یہ معاملات کہاں ___ تھپک تھپک کر تری یاد کو سلایا ہے

اگر کوئی ناصر کی غزلوں سے پوچھیں کہ یادوں کو کیوں سلایا جائے یادیں ہی تو جینے کا ہوتی ہیں تو ہمارے محبت نے اس شعور کو آئینہ حقیقت دکھانے لگتے ہیں ۔

ہوا کے دوش پہ میت ہے آشیانے کی ___ کھڑے ہیں پھول الگ بجلیوں کا سایہ ہے

اور جب یہ پھول زندگی کی ستم ظریفیوں اور طوفانِ حوادث کا مقابلہ کرکے بچ بھی جائیں تو اپنے اطراف واکناف کی آوازیں سن کر مبہوت ہو جاتے ہیں۔

سناتے ہوئے مزے لے لے کے اپنے عدل کے قصے

ہماری بے گناہی کی کبھی تصویر تو کھینچو

اس قسم کے اشعار یونہی نوکِ قلم سے ٹپک نہیں پڑتے۔ ان اشعار کے خالق کو برسوں زندگی کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ سخت حالات سے دامن بچاکر زندگی کا یہ تیکھا تیور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ سخت حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے ہی یہ تیور پیدا ہوتے ہیں اور ناصر جیسے وسیع النظر انسان ہی ان کیفیات کو شعری تراکیب میں محفوظ کرسکتے ہیں۔

الغرض ناصر نے جہاں مترنم بحروں میں طبع آزمائی کی۔ وہیں انہوں نے مشکل زمینوں کو آسان بنانے کی کوششیں بھی کیں۔ قوافی و ردیف کے پیمانے جب وہ چھلکاتے ہیں تو زمانے کو گردش میں لاتے ہیں۔ اپنے کلام میں شراب کا ذکر عادی مے نوش کی طرح کرتے ہیں۔ چشم زلف کی حکایتیں سناکر محبوب سے قربت و شدید قربت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ کبھی جوانی کو سرخ شراب سے تشبیہ دیتے ہیں اور کبھی محبوب کی عنایتوں کو شراب کا نام۔ کبھی خراماں چال کو قیامت سے زیادہ فتنہ انگیز بتلاتے ہیں۔ الم نصیب زندگی میں مسرت بھی تہمت گردانتے ہیں۔ زمانے کی جفائیں فتنہ اور محبوب کا تغافل بھی قیامت بتلاتے ہیں۔ مسکرانے میں قوت کے بکھر جانے کے خوف کا احساس خفاش صفت انسانوں کے سر ڈالتے ہیں۔ رقصِ بسمل پر مسکرانے والوں کو حادثات زندگی سے دوچار ہوتے کا اشارہ کرتے ہیں۔

ایسے موضوعات غزل کیلئے نئے نہیں لیکن ناصر نے جس یکدستی سے اپنی غزلوں میں استعمال کیا اس سے غزل کے پیمانے اثر آفرینی کی شراب سے چھلک پڑتے ہیں ان سے ناصر کی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے۔

سلسلہ ص ۲۵

مشاہدہ تلخ ہوگا اور اس میں تجزیہ کی صلاحیت ہوگی۔ اسکی تخلیق باوقعت، وقیع ہوگی مقاصد اور منشا کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کسی مفکر اہل فکر و نظر اور محقق اور لائق فاضل نے کہا ہے کہ خدارا اس وقت کوئی چیز تخلیق نہ کریں اس وقت تک کوئی تحریر نہ کریں کوئی بات

پی آئی بی

بھارت میں تعلیم
ایک جائزہ

تعلیم انسانی وسائل کی ترقی و فروغ اور ملک کی ترقی کیلئے ایک اہم جزو ہے۔ چنانچہ حکومت نے تعلیم کو ہمیشہ ہی اعلیٰ ترجیح دی ہے۔ آزادی کے گزشتہ چار دہوں کے دوران جامع کوششوں کے نتیجے میں، ملک میں خواندہ لوگوں کی کل تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے نیز طالب علموں کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ آج ملک میں خواندگی کا شرح بڑھکر ۲۳ء ۳۶ فیصد ہوگئی ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں یہ شرح صرف ۱۴ فیصد تھی نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق 'تعلیم بالغاں'، تمام بچوں کی تعلیم نیز طلباء کی پیشہ وارانہ اور تکنیکی تعلیم پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں وضع کی گئی تھی۔ اس پالیسی میں تعلیم کے تمام شعبوں میں ہر قسم کے عدم توازن اور عدم مساوات کو دور کرنے کیلئے تعلیم کا ایک قومی نظام شامل کیا گیا ہے۔

بھارت کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۹ء ۳۶۱۰ لاکھ تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھکر ۸ ء ۶۸۵۱ لاکھ تک پہنچ گئی اور ۱۹۸۷ء میں یہ مزید بڑھکر ۷۶ء ۷ کروڑ ہوگئی ہے۔ ملک میں ۱۹۴۷ء میں خواندگی کی شرح صرف ۱۴ فیصد تھی جو ۱۹۵۱ء میں بڑھکر ۶۷ء ۱۶ فیصد ہوگئی۔ جامع کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۸۱ء میں شرح خواندگی مزید بڑھکر ۲۳ء ۳۶ فیصد ہوگئی۔

کیرالا میں ۱۹۸۱ء میں شرح خواندگی سب سے زیادہ یعنی ۴۲ء ۷۰ فیصد تھی جبکہ اروناچل پردیش میں شرح خواندگی سب سے کم یعنی ۷۹ء ۲۰ فیصد تھی۔ بھارت میں خواندہ افراد کی کل تعداد ۱۹۵۱ء میں ۹ء ۶۰۱ لاکھ تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھکر ۵ء ۲۴۷۵ لاکھ ہوگئی۔

پہلے پنچسالہ منصوبہ کے دوران تعلیم پر کل اخراجات ۱۶۹ کروڑ روپے تھے جو ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران مرکزی اور ریاستی شعبوں میں بڑھکر ۶۳۸۲ کروڑ روپے ہوگئے۔

۱۹۴۷ء میں تعلیم پر کل اخراجات صرف ۵۷۰ لاکھ روپے تھے۔ ۱۹۸۹-۹۰ء میں مرکزی شعبہ میں تعلیم کیلئے ۸۸۲ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ ۱۹۸۶-۸۷ء میں بہار میں تعلیم پر فی کس اخراجات سب سے کم یعنی ۹۶ روپے تھے جبکہ ناگالینڈ میں تعلیم پر فی کس اخراجات سب سے زیادہ یعنی ۲۴۸۱ روپے تھے ۱۹۸۶-۸۷ء میں کیرالہ میں تعلیم پر بجٹ کے اخراجات کا تناسب سب سے زیادہ یعنی ۳۲٫۱ فیصد تھا جبکہ ناگالینڈ میں تعلیم پر اخراجات کا تناسب سب سے کم یعنی ۱۳٫۸ فیصد تھا۔

۱۹۵۱ء میں صرف ۲۷ یونیورسٹیاں تھیں جبکہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھ کر ۱۵۷ ہو گئی۔

۱۹۸۶ء میں ایک آئینی ترمیم کرکے، تعلیم کو مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں کی مشترکہ ذمہ داری بنا دیا گیا۔

تعلیم کا ایک قومی نظام وضع کرنے کی غرض سے ۱۹۸۶ء میں تعلیم کی قومی پالیسی اور اس پر عمل درآمد کیلئے عملی پروگرام وضع کیا گیا تاکہ تمام طالب علم بغیر کسی امتیاز کے مساوی تعلیم حاصل کر سکیں۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۰۹۶۷۱ پرائمری اسکول تھے جبکہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۵۳۷۳۹۹ ہو گئی۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ہائی اور ہائیر سکنڈری اسکولوں کی تعداد ۷۲۸۸ تھی جو ۱۹۸۶-۸۷ء میں بڑھ کر ۶۴۲۴۰ ہو گئی۔ اسی طرح سے ۱۹۵۰-۵۱ء سے ۱۹۸۶-۸۷ء کی مدت کے دوران آرٹس، سائنس اور کامرس کے کالجوں کی تعداد ۵۴۲ سے بڑھ کر ۴۱۵۱ ہو گئی۔ ۱۹۵۰-۵۱ میں کالجوں میں طلباء کی تعداد ۳٫۶ لاکھ تھی جو کہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں بڑھ کر ۵۲ لاکھ ہو گئی۔ اسی طرح سے ۱۹۵۰-۵۱ء میں اساتذہ کے تربیتی اسکولوں کی تعداد ۷۸۲ تھی اور اساتذہ کے تربیتی کالجوں کی تعداد ۵۳ تھی جو ۱۹۸۶-۸۷ء میں بڑھ کر بالترتیب ۹۷۳ اور ۴۶۲ ہو گئی۔

ملک سے ناخواندگی کے خاتمہ کیلئے ۱۹۸۷ء میں خواندگی کے قومی مشن کے تحت ایک وسیع قومی مہم شروع کی گئی تاکہ تعلیم بالغاں کے پروگراموں کے تحت مختلف سکیموں کے ذریعہ ۱۵ سال سے ۳۵ سال کی عمر کے ۸ کروڑ ناخواندہ افراد کو ۱۹۹۰ء تک اور ۵ کروڑ افراد کو

باقی بر صفحہ

جی آر کے بی

تعلیم بالغان اور قومی یکجہتی

کسی قوم کا صرف جغرافیائی اظہار اس کے وجود کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ مختلف ماحول میں پرورش پانے والے اسکے عوام اسکے وجود کی گواہی دیتے ہیں جو مختلف خصوصیات اور کردار کے حامل ہوتے ہیں جنہیں وہ ورثہ میں حاصل کرتے ہیں یا پھر ماحول کی وجہ سے اپنا لیتے ہیں۔ ان اختلافات کے ساتھ وہ ایسے تہہ دار سماج میں زندگی گذارتے ہیں جہاں انسانی رشتے ذات پات اور عقائد کی مصنوعی تفریق میں بٹے ہوتے ہیں اجتماعی سماج میں مختلف گروہوں کے درمیان اختلاف و کشمکش ناگزیر ہوتی ہے۔ ہندوستانی سماج، اپنے گوناگوں مذاہب، زبانوں، تہذیبوں کے پس منظر میں اجتماعی سماج کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ ایسے ہمہ رنگی سماج کو ایک متحدہ سماج میں کس طرح بدلا جا سکتا ہے ؟

خیال اور ذاتی مفادات کے ٹکراؤ کو ہم خیالی اور مفادات عامہ میں کسطرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ سماج کے مخالف گروہوں کے درمیان جو تہذیبی اور جذباتی طور پر یکسانیت سے عاری ہوتے ہیں کسطرح ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے ؟

ان سوالات کے جوابات مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ملاپ کا نام یکجہتی نہیں۔ یکجہتی و اتفاق صرف مختلف اکائیوں کا امتزاج نہیں۔ خلوص کے بغیر سماجی طبقات کے درمیان ایسا امتزاج نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی پسندیدہ۔ اختلافات و تفاوت کسی بھی جمہوری سماج کی اساس ہوتے ہیں کتنی بھی کوششیں کی جائے ان اختلافات کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اصل مسئلہ سماجی ہم آہنگی اور مفاہمت کی بقا کا ہے۔ اگر ہم میں صحیح مفاہمت اور باہمی اعتماد ہو تو سماج میں خوشحالی اور امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ ملک ایک سماجی ادارہ ہے اور یہ اسکی ذمہ داری ہے کہ وہ سماج کی متضاد اکائیوں کے درمیان مختلف قوانین، ضابطوں کے ذریعہ خوشگوار ماحول پیدا کرے ہمارے دستور کی رو سے شہریوں کے کسی اعلیٰ اور حاکم طبقے کے وجود کا جواز نہیں۔ ہمارا آئین، طبقات

اقوام اور فرقوں کی تفریق سے مبرا ہے۔ شہری حقوق کی بابت تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں ہیں قانون کی نظر میں یکسانیت کے معنی تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ کسی بھی شخص کو انکی پیدائش یا نسل کی بنیاد پر فوقیت حاصل نہیں۔ سوائے درج فہرست اقوام، قبائل کے جو برسوں نامساویانہ سلوک کے شکار رہے اسی لئے انہیں آئینی مراعات دی گئی ہیں۔ ہمارے عوام جہالت، لاعلمی اور غربت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ سماج میں علاقائی، مذہبی، لسانی، فرقہ واری اور علاحدگی پسند رجحانات نمایاں ہو رہے ہیں۔ سماج کے پچھڑے ہوئے طبقات قانونی اور آئینی تحفظات کے باوجود سماجی امتیازات اور معاشی استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔

جنسی امتیازات کے خلاف ترقی پسندانہ اقدامات اور عورتوں کو مساویانہ حقوق اور انکے فروغ کیلئے کی جانے والی کوششوں کے باوجود وہ ابھی تک امتیازات کا شکار ہو رہی ہیں۔

سیکولرزم دستور کا نصب العین ہے لیکن فرقہ واریت سماج کا بدترین روگ بنی ہوئی ہے اور مذہب کے نام پر کئی تباہ کن باہمی فسادات جاری ہیں ان تمام برائیوں کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک اہم وجہ لاعلمی اور ناخواندگی ہے۔ ایسے تکلیف دہ ماحول میں عموماً تعلیم کا اور خصوصاً تعلیم بالغان کا کیا رول ہونا چاہئے۔ اس کا جواب ۱۹۸۶ء میں تدوین کردہ قومی تعلیمی پالیسی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے قومی ادراک میں تعلیم سب کے لئے ضروری ہے یہ ہماری مادی، روحانی اور ہمہ جہت ترقی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے یہ ہمارے احساسات کو مہمیز کرتی ہے جو قومی یکجہتی کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں سائنٹفک مزاج ذہنی اور روحانی آزادی کو فروغ دیتی ہے۔

غرض سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوری اقدار کی آبیاری کرتی ہے جو ہمارے دستور کا مشترک حصہ ہیں نئی پالیسی امتیازات کے خاتمے اور ان لوگوں کے لئے یکساں تعلیمی مواقعوں کی فراہمی پر زور دیتی ہے۔ جو ابھی تک اس سے محروم رہے " ان مقاصد کے حصول کیلئے پالیسی اور پروگرام دونوں کے تحت کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ ہم ایسے سماج میں سانس لے رہے ہیں جو نیم خواندہ ہے جسے تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا ادراک نہیں ہے۔ جہاں تعلیم کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی ملازمت اور روزگار کو دی جاتی ہے بچوں کو مدرسہ بھیجنے کا مطلب زائد

آمدنی سے محرومی تصور کیا جاتا ہے اس لئے والدین اس سے گریز کرتے ہیں۔ پسماندہ علاقوں میں عورت اور مرد دونوں توہمات کا شکار اور ایسے اصلاح پسندانہ رجحانات کے مخالف ہیں جو ان کے بچوں کو تعلیم سے روشناس کروا کر ان میں عقلی استدلال اور سائنسی انداز فکر کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ سماجی ماحول اور مدرسوں کے ماحول کے درمیان اکثر ایک خلیج پیدا ہو جاتی ہے جو قبائلی علاقوں میں بچوں کو مدارس بھیجنے میں حائل ہوتی ہے۔ اگر تعلیم نجات کا ذریعہ ہے تو اسے پہلے خود پاؤلو فریرے کے الفاظ میں BANKING CONCEPT OF EDUCATION تعلیم کا بینکی تصور سے نجات حاصل کرنا چاہیے جس میں استاد کی حیثیت جمع کرنے والے کی اور طالب علموں کی جمع ہونے والوں کی ہوتی ہے تعلیم کو حقیقی اصطلاح میں اگر بامعنی بنانا ہو تو اسے بنک کاری کے نظریہ سے چھٹکارا دلانا چاہیئے ۔ اس سلسلے میں نئے تعلیمی نظام میں پہلا قدم محروم اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی نشاندہی کرنا اور انہیں اپنی قوت اور کوتاہیوں نیز انکی مخالف قوتوں سے آگاہ کرنا ہے۔ دوسرے خود اعتمادی، خود انحصاری، اور اپنی مدد آپ جیسے ہتھیاروں سے انہیں لیس کرنا چاہیئے جسکی وجہ سے وہ اپنی روایتی ہچکچاہٹ اور جمود سے نجات حاصل کرکے اپنے اطراف واکناف کی مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پائیں گے۔ تیسرے انہیں تنظیم کی اہمیت سے واقف کروانا۔ نیز ان میں مختلف تنظیموں کے فوائد اور نقصانات سے آگاہی کا شعور پیدا کرنا۔ کسی خاص تنظیم کے بارے میں مثبت و منفی فیصلے کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا۔ چوتھے ان میں تنظیم قائم کرنے کا شعور پیدا کرنا اور اس عمل کے دوران ایک تماسی عامل کی حیثیت سے کردار ادا کرنا تا آنکہ اس عمل کی منطقی تکمیل نہ ہو جائے۔

"اختیار" بیگانگی اور غیر انسانیت کے برعکس ترسیل ہم آہنگی اور شمولیت تعلیم بالغان کی حکمت عملی کی اہم خصوصیات ہیں اس حکمت عملی کی تشکیل قومی خواندگی مشن نے کی ہے تعلیم کی اشاعت کی راہ میں چند مشکلات ہیں لیکن تعلیم لوگوں کو ان کے مسائل حل کرنے کی قوت کو متحرک کر سکتی ہے۔ تعلیم بالغان میں طالب علم کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ استاد کی تدریسی مہارت کو۔ طالب علم عموماً داخلیت پسند

اور چند حد بندیوں میں جکڑے رہتے ہیں اس لئے استاد کا فرض ہیکہ وہ انہیں اپنے اعتماد میں لے، ان سے گفتگو کرے، ان کی ہمت بندھائے تاکہ وہ دھیرے دھیرے اپنے خول سے نکل آئیں۔ اس عمل کو پچھڑے ہوئے اور محروم افراد کی نفسیاتی بازآبادکاری کہنا مناسب ہوگا چونکہ وہ اس اقدام سے اپنے مد مقابل کی طرح مساویانہ حقوق اور قوت حاصل کریں گے۔

ایسے غیر قدامت پسندانہ اور غیر رسمی ماحول میں استاد کو اپنی تعلیم کو موثر بنانا ہو تو اسے اپنے ماحول سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیئے نئی تعلیمی پالیسی کے مخالفین کی نشاندہی بھی کر لینی چاہیئے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ اپنی ملازمت، مقام، وقت اور تعلیمی وسائل کا تعین سمجھداری سے کرے تاکہ تعلیم کی اشاعت ٹھیک ڈھنگ سے ہو سکے۔ حالات کے لحاظ سے اسے چاہیئے کہ وہ اپنے انداز تدریس کو بدل لے۔ استاد کو انقلابی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کا تعلیم بالغان سے ایک پر امن انقلاب برپا ہو جس سے سماج تفریق اور تخریب پسندی کا خاتمہ ہو سکے۔ ظاہر ہے ایسا تعلیمی نظام روایتی طرز کے اداروں اور نہ ہی سرکاری اداروں کے ذریعہ روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔ اس تعلیمی پروگرام کی عمل آوری کیلئے پیشہ ور، رضاکارانہ ایجنسیوں اور سماجی کارکنوں کی ضرورت ہے۔ جو غیر رسمی اور غیر قدامت پسند تعلیم کے حامی ہوں اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے بیرونی مالی وسائل پر تکیہ نہ کرتے ہوں۔

تعلیم بالغان پروگرام کی کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ وہ خود انحصاری اور مساویانہ کلچر پر مبنی ہو اور ایسا ہی تعلیمی نظام بامعنی اور قومی یکجہتی کا موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔

سلسلہ صفحہ ۳۵

۱۹۹۵ء تک کام کاج کے لائق خواندہ بنایا جائے۔

۱۹۸۸ء میں تکنیکی تعلیم کی کل ہند کونسل کا قانون وضع کیا گیا ہے تاکہ ملک میں تکنیکی اداروں میں بے ضابطہ اضافہ کی روک تھام کی جائے اور تکنیکی تعلیم کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

برس ۱۹۸۸ء کے دوران ۲۹ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں ۲۵۶ نودیہ ودیالیہ قائم کئے گئے تاکہ دیہی علاقوں کے ذہین بچوں کو بہتر اور معیاری تعلیم فراہم کی جائے جس میں ثقافت اور اقدار نیز ماحولیات کے بارے میں بیداری پر زور دیا گیا ہے۔

قومی معمار

۱۹۵۷ء میں اپنی طرز کے اعتبار سے واحد عالمی معیار کے ایک مکمل طور پر ایرکنڈیشنڈ کانفرنس ہال کی تعمیر، جہاں بیک وقت چار زبانوں میں کارروائی کے ترجمہ کئے جانے سہولیات دستیاب ہیں، ۱۹۶۷ء میں غلّے کیلئے سلیپ فورم تکنیک کے ذریعہ آرسی گوداموں کی ساڑھے دس دنوں میں تعمیر، جس کی دیواریں ۱۲۰ افٹ بلند ہیں۔ راجستھان کے صحرا میں دور دراز پہاڑیوں کی بلندیوں پر شمسی توانائی سے چلنے والی ہوائی جہازوں کو وارننگ دینے والی لائٹوں اور شیلڈ کی نصب کاری، بلند علاقہ لداخ میں شمسی توانائی سے گرم رہنے والے مکانات کی تعمیر سال ۱۹۸۲ء میں ایشیائی کھیلوں کیلئے ۷۵ ہزار نشستوں والے عالمی معیار کا ایک عظیم الشان اسٹیڈیم کی تعمیر، اسی طرح انڈومان کے گھنے جنگلوں میں پانی صاف کرنے والے پلانٹ کی نصب کاری جیسے تعمیراتی کارنامے مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کے قابل فخر کام ہیں اور قومی تعمیرات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محکمہ جو سی پی ڈبلیو ڈی کے نام سے جانا جاتا ہے ملک میں تعمیرات عامہ کا سب سے قدیم محکمہ ہے۔

یہ محکمہ باضابطہ طور پر ۱۹۳۰ء میں وجود میں آیا۔ لیکن اسکی ابتداء ۱۹۱۱ء میں ہو گئی تھی جب حکومت ہند نے ملک کی راجدھانی کو کلکتہ سے دلّی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سنٹرل سیکریٹریٹ اور راشٹرپتی بھون کے کیمپلکس کی شاندار عمارات اور ان کے سامنے کے خوبصورت حصے فن تعمیر اور انجینئرنگ کی ان روایات کی یادگار ہیں جو اس محکمے کو ورثے میں ملی ہیں۔

پچھلی چار دہائیوں میں اس محکمے نے ملک کے طول و عرض میں ۱۷ لاکھ مربع میٹر سے زیادہ رقبے کے دفاتر، سرکاری ملازمین کے لئے ایک لاکھ پچاس ہزار مکانات، بہت سے ہوائی اڈے، تعلیمی ادارے، ورکشاپ، فیکٹریاں، ہوٹل، اسپتال، گودام، آڈیٹوریم اور اسٹیڈیم

ریڈیو اسٹیشن اور کئی ہزار میل لمبی سڑکیں تعمیر کیں۔ اس محکمے کی دوسری اہم سرگرمی جس کی طرف ماہرینِ نباتات کے ماہرین داد دیں گے وہ ہے صرف دلی میں تقریباً ۱۰ لاکھ پیڑ پودوں کی شجر کاری۔

یہ محکمہ ملک میں تعمیراتِ عامہ کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور اس کا سالانہ کاروبار ۸۰۰ کروڑ روپئے کا ہے۔ عمارات وغیرہ کی دیکھ بھال پر ۱۰۰ کروڑ روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ اس محکمہ کا سربراہ ڈائرکٹر جنرل آف ورکس ہوتا ہے جو حکومت ہند کا مشیر اعلیٰ کار انجینیر بھی ہوتا ہے اس محکمہ میں تقریباً ۴۱ ہزار لوگ کام کرتے ہیں جن میں سے تقریباً ۸۷۰۰ ملازمین کا تعلق تکنیکی عملے سے ہے۔ جو انجینیرنگ کے علوم، فنِ تعمیر، باغ بانی اور فنِ منظرکشی کے مختلف شعبوں کے ماہر ہیں۔ فیلڈ یونیٹیں ۱۰ زونل چیف انجینیروں کے ماتحت ہیں۔ اسکے علاوہ دو پروجیکٹ ٹیمیں دلی میں مخصوص پروجیکٹوں کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ الیکٹریکل میکانیکل اور ایرکنڈیشننگ کے کام چیف الیکٹریکل چیف انجینیر دیکھتے ہیں۔ اس محکمے میں ایک تربیتی ادارہ ایک وجیلنس یونٹ نقشے و ڈیزائن تیار کرنے کی ایک مرکزی تنظیم الگ الگ چیف انجینیروں کے تحت کام کرتی ہیں۔

تعمیراتِ عامہ کا یہ مرکزی محکمہ نہ صرف حکومت بلکہ خود مختار اداروں کے لئے بھی کام کرتا ہے۔ محکمے کے کاموں میں سے تقریباً ۴۰ فیصد کا تعلق خود مختار اداروں اور سرکاری دائرہ کار کے اداروں سے ہے۔ کچھ نجی اداروں نے بھی تعمیرات کا کام اس محکمے کے سپرد کیا ہے جو محکمے کی اچھی کارکردگی کا ثبوت ہے۔

منظرکشی و باغبانی: بہت سے لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ اس محکمے کی درخت لگانے اور باغ بانی کی سرگرمیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سرگرمیوں کی شروعات بہت پہلے ہوئی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں ہی راجدھانی کی ضروریات کی دیکھ بھال کیلئے باغ بانی کے ایک سپرنٹنڈنٹ کا تقرر ہوا تھا۔

اس محکمے سے وابستہ باغ بانی اور قدرتی مناظر پیدا کرنے کے ماہرین کی کوششوں کی وجہ سے ہی لٹ ین (LUTYENS) کی دلی باغات کا شہر بنی پارک، راج گھاٹ، شانتی ون و جے گھاٹ کمپلکس، سنٹرل وسٹا، لودھی گارڈن اور شکتی استھل بھارت کی راجدھانی کیلئے

اس محکمے کی طرف سے پھولوں سے لدے ہوئے تعمیراتی تحائف ہیں۔

نئی دلی میں ۷۰ ایکڑ اراضی پر محیط سنٹرل نرسری ملک میں حکومت کے تحت چلنے والی سب سے بڑی نرسری ہے۔ اس میں بوگین ولیا کی ۱۰۰ سے زائد اقسام ہیں۔ گلابوں کی ۵۰۰ سے زائد اقسام ہیں اور گل داؤدی کی ۱۰۰ سے زائد قسمیں ہیں۔ بغیر منافع کے پودوں کی فروخت سے سالانہ ۳۵ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ باغبانی کے ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ پھولوں کی جو جھانکی نکالی جاتی ہے اسے یوم جمہوریہ کی پریڈوں میں اول انعام مل چکا ہے۔ اس محکمے کو دلی اور دیگر شہروں میں منعقدہ پھولوں کی نمائشوں میں متعدد انعامات مل چکے ہیں۔

وگیان بھون، سپریم کورٹ آف انڈیا اور جواہر لال نہرو اسٹیڈیم نے قومی سطح کی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یہ اندرون ملک اور بیرون ملک دلی کی یادگار نشانیاں بن گئی ہیں۔ پارلیمنٹ ہاؤس انیکسی جس کی تعمیر ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی اس کے بارے میں اس وقت کے صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد نے کہا تھا کہ یہ ایشیا کی خوبصورت ترین عمارات میں سے ایک ہے۔ ٹوکیو اور مانٹریل کے تجارتی میلوں میں بھارتی پویلین بھی سی پی ڈبلیو ڈی کے عمارت سازوں کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ بہت سے ہوائی اڈوں پر ٹرمنل کی عمارتیں جن میں جدید ترین عمارت کالی کٹ کی ہے اس محکمے کے فن تعمیر کے ماہرین کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔ اس محکمے سے تعلق رکھنے والے تین ماہرین کو ان کی گرانقدر خدمات کے لئے پدم شری اور ایک کو پدم بھوشن سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ اس محکمے کے ماہرین تعمیر کے ذریعہ ڈیزائن کی گئی عمارتیں استعمال کے اعتبار سے زیادہ کارآمد ہیں اور ان میں سادگی عیاں ہے۔

عام تاثر کے برخلاف دلی میں ٹاٹا مشاورتی خدمات کے ایک جائزے کے مطابق اس محکمے کی عمارتیں اچھی یا بہت اچھی قرار دی گئی ہیں۔

خوراک کے محاذ پر: بھارت میں سبز انقلاب سے ہونے والی کامیابیوں کو اس محکمے نے گوداموں کی تعمیر کے ذریعہ مضبوط بنایا ان گوداموں میں اناج کا ذخیرہ رہتا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں اناج کو محفوظ رکھنے والے اداروں نے گوداموں کی تعمیر کے لئے اس محکمے کے معیاروں کو اپنایا۔ اب تک اس محکمے نے ذخیرہ کرنے کی جو صلاحیت پیدا کی ہے وہ ۳۰ لاکھ ٹن سے

زیادہ ہے۔ خوراک وزراعت کی وزارت کے ذریعہ اناج کے گوداموں کی تعمیراتی لاگت پر کئے گئے ایک جائزے کے مطابق سی پی ڈبلیو ڈی کے تعمیر کردہ گوداموں پر سب سے کم لاگت آئی ہے۔

ہوائی حمل ونقل: ۱۹۷۱ء میں ہوائی اڈوں کی بین الاقوامی اتھارٹی کے قیام سے قبل جہازوں کی محفوظ اور آرام دہ ڈیزائنوں اور آمد کے لئے بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی ذمہ داری اسی محکمہ کی تھی۔

ہوائی اڈوں سے متعلق بین الاقوامی اور قومی اتھارٹیوں کے قیام کے بعد بھی سی پی ڈبلیو ڈی انہیں اپنی خدمات فراہم کرتا رہا ہے۔ ان کاموں میں موجودہ ہوائی پٹیوں کو مضبوط بنانا نئی ہوائی پٹیاں تعمیر کرنا اور عالمی معیارات اور ہدایات کے مطابق ہوائی پٹیوں پر روشنی اور دیگر سہولیات فراہم کرنا شامل ہے۔ ٹرمنل کی عمارتوں کو بہتر اور نئی عمارتوں کی تعمیر بھی اس محکمے کی ذمہ داریوں کا حصہ تھا۔ ان تمام چیلنجوں کا مقابلہ عملی طور پر دیسی مہارت سے کیا گیا۔ کلکتہ میں بین الاقوامی ٹرمنل کی عمارت کا موازنہ دنیا کی ایسی کسی بھی عمارت سے کیا جاسکتا ہے۔

تریوندرم ہوائی اڈے پر زمین دوز نکاسی نالوں کا اچھا انتظام ہے۔ حال ہی میں ۲۱ کروڑ روپے کی لاگت سے کالی کٹ کا ہوائی اڈا تعمیر کیا گیا ہے جس کا ہوائی پٹی بنانے کے لئے ۱۰۰ فٹ مٹی بھرنی پڑی تھی۔ یہ کارنامے محکمے کی انجینیرنگ مہارت اور بہترین کارکردگی کے مظہر ہیں۔

ملک میں بالعموم اور خاص کر دور دراز علاقوں میں سڑک مواصلات کی ترقی میں اس محکمہ کا حصہ قابل ذکر ہے۔ جموں وکشمیر میں جموں، پٹھان کوٹ اور دھارادھم پور سڑکوں کی تعمیر نے ریاست کے اندرونی علاقوں کو باہر کی دنیا سے مربوط کر دیا ہے۔ سال ۱۹۵۷ء میں ۲۰۵ کلو میٹر لمبی بانیاں کی تعمیر وتکمیل سے اب وادی کشمیر ملک کے بقیہ حصول سے سارا سال مربوط رہتی ہے۔ جبکہ یہ موسم سرما میں الگ تھلگ ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد سے شمال مشرقی خطے اور سکم اور بھوٹان میں بھی کئی ہزار کلو میٹر لمبی سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں بھارت نیپال معاہدے کے تحت ۲۰۰ کلو میٹر لمبی سونالی لوگھرا سڑک کا ڈیزائن تیار کرنے اور اس کی تعمیر کرنے کا کام اس محکمے کے سپرد کیا گیا تھا۔ بعد ازاں سی پی ڈبلیو ڈی کو نیپال میں ۵۵۷ کلو میٹر لمبی مہندر راج مارگ کا ڈیزائن تیار کرنے اور اس کی تعمیر کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔

مشاورتی خدمات: اس محکمے کا اپنا ایک الگ اور خود مختار مشاورتی یونٹ ہے جو تعمیراتی کاموں کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مشورے دیتا ہے۔ بیرون ملک محکمے کو سونپے گئے تعمیراتی کاموں میں "وساکا" کولمبو اور اسلام آباد میں بھارتی سفارت خانوں کی تعمیر، لیبیا میں ہاؤسنگ کامپلکس کی تعمیر، کابل میں اسکول کی عمارت کے ادارے کی تعمیر، سیشلز ۔ میں عالمی کانفرنس مرکز کی تعمیر، ماریشس میں ایک ثقافتی مرکز اور کوالالمپور میں بھارتی سفارتخانہ کی عمارات کی تعمیر قابل ذکر ہیں۔

اس محکمے نے بہت سے مواقع پر اپنی بہترین کارکردگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس نے کئی معینہ مدت کے اہم پروجیکٹوں کی تعمیرو تکمیل معین مدت میں ہی مکمل کرنی تھی ان میں ۱۹۵۶ء میں یونیسکو کانفرنس کے لئے وگیان بھون اور جنپتھ ہوٹل کی تعمیرات، ساتویں دہائی میں ۴۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ترجیحی بنیادوں پر دفاعی ہوائی پٹیوں کی تعمیرات، اقوام متحدہ کے تجارت اور ترقی کے ادارے (UNCTAD) اور صنعتی ترقی کے ادارے (UNIDE) کی کانفرنسوں کے لئے ہوسٹلوں کی تعمیر، ۱۹۸۲ء کے ایشیائی کھیلوں کے لئے سنتھیٹک ٹریک اور فلڈ لائٹ سسٹم کے حامل جواہر لال نہرو اسٹیڈیم کی تعمیر ۱۹۸۳ء میں ناوابستہ کانفرنس اور دولت مشترکہ سربراہ کانفرنس سے متعلق تعمیراتی کام اور ۱۹۸۷ء میں روسی ثقافتی جشن کے لئے اسٹیج اور لائٹ کے ترقی یافتہ نظام کی تعمیر اس محکمے کے ایسے ہی کارنامے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں دوسرے قومی کھیلوں کے لئے صرف دو ماہ میں تریوندرم ویلوڈروم مکمل کیا گیا۔ دلی میں اپنی طرز کے پہلے سوپر کمپیوٹر مرکز کے لئے جگہ کی تیاری جس میں عمارت کو مضبوط کرنا اور ضروری بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کی فراہمی شامل ہے۔ اس پر ۵۰۳ کروڑ روپے لاگت آئی ہے اور یہ کام چھ ماہ میں مکمل ہوا ہے۔ سی پی ڈبلیو ڈی کو یہ اس بات کا امتیاز حاصل ہے کہ سابق ۱۱۰ کلومیٹر لمبی پنجاب سرحد پر دراندازی اور اسمگلنگ روکنے کے لئے باڑ لگانے اور فلڈ لائٹنگ کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ ایسا ہی کام راجستھان میں جاری ہے۔

عام خیال کے برخلاف اس محکمے نے جدید کاری کے میدان میں پہل کی ہے۔ نئی تکنیکیں

اور سازو سامان کے معاملے میں اس محکمے نئے نئی روایات قائم کی ہیں۔ سی پی ڈبلیو ڈی نے پہلی مرتبہ معیار بندی کے سرکلوں کا تصور شروع کیا جس میں کارکنوں کی بھی شامل کیا گیا اس وقت ایسے نو سرکل کام کر رہے ہیں۔

ایک اور میدان جس میں سی پی ڈبلیو ڈی نے خصوصیت کی ہے وہ ہے جائیدادوں کی لاگت آنکنے کا کام۔ سی پی ڈبلیو ڈی کے دو چیف انجینیروں کو مدد گار عملے کے ساتھ انکم ٹیکس کے محکمے سے وابستہ کیا گیا ہے۔ چار بڑے شہروں میں ۱۰ لاکھ روپے سے زائد کے غیر منقولہ جائیداد کے معاملوں کو دیکھنے کے لئے چار چیف انجینیر اپروپریٹ اتھارٹی کے رکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

سی پی ڈبلیو ڈی کے کارکنان نے ملک میں دیگر تعمیراتی اداروں کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اروناچل پردیش، منی پور، تری پورہ اور جزائر انڈومان اور نکوبار جیسی ریاستوں یا مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں تعمیرات عامہ کے محکموں کے وجود میں آنے سے پہلے یہاں کا کام سی پی ڈبلیو ڈی کے ہی سپرد تھا۔ ان ریاستوں یا علاقوں میں تعمیرات عامہ کے محکموں کا قیام سی پی ڈبلیو ڈی کے تکنیکی عملے کی مدد سے ہوا۔ محکمہ ڈاک و تار اور آل انڈیا ریڈیو کے تعمیرات کے محکمے بھی سی پی ڈبلیو ڈی کا حصہ تھے۔ سی پی ڈبلیو ڈی کے انجینیر صاحبان اب بھی بہت سے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں کام کر رہے ہیں اور ان کو اپنے محکمے کے مجموعی تجربوں سے فیضیاب کر رہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ تعمیرات عامہ کے اس مرکزی محکمے نے نہ صرف اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلکہ صحیح معنوں میں ملک کی تعمیر کی ہے۔ ●●

سلسلہ صفحہ ۲۹

تنگتواہی کارکنوں کو دی جانے والی اعزازی رقومات کی شرحوں کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا ہے اور ان میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ آخری جائزہ ۱۹۸۶ء میں لیا گیا تھا اور اسکے مطابق دیئے جانے والی مذکورہ اعزازی رقومات کی شرح میں یکم جولائی ۱۹۸۶ء سے لاگو ہیں۔

(پی آئی بی)

آنگنواڑی

بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات (ICDS) ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو شروع کی گئی تھیں اور اسے تمام دنیا میں بچوں کی بہبود کا سب سے بڑا پروگرام تسلیم کیا جاتا ہے۔ بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات (ICDS) میں ۶ برس سے کم عمر کے بچوں، حاملہ خواتین اور دایوں کو مختلف خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ جن میں اضافی غذائیت، ٹیکے لگانا، صحت کی جانچ اور حوالاتی خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس میں ۳ برس سے چھ برس تک کی عمر کے بچوں کو قبل اسکول کی غیر رسمی تعلیم اور ۱۵ برس سے ۴۵ برس تک کی خواتین کو صحت سے متعلق تعلیم بھی فراہم کی جاتی ہے۔

بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات کے تحت خدمات کی فراہمی کا مرکزی ادارہ بچوں کی دیکھ بھال کا مرکز "آنگنواڑی" ہے جو کہ گاؤں یا گندی بستی کے اندر ہی واقع ہوتی ہے ہر آنگنواڑی کو ایک آنگنواڑی کارکن اور ایک اسکی معاون کارکن چلاتی ہیں۔ دیہی اور شہری علاقوں میں ۱۰۰۰ لوگوں کی آبادی میں ایک آنگنواڑی ہوتی ہے اور قبائیلی و پہاڑی علاقوں میں ۷۰۰ کی آبادی میں ہوتی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء کو منظور شدہ آنگنواڑیوں کی تعداد ۲۲۱۳۶۹ تھی۔

آنگنواڑی کارکن: آنگنواڑی کارکن ایک رضا کار جز وقتی عارضی خاتون کارکن ہوتی ہے جس کا تعلق مقامی برادری یا آبادی سے ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر آٹھویں کلاس تک یا اس سے زیادہ پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر مذکورہ قابلیت کی کوئی مقامی خاتون نہیں ملتی تو ایسی صورت میں تعلیمی اہلیت میں رعایت دی جا سکتی ہے۔

آنگنواڑی کارکن بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات کے پروگرام میں سب سے نمایاں ہے چونکہ اس کا انتخاب مقامی آبادی یا فرقے میں سے ہوتا ہے تو اسکے مقامی آبادی سے قریبی اور مسلسل رابطے کی وجہ سے اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت کل ۲۲۱۳۶۸

آنگنواڑی کارکنان انجام دے رہا ہیں ۔

آنگنواڑی کارکن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے فروغ اور نشوونما پر نظر رکھے، ماؤوں کو عام بیماریوں کی روک تھام اور اس کے مقابلے کے لئے انہیں طریقے بتلائیے ۔ بچوں کی تمام نشوونما کے فروغ کے لئے والدین کو تعلیم دے۔ بیماریوں سے روک تھام کے لئے بچوں کے ٹیکے لگوانے کا اہتمام کرے ۔ وٹامن "اے" اور آئیرن اور فولک ایسڈ کی گولیاں تقسیم کرے معمولی چوٹوں اور بیماریوں کا علاج کرے۔ بچوں کے لئے اضافی تغذیہ بخش خوراک کا اہتمام کرے اور طبی خدمات کے لئے مریضوں کو ہسپتال بھیجے ۔

تربیت ۔ بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات (I C D S) کی اسکیم کے بنیادی سطح کے عہدیداروں (کارکنوں) یعنی آنگنواڑی کارکنوں کو تربیت دینے کا اہتمام ان تربیتی مراکز میں کیا جاتا ہے جنکی نشاندہی ریاستی حکومتوں / مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی انتظامیہ نے کی ہو اور جنھیں غیر سرکاری تنظیمیں اور سرکاری حکومتیں چلاتی ہوں ۔ملک میں ۲۹۵ تربیتی مراکز ہیں جن میں سے ۱۱۹ تربیتی مراکز کو بچوں کی بہبود کی بھارتی کونسل چلاتی تھے۔ دیگر تربیتی مراکز کو ریاستی حکومتیں چلاتی ہیں ۔آنگنواڑی کارکن کو دی جانے والی تربیت کی مدت تین ماہ ہے ۔ کارکنوں کو ابتدائی تربیت کے علاوہ وقتاً فوقتاً "ریفریشر تربیت" بھی دی جاتی رہتی ہے ۔ آنگنواڑی کارکنوں کو حسب ذیل اعزازی رقومات دی جاتی ہیں ۔

۱۔ دسویں پاس ... ۲۷۵ روپے ماہانہ

۲۔ دسویں پاس اور بطور آنگنواڑی کارکن پانچ سال کا تجربہ ... ۳۰۰ روپے ماہانہ

۳۔ دسویں پاس اور بطور آنگنواڑی کارکن دس برس کا تجربہ ... ۳۲۵ " "

۴۔ نیم خواندہ / ناخواندہ سمیت دسویں جماعت سے کم پڑھے ہوئے کارکن ... ۲۲۵ " "

۵۔ دسویں جماعت پاس نہ کئے ہوئے کارکن، جنھیں آنگنواڑی کارکن کا پانچ برس کا تجربہ ہو ... ۲۵۰ " "

۶۔ دسویں جماعت پاس نہ کئے ہوئے کارکن جنھیں بطور آنگنواڑی کارکن ۱۰ برس کا تجربہ ہو ... ۲۷۵ " "

باقی بر صفحہ

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ قسط (۱)

یورپ کے صوفی

ایک روز اتفاق سے میرا تعارف ایک ڈچ صوفی سے ہوگیا۔ اس کا ڈچ نام کنیگ تھا لیکن صوفی نام کرم دین تھا۔ بیوی کا صوفی نام کلثوم تھا اور بچوں کے نام نور دین شرف دین تھے۔ عام زندگی میں تو وہ اپنے اپنے ڈچ نام استعمال کرتے تھے۔ صوفی برادری کے جملہ ارکان باہمی میل جول میں بڑی بے تکلفی سے دوسرے نام استعمال کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا آدھا نام ڈچ تھا۔ آدھا دوسرا۔ مثلاً شوکت خان میسو لولش، رحمت بر کلیے بشیراں کینگ۔ ڈچ صوفیوں کے کئی جگہ اپنے مراکز ہیں جنہیں چیرچ (Sufi Kerk) کہا جاتا ہے چیرچ کا امتیازی نشان انسانی دل ہے جس کے دو طرف پر لگے ہوئے ہیں۔ دل کے اندر چاند تارا بنا ہوتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں ہالینڈ میں سفیر بن کر گیا تو وہاں کے وزیر خزانہ پروفیسر Witteveen بھی صوفی تحریک سے وابستہ تھے بعدازاں وہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ International Monetary Fund کے سربراہ بھی رہے۔

یورپ میں اس سلسلہ کے بانی صوفی عنایت خاں تھے۔

صوفی عنایت خاں ۱۸۸۲ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رحمت خاں پنجاب کے رہنے والے تھے۔ یہ موسیقاروں کا خاندان تھا اور ان کے اجداد میں شیخ جما شاہ ایک صاحب باطن بزرگ بھی گذرے تھے۔ رحمت خاں خود بھی اچھے موسیقار تھے خاص طور پر دھرپد میں انہیں استاد مانا جاتا تھا۔

ایک بار اپنی سیر و سیاحت کے دوران استاد رحمت خاں اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔ سماع کی محفل برپا تھی استاد رحمت خاں نے بھی بڑھ چڑھ کر اپنا کمال دکھایا اس کے بعد وہ مزار کے قریب کھڑے ہو کر مراقب ہو گئے رفتہ رفتہ ان کا بدن سن ہو گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا دامان پر غنودگی چھا گئی۔ ساتھ ہی انہیں صاحب مزار کی زیارت ہوئی جن کا چہرہ پھولوں کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ حضرت خواجہ نے دونوں ہاتھوں سے پھول ہٹا کر اپنا چہرہ بے نقاب کیا اور اشارے سے رحمت خاں کو ایک راستے کا نشان بتایا جس پر چلتے چلتے وہ آخر بڑودہ پہنچ گئے۔

ان دنوں بڑودہ میں استاد مولا بخش کا طوطی بول رہا تھا ان کا پہلا نام چولے گھیس خاں تھا لیکن کسی مجذوب کی ہدایت پر انہوں نے یہ نام بدل کر اپنا نام مولا بخش رکھ لیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گائیکی گھرانے کے سربراہ تھے۔ بڑودہ کے مہاراجہ سایاجی راؤ گائکواڑ پر ان کا بڑا اثر تھا۔ مہاراجہ خود بھی موسیقی کے بڑے رسیا تھے اور استاد مولا بخش کی سرپرستی میں انہوں نے موسیقی کی اکیڈمی گیان شالہ کے نام سے کھول رکھی تھی۔ اس میں ہندوستانی موسیقی کے علاوہ مغربی موسیقی کے شعبے بھی موجود تھے۔

استاد مولا بخش کی بیوی ایک مسلمان شہزادی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز نے مسلمانوں پر مظالم کی قیامت ڈھائی تو دو وفادار ملازم اس شہزادی کو خفیہ طور پر بڑودہ لے آئے۔ مولا بخش نے اسے اپنے پاس پناہ دی اور بعد ازاں اس کے ساتھ شادی کر لی دونوں ملازم بھی تاحیات اسی گھر میں رہے لیکن شہزادی کے حسب نسب کے متعلق کبھی کوئی بات نہ ہوتی تھی ایک روایت کے مطابق اس کا رشتہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے ملتا تھا۔

جب استاد رحمت خاں بڑودہ پہنچے تو استاد مولا بخش نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بڑی بیٹی کو ان کے نکاح میں دے دی۔ کچھ عرصہ بعد یہ خاتون وفات پا گئی تو استاد مولا بخش نے اپنی دوسری بیٹی کو رحمت خاں سے بیاہ دیا۔ صوفی عنایت خاں اسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

عنایت خاں نے گیان شالہ اکیڈمی میں راگ ودیا پر عبور حاصل کیا۔ مہاراجہ گائیکواڑ کی خواہش تھی کہ وہ مستقل طور پر ان کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو جائیں لیکن عنایت خاں کے دل میں جہاں گردی کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے دور دراز کے سفر کرنے لگے۔

سب سے پہلے وہ نیپال گئے۔ کھٹمنڈو میں ان کی ملاقات ایک نیپالی بزرگ سے ہوئی جو وہاں کے راجاؤں مہاراجاؤں کی تربیت پر لگے ہوئے تھے۔ اس بزرگ نے عنایت خاں کا تعارف ایک ہندو یوگی سے کرایا، جو برسہا برس سے آنکھیں بند کئے پہاڑ کی کھوہ میں سمادھی لگائے بیٹھا تھا۔ عنایت خاں صبح و شام اس غار میں جاتے اور یوگی کے سامنے بیٹھ کر دیر دیر تک وینا بجاتے، ایک روز یوگی نے خوش ہو کر آنکھیں کھول دیں اور عنایت خاں کو "ونایک راجہ" کا خطاب عطا کیا۔

نیپال سے عنایت خاں نے برما اور سیلون کا سفر کیا اور پھر گجرات، کاٹھیاواڑ، میسور، مدراس، مالابار کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں انھوں نے مدرسہ کالج پریزیڈنسی کالج اور یونیورسٹیوں میں کئی لیکچر دیئے جن میں سے کچھ کی صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی کی۔ کلکتہ سے آپ ڈھاکہ آئے۔ جہاں نواب ڈھاکہ نے احسن منزل میں محفلیں منعقد کر کے ان کا تعارف سلہٹ اور آسام کے مشاہیر سے کرایا۔ مہاراجہ دیناج پور عنایت خاں کی موسیقی پر خاص طور سے عاشق تھے اور اس فن میں انہیں اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔

اس دوران میں عنایت خاں حیدرآباد دکن پہنچے اور میر محبوب علی خاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ نظام تصوف اور موسیقی کے دلدادہ تھے اور رفتہ رفتہ دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ دربار عام کے علاوہ عنایت خاں کو نظام کی خاص مجلسوں اور نجی محفلوں میں بھی عمل دخل حاصل تھا۔ میر محبوب علی کے اصرار پر عنایت خاں اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ حیدرآباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں لیکن کاتبِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

حیدرآباد میں عنایت علی خاں کی ملاقات چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ سید محمد ابو ہاشم مدنی سے ہوئی۔ سید صاحب نے عنایت خاں کو راہ سلوک کے پیچ و خم سے آشنا کیا اس راستے میں مجاہدے کے ریگزار بھی تھے، اور مشاہدے کے گل و گلزار بھی۔ سفر کی دشوار گزار گھاٹیاں بھی تھیں اور منزل مقصود کے سہانے سنگ میل بھی، عنایت خاں نے سید ابو ہاشم مدنی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مرشد کی راہ نمائی میں وہ اپنے گلے کا نور برساتے وینا بجاتے اس نئے راستے پر چلتے گئے حتیٰ کہ ان کے اپنے الفاظ میں "ایک ایسی منزل آ گئی جہاں پر میرا جسم وینا کا ساز بن گیا۔ میری روح وینا کا تار بن گئی اور میری زندگی ایک سرمدی راگ بن گئی۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے اپنے فن کا سارا

[illegible] ازلی اور ابدی موسیقار کے سپرد کر دیا جو کائنات کے سرگم پر ہر لحظہ نغمہ گانا میں اڑانے میں معروف ہے"

جب عنایت خان کی موسیقی میں معرفت کا رنگ اچھی طرح رچ گیا، تو ان کے مرشد سید ابو ہاشم مدنی نے حکم دیا کہ اب وہ مغربی ممالک میں چلے جائیں اور اپنے فن کے ذریعہ لاہوتیت کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔

عنایت خان نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کیا [illegible] ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو امریکہ روانہ ہوئے ان کے ایک حقیقی اور ایک چچا زاد بھائی ساتھ تھے۔ اس وقت ان تینوں کی عمر تیس تیس سال سے بھی کم تھی۔

نیویارک پہنچ کر عنایت خان نے اپنا پہلا لیکچر کولمبیا یونیورسٹی میں دیا۔ اس کے بعد وہ بہت سے دوسرے شہروں اور امریکی ریاستوں میں اپنی محفلیں منعقد کرتے رہے ان کے مداحوں میں سانتا روزا کے فن باغبانی کے ماہر لوتھر بربینک بھی شامل تھے وہ ہر پودے کو کانٹوں کے بغیر پیدا کرنے کا تجربہ کر چکے تھے۔ یہ خیال حیات عنایت خان کا نصب العین تھا۔ اور یہ شعار نباتات لوتھر بربینک کا۔ یہی ان کی دوستی کا قدر مشترک بن گئی۔

امریکہ میں دو برس گزارنے کے بعد عنایت خان اپنے بھائیوں سمیت انگلستان واپس آ گئے یہاں سے وہ روس گئے۔ ماسکو میں ٹالسٹائی کا بیٹا کاؤنٹ سرجے ٹالسٹائی عنایت خان کا مداح بن گیا۔ اس نے انہیں بہت سی روسی موسیقاروں سے متعارف کرایا اور ماسکو کے علاوہ دوسرے کئی شہروں میں ان کے فن کے مظاہرے منعقد کرانے میں مدد دی۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی کی کوشش سے عنایت خان کی کتاب "A Sufi Message of Spiritual liberty" کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر ماسکو میں شائع ہوا۔

ایک روایت کے مطابق صوفی عنایت خان کی ملاقات زار روس سے بھی ہوئی تھی اس ملاقات کا بندوبست راسپوٹین نے انتہائی خفیہ طور پر کرایا تھا۔ ملاقات کے دوران راسپوٹین کے علاوہ اور کوئی شخص وہاں پر موجود نہ تھا۔ اس ملاقات کی پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں

ماسکو میں عنایت خان کا ایک اور مداح بے بیگ تھا بے بیگ تاتاریوں کا سردار تھا اور امیر بخارا کی جانب سے زار روس کے دربار میں سفیر کے عہدے پر مامور تھا بے بیگ

نے بہت کوشش کی کہ عنایت خاں ہندوستان کا دورہ بھی کریں لیکن ان ہی دنوں پہلی جنگ عظیم سر پر آ گئی اور عنایت خاں انگلستان واپس لوٹ آئے۔

جنگ کے پانچ سال عنایت خاں نے انگلستان میں بسر کئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تصوف کی تعلیم پر بنیاد ڈالی اور لندن میں ایک اشاعتی ادارہ "صوفی پبلشنگ سوسائٹی" کے نام سے قائم کی۔

جنگ کے بعد انہوں نے یورپ کا چپہ چپہ کا دورہ کیا ہر جگہ مریدوں کی خاصی تعداد ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے صوفی تنظیم میں داخل ہونے لگی۔ اب وہ معتقد عنایت خاں کی جگہ مرشد عنایت خاں کہلانے لگے اور چار پانچ سال کے اندر اندر یورپ کے بہت سے ملکوں میں صوفی تحریک کے سنٹر قائم ہو گئے۔ خاص طور پر ہالینڈ، سوئیٹزرلینڈ، فرانس، جرمنی، اٹلی، آسٹریلیا، سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور انگلستان کے بہت سے شہروں میں ان کی شاخیں بڑی سرگرمی سے چلنے لگیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں بھی اس کے کئی سنٹر قائم ہو گئے۔

اپنی تحریک کو یوں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے دیکھ کر عنایت خاں جینوا میں اپنی تحریک کا بین الاقوامی مرکز بنا کر ...ne International Headquarters of Sufi movement کے نام سے قائم کر دیا اس کی ایک برانچ پیرس میں کھولی جہاں اب انہوں نے اپنا مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں پیران کی رہائش گاہ کا نام "فضل منزل" تھا بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر کی دوسری برانچ ہیگ کے قریب (Katwijk) کے مقام پر تھی اس کا نام "مراد حاصل" تھا جہاں پر اب "مراد حاصل فونڈیشن" قائم ہے۔

۱۹۲۶ء میں عنایت خاں کو ہندوستان چھوڑے سولہ برس ہو چکے تھے یورپ میں ان کی صوفی تحریک اپنے نکتہ عروج پر تھی۔ کہ یکایک ان کے دل میں خاک وطن کی کشش نے زور مارا اور نومبر کے مہینے میں وہ ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ان کی یورپین سیکریٹری قسمت اسٹام ان کے ہمراہ تھی۔ پیرس میں ان کے حلقہ بگوشوں کی کثیر تعداد نے ان کو الوداع کہا اور دوسرے شہروں میں ان کے بہت سے اور مرید اپنے مرشد کے واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

ہندوستان پہنچ کر صوفی عنایت خاں نے دلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے

اور بنارس، آگرہ، جے پور اور بڑودہ کا دورہ بھی کیا۔ انہوں نے لوگوں کو تصوف [illegible] سے [illegible] سے آگاہ کیا۔ لیکن یہاں پر ان کے مسلک کو کسی قسم کی قبولیت حاصل [illegible]۔ یہاں پر ان کو فقط ایک یا دو مرید نصیب ہوئے۔ ان میں سے ایک مسز شاستری تھیں جو ایک ہندو ڈاکٹر کی امریکن بیوی تھی اپنی اس ناکامی سے مایوس ہو کر انہوں نے یورپ واپس جانے کا پروگرام بنایا۔ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اجمیر شریف گئے دسمبر کی سردی کے ایام تھے۔ صوفی عنایت خاں کئی رات متواتر محفل سماع میں شریک ہوتے رہے۔ اس کڑاکے کی سردی میں ساری ساری رات ٹھنڈے فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے انہیں نمونیہ ہوگیا۔ دلی واپس آکر وہ کئی ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان نے بھی ان کے علاج معالجہ میں حصہ لیا۔ ۲/ فروری ۱۹۲۷ء کی رات صوفی عنایت خاں بے ہوش ہو گئے۔ مس قسمت اسلام جو ان کے ساتھ یورپ سے آئی تھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کا مرشد قریب المرگ ہے۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ مرشد مراقبہ میں مستغرق ہو کر سمادھی میں چلا گیا ہوا ہے۔ وہ کئی گھنٹے مرشد کی چارپائی کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھی رہی۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ پر دو ڈاکٹروں اور مسز شاستری نے بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا کہ مرشد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ صوفی عنایت خاں کو خواجہ نظام الدینؒ کی درگاہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔

صوفی عنایت خاں کی وفات کے بعد ان کے سلسلہ کو ان کے بھائیوں محبوب خاں، محمد علی خاں اور مشرف خاں نے چلایا۔ عنایت خاں کی بیوی ایک امریکن خاتون امینہ بیگم تھیں ان کے بطن سے کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں لیکن صوفی تحریک کی جانشینی ان میں سے نے نہ سنبھالی ان کی ایک بیٹی نے البتہ ایک دوسرے میدان میں بڑا نام پیدا کیا اس کا نام نورالنساء عنایت خاں عرف "بابلی" تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمن افواج نے فرانس پر قبضہ کیا تو نورالنساء پیرس میں مقیم تھی۔ اس نے "میڈیلین" کا نام اختیار کر کے لندن میں اتحادی فوجوں کے ہیڈکوارٹر کو خفیہ پیغامات بھیجنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک وائرلیس سیٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ کام اس نے بڑی جانفشانی اور دلیری سے سرانجام دیا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا وقت بھی آیا جب لندن میں اتحادی ملٹری ہیڈکوارٹر

کے ساتھ واحد بیٹی نور النساء عنایت خاں عرف "میڈلین" کی خدمات کے ذریعہ کام تھا لیکن گرفتار ہو گئی غدار نے کر اس کا راز فاش کر دیا اور جرمن فوجیوں نے اسے گولی سے اڑا دیا، ہٹلر کی شکست کے بعد جب جنرل ڈیگال نے فرانس کی حکومت سنبھالی تو نور النساء عنایت خاں کو بعد از موت فرانس اور برطانیہ نے بہادری کے نہایت اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ ان اعزازات کی نقول اس باب کے آخر میں منسلک ہیں۔

عنایت خاں کے مرشد سید محمد ابو ہاشم مدنی نے انہیں اسلامی تصوف کے رموز سے آشنا کیا تھا اور رشد و ہدایت کے اسی طریق کو مغربی ممالک میں پھیلانے کی تلقین کی تھی لیکن امریکہ اور یورپ پہنچ کر انہوں نے وہاں کے ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ وہاں کے لوگوں کو اس سلسلہ میں داخل کرنے کی بجائے انہوں نے اپنے سلسلہ کو ہی مغربی مزاج کے سانچے میں ڈھال لیا۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ کرنے کی بجائے ان کا مسلک تھیوسوفیکل سوسائٹی کی طرز پر مختلف مذاہب کا ایک مجموعہ اخلاقیات سامنے کر دیا گیا۔ اس مسلک میں اسلام سمیت دنیا کے سب مذاہب یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ اسی طرح "صوفی" یا "مرید" بننے کے لئے بھی خاص مذہبی عقیدے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور زرتشتیوں کے علاوہ ہندو، بت پرست، مشرک اور ملحد بھی یکساں طور پر اس سلسلہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس مسلک میں کتاب فطرت انسان کا واحد مقدس صحیفہ ہے اور عالمگیر اخوت انسان کا واحد مشترکہ مذہب ہے۔ عبادت کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ یقین سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اس تحریک میں "عالمگیر عبادت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

"عالمگیر عبادت" میں حصہ لینے والے ایک بند کمرے میں قطار در قطار بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک کشادہ میز کے عین وسط میں ایک بڑی موم بتی روشن کی جاتی ہے جو علامتی طور پر خدائے واحد کا نشان ہوتی ہے جو ساری روشنی اور علم کا منبع و ماوی ہے۔ اس موم بتی سے نیچے کی سطح پر چھ چھوٹی موم بتیوں کی قطار ہوتی ہے جو علی الترتیب ہندومت، بدھ مت، زرتشتیت، یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہر موم بتی کے سامنے اس مذہب کا صحیفہ بھی رکھا جاتا ہے عالمگیر عبادت کے اس مجمع کو

کو (Church For Allah) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے اجتماعی عبادت کے علاوہ مریدوں کا مرشد کے ساتھ اپنا اپنا ذاتی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے جس میں انہیں الگ الگ ذکر و اذکار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے جو مرید ترقی کرتے جاتے ہیں ان کو حسب مراتب صاحبزادہ، صاحبزادی، شہزادہ، شہزادی، سراج، چراغ وغیرہ کے خطاب دیے جاتے ہیں۔ خاص خاص اجازت یافتہ مرید وقتاً فوقتاً ذکر کا حلقہ بھی قائم کرتے جاتے ہیں یہ حلقے بھی انتہائی خفیہ طور پر قائم کئے جاتے ہیں۔

اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ صرف اتنا تعلق ہے کہ اس میں بہت سی عربی و فارسی کے اصطلاحات بڑی رواج سے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ذکر، اسم عاظم، پیر و مرشد، شیخ المشائخ، بیعت، مراد حاصل، دربار، ہجرت، ولادت، دعا، تبرک، رحمت، فضل وغیرہ۔ اس ظاہری تعلق کے علاوہ اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ اسلام میں طریقت کے لئے لازم ہے کہ وہ شریعت کی پابند ہو اس لحاظ سے عنایت خان کے مشن کو تصوف کا نام دینا ہی اس اصلاح کا غلط استعمال ہے۔

ہالینڈ میں اس تحریک کے آخری مسلمان سربراہ صوفی عنایت خان کے چھوٹے بھائی مشرف مولا میاں خان تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہیگ میں متعین تھا تو مشرف خان صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی بیگم ایک ڈچ خاتون تھیں جن کو "صوفی" تحریک کی طرف سے شہزادی کا خطاب ملا ہوا تھا وہ اپنے میاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں اور ان کی زندگی ہی میں تحریک پر اپنا تسلط جما رہی تھیں ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک روز صوفی مشرف خان نے بڑے دکھ سے کہا کہ ان کی وفات کے بعد یہ تحریک مکمل طور پر یورپین لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کے ساتھ اس کا جو تھوڑا بہت اصلاحی سہارا بچا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ صوفی مشرف خان کی وفات کو چند برس گذر چکے ہیں اور جس کا خدشہ انہوں نے ظاہر کیا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ لا رہا ہے۔

صوفی حضرت جلالیان خان بڑے سادہ طبیعت مرنجاں مرنج انسان تھے۔ وہ فارسی زبان دانی سے بولتے تھے کسی قدر انگریزی سے بھی شناسا تھے اردو بول تو لیتے تھے لیکن صحیح تلفظ سے پیش آتی تھی۔ ایک روز میں ان کے ہاں بیٹھا تھا، تو انہوں نے کچھ منظوم کلام سنانے کی پیشکش کی۔ پیانو پر پہلے انہوں نے غالب کے غزل کے کچھ اشعار گائے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کے بعد انہوں نے اقبال کی یہ غزل سنائی

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس غزل کا ایک شعر ہے:

کھینچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

اس شعر کو گاتے وقت وہ "موسیٰ" کو لگاتار "موسی" ہی پڑھتے گئے۔ ان دونوں غزلوں کو وہ "عارفانہ کلام" غالباً اسی وجہ سے سمجھتے تھے کہ ایک میں ابن مریم دوسرے میں موسیٰ کا نام آتا تھا۔

ڈچ مرید صوفی مشرف خان کو "حضرت پیر و مرشد" کے القاب سے مخاطب کرتے تھے اور خود بھی اپنے آپ کو مرشد مشرف خان کے نام سے متعارف کراتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی تصنیف [pages in the life of a sufi] مجھے تحفتہً دی۔ اسے انہوں نے ایک انگریز خاتون مس مارگرٹ سکنر کے تعاون سے لکھا تھا۔ میری درخواست پر انہوں نے اس پر انگریزی میں جو آٹوگراف دیا وہ یہ تھا [murshid musharaf khan]

ان کے مریدوں میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں وہ خاص طور پر ہر دلعزیز تھے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ کسی مرید سے کسی بات پر کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ ان کا سر ہمیشہ اثبات میں ہلتا تھا۔ میں نے کبھی ان کا سر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانب ہلتے نہیں دیکھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہالینڈ کے وزیر خزانہ [illegible] Willem پر ان کا بڑا اثر تھا اور وہ بہت سے ذاتی اور سیاسی معاملات میں مشاورہ کرنے صوفی مشرف خان کے پاس آیا کرتے تھے۔

قاضی محمد فضل الدین
متعلم بی کام سال اول انوارالعلوم ڈگری کالج

ہمارا سفر کشمیر

یوں تو ہم نے کئی سفر طے کئے ہیں۔ لیکن کشمیر کا سفر ہماری زندگی کا ایک یادگار سفر بن کر رہ گیا ابھی کچھ عرصہ قبل یعنی مئی میں ہمیں کشمیر دیکھنے کا موقع ملا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ہماری خواہش تھی کہ کہیں بڑے ۔۔۔ انہوں لیکن اس وقت ہمارے حافظہ میں کشمیر کا تصور بھی نہیں تھا لیکن قسمت میں تو کشمیر جانا لکھا تھا سو ہو کر رہا ۔ اور ہم کشمیر کیلئے روانہ ہو گئے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا کشمیر دیکھنے کی دلی خواہش تھی بس اکثر کشمیر کو تصویروں میں یا پھر فلموں میں ہی دیکھا کرتے تھے۔ اب حقیقت میں کشمیر دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ بس دل و دماغ میں وہیں کے خیالات گھوم رہے تھے۔

جانے سے پہلے ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہاں پر خوب برف سے کھیلیں گے اور بس سیب کھا کر ہی اپنا پیٹ بھریں گے۔ اسطرح کے لاکھوں ارمان اپنے دل میں لئے ساری تیاری مکمل کر چکے تھے۔ کچھ دوستوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ساتھ گرم کپڑے لیکر جائیں۔ وہاں پر کڑاکے کی سردی ہوتی ہے۔ ہم نے احتیاطی طور پر اپنا سارا بیاگ گرم کپڑوں سے بھر لیا۔ اور جیسے تیسے گھر سے سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پہونچے تو پتہ چلا کہ ٹرین چھ گھنٹے لیٹ ہے۔ اب مجبوراً ٹرین کا وہیں پر انتظار کرنا پڑا۔ پھر سکندرآباد سے دلی پہونچے اور دلی سے دوسری ٹرین کے ذریعہ جموں کیلئے روانہ ہو گئے۔

تیس دن کا سفر مکمل کرنے کے بعد جموں میں ایک دن ۔۔۔ پڑا جہاں پر گرمی بہت زیادہ تھی۔ جموں سے سری نگر بس کا سفر بارہ گھنٹے یعنی ایک دن کا راستہ ہے۔ ۔۔۔ رے ہی دن ہم جموں سے سرینگر کیلئے روانہ ہو گئے۔ سرینگر پہونچنے تک کافی رات ہو چکی تھی۔ وہاں پہونچنے کے بعد ہوٹل "ہوٹل کنال" میں قیام کا اتفاق ہوا جسکے اطراف پانی ہی پانی ہے۔ اس ہوٹل کو پانی کے درمیان تعمیر کیا گیا اور اس ہوٹل تک پہونچنے کیلئے "شکارا" یعنی کشتی کی مدد لینی پڑتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی ہم جب ہوٹل کے باہر دیکھنے لگے تو ہمیں

تو ہمیں قدرت کا بڑا ہی خوبصورت نظارہ دیکھنے کو ملا۔ دو اونچے پہاڑ جو درختوں اور ہری گھانس سے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی نے اس پر ہرا رنگ پینٹ کردیا ہو اور جب ان دونوں پہاڑوں کے بیچ سے سورج ہلکا سا نمودار ہو رہا تھا تو بڑا ہی خوبصورت نظارہ تھا۔

ان پہاڑوں سے ہم نے نظریں ہٹا کر برف کو دیکھنا چاہا لیکن برف ہمیں کہیں نظر نہیں آئی جب ہم نے یہاں کے مقامی لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ برف ہر مقام پر نہیں ہوتی بلکہ وہ کچھ خاص مقامات پر ہی ہوتی ہے اور صرف اکٹوبر سے ڈسمبر کے مہینے میں ہی برف گرتی ہے۔ یہ سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا خیر دوسرے دن ہم کشمیر کے "گارڈنس" دیکھنے گئے جو واقعی قدرت کی ایک مثال ہے۔ ان باغوں میں ہر طرح کے گلاب لگائے گئے۔ میری نظر میں کشمیر کی شان گلاب ہے۔ کشمیر کے ہر گھر میں آپ کو گلاب دیکھنے کو ملیں گے۔

اب گلاب کے بعد سیبوں کا ذکر ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم حیدرآباد سے ہی سوچ کر گئے تھے کہ کشمیر میں سیب ہی ہماری غذا رہے گی، سیب سے پیٹ بھرنا یا صرف سیب چکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔ کشمیر میں تو ہم صرف سیب دیکھنے کیلئے ترس گئے۔ کشمیر کا چپّا چپّا چھان مارا لیکن کہیں پر بھی سیب نظر نہیں آیا۔ جب ہم نے وہاں کے مقامی لوگوں سے سیب کے بارے میں دریافت کیا تو ان سے پتہ چلا کہ یہ موسم سیب کا نہیں ہے کشمیر میں تو سیب صرف ستمبر سے ڈسمبر تک ہوتے ہیں۔

کشمیر میں یہ ہماری دوسری ناامیدی تھی اس بات کا ہمیں بے حد افسوس ہوا اور ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ کاش اکٹوبر میں آتے تو بہت فائدے میں رہتے۔ خیر اب جب چلے ہی گئے تھے تو پھر کیا پچھتانا۔ سرینگر گھومنے کے بعد ایک دن کیلئے ہم "سون مرگ" روانہ ہوگئے یہاں پر سال کے بارہ مہینے برف رہتی ہے۔ وہاں پر برف کو دیکھنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہمارا کشمیر آنے کا مقصد پورا ہوگیا۔ سارا دن برف میں کھیلنے کے بعد پھر سرینگر واپس ہوئے اور ایک دن آرام کرنے کے بعد نماز جمعہ مسجد "حضرت بل" میں ادا کی جو کشمیر کی تاریخی اور سب سے بڑی مسجد ہے جہاں پر ہر جمعہ کو ۲ لاکھ افراد نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ اس مسجد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پیغمبر اسلام حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی کا موئے مبارک ہے جسے خاص موقعوں پر دیدار کیلئے نکالا جاتا ہے۔ اتنے بڑے اجتماع میں نماز جمعہ ادا کرتے وقت ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کوئی نماز عید

یاکر رہے ہوں ۔ مسجد "حضرت بل" کی ایک اور خصوصیت یہ ہیکہ اس مسجد میں آدمیوں کے پیچھے
ورتیں بھی پنج وقتہ نماز با جماعت پڑھتی ہیں ۔ اس کے دوسرے روز ہم لوگ سرینگر سے پہل گام
یلئے روانہ ہوئے ۔ پہل گام کشمیر کا سب سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے ۔ قدرت کے دلچسپ نظارے
یں یہیں دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ اور کشمیر میں پہل گام ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر کئی مرتبہ مختلف
لموں کی شوٹنگیں ہو چکی ہیں ۔ یہیں پر وادی کشمیر بھی ہے جس کا ایک ایک نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا
ہے ۔ ان خوبصورت نظاروں کی خاطر ہم بھی پہل گام میں دو دن ٹھیر گئے اور پھر واپس سرینگر چلے آئے
ے دن آرام کرنے کے بعد گل مرگ گئے وہ بھی کشمیر کی بہت اچھی جگہ ہے وہاں پر بھی ایک دن قیام
رنے کے بعد واپس سرینگر چلے آئے ۔ سرینگر میں دو دن خریداری وغیرہ کی اور تیسرے دن ہمارے
یک عزیز کے ہاں دعوت بھی اڑائی ۔

اب ہم یہاں کے مقامی لوگوں کے بارے میں بتاتے ہیں ۔ کشمیر میں لوگ کافی مہمان نواز ہوتے
یں اور کسی دوسری ریاست یا کسی دوسرے ملک کے لوگوں سے تو بہت اچھی طرح سے پیش آتے ہیں ۔
رینگر میں مختصر سے قیام کے دوران ہماری بھی بہت سے لوگوں سے پہچان ہوگئی تھی ۔ ایک صاحب
اص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ جن کا نام محسن ہے کشمیر کے اچھے خاندان شہر کے واقف شخص ہیں ۔ ان
ے ملنے کے بعد ہم نے سوچا کہ یہ ہمارے بہت کام آئیں گے ۔ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب
اروق عبداللہ سے ملنے کی بھی ہماری دلی خواہش تھی جب ہم نے ان سے ملنے کی خواہش اپنے
زیز محسن صاحب سے کی تو انہوں نے کہا "یہ تو میرے لئے بہت چھوٹی بات ہے" وزیر اعلیٰ سے
یری اچھی خاصی پہچان ہے "۔ اور کہا کہ میں تمہیں ان سے ملاؤنگا" اور ہم کو کل صبح ملنے کو کہا ۔ ہم
ہت خوش ہو گئے اور صبح سویرے ہی محسن صاحب کے گھر پہونچے لیکن وہاں پہونچنے کے بعد جناب محسن
نے ہمیں خبر دی کہ وزیر اعلیٰ تو کل شام کو ہی صدر ہند جناب آر ۔ وینکٹ رامن کے استقبال کیلئے سرینگر
سے جموں کیلئے روانہ ہو گئے ۔ بس اب کیا کرتے دوسرے دن ہی ہم سرینگر سے واپس ہونے والے تھے ۔
کشمیر میں یہ ہماری مسلسل تیسری ناامیدی تھی ۔

خیر اب دوسرے دن واپس حیدرآباد کیلئے روانہ ہونا تھا ۔ دل میں ایک طرح کی خوشی محسوس
ہو رہی تھی کہ اب وطن دکن واپس ہو رہے ہیں ۔ اب کشمیر سے جی بھر گیا تھا اور حیدرآباد کی یاد زور دے

سے گذر رہی تھی۔ اب ہمارا کشمیر کا سارا دورہ مکمل ہو چکا تھا ہم نے یہاں پر ایک بات نوٹ کی کہ یہاں پر کافی غریبی ہے اور تعلیم بھی عام نہیں ہے۔ حکومتِ ہند غریبی دور کرنے اور تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سفرِ کشمیر سے ہمیں یہ بھی نصیحت معلوم ہوتی ہے کہ سفر میں کم سے کم سامان ساتھ رکھے جو ہم نے نہیں کیا تھا اور سارا سفر پچھتانا پڑا۔

دوسرے دن صبح ہم سرینگر سے جموں کیلئے روانہ ہوئے اور جموں سے دلّی آ گئے پھر دلّی سے دوسری ٹرین کے ذریعہ حیدرآباد کیلئے روانہ ہوئے ٹرین چار گھنٹے لیٹ تھی خیر جیسے تیسے دوسرے دن شام سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پہونچے اور اسٹیشن سے باہر نکلے تو ہرے رنگ کی بسیں اور پیلے رنگ کے آٹو رکشا دکھائی دیئے۔ جنھیں دیکھ کر طبیعت میں ایک طرح کی خوشگواری پیدا ہوگی۔ وہاں سے گھر ہو پہنچے جہاں پر ہمارا سفرِ کشمیر اختتام کو پہونچا۔

چناجورگرم

رؤف خیر

اب وہ دلّی ہے نہ لاہور چنا جورگرم
خاک اڑتی ہے ہر اک اور چنا جورگرم

جنگلوں میں بھی تو بارود کی بو رہتی ہے
رقص کرتے نہیں اب مور چنا جورگرم

خون میں جس کو نہلانے کا ہنر آتا تھا
ہے پسینے میں شرابور چنا جورگرم

پھر نکالے ہوئے بت آ کے سرفراز ہوئے
پھر اٹھا شور چنا جور چنا جورگرم

ہے سرِ ظلِ الٰہی پہ کوصل کا سایہ
ہو گئے ڈھیر سبھی ڈھور چنا جورگرم

ظلمت کی کوکھ سے سورج کو جنم لینا تھا
ہم نے دیکھی ہی [illegible] چنا جورگرم

عزتیں شہر میں نیلام ہوئی جاتی ہیں
عشق بے چارہ [illegible] چنا جورگرم

اک لٹکتی ہوئی تلوار کے نیچے سر ہے
ٹوٹ جائے نہ کہیں ڈور چنا جورگرم

دم لیا تھا نہ ابھی خیر کے گھر والوں نے
پھر گھٹا چھائی ہے گھنگھور چنا جورگرم

ہجرتیں راس بھلا سب کو کہاں آتی ہیں
وہ بھی ہیں زندہ و درگور چنا جورگرم

دیر لگتی ہے بہت ٹنگ بدلتے رت کو
کوتوال آج ہے ہر چور چنا جورگرم

خیر صاحب یہ ترا جوش برا ہوتا ہے
آپ بھی ہوگئے منہ زور چنا جورگرم

غزلیں

ثریا صولت حسین

جیتے ہیں ہم فقط تری مسکان کیلئے
ورنہ دھرا ہے کیا یہاں انسان کیلئے

کچھ اس قدر شکستہ ہے اب کشتیٔ حیات
جی چاہتا ہے پھینک دیں طوفان کیلئے

تارے سلگ کے بجھ گئے پر چاند نہ ملا
آنکھیں ترس کے سو گئیں مہمان کیلئے

وہ ولولے رہے نہ کوئی آرزو رہی
پھر چاہتیں نہ رہ گئی مری، پہچان کیلئے

کتنے فریب کھائے ثریا خلوص میں
کیوں دل مچل گیا اسی ارمان کیلئے

بدیع الزماں خاور

اک زمیں اندر بھی تھی، اک آسماں اندر بھی تھا
جھانک کر دیکھا تو باہر کا جہاں اندر بھی تھا

دیکھتی اس کو کہ اس کی جستجو کرتی نظر؟
اس کا جلوہ عام تھا لیکن نہاں اندر بھی تھا

میں ہی باہر کے مناظر میں الجھ کر رہ گیا
ورنہ چشم شوق کے قابل سماں اندر بھی تھا

جب بہار آئی تھی گلشن میں کھلے تھے زخم بھی
ڈھونڈتا کوئی تو موسم کا نشاں اندر بھی تھا

آگ کے بجھنے کی خبر سے بہت خوش تھے مگر
گھر میں آکر ہم نے دیکھا تو دھواں اندر بھی تھا

اب کہاں خاور سکوں ہو کے ڈھونڈتے پھرتے کہ دل
وہ بھی کیا رت تھی کہ اک سیل رواں اندر بھی تھا

انگریزی نظم | اردو ترجمہ

غازی القوصیبی
(مملکت سعودیہ عربیہ)

قاضی سلیم
(نیا عثمان پورہ اسٹیشن روڈ، اورنگ آباد)

RAIN

it was pouring
rain like the Copious tears
of Some legendary woman
grieving a lost love
rain was knocking at the window
the bed was silently redolent
of the memory of the night
Tentatively you said
But Love persists
after you go,
it stays ...... forever
Just one wild night.
we part and
that is all
Hysterical rain

÷

بھری برسات

پانی انڈیلا جارہا ہے
بے حساب بادلوں سے
یا کوئی برہن
بھولی بسری داستانوں میں
پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے
اپنے کھوئے پیار پر
وہی پانی مرے دریچے پر
آج دستک دے رہا ہے
رات بھر گلیوں میں جو روتا رہا ہے
رات کی بھرپور یادوں سے
مرا بستر بھی بوجھل ہے۔
سرسری انداز میں تم نے کہا تھا
پیار ہی زندہ رہے گا
تم چلے جاؤ گے لیکن
ہماری یہ محبت جاودانی ہے۔
یاد ہے ــــ بھیگی ہوئی وہ رات
ــــ وحشی رات جس میں
بچھڑے تھے ہم اک دوسرے سے
اور پھر کیسے
سبھی کچھ ختم تھا
بتاؤ پیار کا وہ انت تھا؟
ہٹاؤ پاگل ہے
بھری برسات پاگل ہے۔

غزلیں

حمید انصاری
ناگپوری

اک پھول بن کے ذہن کے گلدان میں سجی
ان کی انوکھی بات مرے دھیان میں رہی

سیلاب ایسا آیا کہ سب بہہ گیا مگر
محفوظ ایک جھونپڑی طوفان میں رہی

محنت کے باوجود بھی یہ زندگی مری
دب کر امیرِ شہر کے احسان میں رہی

چھوڑا ہر ایک شخص نے سچائیوں کا ساتھ
پہلی سی پختگی کہاں ایمان میں رہی

غم کی اندھیری رات سے لڑنے کے واسطے
اک جگنوؤں کی فوج بیابان میں رہی

آواز تیری جادو جگاتی تھی ہم تلے جب
کوئی کشش نہ اب ترے سُرتان میں رہی

کیوں ہر کسان سوچ میں ڈوبے نہ ہے حمید
اب کے برس کی فصل بھی نقصان میں رہی

محمد عمر الفت شرقی
نامپلی، حیدرآباد

آپ میں چاہت کی وہ دل میں چبھن باقی نہیں
آپ کے چہرے کا اب وہ بانکپن باقی نہیں

کیا کریں لے کر چمن کو جس چمن میں لٹ گئے
ہے چمن باقی مگر جانِ چمن باقی نہیں

زندگی میں بارہا کھائے ہیں دھوکے دوستو
کیسے کہہ دیں کھوٹے سکے کا چلن باقی نہیں

پھر نہ جانے لوٹ کر وہ روزِ شب کب آئیں گے
ڈھونڈتے ہیں ہم جسے وہ انجمن باقی نہیں

ذہن کی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں آج تو
کیسے دل مچلے وہ خوشبوئے بدن باقی نہیں

جو وطن کے نام پر کٹ جائے وہ انسان نہیں
ہے وطن باقی مگر حب الوطن باقی نہیں

لگ گئی کس کی نظر الفت بتا سکتے نہیں
شہر میں تو اب وہ پہلا سا چلن باقی نہیں

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۶) شمارہ (۱۲) دسمبر ۸۹ء حیدرآباد

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	25 پاکستانی روپے
دو سال	90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 "	205 " "
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	650 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147، ریڈ ہلز - حیدرآباد - (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر دفتر "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

۱۔ حرف اول	ایڈیٹر	۳
۲۔ تحریک آزادی ہند	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۴
۳۔ اسلام اور دہشت پسندی	پروفیسر عبدالمغنی	۱۳
۴۔ انصاف پارٹی	سید شہاب الدین	۲۳
۵۔ اردو ہندی میخ	سید لیٰین سیٹھ	۳۰
۶۔ نئی تعلیمی پالیسی	کے کے کھنّر	۳۲
۷۔ شہاب نامہ "کچھ یا خدا کے بارے میں"	قدرت اللہ شہاب	۳۵
۸۔ خیرات ندیم	سرینواس لاہوٹی	۴۴
۹۔ علامہ خضر برنی	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	۴۹
۱۰۔ پت جھڑ کے بعد	بلقیس تبسم	۵۳
۱۱۔ بلڈ پریشر	ڈاکٹر کے بھگت دتسل راؤ	۶۲

حرف اول

اردو کو آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی ضرورت

ریاست آندھرا پردیش میں پہلے پہل اردو کو خصوصی موقف حاصل رہا۔ اس کی وجہ وہ پس منظر تھا جس میں یہ ریاست عالم وجود میں آئی تھی۔ یعنی قبل ازیں سابق ریاست حیدرآباد میں سالہاسال تک اردو عملی طور پر سرکاری زبان رہی تھی اور یہاں صغیر سے لیکر ایم اے تک اردو ذریعہ تعلیم کی زبان رہی تھی اور سرکاری دفاتر میں بھی عملی طور پر رائج تھی۔ اسی وجہ سے وشال آندھرا کے قیام کے فوری بعد اس ریاست کے پہلے وزیر اعلیٰ جناب سنجیوا ریڈی نے اردو فیسٹول کی ایک تقریب میں اسے ریاست کی دوسری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا تھا لیکن یہ اعلان محض اعلان ہی رہا اور عملی شکل اختیار نہ کرسکا اور نہ اس اعلان کو کوئی قانونی موقف دیا گیا۔ کئی سال تک اردو داں اسی زبانی اعلان کے فسوں میں گرفتار رہے۔ بہت بعد انہیں احساس ہوا کہ ریاست آندھرا پردیش میں اردو کا کوئی قانونی موقف نہیں۔ اس اثناء میں بہار اور اترپردیش جیسی شمالی ہند کی ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اور اسے قانونی موقف بھی دے دیا گیا۔ لیکن ریاست آندھرا پردیش جو اردو کے معاملہ میں سرفہرست تھی وہیں کا وہیں رہی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بہار اور اترپردیش کی طرح آندھرا پردیش میں بھی اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے جس کی اردو بجا طور پر مستحق ہے۔ گزشتہ سات سال سے تو آندھرا پردیش میں اردو کا بہت ہی برا حال ہے۔ حکومت اردو کے تعلق سے بیانات تو بہت دل خوش کن دیتی ہے لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کرتی۔ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے عمل کی ضرورت ہے وعدوں کی نہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مذاکرہ علمی کا خطبہ صدارت

تحریک آزادی ہند

مسلمانوں کا حصہ، اصلاح حال میں ادب اسلامی کا حصہ

[رابطہ ادب اسلامی کا علمی مذاکرہ ۷ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ ۷ر اکتوبر کو حضرت مولانا نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ قارئین شاداب کیلئے پیش ہے۔]

رابطہ ادب اسلامی مذاکرہ علمی کا موضوع بہت وسیع ہے اور اس پر میں اپنی گفتگو اور معروضات کو تحریک آزادی کے ان قائدین اور علمبرداروں کی مساعی، اور ان کے نتائج کے حصہ تک محدود رکھوں گا جو دینی دعوت اور بامقصد اور حیات بخش ادب اسلامی کے ممتاز ترین حامل اور صحیح نمائندہ تھے۔

کسی ملک کی آزادی کی تحریک اور جنگ آزادی تو اس کے نتیجہ میں بعد کی چیز ہے) مذہب و اخلاق، اعلی انسانی قدروں، بعض اوقات طاقتور دینی حمیت، خطر پسندی و مہم جوئی کی صلاحیت اور جذبۂ قربانی کے بغیر وجود میں نہیں آتی اور اس کی صلاحیت ایک صحیح اور پختہ عقیدہ پر ایمان اور مکمل مادی منافع سے صرف نظر کے بغیر نہیں پیدا ہوتی، اسی طرح اس کے لئے حالات کا گہرا مطالعہ، تبدیلیوں کا مبصرانہ اور دور رس جائزہ اور اس کے طویل المیعاد اور بعید الوقوع نتائج کا اندازہ کیا جانا بھی ضروری ہے۔ ان باطنی محرکات و عوامل، ان دینی و اخلاقی سرچشموں اور ان اندرونی کیفیات و جذبات، پھر اس دور بین نگاہ اور حقیقت شناس اور وسیع جائزہ اور اس کے نتیجہ میں شدید احساس کرب کے بغیر نہ سچی تحریک آزادی پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہے اور نہ اس کے نتیجہ میں وسیع اور دیرپا جنگ آزادی لڑی جاسکتی ہے اور نہ اس سلسلہ میں قربانیاں دی جاسکتی ہیں۔

اس کا نتیجہ ہے کہ تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہم جب ہندوستان کے اس قومی لٹریچر پر نظر ڈالتے ہیں جو فارسی، اردو اور ہندی میں دستیاب ہے تو ہم کو اس عہد کے ایک عظیم عالم اور مصلح کے فکر و کردار پر حیرت ہوتی ہے جب کہ مطالعہ اور تحقیق و تشریح کا میدان صرف دینیات

تفسیر وحدیث وفقہ) اور کسی حد تک عربی فارسی کے ادبیات کے اندر محدود نظر آتا ہے، نہ وہ اس زمانے کے
رف کے مطابق کوئی سیاسی قائد ولیڈر تھا نہ عوامی جدوجہد کے میدان کا کوئی تجربہ کار و حوصلہ مند مجاہد،
یری مراد ہندوستان کے شہرہ آفاق عالم واستاد اور محقق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ/
۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) کی ذات ہے، ان کے ایک عربی شعر میں ہم کو وہ سیاسی بصیرت، برصغیر ہند سے لیکر
فغانستان تک کے حالات میں اس انقلاب کے آثار اور فرنگی حملہ آوروں کے خطرناک منصوبوں کی نہ صرف
علک، بلکہ ایک عمیق و معنی خیز پیشن گوئی کی مثال ملتی ہے، جس کو ان کی دور بینی، حقیقت شناسی
ور اخلاقی، معاشرتی، سیاسی و اقتصادی، دور رس تبدیلیوں کی پیش بینی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس
نا مثال ان کے عہد کے بعد اس سے بہت بعد تک کے عہد کے کسی سیاسی مبصر اور مورخ کے یہاں نہیں ملتی۔
ہنوں نے اپنے اس عربی شعر میں اس خطرہ کی نشاندہی کردی ہے بلکہ اس خطرناک انقلاب کی طرف
ھلے طریقہ پر انگشت نمائی کی ہے۔ جو جنوبی ایشیا کے اس وسیع خطہ پر جو عظیم آزاد سلطنتوں کا مالک
تھا منڈلا رہا تھا بلکہ عملاً اس کی سرزمین پر اس کی بساط شطرنج بچھادی گئی تھی وہ فرماتے ہیں۔

وانی اری الافرنج اصحاب ثروۃ ۔۔۔ لقد افسدوا ما بین دھلی و کابل

ہ میں وسائل اور سرمایہ کے مالک فرنگیوں کو دیکھتا ہوں کہ انہوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد عام
ے بیج بو دیئے ہیں اور اس آزاد سرزمین کو سیاسی غلامی، اقتصادی بدحالی اور خانہ جنگی کے لئے تیار کردیا ہے
اسی طرح ان کے خلیفہ و تربیت یافتہ ہندوستان کے شہرہ آفاق مصلح و مجاہد حضرت سید احمد شہید رائے
بلوی (۱۲۰۱ — ۱۲۴۶ھ/ ۱۷۸۶ — ۱۸۳۰ء) کے ان خطوط و مکتوبات میں جو انہوں نے ہندوستان
بعض والیان ریاست اور ہمسایہ ملکوں کے والیان سلطنت کو لکھے ہیں، نو وارد اور قسمت آزما انگریزوں
ے بارے میں وہ الفاظ ملتے ہیں جو کم سے کم انیسویں صدی عیسوی میں ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ بعد
ب بڑے بڑے سیاسی بصیرت رکھنے والوں اور جنگ آزادی کے علمبرداروں کی تحریروں اور تقریروں میں بھی
ظر نہیں آتے اور اس سے ان کی اس حیرت انگیز فیاضی و دیدہ وری اور صاف بیانی کا نمونہ سامنے
تا ہے جو ان کے عہد اس زمانہ کی ثقافت اور ان کے خالص دینی ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے بہت قبل از
قت اور ایک طرح سے "الہامی" معلوم ہوتے ہیں۔

دربارہا دمنودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ"۔

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے' دنیا جہاں کے تاجدار' اور یہ سوا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔"

ایک ہندوستانی ریاست کے فوجی افسر اعلیٰ غلام حیدر خاں کے نام لکھتے ہیں۔

حیدرآباد میں اس مجلس مذاکرہ (سمینار) کے پہلی مرتبہ منعقد ہونے کی مناسبت اور اہل حیدرآباد کی قدردانی اور حسن ضیافت کی رعایت سے ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے سورماؤں اور قائدین کے تذکرہ میں (جن کی تعداد بہت بڑی ہے اور جن کا تذکرہ اگلی سطروں میں آنے والا ہے) سب سے پہلے میر گوہر علی خاں' نواب مبارز الدولہ بہادر کے ذکر خیر سے ابتدا کرتے ہیں' جو نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ ثالث کے چھوٹے فرزند اور ناصر الدولہ بہادر کے بھائی تھے۔ موصوف ۱۸۰۸ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ فارسی و عربی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی تعلیم بھی مستند طور پر ہوئی تھی۔ انگریز دشمنی کا جذبہ انہیں اپنے باپ نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ ثالث سے ورثہ میں ملا تھا اس نے کم عمری ہی میں جارحانہ صورت اختیار کرلی۔ اور انگریز ریذیڈنسی سے ایک مقابلہ و تصادم کے نتیجہ میں ان کو پانچ سال کے لئے قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا۔

ہم یہاں پر ایک فاضل حیدرآبادی مضمون نگار محمد محسن جواد صاحب کے مقالہ شائع شدہ "نیا دور" یوم آزادی نمبر اگست ۱۹۸۵ء کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ نواب مبارز الدولہ بہادر کے اس مجاہدانہ کردار کی مستند تاریخی تفصیل کتاب "حیدرآباد کی تاریخ جدوجہد آزادی شائع کردہ حیدرآباد اسٹیٹ کمیٹی ۱۹۵۶ء سے معلوم ہو سکتی ہے۔ جس کے ساٹھ ۶۰ صفحات نواب مبارز الدولہ بہادر سے مخصوص کیے گئے ہیں۔

فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں۔

گولکنڈہ میں قید کے دوران نواب مبارز الدولہ کے روابط سید احمد شہید کے نمائندوں سے جو دکن بھیجے گئے تھے قائم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ خود سید احمد شہید نے بھی سکندر جاہ آصف جاہ ثالث سے خط و کتابت کی تھی۔ کرنل میڈوز ٹیلر نے اپنی کتاب 'HISTORY OF MY LIFE' میں سید احمد بریلوی کے ایک خط کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ جس میں سید احمد بریلوی نے ہندوستان سے

ریزی اقتدار کے خاتمہ کی جد وجہد میں انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی، اس خط میں انہوں نے اصفجاہ
نسٹ کران کی خاندانی روایات کو یاد دلاتے ہوئے زور دیا تھا کہ وہ ملک سے بے خوف لوگوں کے اقتدار کے
تمہ میں انکی مدد کریں ۔

"سن ۱۸۳۰ء میں سید احمد بریلوی شہید ہوئے ۔لیکن تحریک شہیدین کا زور نہیں ٹوٹا ، بلکہ اس کے بعد کے
قعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے پیرول نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اپنا
رز شمال سے جنوب منتقل کردیا ۔ سنہ ۱۸۳۹ء میں مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم الدین (جو تحریک کے
رگروہ قائدین میں سے تھے) حیدرآباد آئے ، مبارز الدولہ کے گھر میں مقیم رہے اور انہوں نے دیگر ساتھیوں
مبارز الدولہ کا مخبر اور قاصد بناکر انہیں مدراس، بنگلور، کرنول، جودھپور، بمبئی، بھوپال، لاہور، سندھ
ر دوسرے شہروں اور ریاستوں کو روانہ کیا ۔ چنانچہ ان علاقوں میں تحریک کے حق میں زوردار سرگرمیاں
روع ہوگئیں ۔ مختلف مقامات پر بھیجے گئے قاصد فقیروں کے بھیس میں پیامات اور خبریں ایک جگہ
دوسری جگہ پہنچاتے اور عوام میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا کرتے تھے ۔ ان ہی کے ذریعہ
ب مبارز الدولہ مختلف ریاستوں کے حکمرانوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے اور منظم طریقوں سے بغاوت
منصوبہ کو آگے بڑھا رہے تھے ۔

نواب مبارز الدولہ کے ذکر کے ساتھ ہمارا ذہن قدرتا سلطان شہید ٹیپو کی طرف منتقل ہوتا ہے جن
دور اور کارنامہ ، ہندوستان کے تمام مجاہدین آزادی اور بالغ نظر دور میں قائدین آزادی سے پہلے
روع ہوتا ہے اور جو اقبال کے الفاظ میں ؎

ترکش مارا خدنگ آخریں

کا مصداق تھے ، اور جنہوں نے "گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کی زندگی کی ایک ساعت" کو ترجیح دی
ض تاریخوں اور خاندانی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے خاندان کا سید احمد شہید
خاندان سے روحانی ارتباط رہا ہے ۔ اس مرد مومن اور اس فقیر غیور اور امیر جسور کی جسم و جان میں
جس نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی آبرو رکھ لی) خاندان ولی اللہ اور جماعت مجاہدین اور سید احمد
ید کے بزرگوں (سید شاہ ابو سعید اور سید شاہ ابو اللیث) کے روحانی اثرات اور ان کی آرزوں اور
ناؤں کی روح کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔

باوجود اس کے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی صحیح معنی میں عوامی اور قومی تھی اور ہندو مسلمان سب اس میں شریک تھے۔ اور ہندوستان نے وطن دوستی، اتحاد اور گرم جوشی اور ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا۔ پھر بھی قیادت و رہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، چنانچہ اکثر قائد مسلمان ہی تھے۔

اس تحریک کی فکری اور علمی قیادت میں عظیم اللہ خاں، جنرل بخت خان، خان بہادر خان، مولانا شاہ احمد اللہؒ، مولانا لیاقت علی الہ آبادی اور حضرت محل پیش پیش تھے۔ ان میں مولانا شاہ فیض آبادی کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ ہومز لکھتا ہے۔

مولوی احمد شاہ شمالی ہند میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

پنڈت سندر لال لکھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی آزادی کے شہیدوں میں ۱۸۵۷ء کے مولوی احمد اللہ شاہ کا نام ہمیشہ قابل احترام رہے گا۔

ملے سن لکھتا ہے۔

" مولوی احمد اللہ ایک بڑا ہی حیرت انگیز انسان تھا، غدر کے دنوں میں سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی قابلیت کے بہت سے ثبوت ملے، کوئی بھی دوسرا آدمی فخر کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ" میں نے دوبارہ سر کالن کیمپ بل کو میدان میں شکست دی "۔

نیز وہ لکھتا ہے۔

احمد اللہ شاہ سچا محب وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار ناپاک نہیں کیا، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیسیوں کے ساتھ جنگ کی جنھوں نے اس کے وطن کو چھین لیا تھا، ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو چاہیئے کہ مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھیں۔

یہ ایک قتل عام تھا۔ لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے۔ اس لئے کہ بہت سے ذمہ دار انگریز یہ کہتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، ایک انگریز مصنف ہنیری میڈ کہتا ہے کہ

" اس سرکشی کے موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یقیناً اس کا آغاز

سپاہیوں سے ہوا۔ لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔ یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی۔

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے۔

" ایک انگریز کا شیوہ یہ ہوگیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان۔؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی ماردیتا۔

پھر پھانسی کا سلسلہ شروع ہوا، عام شاہراہوں اور سڑکوں پر پھانسی کے تختے لگا دیئے گئے ہر جگہ انگریزوں کی تفریح اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں، جہاں اکثر وہ پھانسی پانے والوں کے سسکنے اور دم توڑنے کے وقت کا لطف لیتے، سگریٹ کا کش لگاتے اور آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ جب پھانسی کا کام پورا ہوجاتا اور وہ مظلوم شخص آخری سانس لیتا تو ہنسی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے، ان بدنصیبوں میں بڑے بڑے ذی وجاہت اور اشراف تھے، بعض مسلم محلے اس طرح تہ تیغ کر دیئے گئے کہ ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے۔

" ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا۔ اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا مٹادیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔

ملاسن لکھتا ہے۔

" ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے مجرموں کو مارتے پھرتے تھے اور کسی درد و تاسف کے بغیر انہیں پھانسیاں دے رہے تھے گویا وہ کتے تھے یا گیدڑ" یا نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے"

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے ۲۱ رجون ۱۸۵۷ء کو اپنی والدہ کو لکھا۔

" سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑادیا جائے یہ بڑا ہی وحشناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہوسکتے۔ ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے۔

ایک عجیب و غریب جذباتی طریقہ سے جسکی انگریز جیسی دستوری اور جمہوری قوم سے توقع نہیں تھی ۱۸۶۵ء میں مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری اور مولوی محمد

جعفر تھانیسری کو جو سب جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے ' انڈمان روانہ کردیا گیا ' مولانا یحییٰ علی
ور مولانا احمد اللہ کا انڈمان میں انتقال ہوگیا اور مولوی محمد جعفر اٹھارہ سال کی قید بامشقت اور
بلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے پٹنہ میں اہل صادق پور کی تمام جائدادیں ضبط کرلی گئیں ۔ ان کی
مارتیں گرادی گئیں اور ان پر ہل چلوادیا گیا اور اس زمین پر نئی سرکاری عمارتیں قائم کی گئیں ۔ ان کے
مقبروں کو تباہ و برباد کردیا گیا ' یہ سب انتقامی جذبہ کے ماتحت اور دل ٹھنڈا کرنے کے لئے کیا گیا ۔

اسی طرح ممتاز اور جلیل القدر علماء کی خاصی تعداد کو انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی ۔ جن
میں مولانا فضل حق خیرآبادی ' مفتی عنایت احمد کاکوروی ' مفتی مظہر کریم دریابادی کے نام قابل ذکر
ہیں ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی تو وہیں انتقال کرگئے اور بقیہ دو عالم طویل عرصہ کے بعد وطن واپس
آئے ۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ چھڑی اور یورپین حکومتوں بالخصوص برطانیہ کے خلاف (جو اس
وقت ان کا لیڈر تھا) رائے عامہ میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر دوڑ گئی اور مشرق کے اسلامی سیاسی
شعور کا لاوا جو آہستہ آہستہ پک رہا تھا پھوٹ پڑا ' اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" نکالا
جس میں سخت آتشیں مضامین شائع ہوئے اور یورپ کی مسلم دشمن سیاست پر بڑی فصاحت و قوت کے
ساتھ بھرپور تنقید کی جاتی ' ہزاروں لاکھوں مسلمان ذوق و شوق کے ساتھ اس کو پڑھتے تھے ۔ مولانا محمد علی
نے کلکتہ سے "کامریڈ" نکالا جو بعد میں دہلی منتقل ہوگیا ۔ وہ انگریزی سیاست پر لطیف اور طنز آمیز
اسلوب میں تنقید کرتا تھا ۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں کا اخبار "زمیندار" اور دوسرے اسلامی اخبارات
اور رسالے منظر عام پر آئے اور ان کے ذریعہ سے پورے ہندوستان میں ایک فکری بغاوت یا انقلاب کی
لہر پھیل گئی ۔ جس کے نتیجہ میں حکومت ہند نے مولانا محمد علی و شوکت علی ' مولانا ابوالکلام آزاد اور
مولانا حسرت موہانی کو گرفتار کرلیا ۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش
کے سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنھوں نے "الہلال" کی نظموں اور
مسلم گزٹ" کے مضامین کے ذریعہ برطانیہ کی وفاداری کی پالیسی اور مسلمانوں کی کمزور سیاست پر سخت تنقید
کی اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو متاثر کیا ۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور غیر ملکی اقتدار سے (جو
دین ، مذہب ' اخلاق و اقدار ' تمدن و معاشرت ' اقتصادیات ہندوستان کی خوشحالی اور صنعتی خودکفالتی
کے لئے کھلا خطرہ تھا) نجات حاصل کرنے کی تحریک و جد و جہد میں علمائے دین ' سرفروش مجاہدین اور

یت وغیرت مسلمانوں کا جو قائدانہ اور سرفروشانہ حصہ تھا اس کی کسی قدر تفصیل سطور بالا میں آچکی ہے۔ ادب وشاعری کے ذریعہ ان کے ادیبوں اور شاعروں نے جس جرأت مندانہ طریقہ پر اس تحریک و جہد میں تپش وسوزش پیدا کی اس کا مفصل تاریخی جائزہ لینے کے لئے ایک جفاکش و دیدہ ور مورخ و ب کا قلم درکار ہے ۔ "الهلال" کامریڈ اور "زمیندار" کے آتشیں مقالات" اور ولولہ انگیز نظموں اور روں سے بہت پہلے جماعت مجاہدین کے ادیبوں اور شاعروں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ اس نازک میں جب ایک تیز لفظ پر پھانسی دی جا سکتی تھی۔ حضرت سید احمد شہید کی جماعت کے ایک فرد محمد امین صاحب امروہی (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) کا یہ شعر بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اور وہ ان ت میں ایک جرأت قلندرانہ، بلکہ اقدام سرفروشانہ سے کم نہیں، انگریز جو مسلمانوں کے بارے جو ہندوستان پر تسلط حاصل کرتے جا رہے تھے وہ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔ سہ

بہ تیروئے اسلامیاں زور دہ — کہ شد از سگاں شہر یا کوردہ

مسلمانوں کے ہتھیاروں میں زور دے اس لئے کہ (مہذب وترقی یافتہ) ان فرنگی کتوں کی وجہ گھٹیا دیہات اور "کوردہ" مقامات بن گئے ہیں"۔

اپنے فرزند کے لئے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مجاہد چنانش کن اندر غزا — کز وتا رسد بر نصاریٰ سزا

" اس کو ایسا مجاہد و غازی بنا کہ اس سے ان فرنگی عیسائیوں کو کچھ سبق ملے۔)

ادبی رزمیہ کا یہ سلسلہ اردو کے نامور و صاحب اسلوب شاعر حکیم مومن خاں مومن کے قصیدہ یہ اور مولانا خرم علی بلوری کی مثنوی جہادیہ سے شروع ہو کر بیسویں صدی عیسوی کی ان ولولہ انگیز انہ نظموں اور شاہناموں پر مشتمل نظر آئے گا۔ جنھوں نے عرصہ تک تعلیم یافتہ حلقوں شرفا کے خاندانوں سا تک کہ مستورات میں شہادت فی سبیل اللہ کی قدر اور جہاد و سرفروشی کی ایسی عظمت و اہمیت کردی کہ وہ اپنے لخت جگر، فرزندوں، پوتوں، اور نواسوں کو اس شعر کی لوری سنا سنا کر سلاتی تھیں

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ان رزمیہ شعری مجموعوں اور شاہناموں میں خاندان سید احمد شہید کے ایک پر گو وقادر الکلام شاعر شی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی "صمصام الاسلام" (منظوم فتوح الشام) (واقدی) خاص طور پر

قابل ذکر ہے، جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور جو راقم السطور کے بچپن تک یوپی، دہلی، دوآبہ اور راجپوتانہ کے دیندار خاندانوں میں مجلسوں میں پڑھی جاتی تھی اور اس سے سننے والی مسلمان خواتین اور اپنی زودوں سے آنے والے ان کے نوعمر فرزندوں میں حرارت ایمانی و جوش اسلامی موجیں مارنے لگتا تھا۔ حضرات! آخر میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ ابھی ان لوگوں کا جنھوں نے جنگ آزادی میں قائدانہ و مجاہدانہ کردار ادا کیا تھا۔ کام ختم نہیں، اب ان کو اس آزاد و خود مختار ملک میں مصالحانہ و مفکرانہ کردار ادا کرنا ہے۔ پہلے اس ملک کی زمین کو آزاد کرانے کا مرحلہ تھا اب اہل ملک کے ضمیر کو آزاد کرانے کا مسئلہ ہے۔ اہل ملک کی اپنے آپس میں ہوس اقتدار اور ایک دوسرے کا ناجائز استحصال، دولت کی بڑھتی ہوئی محبت، اخلاق و اقدار و اصول بے نیازی، حد سے بڑھا ہوا نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصب و منافرت اور تنگ نظری، غیر ملکی اقتدار اور دور غلامی کے کم شرمناک اور خطرناک نہیں، جس کے پاس اب بھی میری دہائی، آسمانی تعلیمات، نبی پیغمبر ﷺ کا اسوۂ حیات آخریں تاریخ اور نثر و نظم کی شکل میں پورا گہرا اور رہنما ادب موجود ہے آپکی ذمہ داری ہے کہ اسی ملک کو ان امراض و خطرات سے بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دیں۔

سلسلہ ص ۲۲

اسلامی جہاد کی شان یہ ہے کہ ظالم اقتدار کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا اس کی بہترین خصوصیت ہے اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکنے کی کوشش ایمان کی علامت ہے، اس لئے لوگوں کو برائی سے منع اور اچھائی کی تلقین کرنا امت مسلمہ کا امتیازی کردار اور منصبی فریضہ ہے، یہ جہاد شرک کے خلاف خیر کی محاذ آرائی اور باطل کے ساتھ حق کی پنجہ کشی ہے، جس میں طاقت کا استعمال تخریبی سرگرمی کے لئے نہیں صرف تعمیری مقاصد کے لئے ہوگا۔ یہ جنگ پسندی اور حق کوشی، دہشت پسندی اور دہشت گردی کے لئے پیام فنا ہے، خواہ اس کا ارتکاب کوئی فرد کرے، کوئی جماعت کرے یا کوئی حکومت۔ ••

پروفیسر عبدالغنی

اسلام اور دہشت پسندی

آج کے ذرائع ابلاغ دہشت پسندی کا لفظ بکثرت استعمال کر رہے ہیں اور بعض سیاسی عناصر
ں کا تعلق اسلام سے جوڑنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں، حالانکہ نہ تو عام طور پر دہشت پسندی کا
ہوم لوگوں کو ٹھیک کوئی معلوم ہے نہ یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس کا کوئی تعلق اسلام سے بھی ہو سکتا
۔ دراصل اردو میں لفظ دہشت پسندی" انگریزی لفظ TERRORISM کا ترجمہ ہے ۔
ر کا مطلب ہے بہت زیادہ خوف خطر اور ہول ہیبت ۔ اس مطلب کی ادائیگی کے لئے فارسی لفظ
شت استعمال کیا گیا اور انگریزی کے " ازم " کا ترجمہ " پسندی " کر دیا گیا ۔ اس طرح پورا مفہوم یہ ہوا کہ
ں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے مسلک کا نام دہشت پسندی ہے یعنی جو لوگ دوسروں کو
و غارت وغیرہ جیسے غیر قانونی، غیر اخلاقی، غیر انسانی افعال سے ڈرا دھمکا کر اپنے ناپسندیدہ
صد حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی مذموم حرکت دہشت پسندی ہے ۔ یہ حرکت ایسے ناروا تشدد
ایذا رسانی پر مشتمل ہے کہ انسانیت کا ضمیر اسے گوارا نہیں کر سکتا اور نہ مہذب دنیا اس ظلم و ستم
جازت دے سکتی ہے ۔ اسلئے کہ یہ انسانیت کو تہذیب و تمدن سے وحشت و بدویت کی طرف واپس
جاتا ہے، یہ اس قسم کی درندگی و سفاکی کا مظاہرہ ہے جو ماضی بعید میں (BERBERISM)
نسوب کی جاتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی صحافت نے دہشت پسندی کو عہد وسطیٰ کی تاریکی کا نشان
بتلایا ہے ۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ تاریخ کا یہ تصور اسی طرح مغرب کے سیاسی مفاد کی پیداوار ہے،
طرح اسلام کی جانب دہشت پسندی کے حوالے کی کوشش مسلم دشمن عناصر کے فرقہ پرستانہ مقاصد
رجحان ۔

فی الواقع اسلام کے ساتھ دہشت پسندی کے ربط کی بات مغربی صحافت میں خاص کر اس وقت سے
نمایاں طور پر کی جا رہی ہے جب تنظیم آزادی فلسطین PALESTIANIAN LIBERATION ORGANISATION

کے بازوئے شمشیر زن کی حیثیت سے "الفتح" نے ریاست اسرائیل کے صیہونی دہشت پسندوں اور ان کے حامیوں کو بین الاقوامی سطح پر دندان شکن جواب دینا شروع کیا، اگرچہ ظالموں کے خلاف مظلوں کی اس سرگرمی میں ایسے عناصر پیش پیش تھے جن کا کوئی تنظیمی رابطہ تنظیم آزادئ فلسطین (P.L.O) سے نہیں تھا اور یہ عرب انتہا پسند اور اپنے طور پر اسرائیلیوں کی درندگی کے خلاف انتقامی کاروائی کر کے دنیا کی توجہ اپنے تحریکی مقاصد کی طرف مبذول اور مظلوں کے ساتھ انصاف کے لئے انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے، بہرحال، بے قصور افراد کے خلاف کسی قسم کی نامعقول کاروائی ایک زیادتی ہے جس کا کوئی جواز کسی بین الاقوامی یا قومی قانون میں نہیں ہو سکتا، مگر یہ زیادتی ایک بڑی زیادتی کا ردعمل تھا جو ایک غاصب حکومت اپنے مقبوضہ ملک کے حقیقی باشندوں پر سال ہا سال سے بدترین شکل میں کرتی چلی آرہی ہے۔

حال فی الحال "شیطانی آیات" "THE SATANIC VERSES" کے مصنف سلمان کے خلاف ایران کے امام آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب کے فتوے قتل کے نتیجے میں جو پر تشدد واقعات بعض مقامات پر ہوئے ہیں انہیں بھی مغربی پریس اور اس کی تقلید میں ہندوستانی پریس دہشت پسندی قرار دے کر اس کا رشتہ اسلام کے ساتھ جوڑ رہا ہے۔ اس سلسلے میں جدید دنیائے اسلام کے اندر "بنیاد پرستی" "FUNDAMENTALISM" کے رجحان کا نظریاتی سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ایران کے اسلامی کہلانے والے انقلاب کی شدت پسندانہ کاروائیوں کو اسلامی بنیاد پرستی پر مشتمل سمجھا جا رہا ہے بنیاد پرستی کی اصطلاح بھی دہشت پسندی کی طرح مغرب کی ایجاد کی ہوئی ہے اور اسلام پسندی پر اس کو چسپاں کرنے کا عمل بھی امریکہ اور یورپ ہی سے شروع ہوا ہے۔

دہشت پسندی کی تعریف : اقوام متحدہ نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۲ء سے اجلاس مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۸۷ء تک پندرہ سال دہشت پسندی کی تعریف و تشریح میں گزارے، مگر آج تک یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ یہ معاملہ اصطلاحی دہشت پسندی اور اس کے سیاسی انطباق کا ہے اول تو اس سلسلے میں انفرادی و اجتماعی، پھر عوامی و سرکاری دہشت پسندی کے درمیان امتیاز کی بات کی جاتی ہے، دوسرے مختلف ممالک و اقوام اپنے اپنے متضاد اغراض کے تحت ایکدوسرے پر ایک دوسرے کے خلاف دہشت پسندی کا الزام رکھتے ہیں، شام کا بیان ہے کہ مشرق وسطیٰ میں دہشت پسندی

ابتدا اسرائیل نے ۱۹۵۴ء میں شام کے ایک جہاز کو گرا کر کیا لیبیا کا موقف ہے کہ نسل پرستوں نے جنوبی افریقہ نمیبیا اور فلسطین میں دہشت پسندی سے کام لیا ہے، پھر کیا عراق کے نیوکلیری ری ایکٹر پر اسرائیل کی بم باری اور لیبیا کے صدر قذافی کی رہائش گاہ کے ساتھ ساتھ طرابلس میں شہری نشانوں پر امریکہ کی بم باری صریح دہشت پسندی نہیں ہے ؟ یہی سوال نکاراگوا، پولینڈ اور مرکزی افریقی جمہوریہ کے واقعات کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے، مغربی یورپ کی یورپین اکنامک کمیونٹی (E. E. C) میں شامل ممالک اور کینیڈا سے لیکر جاپان، ترکی، ارجنٹینا، اسرائیل اور امریکہ تک بھی ملکوں کا خیال ہے کہ دہشت پسندی کی تعریف و تعیین پر اتفاق ممکن نہیں۔ البانیہ نے دہشت پسندی کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی اسباب پر زور دیتے ہوئے ویتنام، ایران، گرینیڈا، لبنان اور نکاراگوا میں امریکہ جارحیت، فلسطینیوں، لبنانیوں اور عربوں کے خلاف اسرائیلی رویے، جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں اور نمیبیوں پر نسل پرست حکومت جنوبی افریقہ کے حملے اور افغانستان میں روسی افواج کی تاخت و تاراج سب کو دہشت پسندی میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ صرف دو ممالک کی مخالفت اور ایک کی غیر حاضری کے ساتھ اقوام متحدہ نے " تمام دہشت پسندانہ افعال کی جن میں براہ راست یا بالواسطہ ریاستیں بھی شامل ہیں" مذمت ۱۵۳ ممالک کے ووٹوں کی زبردست اکثریت سے کی۔

یہ حقائق تو واضح کرتے ہیں کہ دہشت پسندی کا الزام آج کی دنیا میں قوموں کا ایک سیاسی کھلونا بن کر رہ گیا ہے اس لئے کہ جن ممالک کو مذکورہ بالا بیان میں دہشت پسندی کے اندر ملوث بتایا گیا ہے وہ خود دوسروں بالخصوص اپنے حریفوں کو دہشت پسند قرار دیتے ہیں، مثال کے طور پر ۲۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کو اسرائیل نے انٹی ٹیررسٹ ایکٹ منظور کر کے پی، ایل، او کو دہشت پسند قرار دے دیا۔ پھر سال رواں میں نومبر میں افریقی نیشنل کانگریس کو بھی یہی خطاب دیا گیا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ویتنام میں امریکہ کی کارستانی، عالم عرب میں اسرائیل کی شرارت، افغانستان میں روس کی درندگی اور ان سب سے پہلے الجزائر میں فرانس کی بربریت موجودہ صدی میں دہشت پسندی کی وہ بدترین مثالیں ہیں جن میں دنیا کی طاقتور حکومتیں بری طرح ملوث ہیں، ان کے مقابلے میں بعض افراد یا گروہوں کی دہشت پسندی خطرناکی یا تباہی کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک

مرحلے پر ۱۹۳۱ء میں جو ناگہانی تشدد برطانوی حکام یا ان کے ماتحتوں کے خلاف ہوا کیا اسے اس معنی میں دہشت پسندی کہا جا سکتا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی ناکامی تحریک آزادی کے بعد برطانوی سامراج نے حریت پسندوں پر ایک دور دہشت طاری کر دیا۔ آج پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے خواہ سکھوں کے ایک حلقے کی طرف سے یا حکومت کی جانب سے اسے کیا کہا جائے؟

برٹرنڈ رسل نے ایک دلچسپ بات دہشت کے توازن BALANCE OF TERROR امریکہ اور روس کی زبردست طاقتوں کی آویزش کے بارے میں کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سرمایہ دار اور اشتراکی ملکوں کے یہ سربراہ ایک دوسرے کے مقابلے میں مہلک ترین اسلحوں کے استعمال کی دھمکی ہی سے دہشت کا وہ توازن پوری دنیا میں قائم کئے ہوتے ہیں جو عصر حاضر میں ایک وقفۂ امن کا باعث ہے۔ یہ گویا جدید تہذیب و تمدن پر طاری دہشت و بربریت کا کھلا اعتراف ہے، جو آج کی ترقی یافتہ انسانیت کے لئے ایک نکتۂ عبرت ہے۔

تشدد اور دہشت پسندی۔ تشدد (VIOLENCE) تو یقیناً دہشت پسندی کا ایک جزو ترکیبی اور بنیادی عنصر ہے، لیکن انقلاب پسندوں اور جابر و مستبد اقتدار کے درمیان کشمکش میں بعض اوقات دونوں جانب سے جو خون ریزی ہوتی ہے کیا وہ ہر حال میں دہشت پسندی ہے؟ مظلوم اگر ظالم کی طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے ہیں یا فرماں روا کے جبر و ستم کی مزاحمت میں اور اس کے خلاف احتجاج و فریاد کرتے ہوئے محکوموں سے بھی کچھ زیادتیاں سرزد ہو جائیں تو قانونِ سلطنت اس سلسلے میں جو کارروائی بھی کرے ضروری نہیں کہ تاریخ بالآخر اس کی حمایت کرے۔ زبردستی کو امن نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس کے خلاف بغاوت کو لازماً بدامنی کہا جائے گا۔ صدیوں کی گردش ایام گواہ ہے کہ ماضی کے باغی مستقبل کے انقلابی تسلیم کئے گئے ہیں اور انہوں نے بسا اوقات دنیا کے مختلف خطوں میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کر کے انسانیت کی خوشحالی و ترقی کا کچھ سامان کیا ہے۔ ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ کی مثل کا مفہوم یہی ہے۔ بڑے بڑے پیغمبروں، مصلحوں اور رہنماؤں کو اقتدار وقت نے باغی قرار دیکر ستایا ہے۔ پھر ان کے پیروؤں اور حکومتوں کے درمیان ایسی لڑائیاں ہوئی ہیں جن کے نتیجے میں فتنہ و فساد مٹا ہے اور صلاح و فلاح کا دور دورہ ہے۔

لہٰذا اصولاً تشدد کوئی جرم نہیں ہے اور نہ عدم تشدد، بجائے خود کوئی صحیح عقیدہ

ہوسکتا ہے، ظلم پر بعض اوقات صبر و تحمل ایک بات ہے جبکہ ظالموں کے لئے لقمۂ تر اور نرم چارہ بن جانا بالکل دوسری بات ' ایک چیز ہے جارحیت اور دوسری چیز ہے اس کا دفاع ' کسی جنگ باز سے مصالحت سپر اندازی ہے ' جبکہ اس کا مقابلہ کرنا ہمت و شجاعت ہے ' لہذا جو تشدد و فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے اور شر پسندوں کی سرکوبی کرنے کے لئے اختیار کیا جائے ' وہ یقیناً نہ صرف روا بلکہ مطلوب ہے ' حکومت کی انتظامیہ ملک اور سماج کے ناپسندیدہ عناصر کے خلاف جو سخت اقدامات کرتی ہے ' وہ اسی قسم کے جائز اور پسندیدہ تشدد پر مشتمل ہے ۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں میں فسطائیوں اور نازیوں کے خلاف جو فوج کشی ہوئی وہ ایسا ہی ایک تشدد تھا لہذا دہشت پسندی محض تشدد نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ بے قصور اور معصوم افراد پر ظلم و ستم اور ان کو ہراساں و پریشاں کرنے کا نام ہے ' خواہ یہ درندگی و سفاکی افراد کی طرف سے ہو یا گروہوں ' جماعتوں اور حکومتوں کی جانب سے تشدد کے خلاف دہشت پسندی کے لفظ میں سنگ دلی ' بے رحمی اور ستم شعاری کے مفاہیم مضمر ہیں اور یہی حقیقت اسے مذموم بناتی ہے کہا جاسکتا ہے کہ تشدد جب اپنی جائز حد سے بڑھ کر فساد کا باعث ہو جائے اور اس کا کوئی اصلاحی مقصد واضح نہ ہو تو یہ دہشت پسندی ہے ' ایسی چیرہ دستی جو دوسروں کی جان و مال و آبرو پر دست درازی کرے دہشت پسندی ہے ' جبکہ اپنی اور دوسروں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھانا بالکل جائز تشدد ہے ' ایک گال پر بلا وجہ تھپڑ مارنے والے کے سامنے ہر حال میں دوسرا گال بھی پیش کردینا صریح بزدلی اور شرپسندوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ ان کے سامنے تعاون ہے عدم تشدد کا نیم فلسفیانہ اور نیم صوفیانہ تصور فقط ' ایک ملمع کاری اور ظاہرداری ہے جس پر پورے طور سے عمل عالم واقعہ میں نہ کبھی ہوسکا ہے نہ ہوسکے گا ' ہندوستان کی تحریک آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف مقاومت مجہول اول تو اقتدار وقت کی طاقت کے مقابلے میں احساس شکست پر مبنی تھی ' دوسرے وہ بہرحال مقاومت تھی ' خواہ کتنی ہی مجہول ہو عصا نہ ہو تو کلیسی ہے کار بے بنیاد

بنیاد پرستی اور دہشت پسندی : نامذہبی د Non Secular کہلانے والے سیاست داں بالخصوص اصحاب اقتدار اور صحافی عام طور پر خالص مذہب پسندی کو بنیاد پرستی قرار دے کر اس کا رشتہ دہشت پسندی کے ساتھ لگاتے ہیں ۔ گویا وہ مذہبی شدت کو ایک ایسی انتہا پسندی

تصور کرتے ہیں، جو تشدد کی حد تک جاتی ہے اور اپنے پیروؤں کو دہشت گردی پر مائل کرتی ہے"۔

مذہب کا بہت ہی ناقص تصور ہے بلکہ مذہب کی حقیقت کے بارے میں اگر شدید غلط فہمی پر مبنی نہ ہو تو صریح مذہب بیزاری ہی اس کا محرک ہے، کہنا چاہیئے کہ یہ دراصل مذہب کو بدنام کرنے کی سازش ہے اور جو لوگ اس کے مرتکب ہیں ان کا خیال خام یہ ہے کہ تاریخ میں سب سے زیادہ خون مذہب کے نام پر ہوا ہے، حالانکہ مذہب پر الزام تراشی کرنے والے اگر موجودہ صدی میں اقوام پرست اور ترقی پسند کے لئے ہونے والی ہولناک خونریزی پر غور کریں تو نسبتاً مذہب انہیں بہت معصوم نظر آئے گا، پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں مذہب کہاں تھا؟ اشتراکی روس کی بھیانک تطہیرات میں مذہب کا کوئی حصہ ہے؟ ویتنام میں امریکہ کی بدمعاشی ہو یا افغانستان میں روس کی غنڈہ گردی یا فلسطین میں اسرائیل کی درندگی یا الجزائر میں فرانس کی سفاکی یا حبشہ میں اطالیہ کی بربریت، کبھی کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، عیسائیت ہو یا یہودیت، خون ناحق کسی کی بھی نظر میں بھی روا نہیں۔ پنجاب کی حالیہ دہشت گردی کو بھی سکھ دھرم کی تعلیم قرار دینا صحیح نہیں ہے ورنہ سکھ کے خلاف پنجاب کے باہر فساد کو ہندو دھرم کی تعلیم ماننا پڑے گا۔ یہ نکتہ اب ہندوستان کے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی سمجھ میں بھی آ گیا ہے چنانچہ پارلیمنٹ میں پنجاب کے متعلق حکومت کی تازہ ترین پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ بنیاد پرستی کو دہشت گردی سے الگ کر کے دیکھیں۔

"ایک گروہ اور چند افراد کو چھوڑ کر دہشت گردوں کا کوئی تعلق اب بنیاد پرستی یا مذہب سے قطعاً نہیں ہے"۔ (انڈیا ٹوڈے، نئی دہلی، ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء)

بنیاد پرستی کا دوسرا انگریزی ترجمہ (RADICALISM) ہے جس کا استعمال عام طور پر بنیادی و کلی انقلاب پسندی کیلئے ہوتا ہے یعنی ایک ہمہ گیر اور مکمل انقلاب کی آرزو جس کے مطابق کسی دور اور ماحول کی پوری زندگی کو یکسر بدل دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب معاشرہ ہر طرح بگڑ اور بکھر کر سراسر بوسیدہ فرسودہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب ایک معلوم و معروف تاریخ میں ایسا کوئی انقلاب رونما ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے ایک منتہائے نصب العین بن جاتا ہے اور جس نظریہ و نظام نے اس کو جنم دیا ہوتا ہے وہ اس کے ماننے والوں

کے خوابوں اور حوالوں کا مرکز بن جاتا ہے اس کی حیثیت کائنات وحیات کے تمام معاملات میں معیار حق کی ہوتی ہے جو ایک کسوٹی کا کام کرتا ہے اور کھرے کھوٹے کی پرکھ اسی کی بنیاد پر ہوتی ہے' لہٰذا صداقت کا یہ محور عظمت انسانی کا سرچشمہ قرار پاتا ہے اور شعور وکردار کے سارے محاسن کا محرک و مقصود' یہ دنیا میں انسانیت کی منزل کا نشان ہوتا ہے اور ہر قسم کی خیر طلبی کا نشانہ' اس کی اہمیت حقیقی بھی ہوتی ہے ' علامتی بھی یہ کسی ملت کے وجود کے بہترین اظہار کا نمونہ اولین ہوتا ہے اور ماہرین نفسیات وعمرانیات تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے نقوش ایک ملت کے حافظے پر ہمیشہ کیلئے ثبت ہو جاتے ہیں' چنانچہ جب زمانہ بگڑتا ہے تو ملت اپنے فکری سرچشمہ' وجود سے حقیقی دور جا چکی ہوتی ہے اس کے قلب اجتماعی میں اس کی یاد اتنی ہی شدید ہوتی ہے اور اس کا ضمیر اسے دوبارہ پانے کے لئے انتہائی بے چین ہو جاتا ہے ' یہ بیقراری نہ صرف عظمت رفتہ کی بازیابی کیلئے ہوتی ہے بلکہ اس بازیابی کے لائق بننے کی خاطر اپنے اندر ہر قسم کی آلائشوں سے پوری صفائی ستھرائی کے لئے بھی اس لئے کہ پرانی شان وشوکت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تمام بدعات و تحریفات کی اصلاح ضروری سمجھی جاتی ہے ' اسی ضرورت کا احساس ایک شاعر سے کہلواتا ہے۔

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ایسی حالت میں مذہب کا کٹر (ORTHODOX) نقطۂ نظر ہی روشن خیالی اور ترقی پسندی کا نشان بن جاتا ہے ' یہ گویا بدعقیدگی پر خوش عقیدگی کی فتح ہے' جس کی سب سے بڑی پہچان اخلاص اور خالصیت ہے ۔

اس صورتحال کو مغربی بالمخصوص مسیحی وکلیسائی تاریخ کے نشیب وفراز پر قیاس کرنا غلط ہوگا اور آج بنیاد پرستی پر گفتگو میں یہی غلطی عالمی پریس کر رہا ہے ۔ فی الواقع FUNDAMENTALISM کی اصلاح SECULARISM ہی کی طرح یورپ کے تاریک عہد وسطیٰ کے بعد نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہبی کے زمانے سے متصل مغربی ممالک میں کلیسا وریاست Church and State کی اس کشمکش کا شاخسانہ ہے جسکے نتیجے میں دین اور دنیا ایکدوسرے سے جدا ہو گئے اور اہل کلیسا کی بے راہ روی وزیادتی کے سبب لادین دانشوروں نے (CATHOLICISM) بمقابلہ (PURITANISM) کی اصطلاحیں وضع کرلیں اور انہیں مذہبی سیاق وسباق سے آگے بڑھکر علم وادب کا محاورہ بنا دیا' اس مقابلے میں وسیع المشربی کو روشن خیالی اور خالصیت کو

تاریک خیالی فرض کر لیا گیا مشرقی یورپ کے کٹر باز نطینی کلیسا Byzantinian
orthodox church کا بدکرداری کے خلاف مغربی یورپ کے وسیع المشرب رومی
کلیسا (Catholic Roman church) کی بد اطواری سے بھی زیادہ سخت ردعمل اس
سلسلے میں ہوا - یہی وجہ ہے کارل مارکس کی اشتراکیت کے جرمنی اور انگلستان نیز فرانس سے نکل کر
روس میں فروغ پانے کی، کلیسا اور سیاست کی کشمکش کے انجام پر اقبال کا یہ تبصرہ نہایت عبرت انگیز اور
بصیرت افروز ہے ۔ ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

(دین و سیاست ° بال جبریل)

اس طرح مذہب کی سیاست سے خارج اور دین کو دنیا کے راستے میں مزاحم تصور کر کے ہی اہل مغرب نے انتہائی کم عقلی اور کم ظرفی کا یہ ثبوت دیا کہ دنیا پرستی سے عاجز آکر مذہب کی طرف مراجعت کے رحجان کو بنیاد پرستی کا خطاب دیا، جو اشتراکیوں کی ایجاد کی ہوئی سیاسی گالی رجعت پسندی (Reactionism) کا دوسرا نام ہے، اور یہ نام و خطاب دونوں ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

دہشت پسندی اور اسلام

دہشت پسندی اور اسلام بالکل ضدین ہیں اور یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اسلام کا نام لے کر کبھی اور کہیں کچھ مسلمان بھی دہشت گردی کو راہ دیں تو اسلام سے اس کا تعلق ہرگز نہیں ہوگا ۔ بلکہ یہ دین اسلام سے ایک انحراف اور شریعت محمدی میں ایک تحریف کا فعل بد ہوگا جیسے دین و شریعت کے بدترین استحصال پر محمول کیا جائے گا ' اسلام اذیت پسندی اور فساد انگیزی کا روادار نہیں ' یہی بات دوسرے ان مذہب کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ' جن کی اصلیت وحی الہیٰ پر

مبنی ہے، خواہ ان کے پیروؤں نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو کتنا ہی مسخ کر لیا ہو، حتیٰ کہ ان کے نفس پرست علمائے دین اپنے مذہب کا استعمال کتنے ہی غلط مقاصد کے لئے کر رہے ہوں، اس لئے کہ دین رب العالمین کا مقرر کیا ہوا وہ نظریۂ حیات اور نظام زندگی ہے جو بلا امتیاز پوری انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے ہے، دین خدا کا بنایا ہوا قانون قدرت ہے اور وہ فطرت کے مطابق ہے، فطرت اپنی حقیقت کے لحاظ سے دہشت پسند نہیں، ورنہ روئے زمین کو انسان کے لئے ہموار نہیں کیا جاتا، نہ آسمان شاعروں کی تخیل کے برخلاف مہربان ہوتا، دنیا کی آب و ہوا آدمی کو اسی لئے راس آئی ہے کہ وہ خاص اسی لئے بنائی گئی ہے، ؎

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں

(اقبال، روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے - بال جبریل)

دنیائے انسانیت کی اس حقیقت کا امین سب سے بڑھکر وہ اسلام ہی ہے جس کی شناخت تاریخ میں پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے شریعت محمدی کے ذریعہ کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ دین کا آفاقی تصور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان کی شریعت ہی میں مرکوز ہو گیا ہے، یہ شریعت دین اسلام کی پچھلی تمام شریعتوں کی جامع ہے، اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیمات پچھلے انبیاء کی تعلیمات کی تصدیق و ترکیب کرتی ہے، لہذا وحی الہی کے آخری صحیفے کی حیثیت سے کتاب اللہ (قرآن) اور اس کے عملی نمونے کی حیثیت سے سنت رسول اللہ (حدیث) اس قانون قدرت اور نظام فطرت کے احکام و ہدایت اور ان کی تشریح و تعمیل کی دستاویزیں ہیں جو خداوند عالم نے زمین پر انسان کی پر امن اور صالح زندگی کے لئے تجویز اور مرتب کیا ہے، چنانچہ اسلامی ضابطۂ حیات خیر و فلاح کی واحد ضمانت ہے اور شر و فساد کے خلاف سب سے موثر وسیلہ تحفظ

اسلام کی تعریف: اسلام ایک عربی لفظ ہے، جس کا مادہ س ل م ہے اور عربی قواعد کے مطابق مختلف ابواب مثلاً افعال اور تفعیل کے تحت اس مادے سے مشتق الفاظ اسلام و تسلیم ہیں جبکہ چار حروف پر مشتمل ایک لفظ "سلم" کا لفظی ترجمہ امن ہے، پھر سلام اور سلامت کے الفاظ ہماری زبان میں سلامتی کے معنی میں مستعمل اور مروج ہیں، خود لفظ اسلام کا مطلب اپنے آپ کو

اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا اس کے آگے سر جھکانا، اس کی اطاعت، فرماں برداری اور بندگی ہے، یہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی زندگی خدا کی بندگی کے لئے ہے، اور یہ زندگی ربّ امنِ عالم کی ضامن ہے، مسلم معاشرت میں السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کا رواج ایک اسلامی شعار پر مبنی ہے اور اس میں ہر شخص کے لئے خیر و برکت کا پیام ہے، اس کا مطلب ہے کہ اسلام دنیا میں جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، وہ سراسر رحمت ہے اور اس کے افراد کے درمیان باہمی خیر خواہی اس کا امتیازی نشان ہے۔

اسلام کی اسی خصوصیت کی علامت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا وہ مشہور فقرہ ہے جس سے مسلم معاشرے اور اس کے افراد کا کام شروع ہوتا ہے، اور جو قرآن مجید کی تمام سورتوں کا نقطۂ آغاز ہے، اس فقرے میں اللہ تعالیٰ کی جو دو صفات بیان کی گئی ہیں وہ دونوں رحمت میں مبالغہ کے صیغوں پر مشتمل ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ رحم و کرم جس طرح خدا کی بنیادی صفت ہے اسی طرح اس کے بندوں کا بھی امتیازی وصف ہے، اور وہ اپنی زندگی میں رحم خداوندی کا طلب کرتے ہیں اور ان کا ہر فعل خدا کی شانِ کریمی سے منسوب ہوتا ہے، رحم و کرم کے اس جذبے سے بڑھ کر امن و امان کی کیا ضمانت دنیا میں ہو سکتی ہے؟

دہشت پسندی اسلام کی نظر میں: دین اسلام کے عقائد و اخلاق کے مذکورہ بالا جائزے سے واضح ہے کہ اسلام دہشت پسندی اور دہشت گردی کا روادار نہیں۔ فی الواقع اسلامی نظریۂ زندگی انسان کو ان تمام حیوانی میلانات، نفسیاتی الجھنوں اور معاشی کشمکش سے نجات دلاتا ہے۔

دہشت گردی ایک وحشیانہ فعل ہے اور اسلام کے تہذیبی نظام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں اسلام انسان کو صرف خدا کا خوف دلاتا ہے، لہٰذا وہ کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ لوگوں کو اپنا خوف دلائے اور انہیں خوفزدہ کر کے اپنے اغراض و مفادات حاصل کرے، معاشرے میں کشیدگی اور کشاکش اسلام کو گوارا نہیں، وہ ہر قسم کی کشمکش اور چپقلش ختم کر کے ایک پر امن ماحول میں افراد کے درمیان الفت و اخوت اور فلاحی کاموں میں اشتراک و تعاون کے مواقع پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ بندگانِ خدا یکسوئی کے ساتھ اپنی اور کائنات کی تخلیق کے مقاصد کی تکمیل میں بے روک ٹوک مشغول ہوں۔

باقی صفحہ ۱۲ پر

سید شہاب الدین
صدر آل انڈیا انصاف پارٹی

انصاف پارٹی

اس وقت پورے ملک میں آگ لگی ہوئی ہے یہ فرقہ پرستی کی، ہیجان انگیز آگ ہے لوگوں میں ہیجان برپا ہے، گاؤں گاؤں شیلا پوجا ہو رہی ہے۔ حکومت نے اپنے فرض کو نبھانے میں کوتاہی برتی ہے۔ یہ حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کشیدہ حالات یا کشیدگی پیدا ہونے والے رجحانات اور سرگرمیوں کو روکے۔ قانون کا تقاضہ یہی ہے وہ اس طرح کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگائے دیواروں پر جو شر انگیز نعرے لکھے جا رہے ہیں اشتعال انگیز نعروں کے ساتھ جلوس نکالے جا رہے ہیں ان کا سدباب کرے، حکومت اور حکومت کا قانون اسی لئے ہے۔ لا اینڈ آرڈر کا تقاضہ بھی ہے پولیس اور خفیہ پولیس پر حکومت کے بجٹ کا کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ آخر اس خرچ کا مصرف کیا ہے۔ امن و قانون کی سلامتی حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔

مگر یہ رہا ہے کہ شیلا پوجا کے ذریعہ پر امن ماحول کو پراگندہ کیا جا رہا ہے وشوا ہندو پریشد نے اس نئی پوجا کی ایجاد کی ہے۔ حالانکہ دوارکا کے شنکراچاریہ نے شیلا پوجا کی مخالفت کی ہے کہ اس سے ہندو مذہب کا کوئی تعلق نہیں 'شیلا پوجا کے ذریعہ وشوا ہندو پریشد نے بجرنگ دل کی مدد سے آر ایس ایس کے اشارے پر بی جے پی جیسی سیاسی پارٹیوں کے تعاون سے جان بوجھکر ہندوستان میں فرقہ پرستی کی آگ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے ہر گاؤں سے اس اشتعال انگیزی کے ساتھ جلوس نکلیں گے اور یہ اینٹیں جمع ہو کر ضلعوں میں پھر ریاستوں کے صدر مقام اور پھر وہاں سے اجودھیا کی طرف بڑھیں گے تو ایک ایسا اشتعال انگیز ماحول بنے گا کہ حکومت کو اس پر قابو پانا مشکل ہوگا۔ چونکہ یہ انتخابات کا موسم ہے اس لئے حکومت کی بھی

مصلحتیں ہیں یہ حکومت سے زیادہ حکمران پارٹی کانگریس کی سیاسی مصلحتیں ہیں۔ حکومت میں ہمت نہیں ہے کہ وہ اس پر پابندی لگا دے۔

مرکزی حکومت ہی نہیں بلکہ صوبائی حکومت بھی اور وہ حکومتیں بھی جہاں اپوزیشن کی حکومت ہے وہ اس حساس مسئلہ پر کوئی قانونی قدم نہیں اٹھا رہی ہیں۔ ان کی سیاسی مصلحتیں امن و قانون کی برقراری پر حاوی ہو جا رہی ہیں۔ چنانچہ آندھرا پردیش میں جہاں تلگو دیشم کی حکومت ہے اور چیف منسٹر این۔ ٹی راما راؤ نیشنل فرنٹ کے لیڈر ہیں وہاں بھی مختلف جماعتوں کی طرف سے شیلا پوجا پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے کہ رام شیلا کے نام سے ریاست میں جو پروگرام چل رہے ہیں اس سے ریاست میں ہیجان انگیز فضا پیدا ہو رہی ہے۔ اس پر فوری پابندی لگائی جائے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے قانونی اقدامات کئے جائیں۔

جن لوگوں نے جنتا پارٹی کو اسلئے توڑا تھا کہ آر۔ ایس۔ ایس کے سوال پر دوہری ممبرشپ ملک اور ریاست کے لئے خطرناک ہے ایسے ہی لوگ اب بی جے پی سے ہاتھ ملانے کے لئے بیتاب ہیں۔ جارج فرنانڈیز نے پٹنہ میں کہا کہ بی جے پی فرقہ پرست جماعت نہیں ہے جبکہ بی جے پی خود کہتی ہے کہ ہمارا آر ایس ایس سے تعلق ہے ہندو تنظیمیں چاہے وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلہ کا سیاسی استحصال کر رہی ہیں۔ الیکشن کو سامنے رکھکر ۹ نومبر کی تاریخ رکھی گئی ہے تاکہ حکومت کو بلیک میل کیا جاسکے۔ بی جے پی کے ایڈوانی یہ کہکر ہی کہ ہم موضوع نہیں بنائیں گے، اسے موضوع بنا رہے ہیں۔ میں ان کی بات کو منافقانہ اور ان کو بدنیت سمجھتا ہوں۔ پھر دلچسپ بات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم اسے ہندو کارڈ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں تو پھر ہم جو جی چاہے کریں گے۔ ہمارے جنتادل کے دوست اس کو جو چاہے تعبیر کریں۔ یہ حقیقت ہیکہ بی جے پی اس موضوع کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ انہوں نے اپنے منشور سے سیکولرزم کا لفظ بھی نکال دیا ہے۔ اب انہوں نے ہندوتو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ باجپئی نے کہا ہے راشٹر یہ ہیت (قومی مفاد) کا مطلب ہے ہندو ہت (ہندو مفاد) یہ تمام تنظیمیں بی۔ جے پی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل سب کی سب

آر ایس ایس کے پاس ہے۔ آر ایس ایس ۲۵۔۳۰ تنظیمیں چلاتی ہے، بی جے پی آر ایس ایس کا سیاسی ونگ ہے۔ بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد کا لڑاکو ٹولہ ہے۔ اب ان سب میں کوئی فرق نہیں۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

جنتا دل سے میرا اسی میں اختلاف ہے کہ وہ دوہری بات کہتے ہیں۔ انہیں سیدھے طور پر یہ کہنا چاہیئے کہ جہاں ہم کمزور ہیں اور خود کانگریس کو نہیں ہرا سکتے ہم وہ سیٹ چھوڑ دیتے ہیں۔ بی۔جے۔پی میدان میں اتر کر کانگریس کو ہرائے، اسی میں ہمارا فائدہ ہے، کیونکہ ہم کانگریس کو ہرانا چاہتے ہیں۔ جنتا دل والوں کے دل چور ہیں۔ وہ صرف سیٹوں کا سمجھوتہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ کچھ اور کر رہے ہیں۔ راجہ صاحب نے آج تک جو بھی کہا اس سے مکر گئے۔

آج صرف کانگریس ہی کو ہٹانے کا سوال نہیں ہے بلکہ فرقہ پرستی کو روکنے کا بھی مسئلہ ہے میری نظر میں سب سے بڑا مسئلہ ہندو لہر کا ہے۔ اگر یہاں ہندو راشٹر یہ بنا تو یہ ملک کبھی متحد نہیں رہے گا۔ اس ہندو لہر نے جارحانہ رخ اختیار کر لیا ہے، جو ملک کو فاشزم کے اندھیرے میں دھکیل دے گا۔ اگر ہم کو ملک کی حفاظت کرنا ہے تو ہمیں فاشزم کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا ہوگا۔ سیاست کے میدان میں جتنا ہو سکے گا میں پوری طاقت سے اس لہر کو روکنے کے لئے لگاؤں گا۔ اور بی جے پی کے امیدواروں کو ہرانے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ بی جے پی فرقہ پرستی کی علامت بن گئی ہے۔

ماضی میں اپوزیشن کے وہ لوگ جو سیکولر نظریات کو لیکر آگے بڑھتے تھے۔ آج الیکشن جیتنے کے لئے وہ بی جے پی اور شیو سینا سے سمجھوتہ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں افسوس کی بات ہیکہ انہوں نے بی جے پی اور شیو سینا کا دفاع کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بڑے شیطان سے لڑنے کے لئے چھوٹے شیطان کا سہارا لینا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھوٹا شیطان بھی ہمیں اور ہندوستان کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

قومی مورچہ میں باضابطہ ممبرشپ کی بات آئی تھی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہیکہ اس میں گن پریشد بھی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں میں نے گن پریشد جیسی فاشسٹ پارٹی کی قومی

صورت میں شمولیت کی مخالفت کی تھی۔ اگر کسی پارٹی میں شمولیت کا ہی مسئلہ ہوتا تو میں نے انصاف پارٹی بنائی ہی کیوں ؟ میں انصاف پارٹی کو کسی دوسری پارٹی میں ضم کرنا نہیں چاہتا۔ یہ الیکشن ایک سنگ میل ہے 'منزل نہیں ہے' انصاف پارٹی ہر حالت میں اپنا سیاسی تشخص اور وجود باقی رکھے گی۔ اگر مجھ کو جنتا دل میں شامل ہونا ہوتا تو میں ہراول دستے میں ہوتا۔ میرے سامنے زیادہ وسیع تر مفاد ہے۔

انصاف پارٹی کے سامنے یہ چار راستے ہیں کہ ▪ ہم ایک بھی امیدوار نہ کھڑا کریں اور جہاں جہاں ہمارے اثرات ہیں وہاں ہم سب سے بہتر امیدوار کی نشاندہی کریں جو اصولوں اور نظریات پر کھرا اترتا ہو۔ اور جو ہم سے وعدہ کرے کہ وہ اصول و نظریات کے معاملے میں اپنی پارٹی وہپ کی بھی پرواہ نہیں کرے گا اور زندہ ضمیر کا ثبوت دے گا۔

▪ ہم اپنی طاقت سے چند سیٹیں لڑیں اور منشور کی بنیاد پر لڑیں کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں بقیہ سیٹوں کے لئے پہلی پالیسی برقرار رکھیں۔

▪ ہم ان دو بڑے گروپ یعنی کانگریس آئی اور جنتا دل کسی ایک سے انتخابی سمجھوتہ کریں ایسی صورت میں ہی کچھ سیٹیں ضرور محفوظ ہو جائیں گی۔

▪ اگر ہمارا کسی سے سمجھوتہ ہو بھی گیا تو ہم اس معاہدہ کے پابند نہ ہوں گے جو وہ بی جے پی سے کریں گے کیونکہ ہماری نگاہ میں ہندو فرقہ پرستی کو شکست دینا ملک و ملت دونوں کیلئے ضروری ہے۔ سوائے بی جے پی کے میں ہر پارٹی سے بات کرنے تیار ہوں۔ سیاست امکانات کا نام ہے۔ میری پوری کوشش ہے کہ جنتا دل پر جو بی جے پی کا دباؤ ہے وہ ایک حد تک کم ہو جائے میری ارادہ عام ہے اس مسئلہ میں ان کی دعوت پر دو مرتبہ بات ہوئی ہے میں کسی کا دروازہ کھٹکھٹانے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ کانگریس پارٹی نے ہمارے ریزولوشن اور چارٹرس آف ڈیمانڈس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا ہے اور کانگریس کے کسی بڑے لیڈر نے ابھی تک انصاف پارٹی کی مذمت بھی نہیں کی ہے۔ میں چارٹرس آف ڈیمانڈ کی بنیاد پر بی جے پی کے سوا ہر پارٹی سے ہر وقت بات کرنے کو تیار ہوں۔

میں جنتا پارٹی اور کانشی رام کے بارے میں ایک قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں وہ با اقتدار پارٹی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ان دونوں نے کانگریس آئی سے سمجھوتہ کر لیا ہے تاکہ کانگریس سے برگشتہ ووٹ کو اپوزیشن کے نام پر حاصل کریں لیکن کانگریس کو فائدہ پہونچانے کے لئے حاصل کریں۔ آج ہریجنوں میں اتنی بیداری پیدا ہو چکی ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ کانگریس مخالف ہے جس طرح مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ مخالف ہے تو کوئی چھوٹی پارٹی اگر مسلمان یا ہریجن ووٹ اپنی طرف کھینچتی ہے جو کانگریس سے برگشتہ ہو کر اپوزیشن کے امیدوار کو جاتا ہے۔ اس لئے اس معنیٰ میں کانشی رام اور جنتا پارٹی دونوں ووٹ کھینچ کر کانگریس کے لئے بے اثر کر رہے ہیں۔

میں کبھی کانشی رام کے دروازے پر نہیں گیا۔ نہ خط لکھا، کانشی رام ہی خود دو تین سال ہوئے میرے گھر آئے تھے۔ وہ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں محکمہ دفاع کے ایک چھوٹے سے دفتر میں کلرک تھے۔ وہاں ان پر الزامات لگے اور نکالے گئے۔ اب کانگریس ان سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ میرے پاس بہت سے لوگ آئے اور آتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کانشی رام سے فوراً بات کرو، میں نے کہا کہ میں ہمیشہ ہر ایک سے بات کرنے کو تیار ہوں لیکن بات کی بنیاد کوئی پالیسی ہونا چاہیئے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کانشی رام کے یہاں سے ایک پالیسی یا بیان لے آئیے۔ جو وہ اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے بارے میں کرنا چاہتے ہیں مگر آنے والا پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ کانشی رام نے ایک انٹرویو میں کہا کہ میں جہاں جاتا ہوں شہاب الدین صاحب میرے پاس وفود بھیجتے ہیں۔ شہاب الدین نے مجھے سینکڑوں خطوط لکھے ہیں۔ وہ ہماری پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن ہم ان کو اپنی پارٹی میں نہیں لیں گے اس طرح سراسر جھوٹ بولتے ہیں۔

مسلم لیگ نے مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سکریٹری بنانے کی پیشکش کی تھی۔ خود مسلم مجلس نے بھی مجھے اپنا صدر بنانے کی پیشکش کی تھی۔ انہوں نے دہلی کنونشن کے ٹھیک تین دن پہلے یہ پیشکش کی تھی۔ مسلم لیگ نے کئی بار یہ پیشکش کی۔ مگر میں نے قبول نہیں کیا۔

بمبئی کے ایک بزرگ ہیں حاجی مستان مرزا، انہوں نے تو یہاں تک کہا کہ شہاب الدین

صاحب بڑے نالائق ہیں، قطعاً سیاست نہیں جانتے، لیکن اگر وہ ہماری پارٹی میں آجائیں اور ہماری قیادت قبول کرلیں تو میں ان کا خادم اور سپاہی بن جاؤں۔

میرے رخ کو کانگریس اچھی طرح جانتی ہے۔ پارلیمنٹ کے آخری دنوں میں میں نے اکیلے کانگریس کی ہر بات کا جواب دیا، چاہے وہ ٹھکر کی رپورٹ ہو۔ پنچایتی راج کا سوال ہو چاہے نہرو روزگار یوجنا کا مسئلہ ہو، ہریجنوں پر ہونے والے مظالم کا سوال ہو، چاہے وہ سری لنکا کا سوال ہو، میں اکیلا پارلیمنٹ میں بولتا رہا۔ ایک صحافی نے تو یہاں تک کہا کہ شہاب الدین صاحب تم مسلم فرقے کے واحد ترجمان بن گئے۔ جنتادل کے میرے پرانے ساتھیوں نے تو آکر مجھ سے کہا کہ شہاب الدین تم نے بہت اچھا کیا کہ پارلیمنٹ سے استعفیٰ نہیں دیا۔ بوفورس کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس تاریک سرنگ کے دہانے پر مجھے ایک شخص کا سرا پا نظر آرہا ہے، لیکن مجھے چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اسے پہچان نہیں سکتا۔ شائد ہندوستان کے عوام جن کے پاس پانچ ہزار سال کا عقل و سمجھ ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ کون ہے اور اسے وہ اگلے الیکشن میں ضرور سزا دیں گے۔ میں نے اشارہ کرکے چھوڑ دیا۔ لیکن جنرل کرشنا راؤ کے بیان کے بعد میں نے پہلی مرتبہ مطالبہ کیا کہ راجیو گاندھی ملک کو بتائیں یا اس عہدے سے استعفیٰ دے دیں۔ اس کے بعد آپ ہی بتائیں کہ راجیو گاندھی مجھے اپنے گلے سے لگانے کو تیار ہوں گے۔ معاہدہ اور مسائل کی بات اور ہے۔ بہرحال میرے لئے کانگریس پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

انصاف پارٹی کے پیش نظر تین نکات ہیں۔

۱۔ اقتدار کی غیر مرکوزیت (DECENTRALIZATION) تاکہ سماج کے ہر سیکشن کو اقتدار میں حصہ داری ملے، جہاں جہاں اقلیتیں اجنبی حیثیت رکھتی ہیں وہاں انہیں اقتدار میں مناسب نمائندگی کے لحاظ سے پورا حصہ ملے۔

۲۔ ہر گروہ کے تشخص کا احترام کیا جائے اس کی عزت نفس، تہذیب و معاشرت، تمدن و ثقافت کو تحفظ دیا جائے۔

۳۔ اقتصادی سطح پر دولت کی تقسیم میں سب کو حصہ رسدی منصفانہ طور پر ملے۔

ان مقاصد کے حصول کیلئے انصاف پارٹی صرف حصول اقتدار کی جدوجہد پر اپنی توانائی صرف کرنے کے بجائے ایک ایسی طاقتور لابی بنانا چاہتی ہے جو پورے ہندوستان کی سیاست پر اثر انداز ہو سکے منتخب نمائندوں میں اپنی پارٹی اور قیادت سے وفاداری کے بجائے ملک اور باشندگان ملک کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا احساس پیدا ہو۔ جبکہ وہ حقیقی نمائندے ہیں۔ باشندگانِ ملک کو اس کا بھی حق حاصل ہو کہ وہ اپنے نمائندوں کا احتساب کر سکیں۔

- انصاف پارٹی چاہتی ہے کہ

- سماج میں ایک منصفانہ ماحول پیدا ہو جس میں سکھ و شانتی ہو۔
- سیکولر قدروں کو بچانے بڑھاوا دینے اور ان کے تحفظ کے لئے جدوجہد کی جائے۔
- ظلم کے خلاف مظلوم کی حمایت میں مظلومین اور محرومین پسماندہ کمزور بچھڑے ہوئے طبقات، بزجن گرجن' دلت شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب اور تمام مذہبی لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کو ساتھ لیکر سنگھرش کیا جائے۔
- ان سب کے درد کو بانٹ کر' سہارا دیکر اور سہارا لے کر مشترک دشمن کے خلاف جہاد کیا جائے۔
- مظلوموں کے زخموں کو سینے کی کوشش کی جائے چاہے وہ احساس عدم تحفظ جسمانی ہو مالی ہو۔ ثقافتی ہو اقتصادی ہو یا مذہبی اور تہذیبی ہو۔
- ہندوستان کے تمام مظلوم مل کر اپنی قسمت کا فیصلہ کریں۔ ■■

سلسلہ صفحہ ۳۱

بلکہ سارے ملک میں اردو اور ہندی والے عوام اور دانشور ایک ساتھ ہو کر جدوجہد کریں اور دیگر زبانوں کے سنجیدہ حضرات کو ساتھ لیں۔ اس کے بعد میں آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سلسلہ صفحہ ۳۲

میں مدارس اور طلبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں بعض کا شمار صف اول کے قومی رہنما کی صف میں کیا جاتا ہے۔ لالہ لاجپت رائے، بھائی پرمانند اور مولوی عطا اللہ کا نام اپنے آپ زبان پر آجاتا ہے نئی تعلیمی پالیسی اور ۱۵ نکاتی پروگرام نے اقلیتوں کے تعلیمی پروگراموں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

سید یٰسین سیٹھ
صدر آندھرا پردیش اردو ہندی منچ

اردو ہندی منچ

[۱۷ اکتوبر ۸۹ء کو گورنر آندھرا پردیش شریمتی کمود بین جوشی نے اردو ہندی منچ کا حیدرآباد میں افتتاح کیا۔ صدر منچ جناب سید یٰسین سیٹھ نے جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ اُسے قارئین "شاداب" کیلئے پیش ہے۔]

اردو ہندی کے متوالو، دانشورو اور بھائیو بہنو اردو ہندی منچ کی جانب سے آپ سب کا دلی
مقدم اور ہاردک سواگت کرتے ہوئے ہمیں بڑی خوشی، مسرت اور ہرشا ہو رہی ہے۔
صرف ۳ ماہ پہلے کی بات ہے - حیدرآباد کے معززین، ادیبوں شاعروں، اور صحیفہ نگاروں
بلے مخصوص لیکن نمائندہ اجتماع میں آندھرا پردیش میں خاص طور پر اردو اور ہندی کے موجودہ
ن، مطالبات اور مسائل پر تفصیل کے ساتھ غور کیا گیا اور اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ آندھرا
یش میں اگر اردو اور ہندی کے مسائل کی یکسوئی چاہیئے تو ضروری ہے کہ اردو اور ہندی کے پرخلوص
رنے والے ادیبوں، شاعروں اور صحیفہ نگاروں کو ایک دل، ایک ذہن اور ایک خیال و ہم خیال
ر آگے آنا ہوگا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اجتماع نے ممتاز صحافی جناب علاؤ الدین سلیم
ریونز ٹرسٹ آف انڈیا کی اس تجویز کو متفقہ طور پر منظور کر لیا اور اس طرح سے "آندھرا پردیش
ہندی منچ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور ہماری ہر دلعزیز قائد و دستوری سربراہ محترمہ
بین جوشی صاحبہ گورنر آندھرا پردیش سے ہم نے مشترکہ درخواست کی کہ وہ اپنے کرکملوں
: ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی لسانی یکجہتی (Linguistic Integration)
ی اردو ہندی منچ کا ادگھاٹن کریں۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ گورنر صاحبہ نے

ازراہ مہربانی منچ کا افتتاح کرنا قبول کرلیا۔

بھائیو اور بہنو

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہندی تو ہماری راشٹر بھاشا "قومی زبان" اور رابطہ کی زبان ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اردو بھی حیثیت ہندستانی زبان ہے اور عوامی رابطہ کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ فلموں اور مشاعروں نے تو اسے اور بھی زیادہ لوک پریہ اور مقبول عام بنایا ہے۔ بنیادی طور پر ان دونوں عظیم زبانوں میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ جو کچھ بھی آزادی کے بعد تھا وہ اب آہستہ آہستہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ فاصلے، قربت میں بدل رہے ہیں۔ تنگ نظری کی جگہ فراخدلی نے لے لی ہے۔ ریڈیو اور دوردرشن پر اب زبان صاف ہو رہی ہے۔ کڑواہٹ کی جگہ رس گھولتا نظر آ رہا ہے۔ لبوں کی تلخی، شیرینی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور نوجوان نسل، جو ۱۹۴۷ء کی اس وقت کی برگشتہ برہم ادھیڑ نسل سے بہت مختلف، معاملہ فہم اور صلح کن ہونے کے علاوہ، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، کے مانند ہے۔ مسائل کو حل کرنے اردو اور ہندی کو ساتھ ساتھ آگے بڑھانے اور ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کرنے میں یقین رکھتی ہوئی آگے نکل آئی ہے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ نوجوان نسل کو زیادہ سے زیادہ منچ میں برا جاجائے

محترمہ گورنر صاحبہ!

میں اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے یہاں پر مختصر سے وقت میں عرض کرنا چاہوں گا کہ ریاستی سرکار ایک طرف اردو اور ہندی کی ترقی کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کیا کرتی ہیں لیکن عمل الٹا ہی ہے خود چیف منسٹر صاحب نے یہاں تک کہ اسمبلی میں یقین دلایا کہ اردو کے بارے میں جس قدر بھی جی۔ او جاری کئے گئے ہیں انہیں یکجا کرکے زیادہ موثر جی۔ او نکالا جائے گا۔ لیکن جو جی او بڑے مطالبات کے بعد نکلا وہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے مترادف ہی ہے۔ سرکار نے کہا کہ اردو، دوسری سرکاری زبان بنائی جائے گی۔ لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہندی کے ساتھ بھی سرکار کا رویہ نہایت تکلیف دہ ہے۔ ہندی کی تعلیم کا آٹھویں جماعت سے شروع کیا جانا، آیا ہندی دشمنی نہیں ہے۔ ہندی جو ہمارے ملک کی راشٹر بھاشا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آندھرا پردیش سرکار، ٹاملناڈو کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تو بطور خاص آندھرا پردیش

باقی صفحہ ۲۹ پر

کے۔ کے۔ کھلر

نئی تعلیمی پالیسی

اقلیتیں اور ۱۵ نکاتی پروگرام

نئی تعلیمی پالیسی کو پارلیمنٹ نے مئی ۱۹۸۶ء میں منظوری دی۔ لیکن اقلیتوں کے لئے سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹۸۳ء میں پندرہ نکاتی پروگرام کا اعلان کر دیا تھا۔ چونکہ ہمارے ملک میں اقلیتوں کا بہت بھاری حصہ اقتصادی سماجی اور تعلیمی پسماندگی کا شکار رہا ہے اس لئے انکی حالت کو بہتر بنانے کیلئے حکومت کی طرف سے متواتر کوشش کی جاتی رہی ہے اور انہیں ایسے مواقع فراہم کرنے کا آئینی طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ برابری کی سطح پر آجائیں۔ پندرہ نکاتی پروگرام اقلیتوں کے لئے میگنا کارٹا (MAGNA CARTA) کی حیثیت رکھتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں ۱۵ نکاتی پروگرام کے تعلیمی نکات بھی شامل ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی نے اس امر کو مان لیا ہے کہ کچھ اقلیتی گروپ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ یا تعلیم سے قطعی محروم ہیں۔ مساوات اور سماجی انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے ان گروپوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ اس میں فطری طور پر آئین میں دی گئی ضمانتیں بھی شامل ہیں جنکی مدد سے وہ اپنے تعلیمی ادارے نہ صرف قائم کر سکتے ہیں بلکہ ان کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی زبانوں اور ثقافت کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ درسی کتابوں کی تیاری اور اسکول کی سبھی سرگرمیوں میں معروضیت کا عکس نئی تعلیمی پالیسی کا حصہ ہے۔ ایک ایسی ایک جہتی کو فروغ دینے کے لئے تمام ممکن اقدام کے جارہے ہیں۔ جو مرکزی نصاب تعلیم کی مطابقت میں مشترکہ قومی مقاصد اور آدرشوں کی قدر شناسی پر مبنی ہیں۔ کارروائی پروگرام کا چودھواں باب اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ ۱۵ نکاتی پروگرام کے تحت تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پروگرام کے گیارہویں اور بارہویں نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ان نکات میں تعلیمی طور پر اقلیتوں کے لئے تعلیمی جماعتیں شروع کرنے کے لئے ہدایت ہے۔

جن سے انہیں سرکاری ملازمتوں، قومی ملکیت کے بنکوں اور سرکاری سیکٹر کے اداروں میں بھرتی کیلئے
متعدد مقابلے کے انتخابات میں بیٹھنے کے لئے تیار کیا جا سکے۔ ان نکات میں ایسے علاقوں میں جہاں
قلیتیں بڑی تعداد میں آباد ہیں صنعتی تربیتی ادارے یعنی آئی ٹی۔ آئی اور پالی ٹیکنک ادارے کھولنے
ر خصوصی پروگراموں کے ذریعہ تکنیکی مہارت کا اہتمام کرنے کے لئے بھی زور دیا گیا ہے۔ تکنیکی مہارت
لیتوں کی ترقی کا پروگرام اس امر پر مبنی ہے کہ ملک میں ایک ایسے سماج کی تعمیر نو ہو جو سیکولرزم اور
مقاصدی برابری پر مبنی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی ملک کا تہذیبی معیار اس بات سے معلوم کیا
سکتا ہے کہ وہ اپنی اقلیتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ کس ہمدردی کے ساتھ اس پروگرام
عمل میں لاتا ہے۔ پروگرام کے بارہویں نکتے کے مطابق اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ ۲۰ نکاتی پروگرام
میت تمام ترقیاتی پروگراموں سے حاصل ہونے والے فوائد میں اقلیتوں کو منصفانہ اور موزوں حصہ ملے۔
۱۷ نکاتی پروگرام ساتویں یوجنا کا حصہ ہے۔ وزارت ترقی انسانی وسائل نے ۱۵ نکاتی پروگرام
بحت دو اسکیمیں بنائی ہیں ایک ہے کمیونٹی پالی ٹیکنک (COMMUNITY POLYTECHNIC)
ر دوسری ہے اسپشل کوچنگ اسکیم (SPECIAL COACHING SCHEME) جو یونیورسٹی گرانٹ
یشن (U.G.C) چلاتا ہے۔ اس وقت اقلیتی فرقوں کے کمزور طبقوں کو تعلیمی اعتبار سے
بہتر بنانے کے لئے ۳۰ یونیورسٹیوں اور ۱۵ کالجوں میں یہ اسکیم چل رہی ہے۔ اس اسکیم کے نتائج
جانچ شعبہ تعلیم کر رہا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ کے تحت ایک کارروائی یوجنا بنائی گئی ہے۔ اس ایکشن پلان میں
قلیتوں کی تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے ٹھوس اقدام اٹھائے گئے ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں
ا طرف سے چلائے جانے والے اسکولوں کے اساتذہ کے لئے سائنس ریاضی اور انگریزی میں عرصہ
زمت کے درمیان تربیت اور کیریئر (CAREER) کی رہنمائی پر زور دیا گیا ہے۔ اقلیتی ہائر سکنڈری
سکولوں میں پیشہ وارانہ تعلیم کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ ان پڑھ بالغوں کو تعلیم دینے کا خاص پروگرام
میں آچکا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور ہوسٹل قائم کئے جانے کا اہتمام بھی شامل ہے۔
زور طبقوں کے لئے وظیفوں کا انتظام کیا گیا [illegible] پالی ٹیکنک ہیں جن میں ۱۰۰ کے قریب کمیونٹی
پالی ٹیکنک ہیں اور ۲ ایسے پالی ٹکنک ہیں جو ایسی جگہ پر واقع ہیں جہاں اقلیتیں بڑی تعداد میں آباد ہیں

اور ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں ۔ جیسے علی گڑھ، مرادآباد، اورنگ آباد، دہلی اور لکھنؤ وغیرہ۔

اس کارروائی یوجنا میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ جن علاقوں میں اقلیتوں کے دستکار بڑی تعداد میں آباد ہیں وہاں دستکاری کے تربیتی مراکز قائم کئے جائیں جن میں ۸۰ فیصد نشستیں دستکاروں کے بچوں کے لئے ریزرو ہوں۔

کوشش یہ ہے کہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں کوئی بچہ اسکول سے باہر نہ رہے۔ کوئی بالغ ان پڑھ نہ ہو۔ کوئی شخص بیروزگار نہ ہو ۔ بیمار نہ ہو، مایوسی، خاموشی اور گھٹن کی زندگی کا خاتمہ ہو ۔ اکثریت اور اقلیت دونوں شانہ بشانہ اپنے ملک کی بہبود اور ترقی میں جٹ جائیں تاکہ جب اکیسویں صدی کا آغاز ہو تو تعلیمی اعتبار سے ہر ہندوستانی اپنا سر فخر سے اونچا کرسکے ایک اور پروگرام جس پر زور دیا جارہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقلیتیں رضاکارانہ انجمنیں بنائیں جو بے خبر لاعلم اور بیروزگار لوگوں کی گورنمنٹ کے ترقیاتی پروگراموں سے واقفیت کرائیں ۔ لوگوں کو بتائیں کہ تعلیم ایک نایاب سرمایہ ہے۔ ایک ایسا چشمہ ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے تعلیم ہی اس امر کو ممکن بنائے گی کہ اقلیتوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جائے ۔ یہ رضاکار ایجنسیاں اقلیتی امیدواروں کو ملازمتیں حاصل کرنے میں مدد دیں ۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے حالانکہ یہ شاندار زبان سارے ملک کی ہے لیکن کچھ وجوہات کی وجہ سے اقلیتی شکل اختیار کرچکی ہے۔ حکومت ہند نے اردو کے فروغ کے لئے ترقی اردو بیورو ۱۹۶۹ء میں قائم کیا۔ اس بیورو نے پانچ سو سے زیادہ کتابیں چھاپی ہیں۔

اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغتیں تیار ہوچکی ہیں ۔ URDU ENCYCLOPAEDIA طباعت کے لئے جارہا ہے ۔ تیس سے زیادہ کتابت سکھانے کے مراکز ہندوستان کے مختلف اردو مراکز میں کام کررہے ہیں ۔ کچھ مراکز صرف لڑکیوں کے لئے ہیں ۔ NCERT کی درسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرکے اردو بیورو نے کافی تعداد میں کتابیں چھاپی ہیں ۔ اردو سکھانے کیلئے CORRESPONDENCE COURSES بھی شروع ہوچکے ہیں ۔ آخر میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دینی تعلیم اور سیکولر تعلیم دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ اصلیت تو یہ ہے کہ مذہب سے وابستگی وطن سے وابستگی کو کمزور نہیں کرتی بلکہ تقویت پہنچاتی ہے ۔ مولانا آزاد نے اور گاندھی جی نے جنگ آزادی میں شرکت کو ہندوستانیوں کا ایک مذہبی فرض قرار دیا تھا اس احساس کے تحت آزادی کی جدوجہد

باقی صفحہ ۲۰ پر

قدرت اللہ شہاب

پکھیاخ کے بارے میں

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب میں کراچی پہنچا تو چاروں طرف سے لٹے پٹے
بھٹکے مہاجرین کا ایک سیلاب عظیم پاکستان میں امڈا چلا آرہا تھا۔ ان ہی کہیں میرا
نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچوں سمیت بھی شامل تھا۔ وہ کئی ماہ پہلے مشرقی
پنجاب کے گاؤں چکور صاحب سے کسی قافلے میں روانہ ہوا تھا۔ اور ہمیں کچھ معلوم نہ
تھا کہ وہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر پہنچا بھی ہے تو کہاں
ہے؟

اس عزیز کی تلاش میں میں نے ایک ایک کرکے تقریباً تمام مہاجرین کیمپوں کا بڑا
تفصیلی جائزہ لیا۔ ہجرت کا اصل اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس تجربے سے
گزرتے ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر یا دفتروں کی چار دیواری میں اعداد و شمار کے گوشوارے
بنا کر یا جلسوں اور جلوسوں میں دھواں دھار تقریریں سن کر ہجرت کا مفہوم سمجھ میں
نہیں آسکتا ہے۔ اور نہ ہی مہاجر قافلوں میں سسکتے ہوئے، تڑپتے ہوئے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے
بلوائیوں اور بیراگیوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے مہاجرین کی داستان پوری طرح
سمجھی جا سکتی ہے۔

اپنی اس تلاش کے دوران ظلم بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے ہوئے
لاکھوں مہاجرین میری نظر کے سامنے سے گزرے۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں

میں بچے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی، درجنوں نے تڑپ تڑپ کر دلدوز چیخ کرتے کرتے مجھے اپنی بپتا بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کرب ناک مجموعی شاہد نے اندر ہی اندر سلگ سلگ کر آخر ایک روز دلشاد کا روپ دھار لیا، ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فر فر تک ایک ہی نشست میں "یا خدا" کی کہانی مکمل کر چکا تھا۔

یہ طویل افسانہ سب سے پہلے "نیا دور" کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا اس کے بعد احباب کا اصرار ہوا کہ ناولٹ کے طور پر اسے کتابی صورت میں بھی ضرور چھپنا چاہئے۔ محترمہ ممتاز شیریں مرحومہ نے ایک دیباچہ تحریر فرما دیا اور "یا خدا" کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ عام قاری کو یہ اتنا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پے در پے ایڈیشن نکل گئے۔ لاہور کے ایک پبلیشر نے اس ناولٹ کا نام "یا خدا" کی جگہ "آزادی کے بعد" رکھ کر بھی کچھ کاروبار کیا!

یا خدا کی کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند مصنفین کی صف میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی مہینوں تک بڑے بڑے مقتدر رسالوں میں اس کے خلاف خوب لمبے لمبے تنقیدی مضامین آتے رہے۔ میں نے کسی تنقید کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ مجھے یقین تھا، کہ یہ نقاد اگر حق بجانب ہیں تو یہ کہانی بہت جلد مردہ ہو کر دفن ہو جائے گی لیکن۔ پچھلے ۲۷ سال سے ایسا نہیں ہوا مخالفانہ تنقید کسی کو بھی یاد نہیں۔ البتہ "یا خدا" کے ایڈیشن پر ایڈیشن باقاعدہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں یہ اللہ کا فضل اور پڑھنے والوں کا کرم ہے۔

آج کل کالجوں کے نوجوان طلبہ کے کچھ طبقوں میں یہ کتاب خاص طور پر پسند کی جا رہی ہے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں "یا خدا" کی جلدوں پر میرا آٹوگراف لینے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حیرت سے یہ سوال پوچھتے رہتے ہیں۔ "کیا واقعی ہمارا وطن ایسے واقعات سے گذرا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو دوسرے ادیب کیوں نہیں لکھتے؟ وغیرہ وغیرہ۔

"یا خدا کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالنے کے لئے میں یہاں پر تین دستاویزات کی نقول درج کر رہا ہوں۔

اوّل :- محمد حسن عسکری کا خط مورخہ ۲۰/جولائی ۱۹۴۸ء بنام محترمہ ممتاز شیریں

دوم :- اگست ۱۹۵۰ء کے ادبِ لطیف لاہور میں ابوالفضل صدیقی کا مضمون بعنوان "یا خدا" اور اس کا دیباچہ

سوم :- "نوائے وقت" کے ایک نوجوان صحافی اظہر سہیل کے تاثرات جو لاہور، راولپنڈی، ملتان اور کراچی کے میگزین سیکشن ۲۹/مارچ تا ۴/اپریل ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے۔

کچھ یا خدا کے بارے میں
محمد حسن عسکری کا خط

ممتاز شیریں کے نام
معرفت مکتبہ جدید انارکلی لاہور
۲۰/ جولائی ۱۹۴۸ء

محترمہ آداب

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے میں نے اسی وقت قدرت اللہ شہاب کی کتاب "یا خدا" پڑھ کر ختم کی ہے، سب سے پہلے تو میں آپ کو ایسا دیباچہ لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے بڑے بے لاگ طریقے سے، اور بالکل بے جھجک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے جس طرح فسادات کا تعلق انسانوں کا تجزیہ کیا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ قدرت اللہ شہاب کا افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا میں تو کہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر پاکستانی کے گھر ہونی چاہیئے۔ اگر شہاب صاحب پسند کریں تو میری یہ رائے اپنی کتاب کے اشتہار میں دے دیں۔ شہاب صاحب ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے غیروں کے مظالم کو دکھاتے ہیں اتنا وقت صرف نہیں کیا جتنا اپنوں کے مظالم پر۔ کتاب کا تیسرا قصہ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ باا‌ثر ہے۔ خصوصاً آخری سین کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔

کچھ "یا خدا" کے بارے میں

"یا خدا" اور اس کا دیباچہ

ابوالفضل صدیقی

بیدی، کرشن چندر، عصمت اور دو ایک نام اس فہرست میں اور اضافہ کر لیجیے۔ جنہوں نے اردو افسانہ نگاری میں انفرادیت کی گہری چھاپ لگائی اور بے پناہ فکر و استعداد سے پیچھے آنے والے ادیبوں کو اس طرح متاثر کیا کہ ۴۷ء کے بعد ہر نیا ادیب ان ہی افسانہ نگاروں کی دنیا میں کھو کر رہ گیا۔ کرشن چندر ان کے بعد آہستہ آہستہ انحطاط کی جانب مائل ہونے لگے۔ بیدی نے ادب کو کمہار کا شغل بنا لیا اور عصمت جنس سے نکل کر جب مزدوروں اور کسانوں کی دنیا میں آئیں تو اپنے پیچھے چلنے والوں سے بھی پیچھے رہ گئیں۔ جب ہمارے ادب کا یہ حال ہو تو ایسی صورت میں جب کوئی بت شکن اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر خواہ بڑے پجاری اور پرانے بت کتنے ہی خفا اور جز بز کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک تماشائی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت اللہ شہاب ۴۷ء کے بعد کا ایک بہت بڑا بت شکن ہے جس نے اپنے افسانوں سے صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ بتوں اور پجاریوں کی صفوں میں ایک عجیب انتشار سا بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس کا آخری افسانہ "یا خدا" تو اس منزل کا سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر ہمیں نہ معلوم کتنے لات و منات اور قدیم پجاریوں کو تلملاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانہ پر لوگوں کی برہمی کا اظہار دیکھا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں غلط طور پر اس سے متاثر ہو گیا ہوں اور تقاضائے بشریت کے تحت جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں اور افسانہ کے موضوع کی سنگین قسم کی رنگینی میں گم ہو کر اسے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں بہترین خیال کرنے لگا ہوں۔ لیکن آج پھر ایک بار بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف میرا پہلا خیال صحیح ہی تھا بلکہ دوبارہ مخصوص نظر سے پڑھنے کے بعد میری رائے واضح تر ہو گئی اور نہ صرف رائے واضح تر ہو گئی بلکہ مجھے اس میں چند خوبیاں ایسی نظر آئیں جو پہلے مطالعہ میں نگاہ نہ پہنچی تھی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی برہمی کے پردے میں کچھ اور ہے جس کی تشریح

کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ "یا خدا" پھر بھی کیوں؟ جب سجاد ظہیر
اور احمد علی انگارے میں پرانی اقدار پر چوٹ کرتے ہیں۔ جب کرشن چندر
بڑے بڑے ان داتاؤں کی زراق کا بھانڈا پھوڑتا ہے۔ جب عصمت لحاف
موٹا پردہ چاک کرتی ہے اور منٹو ادبی لبھی کے بوہ کنڈے دھواں اٹھا
ہے تو آپ انہیں بڑا فن کار مان لیتے ہیں حالانکہ ان ہی افسانوں پر ایک فا
اسکول کے افراد تلملا اٹھتے ہیں۔ لیکن جب قدرت اللہ شہاب عریب' سڑے گلے سم
کے رستے ناسوروں اور میرومی سیاست کے گینگرینوں [Gangrenes] کر
پٹیاں ہٹا کر نقاب کشائی کرتا ہے تو وہ مقاب قسم کے لوگ بھی بگڑ جاتے ہیں جن
دعویٰ ہے کہ وہ سورج جیسی حقیقت سے بھی آنکھیں چار کرنے کی تاب رکھتے
ہیں۔ فنکار چند بندھے ٹکے ریاضیاتی فارمولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ ا
وہ ایک فن کار ہے۔ اور سچا فن کار تو اسے براہِ راست زندگی اور اس کی تہہ
میں داخل ہونا پڑے گا اگر وہ صرف اخبار کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر اپنے قار
کی مدد سے "تقسیم اور ضرب" اور "ضرب" اور "تقسیم" کا عمل کرے گا۔ تو چاہے بس ا
کچھ اور کہہ لیں لیکن وہ "فن کار نہیں ہے" اور ترقی پسند ادیب تو بالکل نہیں
ہے۔ کیونکہ ترقی پسند مصلحت کے قائل نہیں۔ یہاں زخموں پر پردہ نہیں ڈا
یہاں پھوڑوں کو دبایا نہیں جاتا۔ وہ انہیں عریاں کرتا ہے۔ خواہ سیاست
مصلحت اندیشی، بے حسی اور کراہت ہی کیوں نہ ہو۔ حقیقی معنوں میں ترقی پسند فنکار
ایک ماہر سرجن کی طرح "چیر" سے نشتر لگا دیتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب پر جو نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں وہ تعصب
سمجھتا ہوں، جسے ادب کو تو بالکل ہوا ہی نہیں لگی۔ البتہ اس میں نہایت گر
قسم کی سیاسی دور اندیشی کے نشانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر جب یہ تنقید
والے اپنی ان تنقیدوں کے [illegible] پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر
داستان گوئی کے عشرت خانے سے نکل کر تنقید کے میدان میں آنے کو جی چاہتا
ہے ایک ایسا قلم ہاتھ میں لے کر جو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو اور جو اس غلیظ

کا خاتمہ کر دے۔ میں ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہوں۔ تخلیقی ادب کی میرے نزدیک اہمیت بھی زیادہ ہے اس لئے نہ تنقید کو میں ادبی مشغلہ بنا سکتا ہوں اور نہ ہی پرانے ادیب و شاعر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجارہ داری کا بوجھ میرے نحیف شانے سنبھال سکتے ہیں۔ اس لئے میں قدرت اللہ شہاب کے کہنے والوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر قدرت اللہ شہاب کے بارے میں چند باتیں کہنی نہایت ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ میری ادبی ایمانداری اور فنی خلوص بار بار مجھے اکسا رہا ہے کہ اس ہنگامہ میں جبکہ سیاہ و سفید کی تمیز دنیا کے کسی شعبہ میں باقی نہیں رہ گئی تو کم سے کم ادب کے چشمہ کی صاف پھواروں کو ہر قسم کی آمیزش سے بچانا ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی فرض ہے اور ایسے موقع پر چپ بیٹھے رہنا بھی ایک بڑا فنی جرم ہے۔

سب سے پہلی چیز تو ہمیں شہاب کے یہاں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کی شخصیت ہمارے سامنے مکمل طور پر ابھر کر آجاتی ہے اور افسانہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے اور یہی ایک چیز ہے جس نے شہاب کو نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور ایک حساس شاعر کے ساتھ ایک منفرد انشا پرداز بھی بنا دیا اور مجموعی طور وہ ایشیا کا ایک عظیم فن کار ہے جس کے پاس گھلاوٹ اور شیرینی کے خوشگوار گھونٹ ہیں۔ جس کی آستینوں میں طنز و تشنیع کے تیز نشتر اور مسموم پیکاں ہیں جو دستاویز پر یا تکیے اور تیکھے پن کے رنگین فقرے لہرا رہے ہیں اور اس لہجہ تمام چیزیں ان تمام افسانہ نگاروں سے ممیز کرتی ہے جو سپاٹ اور بے جان طریقہ سے ایک "اچھی بات" کو پیش کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہیں۔ "اچھی بات" کا تو میں بھی قائل ہوں لیکن اچھی بات اچھے طریقے پیش نہ کرنا بھی "بڑی بات" سے کم نہیں۔ موضوع اور طرز اظہار کا جسم و روح والا رشتہ ہے اور وہ بھی خوشگوار تناسب کے ساتھ۔ موضوع اور فن کو جن ادیبوں نے صحیح طور پر جانا ہے ان میں یہ نوجوان افسانہ نگار بھی ہے۔

قدرت اللہ شہاب اپنے افسانے کے کرداروں کو ہم پہ مسلط کر کے ہمیں متاثر نہیں کرتا بلکہ افسانے کے کرداروں سے زیادہ اس کا طرز ادا خود افسانہ نگار کی شخصیت کو ہم پر سوار کر دیتا ہے۔ یہ ہے کچھ عجیب سا پہلو، شہاب کی بے پناہ فنکاری کا اور اس مخصوص صفت میں ہمیں دور موجودہ میں اپنی صف میں صرف وہ ہی تنہا نظر آتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانے پڑھتے وقت ہم خود کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ذہنی طور پر ہی نہیں مرئی مادی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہاب ہمارے گلے میں باہیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لیے پھر رہا ہے۔

میں نے جب شہاب کے افسانے پڑھے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار زبردست لاشعوری جرات اور خداداد بے باکی کا حامل ہے اور اپنی انگلیوں میں داؤدی معجزہ لے کر آیا ہے۔ جو لوہے کو موم کی طرح گوندھ کر اپنی مرضی کے مطابق زنجیر تشکیل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لیے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں حسن و رعنائی کے بجائے کوڑھ کے بدنما داغ ہیں، روحانی جذام اور جسمانی جذام کی بہتی ہوئی پیپ جس پر مکھیوں کے چھتے بھنبھناتے ہیں۔ افلاس کی سیاہیوں نے پاؤں پھیلائے اور گناہوں کی تاریکیوں کی اندھیریاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت نازک مقام ہے اور جب ایک افسانہ نگار ان چیزوں کو اپنے یہاں جگہ دیتا ہے اسے چاق و چوبند ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور کام میں لا کر افسانہ لکھنا پڑتا ہے کہ موضوع کی غیر شعوریت اور بے رنگی جو کرداروں اور ماحول کی کراہیتوں کی صورت قاری کے سامنے آ کر سرے سے انہیں پڑھنے سے روکتی ہے چہ جائیکہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے اور میں بھی شہاب کے افسانے ہرگز نہ پڑھتا اگر ان میں بے پناہ خلوص اور اسٹائل میں غضب کی جان نہ ہوتی۔ اس تاریک دنیا کو شہاب کے جاندار اسٹائل نے اور اس پر خلوص طرز بیان نے اس قدر روشن اور گورا بنا دیا ہے کہ بے اختیار شہاب سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اب کچھ "یا خدا" کے متعلق! شہاب کا یہ افسانہ صرف اس کے پچھلے تمام افسانوں میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ بلکہ اس کا شمار زبان اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح قحط بنگال کے افسانوں میں کرشن چندر کا افسانہ "ان داتا" سب سے زیادہ بھرپور اور موثر افسانہ ہے۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں ہے۔ "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ حقیقت نگاری اور ایسی شدید روح ملتی ہے کہ بعض مصلحت اندیش لکھنے والے اس پر ارتداد کا فتویٰ صادر کر بیٹھے۔ اپنی عمر میں بہت محدود سے چند چیزوں سے قاری انتہائی متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان میں ایک "یا خدا" بھی ہے۔

لیکن جب ظہیر بابر اور مجتبیٰ حسین کے مضامین دیکھے تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں میں غلط راہ پر تو نہیں جا پڑا ہوں۔ جذبات کی رو میں کہیں رجعت پسندی کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں لیکن جب میں نے "یا خدا" کا دیباچہ اور یہ مضامین پڑھے تو یہ محسوس کیا کہ ان مضامین اور دیباچہ کو "یا خدا" سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ دیباچہ میں "یا خدا" کے متعلق کہنے کے بجائے کچھ اور کہا گیا ہے اور مضامین میں "یا خدا" سے زیادہ دیباچہ پر بحث کی گئی ہے اور اصل مصنف سے زیادہ دیباچہ نگار پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب بیچارے ایک جانب سے آلۂ کار رہیں اور دوسری جانب سے چکّی کے دو پاٹوں کے بیچ ساتھ گھن بن کر پیسے گئے ہیں اور ان پر کس اور جذبے کے تحت تیر و نشتر چلائے گئے اور اس بے مثال افسانہ میں فرقہ پرستی کے ناپاک جراثیم تلاش کئے گئے ہیں۔ اس [illegible] افسانہ کا تجزیہ دیکھ کر پہلی نظر میں ضرور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں چالاک سیاست دان کی طرح ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے پیش کرنے والے کے خلوص میں مجھے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ فنکار کے قلم نے صرف احساسات کی عکاسی کی ہے جو ایک مخصوص ماحول میں، ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کردار سے وابستہ ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ان میں ظالم و مظلوم کی تمیز اکثر نہیں تھی۔ ظالم ادھر بھی تھے اور ظالم ادھر بھی اور جانبین میں سے کسی ایک کی بھی یہ منطق ظلم کے لئے جواز نہیں ہو سکتی کہ پہلے اقدام کس کی جانب سے ہوا۔ ہر ہر مہادیو اور نعرہ و تکبیر کے نعروں اور [illegible] وہ مظلوم تھے جنہیں الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایک ماحول کا مصنف صرف اپنے فرقے اپنے ماحول کے مظلوموں کی عکاسی محنت نیت کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ اس کے ماحول کے حدود کے باہر مظلوم ہیں ہی نہیں۔ ترقی پسند نقطۂ نظر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو اس بات کے پیش نظر جانچیں کہ آیا فنکار کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے یا اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کسی بھی بات سے چشم پوشی تو نہیں کر رہا ہے اور اس تصویر کے پیش کرنے میں کہیں افراط و تفریط سے تو کام نہیں لے رہا ہے۔ شہاب کے افسانے کو پڑھ کر جو لوگ اس میں فرقہ واریت کے کیڑے دیکھتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حقیقت کو پیش کر دینے سے خواہ لوگوں کے کھڑے ہو جائیں یا حلق کڑوے ہو جائیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہے اور اس کی تلخی یا ترشی مسلم اسے شیریں بنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ "یا خدا" میں صرف ان لوگوں کو فرقہ پرستی کے کیڑے ملتے ہیں جو یا تو مصلحت اندیش ہیں یا پھر جو ان فسادات میں آگ اور خون کی دنیا سے بہت دور بیٹھے صرف پیپرز کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے اور رائیں قائم کرتے رہے۔

"یا خدا" کے مصنف کا سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندو یا سکھ سے من حیث القوم نفرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا بلکہ خنجر بھونکنے والے سے زیادہ خنجر بھونکنے کے عمل اور وحشت و بربریت کی جانب ہم متوجہ ہوتے ہیں۔

"یا خدا" کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے قاری کے اندر ایک وسیع انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد ہندو سکھ اور مسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم پر ہے اس کے کردار اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماحول کو خواہ یوپی میں رکھ دیجئے چاہے بہار میں بنگال، آسام اور سندھ میں، اس کی بنیاد نہیں بدل سکتی۔

سری نیواس لاہوٹی

خیرات ندیم اپنی شاعری کے آئینے میں

خیرات ندیم تقریباً پچاس سال سے شعر کہہ رہے تھے وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں رومان اور نئے سماجی تقاضوں کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے کہ اس میں امتیاز کرنا مشکل ہے کہ رومان کہاں ختم ہوتا ہے اور سماجی مساوات کا کہاں سے آغاز ہوتا ہے مگر پچھلے کئی سالوں سے وہ صرف غزل کے شاعر ہی بن کے رہ گئے تھے۔ حالانکہ وہ لوگ جنہوں نے ان کی جنگ کے خلاف اور امن و آشتی کی تائید میں نظمیں پڑھی ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ حرکت ہی میں برکت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں بھی ان کی نظموں کی توسیع شدہ شکل ہیں جو موضوعاتی اعتبار سے ایسا آہنگ پیش کرتی ہیں کہ آج غزل کا جو منفی پہلو ہمارے سامنے آرہا ہے اس کی نفی ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ آج سے ۴۵ سال پہلے ۱۹۴۲ء میں سلطان پورہ (حیدرآباد) کے ایک مشاعرے میں جو حضرت اختر مینائی کی صدارت میں ان ہی کے مکان پر منعقد ہوا تھا، اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس مخصوص مشاعرے میں جب انہیں اپنا کلام سنانے کا موقع ملا، جس میں اور دوسروں کے علاوہ ان کے استاد حضرت علی اختر بھی موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اساتذہ نوآموز شاعروں کا کلام صرف نیچی نظریں کئے سنتے تھے اور داد دینا ان کے مشرب میں شامل نہیں تھا لیکن جب انہوں نے اپنے استاد کا اشارہ پاکر خوش الحانی کے ساتھ اپنا کلام سنانا شروع کیا اور جب اس شعر پہ پہنچے کہ ؎

میری حیات پہ تاریکیاں مسلط ہیں — جہانِ شوق میں کیا کوئی آفتاب نہیں

تو یہ شعر سن کر بیٹھے بیٹھے ہوئے اساتذہ سخن ان کی جانب متوجہ ہوئے اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

اک آرزو جو برآئی تو دوسری موجود — جو کامیاب ہے وہ بھی تو کامیاب نہیں!

تب ایسا محسوس ہوا کہ خاموش چہروں پر نہ صرف مسکراہٹ پھیل گئی ہے بلکہ وہ ہمت افزائی انداز میں داد بھی دے رہے ہیں اور ستائش بھی کر رہے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کی ابتداء تھی اور انتہا یہ ہے کہ ؎

چلا ہوں ترک محبت کی آرزو لے کر یہ آرزو بھی کہیں درد سر نہ ہو جائے۔

مخدوم اور وحید کے بعد جن حیدرآبادی شعراء نے اردو شاعری کو نیا آہنگ عطا کیا ان میں ظفر حیدرآبادی، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، خیرات ندیم اور شاذ تمکنت کے نام نمایاں ہیں۔ اس زمانے میں بھی جبکہ ان کے ہم عصر شعراء کا ایک بڑا قافلہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ شعر و ادب کی دنیا کو نکھار رہا تھا اس وقت بھی ندیم نے اپنا ایک الگ طرز ادا و اسلوب بنا کر جو امتیاز حاصل کیا وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس لئے کہ ایک باشعور فنکار اپنے عہد کے تقاضوں سے آشنا ہو کر جب شعر کہتا ہے اور اس سے جو حاصل ہوتا ہے وہ پھر اپنے سامع و قاری کو اس انداز سے لوٹا دیتا ہے کہ داد دینی پڑتی ہے ؎

مری فکر نے مجھے بخش دی ہیں ندیم لیت کی دھڑکنیں
وہ جہاں جہاں نہ پہنچ سکے میں وہاں وہاں سے گزر گیا

ندیم نے اپنے افکار کو ایسے وقت ایک نیا آہنگ عطا کیا تھا جبکہ جاگیردارانہ سماج نزاع کے عالم میں دم توڑ رہا تھا۔ شاہی نظام ہچکیاں لے رہا تھا اور جمہوریت کی آہٹ دریچوں کے اس پار سنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں ایک باشعور شاعر ہی آشفتہ سری کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ ؎

بس اتنی بات سے ڈرتا ہے باغباں جس سے چمن میں اہل چمن اختیار مانگتے ہیں۔
وقت سادہ لوحی سے انتقام لیتا ہے وقت کے تقاضوں پر جب نظر نہیں ہوتی

آج کے دور میں جب کہ انسان تعمیر اور ترقی کی جستجو اور جہد حیات ہی لگا ہوا ہے۔ ایسے میں باشعور شاعر اور ادیب رہنمائی کا فرض انجام دینے کے لئے میدان عمل میں آتے ہیں تو ایک ایسا طرز جدیدیت کے نام سے ابھر کر سامنے آتا ہے اور اپنی ادبی صلاحیتوں کو تعمیری مقاصد کیلئے استعمال کرنے کے بجائے بے مقصدیت کا حجاب ادب کے دھارے کو موڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمارا "

ادب اور سماج گمراہی کا شکار ہو کر ان ادبی اور تہذیبی اقدار سے انحراف کرنے لگے جو ترقی پسندی کی دین ہے۔ جب ندیم جیسا حساس شاعر اس بے راہ روی کے شکار ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو پڑھتا یا سنتا تھا تو ان کے خلاف اس کا ردعمل اس طرح سے ظاہر ہوتا تھا کہ ؎

سخنوری کو بھی لایا ہے کس دوراہے پر ___ غرورِ جہل نے بے ربط سی کلامی نے
حصار کھینچ کر مخصوص چند لفظوں کا ___ سخنوری تو نہیں یہ فقط حماقت ہے
جس تجربۂ نو میں اگر جہل ہے شامل ___ سمجھو نہ وہ معیارِ ادب بھول گئے ہیں
عجیب حال تھا دانشوروں کے جملوں پر ___ تمام لفظ تھے مفہوم کا لباس نہ تھا

پھر وہ ان بھٹکی ہوئی نیکیوں کو نصیحت کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ ؎

جل اٹھیں ندیم آخر مشعلیں حقائق کی ___ شاعری مسائل سے بے خبر نہیں ہوتی
آج بونے میرا قد ناپ رہے ہیں یارو ___ سازشی ذہن سے اور جہل کے پیمانے سے
میرا معیارِ سخن سچائیوں کا حسن ہے ___ مصلحت کا کوئی دھبّہ فکر پر اب تک نہیں

خیرات ندیم روایت اور بغاوت کا ملا جلا احساس لئے ہوئے اردو غزل کا ایک نمائندہ شاعر تھے جنھوں نے اپنی غزل کو نظم کا آہنگ عطا کر کے اس میں وہ بات پیدا کر دی تھی جو نظم کا خاصا تسلیم کی گئی ہے اسی لئے وہ اپنی غزل کو بھی نظم کی طرح سے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے انسانیت کے درد کو اس میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ آج کے اس دور میں انسان اور فنکار کا ربط ٹوٹ گیا ہے اور اس بے ربطی کو ختم کرنے کیلئے وہ آواز دیتا ہے کہ ؎

زندگی کے غم و مسرت کو
ایک شاعر ہی تول سکتا ہے
اور پھر وقت کی زباں بن کر
دل کا ہر زخم بول سکتا ہے۔

ان کی غزلوں میں وقت کے تقاضوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے اور اس آواز میں گرانی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ آج جب کہ جدیدیت کے علمبردار غزل کے منفی پہلو کو اختیار کر کے ہماری شاعری کی روایت کو رسوائی کی دہلیز پر کھڑا کرتے ہیں۔ ایسے میں ندیم کا شاعری بھٹکے ہوئے لوگوں کیلئے

تازیانہ عبرت ہے ۔ کاش کہ گمراہی کے ہم رکاب شاعر وقت کی آواز کو پہچانیں اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ایسے شاعروں کی پیروی کریں جو زندگی اور بہتر مستقبل کے لئے اپنے افکار کو سماج کے سامنے پیش کر رہے ہیں ۔ ندیم نے اس بات کو کس بانکپن کے ساتھ ادا کیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

وقت کے ساتھ بدل جائیں یہ نا ممکن ہے   وقت کو ہم نے بدلنے کی قسم کھائی ہے

اور پھر عزم مصمم کے ساتھ یہ بات بھی کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ؎

تہذیب وارتقاء کے علم ہو گئے بلند   ہم عاشقانِ صبح بہاراں جدھر گئے

فرقہ وارانہ فسادات میں ہندو اور مسلموں کی مشترکہ تہذیب، شائستگی اور وضعداریوں کے اقدار جس طرح پائمال ہو رہے ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک المیہ ہے لیکن یہ فسادات ہوتے نہیں بلکہ جماعت اپنے اقتدار کی ڈوری کو اور مضبوط کرنے کیلئے ان منصوبہ بند فسادات کا سہارا لیتی ہے اور فرقہ پرست جماعتیں حکمرانوں کا آلۂ کار بن کر انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتی ہیں اس پر شاعر چراغ پا ہوکر کہتا ہے کہ ؎

خنجروں کے رقص میں سود و زیاں کی دوڑ میں   صرف چنو ہی نہیں استاد گر دھاری بھی ہیں

مقتل ہے شہر شہر کہیں خنجروں کا رقص   اخبار میں ہے امن و اماں خیریت سے ہیں

ہمارے اس دیش میں زاہدانِ خشک جس طرح اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں ان کے بارے میں شاعر نے جس طرح اظہار خیال فرمایا ہے وہ معرکہ کی چیز ہے ؎

کچھ رہبرانِ قوم، عمامے، عبا، قبا   چمکا کے اپنی اپنی دوکاں خیریت سے ہیں

وہاں اٹھائی گئیں نفرتوں کی دیواریں   جہاں معاملے دستِ عبا قبا کے چلے

یہ صرف نفرتوں کے سوا دیں گے کیا ندیم   اہل عبا، قبا سے کبھی مشورہ نہ مانگ

آج ہمارے ملک میں نہ صرف اقلیتیں بلکہ ان کی زبان بھی خطرے میں ہے اور سیاسی بازیگر اس کا شیرازہ بکھیر کر اس کو سولی پر لٹکانے کی فکر میں ہیں ۔ شاعر جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے اور یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ ؎

اب پھانسیوں کی چھاؤں میں دیگر زبان کو   دانشوران اردو زباں خیریت سے ہیں

جی رہے ہیں آج جو اردو زباں کی بھیک پر   ان سے ہی اردو زباں کا سر خطرے میں ہے

آندھرا پردیش آج لسانی تعصب کا شکار ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی اور اس کے حکمران زعم باطل میں دوسری زبانوں کو یکسر ختم کر کے صرف ایک ہی زبان کا جو نعرہ بلند کر رہے ہیں اس کے بارے میں شاعر کے خیالات ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ زبانوں کا تعصب یہ علاقائی گھمنڈ — پاسبانی بھی وطن کی خوئے غداری بھی ہے
کچھ حقیقت ہے دکھاوا ہے اداکاری بھی ہے — راہزن ہیں رہبری پر سا تستہ طاری بھی ہے

ندیم کی شاعری میں یقین محکم اس قدر مکمل اور اعتماد سے مملو ہے کہ زمانے کی تیز و تند آندھی بھی اسے یہ کہنے سے نہیں روک سکی کہ ؎

کس نے کہا کہ بھولا ہوا سا فسانہ ہے — ہم کل بھی ایک عہد تھے اب بھی زمانہ ہیں

زمانے کی کسمپرسی اور غموں کا ماتم کرنے کے بجائے وہ بساط الٹنے کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

میں نے غم سہے کتنے اب بساط الٹ دوں گا — وہ میری نوازش تھی یہ میرا ارادہ ہے

شاعر جب حساس ہو اور زمانے پر اس کی گہری نظر ہو اور وہ مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر اظہار خیال کرے تو وہی حقیقی شاعری ہے اسی لئے ندیم کی شاعری میں ابہام نہیں بلکہ ایمائیت اور شعوری فکر کا اظہار ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا فارم ان کے لئے بہترین وسیلہ اظہار ثابت ہوا ہے۔ غزل کی اپنی اسلوبی روایت میں ایسی گنجائش پیدا کرنا کہ سماجی اور سیاسی وابستگی پر حرف نہ آئے اور زبان و فن کی حرمت بھی باقی رہے، یہ بات ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے اسی لئے ندیم کہتے ہیں کہ ؎

اب ندیم اپنے مخالف بھی یہی کہنے لگے — شعر بھی تیکھے ہیں اور اسلوب معیاری بھی ہے

آخر میں اتنا کہتا چلوں کہ رخصت ہو جانے والے دوستوں کی یادیں ہی تو محبت اور رفاقت کا سرمایہ ہوتی ہیں اور مرحوم دوست کیلئے اپنے اس اخراج کو ان ہی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

ہوش مندوں نے کہا ہر بزدلی کو مصلحت — جانب مقتل گئے تو صرف دیوانے گئے

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

علامہ خضر برنی کی تین کتابیں

میرے پیش نظر علامہ خضر برنی کی مندرجہ ذیل تین کتابیں ہیں (۱) شمع ہدایت اور پروانے (۲) شاہنامہ رسالت اور (۳) زخم در زخم۔ ان کے علاوہ "علامہ خضر برنی شخص اور شخصیت" کے نام سے ایک کتاب اور ہے جس میں ملک و بیرون ملک کے اہم اہل قلم اور متعدد فنکاروں نے حضرت برنی کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مختصر آرا، تاثرات اور جائزہ کے اس مجموعے کو جناب نظر برنی اور محترمہ مرلقا ملکہ نے مرتب کیا ہے۔ اس طرح ان موجود کتابوں کے ذریعہ علامہ خضر برنی کی خدمات اور ان کی شخصیت کو سمجھنے سمجھانے کا موقع مل جاتا ہے۔

"تاریخ فیروز شاہی" کے مصنف اور عالم بے بدل ضیاء الدین برنی کے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے علامہ خضر برنی نے شعر و ادب، زبان و صحافت، ملک و ملت اور سیاست و معاشرت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کے احاطہ کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔ وہ ایک نابغۂ روزگار کی طرح ہمارے سامنے آئے، انہوں نے اپنے اسلاف کے گراں مایہ کارناموں کو آگے بڑھایا۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت نے بعد کی پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

علامہ خضر برنی نے پندرہ سولہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہے، بچوں کیلئے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ میدان سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا ہے۔ کامیاب صحافتی زندگی گزاری ہے۔ غرض ان تمام جہتوں میں ان کے مکمل کارناموں کی روداد کیلئے تو جناب نظر برنی اور محترمہ مہ لقا ملکہ کو ایک توسیعی منصوبہ مرتب کرنا چاہیئے تاکہ اس گوہر آبدار کی چمک دمک وقت کی دھول میں چھپ کر نہ رہ جائے۔ یہ بات لائق اطمینان ہے کہ ان دونوں نے موسوفہ کی کتابوں

نے موصوف کی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی ہے اور یہ کہ پندرہ روزہ "ہریں" کو زندہ رکھکر اپنے اخلاف صالح ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مرتبہ کتاب "علامہ خضر برنی - شخص اور شخصیت" ایک تعارف کا کام انجام دیتی ہے۔ اس میں حضرت خضر برنی کی مختلف النوع شخصیت تفصیل کے ساتھ سامنے آسکی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں جناب بہار برنی، رئیس الرحمان، عشرت حسین صدیقی، صدیق الرحمن قدوائی، سید حامد، شاہدہ صدیقی، مولانا ماہر القادری، رنبیر جی (چیف ایڈیٹر ملاپ) احمد جمال پاشا مرحوم، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عنوان چشتی، مالک رام، عطا محمد شعلہ، کوثر چاندپوری، ڈاکٹر سیفی پریمی، محمود حسین قدوائی وغیرہ کی تحریریں شریک ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر مضامین سرسری انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مقالات میں کوثر چاندپوری اور ڈاکٹر سیفی پریمی نے قدرے تفصیل سے جناب برنی کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ جوش ملیح آبادی، منور لکھنوی، گوپی ناتھ امن، سلطان دہلوی، بنارسی داس، رام کرشن مضطر، عزیز اندوری، ملہ انصاری، خلیل الرحمن اعظمی مرحوم، سید اختر الاسلام، میر مشتاق احمد وغیرہ کے تاثرات استقبالیہ اور مختصر تبصرے بھی ہیں۔ بہار برنی نے اپنے انٹرویو کے ذریعہ علامہ خضر برنی کی گفتگو قلمبند کردی ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو محققین کے لئے مشعل راہ ہوسکتی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں علامہ خضر برنی کے چند نثری نمونے بھی دیئے گئے ہیں غرض اس پیشکش میں بلاشبہ موصوف کی حیات و خدمات کے متعدد گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر ہر جگہ بخل سے کام لیا گیا ہے۔ بہر حال اسے نقش اول سمجھکر ارباب علم وادب حضرت خضر برنی کی صد پہلو شخصیت پر زیادہ جامع کتاب مرتب کرسکتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی گرانقدر شخصیت پر ایک مبسوط تحقیقی کام کرایا جائے۔

"شمع ہدایت اور پروانے" رسول اکرم ؐ کی حیات طیبہ پر حاجی محمد رفیق کی لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ ہے۔ پس منظر کے طور پر انبیائے ماقبل رسول اکرم ؐ کے اذکار بھی ہیں اور یہ بتایا

گیا ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے ماقبل کے سلسلے میں کیا کیا اطلاعات آئی ہیں۔ اس ۹۶ صفحات کی کتاب میں مختلف عقائد، مذاہب، اقوام و قبائل کے حالات درج ہیں یہ سب مختصر ہیں مگر ان سے مذاہب کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ حضرت خضر برنی کے ترجمہ کی خصوصیت یہ ہیکہ یہ کہیں ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ زبان نہایت سلیس شگفتہ اور رواں ہے۔

دوسری کتاب "شاہنامہ رسالت" علامہ خضر برنی کی شعری تخلیق ہے جیساکہ نام سے ظاہر ہے۔ اس میں ہادی عالم رسول اکرم اور قرآن و اسلام سے متعلق شاعر نے اپنے جذبات پیش کئے ہیں۔ اس میں اکثر و بیشتر چھوٹی چھوٹی منظومات میں متعدد عنوانات کے تحت موضوعات بیان کئے گئے ہیں۔ چند طویل نظمیں بھی ہیں۔ خاص طور پر "شاہنامہ رسالت" نام کی نظم خاصی طویل ہے۔ ان تمام تخلیقات میں حضرت خضر برنی کے مذہبی جذبات اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان سے شاعر کے زور بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ جناب خضر نے تاریخی حقائق کو اپنے نہاں خانۂ دل میں اتار کر انہیں شعری آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان منظومات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہیکہ مذہب و معرفت شاعر کی داخلی شخصیت کا ایک نہایت مضبوط پہلو ہے۔ مختلف منظومات میں بحر و وزن کے تنوع سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور بڑے شوق و ذوق سے پوری کتاب کا مطالعہ کرسکتا ہے۔

"زخم در زخم" علامہ خضر برنی کا دسواں مجموعہ کلام ہے۔ جناب خضر برنی کی عبقری شخصیت نے میدان شعر و سخن میں بھی اپنے اجتہادات کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ موصوف عملی طور پر بھی حد درجہ فعال تھے وہ تحرک و تفاعل کے قائل تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جس قوم کے افراد مسائل کا مقابلہ کرتے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لئے تگ و دو کرتے ہیں وہ قوم ترقی کے راستوں پر گامزن ہوتی ہے شکست و ریخت سے محرومی و مایوسی کے احساسات، مصائب و مسائل سے فرار، تفنن و تعیش کی فضا میں آزادہ روی و تہذیبی انارکی اور اسی طرح کے منفی تصورات و احساسات نہ ان کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ان کی شاعری میں، لہٰذا ان کی شاعری کا مجموعی تاثر اردو کی اس عام شاعری سے

مختلف ہے جہاں تشنگی و شکستگی کے محسوسات بطور خاص بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں عدمیت اور نفی ذات کی ترغیب ملتی ہے جہاں مسماری و تخریب میں بھی دلکشی کا پہلو پیش کیا گیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ حضرت خضر برنی کی شاعری ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل کا نسخۂ کیمیا ہے۔ یہ بات خاص طور پر ان کی منظومات کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے۔ غزل بیچاری تو روایات کی چٹان میں اکثر و بیشتر دب کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ابھرنے کے امکانات کم از کم اس عہد تک کچھ زیادہ واضح نہیں تھے۔ "زخم در زخم" میں غزلوں کے علاوہ جناب خضر کی نہایت کامیاب منظومات بھی ہیں جو سیاست و معاشرت، فطرت و قدرت، حب وطن اور حب انسانیت اور دوسرے خوشگوار اور تعمیری تصورات سے مملو ہیں۔ علامہ خضر برنی کو شعری ہیئتوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں دلنواز روایت کی خوشبو ہے۔ ان کی نظموں میں تشکیلی گھٹاؤ، ارتقار، موضوع سے اٹوٹ تعلق اور اس کا تسلسل، بیان و اظہار میں انفرادیت لہجے کی نازکی اور الفاظ کے استعمال میں حرکی نظام جیسی خوبیوں کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام کتب ادبی سنگم، مولانا محمد علی جوہر مارگ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

بقیہ صفحہ ۲۳

بیمار ہیں تو چند نفسیاتی امراض کا شکار ہیں۔ مسائل الگ الگ ہیں پر دل کے امراض کے شکار ہیں۔ سبھی امریکہ ہو یا ہندوستان، انڈونیشیا ہو یا ملیشیا، سعودی عرب میں ہوں یا پاکستان میں۔ حول الگ الگ ہیں لیکن انسان کی روح ایک ہے۔ واحد ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان، پارسی یا سکھ دل کے چار حصے ہی ہوتے ہیں۔ شریانی نظام، وریدی نظام ایک ہی طرح کا پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر فرد کو سکون کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ فرد کے سکون سے سماج میں سکون ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دل کو فرحت کے احاطہ میں ملبوس رکھنے کی ضرورت ہے۔ تناؤ، جھگڑا، بدچلنی، جذباتی گفتگو، طیش، بیجا جوش سے ہر فرد کو دور رہنے کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈے

بلقیس شبیہ
ڈونپاڑہ بیس۔ (آکولہ)

پت جھڑ کے بعد

ڈاکیہ نے دستک دی
شائد ان کے بیٹے سلمان کا خط ہوگا یا پھر منی آرڈر

عنیزہ بیگم یہ سوچ کر دل ہی دل میں پھڑک اٹھیں۔ منشی جی کے دروازے کی دستک عنیزہ بیگم کی ٹوٹی پھوٹی اجارت پر گویا ایک ٹھوکر تھی۔ جب آؤنی پاؤں پٹکتی کمرے کے باہر آئیں۔ صاف ستھرے دالان میں نیم کے زرد پتوں کو بکھرا دیکھ کر ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ انتہائی برہمی سے انہوں نے کام والی کو پکارا۔

" رفو" وہ زرد پتوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتی ہوئی اسے گھور کر بولیں۔ " دیکھ تو...!!

" ابھی تھوڑی دیر پہلے تو سب طرف کی صفائی کر چکی ہوں خالہ بی۔" لڑکی منمنائی۔

" چل! اور جھاڑو لگا۔" وہ ڈانٹ کر بولیں " کام چوری کی باتیں نہ کیا کر میرے سامنے"

" یہ موا نیم کا پیڑ" رفو کمرے کے گرد اوڑھنی لپیٹتی ہوئی بڑبڑائی " دیکھنے کا نہ چکھنے کا، دن بھر پتے سمیٹتے سمیٹتے ناک میں دم آگیا۔ ہنہ... وہ جھاڑو دیتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔ کچرا سمیٹا۔ اور ابھی اسے پھینک کر گلی کے دروازے سے پلٹی ہی تھی کہ پھر فضاؤں میں لہراتے چند زرد پتے دالان میں آگرے۔ رفو کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

" اوئی اللہ! وہ تلملا کر بولی۔" بجلی گر پڑے اس منحوس جھاڑ پر۔ ایسی آندھی چلے کہ جڑ سے اکھڑ جائے موا...... ! خدا کرے کھڑا سوکھ جائے " رفو انگلیوں کے پور پور کڑکڑاتی ہرے بھرے درخت کو کوسنے لگی۔ اس کی زبان سے نکلے یہ الفاظ شائد عنیزہ بیگم کے بھی دل کو ٹھیس پہنچا رہے تھے ورنہ اس بدکلامی پر وہ رفو کو ضرور پھٹکارتیں۔

پیڑ پودوں سے خود عنیزہ بیگم کو رغبت تھی۔ مگر پڑوس کے آنگن کا یہ درخت!

اس سے تو انہیں چڑ سی ہوگئی تھی۔ گرمی کے موسم میں جب پکی ہوئی نمبولیاں ٹپکتیں اور کبھی کبھار عنیزہ بیگم کے پیروں تلے آکر پٹ سے پھوٹ جاتیں تو پیلے پیلے ننھے سے چھلکوں کے باہر چھوٹی چھوٹی گٹھلیاں اور ان کی تواد دیکھ کر عنیزہ بیگم کو بڑی کراہیت آتی۔ یہ نیم کا درخت ان کے پڑوسی منشی جی کے پیچھے مکان کے چھوٹے سے دالان میں کھڑا تھا اور ان کے لئے گویا ایک ضد ایک چڑ بن گیا تھا۔

"جانے کیوں یہ چھوٹے لوگ اپنے ڈربے نما گھروں میں ایسے بڑے بڑے پیڑ لگاتے ہیں؟" وہ اکثر کہتیں۔ پت جھڑ کے موسم میں زرد پتے ان کے وسیع و عریض صاف ستھرے دالان میں آکر گرتے۔ رفو کے ہاتھ سے جھاڑو نہ چھوٹتی۔ ایک بھی پتہ اگر پڑا نظر آجاتا تو عنیزہ بیگم رفو پر صلواتیں برسانا شروع کردیتیں۔

"سمیٹ بیٹے! موئی آئے دن آلسی ہوتی جارہی ہے۔"

عنیزہ بیگم کے شوہر کو مرے ایک عرصہ گزرچکا تھا۔ وہ ملٹری میں اچھی پوسٹ پر تھے معقول تنخواہ۔ اوپر سے سرکاری رعایتیں۔ بہت سکھ بھوگا۔ ہمیشہ اچھا کھایا اچھا پہنا.... کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ بچپن ہی سے روپے پیسے کی فراغت دیکھی تھی۔ باپ بھی پولیس آفیسر۔ شہر شہر گھومیں، دولت، عزت، سامان عیش و مسرت سے مالامال زندگی بسر کی۔ مگر قسمت میں دکھ کے دن بھی دیکھنے تھے۔ صرف اک بچی پر بیوہ ہوگئیں۔ مگر بڑے حوصلے اور ہوش مندی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ والدین کثیر الاولاد تھے۔ چھوٹی بن بیاہی بہنیں، بھائی، بھابیاں، ان سب کے ساتھ رہ کر تعلقات کو کشیدہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ والدین کی پہلی اولاد ہونے کے ناطے ان کا خوب لاڈ و پیار اور اعتماد ملا تھا۔ شوہر بھی نازبردار تھا۔ لہذا مزاج میں تکبر اور خود پسندی آنا فطری بات تھی۔ ساس سسر کا انتقال ہوچکا تھا۔ صرف دو نندیں تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہوچکی تھیں۔ لہذا سسرال کی بڑی حویلی خالی پڑی تھی۔ بیوگی کے بعد جو وہاں آئیں تو ساری جوانی اسی چاردیواری میں گزار دی۔ سات آٹھ کمروں پر مشتمل وسیع پختہ اور آرام دہ مکان تھا۔ عنیزہ بیگم نے اس کا بڑا حصہ کرائے پر اٹھا دیا۔ دو کمرے، کچن، سامنے لمبا سا برآمدہ، کشادہ آنگن اور ایک پائیں باغ ان کے تصرف میں رہے۔

[redacted]

حویلی کے کرائے اور شوہر کی پنشن پر گزر بسر ہو رہا تھا۔ اپنی آن بان کو قائم رکھے ہوئے تھیں۔ لڑکی بھی رئیسانہ ڈھنگ سے کالج میں پڑھ رہی تھی۔ مزاج میں نفاست تھی اس لئے اپنی لگی بندھی آمدنی میں بھی اسی طمطراق سے جی رہی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے اٹھارہ انیس سال گزر گئے۔ خوشنودہ جوان ہو کر قد و قامت میں ماں سے بھی آگے نکل گئی۔ صحت مند پرکشش شخصیت، سلونی رنگت پر نفیس ناک مناسب، اس پر سرو سا سراپا۔ یہ اس کے بی۔اے کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد امور خانہ داری کی تربیت دے کر وہ اسے جلد اچھی جگہ بیاہ دینا چاہتی تھیں۔

وہ اب اپنے آپ کو عمر سے زیادہ تھکا تھکا محسوس کر رہی تھیں۔ چالیس پینتالیس کی عمر میں ہی ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ جسم کمزور پڑنے لگا تھا۔ شوہر کی اچانک موت کے غم نے لو کے جھکڑ کی طرح ان کے جوان شگفتہ سراپے کو جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ بچی کی بہتر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اور اب اسے مناسب اور اچھی جگہ بیاہنے کی فکر..... خود بستہ اور خود دار تھیں۔ ہمیشہ اپنوں اور بیگانوں سے کٹ کر رہیں۔ پاس پڑوس والوں سے بھی برائے نام واسطہ رکھا تھا۔ شوہر کے وقت کا سارا جمع جتھا زیورات اور روپے پیسے بیٹی کے جہیز کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ وہ خوشنودہ کی شادی ایسی شان و شوکت سے کرنا چاہتی تھیں کہ بچی کو باپ کی کمی کا احساس نہ ہو۔

"رفو"۔ مشین کے پائیداں پر پاؤں روک کر عنیزہ بیگم نے لڑکی کو پکارا۔

"ہوں.. چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی ہوئی رفو نے وہیں سے ہنکارا بھرا،

"تیرے منہ میں خاک بھوبل ....." وہ بھنا کر بولیں "ہزار مرتبہ کہا آواز دینے پر "جی" کہا کر ولدڑ"۔ اندر سے رفو کی کوئی آواز نہ آئی تو وہ پھر بولیں۔

"یہ کیسی بساندھ بو آ رہی ہے ــ انڈے کا خول جل رہا ہے کیا؟

"نہیں خالہ بی ـ" رفو باورچی خانے کے دروازے میں آ کر بولی "شائد منشی جی کے یہاں جھینگے بھنے جا رہے ہیں ـ تو سے پر اکتھانی جلانے کی کھرر کھرر آواز بھی آ رہی ہے۔"

عنیزہ بیگم نے ناک پر کپڑا لگایا اور مشین پر سے اٹھ گئیں۔

"کیڑے مکوڑے بھی پھول کر کھا جاتے ہیں خالہ بیگم یہ لوگ" رفو تحیر بھرے انداز میں بولی۔
"چُپ!" عنبرہ بیگم کو زور کی ابکائی آ گئی۔ وہ باتھ روم کی طرف بھاگیں۔ وہاں سے آنے کے بعد انہوں نے لونگ اور چھالیہ منہ میں ڈالی اور باغ کی طرف ہولیں۔ جاتے جاتے رفو سے کہہ گئیں۔
"آٹا گوندھ کر تیار رکھنا۔ خوشنود ... ہی ہوگی۔ اسے تازہ پھلکے سینک کر دینا۔"

وہ اپنے باغ کا دیکھ ریکھ بڑی رغبت ... تھیں۔ پتہ پتہ کونپل کونپل پر دھیان، دینا کھاد، پانی، روشوں کی صفائی، پھول پودے لگانا سب کام انہیں ہی انجام دینا ہوتے۔ ابھی پرسوں کھانے بھر کی سبزی ترکاری وہ اپنے اسی باغ سے اگا لیتی تھیں۔ مگر باغ میں اب وہ پہلی سی رونق اور دلکشی نہ تھی۔ فوارے سوکھے پڑے تھے۔ ان کے آزاد ارمانوں کی طرح۔ حوض میں پانی ہی نہ تھا۔ ماضی کی یادگار ایک جیسے کا پیڑ، شہتوت، جامن اور امرود کے چند پیڑ باقی رہ گئے تھے۔ جب ان پر پھل آتے تو ... گلہریاں اور چڑیاں خوب چہکارتیں، جوہی، موتیا کی بیلیں ادھر ہوا کے دوش پر ... چند زرد پتے عنبرہ بیگم کے سفید کالے کھچڑی بالوں میں آکر اٹک گئے۔ کسی زمانے میں باغ کے اسی کنج بار کنج میں بیٹھ کر عنبرہ بیگم کے شوہر نے ان کے عنبریں زلفوں میں بیلا، چنبیلی اور گلاب کے پھول لگائے تھے۔ لیکن اب...! بدلتے زمانے کے ساتھ کڑوے کسیلے خزاں زدہ جھاڑ کے زرد خشک پتے ان کے خزاں رسیدہ بالوں میں آکر الجھ رہے تھے۔ وہ جھنجھلا اٹھیں۔ پتوں کو نکالتے نکالتے ان کے بالوں کی ایک لٹ بھی ان کی چٹکی میں آکر کھنچ گئی۔ ہلکے سے درد کا احساس ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ احساس تو اس پیڑ کے وجود کا تھا۔ جو ٹنڈ منڈ شاخوں کو لئے ٹھونٹھ کھڑا صبح شام انہیں زرد پتوں کی سوغات دیتا رہتا۔

"ایسے بے مصرف پیڑ لگا کر دوسروں کو دکھ دینا کیسی جہالت ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی پلٹیں دالان میں ابھی پاؤں ہی دھرا تھا کہ کمرے سے زور کی باتوں کی آواز نے چونکا دیا۔ بنولوں کو باورچی خانے میں جھونکا اور جونہی کمرے میں داخل ہوئیں لق دق ہو کر رہ گئیں۔ قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے منشی جی کی بیوی بیٹھی تھی۔ اور رفو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ خوشنود بھی کالج سے آ گئی تھی اور وہ بھی منشی جی کی بیوی سے بڑی خوش خلقی سے پیش آ رہی تھی۔

عنیزہ بیگم کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسی جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کہ رفو سٹپٹا کر لگی
" کچن کے کواڑ کھلے چھوڑ کر یہاں کیا کر رہی ہے۔؟ رفو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔
منشی جی کی بیوی نے بڑے احترام سے عنیزہ بیگم کو سلام کیا۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے جواب دیا۔ دل میں تو نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔ ان کے تیور اور انداز دیکھ کر منشی جی کی بیوی کھڑی ہو گئیں۔

" چلتی ہوں۔" وہ ملائمت سے بولیں۔" ذرا سلمان کا خط پڑھوانے خوشنودہ بیٹی کے پاس چلی آئی تھی۔" بیٹے کے نام کے ساتھ منشی جی کی بیوی کے چہرے پر خوشی کے گلاب کھل اٹھے۔ عنیزہ بیگم کے ذہن میں دوپہر کی گرم ہواؤں کے جھکڑ سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس کے جانے کے بعد وہ رفو پر برس پڑیں۔

" تو نے اس اجڈ گنوار عورت کو میرے نفیس قالین پر بٹھا دیا۔"

" تو کیا ہوا ممی۔" ماں کے اعتراض کے جواب میں خوشنودہ بولی تو انہیں بڑا جبر کرنا پڑا۔

" آجکل کی پڑھی لکھی لڑکیوں کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چھوٹا بڑا، اونچ نیچ، ذات پات کسی چیز کی تمیز نہیں ان میں۔ میں نے زندگی بھر ایسے لوگوں سے یارانہ نہیں رکھا۔ بھلا ان کا ہمارا کیا میل۔

خدا کی مار ایسے لوگوں پر...... اسے اپنے کمرے میں بیارے بیٹھا دیکھ کر تو میرا خون کھول اٹھا۔ بیٹا سعودی عرب کیا گیا ہے اپنے آپ کو نواب زادی سمجھنے لگی ہے۔ ۔۔۔

" چار پیسے آجانے سے بھی انسان کی اوقات بدلتی ہے!" ان کے غصے کا ٹمپریچر عروج پر آ رہا تھا۔

اک دن خوشنودہ کو منشی جی کے گھر سے نکلتا دیکھ کر عنیزہ بیگم کی سانس گویا حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ جوان بچی پر غیض و غضب کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں پھر بھی ان کے لہجے سے شدید برہمی عیاں تھی۔

" کیوں ۔۔۔؟" اس مختصر سوال کا مطلب منشی جی کے گھر جانے کی وجہ دریافت کرنا تھا۔

" سلمان کا خط آیا ہے۔" خوشنودہ صاف دلی سے بولی۔

"لو......" عنیزہ بیگم کی تیوریاں شکن آلود ہوگئیں۔" خط پڑھانے کیلئے اس نے تمہیں اپنے کٹیا میں سلوایا۔

"نہیں ممی..... ماں کا غصہ دیکھ کر خوشنودہ سہم گئی۔" وہ ممی..... میں یونہی چلی گئی تھی۔ ممی! سلمان نے آپ کو سلام لکھا ہے اور ہماری خیریت دریافت کی ہے۔ خوشنودہ اپنی بوکھلاہٹ چھپاکر قدرے مسکرا کر بولی" اچھا! اب وہ لونڈا اپنے آپ کو اس قابل سمجھنے لگا ہے کہ ہماری خیریت دریافت کرے.... وہ نفرت سے بولیں۔
"اسے کیوں اتنی فکر لاحق ہوگئی ہماری۔" خوشنودہ بے چاری لاجواب ہوکر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سلمان ہر مہینے معقول رقم اپنے والدین کو بھیج رہا تھا۔ جس طرح خزاں زدہ پیڑ پودے بارش کے موسم میں دوبارہ جی اٹھتے ہیں اسی طرح روپے پیسے کی فراوانی نے منشی جی اور ان کی بیوی کے بڑھاپے کو سرسبز بنادیا۔ زمین جائیداد خریدی جاتے لگی۔ سامانِ عیش وعشرت بڑھایا جانے لگا۔ گھر میں کام کاج کے لئے ایک بڑھیا بازار سے سودا سلف لانے کے لئے ایک نوکر بھی رکھ لیا گیا۔ منشی جی کے جھرّیوں بھرے افلاس زدہ چہرے پر دولت کی چمک نظر آنے لگی۔ اب انکی بیگم بھی سفید براق سے ملبوسات لپیٹے شہر کے بڑے بڑے ذی حیثیت گھرانوں میں تعلقات پیدا کررہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر عنیزہ بیگم کے سینے پر سانپ کوئی گھونسے مارتا۔ چھپّر کے مکان کو حویلی میں تبدیل کرنے کے بھی منصوبے بن رہے تھے۔ صرف اس بات نے عنیزہ بیگم کو بڑی راحت پہنچائی۔ مکان کی کچی دیواریں جب بھی فصیل میں بدل جائیں گی تو وہ منحوس بیری کا نیم کا پیڑ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔
چھٹی میں سلمان گھر آیا تو اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ دبلا پتلا شرمیلا زرد رو نوجوان خوش گفتار خوش اطوار خوش وضع بن گیا تھا۔ رنگ روپ بھی خوب نکھر آیا تھا۔ شخصیت سے امارت اور وقار ٹپک رہا تھا۔ محلّے بھر میں سلمان کے چرچے ہونے لگے۔
شامت کی ماری رفو کے زبان سے بھی ایک دن سلمان کیلئے تعریفی کلمات نکل گئے عنیزہ بیگم کے بدن میں گویا مرچیں لگ گئیں۔ رفو پر برس پڑیں۔

"کس ایشڈی بینیڈی کی تعریف کر رہی ہے میرے سامنے۔ لنگوڑا اناتھا! جلدی کی گرہ لیکر پنساری بنا پھرتا ہے۔۔۔۔ اب اگر تیری زبان پر اس لمبو، پیلپٹ گرگٹ کا نام آیا تو کولہو میں پلوادوں گی لنگوڑی کو۔ بے چاری رفو بیچا سر کئے ان کے غصے کا سارا ابال سہتی رہی۔

اک دن منشی جی کی بیگم نے ڈرتے ڈرتے سلمان کیلئے خوشنودہ کا رشتہ مانگ ہی لیا۔

"میرا سلمان خوشنودہ کو بہت پسند کرتا ہے"۔

عنیزہ بیگم کو یوں محسوس ہوا جیسے منشی جی کی بیوی نے انکی شرافت اور وضعداری کے بوسیدہ خول کو تار تار کر دیا ہے۔ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کیلئے انہوں نے گویا منشی جی کی بیوی کا منہ نوچ لیا۔

"یہ کیا آئیں بائیں کر رہی ہے۔ رعنیپے پیسے کے زعم میں تم یہ بھول گئیں کہ تاج صرف شاہوں کے سروں کیلئے ہوتے ہیں:"

بے چاری منشی جی کی بیوی اپنا سا منہ لیکر چلی گئی۔

اتفاق سے ان ہی دنوں خوشنودہ کا ایک اچھی جگہ رشتہ طے ہو گیا۔ منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ لیکن اس موقع پر عنیزہ بیگم نے منشی جی کے پورے گھرانے کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ دو تین دن گزر جانے کے بعد بے چاری منشی جی کی بیوی بن بلائے ہی منگنی کی مبارکباد دینے چلی آئی۔ ڈھیر سی دعائیں دینے کے بعد خوشنودہ کی سو سو بلائیں لے ڈالیں۔

اسی رات کھانا بناتے ہوئے خوشنودہ آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ آگ پر تو فوراً ہی قابو پا لیا گیا مگر بچاری طرح جھلس کر رہ گئی۔ اسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ عنیزہ بیگم تو بالکل حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ منشی جی کے گھر والوں نے پورا حق ہمسایہ ادا کیا۔ ماں کی محنت اور دعاؤں سے اللہ نے خوشنودہ کو نئی زندگی عطا کی۔ لیکن اس کے حسن کا چاند داغدار ہو گیا۔ ماں پھر بھی خوش تھی کہ اپنی بیٹی کو زندہ سلامت گھر لے جاؤں گی۔ مگر اک قیامت ابھی اور ان کی منتظر تھی۔ اس حادثہ کی وجہ سے لڑکے والوں نے خوشنودہ سے نسبت توڑ ڈالی عنیزہ بیگم تو بس آواسا بیٹھ گئیں۔ اس موقع پر منشی جی اور ان کی بیگم نے بہت ڈھارس بندھائی۔

"بہن! دلگیر کیوں ہوتی ہیں۔ پسلی کے جوڑے تو اللہ تعالیٰ بناتا ہے" وہ عنیزہ بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولیں۔ "محض ہمارے اقرار یا انکار کرنے سے کیا ہوتا ہے"

"امی ڈائن کی نظر بد نے میری بچی کے رنگ روپ کو کھالیا ہے۔ اپنے کندھے سے منشی جی کی بیوی کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے عنیزہ بیگم خشونده سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے بولنے لگیں۔

انہوں نے خوشنودہ کو اس کی نئی زندگی کی مبارکباد دی تو وہ پھوٹ پڑی۔

"نہیں چاہیئے مجھے یہ زندگی۔ ساری عمر اک بیوہ بے سہارہ بوڑھی ماں کا بوجھ بنی رہوں گی! مجھے آپ نے کیوں بچایا۔۔۔۔" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"بیٹی! منشی جی کی بیوی ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔" اتنا کیوں سوچ رہی ہوں۔ آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا بیٹی اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارہ کیوں سمجھ رہی ہو ہمارے ہوتے ہوئے۔

"ہاں بیٹی! منشی جی خوشنودہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے" حوصلے سے کام لو۔ اتنی مایوس کیوں ہو۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اب تم ہماری بیٹی ہو۔ ہمارے گھر کی عزت رونق"

"خوشنودہ! ابو نے کیا کہا سن لیا تم نے" سلمان خوشنودہ کے پاس بیٹھ کر محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔" میں تمہارے جذبات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ سب کچھ بھول جاؤ اور اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔

اب تمہیں اک ضعیف ماں کا بوجھ بن کر نہیں بلکہ میری شریک حیات بن کر زندہ رہنا ہے"

"نہیں سلمان! اب میں اس لائق نہیں رہی" خوشنودہ سسکیوں کے درمیاں بولی۔

"خوشنودہ! محبت لازوال جذبہ ہے۔ جو صرف روح سے تعلق رکھتا ہے جسم سے نہیں۔ سچ پوچھو تو اپنے آپ کو تمہارے قابل بنانے کیلئے ہی میں نے اتنی بھی پرواز کی تھی۔ میں نے تمہارے لئے اس مالک حقیقی کے آگے دامنِ امید پھیلا دیا تھا جس نے مجھے ثمر باد کیا۔

"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو سلمان۔"

فیصلہ تو صرف تقدیر کرتی ہے خوشنودہ! جو ازل ہی سے ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھو کہ عمل کی گھڑی اب آئی ہے۔

[redacted]

بٹو! گھر چلو ......" وہ خوشنودہ کو سہارہ دیکر اٹھاتا ہوا بولا ۔

گھر میں قدم رکھتے ہی عنیزہ بیگم نے رفّو کو پکار کر حکم دیا ۔

" ان لوگوں کے لئے لیموں کا شربت بنا لا ۔ ذرا جلدی ...... اور ہاں برف ڈالنا نہ بھولنا ۔"

" جی .... رفو بھونچکا رہ گئی ۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی عنیزہ بیگم کو دیکھتی اور کبھی منشی جی کی بیوی کو جو خوشنودہ کو اپنے بازوؤں کا سہارہ دیئے گھر میں داخل ہو رہی تھیں پیچھے منشی جی تھے جو اپنے نوکر پر ان لوگوں کا سامان لدوائے چلے آرہے تھے ۔ سب سے پیچھے سلمان میاں تھے ۔ جو ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے پھلوں کی ٹوکریا اٹھائے شاداں و فرحاں چلے آرہے تھے ۔

یوں کلیجہ کا منہ بنائے کیا دیکھ رہی ہے ۔ سلمان میاں اور منشی جی کو ڈرائینگ روم میں لے جا ۔ اور بیگم صاحبہ کو خوشنودہ کے کمرے میں ۔"

پھر وہ برآمدے ہی میں ستون کا سہارہ لئے بیٹھ گئیں ۔ جیسے اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں پت جھڑ کے بعد نیم کے پیڑ پر ننھے ننھے سبزی مائل قرمزی پتے نکل آئے تھے ۔ ہوا سے پیڑ کی شاخیں جھول رہی تھیں ۔

اور عنیزہ بیگم کو یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے کوئی ان کے زخم پر پنکھا جھل رہا ہے ۔

سلسلہ ص۳۵

دل سے گفتگو کرنے کی اہمیت ہموار بلڈ پریشر کی برقراری میں ہے ۔ صفائی ستھرائی، خدا کی عبادت انسان کی خدمت میں لگے رہنے سے دل کی بیماریوں سے ہم دور رہ سکتے ہیں ۔ پھر بھی بلڈ پریشر میں کمی ہو جائے تو قریب کے ماہر امراض قلب سے مشورہ بے حد ضروری ہے ۔ پابند زندگی ہمیشہ بلڈ پریشر کے امراض سے انسان کو دوری پر رکھ پاتی ہے ۔ خوش و خرم رہنے سے، ہنسی خوشی کی افزائش سے، کسی کے دکھ میں ہاتھ بٹانے سے حیات میں فرحت پائندہ باد ہو پاتی ہے ۔ خدا کی رحمت صحت کی برکت میں ہو پاتی ہے ۔

ڈاکٹر کے بھگت وتسل راؤ
نیوملہ کنٹہ، حیدرآباد

بلڈ پریشر

ھر ایک انسان کا بلڈ پریشر ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں خون کا دباؤ۔ انسان کا دل ایک پمپ ھاؤز کے مانند ہے۔ اس میں چند نالیاں خون لاتی ہیں۔ چند خون لے جاتی ہیں۔ دل کے چار حصے ہیں اوپری دو حصوں کو آریکلز اور نچلے حصوں کو ونٹریکلز کہتے ہیں۔ بائیں ونٹریکل سے جسم کے تمام حصوں کو شریانی نالیوں کی مدد سے خون پہنچتا ہے۔ دل کو خون لانے والی نالی کو ورید اور لے جانے والی کو شریان کہتے ہیں۔ موٹی دموی شریان بائیں ونٹریکل سے نکل کر اوپر اور نیچے کے حصوں میں شاخوں میں بٹ کر خون کی سپلائی کرتی ہے۔ اگر دماغ کو چار منٹ تک خون نہ پہنچے تو موت ناگہانی انسان کی روح پر اپنا سکہ جما دیتا ہے اور طبی امداد بیکار ہو پاتی ہے۔ جس سرعت سے دل سے خون شریان میں چلا جاتا ہے اس رفتار کا نام ہی بلڈ پریشر ہے جسے ہم خون کا دباؤ کہہ سکتے ہیں۔ اسکی پیمائش ملی میٹر پارہ کے ذریعہ بتلائی جاتی ہے اسے (mm Hg) کہتے ہیں۔ خون کے دباؤ کو ناپنے کا آلہ ہوتا ہے جسے سپھگمومانومیٹر کہتے ہیں۔ اس آلہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ میں ایستادہ دو نالیوں میں پارہ ڈالا ہوا رہتا ہے جو ایک پیمانہ پر نظر آتا ہے۔ اس حصہ کو ایک ربر نالی کے ذریعہ ایک پٹی سے لیس رہ پاتا ہے۔ اس پٹی کو دائیں بازو مریض کے کو لپیٹ دینے کے بعد ایک ربر ٹیوب کے اندر ہوا دباؤ کے ذریعہ داخل کرتے ہیں جو پسٹن کی طرح ہوتا ہے۔ اس طرح کرنے سے خون کا دباؤ شروع ہوتا ہے اور پارہ اعظم واقل پیمانہ پر دیکھ سکتے ہیں۔ سٹیتھوسکوپ سے دل کی دھڑکن کو محسوس کرتے ہوئے ڈیاسٹولک دباؤ اور سیسٹولک دباؤ کی پیمائش کر سکتے ہیں۔

اکثر اوقات جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے دھڑام کے ساتھ مہمان خصوصی گر جاتا ہے۔ دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن مریض فوت ہو جاتا ہے۔ بہترین ڈنر کھاتے ہوئے میزبان بات کرتے کرتے دل کے دورہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ محفل میں غم کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ سب سماں بلڈ پریشر میں کمی و بیشی

کا بھی ہے۔ انسان کا اندرونی دشمن ہے۔ قاتل ہے۔ زندگی کا شیدا ہے۔ خاموشی سے قبرستان یا شمشان گھاٹ کی طرف رخ کر دیتا ہے چلتے پھرتے انسان کو۔ دل کے دورہ سے بے حواسی۔ یہ تو ذیابیطیس، گردہ کی بیماریوں سے اسے بے حد پیار ہے۔ انسان کا خاموش ترین حد سازی سازش ساز بلڈ پریشر کی بیماری ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال اٹھارہ لاکھ لوگ دل کے دورہ کے شکار ہوتے ہیں۔ امریکہ میں چھ لاکھ کے قریب دل کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جزائر برطانیہ میں ایک لاکھ سے زیادہ ان امراض کے شکار ہو پاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ انسان کو کب موت کے منہ میں گھسیٹ دیتا ہے۔

خون کے بہاؤ کو شریانوں میں پرکھنے کیلئے اسٹیتھوسکوپ کام دیتا ہے تو مقدار کی پیمائش سپھگمومانومیٹر سے کی جاتی ہے۔ عام صحت مند انسان (بالغ) کا سسٹولک پریشر اور ڈیاسٹولک پریشر ۱۲۰/۸۰ ملی میٹر مرکیوری ہوتا ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے بھی تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میکانک کا پریشر الگ، لکچرار کا پریشر الگ، سماجی کارکن، فیکٹری کے ڈائرکٹر وغیرہ کا سب کا الگ الگ پریشر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صبح، دوپہر، شام کا بلڈ پریشر بھی الگ ہوتا ہے۔ صحت مند انسان میں - یعنی ۸۰/۱۴۰ سے لیکر ۱۰۵/۲۰ تک بھی آسکتا ہے۔ اکثر ہم کہتے ہیں کہ غصہ کو تھوک دینا چاہیئے خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیئے۔ ورنہ بلڈ پریشر بڑھ پاتا ہے۔ کھانا کم کھانے سے، توانائی سے بلڈ پریشر میں بے حد کمی ہو جاتی ہے غشی کی حالت مریض پر طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات دوا کے بیجا اثرات سے بھی بلڈ پریشر میں کمی ہوتی ہے۔ ڈیاسٹولک پریشر عام طور پر ہموار ہی ہوتا ہے لیکن عمر کے لحاظ سے سسٹولک پریشر میں اضافہ ہوتا ہے۔ سرما کے موسم میں ایک دس ملی میٹر اوسط سے زیادہ ہوتا ہے۔

حمل کے دوران، ورزش کے دوران، زیادہ سوچ وچار کی وجہ سے، بے سوچے سمجھے وبے موقع غذا کے زیادہ استعمال سے، موٹاپن سے، دوسرے ذیلی امراض کی وجہ سے بلڈ پریشر زیادہ ہو جاتا ہے مریض میں۔ دل کے حصوں کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ خود دل کے حصوں کو دوسرے امراض کی وجہ سے مثلاً ذیابیطیس کی وجہ سے دل کو خون لے جانے والی خفیف سی شریانیں سکڑ جاتی ہیں۔ اس میں چربی و کولیسٹرال کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ اسکی وجہ سے وینٹریکل کے کچھ عضلات مردہ ہو جاتے ہیں

جیسے میوکارڈیک انفراکشن کہتے ہیں۔ نالیوں کو صاف کئے جانے کا کام بلون پلاسٹی کے ذریعہ بڑے بڑے تجربہ کار ماہر قلبی امراض مریض کو فرحت پہنچا رہے ہیں۔ نالیوں کو نکال کر دوسری نالی کو پیوند کا کام بھی بائی پاس سرجری میں کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اپولو دواخانہ، ویلور دواخانہ، چینئی گروہ کے خصوصی دواخانہ میں، دہلی کے سرکاری خصوصی ادارے میں، نظامس حیدرآباد میں قلبی امراض کا باقاعدہ علاج کیا جارہا ہے۔ علاج کسی قدر قیمتی ہے۔ عام انسان کے بس کے باہر رہے، قلب کے مرض کا علاج، علاج پر خرچ کرنے کے بجائے مرض کی روک تھام کے لئے خون کے دباؤ کو قابو میں رکھ پانا ضروری ہے۔

آئیے اب روک تھام کے لئے ہم کیا کریں۔ ڈسیٹولک خون کا دباؤ اگر ۸۵ - ۹۰ تک رہے تو آپ مرض کی سرحد پر ہیں (۹۰ - ۱۰۴) ڈسیٹولک پریشر ہے تو خفیف سا مرض ہے (۱۰۵ - ۱۱۴) ڈسیٹولک پریشر ہے تو مرض کی طرف رخ کردہ ہیں (۱۱۵) سے زیادہ ڈسیٹولک پریشر ہو تو فوراً علاج ضروری ہے - دوا کے بغیر کام نہیں چل سکتا - سسٹولک اگر (۱۶۰) سے زیادہ ہو جائے تو دل پر بوجھ ہونے کا امکان ہے۔ طبی معائنہ و علاج معالجہ کی ضرورت ہے۔ مریض کے لئے۔

احتیاط علاج سے بہتر ہے۔ موٹاپا ہر ایک کیلئے نقصان دہ ہے جسکی وجہ سے دل کو کڑی محنت سے، زور سے، زیادہ دباؤ سے شریانوں میں خون کو دوڑانا پڑتا ہے۔ دل کو مضبوط رکھنے کیلئے ہر روز ورزش ایک آدھ گھنٹہ کے لئے ضروری ہے۔ غذا میں نمک (سوڈیم کلورائیڈ) کا استعمال بھی کم مقدار میں کرنا ضروری ہے۔ دودھ میں کیلشیم موجود رہتا ہے۔ لہذا دودھ کا استعمال ضروری ہے، کافی چائے جیسے مشروبات کے استعمال کو محدود کرنا بھی ہے۔ شراب سگریٹ بھی شریانیں سکڑ جاتی ہیں۔ برتھ کنٹرول گولیاں بھی بعض اوقات بلڈ پریشر میں اضافہ پاتی ہیں۔

سب سے زیادہ ضرورت غم میں سکون سے سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے، عبادت، ریاضت سے، یوگا کے ذریعہ دماغ کو فرحت بخشنا ضروری ہے، سخت ترین سوچ دل کا درد پیدا کر دیتا ہے۔

بلا لحاظ مذہب و ملت ہر خاندان [illegible] سب سے، چند مالی پریشانیوں کا

باقی صفحہ ۵۲ پر